برگ و سازِ ما کتاب و حکمت است

ایں دو قوت اعتبارِ ملّت است

اقبالؒ اور قرآن

فکر و پیامِ اقبالؒ ــــ قرآن کی روشنی میں

جلد اوّل

پرویز

طلوعِ اسلام ٹرسٹ ۲۵ بی، گلبرگ لاہور

جملہ حقوق محفوظ ہیں

نام کتاب	------	اقبال اور قرآن
مصنف	------	غلام احمد پرویز
جلد	------	اول
ایڈیشن	------	چہارم 1996ء (بلا ترمیم)
ناشر	------	طلوع اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)
	------	25-B گلبرگ II لاہور 54660
	------	فون: 576 4484
طابع	------	دوست ایسوسی ایٹس
	------	الکریم مارکیٹ اردو بازار لاہور 54000
	------	فون 712 2981
مطبع	------	عصمت اسلم پرنٹرز

طلوع اسلام ٹرسٹ کی شائع کردہ کتب کی
جملہ آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صرف ہوتی ہے۔

مشمولات

نمبر شمار	عنوان	صفحہ
۱	فہرست	ج
۲	پیش لفظ (طبع اوّل ۱۹۵۵ء)، (طبع دوم ۱۹۶۵ء)	د، ص
۳	اقبالؒ اور قرآن (۱۹۳۸ء)	۱
۴	تلمیحاتِ اقبالؒ (۱۹۴۹ء)	۳۴
۵	اقبالؒ اور ملّت (۱۹۴۰ء)	۴۱
۶	اقبالؒ کا پیغام، نوجوانانِ ملّت کے نام (۱۹۵۰ء)	۵۱
۷	مقدمہ ضربُ الکلیم (۱۹۵۲ء)	۷۱
۸	مقامِ اقبالؒ (۱۹۴۹ء)	۷۹
۹	پیامِ اقبالؒ (۱۹۵۰ء)	۸۷
۱۰	مشرق و مغرب (۱۹۵۱ء)	۹۲
۱۱	علامہ اقبالؒ سے آخری ملاقات (نوشتہ ۱۹۳۹ء)	۹۷
۱۲	۲۱، اپریل ۱۹۳۸ء (۱۹۴۹ء)	۱۰۵
۱۳	اقبالؒ کی کہانی خود اقبالؒ کی زبانی (۱۹۵۱ء)	۱۲۳
۱۴	اے کشتۂ سلطانی و ملّائی و پیری (۱۹۶۷ء)	۱۴۹
۱۵	کیا اقبالؒ اشتراکی تھا؟ (۱۹۶۹ء)	۱۷۵
۱۶	اقبالؒ اور دو قومی نظریہ (۱۹۷۳ء)	۱۹۲
۱۷	اقبالؒ کا مردِ مومن (۱۹۷۴ء)	۲۲۸
۱۸	آدم کی کہانی، اقبالؒ کی زبانی (۱۹۵۴ء)	۲۵۹
۱۹	مجلسِ قلندرانِ اقبالؒ (۱۹۵۹ء)	۲۸۰

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

پیش لفظ

(طبع اوّل ______ مارچ ۱۹۵۵ء)

ہمارا دَور اس اعتبار سے خوش بخت ہے کہ اس میں (تیرہ سو سال کے بعد) پھر سے قرآن کی آواز بلند ہوئی ہے۔ اس میں شُبہ نہیں کہ اس آواز کے اوّلون السابقون میں بہت سی قابلِ قدر ہستیوں کے نام فخر و مسرت سے لئے جا سکتے ہیں۔ لیکن جس انداز سے علامہ اقبالؒ نے قرآنی انقلاب کی آواز سے فضا کو معمور کیا ہے، اس کا جواب نہیں ملتا۔ مبداء فیض کی کرم گستری سے انہیں نظر کی وسعت، فکر کی بلندی اور جذبات کی گہرائی کے ساتھ اسلوبِ بیان بھی اس قدر حسین اور دلکش عطا ہوا تھا کہ جس کے کان میں ان کی آواز پڑ گئی، وہ جھومنے لگ گیا۔ اقبالؒ نے اپنے سب سے پہلے مرتّب کلام (مثنوی اسرار و رموز) میں اس حقیقت کا اعلان کیا کہ انہوں نے جو کچھ سمجھا قرآن سے سمجھا ہے اور ان کی شاعری سے مقصود یہ ہے کہ وہ قرآنی پیغام کو لوگوں تک پہنچائیں۔ اس کے بعد وہ عمر بھر اس اعلان کو (مختلف انداز سے) دہراتے رہے اور آخر تک یہی پکارتے رہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ کسی کو، کسی خاص نکتہ کے متعلق ان کی قرآن فہمی یا قرآنی استدلال سے اختلاف ہو لیکن اس سے کسی کو اختلاف نہیں ہو سکتا کہ انہوں نے اپنی مسلسل سعی و کاوش اور سوزِ پیہم سے ہمارے دَور کے اربابِ فکر و نظر کا رُخ قرآن کی طرف ضرور موڑ دیا۔ اور یہ جو آپ کو آجکل "رجعت الی القرآن" کی آواز چاروں طرف سے سنائی دیتی ہے، یہ اسی سعیٔ مسلسل کی بار آوری ہے۔ كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّ فَرْعُهَا فِى السَّمَآءِ ۙ (۱۴/۲۴)

پھر جس طرح یہ حقیقت ہے کہ قرآن کی آواز بلند کرنے والوں میں علامہ اقبالؒ کا نام سرِ فہرست نظر آتا ہے؛ اسی طرح یہ بھی حقیقت ہے کہ جنہوں نے اقبالؒ کے اس قرآنی پیغام کو صحیح طور پر سمجھا اور اُسے

آگے پھیلایا، ان میں محترم پرویز صاحب کا نام بھی سرِ عنوان دکھائی دیتا ہے۔ وہ مسلسل بیس پچیس برس سے اس فکر کی نشر و اشاعت اور اس پیغام کی تشریح و تفسیر میں مصروف ہیں۔ ان کی ضخیم مجلّدات طلوعِ اسلام کے ہزارہا صفحات، اور مختلف اجتماعات میں ان کی سحر آفریں تقاریر، ان کی سعی و کاوش کی زندہ شہادات ہیں۔ یوں تو ان کی تصنیفات کی ایک ایک سطر اور ان کی تقاریر کا ایک ایک لفظ بتا دیتا ہے کہ انہیں اقبالؒ اور قرآن پر کس قدر عبور حاصل ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کی قرآنی فراست، اقبالی بصیرت اور علمی تبحّر کا اندازہ ان مجالس میں جا کر ہوا جس میں انہوں نے، حلقۂ درویشانِ اقبالؒ میں اقبالؒ کے کلام کو (یوں کہئے کہ) درساً درساً سمجھایا۔ یہ مجالس[1] ڈاکٹر عبدالوہاب عزام سابق سفیر مملکتِ مصر (متعینہ پاکستان) کے ہاں (قونصلیہ مصر میں) منعقد ہوا کرتی تھیں۔ جن خوش نصیب حضرات کو ان مجالس میں شرکت کا موقعہ ملا ہے وہ اس سے متفق ہوں گے کہ علوم قدیمہ اور جدیدہ کی روشنی میں، قرآن اور اقبالؒ کو بیک وقت اپنے سامنے مشہود دیکھنے کے اس قسم کے مواقع اور کہیں نہیں مل سکیں گے۔ افسوس ہے کہ یہ تشریحات قلمبند نہ کی جا سکیں ورنہ ان کے بعد اقبالؒ کو سمجھنے کے لئے کسی اور چیز کی ضرورت ہی نہ رہتی۔

پیامِ اقبالؒ کے متعلق، ایک جامع تصنیف کا خیال محترم پرویز صاحب کے سامنے مدت سے ہے لیکن چونکہ انہوں نے قرآن سے متعلق امور کو اپنی زندگی کے مقاصد میں سب سے مقدم رکھا ہے، اس لئے وہ جب تک ان سے فارغ نہیں ہو جاتے، اقبالؒ سے متعلق مستقل تصنیف کی باری نہیں آ سکتی۔ آج کل وہ "قرآنی لغت" اور "قرآنی مفہوم" کی تیاری میں ہمہ تن مصروف ہیں[2] اور جب تک ان کی تکمیل نہیں ہو جاتی، کسی دوسری طرف دھیان نہیں دے سکتے۔ لیکن ہمارے پاس مسلسل تقاضے پہنچ رہے تھے کہ پیامِ اقبالؒ کے متعلق پرویز صاحب کی تصریحات کا کتابی شکل میں (بلا مزید توقف) قارئین کے سامنے آ جانا نہایت ضروری ہے۔ ان تقاضوں کے پیشِ نظر ہم نے مناسب سمجھا کہ ان کے ان مضامین (اور تقاریر) کا مجموعہ شائع کر دیا جائے جو وقتاً فوقتاً طلوعِ اسلام میں چھپتے رہتے ہیں۔ چنانچہ یہ مجموعہ حاضر ہے۔ ان میں سے کچھ تو طلوعِ اسلام کے دورِ اوّل (دہلی[3]) میں شائع ہوئے تھے اور باقی اس کے دورِ جدید (کراچی[4]) میں۔ آخری مضمون البتہ ابھی تک کہیں شائع

---

[1] جو اب مرحوم ہو چکے ہیں، (۱۹۷۵ء)۔ [2] بِلّٰہِ الحمد کہ یہ دونوں شائع ہو چکے ہیں، (۱۹۷۵ء)۔ [3] (۱۹۳۸ء

[4] ۱۹۵۸ء سے یہ ادارہ لاہور منتقل ہو چکا ہے۔

نہیں ہوا۔ ان مضامین کے متعلق اس سے زیادہ کچھ کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہ قرآن کی روشنی میں علامہ اقبالؒ کی پرویزی تشریحات ہیں۔ ان میں سے ہر ایک اپنی اپنی جگہ آپ سند ہے۔

ان مضامین کے متعلق البتہ ایک بات قابلِ تصریح ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ ان میں اقبالؒ کے فلسفہ سے بہت کم بحث کی گئی ہے اور اس کے پیغام کے عملی پہلوؤں کو زیادہ نمایاں کیا گیا ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ان مضامین کا بیشتر حصہ ان تقاریر پر مشتمل ہے جو مختلف اجتماعات میں کی گئیں اور یہ ظاہر ہے کہ عام اجتماعات میں فلسفیانہ مباحث کا کوئی موقعہ نہیں ہوتا۔ وہاں ضرورت اس امر کی ہوتی ہے کہ عام فہم انداز میں زندگی کے عملی گوشوں کے متعلق گفتگو کی جائے۔ دوسرے یہ کہ (ویسے بھی) محترم پرویز صاحب علامہ اقبالؒ کی اس تاکیدی تلقین کو بڑی اہمیت دیتے ہیں کہ

اگر نہ سہل ہوں تجھ پر زمیں کے ہنگامے
بُری ہے مستئ اندیشہ ہائے افلاکی

وہ ملّتِ اسلامیہ کے لئے "زمین کے ہنگامے" سہل کرنے کی تدابیر سوچتے اور زیادہ تر انہی گوشوں کے متعلق قرآن کی تعلیم اور اقبالؒ کے پیغام کو عام کرنے کی فکر کرتے رہتے ہیں۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ ان مباحث کے فلسفیانہ پہلو کو اہمیت نہیں دیتے۔ مقصد یہ ہے کہ ان مضامین میں فلسفیانہ پہلو کے لئے موزوں مقام نہیں تھا۔ ویسے ان میں زندگی کی ان مستقل اقدار کے متعلق کافی بحث آگئی ہے جن پر قرآن انسانی عمل کی عمارت استوار کرتا ہے۔ جہاں تک فلسفۂ اقبالؒ کا تعلق ہے، پرویز صاحب کے پیشِ نظر یہ بھی ہے کہ حضرت علامہ کے خطبات (تشکیل جدید) کا تشریحی ترجمہ شائع کیا جائے۔ یہ خطبات (جو اس وقت تک بالعموم کتابِ مختوم کی حیثیت رکھتے ہیں) اس قدر اہم ہیں کہ ان کے ترجمہ اور تشریحات کی بڑی ضرورت ہے۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اس مقصد کے لئے پرویز صاحب سے بہتر اور کون ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ کچھ اسی وقت ہو سکے گا جب وہ اپنے پیشِ نظر قرآنی پروگرام سے فارغ ہو جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ انہیں ان اہم مقاصد کی تکمیل کے لئے عمر، صحت اور توفیق عطا فرمائے کہ ایسے لوگ روز روز پیدا نہیں ہوا کرتے۔

مارچ ۱۹۵۵ء

طلوعِ اسلام ٹرسٹ
۲۵/بی گلبرگ ۲۔ لاہور

پیش لفظ

(طبع ثانی ـــــــــ ۱۹۷۵ء)

اس کتاب کا پہلا ایڈیشن جو ۱۹۵۵ء میں شائع ہوا تھا، مشتمل تھا پرویز صاحب کے اس وقت تک کے خطابات اور مقالات پر. اُس ایڈیشن کے ختم ہو جانے پر، اس کے دوسرے ایڈیشن کے لئے تقاضے موصول ہونے شروع ہو گئے، لیکن پرویز صاحب کے پیشِ نظر ایک ایسی خود مکتفی تصنیف تھی جس میں علامہ اقبالؒ کے فلسفہ، کلام اور پیام پر سیر حاصل بحث کی جائے اور بتایا جائے کہ ان کی فکر کا سرچشمہ کیا تھا اور ان تمام جگر گدازیوں اور اخترشماریوں کا مقصد کیا! لیکن اُس تصنیف کی باری قرآنِ مجید سے متعلق پروگرام کے بعد آسکتی تھی. پرویز صاحب اس تمام دوران میں، اس قرآنی مشن کی سرانجام دہی میں اس قدر مصروف رہے کہ دیگر موضوعات کے لئے انہیں بہت کم فرصت مل سکی. چنانچہ ان کی معرکہ آرا لغات القرآن (چار جلدیں) اور شہرۂ آفاق مفہوم القرآن (مکمل قرآن کریم کا مفہوم)، علاوہ دیگر اہم تصانیف مثل، کتاب التقدیر، جہانِ فردا، شاہکارِ رسالتؐ، ان کی اس مصروفیت کا حاصل ہیں. نیز، تبویب القرآن (قرآنی انسائیکلوپیڈیا) جو معلوم کتنی جلدوں میں طبع ہو بھی اسی عرصہ میں تکمیل تک پہنچا. بنابریں، وہ اپنی شدتِ آرزو کے باوجود فکر و پیغامِ اقبالؒ سے متعلق اپنی پیشِ نظر تصنیف کی طرف متوجہ نہ ہو سکے ـــ اور اس دوران میں "اقبالؒ اور قرآن" کے جدید ایڈیشن کے تقاضے بڑھتے چلے گئے. جو اب پیشِ خدمت ہے.

ممکن ہے ہم اس (جدید ایڈیشن) کی اشاعت میں مزید تاخیر گوارا کر لیتے لیکن بدلتے ہوئے حالات نے پکار پکار کر کہنا شروع کر دیا کہ اس باب میں مزید تاخیر مناسب نہیں. جس طرح ہمارے صدرِ اوّل کے بعد ایک ایسی سازش وجود میں آئی جس سے اسلام کے نام کے زیرِ نقاب حقیقی اسلام کو مسخ کر کے رکھ دیا گیا (تفصیل اس اجمال کی شاہکارِ رسالتؐ میں ملے گی). اسی طرح، اب کچھ عرصہ سے یہاں ایک ایسی سازش پرورش پا رہی ہے

جس میں اقبالؒ کے نام کی آڑ میں فکر و پیغامِ اقبالؒ کو بُری طرح مسخ کیا جا رہا ہے۔ مقصد اس کا بالکل واضح ہے۔ اقبالؒ ہی نے صدیوں کے بعد اسلام کے صحیح نظریات و تصوّرات کا احیاء کیا۔ اس نے اسلام کے بنیادی مسئلہ "دو قومی نظریہ" کا تصور دیا۔ اسی نے اس فراموش کردہ حقیقت کو از سرِ نو اجاگر کیا کہ اپنی آزاد مملکت کے بغیر دین پر عمل پیرا نہیں ہوا جا سکتا۔ انہی بنیادوں پر اس نے ایک جداگانہ مملکت کا تصور پیش کیا اور پاکستان وجود میں آ گیا۔ اگر اقبالؒ کو ایک قومیت پرست، سوشلسٹ، مغرب کی سیکولر جمہوریت کے علمبردار کے پیکر میں پیش کر دیا جائے تو ظاہر ہے کہ نہ مملکتِ پاکستان کے جداگانہ وجود کی وجۂ جواز باقی رہ سکتی ہے اور نہ ہی اس خطۂ زمین میں حقیقی اسلام کے احیاء کا امکان۔ طلوعِ اسلام اس سازش کا مسلسل مقابلہ کئے چلا آ رہا ہے اور اس سلسلہ میں ضروری سمجھا گیا ہے کہ "اقبالؒ اور قرآن" کا نیا ایڈیشن بلا مزید تاخیر شائع کر دیا جائے جس میں پرویز صاحب کے اس وقت تک کے مقالات وخطابات شامل ہوں۔ ان سے آپ کو اس کا اندازہ ہو جائے گا کہ فکر و پیغامِ اقبالؒ کو مسخ کرنے کی کیا کیا کوششیں کی جا رہی ہیں اور پرویز صاحب ان کے خلاف کس طرح مصروفِ جہاد ہیں۔ اسی سے آپ اس کا بھی اندازہ لگا سکیں گے کہ اس جہاد سے مقصود "محمد اقبال" نامی ایک شخص کی مدافعت اور تائید نہیں۔ اس سے مطلوب اقبالؒ کے پیش کردہ قرآنی مسلّمات کی حقیقت کشائی ہے جو پرویز صاحب کی زندگی کا مشن ہے۔ علامہ اقبالؒ کے متعلق بہت کچھ لکھا اور کہا جا چکا ہے۔ لیکن اس نقطۂ نگاہ سے ان کے متعلق بہت کم سوچا اور کہا گیا ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ فکرِ اقبالؒ کے ساتھ ساتھ قرآنِ مجید پر بھی غائر نگاہ ہو۔ پرویز صاحب کو بفضلِ ایزدی یہ دونوں سعادات حاصل ہیں۔ اس لئے وہ اس زاویۂ نگاہ سے پیغامِ اقبالؒ کو پیش کرنے کے لئے موزوں ترین صاحبِ فکر و نظر ہیں۔ اگر آپ زیرِ نظر تالیف کا اس نگاہ سے مطالعہ کریں گے تو ہمیں امید ہے کہ آپ اسے بیحد مفید اور منفرد پائیں گے۔

پرویز صاحب کی قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کی خوش بختی ادارہ طلوعِ اسلام کے حصہ میں آئی ہے جس پر یہ جس قدر بھی فخر کرے کم ہے۔ جہاں تک ان کتابوں کے حسنِ صوری کا تعلق ہے، اس ادارہ نے اپنے سامنے ہمیشہ بلند معیار رکھا ہے۔ اس گرانی (اور بعض اعلیٰ پیمانہ کی اشیاءِ ضروریہ کی کمیابی بلکہ نایابی) کے زمانے میں اس روایتی معیار کا قائم رکھنا بڑا دشوار ہے۔ بایں ہمہ، ہم اس کی پوری پوری کوشش کرتے ہیں کہ معیار گرنے نہ پائے۔

والسلام

جون ۱۹۷۵ء

طلوعِ اسلام ٹرسٹ
۲۵/بی، گلبرگ ۲، لاہور

اقبالؒ اور قرآن

(پہلے یومِ اقبالؒ، جنوری ۱۹۳۸ء[1] کی تقریر)

تمہید باوجودیکہ قرآنِ کریم میں باعتبارِ بلاغت ہر وہ حسن موجود ہے جو ایک بہترین شعر میں ہونا چاہیئے مگر متعدد مقامات پر اس امر کی وضاحت کی گئی ہے کہ قرآن کریم شاعری نہیں۔ رسول اکرمؐ شاعر نہیں۔

وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ ۭ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ وَّقُرْاٰنٌ مُّبِيْنٌ ۙ لِّيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا وَّيَحِقَّ الْقَوْلُ عَلَي الْكٰفِرِيْنَ ۝ (۳۶/۶۹-۷۰)

اور ہم نے اس (رسول) کو شاعری نہیں سکھائی اور نہ ہی یہ اس کے شایانِ شان تھی۔ بلکہ یہ تو (زندگی کی فراموش کردہ حقیقتوں کی) یاددہانی ہے اور واضح قرآن (اور اس کا مقصد یہ ہے کہ) ہر اس شخص کو جس (کے خون میں) زندگی کی تڑپ موجود ہو (خدا کے اٹل قوانین سے) آگاہ کردے اور نہ ماننے والوں پر (ان کی ہلاکت و بربادی سے پیشتر) اتمامِ حجت ہوجائے۔

اس سے معلوم ہوگیا کہ قرآن کی رُو سے محض "شاعری" کیوں کسی پیغمبر کے شایانِ شان نہ تھی اور ایک رسول کا پیغام شعر کی تمام لطافتیں اپنے اندر رکھتے ہوئے کس طرح "شعر" سے مختلف ہوتا ہے۔ اس لئے کہ وہ پیغام جس کا سرچشمہ خدائے حیّ وقیّوم کا علمِ ازلی ہو، اس کی مابہ الامتیاز خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ قوموں کے عروقِ مُردہ میں خونِ زندگی دوڑا دے، مُردوں کی بستی میں صورِ اسرافیل پھونک دے۔

---

[1] منعقدہ لاہور۔

یہی خصوصیت ہے جس کے لئے نوعِ انسانی کو قرآن کی طرف دعوت دی جاتی ہے۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَ لِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ (۸/۲۴)

اے ماننے والو! اللہ اور اس کے رسولؐ کی دعوت پر لبیک کہا کرو، جب وہ تمہیں اس چیز کی طرف بلائے جو تمہیں زندگی بخشتی ہے۔

"شعر" اور قرآن کے اس نمایاں فرق کو دوسری جگہ یوں بیان کیا گیا ہے کہ "شاعروں" کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ

اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِيْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ ۙ وَ اَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ ۙ

(۲۶/۲۲۶ ـ ۲۲۵)

وہ یوں ہی اِدھر اُدھر صحرانوردیاں اور دشت پیمائیاں کرتے پھرتے ہیں اور ان کے قول و فعل اور قلب و زبان میں کبھی ہم آہنگی نہیں ہوتی۔

شاعر اور اقبالؒ میں فرق

ظاہر ہے کہ جس شخص کے سامنے کوئی منزلِ مقصود ہو گی، زندگی کا کوئی منتہیٰ ہو گا اس کا ہر قدم ایک خاص سمت میں اُٹھے گا، اُس کا رُخ خاص قبلۂ مقصود کی طرف ہو گا۔ برعکس اس کے جس شخص کے سامنے زندگی کا کوئی مقصد نہ ہو گا، کوئی منزلِ مقصود متعین نہ ہو گی، وہ شُترِ بے مہار کی طرح جدھر منہ اٹھائے گا چل دے گا۔ کبھی تخیلات کی اس حسین و جمیل وادی میں، کبھی تصورات کے اس ہولناک اور بھیانک صحرا میں۔ مقصد پیشِ نظر صرف گرمیٔ سخن ہو گا۔ اور اس کی خاطر اکثر و بیشتر یہی کرنا پڑے گا کہ دل کچھ محسوس کرے اور زبان کچھ کہے۔ برعکس اس کے ایک شخص ہے جس کے سامنے زندگی کا ایک خاص مقصد ہے اور وہ مقصد بھی اپنا متعین کردہ نہیں بلکہ وہ ہے جسے اس قرآنِ کریم نے متعین کیا ہے جس پر اس کا ایمان ہے۔ ایمان کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنے قلب و دماغ، اپنے جذبات و افکار کو اس چیز کے تابع رکھے جس پر اس کا ایمان ہے۔ وہ سوچے تو اس کی مدد سے، سمجھے تو اس کی روشنی میں، دیکھے تو اُس کے نور سے، وہ حقائق کو پرکھے تو اسی کسوٹی پر، اور قبول کرے تو اسی کو جو اس کی رُو سے قبول کئے جانے کے قابل ہو اور رد کرے تو اس کو جو اس کے نزدیک مردود ہو۔ اب اگر ایسا مردِ مومن اپنے خیالات کو (جو دراصل قرآنِ پاک ہی کے حقائق ہوں گے) زبانِ شعر سے ادا کرے تو مومنین کے اس زمرہ میں آ جائے گا جس کا ذکر قرآنِ کریم نے اس آیت میں کیا ہے جو مذکورہ صدر آیت سے متصل ہے۔

اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ ذَكَرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّ انْتَصَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا ...... (۲۶/۲۲۷)

مگر وہ لوگ جو ایمان لاتے ہیں اعمالِ صالحہ کرتے ہیں اور قوانین خداوندی کو ہمیشہ اپنے سامنے رکھتے ہیں اور اپنی مدافعت اس وقت کرتے ہیں جب ان پر زیادتی کی گئی ہو۔

اقبالؒ اسی زمرہ میں شامل ہے اور علوم حاضرہ کے متعلق فکر اور قرآن فہمی کی جن بلندیوں پر وہ پہنچ چکا تھا' ان کی رُو سے بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ عالم اسلام نے اس سے پہلے کبھی ایسا مفکر پیدا نہیں کیا۔ لہٰذا، اگر یہ درست ہے کہ کسی مفکر کے پیام میں عروسِ معنی کو بے نقاب دیکھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ پہلے ان جذبات و خیالات کی تہ تک پہنچا جائے جس پر اس کی فکر کی اساس ہے اور اس سرچشمہ سے واقفیت حاصل کی جائے جو اس کے تخیلات کا ماخذ ہے تو بلا تکلف کہا جا سکتا ہے کہ اقبالؒ کا کلام کما حقہٗ سمجھ میں نہیں آ سکتا جب تک قرآن کریم نگاہوں کے سامنے نہ ہو۔ جو اس زاویہ نگاہ سے پیغامِ اقبالؒ کو دیکھے گا وہ جہاں ایک طرف یہ محسوس کرے گا کہ قرآن کریم انسان کو کن بلندیوں تک لے جاتا ہے، دوسری طرف یہ بھی دیکھ لے گا کہ حضرتِ علامہ قرآنِ کریم کے ان حقائق اور ادق مسائل کو کس خوبصورتی سے ایک شعر میں حل کر کے رکھ دیتے ہیں۔ میں نے بھی اپنے ایامِ جاہلیت میں اقبالؒ کو محض ایک "شاعر" کی حیثیت ہی سے دیکھا اور ان کے کلام سے محض "شاعری" ہی کا لطف اٹھایا تھا۔ لیکن جب یہ حقیقت

سرچشمۂ فکرِ اقبالؒ

سامنے آ گئی کہ کلام اقبالؒ کا سرچشمہ کیا ہے تو اس کے بعد ان کی شاعری کی نوعیت ہی بدل گئی اور پھر سمجھ میں آیا کہ اقبالؒ کیا کہتا ہے، کیوں کہتا ہے اور کیسے کہتا ہے۔ اور یہ راز بھی کھل گیا کہ وہ کون سی شاعری ہے جس کے متعلق قرآن کریم نے کہا ہے کہ اس کا اتباع راہ گم کردہ لوگ ہی کیا کرتے ہیں۔ وَ الشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ ؕ (۲۶/۲۲۴) اور وہ کون سی ہے جو اس منزلِ مقصود کے لئے چراغ راہ کا کام دیتی ہے جس کی طرف صراطِ مستقیم لے جاتا ہے۔ ایسے شاعر کے متعلق حضرت علامہ فرماتے ہیں۔

شاعر اندر سینۂ ملت چو دل ملتے بے شاعرے انبارِ گل

سوز و مستی نقشبندِ عالمے است

شاعری بے سوز و مستی ماتمے است

شعر را مقصود اگر آدم گری است   شاعری ہم وارثِ پیغمبری است

بہرکیف یہ ہے وہ انداز جس سے میں نے حضرت علامہ کے کلام کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ میں نے قرآنِ کریم کو جس نوعیت سے سمجھا ہے اس کی اجمالی سی کیفیت آپ کو معارف القرآن کے ان حصّوں سے معلوم ہو گئی ہو گی جو اس وقت تک شائع ہو چکے ہیں[1]۔ قرآن فہمی کے اس اسلوب کی طرف میری رہنمائی کرنے میں جن گراں مایہ ہستیوں کے بارِ احسان سے میری گردنِ تشکر ہمیشہ نگوں سار رہے گی۔ ان میں حضرت علامہ اقبالؒ کی ذاتِ گرامی ایک ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔ بارہا ایسا ہوا کہ میں قرآنِ کریم کے کسی مشکل مقام پر جا کر رُک گیا تو علامہ کے ایک شعر نے ذہن میں بجلی کی سی ایسی چمک پیدا کر دی جس سے صحیح راستہ فوراً نگاہ کے سامنے آ گیا۔ دوسری طرف ایسا بھی ہوا کہ حضرت علامہ کے کسی شعر کے متعلق اُلجھاؤ پیدا ہوا تو کسی آیتِ قرآنی نے اپنے "سمسم" کے اعجاز سے قفلِ ابہام کو کھول دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت علامہ کی صحیح عظمت ہی اس میں ہے کہ انہوں نے اس دَور میں جب کہ مسلمان قرآنِ کریم سے بہت دُور جا چکے تھے، ان کے سامنے قرآنی تعلیم کو اس حسین و دلکش انداز میں پیش کیا کہ سعید روحیں اپنے بربطِ ہستی کے تاروں اور اس سازِ نغمۂ الست کے پردوں میں ایک کھوئی ہوئی ہم آہنگی یوں محسوس کرنے لگیں جیسے اِن کوہسار کی چاندنی رات میں دُور سے بنسری کی ہلکی ہلکی آواز کسی بھولے ہوئے افسانہ کی یاد تازہ کر دیتی ہے۔

قوم کے نوجوانوں کو مذہب سے چڑ سی ہو چکی تھی اور مذہب پرست طبقہ ان کے کھلے ہوئے الحاد اور دہریّت کی وجہ سے ان کی طرف سے مایوس ہو چکا تھا۔ حضرت علامہ نے دینؔ کو ایسے انداز میں پیش کیا کہ اس کی رُوح پھر سے ان کے خون کے ذرّوں میں جذب ہو گئی اور اس طرح وہ غیر محسوس طور پر قرآنِ کریم کے قریب لا کر کھڑے کر دیئے گئے۔ میں نے اکثر دیکھا ہے کہ ایک تعلیم یافتہ نوجوان جو مذہب سے بیگانہ ہی نہیں بلکہ متنفر ہو چکا ہو لیکن کلامِ اقبالؒ سے اسے کچھ ذوق ہو اس کے سامنے اگر قرآنِ کریم کو اس کی اصلی شکل میں پیش کر دیا جائے تو وہ اسے ایک جانی پہچانی ہوئی حقیقت محسوس کرنے لگتا ہے۔

---

[1] معارف القرآن کی حسبِ ذیل مجلدات اب تک شائع ہو چکی ہیں۔ ابلیس و آدم، جوئے نور، برقِ طور، شعلۂ مستور، معراجِ انسانیت، جہانِ فردا، من و یزداں، کتاب التقدیر وغیرہ۔

جب حقیقت یہ ہے کہ اقبالؒ کا پورا پیام قرآنِ حکیم ہی کی تعلیم کی تفسیر ہے تو پیامِ اقبالؒ پر قرآنِ کریم کی روشنی میں تمام و کمال تبصرہ ناممکن ہے جب تک پورے کا پورا قرآن سامنے نہ لایا جائے۔ اس مقصدِ جلیلہ کے لئے میں نے معارف القرآن کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ اس وقت قرآن کی اساسی تعلیم کے ایک آدھ گوشہ پر طائرانہ سی نگاہ ڈالی جاسکے گی۔ اس سے آپ کو اندازہ ہو سکے گا کہ اقبالؒ کا پیام کس طرح قرآنی حقائق کو اپنے جاذب و دلکش انداز میں پیش کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس نقطۂ نگاہ سے پیامِ اقبالؒ کا تجزیہ دقت کی ایک اہم ضرورت ہے۔ یہ ضرورت میرے پیشِ نظر ہے اور اگر توفیقِ ایزدی نے میری یاوری کی تو معارف القرآن کی تکمیل کے بعد اس طرف بھی توجہ دوں گا۔ واقعہ یہ ہے کہ میں اپنی قرآن فہمی کے لئے جس قدر حضرت علامہ کی بصیرت کا رہینِ منت ہوں، اس کے سپاس گذاری کے تقاضے سے میں اپنے اوپر یہ فرض سمجھتا ہوں کہ میں اقبالؒ کے پورے پیغام کو قرآن کی روشنی میں پیش کروں، میں اللہ سے دُعا کرتا ہوں کہ وہ مجھے اس اہم فریضہ سے سبکدوش ہونے کی ہمت اور فرصت عطا فرمائے۔

اگر کوئی شخص قرآنِ کریم کی بنیادی تعلیم کو دو لفظوں میں بیان کرنا چاہے تو وہ نہایت اطمینان سے کہہ سکتا ہے کہ قرآنِ کریم جو پیغام نوعِ انسانی کو دیتا ہے وہ ہے لَا اِلٰہَ ـــ اِلَّا اللّٰہُ۔ اس کلمہ کے دو حصے ہیں۔ ایک سلبی

لَا اِلٰہَ ـــ اِلَّا اللّٰہُ

یعنی اس امر کا یقین، اس حقیقت کا اعتراف کہ دنیا میں کوئی طاقت ایسی نہیں جس کے سامنے سر جھکایا جائے، جس کی غلامی اختیار کی جائے، جسے آقا تسلیم کیا جائے، جسے اپنی حاجات کا قبلۂ مقصود سمجھا جائے، جس کے قانون کو اپنی زندگی کا ضابطہ بنایا جائے۔ یہ نفی کا پہلو ہے۔ تخریبی پہلو ہے۔ یعنی جو کچھ پہلے ذہن میں موجود ہے اسے مٹا دینا ہوگا، بھلا دینا ہوگا۔ جب زمین یوں صاف ہو جائے تو پھر اس پر ایک نئی عمارت تعمیر ہوگی۔ پھر ایجابی پہلو آئے گا۔ تمام قوتوں کے انکار کے بعد اس امر کا اقرار آئے گا کہ ہاں! مگر ایک قوت ایسی ہے جس کی غلامی اختیار کرنا ضروری ہے۔ جس کے قانون کے سامنے جھکنا زیبا ہے اور جسے اللہ کہتے ہیں۔ تمام قوتوں کو راستے سے ہٹا کر یوں خدا اور بندے کا براہِ راست تعلق پیدا کر دینا یہ ہے قرآنِ کریم کی تعلیم۔ دنیا

ہیں اس تعلیم کو سب سے پہلے ایک منضبط شکل میں پیش کرنے والے حضرت خلیل اللہ تھے۔ ان کی حیاتِ مقدسہ کا یہ اہم واقعہ سب کو معلوم ہے کہ کس طرح انہوں نے اپنی قوم کے صنم کدہ میں بُتوں کو پہلے توڑا اور اس کے بعد خدائے واحد کی طرف دعوت دی[1]۔ پہلا قدم لَآ اِلٰہ تھا اور اس کے بعد اِلَّا اللہ۔ جب تک مکان خالی نہ ہو، نیا مکین آ کر نہیں بستا۔ اس حقیقت کے متعلق حضرت علامہ فرماتے ہیں۔

صنم کدہ ہے جہاں اور مردِ حق ہے خلیل
یہ نکتہ وہ ہے جو پوشیدہ لَآ اِلٰہ میں ہے

اسی لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہُ کی تفسیر سورۂ بقرہ میں یوں آئی ہے۔

فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى لَا انْفِصَامَ لَهَا (۲/۲۵۶)

جو شخص ہر سرکش قوت کا انکار کر کے فقط ایک اللہ پر ایمان رکھتا ہے اس نے ایک ایسے مضبوط سررشتہ کو تھام لیا جو کبھی ٹوٹ نہیں سکتا۔

اسی کفر بالطاغوت اور ایمان باللہ سے ایک شخص مسلم بنتا ہے۔

بیا کہ مثلِ خلیل ایں طلسم در شکنیم　　　که جز تو ہر چہ دریں دیر دیدہ ام صنم است

شرک کے متعلق بالعموم یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ کسی پتھر کی مورتی کے سامنے جُھک جانے کا نام ہے اور بس۔ لیکن قرآنِ کریم کی رُو سے شرک یہی نہیں بلکہ اللہ کے سوا جو طاقت بھی ہو، اس کے سامنے جُھک جانے کا نام شرک ہے۔ اور یہ قوتیں وہ بُت ہیں جن کی تعمیر کسی سنگ تراش کے ہاں نہیں ہوتی یہ خود ذہنِ انسانی کے کارخانے میں ڈھلتے ہیں۔ ان کا مسکن کوئی مندر نہیں ہوتا خود قلبِ انسانی ہوتا ہے۔ مال و اولاد کا بُت، عزت و جاہ کا بُت، دولت و ثروت کا بُت، حکومت و سلطنت کا بُت، ملک و نسب کا بُت۔ اور نہ معلوم کون کون سے لات و منات اور کون کون سے ہبل و عزیٰ ہیں جو ہر آن اس کے جلوۂ دماغ میں تراشتے رہتے ہیں جن کے سامنے کھڑا یہ کانپتا ہے، لرزتا ہے، گڑگڑاتا ہے، سجدے کرتا ہے، ماتھے رگڑتا ہے۔ یہ ہیں وہ بُت جن کے متعلق حضرت علامہ فرماتے ہیں۔

رہ مدہ در کعبہ اے پیرِ حرم اقبال را　　　ہر زماں در آستیں دارد خداوندے دگر

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے، جوئے نور۔

یہ بُت انسان کی خواہشات کے پیدا کردہ ہوتے ہیں اور یہ ہے شرک کی وہ خوفناک اور بھیانک گھاٹی جہاں سے پھسل کر انسان سیدھا ہلاکت اور بربادیوں کے ہولناک جہنم میں گر جاتا ہے۔ قرآنِ کریم نے اسی شرک کے متعلق فرمایا ہے۔

اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ وَ اَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ۔۔(۴۵/۲۳)

(کیا تُو نے اس کو بھی دیکھا جس نے اپنی خواہشات کو ہی اپنا معبود بنا لیا؟ یہ ہے وہ جسے خدا کے قانونِ ہدایت نے باوجود علم و عقل کے سیدھے راستے سے ہٹا دیا۔

کہ علم کا تقاضا تھا کہ وہ حق و باطل میں امتیاز کرتا لیکن جب جذبات عقل پر غالب آجائیں جب خواہشات دماغ پر قابو پالیں تو پھر علم و عقل کبھی صحیح راستہ کی طرف رہنمائی نہیں کرسکتے۔ یہی وہ بُت ہیں جن کی وجہ سے انسان قدم قدم پر ٹھوکر کھاتا ہے۔ فرماتے ہیں۔

می تراشد فکرِ ما ہر دم خداوندے دِگر
رست از یک بند تا افتاد در بندے دِگر

ایک زنجیر سے اس کا پاؤں نکالا جاتا ہے تو یہ اُسے دوسری میں الجھا دیتا ہے۔ ایک کی غلامی کا طوق اس کے گلے سے اتارا جاتا ہے تو یہ دوسرے کی غلامی کا طوق پہن لیتا ہے حالانکہ جس رسولِ اکرمؐ کی امت ہونے کا یہ مدعی ہے' ان کی بعثت کا مقصد ہی ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

وَ يَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَ الْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ ؕ (۷/۱۵۷)

وہ انسانوں کے طوق و سلاسل اتارنے کے لئے بھیجا گیا ہے۔ ان کے بوجھ ہلکے کرنے اور ان کے پاؤں سے زنجیریں اتروانے کے لئے۔

لیکن اس کی کیفیت یہ ہے کہ:۔

فکرِ انساں بُت پرستے بُت گرے — ہر زماں در جستجوئے پیکرے
باز طرحِ آذری انداخت است — تازہ تر پروردگارے ساخت است
کاید از خوں ریختن اندر طرب — نام او رنگ است و ہم ملک و نسب
بر سرِ ایں باطلِ حق پیرہن — تیغِ لَا مَوْجُوْدَ اِلَّا هُوْ بزن

جب تک دماغ سے ان غیر خدائی قوتوں کو نکالا نہ جائے، خدا کا صحیح تصور ذہن میں نہیں آسکتا۔ جب تک

لوحِ قلب صاف نہ ہو توحید کے حروف و نقوش اس پر لکھے نہیں جا سکتے۔ فرماتے ہیں۔

بیاں میں نکتۂ توحید آ تو سکتا ہے — ترے دماغ میں بتخانہ ہو تو کیا کہیے

یہی منفی اور مثبت کے دو ٹکڑے ہیں جن کے جوڑنے سے کلمۂ توحید بن سکتا ہے۔ جب تک آپ دوسرے آقاؤں

نفی اور اثبات

سے رُخ نہیں موڑ لیتے نئے آقا کی غلامی اختیار نہیں کر سکتے جب تک اس پرانی دنیا کو ویران نہیں کیا جاتا، جہانِ نَو کی تعمیر نہیں ہو سکتی۔ جب تک اس زنگ کو اتارا نہیں جاتا تلوار پر نئی آب نہیں چڑھ سکتی۔ رموز میں ارشاد ہے۔

آتشے افروز از خاشاکِ خویش — شعلۂ تعمیر کن از خاکِ خویش

اس کو برنگِ ریختہ یوں بیان کیا گیا ہے۔

شعلہ بن کر پھونک دے خاشاکِ غیر اللہ کو
خوفِ باطل کیا کہ غارت گرِ باطل بھی تو

حق آنے سے باطل خود بخود فنا ہو جاتا ہے۔ اندھیرے کی فطرت ہی یہ ہے کہ جب چراغ آجائے تو اندھیرا گھر چھوڑ جائے۔

قُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَ زَهَقَ الْبَاطِلُ ؕ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا ۝ (۱۷/۸۱)

کہیے کہ حق آیا اور باطل غائب ہو گیا۔ باطل تو بنا ہی اس لئے ہے کہ فنا ہو جائے۔

پھر یہ بھی دیکھئے کہ اس فروغِ حق کے لئے کرنا کیا چاہیئے۔ فرمایا۔

ہو صداقت کیلئے جس دل میں مرنے کی تڑپ — پہلے اپنے پیکرِ خاکی میں جاں پیدا کرے
پھونک ڈالے یہ زمین و آسمانِ مستعار — اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے
زندگی کی قوتِ پنہاں کو کر دے آشکار — تا یہ چنگاری فروغِ جاوداں پیدا کرے

حضرت علامہ کے کلام میں ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان کے الفاظ کے انتخاب میں جہاں "حسنِ شعریت" ملحوظ ہوتا ہے، وہاں یہ حقیقت بھی پیشِ نظر رہتی ہے کہ ان الفاظ کا استعمال محض برائے "وزنِ بیت" نہ ہو بلکہ غور سے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے الفاظ بھی قرآنِ کریم کے مختلف حقائق کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ اگر میں اس لحاظ سے ان کے اشعار اور اشعار کے الفاظ کی تشریح کرنے لگوں تو ظاہر ہے کہ ؏

سفینہ چاہیئے اس بحرِ بیکراں کے لئے

ہر چند جی چاہتا ہے کہ ایسا بھی ہوتا کہ ان کے کلام کی عظمت پورے طور پر سامنے آجائے لیکن عدم گنجائش مانع ہے۔ مثال کے طور پر مذکورہ صدر اشعار کے پہلے شعر میں "صداقت کے لئے مرنے کی تڑپ" کا ذکر ہے، بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ یہ شوکتِ الفاظ شعر میں حرارت پیدا کرنے کے لئے ہے لیکن حقیقت اس سے کہیں بلند ہے۔ نبیِ اکرمؐ کے سامنے یہود وغیرہ بہت سی حجتیں پیش کرتے۔ بحث وجدل کا تقاضا کرتے۔ لیکن قرآنِ کریم نے سچے اور جھوٹے کی پہچان کے لئے ایک اور ہی معیار پیش کر دیا اور چیلنج دے دیا کہ آؤ اس کسوٹی پر پورے اترو۔ فرمایا۔

معیارِ صداقت

فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (۲/۹۴)

اگر تم سچے ہو تو موت کی تمنا کر کے دکھاؤ۔ مرنے کی تڑپ پیدا کرو۔ یہ ہے صداقت کی پہچان۔

دیکھئے حضرت علامہ اس حقیقت کو ایک مصرع میں کس خوبصورتی سے بیان کر گئے ہیں۔ دوسرے مصرع میں "پیکرِ خاکی میں جاں" پیدا کرنے کے الفاظ آئے ہیں۔ لیکن ان کی تشریح کے لئے مجھے قرآنِ کریم کی روشنی میں پورے نظریۂ ارتقاء (THEORY OF EVOLUTION) کو بیان کرنا ہوگا اس لئے اس مقام پر اس کی تفصیل سے اجتناب کرتا ہوں[ؒ]۔

ہاں تو کہا یہ جا رہا تھا کہ جب لَا کی تخریب کے بعد اِلَّا کی تعمیر کی جائے، تب آپ کہہ سکتے ہیں کہ آپ ایک قدم آگے بڑھے ہیں۔ دورِ حاضرہ جو یکسر اضطراب اور عدمِ اطمینان کا دور ہے، اپنی ہر روش پر لَا ہی لَا کا مسلک اختیار کئے جا رہا ہے اور اس تخریب کو جہادِ زندگی سمجھ رہا ہے حالانکہ یہ محض استہلاک (DESTRUCTION)، ہے تعمیر (CONSTRUCTION) نہیں۔ مذہبی معتقدات، اخلاقی اصول، سوسائٹی کی مسلّمہ روایات سب اسی سیلابِ لَا کی نذر ہو چکے ہیں اور اس کے بعد اِلَّا کی تعمیر کہیں شروع نہیں ہوئی۔ حالانکہ تخریب سے غرض ہی ایک نئی تعمیر ہوتی ہے۔ فرماتے ہیں۔

فضائے نور میں کرتا نہ شاخ و برگ و بر پیدا سفر خاکی شبستاں سے نہ کر سکتا اگر دانہ
نہادِ زندگی میں ابتدا لَا انتہا اِلَّا پیامِ موت ہے جب لَا ہوا اِلَّا سے بیگانہ

[ؒ] تفصیل کے لئے دیکھئے "ابلیس و آدم"۔

عصرِ حاضر کے متعلق ارشاد ہے۔

لبالب شیشۂ تہذیبِ حاضر ہے مے لَا سے مگر ساقی کے ہاتھوں میں نہیں پیمانۂ اِلَّا

روس اس لَا کے جنون میں سب سے زیادہ شدت سے گرفتار ہے۔ اشتراکیت کی بنیاد ہی نفی سے شروع ہوتی ہے۔ خدا کی نفی، کلیسا کی نفی، ملوکیت کی نفی، حکومت کی نفی (یعنی کمیونزم کے انتہائی دور میں) عائلی زندگی کی نفی۔ تدبیرِ منازل کی نفی۔ اس میں شبہ نہیں کہ بعض چیزوں کی نفی تھی بھی ضروری۔ لیکن محض نفی سے تو کام نہیں چل سکتا۔ نفی کے بعد اثبات کی بھی تو ضرورت تھی۔ توہمات کو چھوڑیئے تو حقائق پر ایمان لایئے۔ یہ تفریط (EXTREMISM) اس یکسر کفر (انکار) ہی کا تو نتیجہ ہے کہ دنیا بھر میں[1] انقلاب کے مدعی خود اپنے اصولوں میں اس قدر عجلت سے تبدیلیاں پیدا کر رہے ہیں کہ باریک بیں نگاہیں دیکھ رہی ہیں کہ کچھ عرصے کے بعد وہ پھر وہیں پہنچ جائیں گے جہاں سے چلے تھے۔ روس کے متعلق ارشاد ہے۔

اشتراکیت کا بحرانِ نفی

کردہ ام اندر مقاماتش نگہ لَا سلاطیں، لَا کلیسا، لَا اِلٰہ
فکرِ اُو در تند بادِ لَا بماند مرکبِ خود را سوئے اِلَّا نراند
آیدش روزے کہ از زورِ جنوں خویش را زیں تند باد آرد بروں
در مقامِ لَا نیا ساید حیات سوئے اِلَّا می خرامد کائنات
لَا و اِلَّا ساز و برگِ اُمتاں نفیِ بے اثبات مرگِ اُمتاں

دو ہی صفحے پہلے ہے۔

نکتہ می گویم از مردانِ حال اُمتاں را لَا جلال اِلَّا جمال
لَا و اِلَّا احتسابِ کائنات لَا و اِلَّا فتحِ بابِ کائنات
ہر دو تقدیرِ جہاں کاف و نوں حرکت از لَا زاید از اِلَّا سکوں

اس آخری مصرع کو غور سے دیکھئے جب تک قومیں لَا کے بحران میں رہتی ہیں، عدمِ سکون و فقدانِ طمانیت کے گرداب میں چکر کھاتی ہیں کسی محکم چٹان پر ان کا قدم نہیں جمتا۔ آج ایک نظریہ قائم ہوتا ہے۔ دنیا میں شور

---

[1] روس تو اب قریب قریب پھر نظامِ سرمایہ داری تک پہنچ رہا ہے۔

مچ جاتا ہے کہ بس وہ مداوا ہاتھ آگیا جس سے تمام دنیا کے دُکھ درد دُور ہو جائیں گے۔ ابھی چار قدم بھی اس کی روشنی میں چلنے نہیں پاتے کہ معلوم ہو جاتا ہے کہ جسے تریاق سمجھ رہے تھے وہ زہر ہے۔ جسے چشمۂ حیوان تصور کئے بیٹھے تھے وہ سراب ہے۔ اسے ڈھا دیا جاتا ہے اور پہلے کی طرح ایک اور فریب تیار کر لیا جاتا ہے۔ دو چار قدم اس کی روشنی میں چلتے ہیں پھر اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارنے لگ جاتے ہیں ـــــ كُلَّمَآ اَضَاءَ لَهُمْ مَّشَوْا فِيْهِ ۙ وَ اِذَآ اَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوْا ؕ (۲/۲۰) جب ذرا بجلی چمک پڑتی ہے تو اس میں دو قدم چل لیتے ہیں اور جب وہ روشنی غائب ہو جاتی ہے تو پھر کھڑے ہو کر آسمان کی طرف تکنے لگ جاتے ہیں۔ یہ ہے متذبذب زندگی کا وہ جہنم جس میں آج ساری دنیا گرفتار ہے اور یہ نتیجہ ہے اِلّا کے نہ ہونے کا ـ اس عملی شرک کا ـ قرآن کریم میں ہے۔

وَ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ اَوْ تَهْوِيْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ مَكَانٍ سَحِيْقٍ ۝ (۲۲/۳۱)

جو اللہ سے شرک کرتا ہے اس کی حالت یوں سمجھئے گویا وہ آسمان کی بلندیوں سے زمین کی پستیوں پر آگرا۔ یا جیسے (مرغی کے چوزے کو) کوئی (عقابی پنجوں والا) پرندہ اُچک کر لے جائے۔ یا جیسے تند و تیز ہوا کے جھونکے (پرکاہ کی طرح) اسے کسی دور دراز مقام پر پھینک دیں۔

گویا اس نظام کا مرکزِ ثقل گم ہو جاتا ہے جس میں لَا ہی لَا ہو، اِلَّا نہ ہو۔ وہاں حرکت ہی حرکت ہوتی ہے ـ سکون نہیں ہوتا۔ اسے کہیں جم کر کھڑے ہونے کے لئے جگہ نہیں ملتی۔ اسی لئے فرماتے ہیں کہ

بخود خزیدہ و محکم چوں کوہساراں زی　　　مزی چوں خس کہ ہوا تند و شعلہ بیباک است

اس تعمیر کا سبق وہ ملّتِ اسلامیہ کے ان نوجوانوں کو دیتے ہیں جو لاعلمی کی وجہ سے اس قسم کی نفی کی طغیانیوں میں بہے چلے جا رہے ہیں۔

کہنہ را در شکن و باز بہ تعمیر خرام　　　ہر کہ در ورطۂ لَا ماند بہ اِلَّا نرسید

اور ان مسلمانوں کو جو ہزار ہزار دانے کی تسبیح پڑھنے کے باوجود لَا اِلٰہ ـــ اِلَّا اللّٰہ کے معنی نہیں سمجھتے پھر سے یہ بھولا ہوا سبق یاد دلاتے ہیں کہ

کافرا دلِ آوارہ دگر بارہ باو بند　　　بر خویش کشا دیدہ و از غیر فرو بند

دیدن دگر آموز ندیدن دگر آموز

پھر سے سیکھ کہ لَا کہاں تک جائے گا اور اِلَّا کہاں سے شروع ہوگا۔

جب تک انسان لَا کے بھنور میں رہتا ہے وہم و قیاس آرائیوں کا تختۂ مشق بنا رہتا ہے۔ اور آپ سمجھ

خدا کا دستِ قدرت

سکتے ہیں کہ اس تذبذب اور گمان میں قلبِ انسانی کس جہنّم میں رہتا ہے' اطمینان و سکون' یقین میں ہے اور یقین پیدا نہیں ہو سکتا جب تک اس سلبی لَا کے بعد ایجابی اِلَّا نہ آجائے۔ اس کیفیت کے متعلق فرماتے ہیں۔

خدائے لم یزل کا دستِ قدرت تو زباں تو ہے
یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گماں تو ہے

مومن خدائے لم یزل کا دستِ قدرت کیسے بنتا ہے' اس کی تفسیر دیکھنی ہو تو قرآن کریم میں واقعۂ بدر دیکھئے۔ کہتے ہیں کہ واٹرلو کی لڑائی نے یورپ کی تاریخ بدل دی۔ لیکن جن کی نگاہیں دُور رس اور دقیقہ شناسِ واقعہ ہوتی ہیں ان کے سامنے یہ حقیقت بے نقاب ہے کہ بدر کی لڑائی نے دنیا کی تاریخ بدل ڈالی۔ اگر اس وقت خدا نکردہ مسلمان مجاہدین کی وہ مٹھی بھر جماعت جو اونٹوں کی پسلیاں اور کھجوروں کی ٹہنیاں لے کر سربکف میدان میں آگئی تھی کہیں ضائع ہو جاتی تو آج دنیا پر توہم پرستی کے گھناؤنے بادل منڈلا رہے ہوتے اور کوئی نہ جانتا کہ علم و عقل' شعور و ادراک' حکمت و فلسفہ کیا شے ہے اور کوئی نہ پہچانتا کہ انسان کی اس دنیا میں صحیح پوزیشن کیا ہے۔ آج نہ اقبال ہوتا نہ اقبال کے یہ قلب و دماغ میں چمک پیدا کرنے والے حقائق اور روح میں برقِ تپاں بن کر دوڑ جانے والے شعر۔ ہاں تو اس بدر کی لڑائی میں جب کہ تین سو بارہ بظاہر بے کس و بے بس مسلمانوں کا مقابلہ قوت اور سامان کے ہجوم کے ساتھ تھا۔ مومنین کے دست و بازو خدا کے ہاتھ بنے۔ فرمایا کہ

فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ ۪ وَ مَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى ۚ (۸/۱۷)

تم نے ان دشمنوں کو قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے قتل کیا ہے۔ تم نے تیر اندازی نہیں کی بلکہ وہ تو اللہ نے کی ہے۔ (تلواریں تمہاری تھیں اور ان میں بجلیاں ہمارے غضب کی کوندر ہی تھیں۔ تیر تمہارے تھے اور ان کی انیوں کے ساتھ قضائیں ہماری لپٹ رہی تھیں)۔

یہ تھے وہ دست و بازو جن کے متعلق فرمایا کہ

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زورِ بازو کا   نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

لیکن برعکس یقین کے جو شخص مغلوبِ گماں رہتا ہے. جو ایمانِ محکم کی بجائے تذبذب و وساوس میں الجھا رہتا ہے. اس کی تمام محنتیں اکارت جاتی ہیں. تمام کوششیں ضائع ہو جاتی ہیں. تمام ساز و سامان، تمام جیوش و عساکر، دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں. بعینہٖ جس طرح کانپتے ہوئے ہاتھوں سے گولی چلانے والا اپنا کارتوس بھی ضائع کر دیتا ہے.

وَمَنْ يَّكْفُرْ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ ز (۵/۵)

جس نے ایمان و یقین سے انکار کیا تو اس کے تمام اعمال ضائع ہو گئے.

لیکن جب اس میں ایمان پیدا ہو جائے تو پھر انہی بازوؤں کی پرواز حدود فراموش اور انہی ہاتھوں کی قوتیں وسعت ناآشنا ہو جاتی ہیں.

جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا
تو کر لیتا ہے یہ بال و پرِ روح الامیں پیدا

قرآنِ کریم میں انہی لوگوں کے متعلق ہے کہ

اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ۝ (۴۱/۳۰)

یقیناً وہ لوگ جنہوں نے کہہ دیا کہ ہمارا رب اللہ ہے اور پھر اس یقین پر جم کر کھڑے ہو گئے تو ان پر خدا کے فرشتے نازل ہوتے ہیں (جو انہیں بشارت دیتے ہیں کہ) مت ڈرو، بالکل نہ گھبراؤ. تمہارے لئے خوشخبری ہے اس جنت کی جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے.

جب انسان میں ایمان و یقین کی یہ کیفیت پیدا ہو جاتی ہے تو پھر اس کی نگاہ کا زاویہ بدل جاتا ہے. وہ ہر ایک شے کو نئے نئے انداز سے دیکھتا ہے. اس کی آنکھ پر کسی خارجی اثر کا رنگین چشمہ نہیں ہوتا. گویا وہ ہر چیز کو اپنی نگاہ سے دیکھتا ہے. یہاں پہنچ کر حضرت علامہ فرماتے ہیں.

میانِ آب و گل خلوت گزیدم   ز افلاطون و فارابی بریدم
نکردم از کسے دریوزۂ چشم   جہاں را جز بہ چشمِ خود ندیدم

قرآنِ کریم نے علم کی تعریف یہ کی ہے کہ وہ سمع، بصر اور قلب کی شہادت سے حاصل ہوتا ہے.

لَا تَقْفُ مَا لَیْسَ لَکَ بِهٖ عِلْمٌ ؕ اِنَّ السَّمْعَ وَ الْبَصَرَ وَ الْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِکَ کَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا ؕ (۱۷/۳۶)

جس چیز کا تمہیں علم نہ ہو اس کے پیچھے مت لگو۔ یاد رکھو سمع، بصر اور قلب ہر ایک کی بابت پرسش ہو گی۔

علم و عقل

پوچھا جائے گا کہ جس چیز کو تم نے بطورِ علم کے تسلیم کیا تھا اسے تم نے سماعت و بصارت کی رُو سے، تجربات و مشاہدات کے ذریعے پرکھ کر دیکھ لیا تھا کہ واقعی یقینی شے ہے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ تمہارے قلبِ سلیم کو بھی اپیل کرتا تھا۔ اس کے برعکس، ان ذرائع سے کام نہ لینے والے کو قرآنِ کریم نے جہنمی قرار دیا ہے۔

لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا یَفْقَهُوْنَ بِهَا ؗ وَ لَهُمْ اَعْیُنٌ لَّا یُبْصِرُوْنَ بِهَا ؗ وَ لَهُمْ اٰذَانٌ لَّا یَسْمَعُوْنَ بِهَا ؕ اُولٰٓئِکَ کَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ؕ (۷/۱۷۹)

وہ لوگ جو دل و دماغ رکھتے ہیں لیکن ان سے سمجھنے کا کام نہیں لیتے۔ آنکھیں رکھتے ہیں لیکن ان سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے۔ کان رکھتے ہیں لیکن ان سے سننے کا کام نہیں لیتے، تو یہ بالکل ڈھور ڈنگر ہیں بلکہ ان سے بھی گئے گزرے۔ ان سے بھی زیادہ بے راہ رو۔

بیکن نے علم کے متعلق یہی نظریہ استقراء پیش کیا اور یورپ کی کایا پلٹ دی۔ اور قرآنِ کریم نے چودہ سو برس پیشتر علم کی یہی تعریف بیان فرمائی۔ لیکن قرونِ اُولیٰ کے بعد مسلمانوں نے اسے غلاف اڑھا کر اونچے اونچے طاقوں میں نہایت ادب و تعظیم سے رکھ چھوڑا اور خود اندھوں کی طرح دوسروں کی لکڑی کے سہارے چلتے گئے کہ وہ گڑھے میں گریں تو یہ بھی ساتھ ہی جائیں۔

حضرت علامہ، علم کی اس قرآنی تعریف کے متعلق فرماتے ہیں کہ "جہاں را جز بہ چشمِ خود ندیدم"۔ اسی "چشمِ خود" کے متعلق 'ضربِ کلیم' میں ہے۔

دیکھے تو زمانے کو اگر اپنی نظر سے	افلاک منور ہوں ترے نورِ سحر سے
خورشید کرے کسبِ ضیا تیرے شرر سے	ظاہر تری تقدیر ہو سیمائے قمر سے
دریا متلاطم ہوں تری موجِ گہر سے	شرمندہ ہو فطرت ترے اعجازِ ہنر سے
اغیار کے افکار و تخیل کی گدائی	کیا تجھ کو نہیں اپنی خودی تک بھی رسائی

یہ ہے جہان کو اپنی نظر سے دیکھنا۔ یہ کیفیت پیدا ہو جائے تو پھر دیکھئے کہ آپ کی دنیا میں کیسا تحیّر انگیز انقلاب پیدا ہو جاتا ہے۔ نگاہ کے بدل جانے سے ہر شے کی نوعیت بدل جاتی ہے۔ دنیا کا نقشہ بدل جاتا ہے۔ اشیاء کی قیمتیں بدل جاتی ہیں اور قرآنِ کریم کے الفاظ میں یَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَیْرَ الْاَرْضِ وَ السَّمٰوٰتِ۔ یہ زمین بدل جاتی ہے، یہ آسمان بدل جاتا ہے۔ فرماتے ہیں۔

بخود نگر، گلہ ہائے جہاں چہ گوئی اگر نگاہِ تو دیگر شود جہاں دگر است

جاوید نامہ میں ہے۔

تبدیلئ نگاہ

ایکہ منزل را نمی دانی زرہ قیمتِ ہر شے ز اندازِ نگہ
نوعِ دیگر بیں، جہاں دیگر شود ایں زمین و آسماں دیگر شود

یہی وہ نگاہیں ہیں جن سے قوموں کی تقدیریں بدل جاتی ہیں اور یہی وہ نگاہیں ہیں جو بدبختی سے ہماری قوم کے نوجوانوں سے چھن چکی ہیں۔ جنہیں وہ بزعمِ خویش اپنی نگاہیں سمجھتے ہیں وہ اپنی نہیں ہوتیں دوسروں سے مستعار لی ہوئی ہوتی ہیں۔ یہی وہ متاعِ گراں بہا ہے جس کے چھن جانے پر ہر رونے والی آنکھ روتی ہے اور ہر تڑپنے والا دل تڑپتا ہے۔ یہی نوجوانوں کی "بے بصری" اقبالؒ کو بھی لہو رلاتی ہے اور اس نے اپنے قلب و دماغ کے بہترین جوہر اسی جہاد میں صرف کر ڈالے ہیں کہ کہیں سے یہ فردوسِ گم گشتہ پھر نوجوانوں کو مل جائے۔

لیکن مومن کی یہ "چشمِ خویش" یہ اپنی آنکھ اس وقت اپنی بنتی ہے جب یہ قرآنِ کریم کی روشنی میں اس آنکھ سے کام لے کہ جس طرح آنکھ بیرونی روشنی کے بغیر بیکار ہے، دیدۂ عقل قرآنِ کریم کے نورِ مبین کے بغیر بالکل کور ہے۔ اس کے متعلق نبیِ اکرمؐ نے فرمایا ہے کہ مومن کی فراست سے ڈرو کہ وہ خدا کے نور سے دیکھتا ہے۔ یہ خدا کا نور قرآنِ کریم ہے۔ ایک مردِ مومن دنیا کی ہر شے کو قرآنِ کریم کی روشنی میں دیکھتا ہے۔ اس کے

قرآن کی روشنی

افکار و آراء اس کے تابع چلتے ہیں۔ اس کا علم و فلسفہ اس کی پیروی کرتا ہے۔ یہ ہے فرق ایک مومن اور غیر مومن حکیم میں۔ غیر مومن یا تو تنہا اپنی عقل کے زور پر چلتا ہے اور قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتا ہے یا دوسرے انسانوں کے پیچھے پیچھے قدم بقدم چلتا ہے کہ اگر وہ جہنم کا راستہ اختیار کئے ہیں تو یہ بھی وہیں پہنچے گا۔ برعکس اس کے ایک حکیم مومن اپنی عقل و خرد سے قرآنِ کریم کی روشنی میں کام لیتا ہے اور چونکہ وہ روشنی خدائے علیم و خبیر کی عطا فرمودہ ہے اس لئے وہ اشیاء کی حقیقتوں کو بے نقاب کر دیتی ہے اور انسان پھر کبھی لغزش نہیں کھاتا۔ یہ ہے وہ حصہ اول جس کا ذکر اوپر گزر چکا ہے اور جس سے

محروم رہنے کی وجہ سے آج دنیا جہنم زار بن رہی ہے اور یہ حصۂ الآ' یہ خدا کے غیر متبدل قوانین' یہ فطرت کے اٹل حقائق' سوائے قرآنِ کریم کے دنیا میں آج کہیں نہیں ہیں. چونکہ حضرت علامہ کو معلوم ہوچکا ہے کہ قرآنِ کریم انسانوں کو کس قسم کی بصیرت عطا کرتا ہے' یہ نگاہوں کو کس اوج تک پہنچا دیتا ہے' یہ قلبِ انسانی میں کیا کیا انقلاب پیدا کر دیتا ہے. یہ کس طرح اس کی ساری دنیا بدل دیتا ہے. اس لئے جہاں کہیں وہ قرآنِ کریم کا ذکر کرتے ہیں' وجدِ مسرت سے جھوم اٹھتے ہیں. ان کے ایک ایک لفظ سے قرآنِ کریم سے عشق و محبت کی چاشنی ٹپکتی ہے. وہ خود بھی اس میں جذب ہوجاتے ہیں اور دوسروں کو بھی جذب کر لیتے ہیں۔ رموز میں فرماتے ہیں.

تو ہمی دانی کہ آئینِ تو چیست — زیرِ گردوں سرِ تمکینِ تو چیست
آں کتابِ زندہ قرآنِ حکیم — حکمتِ او لایزال است و قدیم
نسخۂ اسرارِ تکوینِ حیات — بے ثبات از قوتش گیرد ثبات
حرفِ اُو را ریب نے تبدیل نے — آیہ اش شرمندۂ تاویل نے
نوعِ انساں را پیامِ آخریں — حاملِ اُو رحمۃ للعالمیں

اور سنئے.

فاش گویم آنچہ در دل مضمر است — ایں کتابے نیست چیزے دیگر است
چوں مسلماناں اگر داری نظر — در ضمیرِ خویش و در قرآں نگر
صد جہانِ تازہ در آیاتِ اوست — عصرہا پیچیدہ در آناتِ اوست
بندۂ مومن ز آیاتِ خدا است — ہر جہاں اندر برِ او چوں قبا است
چوں کہن گردد جہانے در برش — می دہد قرآں جہانے دیگرش

دو چیزیں قابلِ غور ہیں. ایک تو "ضمیرِ خویش" اور دوسرے "عصرہا پیچیدہ در آناتِ اوست". اس "عصرہا پیچیدہ" کی خوبصورتی دیکھنے سے علاقہ رکھتی ہے. قرآنِ کریم کی آیات کو کھولتے جائیے' جہاں اندر جہاں' زمانہ در زمانہ' ان کے اندر لپٹا ہوا ملے گا. قرآن کتابِ فطرت ہے یعنی جس طرح فطرت کی کوئی شے ایسی نہیں جو کسی زمانے میں بھی جاکر یہ کہہ دے کہ میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکتی' اسی طرح قرآن بھی یہ کبھی نہیں کہے گا کہ بس اب

قرآن اور رموزِ کائنات

میں تھک گیا۔ جو کچھ میرے اندر تھا سب باہر آچکا۔ اب میں خالی برتن ہوں۔ اب کسی اور رہبر کی تلاش کرو۔ قطعاً نہیں۔ فطرت کی کسی چیز کو لیجئے۔ مثلاً پانی۔ آدم کے وقت لوگ اتنا ہی جانتے ہوں گے کہ اس سے پیاس بجھائی جاتی ہے یا زیادہ سے زیادہ یہ کہ اس سے نہایا بھی جاتا ہے۔ لیکن اس پانی کے اندر چھپی ہوئی خصوصیات زمانہ کی عقل و علم، تجربہ و مشاہدہ، وسعت و بلندی کے ساتھ ساتھ یوں کھلتی گئیں جیسے وہ اس کی لہروں کے پیچ میں لپٹی ہوئی تھیں۔ آج دیکھئے، اسی پانی سے کس قدر کام لئے جارہے ہیں۔ کیا آدم کے وقت کے پانی میں یہ خصائص موجود نہ تھے! یا کیا دنیا آج یہ کہہ سکتی ہے کہ پانی میں جو کچھ تھا سب معلوم کرلیا گیا ہے۔ دنیا اپنے تجربات کی جن بلندیوں تک چاہے اڑتی چلی جائے، فطرت کی اشیاء ان کا ساتھ دیتی جائیں گی۔ اسی فضا کو دیکھئے جو کل تک خالی سمجھی جاتی تھی، آج اس میں ایتھر کی امواج نے کیا کچھ کر دکھایا ہے۔ کیا ایتھر پہلے موجود نہ تھا! کیوں نہ تھا۔ اسی فضا میں لپٹا ہوا تھا، پیچیدہ تھا۔ یہی قرآنِ کریم کی کیفیت ہے۔ زمانہ عقل و علم کی جن پہنائیوں تک چاہے بلند ہوتا چلا جائے، قرآن اس سے بھی آگے نظر آئے گا۔ جو بات آج سمجھ میں نہیں آسکتی اسے کل کی آنے والی نسلیں، جو اگر تجربات و مشاہدات میں موجودہ نسل سے آگے ہوں گی، خود بخود سمجھ جائیں گی۔ اسی طرح قرآنِ کریم کی ایک ایک آیت حقیقتِ ثابتہ بن کر سامنے آتی جائے گی۔ اُس وقت اس کی کوئی آیت متشابہ نہیں رہے گی۔ سب محکم ہوجائیں گی۔ یہ میں نہیں کہتا۔ خود قرآنِ کریم کا ارشاد ہے کہ:

سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنْفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ ط (۴۱/۵۳)

ہم ان کو اپنی نشانیاں اس نظامِ کائنات میں اور خود نفسِ انسانی کے اندر دکھاتے جائینگے یہاں تک کہ ان پر یہ حقیقت واضح ہوجائے گی کہ قرآن فی الواقعہ حق ہے۔

انسانوں کی صحیح پوزیشن

اس نظامِ کائنات میں انسان کی صحیح پوزیشن کیا ہے، اسے سب سے پہلے قرآنِ کریم ہی نے متعین کیا۔ یہ اعلان آپ کو قرآن ہی میں ملے گا کہ

وَسَخَّرَ لَكُمْ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مِنْهُ ط (۴۵/۱۳)

جو کچھ زمین اور آسمانوں کے اندر ہے۔ جو کچھ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں ہے،

اس نے ان سب کو تمہارے لئے تابع فرمان کر رکھا ہے۔

یہ تو اس کائنات سے متعلق ہے لیکن قرآنِ کریم تو اس سے بھی آگے جاتا ہے (اس کا ذکر آگے چل کر آئے گا)۔ قرآنِ کریم کوئی علم الحیات (BIOLOGY) کی کتاب نہیں کہ اس میں ان امور کی ریسرچ دے رکھی ہو۔ بایں ہمہ، جہاں کہیں ضمناً تخلیقِ انسانی کا ذکر اس میں آگیا ہے، جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ وہی ہے جس پر انسان اپنے کمالِ تحقیق کے بعد پہنچے گا۔ یہی حالت دیگر علومِ سائنس کے متعلق ہے۔ قرآن میں تبعاً اور ضمناً جہاں جہاں ان کا ذکر آگیا ہے وہ ایک حقیقتِ ثابتہ ہے۔ ہو نہیں سکتا کہ انسانی انکشافات جس نتیجہ پر پہنچیں قرآن اس کے خلاف ہو۔ بشرطیکہ وہ انکشاف حقیقت کی حد تک پہنچ چکا ہو۔ محض قیاس آرائی نہ ہو۔ انسانی انکشاف ہے کیا۔ یہی ناکہ فطرت کی ایک حقیقت پر پردہ پڑا ہوا تھا۔ وہ نظروں سے اوجھل تھی۔ انسانی کدوکاوش نے وہ پردہ اٹھا دیا۔ وہ حقیقت جیسی تھی سامنے آگئی۔ اسی کو انکشاف کہتے ہیں۔ ایتھر اس فضا میں موجود تھا۔ بجلی کی لہریں یہیں تڑپ

سائنس اور قرآن

رہی تھیں۔ لیکن پہلے وہ نگاہ سے اوجھل تھیں۔ اب بے نقاب ہو کر سامنے آگئیں۔ لیکن خدا وہ ہے جس نے ان تمام چیزوں کو پیدا کیا ہے۔ اگر یہ چھپی ہوئی ہوتی ہیں تو انسانوں کی نگاہوں سے چھپی ہوئی ہیں۔ خدا کی نگاہوں سے چھپی ہوئی نہیں ہوتیں۔ اس لئے جہاں کہیں خدا ان کا ذکر کرے گا وہ تو ایسے ہی کرے گا جیسے کوئی اس چیز کی بابت کہے جو اس کی آنکھوں کے سامنے بے نقاب موجود ہو۔ پھر کس طرح ممکن ہے کہ انسانی انکشافات کے نتائج اور قرآنِ کریم کا بیان باہم متضاد ہوں۔ جہاں کہیں تضاد ہو، سمجھ لیجئے کہ انسانی تحقیق میں ابھی غلطی ہے جسے وہ حقیقت سمجھ رہا ہے، قیاس آرائی ہے۔ جب حقیقت، حقیقت ہو کر سامنے آجائے گی تو وہ وہی ہوگی جو اس حقیقت کے پیدا کرنے والے نے اپنی کتاب میں بیان فرمائی ہے۔ اسی نظریۂ ارتقاء کو لیجئے جسے دورِ حاضرہ کے انکشافات میں ایک معرکتہ الآراء کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔ اس نظریہ میں جو چیزیں بطور حقیقت کے معلوم ہو چکی ہیں جن کا ذکر قرآنِ کریم میں موجود ہے اور جن کی روشنی میں اسلامی مفکرین مثلاً فارابی اور ابنِ مسکویہ نے ویلیس اور ڈارون سے کہیں پہلے ان نظریوں کی داغ بیل ڈال دی تھی۔ (نظریۂ ارتقاء اور قرآنِ کریم ایک جداگانہ مبحث ہے جسے میں نے اپنی کتاب "ابلیس و آدم" میں وضاحت سے بیان کیا ہے)۔ لیکن یورپ کے حکماء اس نظریہ کے

ماتحت انسان کی سابقہ کڑیوں کی تحقیقات کے بعد مطمئن ہو جاتے ہیں اور انسان کو اس سلسلہ کی

انسان اور سلسلہ ارتقاء

آخری کڑی سمجھتے ہیں کہ اس کی موت کے ساتھ یہ سلسلۂ ارتقاء بھی ختم ہو جاتا ہے لیکن قرآنِ کریم اس حصۂ زندگی کو محض ابتداء قرار دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ منزل تو ابھی شروع ہوئی ہے۔ انسان کی موت اس سلسلۂ ارتقاء کا کا خاتمہ نہیں بلکہ ایک اگلی کڑی کی ابتداء ہے۔ آپ دیکھئے کہ سلسلۂ ارتقاء میں جمادات سے نباتات اور نباتات سے حیوانات تک آتے آتے ایک نمایاں تبدیلی آتی ہے۔ اور وہ یہ کہ اگلی منزل میں بمقابلہ پچھلی منزل کے ایک ایسی کیفیت پائی جاتی ہے جو مجرد مادہ میں موجود نہ تھی۔ مادہ غیر شعوری شے ہے اس میں تعقل و ادراک نہیں لیکن مٹی سے درخت اور درخت سے حیوان کی تدریجی ترقی میں یہ کیفیت نظر آئے گی کہ جو چیز پہلی کڑی میں مفقود تھی، اگلی کڑیوں میں پیدا ہوتی چلی جا رہی ہے۔ حیوانات میں ایک خفیف سی حد تک عقل و شعور آ جاتا ہے اور اس سے اگلی منزل یعنی انسان میں یہ خصوصیت ابھر کر سطح پر آ جاتی ہے۔ یعنی اس میں شعور و ادراک، جذبات و احساسات پیدا ہو جاتے ہیں۔ یہ وہ چیز ہے جو مادہ میں موجود نہ تھی۔ گویا سلسلۂ ارتقاء کی ہر کڑی میں "مادیت" سے کسی "غیر مادیت" کی طرف قدم اٹھتا ہے۔ وہ "خاکی" سے کچھ "نوری" سا ہو جاتا ہے۔ ہرچند یہ "غیر مادی" عنصر (اسے ایسا ہی کہنا چاہیئے کیونکہ اور کوئی لفظ اس مفہوم کو ادا نہیں کر سکتا، انسان میں آ کر نمایاں ہو گیا ہے لیکن بایں ہمہ یہ عنصر ابھی اپنے عہدِ طفولیت میں ہے۔ لہٰذا یہ نہیں ہو سکتا کہ یہ سلسلہ یہیں ختم ہو جائے۔ اس کا آگے بڑھنا ضروری ہے اور یہی آگے بڑھنے کی منزلیں ہیں جہاں جا کر یورپ کے حکماء اور مسلم حکیم میں فرق شروع ہو جاتا ہے۔ حکیم مومن کے نزدیک حیات ایک مسلسل شے ہے اور موت اس کا خاتمہ نہیں کر دیتی بلکہ شبِ تیرہ و تار کے بعد ایک نیا دن طلوع کرتی ہے۔ مادی عنصر میں تو تاریکی ہی تاریکی ہے۔ یہ عقل و خرد، یہ شعور و ادراک کی چمک تو مادہ سے آگے بڑھنے میں ہی پیدا ہوتی ہے۔ لہٰذا یہ سلسلۂ ارتقاء جتنا آگے بڑھتا جائے گا تیرگی درخشندگی میں تبدیل ہوتی جائے گی۔ وہ لوگ جن کے اس منزل میں اعمالِ صالح ہوں گے۔ یعنی ایسے کام جو اس میں یہ صلاحیت پیدا کر دیں کہ وہ اس سے اگلی زندگی، اس سے نفیس و لطیف، اس سے اعلیٰ و ارفع زندگی بسر کر سکے وہ اپنے اوپر کی منزل میں چلے جائیں گے جسے جنت کہتے ہیں جن کے

اعمال انہیں اصلح نہیں بنائیں گے وہ سلسلۂ ارتقاء کی اگلی منزل میں نہیں پہنچ سکیں گے۔ وہیں روک دیئے جائیں گے۔ یہ جہنّم کی زندگی ہوگی۔ لہٰذا" موجودہ زندگی تو انسانی خمیر کے آب و گل کی زندگی ہے۔ ذرا اسے سنور لینے دیجئے۔ پھر دیکھئے یہ کیا بنتا ہے۔" انسان کا مستقبل" یہ ہے وہ موضوع جو حضرت علامہ کے تمام کلام کا گویا نقطۂ ماسکہ ہے۔ فرماتے ہیں۔

یکے در معنیٔ آدم نگر از من چہ می پرسی   ہنوز اندر طبیعت می خلد موزوں شود روزے
چناں موزوں شود ایں پیش پا افتادہ مضمونے   کہ یزداں را دل از تاثیر او پُرخوں شود روزے

اس نظامِ کائنات میں انسان کا درجہ کس قدر بلند ہے اس کے لئے اس داستانِ حقیقت کُشا کو دیکھئے جو تخلیقِ آدم کے باب میں پہلے ہی پارہ میں تمثیلاً بیان کی گئی ہے۔ اس تمثیلی داستان میں آدمؑ سے مراد کوئی خاص فرد نہیں۔ اس سے خود "آدمی" مراد ہے۔ یعنی وہ داستان خود آدمی کی داستان ہے جسے اس قصہ کے رنگ میں بیان کیا گیا ہے۔ آدم گویا نوعِ انسان کا نمائندہ ہے۔ فرشتوں سے کہا جاتا ہے کہ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً۔ میں دنیا میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔ یعنی ایک ایسی صاحب اقتدار مخلوق جو زمین پر سابقہ مخلوق کی جانشین ہوگی۔ فرشتوں کی معصوم نگاہیں جب اس ہیولیٰ آب و گل کو دیکھتی ہیں تو اس میں خون کے چھینٹے اور آگ کی چنگاریاں نظر آتی ہیں۔ عرض کرتے ہیں۔ بارِ الٰہ! یہ فتنہ سامانیوں کا مجموعہ اور خلیفہ فی الارض! اس اعزاز کے مستحق تو کچھ ہم ہی نظر آتے ہیں کہ نَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَ نُقَدِّسُ لَكَ۔ ہم تیری حمد و ثنا کرتے ہیں اور اپنے اختیار و ارادہ

قصۂ آدم

سے کام لئے بغیر وہی کچھ کرتے ہیں جس کا حکم دیا جاتا ہے۔ خلّاقِ فطرت کے چہرے پر ایک حسین تبسّم نے گلفشانی کی اور فرمایا کہ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ۔ میں جانتا ہوں یہ مضمون مکمل ہو کر کیا بننے والا ہے اور تم کیا ہو۔ لیکن اتنا کہہ کر فرشتوں کو خاموش نہیں کر دیا گیا بلکہ اس کے ثبوت میں عظمتِ آدم کی ایک جھلک بھی دکھاوی اسے علم الاشیاء یعنی علم الفطرت، عطا کیا گیا ہے اور فرشتوں سے پوچھا کہ تم بھی اس کی نسبت کچھ جانتے ہو۔ انہوں نے گردنیں جھکا دیں اور عرض کیا۔ نہ حضور! لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا۔ ہمیں تو اتنا ہی پتا ہے جتنا ہمیں سکھایا گیا ہے۔ فرمایا کہ اب بتاؤ کہ یہ ہمارے رازوں کا امین! یہ عظمتوں کا پتلا، اس قابل ہے یا نہیں کہ تم اس کے سامنے جھک جاؤ۔ اب سوائے اعترافِ حقیقت کے چارہ کیا تھا۔ وہ

جھکے اور بار بار جھکے۔ حضرت علامہ فرماتے ہیں کہ

کجا نورے کہ غیر از قاصدی چیزے نمی داند کجا خاکے کہ در آغوش دارد آسمانے را

بالِ جبریل میں ہے۔

نہ تو زمیں کے لئے ہے نہ آسماں کے لئے جہاں ہے تیرے لئے تو نہیں جہاں کے لئے

ذرا غور کیجئے اس فلسفہ پر فطرت کی ہر شے اس غرض سے پیدا کی گئی ہے کہ انسان اس سے کچھ کام لے یا وہ انسان کی کچھ خدمت بجالائے۔ ان اشیاء کا وجود انسان کی زندگی اور زندگی کی ضروریات کے لئے ہے۔ ہوا نہ رہے تو انسان بھی نہ رہے۔ پانی نہ رہے تو انسان نہ رہے۔ لیکن اگر روئے زمین پر کوئی انسان باقی نہ رہے تو بھی سلسلۂ کائنات اسی طرح جاری رہے گا۔ اس میں کوئی نقص واقع نہیں ہوگا۔ اس سے ظاہر ہے کہ انسان کا وجود اس نظامِ کائنات کے لئے نہیں۔ اس کی تخلیق سے یہ غرض نہیں کہ یہ اسی دنیا کا ہو کر رہ جائے۔ دنیا اس کی خاطر ہے۔ یہ دنیا کی خاطر نہیں۔ یہ اس سے کسی بلند و بالا مقصد کے لئے پیدا کیا گیا اور یہی چیز اسے نظامِ کائنات سے ممتاز کر دیتی ہے۔ لیکن یہ شرفِ اجتبا، یہ امتیاز و خصوصیت محض ایک انسان کے گھر میں پیدا ہو جانے سے ہی نہیں حاصل ہو جاتی۔ اس کے لئے ایک "یقینِ کامل" اور "عملِ پیہم" کی ضرورت ہے۔ جب کسی قوم میں یہ باتیں پیدا ہو جاتی ہیں تو وہ "خیر امت" بن جاتی ہیں۔ اب آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ اس خیرِ امت کا مقام کس قدر بلند ہوگا۔ اس جماعت کے بھولے ہوئے فرد سے خطاب کر کے فرماتے ہیں۔

اپنی اصلیت سے ہو آگاہ اے غافل کہ تو قطرہ ہے لیکن مثالِ بحرِ بے پایاں بھی ہے

کیوں گرفتارِ طلسمِ ہیچ مقداری ہے تو دیکھ تو پوشیدہ تجھ میں شوکتِ طوفاں بھی ہے

ہفت کشور جس سے ہو تسخیر بے تیغ و تفنگ تو اگر سمجھے تو تیرے پاس وہ ساماں بھی ہے

یہی وہ ہیں جن کے متعلق ارشاد ہے کہ

وَ لَا تَهِنُوْا وَ لَا تَحْزَنُوْا وَ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ○ (۳/۱۳۹)

مت گھبراؤ، مت خوف کھاؤ، تم دنیا میں سب سے بلند ہو بشرطیکہ تم مومن بن جاؤ۔

دوسری جگہ کہتے ہیں۔

خدائے لم یزل کا دستِ قدرت تو زباں تو ہے یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گماں تو ہے

پرے ہے چرخِ نیلی فام سے منزل مسلماں کی ستارے جس کی گردِ راہ ہوں وہ کارواں تو ہے

مکاں فانی مکیں آنی ازل تیرا ابد تیرا خدا کا آخری پیغام ہے تو جاوداں تو ہے
تری فطرت امیں ہے ممکناتِ زندگانی کی جہاں کے جوہرِ مضمر کا گویا امتحاں تو ہے

وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَ يَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ؕ (۲/۱۴۳)

اور اس طرح ہم نے تمہیں ایک بہترین قوم بنایا کہ تم تمام نوعِ انسانی کے (اعمال کے) نگران رہو اور تمہارے (اعمال کے) نگران رسول ہوں۔

مسلم کی تو شان یہ ہے کہ تمام دنیا کی قوموں کے اعمال کا جائزہ لیتا رہے کہ کون ٹھیک کام کر رہا ہے اور کون راستے سے بھٹک گیا ہے۔ اسے تمام اقوامِ عالم کا نگرانِ کار (SUPERVISOR) بنا کر بھیجا گیا ہے اور مرکزِ ملت اس کے اعمال کا نگران۔ جب مومن کے علوِ مرتبت کی یہ شان ہو تو پھر دنیاوی حکومت و ثروت اس کے سامنے کیا حقیقت رکھتی ہے۔ یہ تو بنی ہی اس کے لئے ہے۔ یہ تو اس کی وراثت ہے کسی اور کے پاس جا ہی نہیں سکتی۔

مقامِ مومن

عالم ہے فقط مومنِ جانباز کی میراث مومن نہیں جو صاحبِ لولاک نہیں ہے

اس فقط کو دیکھئے۔ کسی اور کا اس میں حصہ نہیں۔ یہ بطور حق کے اس پر قابض ہوگا کوئی اور اسے اس سے چھین نہیں سکتا۔ یہ خدا کا فیصلہ ہے اور کس قدر سچا فیصلہ!

وَ لَقَدْ كَتَبْنَا فِى الزَّبُوْرِ مِنْۢ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِىَ الصّٰلِحُوْنَ ○ (۲۱/۱۰۵)۔

اور یقیناً ہم نے زبور میں نصیحت کے بعد لکھ دیا تھا کہ بے شک زمین ہمارے صالح بندوں کی میراث ہے۔

عالم ہے فقط مومنِ جانباز کی میراث مومن نہیں جو صاحبِ لولاک نہیں ہے

اور یہ اس لئے کہ مومن کی برابری دنیا میں کوئی نہیں کر سکتا۔ یہ تو اعلون ہے سب سے بلند و بالاتر۔

مومنے بالاتے ہر بالاترے غیرتِ اُو برنتابد ہمسرے

یہ تو تھا اس دنیا کے متعلق۔ لیکن جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں۔ قرآنِ کریم کے نزدیک یہ زندگی تو

حیاتِ انسانی کا اوّلین گہوارہ ہے۔ عہدِ طفولیت ہے۔ اس نے ابھی جوان ہونا ہے۔ اس لئے قرآنِ کریم کے

تسلسلِ حیات

نزدیک یہ زندگی بایں ہمہ رعنائی و زیبائی اصل معنوں میں زندگی کہلانے کی مستحق ہی نہیں۔ "زندگی" تو اس کے بعد آنے والی ہے۔

وَ مَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّ لَعِبٌ[1] وَ اِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ ۘ (۲۹/۶۴)

یہ زندگی تو محض کھیلنے کودنے کی زندگی ہے۔ بچپن کا زمانہ ہے۔ زندگی تو درحقیقت اس کے بعد کی منزل ہے۔

اس حقیقت کو واضح کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ یہ بتایا جائے کہ زندگی ایک مسلسل شے کا نام ہے۔ جہاں کوئی شے رُک جائے وہ اس کی موت ہوتی ہے۔

برگ و سازِ ہستی موج از رم است | زندگانی از خرامِ پیہم است

موجودہ دورِ حیات کے لہو و لعب ہونے کے متعلق ارشاد ہے۔

فلک یک گردشِ پیمانۂ ما | زمیں خاکِ درِ میخانۂ ما
جہاں دیباچۂ افسانۂ ما | حدیثِ سوز و سازِ ما دراز است

ذرا اس "خاکِ درِ میخانہ" اور "گردشِ یک پیمانہ" کے ٹکڑوں کو دیکھئے اور پھر سامنے لائیے آیتِ مذکورہ کے اس حصّہ کو کہ "وَ مَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّ لَعِبٌ" اور اس "دیباچۂ افسانۂ ما" کے ساتھ وَ اِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ کو۔ یہ موجودہ زندگی تو محض دیباچہ ہے۔ اصل کتاب ابھی شروع ہونے والی ہے۔

ہرچند بات لمبی ہو رہی ہے لیکن جی نہیں چاہتا ہے کہ ایک چیز سامنے آجائے اور اسے یوں ہی چھوڑ کر آگے گزر جائیں۔ "حدیثِ سوز و سازِ ما دراز است" کے لئے مجھے نظریۂ ارتقاء بیان کرنا چاہیئے۔ لیکن جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں، یہ ایک الگ موضوع ہے جس کا ضمناً بیان کرنا دشوار ہے۔ یہاں صرف حضرت علّامہ کے اس مصرعہ کے متعلق کچھ اشارات ضروری ہیں۔ قرآنِ کریم میں ارتقاء کے ضمن میں یہ بیان ہوا

---

[1] دنیا اور آخرت کی قرآنی اصطلاحات کے مفہوم کے لئے "اسبابِ زوالِ امّت" دیکھئے۔

ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک تدبیر (PLAN) کرتا ہے. پھر اس تدبیر کو پختگی کی حد تک پہنچانے کے لئے اسے مختلف مراحل طے کراتا ہے. قطرہ کو گہر ہونے تک گوناگوں مقامات میں سے گزرنا ہوتا ہے. ایک ایک مقام اور ایک ایک

سلسلہ ارتقاء

منزل کا نام یوم ہے. لیکن یہ ایام ہمارے گردشِ لیل و نہار کے ایام نہیں بلکہ ان کا طول ہمارے حساب سے ہزار ہزار سال کا ہوتا ہے.

يُدَبِّرُ الْأَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ إِلَى الْأَرْضِ ثُمَّ يَعْرُجُ إِلَيْهِ فِي يَوْمٍ كَانَ
مِقْدَارُهُٓ أَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّونَ ۝ (۳۲/۵)

وہ آسمان سے زمین کی طرف تدبیرِ امور کرتا ہے پھر وہ امر (پختگی اختیار کرکے) اس کی طرف بلند ہوتا ہے ایک دن میں جس کی مقدار انسانوں کے اعداد و شمار کے لحاظ سے ہزار سال ہو سکتی ہے.

دوسری جگہ ہے کہ بعض ایام پچاس پچاس ہزار سال کے بھی ہوتے ہیں. اسی کرۂ ارض کو دیکھئے. یہ اپنے اوّلین ہیولیٰ سے الگ ہونے کے بعد (جس کا ذکر قرآنِ کریم میں موجود ہے) کتنے عرصۂ دراز میں اس قابل ہوئی ہوگی کہ اس پر کوئی ذی روح آباد ہو سکے. اسی طرح انسان کو اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لئے کتنی منازل طے کرنی ہوں گی اور اس میں کتنا وقت صرف ہوگا. اب پھر دیکھئے کہ

حدیثِ سوز و سازِ ما دراز است

کس قدر سچی حقیقت ہے اور کس قدر لطیف پیرائے میں بیان کی گئی ہے. اس کو دوسری جگہ ذرا زیادہ شوخی سے لکھتے ہیں کہ

باغِ بہشت سے مجھے حکمِ سفر دیا تھا کیوں　　کارِ جہاں دراز ہے اب میرا انتظار کر

ہاں تو کہنا یہ تھا کہ موت زندگی کو ختم کرنے والی شے نہیں بلکہ یہ تو ایک نئی زندگی کا دروازہ ہے.

چشم بکشائے اگر چشمِ تو صاحب نظر است
زندگی در پئے تعمیرِ جہانِ دگر است

اسی عنوان پر دو ایک شعر اور بھی دیکھتے جائیے. کبھی شعروں کو دیکھئے اور کبھی اپنے قلب و دماغ کو کہ ایک ہی ثانیہ میں ان اشعار نے انہیں علم و ادراک کی کن بلندیوں اور کیف و نشاط کی کن جنتوں میں پہنچا دیا. ایسے شعر کہہ دینا درحقیقت فیضان ہے اس کتابِ مبین کی ضیا پاشیوں کا جس کا دعوے ہے کہ آؤ تمام نوعِ انسانی مل کر اس کی ایک سورت کی مثل پیش کرکے دکھاؤ. ایسے شجرِ طیب کے برگ و بار بھی ایسے ہی ہونے چاہئیں. فرماتے

ہیں.

خاکِ ناچیز و کہ سازد آسمانے دیگرے ذرّہٗ ناچیز و تعمیرِ بیابانے نگر

پیامِ مشرق کے دو شعر ہیں.

زندگی جوئے رواں است و رواں خواہد بود این مئے کہنہ جواں است و جواں خواہد بود

شعلہ بودیم و شکستیم و شرر گردیدیم صاحبِ ذوق و تمنّا و نظر گردیدیم

اس آخری شعر کو ملاحظہ فرمایئے. شعلہ کی شکست اس لئے نہیں ہوتی کہ وہ خاکستر بن کر رہ جائے بلکہ اس لئے کہ اس میں پہلے سے بھی زیادہ تڑپ، چمک، حرارت پیدا ہو جائے. انسانی ہیولیٰ میں ہر چند "نورانیت" کا عنصر موجود ہے لیکن ابھی "مادیت" کا عنصر زیادہ غالب ہے اس لئے حقائقِ اشیاء پر ظلمتوں کے پردے پڑے رہتے ہیں. اس ہیولیٰ کی شکست اس لئے ہوگی کہ اس کے بعد شعلہ کی حرارتیں سمٹ کر شرر بن جائیں اور وہ اس آتشدانِ خاکی سے اُڑ کر فضائے نور کی ان وسعتوں میں جا پہنچے جن کے لئے لاشرقیہ ولاغربیہ آیا ہے. جو زمان و مکان (TIME AND SPACE) کے موجودہ تصورات کے دائرہ سے باہر ہیں. یعنی ادھر سکراتِ موت کی ہچکی آنکھ بند کرے اور اُدھر نورانی ملائکہ استقبال کے لئے آجائیں کہ دیدہ و دل فرشِ راہ! یہ نورانی وادیاں' یہ دل و نگاہ کو سکون و اطمینان کی ٹھنڈک پہنچانے والی حسین جنتیں آپ کے انتظار میں ہیں.

اَلَّذِیۡنَ تَتَوَفّٰىہُمُ الۡمَلٰٓئِکَۃُ طَیِّبِیۡنَ ۙ یَقُوۡلُوۡنَ سَلٰمٌ عَلَیۡکُمُ ۙ
ادۡخُلُوا الۡجَنَّۃَ بِمَا کُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۶/۳۲﴾

یہ وہ لوگ ہیں جنہیں ملائکہ نہایت آسودگی کی حالت میں وفات دیتے ہیں' یہ کہتے ہوئے کہ تم پر سلامتی و رحمت ہو. آیئے جنّت میں داخل ہو جایئے بوجہ ان اعمال کے جو تم نے کئے ہیں.

اس آیت کو سامنے رکھئے اور پھر اس شعر کو پڑھئے کہ

شعلہ بودیم و شکستیم و شرر گردیدیم صاحبِ ذوق و تمنّا و نظر گردیدیم

پھر جنّت کے متعلق جو اس آیت میں اور دیگر متعدد آیات میں آیا ہے کہ بِمَا کُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ. یعنی جنّت اعمال کی جزا ہے. اس کے متعلق فرماتے ہیں کہ

آں بہشتے کہ خدائے بتو بخشد ہمہ ہیچ تا جزائے عملِ تُست جناں چیزے ہست

زندگی کے تسلسل کے متعلق غزل کا ایک شعر سنیے اور دیکھئے کہ غزل کی رنگینی باقی رکھتے ہوئے بھی حقائق کیسے بیان کئے جا سکتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔

پریشاں ہو کے میری خاک آخر دل نہ بن جائے جو اب مشکل ہے یارب پھر وہی مشکل نہ بن جائے

اس غزل کا دوسرا شعر ہے۔

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہ کامل نہ بن جائے

اس شعر میں انسان (آدم) کے ہبوط و صعود کی حقیقت کس قدر دلآویز پیرایہ میں بیان کی گئی ہے۔ تخلیقِ آدم کا قصہ ہم اوپر دیکھ آئے ہیں۔ اس کے بعد ہبوطِ آدم کا ذکر ہے۔ ہبوط کے معنی نیچے گرنے کے ہیں۔ آدم کے جنت سے نکلنے کے لئے قرآنِ کریم نے خروج (نکلنا) کا لفظ استعمال نہیں کیا بلکہ ہبوط (نیچے گرنے) کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اس ہبوط کی رعایت سے آدم کو ٹوٹا ہوا تارا کہنا کس قدر موزوں ہے۔ آدم نے اپنے ہبوط کا جو اثر بیان کیا ہے وہ یہ تھا کہ اے بارِ الہا! اگر ہماری توبہ قبول نہ ہوئی، اگر ہمیں اپنی حالت میں نہ پہنچایا گیا تو لَنَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ ہم نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو جائیں گے۔ اس ہبوط کے بعد ان تمام ارتقائی منازل طے کر کے پھر ایسا عروج حاصل کرنا کہ تارا مہِ کامل بن جائے۔ اس کی عظمتیں اور رفعتیں پہلے سے بھی زیادہ بڑھ جائیں۔ یہ ہے وہ راز جو ملائکہ کی نگاہوں سے اوجھل تھا۔ قرآنِ کریم میں ہے۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِيٓ أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ ۝ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ أَسْفَلَ سَافِلِينَ ۝ إِلَّا الَّذِينَ اٰمَنُوا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ أَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُونٍ ۝ (۹۵/۴-۶)

بے شک ہم نے انسان کو بہترین ہیئت میں پیدا کیا۔ پھر اسے (اس کے اعمال کی بدولت) نچلے درجہ میں لوٹا دیا مگر سوائے ان کے جنہوں نے ایمان کے ساتھ اعمالِ صالحہ کئے۔ پس ان کے لئے غیر منقطع اجر ہے۔

انسان میں ایمان و عملِ صالح پیدا ہونے دیجئے، پھر دیکھئے کہ یہ شہباز کن بلندیوں پر اڑتا ہے ایسی فضاؤں میں جو حدود نا آشنا ہیں (غیر ممنون) اسی پرواز کی پہلی منزل ہے جس کے متعلق فرماتے ہیں۔

برخیز کہ آدم را ہنگامِ نمود آمد ایں مشتِ خاکے را انجم بسجود آمد

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، یہی فرق ہے یورپ کے نظریۂ ارتقاء اور ایک مسلم کے نظریۂ عروج میں۔ یورپ کا مادہ پرست، انسان کی پرواز اس دنیا یا زیادہ سے زیادہ کسی قریبی ستارے مثلاً مریخ وغیرہ تک سمجھتا ہے اور وہ بھی محض جسمانی پرواز۔ لیکن قرآنِ کریم انسان کو بہت اونچا لے جاتا ہے كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ أَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّ فَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ۔ ایسے مبارک درخت کی طرح جس کی جڑیں مضبوط ہوں اور جس کی شاخیں آسمان میں جھولے جھول رہی ہوں۔ اسی لئے حضرت علامہ فرماتے ہیں کہ

فرنگ سے بہت آگے ہے منزلِ مومن — قدم اٹھا یہ مقام انتہائے راہ نہیں

اس چیز کو دوسری جگہ یوں بیان کیا گیا ہے۔

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں — ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں
تہی زندگی سے نہیں یہ فضائیں — یہاں سینکڑوں کارواں اور بھی ہیں
قناعت نہ کر عالمِ رنگ و بو پر — چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں
تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا — ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں
اسی روز و شب میں اُلجھ کر نہ رہ جا — کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں

ارتقائی منازل کو "عشق کے امتحاں" کہنا خشک فلسفہ کو کس قدر شیریں بنا دیتا ہے۔ دوسرے شعر میں اس حقیقت کو بے نقاب کیا گیا ہے کہ یہ بلندیوں کی فضائیں جنہیں قرآنی اصطلاح میں سمٰوٰت کہا جاتا ہے آبادی سے خالی نہیں۔ قرآنِ کریم میں ہے۔

ستاروں کی دُنیا

وَ مِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَمَا بَثَّ فِيْهِمَا مِنْ دَآبَّةٍ ؕ (۴۲/۲۹)

اللہ کی نشانیوں میں سے یہ (بھی) ہے کہ اس نے زمین و آسمان، پستیوں اور بلندیوں کو پیدا کیا اور ان دونوں میں جو جاندار پھیلا دیئے، وہ بھی۔

اس شعر کے دوسرے مصرعے میں ان آباد فضاؤں کو کارواں کہا گیا ہے۔ قرآنِ کریم میں ہے۔ وَلَقَدْ خَلَقْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعَ طَرَآئِقَ اور ہم نے تمہارے اوپر متعدد رہگذر بنائے۔ یہ رہگذر کاروانوں ہی کے لئے تو ہیں۔ اور کون کہہ سکتا ہے کہ یہ کارواں در کارواں ہجوم کون کونسی ارتقائی منازل طے کرتے

پھر رہے ہیں اور عشق کی کون کون سی وادیوں میں سرگرداں ہیں۔ پھر چونکہ یہ تمام آبادیاں ایک جوئے رواں کی طرح ہر وقت مصروفِ خرام ہیں۔ قطعِ منازل کر رہی ہیں۔ اس لئے ان کو کارواں کہنا کیسا حسین انداز ہے۔

شعر کو جذبات کے اظہار کا بہترین ذریعہ قرار دیا گیا ہے۔ انہی جذبات سے اس میں دلکشی اور سوز و گداز پیدا ہوتا ہے۔ لیکن جب شعر میں حقائق بیان کئے جائیں یا اس کا انداز مصلحانہ اور پیامی ہو جائے تو پھر اس میں بالعموم شعریت باقی نہیں رہتی۔ پھر یا تو وہ شعر اس انداز کا ہو جاتا ہے کہ ؎

اے شمع تیری عمرِ طبیعی ہے ایک رات ہنس کر گزار یا اسے رو کر گزار دے

یا اس انداز کا کہ ؎

تو بھلا ہے تو بُرا ہو نہیں سکتا اے ذوق ہے بُرا وہ ہی کہ جو تجھ کو بُرا جانتا ہے
اور اگر تو ہی بُرا ہے تو وہ سچ کہتا ہے کیوں بُرا کہنے سے تو اسکے بُرا مانتا ہے

اور ایک ذوق ہی پر کیا موقوف ہے۔ بڑے بڑے اچھے شعر کہنے والے جب تبیانِ حقائق یا مصلحانہ انداز میں کچھ کہتے ہیں تو شعر بے جان ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ خصوصیت حضرت علامہ ہی کے حصہ میں آئی ہے کہ حقائق اور حقائق بھی اس درجہ دقیق بیان کئے جاتے ہیں اور شعر کے حُسن میں بھی کوئی کمی نہیں آتی۔ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ۔ ستاروں کی دنیا کے متعلق زبورِ عجم میں فرماتے ہیں۔

گماں مبر کہ ہمیں خاکداں نشیمنِ ماست
کہ ہر ستارہ جہان است یا جہاں بود است

زندگی، مسلسل خرام کا نام ہے۔ چلتے جانا، بڑھتے جانا، بڑھتے ہی چلے جانا کہ

ہر اِک مقام سے آگے مقام ہے تیرا حیات، ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں

جسے مقام سمجھا جاتا ہے وہ مقام نہیں۔ جسے منزل کہا جاتا ہے وہ منزل نہیں۔ یوں ہی ذرا ستانے، دم لینے کے لئے گھنے درختوں کا سایہ ہے۔ کارواں کے دوپہر کاٹنے کے لئے نخلستان ہے۔ وہ جنت کہ جسے بالعموم منزلِ مقصود سمجھا جاتا ہے، راستہ کی خوشگوار وادی ہے کہ جنت میں پہنچ کر بھی اہلِ جنت کی یہ کیفیت ہو گی کہ

يَسْعٰى نُوْرُهُمْ بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَ بِاَيْمَانِهِمْ (۵۷/۱۲)

ان کا نور ان کے آگے اور ان کی دائیں طرف چلتا ہو گا۔

یہ نور، پیشانی کی روشنی، یہ سرچ لائٹ اگلی منزل کا راستہ دکھانے کے لیے ہوگی وہ راستہ جس کے متعلق ارشاد ہے کہ جنت میں پہنچ کر بھی وَ هُدُوۡۤا اِلٰی صِرَاطِ الۡحَمِیۡدِ. ان کی ایک پسندیدہ راستہ کی طرف رہنمائی کی جائے گی (۲۲/۲۴)۔ اس لیے جنت بھی مقام نہیں، راہ گذر ہے۔ وہاں سے بھی انسان کو آگے بڑھ جانا ہے۔

اگر عنانِ تو جبریل و حور می گیرند   کرشمہ بردلِ شاں ریز و دلبرانہ گذر

لیکن بایں ہمہ انسان "لامکاں" نہیں۔ ہر ایک مقام سے آگے ہی سہی لیکن مقام اس کا ضرور ہے۔ وہ مقام کیا ہے؟ وہ منزلِ مقصود کونسی ہے؟ یہ راز ہے جسے کھول کر بیان نہیں کیا گیا۔ نہ ہی اس کی آج ضرورت تھی۔ آج تو صرف یہ دیکھنا ہے کہ انسان کی موجودہ زندگی کے بعد اگلی منزل کون سی ہے۔ سو اس کی تفصیل شرح و بسط سے قرآنِ کریم میں موجود ہے۔ اس منتہیٰ کے متعلق تو سر دست اتنا ہی کہا گیا ہے کہ وَ اِلٰی رَبِّکَ مُنۡتَهٰهَا۔ اس کا منتہیٰ تیرے رب کی طرف ہے۔

شعلہ در گیر و زد برخس و خاشاک من   مرشد روی کہ گفت منزلِ ما کبریاست

لیکن یہاں پہنچ کر حضرت علامہ "واصل بالحق" ہونے کے عقیدہ کا اتباع نہیں کرتے کہ قرآنِ کریم کی رُو سے انسان کے خدائے واحد کی ذات میں جذب ہو جانے کے عقیدہ کی سند نہیں ملتی۔ لیکن حضرت علامہ اس عقیدہ کے اختلاف میں بھی ایک شانِ انفرادیت پیدا کر لیتے ہیں اور اسے انسان کی خودی کے محکم بالذات ہونے کے منافی سمجھتے ہیں کہ وہ کسی کی ذات میں گم ہو جائے۔ ان کے نزدیک عشرتِ قطرہ دریا میں فنا ہو جانا نہیں بلکہ تہِ دریا گھر کر بیٹھ جانا ہے۔ آپ فرماتے ہیں:-

چناں با ذاتِ حق خلوت گزینی   ترا او بیند و او را تو بینی
بخود محکم گزار اندر حضورش   مشو ناپید اندر بحرِ نورش

"ترا او بیند" تو ہر وقت کا معاملہ ہے، وہ کون سا لمحہ ہے جب خدا انسان کو نہیں دیکھتا۔ لیکن "او را تو بینی" کا مقام اس منزل سے آگے آتا ہے۔ موجودہ مقام میں تو ایک اولو العزم پیغمبر نے جب یہ آرزو کی کہ "رَبِّ اَرِنِیۡۤ" تو جواب ملا کہ "لَنۡ تَرٰىنِیۡ" (تو مجھے نہیں دیکھ سکتا) لیکن اس سے اگلی منزل میں مومنین کی یہ کیفیت ہوگی کہ

وُجُوۡهٌ یَّوۡمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ۙ اِلٰی رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ۚ ۷۵-۲۲-۲۳

بہت سے چہرے اس دن تر و تازہ ہوں گے اپنے رب کی طرف دیکھ رہے ہوں گے۔
اب خدا بندے کو دیکھ رہا ہے اس وقت بندہ بھی خدا کو دیکھے گا کہ

عبد و مولا در کمینِ یک دگر ہر دو بے تاب اند از ذوقِ نظر
زندگی ہر جا کہ باشد جستجو است حل نشد ایں نکتہ من صیدم کہ اوست

اگر ایک طرف انسان کی تڑپ اور تجسس کا یہ عالم ہے کہ اِلٰی رَبِّهِمْ يَنْسِلُوْنَ اپنے رب کی طرف رواں دواں جائیں گے تو دوسری طرف یہ کیفیت بھی ہمارے سامنے آئی ہے کہ وَ اَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا۔ زمین اپنے رب کے نور سے جگمگا اٹھے گی۔ وَ جَاءَ رَبُّكَ وَ الْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا اور تیرا رب اور فرشتے قطار اندر قطار آئیں گے کہ

ہر دو بے تاب اند از ذوقِ نظر

لیکن یہ تمام مراحل طے کس طرح ہوں گے۔ یہ "محکم خودی" حاصل کیسے ہوگی۔ یہ اس دنیا میں اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ ہونا یعنی ایسا سخت ہو جانا کہ کوئی اسے ہضم نہ کر سکے۔ کوئی اپنے اندر جذب نہ کر سکے۔ یہ کیسے ہوگا! اس خاک کے تودے میں فولادی جوہر کیونکر پیدا ہوں گے۔ یہ نازک سا شیشہ اپنے اندر ایسی سختی کیسے پیدا کرے گا کہ اس کا "زجاج حریف سنگ" ہو جاتے۔ اس کے لئے "رموز و اسرار" میں پورا لائحہ عمل مرتب کر کے دے دیا گیا ہے۔ یہاں اس کی تفصیل کا موقع نہیں۔ لیکن ان سب کا ماحصل ایک نکتہ ہے اور یہی نکتہ دراصل کلامِ اقبالؒ کا محور ہے۔ مرکز ہے۔ محیط ہے، سب کچھ ہے: یہ نکتہ یہ ہے کہ

ترا جوہر ہے نوری پاک ہے تو فروغِ دیدۂ افلاک ہے تو
ترے صیدِ زبوں افرشتہ و حور کہ شاہینِ شہِ لولاک ہے تو

بس یہ ہے راز ایک مومن کی پختگی کا۔ اس کی خودی کے استحکام کا کہ شاہینِ شہِ لولاک ہے تو۔ تُو ان مقدس ہاتھوں کا پروردہ ہے جس کی شان میں آیا ہے کہ يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ۔ تُو تو اس ذاتِ گرامی کا شاہین ہے جو دانائے سبل "ختمِ رسل" ہے۔ جو معراجِ انسانیت کا مظہرِ کامل ہے۔ جب تو ایسی رفیع الشان بارگاہ کا شاہین ہے تو تیرے عرشِ آشیاں ہونے میں کیا شبہ رہ جاتا ہے۔ لہٰذا یہ

اطاعت مرکزِ قرآن

تمام فضائیں اور فضاؤں کی پہنائیاں، یہ سب پستیاں اور تمام بلندیاں، یہ ارض و سماوات، یہ تمام کائنات اور اس کی قیود نا آشنا

اقبالؒ اور قرآن

وسعتیں اس شاہینِ لولاکؐ کے بازوؤں کے نیچے کیوں نہ ہوں. اور یہ اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اطاعت عشق کے مرتبہ تک نہ پہنچ چکی ہو کہ رسول کی اطاعت درحقیقت خدا کی اطاعت ہے اور یہ اطاعت قرآن کی اطاعت سے میسر آتی ہے کہ حضورؐ قرآن ہی کی اطاعت سکھانے کے لئے تشریف لائے تھے۔

> قسم ہے تیرے پروردگار کی ان میں سے کوئی بھی مومن نہیں ہو سکتا جب تک اپنے ان تمام معاملات میں جن میں یہ اختلاف کرتے ہیں' اے رسول! تمہیں اپنا حکم تسلیم نہ کرلیں' پھر تمہارے فیصلوں پر دل میں کوئی تنگی اور گرانی محسوس نہ کریں. بلکہ ان کے سامنے سرِ تسلیم خم کردیں۔
> (۴/۶۵)

اس نکتہ کے اندر امت کی مرکزیت' امیر کی اطاعت' وحدتِ افکار و عمل اور ان کے جیتے جاگتے نتائج یعنی تمکن فی الارض' شان و شوکت' حکومت و سطوت' زمین پر "آسمانی بادشاہت" کا قیام' سرفرازیاں اور بلندیاں' کامیابیاں اور کامرانیاں اور اس کے بعد حیاتِ اُخروی میں' بعد کی منزل میں' آگے بڑھنے کی قوتیں' مدارجِ عالیہ' یہ سب کچھ اس کے اندر پوشیدہ ہے. مجھے ضمناً اس بحث کو یہاں چھوڑ دینا پڑا ورنہ یہ تو وہ عنوان ہے جس پر کلامِ اقبالؒ سے ایک ضخیم کتاب مرتب ہو سکتی ہے. اقبالؒ کی تمام شاعری اور شاعری کا تمام سوز و گداز رہینِ منت ہے محبتِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کا' جذبۂ اطاعت کا. اسی ذاتِ گرامیؐ کی شعلہ ریز محبت ہے جس نے اقبالؒ کو اقبال بنادیا ورنہ یہ بھی کہیں میرِ مشاعرہ ہوا کرتے. جذبۂ اطاعتِ[1] رسولؐ نے (جسے وہ عشق کہتے ہیں) اقبالؒ کو اس انداز سے گداز کر رکھا ہے کہ اس کے بربطِ ہستی کے کسی تار کو چھیڑیئے اس میں سے نغمہ وہی پیدا ہوتا ہے. اسی چیز نے ان کے سامنے قرآنی حقائق کو بے نقاب کیا اور قرآنی حقائق نے ان کے کلام میں دمِ مسیحا اور ضربِ کلیم کے اعجاز پیدا کردیئے. فطرت کی کرم گستری نے وہ دماغ عطا کیا تھا جو

---

[1] نظامِ اسلامی کی رُو سے کس طرح امامِ متفق علیہ (مرکزِ ملت) کی اطاعت' اطاعتِ خدا اور رسولؐ کے مرادف ہو جاتی ہے' قرآنِ کریم میں بہ صراحت اس کی تشریح موجود ہے. اسی جذبۂ اطاعت کے اندر قوموں کی زندگی کا راز ہے اور اس کو بُھلا دینے سے مسلمانوں کی آج یہ حالت ہو رہی ہے. اطاعت جب خوف و ترہیب سے بلند اور مزد و معاوضہ سے بے نیاز ہو جائے تو عشق بن جاتی ہے. ان امور کی تفصیل کے لئے دیکھئے ــــ اسلامی نظام۔

یکسر علم و حکمت تھا۔ محبتِ رسولؐ کی موہبتِ عظمیٰ سے وہ قلبِ منوّر مل گیا جسے صہبائے ایمان کا مقدس آبگینہ کہنا چاہیئے۔ ان دونوں کے امتزاج سے وہ نگاہ پیدا ہوئی جو اشیاء کی حقیقت کو بے نقاب دیکھ لے، جو گُل و خار کے نظر فریب امتیاز سے ہٹ کر شاخِ گُل کے اندر جا کر مشاہدہ کرلے کہ "درونِ اُو نہ گل باشد نہ خار است"۔ اسی نگۂ حقیقت شناس کا نام ہے اقبالؒ یعنی قلب و دماغ کا مجموعہ، ایمان و حکمت کا فشردہ، زیرکی و عشق کا عصارہ، اویسؒ و بوعلیؒ کا مرکب، مجسمہ، رومیؒ و رازیؒ کا مشترکہ شاہکار، مشرق و مغرب کا مقامِ اتصال۔

غربیاں را زیرکی سازِ حیات — شرقیاں را عشق رازِ کائنات
زیرکی از عشق گردد حق شناس — کارِ عشق از زیرکی محکم اساس
خیز و نقشِ عالمِ دیگر بنہ — عشق را با زیرکی آمیز دہ

اور یہی وہ امتزاجی کیفیت ہے جو قرآنِ کریم ایک مومن کے اندر پیدا کرنا چاہتا ہے۔ مظاہرِ فطرت کی گوناگوں نیرنگیوں کے بعد فرمایا۔

اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ اخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَ النَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الۡاَلۡبَابِ ۚۙ الَّذِیۡنَ یَذۡکُرُوۡنَ اللّٰہَ قِیٰمًا وَّ قُعُوۡدًا وَّ عَلٰی جُنُوۡبِهِمۡ ۵ (۳/۱۹۱-۱۹۰)

بیشک (ان مظاہرِ فطرت) کے اندر صاحبانِ عقل و خرد کے لئے آیات ہیں۔ یعنی وہ لوگ جو کھڑے بیٹھے اور لیٹے اللہ کو یاد کرتے ہیں۔

یہ عقل و بصیرت کے ساتھ خدا کو یاد کرنے والے وہ مومنین ہیں جنہیں نوعِ انسان کے لئے نمونہ بنایا گیا ہے۔

اور پھر سحابِ فطرت کا کرم بالائے کرم کہ اس نگۂ حقیقت بین کو اظہارِ جذبات کے لئے ذریعہ بھی ایسا حسین و دلکش عطا کر دیا کہ جو دیکھے کھنچا چلا آئے۔ بشرطیکہ وہ کہیں سے بوجہلؔ و بولہبؔ کی ہی آنکھیں نہ مانگ لایا ہو۔ اور پھر تماشہ یہ کہ یہ ملکوتی کام لیا اس شاعری سے جس کے علمبردار ابھی تک اس "تحقیقِ انیق" سے ہی فارغ نہیں ہو سکے کہ بُلبل مذکر ہے یا مونث۔ سچ ہے جب خدا چاہے تو ایک خشک لکڑی سے وہ کام لے لے کہ وہ کذب و باطل کے بڑے بڑے اژدہوں کو نگل جائے۔ یہ اور بات ہے کہ قومِ اقبالؒ کو بھی ایسی ہی ملی ہو جو قومِ موسیٰؑ کی طرح کہہ دے فَاذۡهَبۡ اَنۡتَ وَ رَبُّکَ فَقَاتِلَاۤ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوۡنَ۔ جا تو اور تیرا رب لڑو جا کر۔ ہم تو یہاں بیٹھے ہیں جب فتح

ہو جائے تو آواز دے دینا۔ بایں ہمہ یقین مانیئے کہ جس طرح قرآنِ کریم نے عرب کی شاعری کے دورِ جاہلیت کو ختم کرکے اسی قوم سے ایک ایسا خمیر تیار کر دیا تھا کہ وہ جس آٹے میں جا کر ملے اس میں بھی خمیر کی کیفیت پیدا کر دے۔ اقبالؒ نے بھی مشکوٰۃِ قرآن کی روشنی میں "عجمی شاعری" کے "دورِ جاہلیت" کو ختم کرکے ان کے افیونی اعصاب میں ایسا خونِ زندگی دوڑا دیا ہے کہ وہ دن دُور نہیں جب یہ زمین بدل جائے گی یہ آسمان بدل جائے گا اور مسلمان پھر یہ کہنے کے قابل ہو جائے گا کہ

زمیں از کوکبِ تقدیرِ ما گردوں شود روزے
فروغِ خاکیاں از نوریاں افزوں شود روزے

تلمیحاتِ اقبالؒ

(قرآنِ کریم سے)

ریڈیائی تقریر ـــــــ جنوری ۱۹۴۹ء

کسی مفکّر کے پیغام کا صحیح مفہوم سمجھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس کے فکر کے سرچشمہ کے متعلق صحیح معلومات بہم پہنچائی جائیں۔ اس لئے کہ جب تک اس کی اصل حقیقت معلوم نہ ہو جائے جس سے اس کے فکر کی شاخیں پھوٹی ہیں۔ اس کے برگ و بار کی ماہیت اور اہمیت کا صحیح صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا۔ اکثر مفکّرین اپنی اساسِ فکر کو اس طرح غیر معین اور مبہم چھوڑ جاتے ہیں کہ ان کے پیغام پر غور و فکر کرنے والوں کو اس اصل و اساس کے تعین میں بڑی دشواری پیش آتی ہے اور ان کے ناقدین و شارحین کی قیاسی سراغ رسانیوں سے یہ معمّہ پیچیدہ سے پیچیدہ تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ حتّٰی کہ کچھ عرصہ کے بعد ان کے پیغام پر ان قیاس آرائیوں کے اتنے دبیز پردے پڑ جاتے ہیں کہ حقیقت نگاہوں سے یکسر گم ہو جاتی ہے اور لوگ جسے ان مفکّرین کا پیغام سمجھتے ہیں وہ ان کے ناقدین و شارحین کی خیال آفرینیوں سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا۔ اس باب میں علامہ اقبالؒ کی ہستی ممتاز نظر آتی ہے کہ انہوں نے اپنے فکر کے سرچشمہ اور اپنے پیغام کی اساس کو اس طرح واضح اور غیر مبہم طور پر بیان کر دیا ہے کہ اس میں کسی ظن و تخمین اور قیاس و گمان کی گنجائش ہی نہیں رہنے دی۔ بایں ہمہ اسے ہماری لذت نکات آفرینی کہئے یا ذوقِ اعجوبہ پسندی کہ پیامِ اقبالؒ سے دلچسپی رکھنے والے گزشتہ دس برس سے اپنی تحقیق و جستجو میں سرگرداں و حیراں پھر رہے ہیں کہ علامہ اقبالؒ کے فکر کے ماخذ کیا تھے اور انہوں نے کن افکار و خیالات سے متاثر ہو کر

اپنا پیغام متعین کیا تھا۔ انہی قیاس آرائیوں کا نتیجہ ہے کہ کوئی ان کے فکر کو کانٹ کے فلسفہ کا رہین منت بتاتا ہے اور کوئی نیٹشے کے خیالات کا پرتو۔ کہیں انہیں برگسان کا آئینہ دار کہا جاتا ہے اور کہیں ہیگل کا خوشہ چیں۔ اور بہت کم ہیں جو یہ سوچتے ہیں کہ جب انہوں نے خود واضح طور پر بتا دیا ہے کہ ان کی فکر کا ماخذ کیا ہے اور وہ کن حقائق سے متاثر ہوئے ہیں تو پھر اس کاوشِ بے جا اور کاہشِ لاحاصل سے مقصود کیا ہے۔ اس میں کوئی کلام نہیں کہ علامہ مرحوم نے مشرقی و مغربی علومِ قدیمہ و جدیدہ کا بدقتِ نظر مطالعہ کیا تھا اور چونکہ فلسفہ ان کا خاص موضوع تھا اس لئے انہوں نے مغربی مفکرین کے افکار و تصورات پر گہری نظر ڈالی تھی۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کے فکر کی اساس ان مفکرین کے تصورات و نظریات پر تھی۔ ان کی فکر کی اساس ایک محکم اور مستقل حقیقت پر تھی جو نہ مشرق سے متاثر ہوئی ہے نہ مغرب سے۔ وہ اس کی تائید و تشریح میں مشرق و مغرب کے خیالات و تصورات کو استشہاداً پیش کرتے تھے۔ لیکن اسے ان کے قیاسات و مزعومات سے ملوث نہیں ہونے دیتے تھے۔ بلکہ وہ تو یہاں تک کہتے تھے کہ جس مقام سے وہ بات کر رہے ہیں وہ حکمت و فلسفہ کی حد سے ماوراء ہے۔

حکیم میری نواؤں کا راز کیا جانے وراے عقل ہیں اہلِ جنوں کی تدبیریں

عصرِ حاضر کے علوم و فنون کے متعلق انہوں نے واضح طور پر کہہ دیا کہ ان میں جو باتیں انہوں نے اس حقیقتِ ثابتہ کے مطابق پائی ہیں جس پر ان کے فکر کی اساس تھی انہیں تائیداً لے لیا گیا ہے اور جو چیزیں خلافِ حقیقت ہیں ان کے فریب کو بے نقاب کر دیا گیا ہے۔

طلسمِ علمِ حاضر را شکستم ربودم دانہ و دامش گسستم
خدا داند کہ مانندِ براہیم بہ نارِ او چہ بے پروا نشستم

غور کیجئے جو شخص دورِ حاضر کی علم و حکمت کو آتشِ نمرود قرار دے رہا ہو اس کے متعلق یہ کہنا کہ اس نے اپنی فکر کی اساس اس علم و حکمت پر رکھی تھی اس پر کتنا بڑا اتہام ہے۔ علومِ جدیدہ ہی نہیں، علومِ قدیمہ کے نظریات کے متعلق بھی ان کا یہی مسلک تھا۔ وہ ان غلط نظریاتِ زندگی اور تصوراتِ حیات کو "ملّا و صوفی" کی جامع اصطلاح سے تعبیر کرتے تھے۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ

بیا ساقی بگرداں ساتگیں را بیفشاں بر دو گیتی آستیں را
حقیقت را بہ رندے فاش کردند کہ ملا کم شناسد رمزِ دیں را

جدید و قدیم دونوں کے متعلق

نہ فلسفی سے نہ ملّا سے ہے غرض مجھ کو ۔۔۔ یہ دل کی موت وہ اندیشہ و نظر کا فساد

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب علامہ اقبالؒ نے اپنی فکر کو کہیں سے مانگے ہوئے افکار و تخیلات سے متاثر نہیں ہونے دیا تو وہ کون سی حقیقتِ ثابتہ تھی جس پر اس فکر کی اساس تھی۔ جیسا کہ میں نے شروع میں کہا ہے انہوں نے اسے ایسے واضح الفاظ میں بیان کر دیا ہے کہ اس کے متعلق کسی ظنّ و قیاس یا تاویل و تعبیر کی گنجائش ہی نہیں رہنے دی۔ ان کا پیغام سب سے پہلے منضبط صورت میں اسرار و رموز میں ہمارے سامنے آتا ہے جو ان کی سب سے پہلی تصنیف ہے۔ اس مثنوی کے آخر میں انہوں نے اس ذاتِ اقدس و اعظم (علیہ التحیۃ والسلام) کی بارگاہ میں ایک التجا پیش کی ہے جو ان کے عشق کی منتہیٰ، ان کی آرزوؤں کی محور اور ان کی تمناؤں کی مرکز تھی۔ اس دعا میں وہ کہتے ہیں کہ

گر دلم آئینۂ بے جوہر است ۔۔۔ ور بحرفم غیرِ قرآں مضمر است

یعنی اگر میرے پیغام میں قرآن کے سوا کچھ بھی اور ہے تو اے ختمِ رسلؐ، دانائے سبل!

پردۂ ناموسِ فکرم چاک کن ۔۔۔ ایں خیاباں را ز خارم پاک کن

یہیں تک نہیں بلکہ

روزِ محشر خوار و رسوا کن مرا ۔۔۔ بے نصیب از بوسۂ پا کن مرا

جن کی نگاہیں قلبِ اقبالؒ پر ہیں وہ اس شدّتِ احساس کا اندازہ لگا سکتے ہیں جس کے ماتحت انہوں نے اپنے حق میں اتنی بڑی تعزیر روا رکھی ہے۔ اس سے آگے چل کر وہ کہتے ہیں کہ

گر دُرِ اسرارِ قرآں سفتہ ام ۔۔۔ با مسلماناں اگر حق گفتہ ام

اگر میرا پیغام قرآن ہی کا ترجمان ہے تو

عرض کن پیشِ خدائے عزّ و جل ۔۔۔ عشقِ من گردد ہم آغوشِ عمل

میں نہیں سمجھتا کہ ایسے کھلے کھلے الفاظ کے بعد اس کی گنجائش بھی باقی رہ جاتی ہے کہ تحقیق کی جائے کہ اقبالؒ کے فکر کا سرچشمہ کیا تھا اور ان کی نگاہیں کس آفتابِ حقیقت سے مستنیر تھیں۔ میرے نزدیک اقبالؒ کی عظمت و عقیدت اسی بنا پر ہے کہ انہوں نے جو کچھ سمجھا قرآن سے سمجھا اور جو کچھ سمجھایا قرآن سے سمجھایا۔ ان کی مے سخن براہِ راست خمکدۂ حجاز سے سربمہر آبگینوں میں آیا کرتی تھی اور

اس میں کسی قسم کی آمیزش نہیں ہوتی تھی۔ ان کا مسلک یہ تھا کہ

از تاک بادہ گیرم و در ساغر افگنم

اقبالؔ کے پیغام کو سامنے رکھئے اور پھر دیکھئے کہ اس میں جہاں جہاں قرآن کا ذکر آتا ہے وہ کس جذب و شوق اور کیف و مستی سے جھومتے نظر آتے ہیں۔ اقبالؔ کے نزدیک قرآن کیا ہے' وہ کہتے ہیں۔

تو ہمی دانی کہ آئینِ تو چیست — زیرِ گردوں سرِّ تمکینِ تو چیست
آں کتابِ زندہ قرآنِ حکیم — حکمتِ او لایزال است و قدیم
نسخۂ اسرارِ تکوینِ حیات — بے ثبات از قوتش گیرد ثبات
حرفِ اُو را ریب نے تبدیل نے — آیہ اش شرمندۂ تاویل نے
نوعِ انساں را پیامِ آخریں — حاملِ اُو رحمۃ للعالمیں

اور سنئے۔

فاش گویم آنچہ در دل مضمر است — ایں کتابے نیست چیزے دیگر است
صد جہانِ تازہ در آیاتِ اوست — عصرہا پیچیدہ در آناتِ اوست
بندۂ مومن ز آیاتِ خدا است — ہر جہاں اندر برِ اُو چوں قبا است
چوں کہن گردد جہانے در برش — می دہد قرآں جہانے دیگرش

یہ ہوسکتا ہے کہ آپ کو اقبالؔ کے فہمِ قرآں کے کسی مقام سے اختلاف ہو۔ لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان کے فکر کی اساس کچھ اور تھی۔ اب آپ یہ سوچیئے کہ جس مفکّر کے فکر کا سرچشمہ قرآن ہو۔ نہیں! بلکہ جس کا دعویٰ یہ ہو کہ میرے پیغام میں غیر قرآن ایک حرف بھی نہیں' اس کے پیغام سے قرآن کی تلمیحات پیش کرنا' اس کے پورے کے پورے پیغام کو پیش کرنا ہوگا۔ تلمیحِ قرآنی کے معنی یہ ہیں کہ اگر علامہ اقبالؔ اپنے کسی شعر میں قرآن کی کسی آیت کا کوئی لفظ یا ٹکڑا لاتے ہیں تو یہ بتا دیا جائے کہ اس سے کس آیتِ قرآنی کی طرف اشارہ ہے مثلاً انہوں نے اپنی نظم خضرِ راہ کے ایک مصرعہ میں لکھا ہے۔

آ بتاؤں تجھ کو رمزِ آیۂ اِنّ الملوک

تو اِنّ الملوک کی تلمیح سے اشارہ ہے سورۂ نمل کی اس آیۂ مقدسہ کی طرف کہ قَالَتْ اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا وَجَعَلُوْٓا اَعِزَّةَ اَهْلِهَآ اَذِلَّةً ۚ وَكَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ۔ ملکہ سبا

نے کہا کہ بادشاہ جب کسی بستی (کو فتح کر کے) اس میں داخل ہوتے ہیں تو اس کا تختہ اُلٹ دیتے ہیں اور وہاں کے صاحبِ عزت و حشمت لوگوں کو ذلیل و خوار کر دیتے ہیں اور یہ کوئی ہنگامی چیز نہیں بلکہ ملوکیت کا خاصہ ہی یہ ہے۔

جیسا کہ میں نے ابھی ابھی کہا ہے چونکہ اقبالؒ کے پیغام کا ماخذ ہی قرآن ہے، اس لیے ان کی جس کتاب کو اٹھایئے آپ دیکھیں گے کہ قرآنی آیات کی طرف اشارہ پر اشارہ چلا آ رہا ہے۔ کہیں خود قرآن کے الفاظ میں اور کہیں قرآنی مفہوم اپنے الفاظ میں۔ مثلاً اسرار و رموز کے چند الفاظ لیجئے۔

آنکہ بر اعدا درِ رحمت کشاد مکہ را پیغامِ لَا تَثْرِیْب داد

نبیٔ اکرمؐ نے جب مکہ فتح کیا ہے تو سردارانِ قریش جنہوں نے حضورؐ کی ایذا رسانی اور تکلیف دہی میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی پابجولاں سامنے کھڑے تھے۔ دنیا کے ہر قانون کی رُو سے ان کی سزا قتل تھی لیکن حضورؐ نے اپنے انتہائی عفوِ کریمانہ سے کام لیا اور فرمایا کہ لَا تَثْرِیْبَ عَلَیْکُمُ الْیَوْمَ۔ جاؤ! تم سے کچھ مواخذہ نہ ہوگا۔ قرآنِ کریم میں یہ الفاظ حضرت یوسفؑ کی زبان سے آئے ہیں جب انہوں نے اپنے بھائیوں کی ہر خطا کو معاف کر دیا تھا۔ ایک اور شعر ہے۔

ایکہ در زندانِ غم باشی اسیر از نبی تعلیمِ لَا تَحْزَن بگیر

شبِ ہجرت کی صبح نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکر صدیقؓ کی معیت میں ایک غار میں چھپے بیٹھے تھے کہ دشمنوں کے پاؤں کی آہٹ کان میں آئی۔ حضورؐ کی حفاظت کے خیال سے حضرت صدیق اکبرؓ کی پیشانی پر تردّد کے آثار نمایاں ہو گئے۔ حضورؐ نے اسے بھانپا اور دل کے کامل سکون اور اطمینان سے فرمایا کہ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا۔ مت گھبراؤ! ہم اکیلے نہیں۔ اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ یہی ہے وہ واقعہ جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ

از نبی تعلیمِ لَا تَحْزَنْ بگیر

یا مثلاً جب صاحبِ ضربِ کلیم حضرت موسیٰؑ کا ساحرینِ دربارِ فرعون سے آمنا سامنا ہوا اور جادوگروں کی رسّیاں دیکھنے والوں کی نگاہوں میں سانپ بن کر دوڑنے لگیں تو حضرت موسیٰؑ کو خیال پیدا ہوا کہ

---

[1] یہ قرآن کی متعلقہ آیات کے لغوی معانی ہیں۔ ان کا مجازی مفہوم کچھ اور ہے جسے میں نے "برقِ طور" میں بیان کیا ہے۔

کہیں لوگ ان کی نگاہ فریبی سے متأثر ہوکر باطل کی طرف نہ جھک جائیں۔ اس پر اللہ کی طرف سے ارشاد ہوا کہ لَا تَخَفْ اِنَّکَ اَنْتَ الْاَعْلٰی۔ اے موسیٰ! مت گھبراؤ۔ یقیناً تم ہی غالب رہو گے۔ اقبالؒ مردِ مومن کے متعلق فرماتے ہیں کہ:

چوں کلیمے سوئے فرعونے رود قلبِ او از لاتخف محکم شود

ان اشعار میں تو آیاتِ قرآنی کے ایک ایک دو دو الفاظ ہی آتے ہیں۔ بعض اوقات پورے کا پورا مصرعہ آیتِ قرآنی پر مشتمل ہوتا ہے۔ مثلاً وطنیت کے پرستاروں کے متعلق کہتے ہیں۔

جنتے جستند در بِئْسَ الْقَرَار تا اَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَار

سورۂ ابراہیم میں ہے۔ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ كُفْرًا وَّ اَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ ۙ جَهَنَّمَ يَصْلَوْنَهَا وَ بِئْسَ الْقَرَار۔ کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنہوں نے خدا کی نعمتوں کی ناسپاس گزاری کی اور اس طرح اپنی قوم کو ہلاکت کے گھر میں لے گئے یعنی جہنّم میں داخل ہو گئے اور وہ کیسی بُری جگہ ہے ٹھہرنے کی۔

ان اشعار میں قرآنی الفاظ سے آیاتِ قرآنی کی طرف اشارے کئے گئے ہیں۔ لیکن ایسے اشعار بھی ہیں جن میں اپنے الفاظ میں قرآنی آیات کی طرف تلمیحات ہیں۔ مثلاً حضرت ابراہیمؑ کے متعلق فرماتے ہیں۔

بہر ما ویرانہ آباد کرد طائفاں را خانہ بنیاد کرد

پہلے مصرعہ میں ویرانہ سے اشارہ ہے سورۂ ابراہیم کی اس آیتِ جلیلہ کی طرف جس میں حضرت ابراہیمؑ نے بحضورِ ربّ العزت عرض کیا تھا۔ رَبَّنَا اِنِّیْ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِیْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِیْ زَرْعٍ۔ ہمارے پروردگار! میں نے اپنی اولاد میں سے بعض کو اس وادی میں آباد کر دیا ہے جس میں شگفتگی و شادابی کا نام و نشان تک نہیں۔ اور دوسرے مصرعہ (طائفاں را خانہ بنیاد کرد) میں اشارہ ہے سورۂ بقرہ کی اس آیت کی طرف جس میں ارشاد ہے کہ وَ عَهِدْنَا اِلٰى اِبْرٰهِيْمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِیَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَ الْعٰكِفِيْنَ وَ الرُّكَّعِ السُّجُوْدِ اور ہم نے ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ کو حکم دیا کہ وہ طواف کرنے والوں اور اعتکاف کرنے والوں اور رکوع و سجود کرنے والوں کے لئے ہمارے گھر کو پاک کر دیں۔

میں نے ان اشعار کو محض تمثیلاً پیش کیا ہے ورنہ مفہوم کے اعتبار سے اقبالؒ کے پورے

پیغام سے بتایا جا سکتا ہے کہ وہ قرآن کے کس مقام کا ترجمان ہے۔ وہ اپنے الفاظ کے پردے میں سب کچھ کہہ گئے ہیں۔ پیامِ مشرق میں ہے۔

پردہ برگیرم و در پردہ سخن می گویم
تیغ خوں ریزم و خود را بہ نیامے دارم

لہٰذا اگر یہ صحیح ہے کہ کسی مفکر کے پیغام کی حقیقت سمجھ میں نہیں آسکتی جب تک اس کے پیغام کے ماخذ اور اس کے فکر کی اساس کو نہ سمجھا جائے تو اس میں کوئی کلام نہیں کہ اقبالؒ کے پیغام کو نہیں سمجھا جا سکتا جب تک پڑھنے والے کے سامنے قرآن نہ ہو۔ جو اقبالؒ کو اس طرح نہیں سمجھتا وہ اس کے الفاظ میں کھو کر رہ جاتا ہے حقیقت تک نہیں پہنچ سکتا۔ انہی کے متعلق اقبالؒ نے کہا تھا کہ

آشنائے من ز من بیگانہ رفت — از خمستانم تہی پیمانہ رفت
من شکوہِ خسروی او را دہم — تختِ کسریٰ زیرِ پائے او نہم
او حدیثِ دلبری خواہد ز من — رنگ و آبِ شاعری خواہد ز من

کم نظر بیتابیٔ جانم نہ دید
آشکارم دید و پنہانم نہ دید

اقبالؒ اور ملّت

(۱۹۴۰ء کے یومِ اقبالؒ کی تقریر)

۱۹۳۸ء میں جب پہلا یومِ اقبالؒ منایا گیا تو میں نے مسلم برادرہُڈ کی خدمت میں ہدیۂ تبریک پیش کرتے ہوئے کہا تھا کہ حضرت علامہ (علیہ الرحمتہ) کی یاد میں سر جھکائے آنکھوں میں آنسو ڈبڈبائے یومِ اقبالؒ تو سینکڑوں منائے جائیں گے لیکن گلے میں پھولوں کے ہار ڈال کر زمزمۂ تہنیت و غلغلۂ تبریک سے سرمست یومِ اقبالؒ منانے کا سہرا برادرہُڈ کے سر ہی رہے گا۔ نہ جانے وہ کونسی قوت تھی جس نے میری زبان سے اس وقت یہ الفاظ کہلوا دیئے کہ دوسرے ہی سال ہمیں سر جھکائے آنکھوں میں آنسو ڈبڈبائے "یومِ اقبالؒ" منانا پڑا۔ بہرحال، میں اس وقت اپنے بربطِ ہستی کے ان تاروں کو نہیں چھیڑنا چاہتا جس میں یہ المیہ نغمات خوابیدہ ہیں کہ ہمیں ایسے مواقع پر سکھایا یہ گیا ہے کہ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ۙ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ۝ (۲/۱۵۵-۱۵۶)

آپ کو معلوم ہے کہ میرا مستقل موضوع ہوتا ہے "پیامِ اقبالؒ اور قرآن کریم"۔ اس لئے کہ میرے نزدیک حضرت علامہ کی صحیح عظمت و عقیدت اسی بنا پر ہے کہ انہوں نے جو کچھ سمجھا قرآن سے سمجھا اور جو کچھ کہا قرآن سے کہا۔ ان کے پیام کا سرچشمہ نہ افلاطون و فارابی کے تصورات کی دنیا ہے اور نہ کانٹ اور ہیگل کے تخیلات کا عالم۔ انہوں نے جس قدر اکتسابِ ضیا کیا اللہ کی اسی شمعِ نورانی سے کیا۔ ان کی مئے سخن براہِ راست خمستانِ حجاز سے سربمہر آبگینوں میں آتی تھی تاکہ اس میں کسی قسم کی آمیزش نہ ہونے پائے۔ ان کا مسلک یہ تھا کہ

از تاک بادہ گیرم و در ساغر افگنم

سالِ گذشتہ میں نے اس وسیع موضوع کے ایک ضمنی گوشے یعنی اسلامی فلسفۂ اجتماعیت کے متعلق کچھ عرض کیا تھا. اس وقت "اقبالؒ اور ملت" کے عنوان سے کچھ گزارش کروں گا. اسے دراصل سالِ گذشتہ کے سلسلہ ہی کی ایک کڑی سمجھئے. وما توفیقی اِلّا باللّٰہ العلی العظیم.

اگر آپ اسلام اور دیگر ادیانِ[1] عالم پر ایک سرسری نگاہ ڈالیں تو آپ کو ان دونوں میں ایک بیّن فرق نظر آئے گا. دنیا کے دیگر مذاہب کا منتہائے مقصود یہ ہے کہ انسان کو اس کی اپنی نجات کا طریقہ سکھائیں. اُسے بتائیں کہ اُس کی مُکتی کیسے ہو سکتی ہے. وہ (SALVATION) کس طرح حاصل کر سکتا ہے اور اس نجات، مکتی یا (SALVATION) کے حصول کے لئے سکھایا یہ جاتا ہے کہ انسان دنیا کے دھندوں سے الگ ہو کر ایشور کی بھگتی میں مگن ہو جائے. ان مذاہب میں خدا کا مقرب وہی سمجھا جاتا ہے جو اس کے بندوں سے دُور ہوتا چلا جائے. گرہست آشرم اور سنیاس آشرم ایک انسان کی

اسلام کا مقصود

دو مختلف زندگیوں کے نام ہیں جو کبھی یک جا نہیں ہو سکتے. کلیسا کا راہب بیوی بچوں کی زندگی سے دُور بھاگتا ہے. کیونکہ اسے ان میں شیطان کی روح نظر آتی ہے. سلطنت اور مذہب (CHURCH AND STATE) نظامِ عالم کے دو جداگانہ شعبے ہیں جن میں کبھی تطابق و توافق پیدا نہیں ہو سکتا. لیکن اس کے برعکس اسلام دنیا کو ایک اور ہی سبق دیتا ہے. وہ کہتا ہے کہ دین انسان کی عملی زندگی کے ہر شعبے کو محیط ہے. اس کے حدود و قیود وہ پختہ ساحل ہیں جو حیاتِ انسانی کی جوئے رواں کا رُخ متعین کرتے ہیں. اسلام کے نزدیک دین کا منشا محض ایک انسان کی انفرادی نجات نہیں بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ خدا کی اس وسیع و عریض زمین پر جسے انسانی چیرہ دستیوں اور ہوس پرستیوں نے جہنم بنا رکھا ہے، خدا کی بادشاہت قائم کی جائے. اس نظامِ زندگی، اس ضابطۂ حیات کا نام ہے اسلام. یہ بھی ظاہر ہے کہ اس قرآنی نظام

---

[1] دنیا میں دینِ خداوندی صرف ایک ہی ہے جسے اسلام کہتے ہیں اور جو قرآن کے اندر محفوظ ہے. باقی سب مذاہب ہیں. خدا کے رسول دین پیش کرتے ان کے متبعین ان کے بعد اس دین میں اپنی طرف سے آمیزش کر دیتے تھے. دین کی اس تحریف شدہ شکل کو مذہب کہتے ہیں.

کے قیام و بقا کے لئے اللہ کے سپاہیوں کی ایک جماعت کی ضرورت ہوگی، اس جماعت کا نام ہے ملتِ اسلامیہ، جو دنیا میں اپنے لئے نہیں بلکہ اپنے خدا کے لئے جیتی اور اسی کے لئے مرتی ہے۔ قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَ نُسُکِیْ وَ مَحْیَایَ وَ مَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ۔

ہم تو جیتے ہیں کہ دنیا میں ترا نام رہے
کہیں ممکن ہے کہ ساقی نہ رہے جام رہے

لیکن برادران! اسلام کی اس امتیازی تعلیم پر غیر اسلامی تصورات اس درجہ غالب آگئے کہ حیاتِ اجتماعیہ کا یہ نظریہ مسلمانوں کی نگاہوں سے یکسر اوجھل ہو گیا اور دیگر مذاہب کی طرح اسلام کے متعلق بھی یہی سمجھ لیا گیا کہ اس کا مقصد انسان کی انفرادی نجات ہے۔ اگرچہ یہ عجمی نظریہ مسلمانوں کے ذہن پر ایک عرصہ سے مسلط تھا لیکن دورِ حاضرہ میں ان لوگوں کی طرف سے جو سمجھتے تھے کہ اسلام کا یہ امتیازی نشان ان کے بعض مخصوص مقاصد کی راہ میں ایک سنگِ گراں بن کر حائل ہے' اس نظریہ کو بڑا نمایاں کر کے دکھایا گیا اور ہر جگہ اس کا ڈھنڈورا پیٹا گیا کہ مذہب انسان کے پرائیویٹ عقیدہ کا نام ہے۔ عملی زندگی میں اس کا کوئی دخل دائرہ نہ ہونا چاہیئے۔ ایسے پُر آشوب زمانے میں جب کہ مذہب کے متعلق اپنوں اور بیگانوں کی طرف سے اس قسم کے غیر اسلامی تصورات کو عام کیا جا رہا تھا۔ ملتِ اسلامیہ کی خوش بختی سے ان کے اندر ایک مردِ مومن پیدا ہوا جس نے

اقبالؒ

اپنی بصیرتِ قرآنی اور جراَتِ ایمانی سے مسلمانوں کے سامنے ان کے اس گم گشتہ نظریہ کو پھر سے نمایاں کیا اور پوری قوت سے اعلان کیا کہ لَا اِسْلَامَ اِلَّا بِالْجَمَاعَةِ۔

فرد را ربطِ جماعت رحمت است — جوہرِ اُو را کمال از ملت است
تا توانی با جماعت یار باش — رونقِ ہنگامۂ احرار باش
فرد می گیرد ز ملت احترام — ملت از افراد می یابد نظام
فرد تا اندر جماعت گم شود — قطرۂ وسعت طلب قلزم شود

فرد اور ملت کی مثال ایک گھڑی کے پرزوں کی سی ہے۔ پرزے الگ الگ بکھرے پڑے ہوں تو ایک ایک پرزہ کتنا ہی قیمتی اور کیسا ہی مضبوط کیوں نہ ہو کسی کام کا نہیں۔ لیکن اگر یہی پرزے ایک خاص نظام کے ماتحت گھڑی کے اندر فٹ (FIT). ہو جائیں تو ہر پرزہ کی حرکت تمام مشینری پر

اثر انداز ہو گی اور یوں ان پُرزوں کی حرکات کے جیتے جاگتے درخشندہ و تابندہ نتائج آنکھوں کے سامنے آجائیں گے۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَ صَابِرُوْا وَ رَابِطُوْا قف وَ اتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ٥ (۳/۲۰۰)

اگر آپ حضرت علامہ کے کلام پر اس نگاہ سے غور کریں گے تو آپ پر یہ حقیقت بے نقاب ہو جائے گی۔

ملت اور مرکز

کہ آپ کے پیام کا نقطۂ ماسکہ ہے ملت اور مرکز۔ اور اسلام فی الحقیقت انہی کے التزام کا نام ہے۔ یہ گئے تو اسلام بھی گیا۔

اپنی اصلیت پہ قائم تھا تو جمعیت بھی تھی — چھوڑ کر گُل کو پریشاں کاروانِ بُو ہوا
پھر کہیں سے اس کو پیدا کر بڑی دولت ہے یہ — زندگی کیسی جو دل بے گانۂ پہلو ہوا
آبرو باقی تری ملت کی جمعیت سے تھی — جب یہ جمعیت گئی دُنیا میں رسوا تو ہوا
فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں — موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

یہ تصور کہ ملت کا شیرازہ منتشر ہو چکا ہے اس کی اجتماعیت فنا ہو چکی ہے، ان کی وحدت پارہ پارہ ہو چکی ہے، ان کی مرکزیت انفرادیت میں گُم ہو چکی ہے، حضرت علامہ کو خون کے آنسو رلاتا تھا۔ بحضور رسالت مآبؐ عرض کرتے ہیں۔

ہنوز ایں چرخِ نیلی کج خرام است — ہنوز ایں کارواں دور از مقام است
زکارِ بے نظامِ اُو چہ گویم — تو می دانی کہ ملت بے امام است

ان کے نزدیک ایک مسلمان کی تعریف (DEFINITION) ہی یہ ہے کہ وہ اپنی خودی کو مستحکم کر کے ملت کا جزوِ لاینفک بن جائے اور یوں بقائے دوام اور حیاتِ جاوید کے بلند ترین مقام پر سرفراز ہو جائے۔ وہ دنیائے عشق میں ایک نئے باب کا اضافہ کرتے ہیں۔ وہ تصوّف کے عجمی تصور کو پھر سے اسلامی بنیادوں پر استوار کرتے ہیں۔ وہ انا الحق کی جگہ انا الملت کا نعرہ لگانا سکھاتے ہیں۔

مسلمانی غمِ دل در خریدن — چوں سیماب از تپِ یاراں تپیدن
حضورِ ملت از خود در گذشتن — دگر بانگِ انا الملت کشیدن

"چوں سیماب از تپ یاراں تپیدن"۔۔۔ نبیٔ اکرمؐ نے فرمایا کہ تمام رُوئے زمین کے مسلمانوں کی مثال ایک جسدِ واحد کی سی ہے. اگر پاؤں کے انگوٹھے میں کانٹا چبھ جائے تو آنکھ کے آبگینے میں آنسو چھلک آئیں. اگر افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں میں کسی حبشی کے تلوے میں آبلہ پڑ جائے تو گل کدۂ ایران میں حریر و اطلس کے گدوں پر لیٹے ہوئے شاہنشاہ کی آنکھوں میں نیند حرام ہو جائے. علاوہ بریں اپنے آپ کو ملت کا جزو بنا دینے اور اس طرح خود ملت بن جانے کے نکتہ پر بھی غور فرمایا آپ نے؟ اسلام ملتِ ابراہیمی کا نام ہے اور حضرت ابراہیمؑ کے متعلق قرآن کریم میں ہے.

اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِيْفًا

یقیناً ابراہیم ایک فردِ واحد نہیں تھا بلکہ ایک (پوری پوری) ملتِ قانتا کو اپنی ذات میں سموئے ہوئے تھا اور تمام دنیا سے کٹ کر سیدھا اسی کے راستے پر قائم تھا.

بہ چشمِ کم مبیں تنہائیم را		کہ من صد کارواں اندر کنارم

چونکہ اس زمین پر حکومتِ الٰہیہ کے قیام کی ذمہ دار ملتِ اسلامیہ ہے. اس کی سلطنت کا تخت اسی کے ہاتھوں بچھایا جائے گا. اس لئے اگر یہ ملت (افراد نہیں ملت) انا الحق کا دعویٰ بھی کرے تو بیجا نہیں.

انا الحق جز مقامِ کبریا نیست		سزائے او چلیپا ہست یا نیست
اگر فردے بگوید سرزنش بہ		اگر قومے بگوید ناروا نیست

لیکن یہ انا الحق کا دعویٰ زیب کس قوم کو دیتا ہے. فرماتے ہیں.

بآں ملت انا الحق سازگار است		کہ از خونش نم ہر شاخسار است
نہاں اندر جلالِ اُو جمالے		کہ او را نہ سپہر آئینہ دار است

وہ اُمت جو

میانِ اُمتاں والا مقام است

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (۳/۱۱۰)

کہ آں اُمت دو گیتی را امام است

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ۝ (۲/۱۴۳)

پرے ہے چرخِ نیلی فام سے منزل مسلماں کی　　ستارے جس کی گردِ راہ ہوں وہ کارواں تو ہے

ہاں! وہ اُمت کہ

میانِ اُمتاں والا مقام است　　کہ آں امت دو گیتی را امام است

نیاساید ز کارِ آفرینش　　کہ خواب و خستگی بروے حرام است

وہ اُمت کہ جس کا اندازِ زندگی یہ ہو کہ

پرد در وسعتِ گردوں یگانہ

جن بلندیوں پر یہ اڑے کسی اور کے شہپرِ تخیل کی بھی وہاں تک رسائی نہ ہو۔

مومنے بالائے ہر بالا ترے　　غیرتِ اُو برنتابد ہمسرے

وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ۝ ۳/۱۳۹

بخود نگر وہ مسلمان سے کہتے ہیں کہ تو نے اپنے مقام کو پہچانا ہی نہیں. تہذیبِ یورپ کے جھوٹے نگوں کی مینا کاری تیری نگاہوں کو یوں ہی خیرہ کر گئی حالانکہ اگر تو کبھی اپنے آپ سے باخبر ہو جاتا تو خود محسوس کر لیتا کہ

فرنگ سے بہت آگے ہے منزلِ مومن　　قدم اٹھا یہ مقام انتہائے راہ نہیں

یورپ کا مادہ پرست اسی جہانِ آب و گل کی چار دیواری میں محبوس ہو کے رہ گیا. اس کی نگہِ تجسس نے بہت بڑی جست کی تو کسی کرے سے ٹکرا کر نیچے گر پڑی. اس کے برعکس، مومن کو قرآن یہ سکھاتا ہے کہ

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں　　ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

اسی روز و شب میں اُلجھ کر نہ رہ جا　　کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں

اقبالؒ نے اس ملت کے متعلق کہا ہے کہ

پرد در وسعتِ گردوں یگانہ. وہ آسمان کی بلندیوں پر بلا شریک و سہیم اڑتی ہے. لیکن اتنی بلندیوں پر اڑنے کے باوجود، نگاہِ اُو بشاخِ آشیانہ ــــ اس کے قلب کا رشتہ مرکز سے وابستہ رہتا ہے۔

ہیچو پرکاریم پائے در شریعت مستقیم　　پائے دیگر سیر ہفتاد و دو ملت کردہ ایم[1]

---

[1] یہ شعر اقبالؒ کا نہیں۔

مرکز

کہ اگر پاؤں مرکز سے اکھڑ گیا تو دائرۂ کائنات بگڑ گیا. اگر آشیانے سے نگاہ اچٹ گئی تو فضا کی پہنائیوں میں کھو گیا. کیا آپ نے شہد کی مکھیوں کی طرف نہیں دیکھا (وَ اَوْحٰی رَبُّكَ اِلَی النَّحْلِ) سیکڑوں اور ہزاروں میل کی مسافت طے کرتی ہیں. ایک سے ایک الگ ہو جاتی ہے. قسم قسم کے باغات اور رنگا رنگ کی وادیوں میں جا نکلتی ہیں لیکن وہ کبھی اس فضائے رنگ و بو میں کھو نہیں جاتیں. وہ کلی کلی کا رس چوستی ہیں. اس تمام خارجی فضا کو اپنے اندر جذب کر لیتی ہیں. لیکن اس عالمِ رنگ و تعطر میں، اس جہانِ کیف و کم میں 'قلب' کا رشتہ اپنے مرکز سے قائم رکھتی ہیں اور ہر ایک اپنی اپنی محنتوں کا سرمایہ، اپنی اپنی تگ و دو کا ماحصل امیرِ ملت کے قدموں میں ڈھیر کر دیتی ہے. یہی کیفیت ملتِ اسلامیہ کی ہے.

بپرّد در وسعتِ گردوں یگانہ — نگاہِ او بشاخِ آشیانہ
مہ و انجم گرفتارِ کمندش — بدستِ اوست تقدیرِ زمانہ

اس ملت کی صفات کیا ہوں گی؟

بباغاں عندلیبے خوش صفیرے — براغاں جرّہ بازے زود گیرے

یعنی

مصافِ زندگی میں سیرتِ فولاد پیدا کر — شبستانِ محبت میں حریر و پرنیاں ہو جا
گزر جا بن کے سیلِ تند رو کوہ و بیاباں سے — گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہو جا

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَ الَّذِیْنَ مَعَهٗ اَشِدَّآءُ
عَلَی الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ

جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم — دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفاں

ہاں!

بباغاں عندلیبے خوش صفیرے — براغاں جرّہ بازے زود گیرے
امیرِ او بہ سلطانی فقیرے — فقیرِ او بہ درویشی امیرے

ایک زندہ و پائندہ قوم، جیتی جاگتی قوم، وہ قوم جس کے اعمالِ صالح کے درخشندہ نتائج دیکھ کر دنیا پکار اٹھے کہ

نشاں یہی ہے زمانے میں زندہ قوموں کا — کہ صبح و شام بدلتی ہیں ان کی تقدیریں
کمالِ صدق و مروّت ہے زندگی ان کی — معاف کرتی ہے فطرت بھی ان کی تقصیریں
قلندرانہ ادائیں سکندرانہ جلال — یہ امتیں ہیں جہاں میں برہنہ شمشیریں

اسی غزل کا ایک اور شعر ہے۔

شکوۂ عید کا منکر نہیں ہوں میں لیکن — قبولِ حق ہیں مردِ حق کی تکبیریں

مختلف تکبیروں میں کس قدر فرق ہے. فرماتے ہیں.

الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں لیکن — ملّا کی اذاں اور مجاہد کی اذاں اور
پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں — کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور

وحدتِ ملت

مسلمان سے پوچھتے ہیں کہ

چیست ملت ایکہ گوئی لَا اِلٰہ — با ہزاراں چشم بودن یک نگاہ
ذرہ ہا از یک نگاہی آفتاب — یک نگہ شو تا شود حق بے نقاب
مردہ ! از یک نگاہی زندہ شو — بگذر از بے مرکزی پایندہ شو
وحدتِ افکار و کردار آفریں — تا شوی اندر جہاں صاحب نگیں

توحید نام ہی وحدت و یک نگہی کا ہے. تفرقہ قرآن کے نزدیک شرک ہے.

وَ لَا تَکُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ ۙ مِنَ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَھُمْ وَ کَانُوْا شِیَعًا ؕ کُلُّ حِزْبٍۭ بِمَا لَدَیْھِمْ فَرِحُوْنَ ○ $\frac{30}{31\text{-}32}$

مسلمانو! دیکھنا کہیں تم مشرکین میں سے نہ ہو جانا. یعنی ان لوگوں میں سے جو دین میں تفرقہ پیدا کر دیتے ہیں اور خود ایک فرقہ بن بیٹھتے ہیں. (پھر یہ حالت ہو جاتی ہے کہ) کہ ہر فرقہ اپنے اپنے مسلک میں مگن ہو جاتا ہے.

حضرت علیؓ کا قول ہے.

اِیَّاکُمْ وَ التَّفَرُّقَۃَ. فَاِنَّ الشَّاذَ مِنَ النَّاسِ لِلشَّیْطَانِ کَمَا اِنَّ الشَّاذَ مِنَ الْغَنَمِ لِلذِّئْبِ. اِلَا ! مَنْ دَعَا اِلٰی ھٰذَا الشِّعَارِ فَاقْتُلُوْا. وَ لَوْ کَانَ تَحْتَ عِمَامَتِیْ ھٰذَا.

ہمیشہ تفرقہ سے بچو یاد رکھو جو شخص ملت سے کٹ کر تنہا رہ جاتا ہے وہ اسی طرح شیطان کا شکار ہو جاتا ہے جس طرح ایک بھیڑ گلے سے جدا ہو کر بھیڑیئے کا شکار ہو جاتی ہے! دیکھو! جو شخص تمہیں اس شعار کی طرف دعوت دے اسے قتل کر ڈالو خواہ وہ سر پر سے ہی عمامہ کے نیچے کیوں نہ ہو۔

ہوس نے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے نوع انساں کو اخوت کا بیاں ہو جا محبت کی زباں ہو جا
یہ ہندی وہ خراسانی یہ افغانی وہ تورانی تو اے شرمندۂ ساحل اچھل کر بیکراں ہو جا
غبار آلودۂ رنگ و نسب ہیں بال و پر تیرے
تو اے مرغ حرم اڑنے سے پہلے پرفشاں ہو جا

نبی اکرمؐ نے فرمایا۔

عَلَيْكُمْ بِالْجَمَاعَةِ فَاِنَّهُ مَنْ شَذَّ شُذَّ فِي النَّارِ

ہمیشہ جماعت کے ساتھ رہو۔ جو جماعت سے الگ ہوا سیدھا جہنم میں گیا۔

ہر کہ از بند خودی وارست مُرد ہر کہ با بیگانگاں پیوست مُرد

ایسے مسلمان جو ملت اسلامیہ سے اس لئے برگشتہ ہو جاتے ہیں کہ یہ نکبت و ادبار کے نرغے میں آچکی ہے۔ یہ دور انحطاط سے گزر رہی ہے۔ اس میں کوئی جاذبیت نہیں رہی۔ انہیں مخاطب کر کے فرماتے ہیں ۔۔ اور سنیئے کہ کس دلگداز پیرایہ میں فرماتے ہیں کہ:۔

کہن شاخے کہ زیر سایۂ او پر برآوردی چوں برگش ریخت از وے آشیاں برداشتن ننگ است

ملت اسلامیہ کا وہ شجر مقدس جس کے سایہ میں تم پروان چڑھے جس نے تمہارے جیسے بے بال و پر ناتواں کو وہ بازوئے شاہیں عطا کئے جس سے تمہاری بلندیٔ پرواز کی داستانیں زبان زد خلائق ہو گئیں۔ اگر آج اس درخت پر خود تمہاری ہی بدولت خزاں کا دور آگیا ہے تو اسے چھوڑ کر کسی اور سرسبز ٹہنی پر جا بسیرا کرنا دنیائے خودداری میں بڑی ہی گری ہوئی بات ہے۔ مسند امام احمد حنبلؒ کی ایک روایت ہے۔

قَالَ صَلْعَمْ اَنَا اٰمُرُكُمْ بِخَمْسٍ اللّٰهُ اَمَرَنِيْ بِهِنَّ اَلْجَمَاعَةَ وَ السَّمْعَ وَ الطَّاعَةُ وَ الْهِجْرَةُ وَ الْجِهَادُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَاِنَّهٗ مَنْ خَرَجَ مِنَ الْجَمَاعَةِ شِبْرًا فَقَدْ خَلَعَ رِبْقَةَ الْاِسْلَامِ

مِنْ عُنُقِہٖ۔ قَالُوْا یَارَسُوْلَ اللّٰہِ۔ وَ اِنْ صَامَ وَ صَلّٰی. قَالَ وَ اِنْ صَلّٰی وَ صَامَ وَ زَعَمَ اِنَّہٗ مُسْلِمٌ.

حضورؐ نے فرمایا میں تمہیں پانچ باتوں کا حکم دیتا ہوں جن کا اللہ نے مجھے حکم دیا ہے جماعت (کے ساتھ رہو) (حکم امیر) سنو اور (اس کی) اطاعت کرو (ضرورت پڑے تو اپنی عزیز ترین چیزوں کو بھی) چھوڑ دو اور اللہ کے راستے میں جہاد کے لئے نکل کھڑے ہو. یاد رکھو جو شخص جماعت سے ایک بالشت بھر بھی الگ ہو گیا اسلام کا پٹہ اس کے گلے سے اتر گیا عرض کیا کیا یارسولؐ اللہ! خواہ وہ روزے رکھتا ہو اور نمازیں پڑھتا ہو (پھر بھی اسلام سے خارج ہو جائے گا). فرمایا ہاں! خواہ وہ نمازیں پڑھتا ہو اور روزے رکھتا ہو اور بزعم خویش اپنے آپ کو مسلمان ہی کیوں نہ سمجھتا ہو (دائرۂ اسلام سے خارج ہو جائے گا).

اس لئے کہ

ڈالی گئی جو فصلِ خزاں میں شجر سے ٹوٹ ممکن نہیں ہری ہو سحابِ بہار سے
ہے لازوال عہدِ خزاں اس کے واسطے کچھ واسطہ نہیں ہے اسے برگ و بار سے
شاخِ بریدہ سے سبق اندوز ہو کہ تو نا آشنا ہے قاعدۂ روزگار سے
ملت کے ساتھ رابطہ استوار رکھ
پیوستہ رہ شجر سے امیدِ بہار رکھ

اقبالؔ کا پیغام نوجوانانِ ملّت کے نام

عرصہ کی بات ہے. میں کسی کام کے لئے عجلت میں تھا اس لئے بازار میں تیزی سے جا رہا تھا کہ ایک بوڑھے آدمی سے میرا کھوا چھل گیا. میں فوراً رُکا اور اس مردِ بزرگ سے معذرت چاہی. اُس نے شفقت اور طنز کے ملے جلے لہجہ میں کہا "کوئی بات نہیں بیٹا! یہ عمر کا تقاضا ہے. جب ہم تمہاری عمر کے تھے تو آدمی تو ایک طرف دیواروں تک کو مونڈھے مار کر چلا کرتے تھے" اس واقعہ کو ایک عمر گزر گئی لیکن اس پیرِ دانا کی بات آج تک میرے کانوں میں گونج رہی ہے. جوانی کے زمانے میں چونکہ فطرت کو قوائے جسمانیہ کی نشوونما مقصود ہوتی ہے اس لئے وہ خون میں بجلیاں بھر کر رکھ دیتی ہے جس سے نوجوان چلتا نہیں، دوڑتا ہے. اُٹھتا نہیں پھاندتا ہے. بیٹھتا بھی ہے تو کبھی نچلا نہیں رہتا۔ حرکت ۔ حرکتِ پیہم ۔ مسلسل حرکت. یہ ہے جوانی کی نشانی، عمر کے ایک درجہ تک یہ سلسلۂ نشوو بالیدگی جاری رہتا ہے. اس کے بعد یہ ترقی رُک جاتی ہے. لیکن اس کا ماحصل علیٰ حالہٖ قائم رہتا ہے. پھر انحطاط کا زمانہ آجاتا ہے جو جوانی کی گردن فرازی کو کنوئیں جھکوا دیتا ہے اور انسان ومن نعمرہ ننکسہ فی الخلق ــــ (بڑھاپے میں انسان کی حالت منکوس و منکوب ہو جاتی ہے) کی چلتی پھرتی تصویر بن جاتا ہے.

جوانی کی شعلہ فشانیاں

یہ تحوّل و تبدّل انسانی جسم تک ہی محدود نہیں رہتا بلکہ اُس کا اثر اس کے دل و دماغ پر بھی ہوتا ہے. جوانی میں جس طرح اس کا جسم ساکت نہیں رہ سکتا اسی طرح اس کے خیالات بھی جامد نہیں رہتے. ان میں بھی ہر آن ایک تبدیلی

پیدا ہوتی رہتی ہے۔ وہ "نچلے نہیں بیٹھتے"، کبھی یہ اسکیم سوچتے ہیں کبھی اس پروگرام کے پیچھے چلتے ہیں۔ یہ ہونا چاہیئے وہ نہیں ہونا چاہیئے۔ خیالات کیا کوندے کی لپک اور شعلے کی جھپٹ ہوتی ہے۔ ابھی یہاں ابھی وہاں۔ جس نوجوان کو دیکھو یہ کیفیت ہے کہ

چہ کنم کہ فطرتِ من بہ مقام درنسازد — دلِ ناصبور دارم چو صبا بہ لالہ زارے
چوں نظر قرار گیرد بہ نگارِ خوب روئے — تپد آں زماں دلِ من پئے خوب تر نگارے
زشرر ستارہ جویم زِ ستارہ آفتابے — سرِ منزلے ندارم کہ بمیرم از قرارے

ان خیالات کی یہی برق رفتاری اور شعلہ پائی ان میں تحیّر انگیز انقلابات کی صلاحیتیں پیدا کر دیتی ہے۔ اگر ان صلاحیتوں سے صحیح کام لیا جائے تو قوم کی اپنی تقدیر ہی نہیں بدلتی بلکہ زمانہ کی تقدیریں اس کے ہاتھ میں آجاتی ہیں۔ لیکن اگر انہیں سرکش دیباک چھوڑ دیا جائے تو ان کا ماحصل ایک بگولے کے رقص سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا کہ جب تک وہ جوش و حرکت میں رہتا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے شاید ایک نیا آسمان پیدا کر دے گا اور جب آنسوؤں کی طرح بیٹھ جاتا ہے تو زمین پر اپنا نقش تک بھی نہیں چھوڑتا۔ اور اس کے بعد یہی نوجوان، جو ابھی ابھی ایک شعلہ جوالہ تھا، انحطاطِ عمر کے زمانہ میں راکھ کا ڈھیر بن کر رہ جاتا ہے جس میں نہ حرارت ہوتی ہے نہ حرکت۔ تبدیلیٔ احوال کے تصور سے اس کا دم گھٹتا ہے۔ انقلاب کے نام سے اس کی جان جاتی ہے۔ بے بسی کی قناعت اس کے نزدیک "شرافت کی زندگی" اور بیکسی کا سکون اس کے خیال میں بزرگی کا شیوہ بن جاتا ہے۔ وہ اپنے اس جمود و سکوت کی قبرستانی زندگی پر قانع نہیں ہوتا بلکہ خوش ہوتا ہے کہ

نے تیر کماں میں ہے نہ صیاد کمیں میں
گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

حرکت و جنبش اس کے نزدیک بچپن کی شام کاریاں اور تیز خرامی و سُبک سیری اس کے خیال

بڑھاپے کی سہل انگاری

میں جوانی کی تلوّن انگاریاں بن جاتی ہیں۔ پھر چونکہ عقل حیلہ جو انسان کو جھوٹے فریب سے مطمئن رکھنے کی کوشش کرتی ہے اس لئے وہ اس سکوت و جمود کی زندگی کو سنجیدگی اور ثقاہت کے بزرگانہ پیرہن میں پیش کر کے اس کی عدمِ حرکت کو تقدس کا جامہ پہنا دیتی ہے اور اس کے خیالات کے خدر و جمود کو تجربہ کی پختگی اور فکر

کی تکمیل قرار دے کر اسے "قطب" بنا دیتی ہے کہ ساری دنیا اپنی جگہ سے ہل جائے لیکن یہ اپنے مقام سے نہ ٹلے۔ فکر و نظر کا یہی تعطل جب مذہب کی دنیا میں آتا ہے تو انسان اسے اسلاف پرستی اور تقلید آباء کا مقدس نقاب اڑھا کر اپنے آپ کو فریب دے لیتا ہے۔ (اس میں شبہ نہیں کہ جس طرح بعض آدمیوں کے قوائے جسمانی اخیر عمر تک صحیح و سالم رہتے ہیں، اسی طرح ایسی صورتیں بھی ہمارے سامنے آتی ہیں جہاں انحطاطِ عمر کی برودت، انسانی خیالات کی حرارتِ انقلاب کو ٹھنڈا نہیں ہونے دیتی لیکن یہ صورتیں شاذ اور یہ شکلیں مستثنیات میں سے ہیں۔ کلیہ یہی ہے کہ من نعمرہ ننکسہ فی الخلق ۔ عمر کی زیادتی سے حالت منکوس ہو جاتی ہے)۔ یہی وہ بڑے بوڑھے تھے جو صاحبِ ضربِ کلیم جناب موسیٰؑ جیسے کوہ تمثال و فرعون شکن داعیٔ انقلاب کی دعوتِ جہاد کے اولین مخاطب تھے۔ ان کی حالت یہ تھی کہ خدا کا یہ اولوالعزم پیغمبر انہیں بشارت دیتا ہے کہ یہ سرزمین تمہارے نام لکھی جا چکی ہے۔ اٹھو اور اس پر قابض ہو جاؤ۔ لیکن ان پر عافیت کوشی اور سہل انگاری کی افسردگی اس درجہ طاری ہو چکی ہے اور فریقِ مخالف کا خوف انہیں اس طرح چھلاوہ بن کر ڈراتا ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ

"صاحب! جب تک اس سرزمین میں بسنے والے وہاں موجود ہیں ہم وہاں قطعاً پاؤں نہیں رکھیں گے۔ تم اور تمہارا خدا جاؤ اور ان سے لڑو۔ ہم یہاں بیٹھے ہیں۔" (۵/۲۴)

نتیجہ اس کا یہ کہ اس قانونِ مشیت نے جس میں کسی کے لئے رعایت نہیں ہوتی فیصلہ کر دیا کہ ۔ فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً يَتِيْهُوْنَ فِى الْاَرْضِ (۵/۲۶) یعنی جب ان کی یہ حالت ہے تو وہی سرزمین جو اُن کے لئے مقدر کر دی گئی تھی، اُن پر چالیس برس تک حرام کر دی گئی اور ان سے کہہ دیا گیا کہ جاؤ اس بیاباں میں سرگرداں پھرتے رہو۔ چنانچہ حضرت موسیٰؑ ان چلتی پھرتی لاشوں کو لئے لئے چالیس برس تک جنگلوں اور صحراؤں میں پھرتے رہے تا آنکہ اس قوم کے بڑے بوڑھے ایک

بنی اسرائیل

ایک کر کے اٹھ گئے اور وہ نوجوان جن کی تربیت شہروں کی غلام ساز فضا سے دور کوہ و بیاباں کی آزاد ہوا میں ہوئی تھی، نئے دماغ، نئی زندگی، نئی آرزوؤں کو اپنے دلوں میں لئے حضرت موسیٰؑ کے گرد پروانہ وار جمع ہو گئے (فَمَآ اٰمَنَ لِمُوْسٰٓى اِلَّا ذُرِّيَّةٌ مِّنْ قَوْمِهٖ (۱۰/۸۳) یہی وہ آہن گداز نوجوان تھے جو انقلابی تصورات کو دماغوں میں لئے بپھرے ہوئے شیروں کی طرح اُٹھے اور ہر مخالف قوت کو پاش پاش کر کے رکھ دیا۔ نتیجہ یہ کہ وہی مغلوب و محکوم قوم جو کل تک نہایت

ذلیل وحقیر شمار کی جاتی تھی، قومِ غالب کے خزائن ودفائن اور تخت وتاج کی وارث بن گئی۔

تاریخ کے اوراق کو ساڑھے تین ہزار سال آگے الٹیے اور قومِ بنی اسرائیل سے ہندی مسلمانوں

ہندی مسلمان

تک آپہنچیے۔ آپ دیکھیں گے کہ انیسویں صدی کے اخیر اور بیسویں صدی کے اوائل میں یہاں کے مسلمانوں کی حالت بعینہٖ وہی ہوچکی تھی جس کا نقشہ قرآنِ کریم نے داستانِ بنی اسرائیل کی شکل میں کھینچا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب شجرِ ملت کی ہر شاخ پر افسردگی اور پژمردگی چھا چکی تھی۔ مدت ہائے دراز کی غلامی اور محکومی سے ان کے حوصلے پست، ہمتیں کمزور، افکار جامد، اعمال خام، ارادے سقیم اور تمنائیں عقیم ہوچکی تھیں۔ ہر شعبۂ زندگی بساطِ بے نظام اور ہر فردِ کارواں ناقۂ بے زمام تھا۔ دماغ فکر سے عاری، دل سوز سے خالی، نگاہیں بے نور، قلوب بے حضور، قوم کیا، ایک راکھ کا ڈھیر تھی جسے مخالف ہوائیں جدھر چاہے اڑائے اڑائے

اقبالؒ

پھر رہی تھیں۔ یہ تھا وہ زمانہ جس میں مبدارِ فیض کی کرم گستری نے اس قوم کو اقبالؒ جیسا مردِ خود آگاہ وخدا مست عطا کردیا جس نے اپنی نفس گدازیوں سے اس مُردوں کی بستی میں صورِ اسرافیل پھونک کران میں حیاتِ نو کے آثار پیدا کردیئے اور اپنی شعلہ نوائیوں سے راکھ کے اس ڈھیر میں پھر سے زندگی کی چنگاریاں نمودار کردیں۔ اس نے اپنے گردوپیش نظر دوڑائی تو اسے بالعموم وہی بڑے بوڑھے دکھائی دیئے جن میں تبدیلیٔ احوال کی صلاحیتیں ختم ہوچکی تھیں۔ اس لئے اسے سوچنا پڑا کہ وہ اپنے اس پیغام کو جس کا ایک ایک لفظ حشر بداماں اور ایک ایک حرف برق ساماں تھا، کس کے سامنے پیش کرے۔ لیکن اسے اس فیصلہ میں کچھ دقت نہ ہوئی، اس لئے کہ تاریخ کے اوراق، فلسفہ کے غوامض، انسانی ذہنیت کے مشاہدات اور قرآنِ کریم کے حقائق ومعارف نے اس پر یہ حقیقت بے نقاب کردی تھی کہ قوم کی تقدیر ہمیشہ ابھرنے والی نسلوں کے ہاتھ میں ہوا کرتی ہے۔ ان نوجوانوں کے قلب ودماغ کی صلاحیتیں، ان کے گرم خون کی حرارتیں، ان کا زورِ بازو، ان کا جوشِ کردار، ایک کفِ بدہاں سیلاب کی طرح اٹھتا ہے اور ہر ٹکرانے والی قوت کو خس وخاشاک کی طرح بہا کر لے جاتا ہے۔ وہ جانتے تھے کہ قوموں کی تخلیقِ نو ان کے نوجوانوں کے کوہ شکن ارادوں کی رہینِ منت ہوتی ہے۔ وہ سمجھتے تھے کہ:۔

جواں مردے کہ خود را فاش بیند جہانِ کہنہ را بازآفریند
ہزاراں انجمن اندر طوافش کہ او با خویشتن خلوت گزیند

اس لئے یہی وہ طبقہ تھا جسے اس نے اپنے تصوّرات کی آماجگاہ، اپنی امیدوں کا مرکز، اپنی تمناؤں کا محور اور قوم کے مستقبل کا مظہر قرار دیا اور اسی کو اپنے پیغاماتِ انقلاب آفریں کا درخورِ تخاطب سمجھا. انہی کے لئے وہ دعائیں مانگتے تھے کہ

جوانوں کو مری آہِ سحر دے پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے
خدایا آرزو میری یہی ہے مرا نورِ بصیرت عام کر دے

اور انہی کو اپنے سوز و گداز، تپش و خلش، تڑپ اور اضطراب کا وارث سمجھتے تھے. بالِ جبریل کے ساقی نامہ میں دیکھئے. جذب و کیف کی کس والہانہ بیتابی سے بحضورِ ربّ العزّت ملتجی ہوتے ہیں کہ

ترے آسمانوں کے تاروں کی خیر زمینوں کے شب زندہ داروں کی خیر
جوانوں کو سوزِ جگر بخش دے مرا عشق، میری نظر بخش دے
مرے دیدۂ تر کی بے خوابیاں مرے دل کی پوشیدہ بیتابیاں
اُمنگیں مری، آرزوئیں مری امیدیں مری جستجوئیں مری
یہی کچھ ہے ساقی متاعِ فقیر اسی سے فقیری میں ہوں میں امیر
مرے قافلے میں لٹا دے اسے لٹا دے ٹھکانے لگا دے اسے

ان کی آرزو ہی یہ تھی کہ جس پیغامِ انقلاب انگیز کو وہ قوم کے سامنے پیش کر رہے ہیں وہ نونہالانِ ملّت کے قلب کی گہرائیوں میں جاگزیں ہو جائے تاکہ وہ وہاں سے زندہ آرزوؤں کا چشمہ بن کر اُبلے اور خیابانِ ملّت کو اس طرح سیراب کر دے کہ اس کی ایک ایک شاخ پھر سے شگفتہ و شاداب نظر آنے لگ جائے. اسی لئے وہ دعائیں مانگتے تھے کہ

من کہ نومیدم ز پیرانِ کہن دارم از روزے کہ می آید سخن
بر جواناں سہل کُن حرفِ مرا بہر شاں پایاب کن ژرفِ مرا

تاریخی آثار و شواہد جوان کے نورِ بصیرت سے ان کے سامنے بے نقاب ہوتے چلے جاتے تھے، اس حقیقتِ کبریٰ کو واضح کئے دیتے تھے کہ:۔

گرچہ اس دیرِ کہن کا ہے یہ دستورِ قدیم — کہ نہیں میکدہ و ساقی و مینا کو ثبات
قسمتِ بادہ مگر حق ہے اسی ملّت کا — انگبیں جس کے جوانوں کو ہے تلخابِ حیات

لیکن ان کے ہاں محض شاعرانہ جذبات نگاری نہ تھی بلکہ ان کی نگہ حکمت و بصیرت زندگی کے حقائق کو پرکھتی اور ہر شے کو اس کے حقیقی مقام پر دیکھتی تھی۔ وہ دیکھتے تھے کہ صدیوں کی غلامی سے قوم ہلاکت و تباہی کے جس جذام میں گرفتار ہے، قوم کے نوجوان بھی اس کے مہلک جراثیم سے محفوظ نہیں رہے۔ جوانی کے

جوانانِ کہن سال

پیمانے دن اور سال نہیں بلکہ کشمکشِ حیات میں عزم و استقامت سے سینہ سپر ہونے کی ہمت ہے۔ وہ دیکھتے تھے کہ اس معیار کے مطابق قوم کے تنومند جوان بھی پیرانِ کہن سال سے کچھ بہتر نہیں۔ اس لئے وہ ان کی عافیت کوشی اور سہل انگاری پر خون کے آنسو روتے تھے۔ وہ ان نرم و نازک پیکرانِ آب و گل کی طرف نہایت حسرت آمیز نگاہ سے دیکھتے اور سرد آہ بھر کر کہتے کہ

ترے صوفے ہیں افرنگی ترے قالیں ہیں ایرانی — لہو مجھ کو رُلاتی ہے جوانوں کی تن آسانی
امارت کیا شکوہِ خسروی بھی ہو تو کیا حاصل — نہ زورِ حیدری تجھ میں نہ استغنائے سلمانی

یہی کج کلاہانِ ملّت، قوم کے مستقبل کے آئینہ دار تھے۔ لیکن ان کی کیفیت یہ تھی کہ ان کے قلوب دولتِ یقین سے تہی مایہ، ان کی نگاہ نورِ بصیرت سے محروم، ان کے بازو قوّتِ عمل سے بیگانہ اور ان کے دماغ تخلیقِ مقاصد کی متاعِ گراں مایہ سے عاری تھے۔ دیکھئے کہ وہ کس حسرت سے ان کے متعلق کہتے ہیں کہ

نوجواناں تشنہ لب، خالی ایاغ — شستہ رو، تاریک جاں، روشن دماغ
کم نگاہ و بے یقین و ناامید — چشمِ شاں اندر جہاں چیزے ندید
ناکساں، منکر ز خود، مومن بغیر — خشت بند از خاکِ شاں معمارِ دَیر

ان کی زندگی بے مقصد، ان کے افکار پریشان، نہ کوئی متعین نصب العین، نہ منتہائے نگاہ۔ کبھی جذبات کی ان وادیوں میں مصروفِ جادہ پیمائی، کبھی امیال و عواطف کے ان صحراؤں میں مشغولِ انجمن آرائی۔ زندگی کے حقائق سے چشم پوشی اور مصافِ حیات سے گریز پائی۔

ایں مسلماں زادۂ روشن دماغ — ظلمت آبادِ ضمیرش بے چراغ
در جوانی نرم و نازک چوں حریر — آرزو در سینۂ او زود میر

این غلام' ابنِ غلام' ابنِ غلام حریّت اندیشۂ او را حرام
این زخود بیگانہ این مست از نگ نانِ جو می خواہد از دستِ فرنگ

لیکن ان کی یہ تادیب ایک طبیبِ مشفق کی تحقیق تھی' فیصلۂ عدالت کی تہدید نہیں تھی. ان کا ناوک تنقید ایک غمخوار جرّاح کی نوکِ نشتر تھی' دشمن کی سنانِ زہر آلود نہ تھی۔ ان کی تنبیہ ملّا کی نفرت انگیز لاحول نہ تھی۔ مادرِ مہرباں کی سیلی تھی کہ جس کی چوٹ بچے سے پہلے خود اپنے کلیجہ پر پڑے. یہ قہر آلود نگاہیں غصہ سے لال پیلی نہیں ہو رہی تھیں بلکہ دل کا خون بہا جو شدّتِ غم سے آنکھوں میں کھنچ آیا تھا. وہ ان سہل انگار نوجوانوں کو دیکھتے تھے تو راتوں کی تنہائی میں اُٹھ اُٹھ کر روتے اور سسکیاں لے لے کر کہتے کہ

متاعِ دین و دانش لٹ گئی اللہ والوں کی
یہ کس کافر ادا کا غمزۂ خوں ریز ہے ساقی

لیکن انہوں نے اسی لٹی ہوئی متاع کی فقط مرثیہ خوانی نہیں کی بلکہ یہ بھی بتا دیا کہ یہ لٹی کیسے. اجب تک یہ نہ بتا دیا جاتا' اس کے تحفظ و بقا کا انتظام کیسے کیا جا سکتا تھا؟

تعلیم کی اہمیت

تاریخِ انسانیت پر نگاہ ڈالیے ایک مسلسل داستانِ صید و صیاد نظر آئے گی. ہر وہ شخص یا اشخاص کی جماعت جو کسی طرح قوت فراہم کر لیتی ہے' کمزور انسانوں کو اپنی ہوسِ کام جوئی کا ذریعہ بناتی ہے. مختلف زمانوں میں اس قوت کے استعمال کے طریق بدلتے رہتے ہیں' روح ہمیشہ اور ہر جگہ وہی کار فرما رہی ہے. چونکہ عہدِ جاہلیت میں انسان کی عقلِ حیلہ جُو نے ابھی ایسی پُرکاری ہی نہیں سیکھی تھی اس لئے اس زمانہ کے اوزاروں اور ہتھیاروں کی طرح محکوموں کو پنجۂ استبداد میں جکڑے رکھنے کے حربے بھی کھردرے اور کند ہوتے تھے جنہیں ہر آنکھ مشہود دیکھ سکتی تھی اور ہر قلب محسوس کر سکتا تھا. لیکن جوں جوں انسانی عقلِ مکر و حیل میں ترقی کرتی گئی' آلات و ادواتِ حرب و ضرب کی طرح مغلوب قوموں کو ضعیفی و زبردستی کی نیند میں سلائے رکھنے کے اسباب و ذرائع بھی لطیف غیر محسوس ہوتے چلے گئے. ان تمام ذرائع میں تعلیم کو بنیادی حیثیت حاصل ہے. آپ جس قسم کی قوم بنانا چاہیں اس کے بچوں کو اسی قسم کی تعلیم دیتے جائیے. بلا مزید سعی و کاوش وہ قوم خود بخود آپ کے ذہنی سانچوں میں ڈھلتی جائے گی اور یہ تبدیلی کچھ اس طرح غیر مرئی طور پر ظہور پذیر ہوگی کہ اس قوم کو پتا تک

بھی نہ چلے گا کہ ہم میں کوئی تبدیلی پیدا کی جارہی ہے۔ جب انگریز ہندوستان میں آیا تو اس نے محسوس کرلیا کہ مسلمان ہی وہ قوم ہے جو اس تغلّب و استبداد کے راستے میں روڑا بن سکتی ہے چنانچہ اس نے اس قوم کو اپنے مطلب کے مطابق بنانے کے لیے وہی غیر محسوس لیکن زیرِ ہدف نسخہ استعمال کیا جس کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے۔ اس نے اس قوم کا نظامِ تعلیم بدل دیا اور اس ایک تبدیلی سے تھوڑے سے عرصہ میں پوری کی پوری قوم بدل گئی.

یہ تھی قومِ غالب کی وہ سحر آفرینی جو قومِ مسلم کی تبدیلیٔ احوال (یعنی تبدیلیٔ ذہنیت) کا موجب بنی تھی اور اس کی پردہ کشائی اس مردِ مومن کے پیشِ نظر تھی۔ اس باب میں وہ کہتے ہیں:-

اک مردِ فرنگی نے کہا اپنے پسر سے — منظر وہ طلب کر کہ تری آنکھ نہ ہو سیر
بیچارے کے حق میں ہے یہی سب سے بڑا ظلم — برّے پہ اگر فاش کریں قاعدۂ شیر
سینے میں رہے رازِ ملوکانہ تو بہتر — کرتے نہیں محکوم کو تیغوں سے کبھی زیر
تعلیم کے تیزاب میں ڈال اس کی خودی کو — ہو جائے ملائم تو جدھر چاہے اسے پھیر
تاثیر میں اکسیر سے بڑھ کر ہے یہ تیزاب — سونے کا ہمالہ ہو تو مٹی کا ہے اک ڈھیر

تعلیم بدل جانے سے نگاہ کا زاویہ بدل جاتا ہے اور زاویۂ نگاہ بدلنے سے اشیاء کی اقدار بدل جاتی ہیں۔ جب اقدار بدل جائیں تو دنیا کچھ کی کچھ ہو جاتی ہے۔

نوعِ دیگر بیں جہاں دیگر شود — ایں زمین و آسماں دیگر شود

تعلیم بدل دینے سے

تعلیم بدل جانے سے قوموں کی ریل گاڑی کا کانٹا مڑ جاتا ہے۔ کانٹا مڑنے سے جب ریل گاڑی پٹڑی بدلتی ہے تو دونوں پٹڑیوں میں غیر محسوس سا فرق ہوتا ہے لیکن اگر کانٹا موڑ دیا گیا ہو تو اس کے بعد پہیئے کا ہر چکر گاڑی کو اس کی منزلِ مقصود سے دُور لیے جاتا ہے۔ گاڑی کی حرکت بھی وہی ہوتی ہے اور رفتار بھی وہی لیکن جب آخر الامر دیکھا جائے تو گاڑی اور اس کی اصلی منزلِ مقصود میں بُعد المشرقین ہوتا ہے۔ یہی وہ غلط تعلیم تھی جس نے اتنی سی مدتِ قلیل میں پوری کی پوری قوم کو تباہ کر کے رکھ دیا۔ تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ انسان کائنات کی ہر شے کی صحیح قیمت جانے اور پھر اپنا مقام پہچانے۔ انسان' کائنات اور خالقِ کائنات کا باہمی تعلق کیا ہے۔ اسی کا نام علمِ صحیح اور دینِ قیم ہے۔ اگر یہ تعلق غلط خطوط پر متعین ہو جائے تو نظامِ انسانیت میں فساد ہی فساد برپا ہو جاتا ہے۔ مغرب نے خدا' انسان اور کائنات کے اقنومِ ثلاثہ میں سے سب سے بڑا رکن (خدا) پہلے ہی الگ کر دیا۔ علمِ انسانی کا

منتہی، تسخیرِ فطرت اور اس سے حاصل شدہ قوتوں کا اپنے تغلب و تسلط کے لئے استعمال قرار پایا۔ جب وہ اس تعلیم کو محکوم قوموں تک لائے تو تسخیرِ فطرت کے رموز و اسرار بھی ان کی نگاہوں سے پوشیدہ رکھ لئے۔ جو کچھ باقی رہ گیا وہ بجز اس کے کچھ نہ تھا کہ مغرب کے تفوق و برتری کو ذہنوں پر مسلّط کر دیا جائے اور اس جذبۂ مرعوبیت کے ماتحت ان کی کیفیت یہ ہو جائے کہ اپنی ہر قدر سے نفرت ہوتی جائے اور حاکم قوم کی ہر ادا میں شانِ محبوبیت جھلکتی نظر آئے۔ چنانچہ رفتہ رفتہ قوم کی حالت یہ ہو گئی کہ لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا ز وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا ز وَلَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا ط کان اپنے ہیں لیکن سنتے ان کی قوتِ سماعت سے ہیں۔ آنکھیں اپنی ہیں لیکن دیکھتے ان کی بصارت سے ہیں، دل اپنے ہیں لیکن سمجھتے ان کی عقل کی روشنی سے ہیں۔ أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ ط (۷/۱۷۹) یہ انسان نہیں بلکہ انسان نما حیوان ہیں۔ بلکہ ان سے بھی گئے گزرے۔ نتیجہ یہ کہ ذہنوں میں افکارِ مستعار دلوں کے مقاصد و مسردل کے پیدا کردہ، نگاہوں کے زاویے اوروں کے متعین کردہ۔ زبان ان کی ہے بات اُن کی۔ چراغ ان کا ہے رات ان کی۔ یہ تھی وہ تعلیم جس کے نتائج سے مردِ حق آگاہ کے کلیجے میں ہوک اٹھتی تھی، اور وہ اس آتشِ خاموش سے پھک کر جس نے اس کے مغزِ استخواں تک کو جلا دیا تھا، بے اختیار کہتا تھا کہ:

مکتب از مقصودِ خویش آگاہ نیست ~~

مکتب از وے جذبۂ دیں در ربود — از وجودش ایں قدر دانم کہ بود

شیخِ مکتب کم سواد و کم نظر — از مقامِ او نہ داد او را خبر

وہ نوجوانانِ ملت کی چلتی پھرتی لاشوں کو دیکھتا اور نم آلود آنکھوں سے کہتا کہ

گرچہ مکتب کا جواں زندہ نظر آتا ہے — مُردہ ہے مانگ کے لایا ہے فرنگی سے نفس

وہ جب ان مدعیانِ علم و ہنر کو دیکھتا کہ ان جھوٹے نگوں کی میناکاری نے ان کی نگاہوں میں کس قدر خیرگی پیدا کر رکھی ہے تو وہ ایک خفیف سی ہنسی کے ساتھ جو درحقیقت اس کا خندۂ زخمِ نہاں ہوتا تھا۔ ان سے کہتا کہ فریبِ باطل پر یہ فخر و ناز کس لئے جب حقیقت یہ ہے کہ:

ترا وجود سراپا تجلیٔ افرنگ — کہ تو وہاں کے عمارت گروں کی ہے تعمیر

مگر یہ پیکرِ خاکی خودی سے خالی ہے

فقط نیام ہے تو زرنگار و بے شمشیر

احساسِ خودی اور خود نگہی یہی شرفِ انسانیت کی اساس و بنیاد ہے اور اس تعلیم سے اسی کو فنا کیا جاتا ہے۔ لہٰذا ظاہر ہے کہ حقیقت شناس نگاہ اس زہر ہلاہل کو کس طرح تریاق سمجھ سکتی ہے۔ اسی لئے وہ کہتے ہیں کہ:۔

بہ آں مومن خدا کارے نہ دارد کہ در تن جانِ بیدارے ندارد
ازاں از مکتبِ یاراں گریزم جوانے خود نگہدارے ندارد

باسلوبِ دیگر:۔

اقبالؒ یہاں نام نہ لے علمِ خودی کا موزوں نہیں مکتب کے لئے ایسے مقالات
بہتر ہے کہ بیچارے مموں کی نظر سے پوشیدہ رہیں باز کے احوال و مقامات

وہ مکتب کے اس کارگہ شیشہ گراں کو بہ ہزار عبرت و تأسف دیکھتے اور جب انہیں نظر آتا کہ ان نوجوانانِ نیک طینت و پاک سیرت کو جن کے فولادی جوہروں کو شمشیرِ بے نیام بننا تھا کس طرح "جاپانی کھلونے" بنایا جا رہا ہے تو وہ اک صدائے دردناک و الم انگیز سے کہتے ہیں کہ:۔

شکایت ہے مجھے یا ربّ خداوندانِ مکتب سے
سبق شاہیں بچوں کو دے رہے ہیں خاکبازی کا

پھر اتنا ہی نہیں کہ تعلیم کے اس نظام سے محکوم قوموں کے افراد کی خودی ہی کو فنا کیا جاتا ہے بلکہ قیامت

معاش کی دست نگری

بالائے قیامت کہ قوّتِ حاکمہ رزق کے سرچشموں کو اپنے قبضہ میں رکھ کر محکوم قوم کے صالح عنصر کو اس درجہ اپاہج اور مفلوج بنا دیتی ہے کہ وہ معاش تک کے لئے ان کی دست نگر ہو جاتی ہے اور پھر اس کے بعد جو کچھ جی میں آئے اُن سے بآسانی کرا لیا جا سکتا ہے۔ یہ انسانی ذلّت و پستی کی وہ انتہا ہے جس کا احساس ہر قلبِ حسّاس کو طلسمِ پیچ و تاب بنائے رکھتا ہے۔ اسی انسانیت کش منظر کو دیکھ کر اس حکیمِ امّت کا خون کھولنے لگتا ہے اور وہ درد و کرب کی انتہائی بیتابیوں کے ساتھ آہِ سرد بھر کر کہتا ہے کہ

جوانے خوش گلے رنگیں کلاہے نگاہ اوچو شیراں بے پناہے
بہ مکتب علمِ میشی را بیاموخت میسّر نابدش برگِ گیاہے

کس قدر قیامت ہے کہ ابنِ آدم کو خودی جیسی متاعِ بے بہا کے بدلے روٹی کا ٹکڑا تک بھی

میسر نہ ہو۔ اس کا سرمایہ کو نہ چھین لیا جائے اور اس کے معاوضے میں اسے دو کفِ جو تک نہ مل سکے۔

نوا از سینۂ مُرغِ چمن بُرد ز خونِ لالہ آں سوزِ کہن بُرد
بایں مکتب بایں دانش چہ نازی کہ ناں در کف ندادو جاں ز تن بُرد

اسی لئے وہ اس نظامِ تعلیم و تربیت کو ملک الموت قرار دیتے ہیں۔ ضربِ کلیم میں مدرسہ کے عنوان سے لکھتے ہیں:۔

عصرِ حاضر ملک الموت ہے تیرا جس نے قبض کی رُوح تری دے کے تجھے فکرِ معاش
دل لرزتا ہے حریفانہ کشاکش سے ترا زندگی موت ہے کھو دیتی ہے جب ذوقِ خراش
اس جنوں سے تجھے تعلیم نے بیگانہ کیا جو یہ کہتا تھا خرد سے کہ بہانے نہ تراش
فیضِ فطرت نے تجھے دیدۂ شاہیں بخشا جس نے رکھ دی ہے غلامی نے نگاہِ خفاش
مدرسے نے تیری آنکھوں سے چھپایا جن کو خلوتِ کوہ و بیاباں میں وہ اسرار ہیں فاش

اور اس کی ذمہ دار صرف وہ تعلیم نہیں جو مدرسوں اور کالجوں میں کتابوں کے ذریعے دی جاتی ہے بلکہ وہ

تہذیبِ عصرِ حاضر تہذیب ہے جو عصرِ حاضر کا طرۂ امتیاز ہے اور جس نے ساری دنیا کو یوں جہنم زار بنا رکھا ہے۔ اسی کے متعلق وہ کہتے ہیں کہ

جواناں را بد آموز است ایں عصر شبِ ابلیس را روز است ایں عصر
بدامانش مثالِ شعلہ پیچم کہ بے نور است و بے سوز است ایں عصر

اس مقام پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ علامہ اقبالؒ تہذیبِ مغرب کے اس قدر مخالف کیوں تھے۔ کیا یہ مخالفت ملّا کی وہ قدامت پرستی تھی جس کی رُو سے ہر نئی چیز دوزخ میں پھینک دینے کے قابل ہوتی ہے۔ یہ کس طرح ہو سکتا ہے۔ حضرت علامہ کے نزدیک ایک جوئے رواں ہے جس کا کسی مقام پر بھی تھم جانا اس کی موت ہے اس لئے جمود و تعطّل ان کے نزدیک فطرت کے ضابطۂ قوانین میں جرمِ عظیم ہے جس کی سزا مرگِ مفاجات ہے۔ بنا بریں وہ علمی عروج اور ذہنی ارتقاء کے کس طرح مخالف ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا تہذیبِ مغرب سے ان کی مخالفت اور نفرت کی وجہ قدامت پرستانہ تعصب نہیں ہو سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تہذیبِ مغرب باطل کی بنیادوں پر استوار ہے۔ اس لئے ہر نگۂ حق شناس اس میں فسادِ آدمیت کا جہنم مضمر دیکھے گی اور اس کی مخالفت کرے گی۔ تہذیبِ مغرب کیا ہے اور یہ کس طرح

باطل کی بنیادوں پر قائم ہوتی ہے۔ حق کی بنیادیں کیا ہیں اور ان بنیادوں پر کس قسم کا قصرِ تہذیب تعمیر ہو سکتا ہے۔ ان سوالات کا جواب تفصیل طلب ہے اس لئے اس مقام پر اس سے بحث نہیں کی جا سکتی۔ اس مقام پر صرف اتنا اشارہ کافی ہوگا کہ کسی قوم کی تہذیب

مغربی فلسفۂ حیات

درحقیقت اس کے فلسفۂ زندگی اور تصورِ حیات کی محسوس مظہر ہوتی ہے۔ اس لئے جب ہم کسی قوم کی تہذیب سے بحث کرتے ہیں تو دراصل یہ بحث اس قوم کے فلسفۂ حیات سے متعلق ہوتی ہے۔ تہذیبِ مغرب کی بنیاد زندگی کے میکانکی تصور (MECHANISTIC CONCEPT OF LIFE) پر ہے جس کا ملخص یہ ہے کہ زندگی مادہ کے طبیعی ارتقاء (PHYSICAL EVOLUTION) سے کسی نہ کسی طرح ظہور میں آگئی ہے اور جسمِ انسان ایک مشینی حرکت سے اسے قائم رکھ رہا ہے۔ مرورِ زمانہ سے جب یہ حرکت بند ہو جائے گی تو زندگی ختم اور انسان نسیاً منسیا ہو جائے گی۔ وَ قَالُوْا مَا هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَ نَحْيَا وَ مَا يُهْلِكُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ (۴۵/۲۴) اور یہ کہتے ہیں کہ یہی طبیعی زندگی ہے۔ ہم اب زندہ ہیں۔ عناصر کا شیرازہ بگڑ جانے سے مر جائیں گے اور اس طرح مرورِ زمانہ ہمیں ختم کر دے گا۔ لہٰذا نہ انسانی تخلیق کا کوئی مقصد ہے نہ اس کے سفرِ حیات کا کوئی منتہیٰ۔

در نگاہش آدمی آب و گل است کاروانِ زندگی بے منزل است

اس تصورِ زندگی کا عملی نتیجہ یہ ہوا کہ انسانی عزائم و اعمال کا معیار انفرادی اغراض یا زیادہ سے زیادہ افراد کے مجموعہ یعنی قوم کے مفاد کا حصول قرار پا گیا۔ مستحسن اعمال وہ جن سے افراد کو دولت و حشمت اور اقوام کو غلبہ و تسلط حاصل ہو جائے خواہ اس کے لئے کیسے ہی حربے کیوں نہ استعمال کرنے پڑیں۔ جائز و ناجائز کا سوال وہاں پیدا ہوتا ہے جہاں انسان اپنے اعمال کے لئے کسی اقتدارِ اعلیٰ (HIGH OTHORITY) کے سامنے جواب دہ ہو۔ یہاں افراد زیادہ سے زیادہ اپنی قوم کے سامنے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ اس لئے ان کے نزدیک جائز وہ جس سے قومی مفاد کا تحفظ ہو۔ قوم اپنے سے اوپر کسی اقتدارِ اعلیٰ کے سامنے ذمہ دار نہیں ہوتی اس لئے وہاں جائز و ناجائز کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس نظامِ تمدن و معاشرت کا فطری نتیجہ جنگل کا قانون ہے کہ "جس کی لاٹھی اس کی بھینس"۔ اس نظام نے دنیا کو کیا دیا۔ اس کے لئے اب کسی تحقیقاتی کمیشن

کی رپورٹ کی ضرورت ہی نہیں۔ اس کے نتائج ساری دنیا کے سامنے ہیں اور، اور تو اور، خود اس تہذیب و تمدّن کے علمبردار اس کے ہاتھوں اس قدر تنگ آچکے ہیں کہ وہ اس جہنّم سے نکلنے کی راہیں تلاش کر رہے ہیں۔ لیکن انہیں نجات کی صورت نظر نہیں آتی۔ وَمَا هُمْ بِخَارِجِيْنَ مِنَ النَّارِ۔ مشہور مفکّر پروفیسر میسن (MASON) اپنی کتاب (CREATIVE FREEDOM) میں لکھتا ہے کہ

> ہم نے اپنے زمانہ کی ابتداء سائنس کی کاریگری سے کی اس وثوق کے ساتھ کہ مادّی کامرانیاں زندگی کے عقدوں کو حل کر دیں گی۔ لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہم غلطی پر تھے۔ زندگی کے مسائل کچھ ایسے سہل نہیں۔

اور فرانسیسی مفکّر (RENE GUENON) لکھتا ہے کہ

> عہدِ حاضر کی تہذیب رفتہ رفتہ تنزّل کی طرف گرتی گئی ہے حتّٰی کہ یہ انسان کے پست ترین عناصر کی سطح پر جا کر رُک گئی ہے۔ اس کا نصب العین اس کے سوا کچھ نہیں کہ انسانی فطرت کے محض مادّی گوشے کے تقاضوں کی تسکین کا سامان فراہم کیا جائے۔ یہ نصب العین خود ایک فریب ہے..... جو لوگ مادّہ کی وحشی قوتوں کو بے لگام چھوڑ دیتے ہیں وہ خود انہی قوتوں کے ہاتھوں تباہ ہو جاتے ہیں...... مغرب کے غرق ہو جانے کا خطرہ سر پر ہے۔ وہ خود تو ڈوبے گا ہی لیکن اپنے ساتھ تمام نوعِ انسانی کو بھی اپنے منتشر افکار و اعمال کے گرداب میں غرق کر دے گا۔

(THE CIVILIZATION OF THE MODERN WORLD)

غور کیجئے کہ اس تہذیبِ نَو کے علمبردار خود اس کے ہاتھوں کس درجہ نالاں ہیں اور پھر سوچئے کہ جس دانائے راز کی فراستِ ایمانی اور بصیرتِ قرآنی نے اس کے سامنے ان حقائق کو بے نقاب کر دیا تھا اس نے کس قدر صحیح کہا تھا کہ :۔

بیا کہ سازِ فرنگ از نوا بر افتاد است درونِ پردۂ او نغمہ نیست فریاد است

یہ نتائج جن کو دیکھ کر یورپ کے مفکّر اور اربابِ سیاست و تمدّن یوں چیخ اٹھے ہیں، کوئی ہنگامی حادثہ اور اتفاقی واقعہ نہیں بلکہ فطری نتیجہ ہیں اس تہذیب کا جس کی بنیادیں باطل پر استوار ہیں۔ چنانچہ تاریخ تہذیب کا مشہور عالم (BRIFFAULT) اپنی کتاب (THE MAKING OF HUMANITY)

میں اس پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ

انسانی ہیئتِ اجتماعیہ کا کوئی قانون جس کی بنیاد باطل کے اصولوں پر ہو کبھی قائم نہیں رہ سکتا خواہ اس باطل نظام کو کیسے ہی تدبّر اور دانشمندی سے کیوں نہ چلا جائے۔ اس کی بنیادی کمزوری خارجی نظم و ضبط اور ادھر اُدھر کی مرمّت سے کبھی رفع نہیں ہو سکتی جب تک اس کی اصل باقی ہے اس کے لئے تباہی مقدّر ہے۔

اس نہج زندگی اور آئینِ حیات نے خود یورپ کے نوجوان طبقہ پر کیا اثر کیا، اس کے متعلق کسی مشرق کے دقیانوسی فرسودہ خیال کی زبان سے نہیں بلکہ مغرب کے مبصّر ڈاکٹر جوڈ کے الفاظ میں سنیئے وہ لکھتا ہے۔

ہمارا نوجوان طبقہ شاہراہِ زندگی پر بلاتعیّنِ مقصد چلا جا رہا ہے۔ انہیں کچھ علم نہیں کہ ہم کہاں جا رہے ہیں۔ بلکہ یہ بھی معلوم نہیں کہ ہم چل ہی کیوں رہے ہیں۔ نہ ان کے سامنے کوئی ضابطۂ زندگی ہے نہ آئینِ حیات، نہ اقدار ہیں نہ معیار۔

اس بلا مقصد و معیار زندگی کا نتیجہ کیا ہے۔ اس کے متعلق مشہور فلسفی پسکال (PASCAL) نے لکھا ہے کہ

انسانی ذہن اپنی فطرت سے مجبور ہے کہ وہ کسی نہ کسی چیز پر ایمان رکھے اور اس طرح انسان کا ارادہ بھی کسی نہ کسی سے محبّت کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ جب اسے ایمان اور محبّت کے لئے کام کی باتیں نہیں ملتیں تو وہ بے کار اور خراب مقصد پر ریجھ جاتا ہے۔ خلا قدرت کے کارخانے میں محال ہے۔ انسان جب خدا پر ایمان چھوڑ دے تو شیطان کی پرستش کرنے لگ جاتا ہے اور اچھے نصب العینوں سے دستکش ہو جائے تو بُرے راستے اسے خوش آتے ہیں۔

مشفقانہ پکار

جو کچھ یورپ کے نوجوانوں کے ساتھ ہوا اس سے کہیں بدتر ہمارے نوجوان طبقہ پر گزری۔ یہ تھا وہ جہنّم جس سے بچانے کے لئے حضرت علاّمہ نے نونہالانِ ملّت کو پکارا اور اپنے دل کی انتہائی گہرائیوں میں ڈوب کر پکارا کہ وہ غمگسارِ ملّت جانتا تھا کہ ان کی تباہی سے قوم تباہ ہو جائے گی اور ان کے سنبھلنے سے ملّت کا مستقبل سنبھل جائے گا۔ اس لئے اس نے نہایت محبّت اور شفقت سے انہیں اپنے قریب بلایا اور کہا کہ

اے جوانانِ عجم جانِ من و جانِ شما چوں چراغِ لالہ سوزم در خیابانِ شما

غوطہ ہا زد در ضمیرِ زندگی اندیشہ ام | تا بدست آوردہ ام افکارِ پنہانِ شما
مہر و مہ دیدم نگاہم برتر از پروین گزشت | ریختم طرحِ حرم' در کافرستانِ شما
حلقہ گردِ من زنید اے پیکرانِ آب و گل | آتشے در سینہ دارم از نیاگانِ شما

انہوں نے کہا کہ میں اپنی قوم کی تہی مائگی سے واقف ہوں. میں جانتا ہوں کہ ان کے پاس نہ ساز و برگ ہے نہ ذرائع و اسباب. لیکن یاد رکھو! قوم کی حالت نگاہ کی تبدیلی سے بدلا کرتی ہے. خارجی انقلاب ہمیشہ دل کے انقلاب کا رہینِ منت ہوتا ہے. اس لئے اسباب و ذرائع کی کمی اور متاع و منال کے فقدان سے مت گھبراؤ.

اگر یک قطرہ خوں داری اگر مشتِ پرے داری
بیا من با تو آموزم طریقِ شاہبازی را

پہلے اپنی نگاہوں میں تبدیلی پیدا کرو. دل میں قوتِ ایماں' نگاہوں میں نورِ بصیرت، بازوؤں میں جوششِ کردار، سامنے حق و صداقت پر مبنی نصب العین اور دماغ میں اس کے حصول کا ولولہ. اس ساز و سامان کو لے کر نکلو. اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰہِ مَثْنٰی وَ فُرَادٰی (۳۴/۴۶) اپنے اللہ کے لئے ایک ایک دو دو کر کے کھڑے ہو جاؤ اور حالات و کوائف نے تمہیں جس منزل میں رکھا ہے وہیں سے حصولِ مقصد کی ابتدا کر دو.

آفریدند اگر شبنم بے مایہ ترا | خیز و بر داغِ دلِ لالہ چکیدن آموز
اگر خارِ گُل تازہ رسے ساختہ اند | پاسِ ناموسِ چمن دار و خلیدن آموز
باغباں گز خیابانِ تو برکند ترا | صفتِ سبزہ دگر بار دمیدن آموز
تا کجا در تہِ بالِ دگراں می باشی | در ہوائے چمن آزادہ پریدن آموز

اس مردِ حقیقت شناس نے ان کے سامنے آئینِ فطرت کا یہ عظیم الشان راز فاش کر کے رکھ دیا کہ قوموں کی کامیابی اور کامرانی کا انحصار نوجوانانِ ملت کی سیرت (کیریکٹر) پر ہے.

اس قوم کو شمشیر کی حاجت نہیں رہتی | ہو جس کے جوانوں کی خودی صورتِ فولاد

اس لئے کہ انہیں محکم یقین تھا کہ

اگر جواں ہوں مری قوم کے جسور و غیور | قلندری مری کچھ کم سکندری سے نہیں

وہ انہیں مصافِ زندگی میں سیرتِ فولاد پیدا کرنے کی تلقین کرتا تھا اور اس لئے انہیں متنبہ کرتا تھا کہ

نہیں ہنگامۂ پیکار کے لائق وہ جواں — جو ہوا نالۂ مرغانِ سحر سے مدہوش
مجھ کو ڈر ہے کہ ہے طفلانہ طبیعت تیری — اور عیار ہیں یورپ کے شکر پارہ فروش

وہ انہیں برملا کہتا تھا کہ قوموں کی تقدیریں سہل انگاری اور عافیت کوشی سے نہیں بدل جایا کرتیں سلطنتیں ریزولیوشنز پاس کرنے سے نہیں بلکہ ریزولیوشن (عزمِ راسخ) پیدا کرنے سے ملا کرتی ہیں. تاج و شکوہِ خسروی کے معاملے چمن زاروں میں طے نہیں ہوا کرتے.

تختِ جم و دارا سر راہے نفروشند — ایں کوہ گراں است بکاہے نفروشند
باخونِ دلِ خویش خریدن وگر آموز

وہ جانتے تھے کہ غلط تعلیم و باطل تہذیب کے اثرات نے ان جوانوں کے جوہر مردانگی کو سلب' ان کے افکار کو آوارہ، ان کی نگاہوں کو پریشاں اور ان کے قوائے عملیہ کو مضمحل کر رکھا ہے. اس لئے وہ قوم کے اربابِ مسانید و فتاویٰ اور صاحبانِ دعوت و ارشاد کی توجہ اس نقطۂ ماسکہ کی طرف مبذول کراتے اور ان سے بار بار تاکید کرتے کہ

اے پیرِ حرم رسم و رہِ خانقہی چھوڑ — مقصود سمجھ میری نوائے سحری کا
اللہ رکھے تیرے جوانوں کو سلامت — دے ان کو سبق خود شکنی و خود نگری کا
تو ان کو سکھا خارہ شگافی کے طریقے — مغرب نے سکھایا انہیں فن شیشہ گری کا
دل توڑ گئی ان کا دو صدیوں کی غلامی — دارو کوئی سوچ ان کی پریشاں نظری کا

اس لئے ان کی پریشاں نظری دُور ہو جانے سے ان کے سامنے وہ درخشندہ نصب العین حیات بے نقاب ہو جائے گا. جس کا حصول ملتِ اسلامیہ کا منتہیٰ اور تکمیلِ شرفِ انسانیت کی معراج ہے. نصب العین کی صداقت اور اس پر محکم یقین انسانوں کی خوابیدہ قوتوں کو بیدار کر دیتا ہے. اس سے اس کے جگر بن خون خون میں حرارت اور حرارت میں وہ شعلہ صفتی پیدا ہو جاتی ہے جو باطل کے ہر خس و خاشاک پر برقِ خاطف بن کر گرتی اور اُسے راکھ کا ڈھیر بنا کر رکھ دیتی ہے. یہی وہ "عقابی رُوح" ہے جس کی بیداری میں اُمتوں کی حیاتِ تازہ کا راز پوشیدہ ہے.

عقابی رُوح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں — نظر آتی ہے اس کو اپنی منزل آسمانوں میں

نہ ہو نومید، نومیدی زوالِ علم و عرفاں ہے　　　　امیدِ مردِ مومن ہے خدا کے رازدانوں میں!
نہیں تیرا نشیمن قصرِ سلطانی کے گنبد پر　　　　تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں

حضرت علامہ نے اپنے کلام میں جہاں جہاں شاہیں کو مخاطب کیا ہے' اس سے مقصود قوم کا جسور و غیور

شاہین زادگان

نوجوان ہے۔ اس طبقہ کی صلاحیتوں سے وہ کبھی ناامید نہیں ہوئے۔ وہ سمجھتے تھے کہ ان کے ممکنات کی وسعتیں کس قدر حدود فراموش اور قیود ناآشنا ہیں۔ دیکھئے۔ یہ امیدوں کا شاہزادہ کس قدر شگفتہ و شاداب انداز میں اس کا ذکر کرتا ہے جب کہتا ہے کہ:۔

نہیں ہے ناامید اقبالؔ اپنی کشتِ ویراں سے　　　　ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

یہ نم کیا تھا۔ بس اسی میں اقبالؒ کے پیغام کا سارا راز مضمر ہے۔ مغرب اپنے موجودہ نظامِ تمدن و معاشرت کے ہاتھوں جگر فگار ہے۔ لیکن چونکہ اس کے سامنے حقائقِ ابدی کا کوئی ضابطہ نہیں اس لئے اسے سمجھ میں نہیں آتا کہ اس غارت گرِ امن و عافیت و رہزنِ متاعِ شرفِ انسانیت۔ تہذیب کی تخریب کے بعد نظامِ انسانیت کو کن جدید بنیادوں پر استوار کیا جائے۔ لیکن حضرت علامہ کے سامنے تو حقائقِ ابدی کا وہ ضابطۂ آئین و دستور کھلا رکھا تھا جس میں شرفِ انسانیت کے تقاضوں کی

علاج

تسکین کا سامان موجود ہے۔ اس لئے انہیں امتوں کے مرضِ کہن کا علاج تجویز کرنے میں کچھ دقت نہ تھی۔ انہوں نے مریض کی نبض پر انگلیاں رکھیں اور اپنے یقین کی پختگی کے ساتھ اعلان کر دیا کہ:۔

وہی دیرینہ بیماری، وہی نامحکمی دل کی　　　　علاج اس کا وہی آبِ نشاط انگیز ہے ساقی

ملت کی کشتِ ویراں کا نم اسی آبِ نشاط انگیز سے حاصل ہونا تھا جسے قرآن کہتے ہیں۔ اسی لئے انہوں نے ملت کے نوجوانوں سے پوری قوت اور شدت سے کہا کہ یورپ آوارہ نظر اور پریشاں نگاہ ہے۔ اس لئے تمہیں اس کی تقلید سے کیا حاصل ہوگا۔ تمہارے صحنِ چمن میں تہذیب و تمدن کا وہ شجرِ طیّب سایہ فگن ہے جس کی جڑیں حقائقِ ابدی کی گہرائیوں میں اور جس کی شاخیں کہکشاں گیر ہیں۔ شَجَرَةٌ طَيِّبَةٌ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّ فَرْعُهَا فِى السَّمَآءِ۔ جو زمان و مکان کی حدود سے ماوراء اور مشرق و مغرب کی ثغور سے بے نیاز ہے۔ لَا شَرْقِيَّةٍ وَّ لَا غَرْبِيَّةٍ۔ جس کے برگ و بار

کی تازگی و شگفتگی پر ہزاروں جنتیں نچھاور اور لاکھوں بہاریں تصدق ہیں اور جسے دیکھ کر باغبانِ فطرت فرطِ مسرت سے والہانہ انداز میں جھوم اٹھتا ہے اور حاسدوں کے دل پر سانپ لوٹنے لگ جاتے ہیں یُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ (۴۸/۲۹) تم اس سدابہار شجرِ مقدس کی شاخ سے کٹ کر گر پڑے ہو۔ تمہیں تو صرف اتنا کرنا ہے کہ پھر سے اسی شاخ سے پیوست ہو جاؤ۔ زندگی کی تمام تازگیاں تمہارے رگ و پے میں سرایت کر جائیں گی اور کامیابیوں کے پھول اور کامرانیوں کے خوشے اس کا ماحصل ہوں گے۔

دگر بشاخِ گل آویز و آب و نم برکش　　پریدہ رنگ ز بادِ صبا چہ می جوئی

بس اس کے لئے کرنا یہ ہے کہ مغرب کی باطل افروز تہذیب اور انسانیت سوز نظریۂ زندگی کا جو رنگ تمہارے قلب و نظر کو آلودہ کر چکا ہے، اسے الگ کر دو۔ یہ حصہ لَآ اِلٰہَ ہے۔ اس کے بعد اس یقین کو دل کی گہرائیوں میں جگہ دے دو کہ قرآن تکمیلِ شرفِ انسانیت کے لئے واحد اور مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ یہ حصہ اِلَّا اللہ ہے۔ لا اور اِلّا کے اس مجموعہ سے تمہاری داستانِ حیات نئے سرے سے مرتب ہو جائے گی۔

اے اسیرِ رنگ، پاک از رنگ شو　　مومنِ خود کافرِ افرنگ شو

اس ایمان سے تمہاری نگاہ کا زاویہ بدل جائے گا اور جب نگاہ کا زاویہ بدل جائے گا تو ساری دنیا بدل جائے گی۔ یہ ہے اقبالؒ کا پیغام نوجوانانِ ملت کے نام۔ وہ پیغام جسے انہوں نے "پیامِ مشرق" میں پند باز بابچۂ خویش کے استعارے میں ان الفاظ میں سمیٹ کر رکھ دیا ہے۔ شاہین اپنے بچے کو نصیحت کرتا ہے کہ

تو دانی کہ بازاں ز یک جوہر اند　　دلِ شیر دارند و مشتِ پر اند
نکو شیوہ و پختہ تدبیر باش　　جسور و غیور و کلاں گیر باش
میامیز با کبک و تورنگ و سار　　مگر ایں کہ داری ہوائے شکار
شد آں باشہ نخچیر نخچیر خویش　　کہ گیرد ز صید خود آئین کیش
نگہ دار خود را و خورسند زی　　دلیر و درشت و تنومند زی
چہ خوش گفت فرزندِ خود را عقاب　　کہ یک قطرۂ خوں بہ از لعلِ ناب
ز دستِ کسے طعمۂ خود مگیر　　نکو باش و پندِ نکویاں پذیر

قوم کے جس نوجوان میں یہ سیرتِ فولاد پیدا ہو جائے وہی قوم کی امیدوں کا سہارا اور اس کے

آسمانِ مستقبل کا درخشندہ ستارہ ہے.

وہی جواں ہے قبیلے کی آنکھ کا تارا　　شباب جس کا ہے بے داغ ضرب ہے کاری
اگر ہو جنگ تو شیرانِ غاب سے بڑھ کر　　اگر ہو صلح تو رعنا غزالِ تاتاری
عجب نہیں ہے اگر اس کا سوز ہے ہمہ سوز　　کہ نیستاں کے لئے بس ہے ایک چنگاری
خدا نے اس کو دیا ہے شکوہِ سلطانی　　کہ اس کے فقر میں ہے حیدری و کراری
نگاہِ کم سے نہ دیکھ اس کی بے کلاہی کو　　یہ بے کلاہ ہے سرمایۂ کلہ داری

لیکن اقبالؒ نے یہ سب کچھ اس زمانہ میں کہا جب قوم کو حصولِ مقصد کے لئے تیار کیا جانا مقصود تھا. یہ مقصد بھی وہی تھا جسے اس مردِ مومن نے ۱۹۳۰ء میں الہ آباد کے مقام پر قوم کے سامنے پیش کیا تھا اور جو بعد میں پاکستان کے درخشندہ و محبوب تصور کی صورت میں وجہ شگفتگی قلب و نگاہ ہوا. اس وقت قوم کے نوجوانوں کے ذمہ صرف یہ فریضہ تھا کہ وہ اس سرزمین کو جوان کے لئے مقدر ہو چکی تھی، انگریز اور ہندو کے قبضہ سے نکال کر اپنے حیطۂ اقتدار میں لے آئیں. وہ مقصد حاصل ہو گیا. لیکن اب نوجوانانِ ملت کے سامنے اس سے بھی بلند و بالا اور اشد و اہم فریضہ آ گیا اور وہ فریضہ اس کے سوا اور کیا ہے کہ خدا کی جو زمین انہیں اس طرح حاصل ہو گئی ہے. اس میں خدا کے

پاکستان کا نوجوان

اس ابدی قانون کو رائج کریں جس کے اتباع میں شرفِ انسانیت کے ارتقاء کا راز پوشیدہ ہے. یہ کام قوم کے نوجوانوں کے ہاتھ سے سرانجام پائے گا. وہ پیرانِ کہن جنہوں نے اپنی زندگیاں ایک خاص نہج و اسلوب پر بسر کی ہیں اور ان کی عادات و امیال انہی روشوں پر پختگی حاصل کر چکی ہیں. ان کے لئے مشکل ہی نہیں (بعض اوقات) ناممکن ہوتا ہے کہ وہ ان قالبوں کو توڑ سکیں جس میں ان کے پیکر ڈھل چکے ہیں. دنیا کے نظامِ کہن کی جگہ جہانِ نو کی تعمیر قوم کے نوجوانوں کی قوتِ بازو ہی سے ممکن ہے. اس لئے اقبالؒ کی روح آج پاکستان کے ہر نوجوان سے پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ

اُٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دَور کا آغاز ہے

اور جو سعادت مند اس کی اس دعوتِ حیات بخش پر لبیک کہے اس کے لئے پیغام یہ ہے کہ:-

ہو صداقت کیلئے جس دل میں مرنے کی تڑپ — پہلے اپنے پیکرِ خاکی میں جاں پیدا کرے
پھونک ڈالے یہ زمین و آسمانِ مستعار — اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے
زندگی کی قوتِ پنہاں کو کر دے آشکار — تا یہ چنگاری فروغِ جاوداں پیدا کرے
خاکِ مشرق پر چمک جائے مثالِ آفتاب — تا بدخشاں پھر وہی لعلِ گراں پیدا کرے

خام ہے جب تک تو ہے مٹی کا اک انبار وہ
پختہ ہو جائے تو ہے شمشیرِ بے زنہار وہ

(اپریل ۱۹۵۰ء)

ضربُ الکلیم

[ڈاکٹر عبدالوہاب عزام مصر کے نہایت جلیل القدر اہلِ علم تھے۔ اقبالؒ سے انہیں والہانہ عشق تھا۔ جب وہ بطور سفیرِ مصر، پاکستان میں قیام پذیر تھے تو انہوں نے پرویز صاحب سے اقبالؒ کا کلام لفظاً لفظاً سمجھا۔ جتنا کچھ وہ سمجھتے تھے اسے عربی (نظم) میں منتقل کرتے چلے جاتے تھے۔ اسی نہج سے انہوں نے ضربِ کلیم کا منظوم ترجمہ مکمل کرلیا تو اس کا پیش لفظ بھی پرویز صاحب ہی سے لکھوایا۔ اس پیش لفظ کا اُردو ترجمہ حسبِ ذیل ہے]

جس کتاب کا ترجمہ آپ کے پیشِ نظر ہے علامہ اقبالؒ نے اس کا نام ضربِ کلیم رکھا اور خود ہی اس کی تشریح ان الفاظ سے کردی۔

اعلانِ جنگ عصرِ حاضر کے خلاف

میرے نزدیک یہ الفاظ علّامہ اقبالؒ کی صرف ایک کتاب ضربِ کلیم ہی کے شارح نہیں بلکہ ان کے پورے کے پورے پیغام کے ایک عظیم حصّے کے مفسّر ہیں۔ اگر حضرت علّامہ کے پورے پیغام کا تجزیہ کیا جائے تو وہ دو اہم حصّوں میں تقسیم ہوجاتا ہے۔ ایک حصّہ نفیرِ انقلاب ہے۔ اس "غیر منزل من اللہ" اسلام کے خلاف جسے عجمی سازش نے نہایت سادگی اور پُرکاری سے وضع کیا اور دامِ ہمرنگِ زمین کی صورت میں عینِ اسلام بناکر اس امّت پر مسلّط کردیا جو ان غیر قرآنی تصورات کو مٹانے کے لئے مبعوث ہوئی تھی۔ عجم کی یہ سازش درحقیقت انتقام تھی یہود و نصاریٰ و مجوس کی ان شکستوں کا جو انہیں میدانِ جنگ میں مسلمانوں کی تیغِ حق کے مقابلے میں اٹھانی پڑیں۔ یہ لوگ جانتے تھے کہ اس ملّتِ مجاہدین کی

قوت وسطوت کا راز قرآن کی حیات بخش تعلیم میں ہے۔ لہٰذا انہوں نے ایسی چال چلی کہ مسلمانوں کو قرآن سے یکسر بے گانہ بنا کر غیر قرآنی اسلام کے فریب میں الجھا دیا اور یہ کچھ اس کامیاب طریق سے کیا کہ سادہ لوح مسلم اس سرابِ رنگ و بو کو سچ مچ کا گلستان سمجھنے لگ گیا۔ یونان کا خواب آور فلسفۂ حشیشیں، مجوس کی غلامانہ نسل پرستی، یہود کی قشری شریعتِ رسومات، رہبانِ نصاریٰ کی مرگ آفریں خانقاہیت ایک ایک کر کے اسلام کے لاینفک اجزا بن گئے اور اس طرح یہ ملت جو کبھی ذوقِ عمل سے شعلۂ جوالہ تھی، کوتاہیِ عمل سے راکھ کا ڈھیر بن گئی۔ اقبالؒ کے پیغام کا ایک حصہ اسی "غیر منزل من اللہ" اسلام کے لئے پیامِ مرگ اور قرآنی اسلام کے احیاء کے لئے نشیدِ حیات تھا۔

علامہ کے پیغام کا دوسرا حصہ اس فتنے کے خلاف احتجاجِ مسلسل تھا جو تہذیبِ مغرب کے رنگ میں طوفان در طوفان اُمڈے چلا آ رہا تھا اور جس کی تموج انگیز طغیانیاں ملتِ اسلامیہ کی نژادِ نو کو خس و خاشاک کی طرح بہائے لئے جا رہی ہے۔ ضربِ کلیم اس تہذیبِ عصرِ حاضر کے جنود و عساکر کے خلاف اعلانِ جنگ تھا۔

سوال یہ ہے کہ تہذیبِ حاضر کہتے کسے ہیں اور اقبالؒ نے اس کی اس قدر مخالفت کیوں کی؟ اس سوال کا جواب سمجھ میں نہیں آسکتا جب تک پہلے یہ نہ دیکھ لیا جائے کہ اسلامی تہذیب کیا ہے۔

جس شخص کے سامنے قرآن کے اوراق کھلے ہیں اس پر یہ حقیقت روشن ہے کہ اسلام ایک

اسلامی تہذیب

ضابطۂ حیات اور نظامِ زندگی ہے جسے الدّین کی اصطلاح سے تعبیر کیا گیا ہے۔ قرآن نے انسانی زندگی کے لئے ایک نصب العین مقرر کر دیا ہے اور اس کے ساتھ وہ حدود متعین کر دی ہیں جن کے اندر رہتے ہوئے انسان اپنے اختیارات کا استعمال کر سکتا ہے۔ یہ نصب العین اور حدود دونوں غیر متبدل ہیں۔ انہی کو ابدی صداقتیں یا مستقل اقدارِ زندگی کہا جاتا ہے۔

قرآن کی رُو سے، اگرچہ حیات کی نمود مختلف پیکروں میں ہوتی ہے لیکن حیات کا سرچشمہ ایک ہے اور یہی سرچشمہ ان ابدی صداقتوں کی اصل ہے جن کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔ سرچشمۂ حیات اور ابدی صداقتوں کے سرچشمہ کی وحدت کے عقیدے سے فطری طور پر یہ نتیجہ مرتب ہوتا ہے کہ:-

(د) ہر انسان من حیث الانسان زندگی کی ممکنات اپنی ذات میں مضمر رکھتا ہے جن کی نشوونما اور نمود زندگی کا مقصود ہے۔ ان جواہر مضمر کی پختگی اور تابندگی سے انسان میں شانِ انفرادیت پیدا ہوجاتی ہے جس کا تحفظ بقا اور تسلسل (بعد از ممات) انسانی جدوجہد کا ماحصل ہے۔

(ب) تمام انسان ایک عالمگیر برادری کے افراد ہیں جو جغرافیائی لسانی، نسلی اور وطنی حدود سے متأثر نہیں ہوتی۔

(ج) تمام نوعِ انسانی کی فلاح کا راز ایک ہی ضابطہ کے مطابق زندگی بسر کرنے میں ہے جو وحی کے ذریعہ مل سکتا ہے اور جو آج اس آسمان کے نیچے قرآن کی دفتین میں محفوظ ہے۔

ان محکم اصولوں کی بنیاد پر اسلام ایک ایسے معاشرے کی تشکیل کرتا ہے جس میں نوعِ انسانی زندگی کی ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی شرفِ انسانیت کے سدرۃ المنتہیٰ تک جا پہنچے۔ اس معاشرے کی نمایاں خصوصیات یہ ہیں:۔

۱۔ اس میں افرادِ معاشرہ اپنے اندر ان صفاتِ خداوندی کو منعکس کرنے کے قابل ہوجاتے ہیں جنہیں قرآن اسماء الحسنیٰ سے تعبیر کرتا ہے اور جو کائنات میں مستقل اقدار کا سرچشمہ ہیں۔

۲۔ ان افراد میں ایسا ضبط پیدا ہوجاتا ہے جس سے وہ ان صفات میں ٹھیک ٹھیک توازن قائم رکھ سکتے ہیں۔ اس لئے کہ اسماء کے لئے حسنیٰ کی شرط ضروری ہے اور حسن نام ہے تناسب کے اعتدال کا۔

۳۔ ان افراد کی نگاہوں میں ایسی بصیرت پیدا ہوجاتی ہے جس سے وہ صحیح صحیح فیصلہ کر سکتے ہیں کہ فلاں قسم کے خارجی حادثہ کی صورت میں فلاں قسم کی صفتِ خداوندی کا ظہور ہونا چاہیئے۔

۴۔ ان افراد پر مشتمل جماعت میں اشیاء فطرت کی تسخیر کی قوت اور ان کے ماحصل کو فلاحِ انسانیت کے لئے صرف کرنے کی صلاحیت پیدا ہوجاتی ہے۔

۵۔ وحدتِ خالق، وحدتِ انسانیت اور وحدت و ائتلافِ ملت کے محکم تصور سے انسان اور کائنات، انسان اور انسان اور خود انسان کے اپنی ذات کے تضادات میں توافق پیدا ہوجاتا ہے جس سے انسانی معاشرہ کی ناہمواریاں مٹتی چلی جاتی ہیں۔

۶۔ اس جماعت کا ہر فرد اپنے آپ کو خدا کی صفتِ ربّ العالمینی کا مظہر سمجھتے ہوئے بلا مزد و معاوضہ انسانیت کی ربوبیت کا کفیل بن جاتا ہے۔ اس طرح تمام افرادِ معاشرہ کی ضروریاتِ زندگی بھی ازخود پوری ہوتی جاتی ہیں اور ان کی فطری صلاحیتوں کے کامل نشوونما کے اسباب و وسائل بھی یکساں طور پر میسّر آتے جاتے ہیں۔ اور اس طرح زندگی کی جوئے رواں ہنستی کھیلتی رقص کرتی شاداں و فرحاں اقطار السمٰوٰت والارض سے آگے بڑھتی چلی جاتی ہے۔

یہ ہے مختصر سے الفاظ میں قرآنی تہذیب کا ماحصل۔ اس کے برعکس تہذیبِ عصرِ حاضر اس تہذیب کی یکسر نقیض ہے۔ اس تہذیب کی عمارت اس فلسفہ کی

تہذیب مغرب

بنیادوں پر استوار ہوتی ہے کہ مادی عناصر کے محض اتفاقیہ طور پر یکجا ہوجانے سے حیات وجود میں آگئی اور ان عناصر کے منتشر ہوجانے سے اس کا خاتمہ ہوجائے گا۔ دنیا یہی مادی عناصر کی دنیا ہے جس میں ہر شے تغیّر پذیر ہے۔ لہٰذا دنیا میں نہ کوئی مستقل اقدار ہیں نہ قانونِ مکافاتِ عمل۔ خیر وہ ہے جس سے کسی فرد یا افراد کے گروہ یا قوم کو ذاتی مفاد حاصل ہوجائے (خواہ اس سے دوسرے افراد یا دوسری اقوام کی رگِ حیات ہی کیوں نہ کٹ جائے) اور شر وہ ہے جس سے کسی فرد یا قوم کا ذاتی نقصان ہو۔ ہر فرد یا قوم کا نصب العینِ حیات منفعتِ خویش کا حصول ہے اور علم و عقل کا کام یہ ہے کہ وہ اس منفعت کے حصول کے لئے اسباب و تدابیر اور حیل و مکائد فراہم کرے۔ اس فلسفۂ حیات (یا تہذیبِ عصرِ حاضر) کا نتیجہ یہ ہے کہ انفرادی طور پر خود اہلِ مغرب کی تحقیق کے مطابق وہاں کی آبادی کا ہر چھٹا فرد ایسا ہے جسے عمر کا کچھ نہ کچھ حصّہ پاگل خانے میں گزارنا ہوگا اور اجتماعی طور پر یہ عالم ہے کہ دنیا کی مختلف قومیں یا تو باہمی کشت و خون میں مصروفِ پیکار رہتی ہے یا اس کشت و خون کی تیاری میں مشغول۔

اقبالؒ نے اقوامِ مغرب کے فلسفۂ حیات اور نظریۂ سیاست و عمرانیت کا گہری نظروں سے مطالعہ کیا جس سے اس پر یہ حقیقت منکشف ہوگئی کہ یہ فلسفۂ حیات اور منہاجِ زندگی دنیا میں جہنّم پیدا کر دینے کا موجب ہے۔ دوسری طرف قرآنی بصیرت نے اس پر حقائقِ زندگی کو اس طرح واشگاف کر دیا کہ وہ بادلوں میں چھپی ہوئی بجلیوں اور ہواؤں میں مستور طوفانوں کو بے حجاب اپنے

سامنے دیکھ لیتا تھا۔ یہی تھی وہ قرآنی بصیرت جس کی بنا پر اس نے ۱۹۰۷ء میں اقوامِ مغرب کو للکار کر کہہ دیا تھا کہ :۔

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

اس وقت سے لے کر اپنی زندگی کے آخری لمحات تک اقبالؒ اقوامِ مغرب کو بالعموم اور ملتِ اسلامیہ کو بالخصوص اس اہرمنی تہذیب کے نتائج و عواقب سے آگاہ کرتا رہا۔ اس مجموعۂ **ضرب کلیم** انذار و تنذیر کا نام ہے ضربِ کلیم جس سے اقبالؒ بتکدۂ عصرِ حاضر کے تمام بتوں کو پاش پاش کر کے رکھ دیتا ہے۔ لیکن وہ اپنے عصائے کلیمی سے صرف فرعونیت، ہامانیت اور قارونیت ہی کے نگاہ فریب سحر کو نہیں توڑتا بلکہ وہ اس کے بعد اپنی قوم کو قندیلِ قرآنی کی روشنی میں فاران و سینا کی ان محفوظ و بابرکت وادیوں میں لے جاتا ہے جہاں زمین سے فوز و فلاح کے چشمے اُبلتے اور آسمان سے رشد و سعادت کے من و سلویٰ اُترتے ہیں۔

پیامِ اقبالؒ کی خوش بختی ہے کہ وہ رفیقِ محترم، صاحب السعادۃ عبدالوہاب عزام سبلے کی "خاراشگافی" اور "جوئے شیر" کے تصدق تنگنائے اُردو سے نکل کر بحیرۂ عرب میں باد باں کشا ہوتا ہے اور اس طرح اپنی اس افادیت کو جو اس وقت تک تشنہ مندۂ ساحل تھی بیکراں بنا رہا ہے۔ اور خوش بختی ہے خود عربی بولنے والی ملتِ اسلامیہ کی جو اس پیامِ حیات بخش سے، جو معنوی لحاظ سے ان سے اس قدر قریب ہونے کے باوجود لفظی اعتبار سے اتنا دور تھا، شرفِ تعارف حاصل کر رہی ہے۔

خدا کرے یہ پیامِ انقلاب سرزمینِ عرب کے لئے پھر وہی تخمِ صالح بن جائے جس سے ایک مرتبہ پہلے وہ شجرِ بلند و بالا پیدا ہو چکا ہے جس کی رفعتوں کے متعلق اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ کہا گیا تھا اور جس کی ہمہ گیر پہنائیوں کو لَا شَرْقِيَّةٍ وَّ لَا غَرْبِيَّةٍ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

اس شجرِ طیب و مبارک کی روئیدگی و بارآوری صرف قرآنی ماحول میں ممکن ہے اور یہی پیامِ اقبالؒ کا مقصود و منطوق ہے۔

گر تو می خواہی مسلمان زیستن نیست ممکن جز بہ قرآن زیستن

(۰)

یہاں تک تو ضربِ کلیم کے متعلق ہوا۔ اقبال کے عمومی مطالعہ کے ضمن میں ایک چیز ایسی ہے

اقبالؒ کی اصطلاحات

جسے مدنظر رکھنا نہایت ضروری ہے۔ اقبالؒ کی شاعری میں عربی اور فارسی لغت کے اکثر الفاظ ایسے ہیں جنہیں وہ ان کے لغوی معنوں میں استعمال نہیں کرتا بلکہ وہ کلامِ اقبالؒ کی خاص اصطلاحات ہیں۔ جب تک ان الفاظ کے اصطلاحی معانی سمجھ میں نہ آئیں اقبالؒ کا صحیح مفہوم سامنے نہیں آسکتا۔ مثلاً علم و عشق، عقل و دل، ذکر و فکر، خبر و نظر، سوز و ساز یا درویش، قلندر، مردِ حُر وغیرہ الفاظ اسی قبیل کے ہیں۔ یہ تمام اصطلاحات اپنی اپنی جگہ اہمیت رکھتی ہیں۔ لیکن وہ اصطلاح جو فکرِ اقبالؒ میں محور کا حکم رکھتی ہے اور جس کے گرد اس کا سارا کلام گردش کرتا ہے' خودی ہے۔ اقبالؒ سے پہلے یہ لفظ ہمارے ہاں غرور اور تکبّر کے معنوں میں استعمال ہوتا تھا لیکن اقبالؒ نے اسے بالکل جداگانہ معنی پہنا دیئے۔ اور یہ مفہوم اب اس درجہ رائج ہو چکا ہے کہ اس لفظ کے قدیمی معانی بالکل نظروں سے اوجھل ہو چکے ہیں۔

خودی

خودی ــــ سے اقبالؒ کا مفہوم کیا ہے اس سوال کا جواب مختصر الفاظ میں دینا آسان نہیں۔ اس لئے کہ اقبالؒ کا فلسفہ درحقیقت فلسفۂ خودی ہے اور جب تک اقبال کا پورا فلسفہ سامنے نہ آجائے اس اصطلاح کا صحیح مفہوم بھی سمجھ میں نہیں آسکتا۔ اس تفصیل و اطناب کا یہ موقع نہیں ہے لیکن چونکہ ضربِ کلیم میں بھی یہ لفظ بار بار سامنے آتے گا۔ اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ قلیل ترین الفاظ میں اس اصطلاح کا طائرانہ سا تعارف کرا دیا جائے۔

سوال یہ ہے کہ کیا انسان کی انفرادیت، شخصیت یا انا کوئی مستقل حقیقت ہے یا محض فریبِ تخیل؟ دنیا کی کوئی قوم ایسی نہ ہوگی جس کے مفکرین نے اس سوال کا جواب دینے کی کوشش نہ ہوگی' افلاطون اور اس کے اتباع میں حکمائے ایران اور ہند اس نتیجہ پر پہنچے کہ کائنات میں صرف حیاتِ کلّی کا وجود ہے۔ اس لئے انسانی ذات (انا یا شخصیت) محض فریب ہے۔ یہ فریب عمل کے زور پر قائم رہتا ہے اور عمل کی بنیاد آرزو پر ہے۔ لہٰذا اس فریب سے نجات حاصل کرنے کا ذریعہ یہ ہے کہ انسان ترکِ آرزو سے ترکِ عمل کرے اور اس طرح انسانی ذات کا حباب ٹوٹ کر حیاتِ کلّی کے بحر میں گم ہو جائیگا۔ اس (فنائے ذات) کا نام نجات ہے اور یہی زندگی کا مقصود ہے۔ یہی وہ فلسفۂ حیات تھا جو ہمارے

ہاں نظریۂ وحدت الوجود کے نام سے رائج ہوا اور جس نے مسلمانوں جیسی ہمہ تن عمل قوم کو خاک کے آغوش میں سُلا دیا۔

اقبالؒ نے اس فلسفۂ حیات کے خلاف مسلسل احتجاج کیا اور اس کے برعکس فلسفۂ خودی پیش کیا۔ اس فلسفہ کا ملخص یہ ہے کہ حیات عالمگیر یا کلّی نہیں بلکہ انفرادی ہے۔ حتیٰ کہ خدا بھی ایک فرد ہے اگرچہ وہ اپنی انفرادیت میں یگانہ اور نادر ہے۔ اس انفرادی زندگی کی اعلیٰ ترین صورت کا نام خودی ہے جس سے انسانیت کی شخصیت یا انفرادیت متشکل ہوتی ہے۔ لہٰذا انسانی زندگی کا مقصود فنائے ذات نہیں بلکہ اثباتِ خودی ہے۔ اقبالؒ کے نزدیک جوں جوں انسان اس فردِ کامل و نادر کی مانند ہوتا جاتا ہے (جسے انائے مطلق یا خدا کہتے ہیں) وہ خود بھی منفرد اور نادر ہوتا جاتا ہے۔ اس کا نام استحکامِ خودی ہے۔ "خدا کی مانند" ہونے کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنے اندر صفاتِ خداوندی کو منعکس اور اس طرح اس انائے مطلق کو اپنے اندر جذب کرتا جائے۔ خودی کے ضعف اور استحکام کے پرکھنے کا معیار یہ ہے کہ انسان اپنی راہ میں آنے والے موانعات پر کس حد تک غالب آتا ہے۔ زندگی کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ مادہ ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ مادّہ شر ہے اور اس لئے قابلِ نفرت۔ مادہ شر نہیں بلکہ یہ زندگی کی خوابیدہ قوّتوں کو بروئے کار لانے کا ذریعہ ہے۔ جب انسانی خودی موانعات پر غلبہ حاصل کرنے سے پختہ ہو جاتی ہے تو پھر موت کا جھٹکا اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ اس طرح انسانی زندگی دوام سے ہمکنار ہو جاتی ہے۔ بنا بریں ہر وہ عمل جس سے خودی میں استحکام پیدا ہو خیر ہے اور ہر وہ کام جس سے خودی کمزور ہو جائے، شر ہے۔

مراحلِ ثلاثہ

اقبالؒ کے نزدیک ارتقائے خودی کا پہلا مرحلہ تخلیقِ مقاصد یا تولیدِ آرزو ہے۔ آرزو عینِ حیات اور اصلِ قوّت ہے۔ کیونکہ یہی عمل کی محرک ہوتی ہے۔

تخلیقِ مقاصد کے بعد دوسرا مرحلہ حصولِ مقاصد کے لئے جہدِ مسلسل ہے۔ حصولِ مقصد کے لئے اس تپش و خلش کا نام اقبالؒ کی اصطلاح میں عشق ہے۔ اس جدوجہد کی کامیابی کے لئے تین شرائط ناگزیر ہیں۔ اوّل اطاعت۔ اطاعت سے مراد ہے قوانینِ خداوندی (قرآن) کا کامل اتباع جس کے لئے قرآنی معاشرہ کی تشکیل ضروری ہے۔ اس اطاعت سے انسان کے اندر ضبطِ نفس پیدا ہو جاتا ہے اور یہ دوسری شرط ہے۔ ضبطِ نفس سے مراد خواہشات کا دبانا نہیں بلکہ امالہ یا کظامت (زائد قوّتوں

کا رُخ دوسری طرف بدل دینے) سے ان میں توازن پیدا کرنا ہے۔ اس توازن کی اکمل ترین شکل ذاتِ خداوندی ہے جس میں متضاد صفات کا باہمی توازن اپنی انتہا تک پہنچا ہوا ہے۔

اس تطہیرِ فکر و عمل اور تہذیبِ نفس سے انسان اس مقام تک جا پہنچتا ہے جسے اقبالؒ نیابتِ الٰہیہ سے تعبیر کرتا ہے اور یہ تیسری شرط ہے۔ نیابتِ خداوندی سے اقبالؒ کا مفہوم وہ قوتِ مجریہ ہے جو دنیا میں قوانینِ خداوندی (ضابطۂ قرآنی) کی تنفیذ و ترویج کا موجب بنتی ہے (نیابتِ الٰہیہ سے مراد یہ نہیں کہ انسان خدا کا قائم مقام یا جانشین بن جاتا ہے۔ اس لئے کہ جانشینی صرف اس کی ہوتی ہے جو خود موجود نہ ہو)۔ یہ مقامِ مومن ہے اور یہی مقامِ اقبالؒ کے نزدیک استحکامِ خودی کا آخری نقطہ ہے۔ اس مقام پر پہنچ کر انسان ساری دنیا پر غالب آجاتا ہے۔ دنیا اس پر غالب نہیں ہوتی۔ اس کیفیت کا نام اقبالؒ کی اصطلاح میں فقر، درویشی یا قلندری ہے۔ یعنی سب کچھ مسخر کر لینے کے بعد وہ استغناء جو اللہ کی صفتِ صمدیت اور "غَنِیٌّ عَنِ الْعَالَمِیْنَ" کا مظہر ہو۔ اس قسم کے افراد پر مشتمل جماعت کا نام امتِ مسلمہ ہے اور اسی جماعت کی نشاۃِ ثانیہ، پیامِ اقبالؒ کا منتہیٰ و مقصود۔ وہ امت جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ

میانِ امتاں والا مقام است　　　کہ آں امت دو گیتی را امام است
نیاساید ز کارِ آفرینش　　　کہ خواب و خستگی بر وے حرام است

اور

بباغاں عندلیبے خوش صفیرے　　　براغاں جرّہ بازے زود گیرے
امیرِ او بسلطانی فقیرے　　　فقیرِ او بہ درویشی امیرے

لتکونوا شھداء علی النّاس و یکون الرّسول
علیکم شھیدًا

مقامِ اقبالؒ

صندل ہال شملہ کی ایک تقریر

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مسلمانوں نے قرآنِ کریم کے الفاظ کو یاد رکھا اور اس طرح یاد رکھا کہ اس کی نظیر دنیا کی کسی اور قوم میں نہیں مل سکتی. لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ انہوں نے اس کے مفہوم و معانی کو جس طرح سے بھلایا ہے اس کی مثال بھی شاید ہی کہیں اور مل سکے. صدرِ اوّل کے بعد جو قرآن نگاہوں سے اوجھل ہونا شروع ہوا ہے تو رفتہ رفتہ وہ غیر اسلامی تصوّرات کے غلافوں میں اس طرح چھپ گیا جیسے چاند گہن میں آجاتے. صدیاں اسی طرح گذر گئیں اور پھر یہ حالت ہوگئی کہ یہی غیر اسلامی تخیلات عین اسلام بن گئے. اب مسلمانوں سے ان معتقدات کو چھڑانا جو انہیں اسلاف سے وراثت میں ملے ہیں، ان کی نگاہ میں انہیں دین سے بے گانہ بنانا تھا. ادھر یہ حالت تھی. اُدھر یورپ کے میکانکی تصورِ حیات کے بڑھتے ہوئے سیلاب نے نوجوان طبقہ کے دل و دماغ سے ماورائے عقل (یعنی وحی) کی ضرورت اور اس کے تاثرات کو خس وخاشاک کی طرح بہا کرلے جانا شروع کر دیا اور اس طرح ان کی نگاہوں کا زاویہ بدل دیا. مذہب پرست طبقہ اپنی جگہ نوحہ کناں تھا کہ نوجوان طبقہ مذہب سے بیگانہ ہی نہیں بلکہ متنفر ہوتا جارہا ہے. اور نوجوان طبقہ شکوہ سنج تھا کہ جس چیز کو ان کے سامنے حقیقت و بصیرت کہہ کر پیش کیا جارہا ہے اس سے ان کی فطرت ابا کرتی ہے. غرضیکہ — "مسجدیں مرثیہ خواں تھیں کہ نمازی نہ رہے:" اور بے نمازوں کو شکایت تھی کہ نمازیوں میں — وہ صاحبِ اوصاف حجازی نہ رہے. مذہب کے

مدعیوں کو ہر مقام پر شکست ملتی تھی۔ اس لئے کہ قرآنِ کریم میں تو یہ جوہر موجود ہے کہ انسان علم و عقل اور تجارب و مشاہدات کی جن بلندیوں تک جی چاہے اڑتا جائے قرآن اس سے بھی آگے نظر آئیگا۔ لیکن جن عجمی تصورات کو اسلام کہہ کر پیش کیا جارہا تھا وہ تو انسانی دماغ کی کاوش ہی کا نتیجہ تھے۔ ان میں یہ صلاحیت کیسے پیدا ہو سکتی تھی کہ وہ زمانہ کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ دے سکتے۔ غرضیکہ دنیائے اسلام عجیب پیچ و تاب میں تھی اور کسی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کیا جائے کہ ایسے میں

حقیقی قرآن

مبدارِ فیض کی کرم گستری نے ان میں ایک ایسی گراں مایہ ہستی کو پیدا کر دیا جس کی نگاہِ دور رس نے انسانی تخیلات کے تو بر تو پردوں کو قرآنِ کریم سے ہٹا کر عروسِ حقیقت کو بے نقاب دیکھ لیا اور وہ اسلام جو مدت ہائے دراز سے عجمی انسانوں کی چیستاں بن چکا تھا پھر سے اپنی اصلی حالت میں پہچانا گیا۔ خدائے ذوالمنن کی موہبتِ کبریٰ سے اس شخص کو دماغ ایسا عطا ہوا جو علم و حکمت کے بلند ترین مقام تک پہنچ چکا تھا اور اس کے ساتھ ہی قرآن کی محبت نے اس کے سینے میں وہ قلبِ روشن رکھ دیا جسے صہبائے ایمان کا شفاف آبگینہ کہنا چاہیئے۔ ان دونوں کے امتزاج سے وہ نگاہ پیدا ہوئی جو ہزار پردوں میں چھپی ہوئی حقیقت کو بھی بے نقاب دیکھ لے۔ اس نگہِ حقیقت شناس کا نام تھا اقبالؒ۔

(۰)

جب سے مسلمانوں میں مرکزیت فنا ہوئی تھی ان کے ہاں بھی دین اور دنیا دو الگ الگ شعبے قائم ہو چکے تھے، جس طرح عیسائیت میں کلیسا اور سلطنت اور ہندوستان میں گرہست آشرم اور سنیاس آشرم تھا۔ مسلمانوں کے نزدیک بھی دنیا ایسی قابلِ نفرت شے بن چکی تھی کہ ہر محراب و منبر سے یہ آواز بلند ہوتی تھی کہ دنیا مردار ہے اور اس کا طالب کتا۔ اقبالؒ نے آکر بتایا کہ یہ نظریہ یکسر غیر اسلامی ہے۔ قرآن اپنے ماننے والوں کے لئے ایک مکمل دستورِ حیات پیش کرتا ہے۔ ایک ایسا نظامِ زندگی مرتب کر کے دیتا ہے جو ان کی ہر قدم پر راہنمائی کرتا ہے۔ سیاست، مدنیت، عمرانیت، سب دین ہی کی شاخیں ہیں۔ یوں سمجھئے کہ دنیا کا ہر وہ کام جس کی بنا تقویٰ پر ہو عین دین ہے۔ پھر اقبالؒ نے اس حقیقت کو محض ایک نظری اور اجمالی حیثیت ہی سے پیش نہیں کیا بلکہ دنیا کے ہر نظامِ زندگی کے تجزیہ کے بعد بتا دیا کہ اس میں کیا خرابیاں ہیں اور اسلامی نظام

کس طرح انسانیت کو اس کی منزلِ مقصود تک پہنچانے کا واحد اور مکمل ذریعہ ہے۔

اجتماعی زندگی

دین کے متعلق یہ غلط نظریہ بھی رائج ہو چکا تھا کہ اس سے مقصود محض انفرادی نجات ہے۔ ملت کے اجتماعی معاملات "دنیاداروں" کے لئے ہیں۔ یہ عملی رہبانیت کا تصوّر تھا جو مسلمانوں کے رگ و پے میں سرایت کر چکا تھا۔ اقبالؒ نے آکر بتایا کہ انفرادیت کی زندگی کبھی اسلامی زندگی نہیں ہو سکتی۔ قرآنِ کریم ایک ایسا نظام پیش کرتا ہے جس میں ہر فرد، ملّت کا ایک زندہ رکن ہے۔ انفرادی اصلاح اس لئے ضروری ہے کہ ان افراد کے مجموعہ سے جو قوم بنے وہ از خود اصلاح یافتہ ہو۔ لیکن اگر افراد کے سامنے اجتماعی تصوّرِ حیات نہیں تو وہ لاکھ اصلاح یافتہ ہوں، مقصدِ زندگی سے بہت دور ہوں گے۔ اسلام جماعت ہے اور جماعت نام ہے ایک نظام کے تابع زندگی بسر کرنے کا۔ یہ نظام مرکز سے قائم ہوتا ہے اور مرکزِ ملت وہ ادارہ ہے جو قرآنی احکام کی تنفیذ و ترویج کا ذریعہ بنتا ہے۔ اسی کو "خدا کی بادشاہت" کہتے ہیں یعنی قرآنی نظامِ مملکت۔

دین کے متعلق یہ تصوّر بھی ذہنوں میں جاگزیں ہو چکا تھا کہ عبادات و اعمال کے نتائج محض اُخروی زندگی میں جا کر مرتب ہوں گے۔ ثواب نام رہ گیا تھا ایک ایسے مبہم تصوّر کا جس کی کوئی محسوس توجیہہ اس زندگی میں نہیں ہو سکتی تھی۔ اقبالؒ نے آکر بتایا کہ قرآن کی رُو سے اعمالِ صالحہ سے مفہوم یہ ہے (بلکہ یوں کہیئے کہ اعمال کا فطری اور لازمی نتیجہ ہے) کہ وہ انسان میں یہ صلاحیت پیدا کر دیں کہ وہ موجودہ زندگی میں عزت و وقار، شوکت و حشمت، دولت و ثروت، حکومت و سلطنت کی زندگی بسر کرے اور اس کے بعد کی زندگی میں وہ تمام کامیابیاں اور کامرانیاں نصیب ہوں جو انسانی آرزوؤں کا منتہیٰ ہیں۔ اعمال و عبادات اگر یہ نتائج مرتب نہیں کرتے تو سمجھ لیجئے کہ اس طریقِ کار میں کہیں نہ کہیں خرابی ضرور ہے۔ اور وہ خرابی یہ ہے کہ آج وہ نظامِ زندگی مفقود ہے جس کے اندر رہتے ہوئے یہ اعمال حقیقی معنوں میں اعمالِ صالحہ بنتے تھے۔

پھر مذہب کے متعلق یہ عقیدہ پیدا ہو چکا تھا کہ مذہب جتنا کچھ سمجھا جانا تھا سمجھا جا چکا۔

اجتہاد

اس کے بعد کسی کو حق نہیں پہنچتا کہ وہ مذہب کے متعلق مزید تحقیق و اجتہاد سے مسائل زندگی کا ایسا حل تلاش کرے جو زمانہ کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ دے سکے۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ دنیا کہیں سے کہیں پہنچ گئی لیکن مسلمان ایک ماضی پرست قوم بن کر زندگی کی دوڑ میں صدیوں پیچھے رہ گئے۔ اقبالؒ نے یہ بتایا کہ دین کے مکمل ہونے کے یہ معنی نہیں کہ ضروریاتِ زندگی کے متعلق سینکڑوں برس پیشتر ایک خاص ماحول اور خاص معاشرہ کے تقاضوں کے مطابق جو جزئیات مرتب ہوئی تھیں وہ ابدی طور پر غیر متبدل رکھی جائیں گی۔ ختمِ نبوت اور اکملیتِ دین سے مقصود یہ ہے کہ اصولی طور پر انسانی تقاضوں کی تسکین کے لئے جو کچھ درکار تھا وہ وحی کے ذریعہ انسانوں تک آچکا ہے۔ اس میں کسی ردّ و بدل اور حک و اضافہ کی گنجائش نہیں۔ اب ان اصولوں کی روشنی میں اپنے اپنے زمانہ کے تقاضوں کے مطابق جزئی مسائل کا حل ساتھ کے ساتھ مستنبط ہوتا رہے گا۔ یورپ اس لئے تباہ ہوا کہ اس کے پاس مسائلِ حیات کے حل کے لئے کوئی ایسا غیر متبدل ضابطۂ آئین نہ تھا جو وحی کی محکم بنیادوں پر قائم ہو اور مسلمان اس لئے تباہ ہوئے کہ انہوں نے بدلتے رہنے والے فرعی مسائل سے متعلق احکام کو بھی غیر متبدل سمجھ لیا۔ ماضی سے تمسک اس لئے مفید ہے کہ جو علمی سرمایہ ہمارے اسلاف ہمارے لئے چھوڑ گئے ہیں اس کی مدد سے ہم اپنے مستقبل کو درخشندہ تابناک بنائیں نہ یہ کہ ماضی تو درخشندہ اور روشن رہے اور مستقبل تاریک سے تاریک تر ہوتا چلا جائے۔

(۵)

ایک طرف اقبالؒ نے مذہب پرست طبقہ کے سامنے دین کے وہ حقائق پیش کئے جن کی رُو سے وہ اسلام جو ایک عرصہ سے متاعِ گم گشتہ ہو چکا تھا پھر سے آنکھوں کے سامنے آگیا۔ دوسری طرف انہوں نے یورپ کے مادہ پرستی کے بڑھتے ہوئے سیلاب کے روکنے کی فکر کی۔ یورپ بزعمِ خویش ہر نظریہ کو علم و عقل کی روشنی میں پرکھنے کا مدعی تھا اور اس نظر فریب خوش آیند دعویٰ کے ماتحت وہ مسلمانوں کے نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کو مذہب سے برگشتہ کئے جا رہا تھا۔ ہمارے مذہب پرست طبقہ کے پاس اس الحاد و بے دینی کا علاج سوائے فتاوائے کفر کے اور کچھ نہ تھا۔ کیونکہ نبی اکرمؐ کا یہ ارشادِ گرامی ان کی نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا کہ دشمن کا مقابلہ اس قسم کے ہتھیاروں سے کرو جو اس کے پاس ہوں۔ اقبالؒ حکمت و فلسفہ کی ان بلندیوں تک پہنچ چکا تھا کہ خود اہلِ یورپ

اسے ائمہ فن ہیں سے تسلیم کرتے تھے۔ ان ہتھیاروں سے مسلح ہو کر اس نے قرآن کو دنیا کے سامنے پیش

مادہ پرستی

کیا اور اس طرح اہلِ یورپ کی مادہ پرستی کی دھجیاں فضائے آسمانی میں بکھیر دیں، اس نے بتایا کہ وہ دین جو قرآن کی دفتین میں محفوظ ہے کس طرح عین علم و بصیرت ہے اور وہ ظن و قیاس جسے یورپ علم و بصیرت سمجھ رہا ہے کس طرح جہل و ظلمت۔ یورپ کی مادہ پرستی اسے اس نتیجہ پر پہنچاتی ہے کہ انسان کی موجودہ زندگی سلسلۂ ارتقاء کی آخری کڑی ہے۔ اس کے بعد فنا ہے۔ لہٰذا اُخروی زندگی کا عقیدہ ایک واہمہ ہے۔ اقبالؒ نے نظریۂ ارتقاء کے مسلمات سے اس حقیقتِ عظمیٰ کو واضح کر دیا کہ موجودہ زندگی سلسلۂ ارتقاء کی آخری کڑی نہیں بلکہ ایک آنے والی زندگی کا پیش خیمہ ہے۔ زندگی ایک جوئے رواں ہے جو بڑھتی چلی جائے گی۔ اقبالؒ نے اس قرآنی نظریۂ حیات کو علمی اکتشافات کی روشنی میں پیش کر کے صرف یورپ کی مادہ پرستی ہی کا ابطال نہیں کیا بلکہ تمام نوعِ انسانی پر اس کا احسان ہے کہ اس نے انسانیت کو اس کی صحیح قدر و قیمت سے متعارف کرا کر انسان کو آسمان کی بلندیوں تک پہنچا دیا کہ وہی انسان جو حرکتِ قلب بند ہو جانے کے بعد مٹی کا ایک تودہ بن کر رہ جاتا تھا اب ایک ایسی حیاتِ جاوداں کا پیکر بن گیا کہ موت اس کے نزدیک ایک شبِ تاریک کے بعد نورانی صبح کے طلوع کا نام ہو گیا۔ جب زندگی کے متعلق یہ یقین ہو جائے تو ظاہر ہے کہ اس سے انسان میں اپنی ذمہ داریوں کا صحیح احساس بھی بیدار ہو جاتا ہے اور یہی وہ احساس ہے جس سے دنیا میں عدل و انصاف قائم رہ سکتا ہے۔

یورپ کے نظریۂ مادہ پرستی نے ایک اور بھی ہلاکت آفریں خرابی پیدا کر رکھی ہے۔ مادہ پرستی کے معنی یہ ہیں کہ انسان ہر شے کی قدر و قیمت مادیت کی میزان ہی سے متعین کرتا ہے جب کوئی کمزور و ناتواں کسی صاحبِ قوت سے امداد کا طالب ہوتا ہے تو وہ سوچتا ہے کہ کاروباری نقطۂ نگاہ سے اس کمزور کی مدد کرنا زیادہ منفعت بخش ہے یا اس کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر اسے ہڑپ کر جانا زیادہ سودمند۔ وہ دنیا کے ہر معاملہ کو اسی "کاروباری میزان" سے تولتا ہے اور جو شکل اسے زیادہ منفعت بخش دکھائی دیتی ہے اسے بلا تأمل اختیار کر لیتا ہے۔ یورپ کا جدید "ضابطۂ اخلاق" (کہ اگر اسے "اخلاق" کہا جا سکے) اسی اساس پر قائم ہے اور دنیا آج جس جہنم سے گزر رہی ہے وہ اسی اصل و اساس کا فطری نتیجہ ہے۔ اقبالؒ نے آ کر بتایا کہ یہ ضابطۂ معاشرت ابلیسانہ مکر و فریب

کا جال ہے۔ وہی معاشرت دنیا کو جنت میں تبدیل کرنے کا موجب بن سکتی ہے جو وحدتِ خالق کے ایمان کی بنا پر وحدتِ خلق کی محکم اساس پر استوار ہو۔

مادہ پرستی کی اس لعنت سے ایک اور مصیبت شروع ہو جاتی ہے۔ چونکہ مادیّت سے انسان کی نگاہیں ہمیشہ محسوسات میں گھری رہتی ہیں اس لئے انسانوں کی تقسیم محسوس حدود و قیود کی رُو سے کی جاتی ہے اور زبان، رنگ، نسل یا وطن کی تفریق سے انسانی جماعتوں کی تشکیل ہوتی ہے۔

وحدتِ انسانیت

یہ وہ جہالتِ کبریٰ ہے جو آج انسانیت کی امن سوزی کی سب سے بڑی ذمہ دار ہے۔ اقبالؒ نے آکر دنیا کے سامنے قرآن کی اس بلند حقیقت کو پیش کیا کہ یہ "تقسیمِ انسانیت" کس درجہ تنگ نظری پر مبنی ہے۔ اس نے بتایا کہ قرآن کی رُو سے تمام انسانوں کی تخلیق نفسِ واحدہ سے ہوئی ہے اور ان کی وجہ تکریم ان کے جوہرِ ذاتی ہیں نہ کہ نسبتی تعارف۔ لہٰذا، انسانی جماعت کی تشکیل اسی معیار کے مطابق ہونی چاہیئے۔ اس نے سیاستِ حاضرہ کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد ساری دنیا سے پکار کر کہہ دیا کہ جب تک تمہارا نظریۂ قومیت نہیں بدلتا دنیا میں امن قائم نہیں ہو سکتا۔ اسی قرآنی نظریۂ تقسیم انسانیت کی رُو سے اس نے ہندی مسلمانوں کی سیاست کا رُخ لندن اور سومنات سے کعبہ کی طرف پھیر دیا اور نہایت بلند آہنگی سے برملا کہہ دیا کہ ـــــ بِنا ہمارے حصارِ ملّت کی اتحادِ وطن نہیں ہے ـــــ اسی الگ نظریۂ قومیت سے مسلمانوں کی جداگانہ مملکت کا سوال پیدا ہوا جس نے آج پاکستان کی جیتی جاگتی شکل اختیار کر لی ہے (اللہ اسے اپنوں اور بیگانوں کے ہر شوم ارادہ سے محفوظ رکھے اور اسے قرآنی نظام کی ترویج و تنفیذ کا گہوارہ بنائے کہ یہی اس مردِ درویش کی آہ سحری اور نالۂ نیم شبی کا مقصود تھا)۔

(۵)

یہ ہے ایک ہلکی سی جھلک حقیقی اقبالؒ کی۔ وہ اقبالؒ جو اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتا تھا بلکہ ہر مسئلہ کا حل قرآن کی روشنی میں تلاش کرتا تھا۔ ہم اقبالؒ کو نہ معصوم سمجھتے ہیں نہ اس کے فکر و اجتہاد کو منزہ عن الخطا۔ وہ قرآن کا ایک طالب العلم تھا اور ساری عمر طالبِ علم رہا۔ اس لئے اس کے فکری نتائج حرفِ آخر نہیں ہو سکتے۔ ہمارے نزدیک اس کی عظمت کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ ہر وقت ملّا

کا حل قرآن کی روشنی میں تلاش کرنے کی کوشش کرتا تھا اور اس تلاش میں وہ کسی غیر قرآنی فکر کا منت کش نہیں ہوتا تھا کہ اس کا مسلک یہ تھا کہ

از تاک بادہ گیرم و در ساغر افگنم

جب تک اقبالؒ کا صحیح مقام متعین نہ کیا جائے، سمجھ میں نہیں آسکتا کہ اقبال کو فطرت نے کس مقصدِ عظیم کے لئے پیدا کیا تھا اور اس مقصد کو اس نے کس حد تک پورا کیا۔ وہ یہ دکھانے کے لئے نہیں آیا تھا کہ زمینِ شعر میں گلکاریاں کس طرح کی جاتی ہیں بلکہ وہ یہ بتانے کے لئے آیا تھا کہ یہ زمین کس طرح بدل سکتی ہے، یہ آسمان کس طرح بدل سکتا ہے اور مسلمانوں کو اس کی عظمتِ گم گشتہ پھر سے کیسے مل سکتی ہے۔ محسوسات کے خوگر انسان کی نگاہیں جب لطیف حقیقتوں کے حسنِ بسیط سے پورے طور پر بہرہ یاب نہیں ہوسکتیں تو وہ پردہ ہائے مجاز کی ان رنگینیوں میں جذب ہوکر رہ جاتی ہیں جو اس حقیقت کو مشہود بنائے ہوتی ہیں۔ شاعری دراصل وہ حسین و جمیل نقاب تھی جس کے اندر حقیقی اقبال چھپا بیٹھا تھا۔ عام لوگ ان پردوں کے نقش و نگار میں محوِ تماشا ہوکر رہ جاتے ہیں اور ان کے اندر بیٹھا ہوا اقبالؒ ان ظاہر بین نگاہوں کی فریب خوردگی پر ہنس دیتا اور کلیجہ مسوس کر رہ جاتا ہے۔

پوچھا جائے گا کہ اقبالؒ نے کام کیا کیا تھا؟ یہ سوال پھر اس طبقہ کی طرف سے اُٹھے گا جس کی نگاہیں محسوسات میں الجھ کر رہ جاتی ہیں۔ وہ طبقہ جو غالب کے الفاظ میں "اوجِ طالعِ لعل و گہر" کے بجائے کسی کے "جوہرِ طرفِ کلاہ" کی طرف دیکھتا رہتا ہے۔ جو کسی کی عظمت کا اندازہ اس سے لگاتا ہے کہ اس نے اینٹوں اور پتھروں کا کتنا بڑا انبار جمع کیا تھا۔ جو کسی کی شان و شوکت کے لئے صرف یہ دیکھتا ہے کہ اس کی گاڑی کے آگے کتنے گھوڑے جتتے تھے اور کتنے ہاتھی اس کے جلوس میں نکلتے تھے یا آگے بڑھے تو کتنا وسیع پنڈال اس کی آمد کی تقریب میں تعمیر ہوتا تھا۔ کتنے لاکھ انسان اس کے گرد و پیش "زندہ باد" کے نعرے لگاتے تھے۔ جو لوگ کسی کے اعمالِ حیات کو صرف انہی میزانوں سے تولنے کے خوگر ہیں ان کے لئے اس سوال کا جواب فی الواقع بڑا مایوس کن ہوگا۔ لیکن جس کی نگاہیں محسوسات سے گزر کر حقائق کو پرکھتی ہیں وہ بلا تکلیف و کاوش دیکھ سکتا ہے کہ اقبالؒ نے کیا کیا؟ کسی کی دنیا بدلنے کے لئے یہ سہل ہوتا ہے کہ اس کے مکان کا نقشہ

بدل دیا جائے۔ ضرورت اس کی ہوتی ہے کہ اس کی نگاہ کا زاویہ بدل دیا جائے۔ اس کا نظریۂ زندگی بدل دیا جائے کہ

اگر نگاہِ تو دیگر شود جہاں دگر است

اقبالؒ نے اپنے طریقِ کار میں اسی روش کو اختیار کیا جس سے ہنگامہ آفرینیوں اور غوغا آرائیوں کے بجائے چپکے چپکے دلوں کی بستیاں بدل جایا کرتی ہیں۔ اقبالؒ نے کشتی کا رُخ بدلنے کے بجائے پانی کے دھارے کا رُخ بدل دیا۔ اس نے اشیاء کا رنگ تبدیل کرنے کے بجائے نگاہوں کے چشمہ کا رنگ بدل دیا۔ اس نے جسموں کو نہیں چھوا بلکہ دلوں کو بدل دیا۔

پیامِ اقبال

دو عالم را تواں دیدن بمینائے کہ من دارم
کجا چشمے کہ بیند آں تماشائے کہ من دارم

قرآن آیا اور اس نے ان تمام زنجیروں کو کاٹ کر پھینک دیا جن میں انسانیت جکڑی چلی آ رہی تھی۔ استبدادِ ملوکیت کی انسانیت کش زنجیریں جو انسان کو حیوان کی سطح سے بلند ہونے ہی نہیں دیتیں۔ افسونِ ہامانیت (برہمنیت، پیشوائیت، ملّائیت اور خانقاہیت) کی مرگ آور زنجیریں جو زندگی کا گلا گھونٹ کر رکھ دیتی ہیں اور مکائدِ قارونیت (سرمایہ پرستی) کی خوں آشام زنجیریں جو شجرِ انسانیت کے پتے پتے سے نمِ حیات چوس لیتی ہیں۔ اس نے ان تمام زنجیروں کو کاٹ دیا تاکہ انسانیت آزادی کی فضائے بسیط میں برگ و بار پیدا کرے۔ کَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ أَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّ فَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ۔ اس شجرِ مقدس کی طرح جس کی جڑیں پاتال تک پہنچ چکی ہوں اور اس کی شاخیں بامِ عرش کو چھو رہی ہوں۔ اس طرح کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا محتاج نہ رہا اس لئے کوئی انسان کسی دوسرے کا غلام نہ رہا۔ اس نے کسی انسان کو یہ حق نہ دیا کہ وہ

تکمیلِ دین

دوسرے انسانوں پر حکومت کرے۔ اطاعت و اتباع صرف ان قوانین کا رہ گیا جو انسانوں کو خدا کی طرف سے دیئے گئے تھے۔ یہ قوانین ان غیر متبدل اصولوں پر مشتمل تھے جن کی روشنی میں انسانی زندگی اپنے منتہیٰ تک پہنچ سکتی ہے۔ لہٰذا ان

قوانین کے بعد کسی اور ضابطۂ قوانین کی ضرورت باقی نہ رہی اور اس طرح دین مکمل اور نبوت ختم ہو گئی۔

تکمیلِ دین اور ختمِ نبوت کے بعد انسانی معاشرہ کو اس کی ارتقائی منازل طے کرانے کا طریق یہ متعین کر دیا گیا کہ جس جماعت نے ان اصولوں کی روشنی میں اپنی زندگی کو صحیح راستہ پر ڈال لیا تھا، اسے اس ضابطۂ قوانین کا وارث بنایا گیا تاکہ وہ اس سلسلہ کو آگے بڑھاتی جائے اور ہر دور کا انسان ان اصولوں کی روشنی میں اپنے اپنے زمانہ کے تقاضوں کا حل خود تلاش کرتا ہوا کاروانِ زندگی کو اس متوازن راستے پر لے جائے جسے صراطِ مستقیم سے تعبیر کیا گیا تھا۔

یہ قافلۂ رشد و سعادت ابھی تھوڑی دُور چلنے پایا تھا کہ ملوکیت کے رہزنوں نے اپنی کمین گاہوں سے سر نکالا اور اس قافلہ کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ ملوکیت بے ساز و یراق کبھی کامیاب نہیں ہوا کرتی۔ وہ اپنی تائید میں پیشوائیت (PRIESTHOOD) اور غاصبانہ مفاد پرستی (CAPITALISM) کو اپنے ساتھ لاتی ہے۔ دنیا کا کوئی فرعون، ہامان اور قارون کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ ان غاصبانہ قوتوں کے راستہ میں قرآن ہی سب سے بڑی روک تھی۔ اس لئے انہیں اپنی کامیابی کے لئے اس سنگِ راہ کو سامنے سے ہٹانا ضروری تھا۔ اس مقصد کے حصول کے لئے کیا کچھ کیا گیا تفصیل اس کی طویل ہے اور غور سے دیکھئے تو مسلمانوں کی ساری تاریخ گویا اسی اجمال کی تفصیل ہے۔ غیر قرآنی تصوراتِ زندگی کے لئے ایک جامع اصطلاح "عجمی تصورات" ہے۔

عجمی تصورات

ہماری تاریخ تفصیل ہے اس کوششِ مذموم و سعیٔ مشئوم کی کہ قرآن کی جگہ کس طرح عجمی تصورات کو مسلمانوں کے دل و دماغ پر مستولی کر دیا جائے۔ یہ کوشش بڑی کامیاب رہی۔ ایسی کامیاب کہ اس ایک ہزار سال کے عرصہ میں قرآن عجمی تصورات سے بدل گیا۔ اور بایں انداز کہ یہ عجمی تصورات عین اسلام قرار پا گئے اور قرآنی تعلیم یکسر غیر اسلامی بن گئی۔ چنانچہ آج کیفیت یہ ہے کہ اگر کسی کے سامنے قرآن لایا جائے تو وہ سمجھتا ہے کہ مجھے کفر و بے دینی کی تعلیم دی جا رہی ہے اور وہ اس سے اس طرح بھاگتا ہے۔ کانھم حمر مستنفرۃ فرت من قسورۃ۔

ہزار برس سے مسلمانوں پر یہی حالت چلی آ رہی تھی۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس دوران

میں اصلاحِ حال کی کوششیں بھی ہوئیں۔ بہت سی سعید روحوں نے قوم کی زبوں حالی پر خون کے آنسو بہائے اور اس کے دُکھ کی دوا ڈھونڈنے میں بڑی سعی و کاوش سے کام لیا۔ لیکن یہ کوششیں علاماتِ مرض کے ازالہ سے آگے بڑھ کر علتِ مرض تک نہ پہنچ سکیں اور مرورِ زمانہ سے مرض ایسا مزمن اور مریض ایسا سقیم و ناتواں ہوتا گیا کہ غیر تو غیر خود اپنے بھی اس کی زندگی سے مایوس ہونے لگ گئے۔ اسلام کے مستقبل کے متعلق یہی مایوسی تھی جو ایران میں باب اور بہاء اللہ کی شریعتِ جدیدہ اور پنجاب میں نبوتِ فرنگ آفریدہ کی صورت میں نمودار ہوئی اور جس نے تہذیبِ مغرب سے مرعوب اور شکست خوردہ ذہنیتوں کو عام طور پر اپیل کیا۔ مذہب پرست طبقہ نے ان جدید نبوتوں کی تو مخالفت کی لیکن اسلام کے مستقبل سے مایوسی کا غیر شعوری اثر انہیں قومیت پرستی (NATIONALISM) کے آغوش میں لے گیا۔ چنانچہ ابوالکلام آزاد، حسین احمد مدنی اور رفقاء ہم اس حقیقت کی زندہ مثالیں ہیں۔

مسلمان عالمگیر مایوسیوں کے اس خوفناک سیلاب میں بہہ ہی چلا تھا کہ مبدا فیض کی کرم گستری نے ان میں ایک ایسا دیدہ ور پیدا کر دیا جس کی نگہ دور رس ہزار برس کے عجمی تصورات کے دبیز پردوں کو چیرتی ہوئی اس مقام تک جا پہنچی جہاں قرآن اپنی اصلی شکل میں دنیا کے پاس آیا تھا۔

نگہِ بصیرت

وہاں سے اس نے نورِ بصیرت حاصل کیا اور روشنی کی اس کرن نے مایوسی کی ظلمت انگیز طغیانیوں میں امیدوں کی ایک نئی لہر دوڑا دی۔ اس نے تالبِ گور پہنچے ہوئے مسلمان کو پھر سے تھاما اور ایمان و ایقان کی بے پناہ قوتوں کے ساتھ اس حقیقت کو اس کے سامنے واشگاف کیا کہ جس چیز کے مستقبل سے تجھے مایوسی ہو رہی ہے وہ اسلام نہیں، عجم کے وہ تصورات ہیں جنھوں نے اسلام کا نقاب اوڑھ رکھا ہے۔ اسلام قرآن کے اندر ہے اور قرآن اس خدا کا پیغامِ ابدی ہے جو ہمیشہ زندہ ہے اور جس پر موت تو ایک طرف نیند اور اونگھ تک طاری نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا، قرآنی ممکنات سے مایوسی، زندگی کے حقائق سے چشم پوشی ہے، وہ بیس چالیس برس تک مسلسل و متواتر اس پیغام کو دہراتا رہا۔ اس پیغام کے انداز مختلف تھے۔ لیکن لَم ایک ہی تھی اور وہ لِم یہ تھی کہ اس ہزار سالہ عجمی اثرات کو پھینک کر الگ کر دو اور قرآن کو اپنی نگاہ سے دیکھو، بات واضح ہو جائے گی۔ قرآن کو اس طرح سمجھو گویا وہ خود تم پر نازل ہو رہا ہے۔ اگر تم نے قرآن کو اس طرح سمجھ لیا تو یہ تمہارے شعور میں انقلاب پیدا کر دے گا۔ اور انقلابِ شعور سے خارجی دنیا میں خود بخود انقلاب

آجاتا ہے۔

کہ یہی ہے امتوں کے مرضِ کہن کا چارہ

اقبالؒ یہ پیغام دے کر چلا گیا لیکن جو کچھ قرآن سے پیامبرِ اوّلین کے ساتھ ہوا تھا وہی کچھ اس کے ساتھ ہوتا نظر آرہا ہے۔ قرآن زندگی کا پیغام تھا اس لئے اس نے بار بار اس کا اعلان ضروری سمجھا کہ یہ شاعری نہیں شاعری ایک پیامبر کے شایانِ شان ہی نہیں ہوتی۔ لیکن مسلمانوں نے ان تنبیہات کے باوجود قرآن سے ایسی شاعری کی کہ اسے چیستان بنا کر رکھ دیا۔ مذہب کو شاعری کی فضا خوب راس آتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مذہب کا بیج پھوٹتا ہی شاعری کی زمین سے ہے اور اس کی پرورش بھی شاعری کی فضا میں ہوتی ہے۔ دین کا مدار حقائق پر ہوتا ہے۔ مذہب کا انحصار الفاظ پر۔ دین زندگی کا ضابطہ دیتا ہے، مذہب چند موہوم تصورات پیش کرتا ہے۔ دین کے مسلّمات کی پرکھ محسوس نتائج سے ہوتی ہے، مذہب ذہنی اطمینان کا فریب دیتا ہے۔ یہی کچھ شاعری کرتی ہے۔ الفاظ کا الٹ پھیر، فنی قیود و شرائط کا شدت سے التزام، اور ان سب کا نتیجہ کچھ وقت کی واہ واہ۔ اقبالؒ نے قرآن کا پیغام دیا اس لئے قرآن ہی کے اتباع میں وہ عمر بھر اعلان کرتا رہا کہ میرا پیغام شاعری نہیں، نہ شاعری میرے شایانِ شان ہے۔ لیکن قوم ہے کہ اس کی ان تمام تنبیہات کے باوجود اسے شاعر بنانے پر مُصر ہے۔ گانے والے اور گانے والیوں کی زبان پر کبھی داغ اور غالب کی غزلیں ہوا کرتی تھیں۔ اب ان کی جگہ اقبالؒ کے شعروں نے لے لی ہے۔ قوالی کہ جس کے زور پر تصوف زندہ رہتا ہے، اس کے سوا کیا ہے کہ عقل و بصیرت کو ماؤف کر کے انسان کے سطحی جذبات میں ہیجان پیدا کیا جائے۔ اقبالؒ نے اسی لئے اسے افیون سے تعبیر کیا تھا۔ آج وہی قوالی اقبال کی سب سے بڑی نقیب ہے۔ جو ملک خود اقبالؒ کے قرآنی تصور کا عطیہ ہے اس میں اگر کسی چیز سے بُعد، اجنبیت، بلکہ بغض و عناد ہے تو اقبالؒ کے قرآنی پیغام سے۔ مذہب اور مفاد پرستی کا رشتہ پھر سے استوار ہو رہا ہے۔ وطنیت کی لعنت ذاتوں، برادریوں اور خاندانوں سے آگے گزر کر صوبجاتی تفریق کی محکم گیر صورت اختیار کر چکی ہے۔

شاعری

حالات ہر چند نامساعد و ناموافق ہیں لیکن اس کے باوجود مایوسی کی کوئی وجہ نہیں۔ وہ قرآن جسے اقبال کا پیغام ہمارے سامنے دوبارہ لایا، زندہ اور پائندہ ہے۔ دنیائے انسانیت کا مستقبل

صرف قرآن سے وابستہ ہے۔ جن لوگوں کے دل میں یہ حقیقت اقبالؒ کی طرح ایمان بن کر سما گئی ہے ان

اُمید کی کرن

پر لازم آتا ہے کہ وہ بھی اقبالؒ کی طرح اس پیغام کے عام کرنے میں اپنی پوری عمر بسر کردیں۔ مردہ پرست قوم زندہ انسانوں کی باتوں کو نہیں سنا کرتی۔ وہ زندہ افراد کا گلا گھونٹ کر انہیں مار دیتی ہے اور پھر ان کی قبروں پر اپنی ہوسِ مردہ پرستی کی تسکین کے بڑے بڑے عظیم القدر مقبرے تعمیر کیا کرتی ہے۔ لیکن جس طرح ان تمام نامساعد حالات کے باوجود اقبالؒ نے اپنے پیغام کے عام کرنے میں کبھی ہمت نہ ہاری، اسی طرح اس پیغام کی نشر و اشاعت میں ان لوگوں کو بھی عزم و ثبات سے کام لینا ہوگا۔ قرآن کو انسانیت کا نصب العین بن کر رہنا ہے۔ اس کے سوا زندگی کے مسائل کا کوئی اور حل نہیں ہے۔ سوال یہی ہے کہ یہ شرف کس قوم کے حصہ میں آتا ہے کہ وہ اس شمعِ ہدایت کی علمبردار بن کر انسانیت کے بھٹکے ہوئے قافلہ کو صحیح راستہ پر لے چلے۔

۱۹۵۰ء

مشرق ومغرب

پچھلے دنوں ایک نجی مجلس میں اقبالؒ کے متعلق گفتگو ہو رہی تھی۔ ایک صاحب نے کہا کہ اقبالؒ کے ہاں "مشرق" اور "مغرب" کے الفاظ اکثر ملتے ہیں۔ معلوم نہیں ان سے اس کا مفہوم کیا ہے؟ آیئے دیکھیں کہ اقبالؒ کے ہاں ان اصطلاحات سے مراد کیا ہے؟

اقبالؒ کے ہاں مشرق یا مغرب سے مفہوم کوئی خاص خطۂ زمین نہیں۔ ان کے مفہوم زندگی کے دو جداگانہ تصوّرات (IDEOLOGIES) ہیں۔ مشرق کو آپ دیکھئے تو اس میں آپ کو ایک چیز خاص طور پر نمایاں نظر آئے گی۔ قرآن نے جن انبیاء کرامؑ کا ذکر کیا ہے وہ سب مشرق میں پیدا ہوئے۔ بلکہ یوں کہیئے کہ یہ سب کے سب سامی النسل تھے۔ قرآن نے یہ ضرور کہا ہے کہ ان انبیاء کے علاوہ جن کا ذکر قرآن میں کیا گیا ہے مختلف اقوام میں اور انبیاء بھی آتے رہے۔ لیکن آپ دیکھیں گے کہ یہ صرف مشرق کی اقوام ہی ہیں جو اپنی تعلیم کو انبیاء کی طرف منسوب کرتی ہیں یا یوں کہیئے کہ اپنے ہاں کے نوشتوں کو آسمانی کتابیں کہہ کر پکارتی ہیں۔ مغرب کی کسی قوم کا یہ دعوےٰ نہیں کہ

مشرق

ان کے ہاں کوئی نبی آیا تھا یا ان کے ہاں کوئی تعلیم ایسی ہے جس کا سرچشمہ ذہن انسانی سے ماوراء ہو۔ ہم اس بحث میں نہیں جانا چاہتے کہ ان اقوام میں فی الواقع کوئی رسول آیا تھا یا نہیں۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ ان کی تاریخ نے اپنے دامن میں کسی رسول کا ذکر محفوظ نہیں رکھا۔ نہ ہی وہ اقوام اپنی تعلیم کو کسی رسول کی طرف منسوب کرتی ہیں۔ یورپ میں یہودیت

اور عیسائیت عام ہے لیکن ان دونوں مذاہب کے رسول مشرقی ہیں مغربی نہیں۔ لہٰذا، مشرق کی سب سے پہلی خصوصیت یہ ہے کہ وہ وحی کی قائل ہے۔ دنیا کے تمام مذاہب سرزمینِ مشرق ہی کی پیداوار ہیں۔ لہٰذا، یوں کہیئے کہ اقوامِ مشرق مذہب پرست ہیں۔ مذہب میں ایک طرف کسی بالاہستی کا تصور ناگزیر ہے اور دوسری طرف کسی نہ کسی شکل میں موت کے بعد کی زندگی کا عقیدہ بھی۔

اس کے برعکس مغرب کو لیجئے۔ وہاں یا تو فلسفہ کارفرما رہا ہے اور یا عصرِ حاضر میں طبیعیات کی بنیادوں پر پیدا شدہ تصوراتِ زندگی، فلسفہ ہو یا طبیعیات، دونوں کا سرچشمہ ذہنِ انسانی ہے۔

مغرب

یہ ماورائے سرحدِ ادراک کے قائل ہی نہیں۔ ان کے ہاں علوم کا دائرہ محسوسات میں گھرا ہوا ہے۔ وہاں تمام مسائلِ حیات کا حل تنہا عقل کی رُو سے تلاش کیا جاتا ہے۔ عقل ہمیشہ وقت کی مصلحتوں کے تابع چلتی ہے اس لئے مختلف اوقات اور مختلف حالات میں عقل کے فیصلے مختلف ہوتے ہیں۔ لہٰذا، یوں کہیئے کہ مغرب کی دنیا میں مستقل اقدار کا کوئی تصور نہیں۔ وہاں صرف تقاضائے مصلحت (EXPEDIENCY) فیصلے کا معیار قرار پاتا ہے۔ وہاں یا تو کسی بالاہستی کا تصور ہی نہیں ملتا، اور اگر ملتا ہے تو صرف ایسے خدا کا جو کائنات کی مشینوں کو ایک دفعہ کوک دے کر الگ ہو بیٹھتا ہے اور اب یہ مشینری قوانینِ فطرت کے مطابق خود بخود چلے جا رہی ہے۔ اگر وہ لوگ اس سے ذرا آگے بڑھتے ہیں تو یہ کہہ دیتے ہیں کہ خدا انہی قوانینِ فطرت کا نام ہے اور چونکہ قوانینِ فطرت دنیائے محسوسات ہی سے متعلق ہیں اس لئے خدا بھی انہی چار دیواریوں میں گھرا ہوا ہے۔ زندگی، مادی اجزاء میں ایک خاص ترتیب سے پیدا ہوتی ہے اور اسی ترتیب کے منتشر ہو جانے سے اس کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ لہٰذا، انسانی اعمال کا تعلق اسی دنیا سے ہے۔ اس سے آگے کچھ نہیں۔

یہ ہیں وہ متضاد تصورِ حیات اور نظریاتِ زندگی جن کی مظہر مشرق اور مغرب ہیں۔ اقبالؒ جب مشرق کہتا ہے تو اس سے اس کی مراد یہی تصوراتِ زندگی ہوتے ہیں۔ بنیادی طور پر یہ تصورات مختلف اقوامِ مشرق میں مشترک ہی کیوں نہ ہوں لیکن کہیں یہ بالکل خالص اور غیر ملوث شکل میں ہیں اور کہیں ان میں ذہنِ انسانی کی آمیزشیں بھی ہو چکی ہیں۔ یہ اپنی اصلی اور غیر ملوث حالت میں صرف قرآن کے اندر باقی رہ گئی ہیں۔ اس کے علاوہ ہر مقام پر ان میں انسانی تصورات کی

آمیزش ہو چکی ہے۔ اس لئے اقبالؒ جب مشرق کا نام لیتا ہے تو اس سے اس کا حقیقی مفہوم قرآن ہی کی تعلیم ہوتا ہے۔ اور یہی وہ تعلیم ہے جسے وہ مغربی تصوراتِ حیات کے مقابلے میں لاتا ہے اور انہیں چیلنج دیتا ہے کہ وہ اس کے مقابل میں انسانی زندگی کے مسائل کا حل پیش کریں۔ ایک مرتبہ ایک نجی

عقل و عشق

صحبت میں حضرت علامہ نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا تھا جب انہوں نے اس سوال کے جواب میں کہ تمام انبیاء مشرق ہی میں کیوں آئے مغرب ہی میں کیوں نہ آئے اپنے مخصوص شگفتہ انداز میں فرمایا کہ بات یوں تھی کہ روزِ اوّل جب خدا اور ابلیس میں جھگڑا ہوا ہے تو ان دونوں نے اپنے اپنے ملک بانٹ لئے تھے۔ مشرق کو خدا نے لے لیا اور مغرب ابلیس کے حصہ میں آگیا۔ یہ ہے وہ مقام جہاں اقبالؒ مغرب کے مقابلے میں ہمیشہ مشرق کی برتری ثابت کرتا ہے۔ یہ برتری درحقیقت عقلِ انسانی کے تراشیدہ نظامہائے زندگی کے مقابلہ میں قرآنی نظامِ زندگی کی برتری کے مترادف ہوتی ہے۔ اقبالؒ کا سارا پیغام اسی برتری کا نقیب ہے اور اسی کو عام کرنے کے لئے اس نے اپنی زندگی وقف کر دی تھی۔ اس کی فکر کا ماحصل عقل کے مقابلے میں عشق کی فضیلت اور فوقیت ثابت کرنا ہے اور عشق سے اس کی مراد وحیٔ خداوندی ہوتی ہے۔ عقل ہی کا دوسرا نام اس کے نزدیک تہذیبِ فرنگ ہے۔ دیکھئے کہ وہ "پیامِ مشرق" میں فرنگ کے نام کیا پیغام دیتے ہیں۔

از من اے بادِ صبا گوئے بہ دانائے فرنگ　　عقل تا بال کشوداست گرفتار تر است
برق را ایں بہ جگر می زند آں رام کند　　عشق از عقلِ فسوں پیشہ جگردار تر است
چشم جز رنگِ گل و لالہ نہ بیند ورنہ　　آنچہ در پردۂ رنگ است پدیدار تر است
دانشِ اندوختہ دل زکف انداختہ　　آہ زاں نقدِ گراں مایہ کہ در باختہ

ذرا آگے چل کر کہتے ہیں۔

عقلِ خودبیں دگرو عقلِ جہاں بیں دگر است　　بالِ بلبل دگرو بازوئے شاہیں دگر است
دگر است آں سوئے نہ پردہ کشادن نظرے　　ایں سوئے پردہ گمان و ظن و تخمیں دگر است

اے خوش آں عقل کہ پہنائے دو عالم با اوست
نورِ افرشتہ و سوزِ دلِ آدم با اوست

لیکن اقبالؒ کے ہاں مشرق و مغرب سے ایک اور مفہوم بھی ہے اور اس مفہوم کے لئے بھی اقبالؒ نے ان اصطلاحات کو جا بجا استعمال کیا ہے. مشرق کو تعلیم تو وحی کے ذریعہ سے ملی لیکن اس نے اس تعلیم کو اس درجہ مسخ کر دیا کہ ان کی نگاہوں سے زندگی کا مقصود ہی اوجھل ہو گیا. ان کے ہاں حقائق کی جگہ اشخاص پرستی نے لے لی. دین کے نظامِ زندگی کی جگہ دھرم (مذہب) کی رسومات آ گئیں. عقل و فکر کی جگہ اندھی تقلید نے لے لی. قوائے فکریہ کے ساتھ ہی ان کے قوائے عملیہ بھی مفلوج ہو گئے. دنیا کی زندگی کو قابلِ نفرت سمجھ کر انہوں نے اپنی توجہ کو اپنے ذہن کی تراشیدہ "اخروی زندگی"[۱] پر مرکوز کر دیا اور اس زندگی سے مفہوم اپنی موہوم امیدوں کے علاوہ کچھ نہ سمجھا. نتیجہ یہ کہ تمام اقوامِ مشرق رفتہ رفتہ راکھ کا ڈھیر بن کر رہ گئیں.

مذہب پرستی

ان کے مقابل میں مغرب نے ہر سامنے آنے والے معاملہ کو علم اور عقل کی رُو سے جانچا اور اس کا عملی حل تلاش کرنے کی کوشش کی. قوانینِ فطرت کے مطالعہ اور اشیائے فطرت کے مشاہدے سے انہوں نے قوائے فطرت کو ایک ایک کر کے مسخر کر لیا. انہوں نے زمین پر جال بچھا دیئے. پانیوں پر اپنی حکومت قائم کر لی. وہ فضا کی پہنائیوں پر مسلط ہو گئے اور اپنی قوتوں سے ساری دنیا پر چھا گئے. ان کے ہاں کمی رہ گئی تو فقط یہ کہ ان کے پاس مستقل ضابطۂ حیات ایسا نہ تھا جس سے انسانی معاشرہ میں توازن قائم رکھ سکتے.

اقبالؒ کے ہاں مشرق سے دوسرا مفہوم دہی پژمردگی اور افسردگی، بےکسی اور بےبسی، محکومی اور نا امیدی، تقلید و جمود اور بےحسی اور بےعملی ہوتا ہے. اس کے برعکس مغرب سے مفہوم بیباک قوتیں اور بےضبط طاقتیں ہوتا ہے. اس مقام پر وہ مشرق اور مغرب دونوں پر سخت تنقید کرتا ہے. وہ برملا کہتا ہے کہ

مشرق ہمہ افسانہ مغرب زتو بیگانہ وقت است کہ در عالم نقش دگر انگیزی

اقبالؒ کے پیغام میں جہاں جہاں مشرق کی تنقیص ہے وہ اس تصورِ حیات پر تنقید ہے جس نے ان سے زندگی کی حرارت چھین کر ان کی دنیا کو مُردوں کی بستی بنا رکھا ہے. اقبالؒ کے نزدیک نہ مشرق کے یہ

---

[۱] وہ اُخروی زندگی نہیں جس کا تصور قرآن نے دیا ہے بلکہ انسانوں کے ذہن کی خودساختہ اخروی زندگی کا تصور.

انداز صحیح ہیں نہ مغرب کا وہ اسلوب۔ اس کے نزدیک صحیح نظامِ زندگی عقل اور عشق کے امتزاج کا نام ہے۔ یعنی دنیا کو وحی کی روشنی میں عقل کی آنکھ سے دیکھنے کا نام۔ اس کے لئے وہ مشرق اور مغرب دونوں کو مخاطب کرکے کہتا ہے کہ

خیز و نقشِ عالمِ دیگر بنہ　　عشق را با زیرکی آمیز دہ

اور یہ قرآن کے پیغام کی صحیح تفسیر ہے۔ اس کے نزدیک مردانِ مومن کی تعریف یہ ہے۔ اُولوا الالباب الذین یذکرون اللہ قیاماً و قعوداً و علیٰ جنوبہم۔ یعنی اربابِ عقل و دانش جو اٹھتے بیٹھتے لیٹتے ہر وقت اپنے سامنے وحی کے محکم قوانین رکھتے ہیں اور انہی کی روشنی میں اپنی عقل سے کام لے کر اپنے زمانہ کے تقاضوں کا حل تلاش کرتے ہیں۔ اقبالؔ دنیا میں اسی قسم کے انسان دیکھنا چاہتا تھا۔ اس لئے وہ مغرب والوں سے کہتا تھا کہ وہ مشرق سے وحی کا تصور لے لیں اور مشرق والوں سے کہتا تھا کہ وہ مغرب والوں سے عقل کی باتیں سیکھیں۔ اقبالؔ کا جہانِ نو وہی تھا جس میں ہر کام عقل اور وحی کے اس حسین امتزاج سے طے پائیں اور اس طرح مشرق اور مغرب کی حدود مٹ کر الارض للہ کا منظر عام ہو جائے۔ اسی میں وہ فوز و فلاحِ انسانیت کا راز دیکھتا تھا اور اسی میں وہ قیامِ آدمیت کا امکان پاتا تھا۔

سنہ ۱۹۵۱ء

حضرت علامہ اقبالؒ سے آخری ملاقات

نوشتہ ۱۹۳۹ء

۳۸ء اور ۳۹ء کی درمیانی شب، گزشتہ سال کی ڈائری کی ورق گردانی کر رہا تھا۔ گزری ہوئی کہانیاں ایک ایک کر کے سامنے آ رہی تھیں۔ جس طرح کوئی چھوٹا سا بادل کا ٹکڑا چاند کے سامنے سے گزرے تو یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ چاند دوڑ رہا ہے یا بادل، اسی طرح دن گزرتے جاتے ہیں اور یہ محسوس نہیں ہوتا کہ ہم آگے بڑھ رہے ہیں یا زمانہ۔ ڈائری کے اوراق سے بعض بھولے ہوئے افسانوں کی یاد یوں تازہ ہوتی جا رہی تھی جس طرح عرقِ لیموں سے لکھے ہوئے حروف، کاغذ کو آگ کے سامنے رکھنے سے خود بخود اُبھرتے چلے آتے ہیں۔ ابھی چند ورق الٹنے پایا تھا کہ ۱۰ر جنوری کے صفحہ ایک ایسا واقعہ مندرج پایا جس نے نگاہوں کو وہیں روک لیا اور ایسا محسوس ہوا کہ یہ کسی واقعہ کی یاد نہیں بلکہ ایک مضراب ہے جس نے میرے بربطِ ہستی کی تاروں کو یوں چھیڑ دیا ہے کہ ان کے اندر سوئے ہوئے المیہ نغمات پھر سے بیدار ہو رہے ہیں اور شعلہ ریز دیپک کے سروں میں تمام کائنات پر چھائے جا رہے ہیں۔ واقعہ کی تمہید یوں ہے کہ ۹ر جنوری کو دہلی کا "قافلہ" زیرِ امارت مولانا محمد اسلم صاحب جیراجپوری بتقریب "اقبال ڈے" لاہور پہنچا۔ رات تک مصروفیت رہی۔ اس اجلاس کا تذکرہ بھی ڈائری میں لکھا پایا۔ لیکن ۱۰ر جنوری کی صبح کے واقعہ کی تفصیل جو ڈائری کے کئی ایک صفحات پر پھیلی ہے کچھ ایسی وجد انگیز ہے کہ جی چاہتا ہے کہ بزمِ طلوعِ اسلام کو بھی اس حظ و کیف میں

شریک کروں بہتر ہو کہ اسے ڈائری کے الفاظ ہی میں سنیئے :۔

۱۰ جنوری بروز سوموار صبح ۹ بجے جاوید منزل واقع میو روڈ پر حاضر ہوئے۔ نذیر نیازی صاحب حسب وعدہ وہاں پہلے سے موجود تھے۔ حضرت علامہ پلنگ پر استراحت فرما رہے تھے۔ لحاف اوڑھے بلکہ لحاف کے ساتھ ایک کمبل بھی ملفوف تھا حقہ سامنے تھا۔ جو ہمیشہ سامنے رہتا ہے۔ نیازی صاحب نے بتایا کہ جب پچھلے دنوں لارڈ لوتھین ملنے کے لئے آیا تو بھی آپ اسی انداز میں لیٹے لیٹے ملے تھے۔ آواز ابھی تک صاف نہیں ہوئی۔ اس طرح بولتے ہیں جیسے کسی کی گھگھی بندھ رہی ہو۔ مولانا صاحب کی وجہ سے سلسلہ گفتگو اُردو میں چھڑا لیکن آپ کے لب و لہجہ سے حسبِ معمول پنجابیت صاف نمایاں تھی جسے وہ کسی تکلف کے پردے میں چھپانا نہیں چاہتے۔ عمر قریب ساٹھ برس سمجھئے۔ لیکن اس دفعہ کمزور ہو رہے تھے۔ بایں ہمہ اس کمزوری اور بڑھاپے میں بھی دبدبہ اور عظمت کی وہی شان تھی۔ لیکن سادگی اتنی کہ اگر کسی کا پہلے تعارف نہ ہو تو وہ شاید ہی سمجھے کہ کسی پڑھے لکھے آدمی کے سامنے بیٹھے ہیں۔ پہلے متفرق سلسلۂ کلام شروع ہوا۔ آپ کی باتوں میں ہلکی سی ظرافت کی چاشنی جسے ظرافت کی بجائے شگفتگی کہنا زیادہ موزوں گا ہمیشہ موجود رہتی ہے۔ لیکن آج کل آپ کی علالت کی وجہ سے یہ ضرورت بھی رہتی ہے کہ سنجیدہ گفتگو کو یہاں وہاں سُبک رَد کر دیا جائے۔ ضمناً ایک بات سامنے آ گئی۔ فرمایا کہ جب راؤنڈ ٹیبل کانفرنس سے واپس آ رہے تھے تو مولوی شفیع (مرحوم) بھی ساتھ تھے۔ میں عرشہ جہاز پر کانفرنس کی روئیداد دیکھ رہا تھا کہ کتاب ہاتھ سے گر گئی۔ چھوٹی چھوٹی کشتیوں پر عرب لڑکے جہاز کے ساتھ ساتھ آ رہے تھے۔ مولوی صاحب کو عربی آتی نہیں تھی، گھبراہٹ میں آواز دی کہ یا شیخ! ذٰلِکَ الْکِتٰبُ لَا رَیْبَ فِیْہَا۔ وہ سمجھ گئے اور کتاب جو اتفاق سے ایک کشتی میں جا گری تھی اٹھا لائے۔

جاوید نامہ کے متعلق کچھ ذکر آیا تو میں نے عرض کیا کہ دربارِ فرعون کے ساحر جن کی قوتِ ایمانی استبدادِ فرعون کا دندان شکن جواب ہے، انہیں جاوید نامہ میں ضرور جگہ ملنی چاہیئے تھی۔ فرمایا کہ جاوید نامہ میں تو بہت سی چیزیں لکھنے سے رہ گئیں۔ جی چاہتا تھا کہ کہیں سید احمدؒ (بریلوی) اور سید احمد (دہلوی)' (سر سیدؒ) کی روحوں کو بھی اکٹھا کر دوں۔ یہ بھی نظر انداز ہو گیا اور بھی بہت سی

باتیں میں نے نوٹ کر کے رکھی تھیں. اب کسی اور موقعہ پر ان کو لکھوں گا۔

اگلی منزل

میں نے عرض کیا کہ قرآن کریم میں اس منزل کے بعد دوسری منزل کے لئے جہاں ایک طرف انسانوں کے متعلق یہ ہے کہ و الی ربھم ینسلون (وہ اپنے رب کی طرف دوڑتے ہوئے جائیں گے). دوسری طرف خدا کے متعلق بھی ہے کہ و جاء ربك و الملك (کہ تیرا رب اور فرشتے صف در صف آئیں گے) گویا خدا خود اس زمین پر آئے گا اور اشرقت الارض بنور ربھا (زمین اس کے رب کے نور سے جگمگا اٹھے گی) تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابھی یہ ڈراما کچھ اور سین اسی اسٹیج پر دکھائے گا. فرمایا کہ یہ درست ہے لیکن ارض و سما، پستی و بلندی کا تصور تو موجودہ شعور کے تابع ہے. جب شعور بدل جاتا ہے تو زمان و مکان (TIME AND SPACE) کے تصورات بھی بدل جاتے ہیں. اگلی منزل میں شعور بدل جائے گا. کیا معلوم ارض کیا ہو اور سما کیا ہو یا دونوں ایک ہی ہوں. اسی لئے تو فرمایا کہ یوم تبدل الارض غیر الارض و السمٰوٰت (جس دن یہ ارض و سمٰوٰت بدل جائیں گے). شعور کی ارتقائی منازل کا تقاضا ہے کہ زمان و مکان کے بُعد باقی نہ رہیں. خواب میں دونوں چیزیں باقی نہیں رہتیں. نہ وقت کوئی شے رہتا ہے نہ مکان ایک سیکنڈ کے خواب میں ایک شخص بارہ برس امریکہ بھی رہ آتا ہے. یہ محض ایک مثال ہے ورنہ کیا معلوم کہ دوسرے شعور میں کیفیت و کمیت کا کیا عالم ہو۔

فرمایا کہ جب میں کیمبرج میں پڑھتا تھا تو (TIME) کے نظریہ پر ایک مقالہ لکھ کر اپنے استاد (MACTAGGART) کے پاس لے گیا. اس نے کہا کہ یہ کیا لکھ دیا؟ اس پر لوگ ہنسیں گے۔ میں نے اسے ضائع کر دیا. ایک عرصے کے بعد جب برگساں کے نظریئے شائع ہوئے تو ان میں ٹائم کے متعلق وہی کچھ تھا جو میں نے لکھا تھا. اس وقت مجھے اپنے مقالہ کے ضائع کر دینے کا بڑا افسوس ہوا اس لئے کہ میرے مقالہ سے قرآن کریم کی حقیقت ثابتہ سامنے آجاتی تھی۔

برگساں اور نیٹشے

اس کے بعد برگساں اور نیٹشے اور اپنے فلسفہ کے اختلافات کی توضیح فرماتے رہے اور بتایا کہ وہ فلسفہ جس کا سرچشمہ علم الٰہی ہو کس طرح ایک یقینی شے بن جاتا ہے اور وہ فلسفہ جو محض انسانی دماغ کا رہین منت ہو

کس طرح ظن وقیاس کی وادیوں میں سرگرداں رہتا ہے اور جب کبھی اُسے یقین کا رتبہ حاصل ہوتا ہے تو ہو نہیں سکتا کہ وہ قرآن کے خلاف ہو، آپ یہ کچھ بیان فرما رہے تھے اور ہمیں یہ محسوس ہو رہا تھا کہ کسی نئی دنیا میں ہیں۔ اس وقت معلوم ہوا کہ ذہن انسانی کی وسعتیں کس قدر حدود ناآشنا ہیں اور یہ ہستی جسے دنیا نے محض ایک شاعر کی حیثیت سے پہچانا ہے، علم وادراک کی کن بلندیوں پر ہے۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ سر سے پاؤں تک دماغ ہی دماغ ہے اور دماغ بھی ایسا جو ثریا سے ورے کی بات ہی نہ کرتا ہو۔ بڑے بڑے اہم حقائق اور ادق مسائل کو دو دو جملوں میں واضح کرتے جاتے تھے۔

پھر قرآن کے متعلق ذکر آگیا۔ فرمایا کہ جب میں ایف۔ اے میں پڑھتا تھا تو صبح کی نماز کے بعد قرآن کی تلاوت کیا کرتا تھا۔ والد مسجد سے نماز پڑھ کر آتے تو کبھی منزل ختم کر چکا ہوتا کبھی جاری ہوتی۔ ایک دن آکر پوچھتے ہیں کیا پڑھتے تھے۔ مجھے حیرت بھی ہوئی اور غصہ بھی آگیا کہ چھ مہینے ہو گئے اور ہر روز دیکھتے ہیں کہ قرآنِ کریم پڑھتا ہوں۔ پھر یہ سوال کیسا۔ نہایت نرمی سے فرمایا کہ میں پوچھتا ہوں کہ کچھ سمجھ بھی آتا ہے۔ اب میرا استعجاب اور غصہ جاتا رہا اور کہا کہ کچھ عربی جانتا ہوں کہیں سے سمجھ میں آجاتا ہے۔ بات آئی گئی ہو گئی۔ کوئی چھ ماہ بعد ایک دن لے کر بیٹھ گئے اور فرمایا کہ بیٹا قرآنِ کریم اسی کی سمجھ میں آسکتا ہے جس پر یہ نازل ہوتا ہے۔ میں حیران تھا کہ کیا نبیؐ اکرمؐ کے بعد قرآن کریم کسی کی سمجھ میں آ نہیں سکتا۔ فرمایا کہ یہ تم نے کیسے سمجھ لیا کہ قرآنِ کریم حضورؐ کے بعد اب کسی پر نازل ہی نہیں ہو سکتا۔ میں پھر حیران تھا؟ فرمایا کہ انسانیت کو جس معراج پر پہنچانا فطرت کا مقصود ہے اس کا نمونہ ہمارے سامنے محمدؐ کی صورت میں پیش کر دیا گیا۔ حضرت آدم سے لے کر حضرت عیسیٰؑ تک ہر ایک نبی محمدؐ ہی کے مختلف مدارج تھے۔ وہ سلسلہ گویا تکمیل محمدؐ کے منازل تھے۔ (MOHAMMAD IN THE MAKING) بنیادی اصول ہر جگہ ایک تھا۔ البتہ شعورِ انسانی کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ فروعات کی تکمیل ہوتی جاتی تھی۔ حتیٰ کہ "محمدؐ" مکمل ہو گیا۔ بابِ نبوت بند ہو گیا۔ انسانیت اپنے معراجِ کبریٰ تک پہنچ گئی۔ اب ہر انسان کے سامنے معراجِ انسانیت کا نمونہ محمدؐ ہے۔ کوئی انسان جتنا محمدیت کے رنگ میں

رنگا جاتا ہے، اتنا ہی قرآنِ کریم اس پر نازل ہوتا جاتا ہے۔ یہ مفہوم تھا میرے کہنے کا کہ قرآنِ کریم اسی کی سمجھ میں آسکتا ہے جس پر یہ نازل ہونا شروع ہو جاتا ہے۔

یہ تو تھی قرآنِ کریم کے قلب کے راستے سمجھ میں آنے کی صورت۔ دماغ کے راستے سے

قرآن فہمی

سمجھ میں آنے کے متعلق حضرت علامہ نے فرمایا کہ قرآن فطرت اللہ ہے یعنی دنیا میں مختلف اوقات میں مختلف حقائق ظاہر ہوئے۔ کوئی یہاں کوئی وہاں۔ ہر حقیقت فطرت اللہ ہوتی ہے۔ ان حقائق کے منتشر اوراق ایک جگہ جمع کر دیئے۔ اس مجموعہ کا نام ہے قرآنِ کریم۔ اب بھی جہاں کہیں کوئی حقیقت ظاہر ہوگی، وہ لینن کے الفاظ میں ہو یا سنوسی کے قرآن ہی کی کسی آیت کا ترجمہ ہوگا۔ اس لئے کہ حیاتِ انسانی کے لئے جس قدر حقائق کی ضرورت تھی وہ سب کے سب اس کے اندر آچکے ہیں۔ اب قرآنِ کریم کو اس طرح سمجھنا چاہیئے جس طرح یہ دنیا کو ملتا چلا آرہا ہے۔ کبھی ایک حقیقت کسی زرتشت کو ملی تھی، کہیں کسی بدھ کو وغیرہ وغیرہ۔ اس لئے پہلے ان تمام مذاہب کو دیکھئے۔ وہاں نظر آجائے گا کہ حقائق کون کون سے ہیں اور افسانے کون کون سے۔ حالانکہ اس مذہب والے ان افسانوں کو بھی حقائق ہی سمجھتے ہوں گے۔ ان کے حقائق قرآنِ کریم میں موجود ہوں گے اور ان کے افسانوں کی تردید ہوگی۔ یہ افسانے انسانی دماغ کے وضع کردہ ہوں گے۔ جب تک ان افسانوں سے واقفیت نہ ہو معلوم نہیں ہو سکتا کہ قرآنِ کریم کس چیز کی تردید کر رہا ہے۔ مثلاً قرآنِ کریم میں ہے کہ ہم نے ارض و سما کو لاعبین (IN SPORT) کھیل کود میں پیدا نہیں کیا۔ ہندوؤں کے ہاں ایک عقیدہ ہے کہ یہ تمام کائنات ایشور نے ایک "لیلا" رچائی ہے۔ چنانچہ ان کے ایک خدا کا نام نٹراجن "کھلاڑیوں" کا بادشاہ ہے۔ اس کی مورتی بھی ایسی ہے کہ وہ رنگ راگ میں مصروف ہے اور دنیا پیدا ہوتی جاتی ہے۔ اس افسانہ کی تردید لاعبین کے اندر ہے۔ یا مثلاً قرآنِ کریم میں ہے کہ لا تاخذہ سنۃ ولا نوم (خدا کو اونگھ یا نیند نہیں آتی)۔ ہندوؤں کے ہاں ایک عقیدہ ہے کہ یہ سب کائنات پرماتما کا خواب ہے۔ جب وہ بیدار ہو جائے گا تو یہ خواب بھی پریشان ہو جائے گا۔ خود ہمارے ہاں بھی بعض صوفیا میں اس قسم کا تصور موجود ہے۔ اس افسانہ کی تردید قرآنِ کریم نے ان الفاظ میں کی ہے۔ لہٰذا قرآنِ کریم سمجھنے کے لئے پہلے اس قسم کے

"افسانوں" کے سمجھنے کی بھی ضرورت ہے۔ خالص حقائق اب قرآنِ کریم کے سوا اور کہیں سے نہیں مل سکتے۔

رسالت رسول کی تعریف (DEFINITION) کے متعلق فرمایا کہ ایک رسول میں اللہ کی طرف سے یہ شعور پیدا کر دیا جاتا ہے کہ وہ امتدادِ زمانہ (LENGTH OF TIME) کو سمیٹ کر ایک حال (PRESENT) کے اندر مرتکز کر لے۔ لہٰذا جو باتیں دوسروں کے نزدیک دو ہزار برس بعد آنے والی ہوتی ہیں وہ رسول کے سامنے زمانۂ مستقبل کی نہیں بلکہ حال کی ہوتی ہیں۔ اس لئے وہ اپنی وحی میں اس قدر محکم یقین رکھتا ہے کہ اس کی سچائیاں اس کی آنکھوں کے سامنے ہوتی ہیں۔ وہ ان کا مشاہدہ کرتا رہتا ہے۔ اس لئے اس کے دل میں شک و ریب کا کوئی دخل نہیں ہو سکتا۔

سیاستِ حاضرہ کے متعلق بہت سی باتیں ہوتی رہیں۔ فرمایا ' مجھے تو نظر آتا ہے کہ انہی عوام میں سے کوئی صاحبِ ایمان کھڑا ہو جائے گا اور مسلمانوں کو ایک مرکز پر لے آئے گا۔ اس کی عملی شکل ان کے سامنے وہی ایک اسلامی ریاست (پاکستان) کا تصور ہے۔ فرمایا کہ اس کے سوا ہندوستان کی سیاست کا کوئی اور عملی حل سمجھ میں نہیں آتا۔

یہ سب کچھ اقبالؒ کے دماغ کے متعلق تھا لیکن حقیقی اقبالؒ ان پردوں کے پیچھے قلب کی انتہائی گہرائیوں کے اندر چھپا رہتا ہے۔ ہر چند نیازی صاحب نے کہہ رکھا تھا کہ کسی جذباتی چیز کا تذکرہ نہ چھیڑنا کیونکہ اس کا ان کی صحت پر بے حد مضر اثر پڑتا ہے۔ لیکن ایک بات غیر ارادی طور پر ایسی آگئی جس سے ہمیں حقیقی اقبالؒ کی ایک جھلک دیکھنی بھی نصیب ہو گئی۔ مولانا صاحب نے دریافت کیا کہ آجکل کوئی تازہ کلام کہا گیا ہے۔ انہیں کیا معلوم تھا کہ یہ زخمہ کس تار پر جا لگے گا۔ فرمایا کہ گزشتہ چھ ماہ سے جب سے حج کا ارادہ ہوا ہے' صبح سے شام تک مدینہ ہی کے راستے میں رہتا ہوں۔ جو کچھ کہتا ہوں وہ بھی کچھ وہیں کی باتیں ہی ہوتی ہیں۔ یہ کہا اور آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

طبیعت کچھ سنبھلی تو فرمایا، بہت کچھ دل میں ہے کہ حضورؐ کے آستانۂ اقدس پر پہنچوں تو یہ بھی عرض کروں گا وہ بھی۔ راستہ طے کر لیتا ہوں لیکن جب وہاں پہنچتا ہوں تو طبیعت قابو میں نہیں رہتی۔ نیازی صاحب سے فرمایا کہ تازہ کلام سے کوئی شعر ان کو سناؤ۔ انہوں نے ایک شعر سنایا تو فرمایا کہ ہاں ایک شعر یاد آگیا۔ کعبۃ اللہ میں پہنچ کر بہ حضورِ حق یہ عرض کیا ہے کہ:۔

تو باش ایں جا و با خاصاں بیامیز!
کہ من دارم ہوائے منزلِ دوست!

جذب کیف پہلا مصرعہ تو آسانی سے پڑھ دیا لیکن دوسرے مصرعہ میں "منزلِ دوست" تک پہنچے تو ایک عجیب کیفیت سامنے آئی۔ دیکھا کہ تمام جسم پر ایک ارتعاشی حالت پیدا ہو گئی ہے۔ لیٹے ہوئے اٹھ بیٹھے۔ یوں محسوس ہوا کہ سارا کلیجہ اُمنڈ کر منہ میں آگیا ہے۔ گلا پھول گیا۔ چہرہ سُرخ ہو گیا۔ اسے بڑی مشکل سے یوں دبایا جیسے کسی چیز کو حلق سے نیچے لیجا رہے ہیں۔ بڑے کرب و اذیّت کے بعد انتہائی اضطراب کے عالم میں بچّوں کی طرح ہچکیاں لے کر رونے لگے۔ غش کی سی حالت ہو گئی اور نڈھال ہو کر لیٹ گئے۔

ہم ششدر ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے کہ یا اللہ! یہ کیا ہو گیا۔ ایک ہیبت سی طاری ہو گئی۔ سارے کمرے میں سناٹا تھا۔ ہمیں رہ رہ کر افسوس آتا تھا کہ ہم نے کیوں اس مضمون کو چھیڑ دیا۔

کچھ دیر اور بیٹھے کہ ان کی طبیعت سنبھل جائے۔ اجازت چاہی تو مولانا صاحب سے فرمایا کہ ایک دن اور ٹھہرنے کی صورت پیدا نہیں ہو سکتی! ہماری دفتر کی پابندیاں اس کی کب اجازت دیتی تھیں! طوعاً و کرہاً رخصت ہوتے۔ دیکھا تو بارہ بج چکے تھے۔ تین گھنٹے گزر گئے اور یوں معلوم ہوا کہ شاید پانچ منٹ ہوتے ہیں۔

بعض اوقات زندگی میں چند لمحات حاصلِ زندگی بن جاتے ہیں۔ یہ چند لمحات اسی قسم کے تھے۔ اب کچھ سمجھ میں آیا کہ اقبالؒ کہاں پہنچ چکا ہے۔ دماغ ہے تو عرش کی بلندیوں پر اور قلب ہے تو عشقِ رسولؐ میں خاکستر! اے کاش مسلمانوں کی سمجھ میں آجاتا کہ انہیں فطرت کی کرم گستری نے

کس قدر بیش بہا نعمت عطا فرمائی ہے! مرقومہ ۱۲ر جنوری ۱۹۳۸ء

یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ اس ملاقات میں جتنی باتیں ہوئیں اور جس طرح ہوئیں، میں نے وہ سب اس یادداشت میں لکھ لی تھیں۔ بہر حال یہ تھے وہ تاثرات جو میرے ذہن میں باقی تھے جنہیں میں نے محفوظ کر لیا۔ اس وقت اس کی بھی کیا خبر تھی کہ یہ ملاقات آخری ہو گی اور اس کے بعد عالمِ اسلامی کی یہ جلیل المرتبت ہستی ہمیشہ کے لئے آنکھوں سے پنہاں ہو جائے گی۔ اس کمی کو کچھ وہی محسوس کر سکتے ہیں جنہیں کبھی حضرت علّامہ کی خدمت میں باریابی کی سعادت حاصل ہوئی ہو۔ آج تو اس قسم کی یادداشتوں کے اوراق ہیں اور دلِ حرماں نصیب کی حسرتیں کہ

دگر دانائے راز آید کہ ناید!

۲۱ر اپریل ۱۹۳۸ء

علامہ اقبالؔ کے "یومِ وفات" پر تقریر

بیسویں صدی کا آغاز ہے. مشرق کی تہذیب و تمدن کے ٹمٹمانے والے آخری چراغ بھی گُل ہو چکے ہیں. مغرب نے ایک نئے نظامِ تمدن کی طرح ڈالی ہے جس کی درخشندگی اور تابناکی نے بڑے بڑے دیدہ وروں کی نگاہوں میں خیرگی پیدا کر رکھی ہے. دنیا بھر کی قومیں اس تہذیبِ جدید کی نقالی میں فخر و سعادت محسوس کر رہی ہیں. جلیل القدر دانایانِ روزگار اس نئے تمدن کو انسانیت کے مصائب و نوائب کے لئے مسیحا سمجھ رہے ہیں. بڑے سے بڑے مفکر انسانی دانش و بینش کے اس اوجِ کمال پر نازاں و فرحاں دکھائی دیتے ہیں. ہر طرف سے اس نئی روشنی کی مدح و ستائش میں قصائد لکھے جا رہے ہیں. چاروں سمت سے تحسین و تبریک کے غلغلے بلند ہو رہے ہیں. چھوٹے بڑے اس نسخۂ کیمیا کی برکات کے معترف ہیں. ایسا دکھائی دیتا ہے، گویا انسان نے اس فردوسِ گم گشتہ کو پھر سے پا لیا جس کی تلاش میں اس نے ساری عمر دشت پیمائیوں اور صحرا نوردیوں میں گزار دی تھی. نئے انداز کی سیاست، نئی وضع کی معاشرت، معیشت کے طور طریق نرالے، تعلیم کے ڈھب انوکھے، تمام نظامہائے کہنہ کی بنیادیں تک اکھیڑی جا چکی ہیں. اور نئے نقشے کے مطابق بالکل جدید بنیادوں پر اس تہذیبِ نو کے قصرِ فلک بوس کی عمارت اوپر کو اٹھتی چلی جا رہی ہے جس کی رفعت و بلندی، نقش و نگار، آئینہ بندی، حریر و اطلس

کے نگاہ فریب پردے، بجلی کے قمقمے اور ان قمقموں کی عالمتاب روشنی میں ایک رنگین دنیا، ہر دیکھنے والے کی نگاہ کو حیرت کدہ بنا رہی ہے کہ اتنے میں مشرق کے تیرہ و تار ویرانوں کا ایک تیس سالہ نوجوان اس طلسم خانۂ ہوش ربا میں جا نکلتا ہے۔ وہ تہذیبِ نَو کے اس جہانِ رنگ و بو میں کھویا کھویا اِدھر اُدھر پھرتا ہے۔ ہر شے پر ایک غائرانہ نگاہ ڈالتا ہے۔ ہر چیز کو متجسسانہ نظر سے پرکھتا ہے۔ کہیں رُکتا ہے تو پہروں کسی گہری فکر میں ڈوبا ہوا خاک کے ذرّوں کو ٹکٹکی لگائے دیکھتا رہتا ہے۔ پھر اٹھتا ہے تو دیوانوں کی طرح اپنے آپ سے باتیں کرتا ہے۔ ہونہار ایسا ہے کہ بڑے بڑے مفکرین اسے مستقبل کا درخشندہ ستارہ قرار دیتے ہیں۔ لیکن اس کے اس کمالِ ہوش میں کچھ ایسے غیر محسوس سے 'جنون' کی آمیزش ہے جو اُسے دوسرے ہوش مندوں سے بکسر الگ کئے ہوئے ہے۔ وہ فکر و نظر اور ہوش و جنوں کے اس نرالے امتزاج سے تہذیبِ جدیدہ کے اس طلسم کدہ کے ایک ایک عنصر کو دیکھتا ہے اور عین اس وقت، جبکہ ساری فضا اس نظامِ تمدّن کی توصیف و ستائش میں ڈوبی ہوئی ہے۔ اس کے لبوں پر خفیف سی ہنسی اور اس کی آنکھوں میں ہلکے سے تبسم کی موج کے ہلکورے نظر آتے ہیں۔ وہ اس پورے تماشے کو اپنی نگاہوں کے دامن میں سمیٹ کر لوٹتا ہے اور لبِ ساحل ایک اونچی سی چٹان پر کھڑا ہو کر پیچھے مڑ کر دیکھتا اور بلند آواز سے پکارتا ہے کہ

دیارِ مغرب کے رہنے والو! خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہوگا!

اور یاد رکھو کہ

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

سننے والوں نے سُنا اور اُسے مجذوب کی بڑ سمجھ کر ایک فلک بوس قہقہہ لگایا اور اس کے بعد پھر اسی کیف و مستی کی دنیا میں جذب ہو گئے۔ یہاں پہنچنے پر پوچھنے والوں نے پوچھا کہ کہو بھائی! حیرت خانۂ مغرب کی سیر تو کی، وہاں تہذیبِ نَو کے "پری محل" کو بھی دیکھا۔ کیا خیال ہے؟ اس نے اپنے مخصوص انداز میں نگاہوں کو اوپر اٹھایا اور کہا کہ ہاں دیکھا! چمک دمک تو بڑی ہے لیکن

پیرِ میخانہ یہ کہتا ہے کہ ایوانِ فرنگ سُست بنیاد بھی ہے آئنہ دیوار بھی ہے

زمانہ آگے بڑھتا گیا۔ شیشہ گرانِ فرنگ اپنے کاخِ تہذیب کی آئینہ بندی میں پہلے سے بھی زیادہ تیزی اور انہماک سے مصروف رہے۔ دنیا بدستور خدا کی رحمت تصور کرتی رہی۔ انسانیت اسی طرح اس کی سلامتی کی دعائیں مانگتی رہی تا آنکہ ۱۹۱۴ء میں ایک عالمگیر دھماکہ محسوس ہوا دھماکہ زلزلہ کی صورت اختیار کر گیا اور چار برس تک متواتر بستیاں ویرانوں میں تبدیل ہوتی رہیں۔ میدانوں کا ذرہ ذرہ انسانی خون کی ارزانی کی زندہ داستان بن گیا۔ لیکن مغرب نے اس کے بعد پھر اپنے آپ کو سنبھال لیا اور اس قصرِ جدید کی تزئین و آرائش اور حفاظت و صیانت میں پہلے سے بھی زیادہ جوش اور سرگرمی سے منہمک ہو گیا۔ سطح بین نگاہوں نے اس "ہوشمند دیوانہ" سے پھر پوچھا کہ اب کیا کہتے ہیں آپ؟ آپ کی وہ پہلی پیشین گوئی تو غلط ثابت ہوئی۔ اس مردِ دانا کی آنکھوں میں پھر تبسم کی لہر دوڑی اور اب کے پہلے سے بھی زیادہ نمایاں ہو کر دوڑی۔ اپنے مخصوص انداز میں سر اٹھایا اور کہا کہ میری آنکھوں نے غلطی نہیں کی۔ میں نے جو کچھ کہا تھا حرف حرف دیکھ کر کہا تھا۔ وہ غلط نہیں ہو سکتا۔ مغرب کو یہ فطرت کی طرف سے پہلی تنذیر ملی تھی۔ وہ اس سے عبرت حاصل کرتے تو بچ جاتے۔ لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ اور میری آنکھیں پھر دیکھ رہی ہیں کہ

فتنہ را کہ دو صد فتنہ در آغوشش بود
دخترے ہست کہ در مہدِ فرنگ است ہنوز

سننے والوں نے اُسے سُنا اور سُن کر اَن سُنی کر دی۔ مغرب کے قمقموں کی روشنی اپنی خیرگی میں اور بھی بڑھتی گئی۔ اب ساری دنیا اس کی نقال تھی، اور اس نقالی میں فخر محسوس کرتی تھی۔ پوچھنے والوں نے پھر اس "مجذوب زیرک" سے پوچھا کہ فرمائیے! آپ کیا کہتے ہیں۔ اب تو اس قصرِ بلند کی رفعت کہکشاں تک جا پہنچی ہے۔ اس نے پھر ایک سیلابِ تبسم سے پوچھنے والوں کی طرف دیکھا اور کہا کہ

نہ کر افرنگ کا اندازہ اس کی تابناکی سے کہ بجلی کے چراغوں سے ہے اس جوہر کی برّاقی
الٹ جائینگی تدبیریں بدل جائینگی تقدیریں حقیقت ہے نہیں میرے تخیّل کی یہ خلّاقی

دنیا نے اس پر ایک قہقہہ لگایا اور مغرب اپنی شیشہ گری اور مشرق اس کی نقالی میں پھر مصروف ہو گیا۔

اور وہ مردِ زیرک پھر اپنی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ مغرب نے زمین پر جال پھیلایا۔ مغرب نے آسمان پر قابو پالیا۔ اس نے پانی پر اپنا تسلط جمالیا۔ اس نے خشکی اور تری کو مسخر کرلیا۔ اس نے اپنی حفاظت کے پورے سامان مہیا کرلئے۔ اِدھر یہ ہوتا گیا اور اُدھر دیکھنے والوں نے دیکھا کہ اس دانائے راز پر کچھ عجیب سراسیمگی کا عالم طاری ہو رہا ہے۔ وہ بیٹھے بیٹھے اس طرح چونک اٹھتا جس طرح ایک حسین و معصوم بچہ خواب میں دہشت ناک عفریتِ خونخوار کو دیکھ کر چیخ اٹھتا ہے۔ وہ تصور ہی تصور میں کچھ دیکھتا اور یوں ڈر کر سہم جاتا جیسے آگ اور خون کا کوئی سیلاب بلا بڑھتا چلا آرہا ہو۔ وہ پہاڑی کی چوٹی پر، دُور افق سے اُس پار، کچھ دیکھتا اور بے ساختہ چلا اٹھتا کہ

شفق نہیں مغربی افق پر یہ جوئے خوں ہے! یہ جوئے خوں ہے
طلوعِ فردا کا منتظر رہ کہ دوش و امروز ہے فسانہ!
وہ فکرِ گستاخ جس نے عریاں کیا ہے فطرت کی طاقتوں کو
اسی کی بیتاب بجلیوں سے خطر میں ہے اس کا آشیانہ

وہ دیکھو!

جہانِ نو ہو رہا ہے پیدا وہ عالمِ پیر مر رہا ہے
جسے فرنگی مقامروں نے بنا دیا ہے قمار خانہ

وہ راتوں کی تنہائیوں میں اکیلا دیوانہ وار اِدھر اُدھر پھرتا۔ کبھی آسمان کے خاموش ستاروں سے باتیں کرتا۔ کبھی ندی کی ساکت روانیوں سے محوِ تکلم ہوتا۔ وہ جنگل کے ویرانوں سے شہر کی اس محفلِ شعر و شراب کی چکاچوند کو دیکھتا جسے بڑے بڑے ہوشمندوں نے باعثِ گرمیٔ کائنات سمجھ رکھا تھا تو ایک ٹھنڈی سانس بھرتا اور اپنے سینے کے داغوں کو نمایاں کرکے پکار اٹھتا کہ

وہ بزمِ عیش ہے مہمان یک نفس دو نفس چمک رہے ہیں مثالِ ستارہ جس کے ایاغ
دلوں میں ولولۂ انقلاب ہے پیدا قریب آگئی شاید جہانِ پیر کی موت

وہ کبھی کسی نخلستان کے قریب کھجوروں کے جھنڈ کے سایہ میں وجد و مستی میں رقص کرتا اور مطرب

فطرت کی نَے نوازی کی ہم آہنگی میں والہانہ انداز میں گاتا نظر آتا کہ

زمانہ کے انداز بدلے گئے		نیا راگ ہے ساز بدلے گئے
ہوا اس طرح فاش رازِ فرنگ		کہ حیرت میں ہے شیشہ بازِ فرنگ
پرانی سیاست گری خوار ہے		زمیں میر و سلطاں سے بیزار ہے
گیا دورِ سرمایہ داری گیا		تماشا دکھا کر مداری گیا!

ایک حجازی قافلہ پاس سے گزر رہا تھا۔ سالارِ کارواں نے اس تماشے کو حیرت سے دیکھا اور کہا کہ بابا! یہ کیا کہتے ہو۔ آؤ تمہیں دکھاؤں کہ اس تہذیبِ نو نے ہمارے عروقِ مُردہ میں کس طرح ایک نیا خونِ زندگی دوڑا دیا ہے۔ اس نے اس سادہ لوح میر کارواں کی بات سنی اور ہنس کر کہا کہ اے ناداں!

زندہ کر سکتی ہے ایران و عرب کو کیونکر		یہ فرنگی مدنیت کہ جو ہے خود لبِ گور

اس نے پوچھا کہ پھر ہوگا کیا؟ بتایا کہ

آنچہ بود است و نباید ز میاں خواہد رفت		آنچہ بایست و نبود است ہماں خواہد بود

اس نے پوچھا کہ اس کے لئے کرنا کیا چاہیئے؟ جواب ملا کہ

اگر در دل جہانِ تازہ داری بروں آور
کہ افرنگ از جراحت ہائے پنہاں بسمل افتاد است

اس نے پوچھا کہ کیا دنیائے مسیحیت پھر کسی صلیبی جنگ کے ارادے کر رہی ہے؟ اس مردِ دانا نے کہا کہ نہیں۔

من از بلال و چلیپا دگر نیندیشم		کہ فتنۂ دگرے در ضمیر ایام است

اس نے کہا کہ مغرب کے آہنی پنجے تو زمین و آسمان کو اپنی قاہری گرفت میں لئے بیٹھے ہیں۔ اس چنگل سے رستگاری بھلا کیسے ممکن ہے! مردِ قلندر ہنسا اور اس نے کہا کہ اس گرفت کی شدت بجا اور درست۔ لیکن

پانی بھی مسخر ہے ہوا بھی ہے مسخر		کیا ہو جو نگاہِ فلکِ پیر بدل جائے
دیکھا ہے ملوکیتِ افرنگ نے جو خواب		ممکن ہے کہ اس خواب کی تعبیر بدل جائے

لیکن یہ باتیں اس پوچھنے والے کی سمجھ سے باہر تھیں۔ وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ یورپ جو اس قدر

بے پناہ قوتوں کا مالک ہے کبھی تباہ و برباد ہو سکتا ہے، وہ شوکت و سطوت، غلبہ و تسلّط، استیلاءً و قہرمانی کے اس بحرِ موّاج کو دیکھتا اور کانپ اٹھتا۔ وہ بھلا کیسے باور کر لیتا کہ کہنے والا سچ کہتا ہے لیکن کہنے والا کچھ ایسے حزم و یقین سے کہہ رہا تھا گویا اس کے سامنے سینما کا ایک فلم چل رہا ہے جسے یہ اپنی آنکھوں سے دیکھ کر بتاتا جاتا ہے کہ اب کیا ہونے والا ہے۔ اس نے اس پوچھنے والے سے کہا کہ تیری حیرت اور استعجاب درست! لیکن جو کچھ میں کہتا ہوں وہ بھی غلط نہیں۔

تو نے دیکھا سطوتِ رفتارِ دریا کا عروج موجِ مضطر کس طرح بنتی ہے اب زنجیر دیکھ
آزمودہ فتنہ ہے اک اور بھی گردوں کے پاس سامنے تقدیر کے رسوائی تدبیر دیکھ
کھول کر آنکھیں مرے آئینۂ گفتار میں
آنیوالے دَور کی دھندلی سی اِک تصویر دیکھ

سننے والے نے سننے کو تو سُنا کہ ان باتوں میں لذت و جاذبیت بہت تھی۔ لیکن اسے محض شاعری سمجھا اور دادِ سخن دے کر آگے بڑھ گیا۔ اس کے جاتے جاتے بھی اس مردِ قلندر نے اُسے آواز دی اور کہا کہ میری باتوں کو شاعری نہ سمجھ۔ یہ حقیقت ہے۔

چشم بکشائے اگر چشمِ تو صاحب نظر است زندگی در پئے تعمیرِ جہانِ دگر است

لیکن سننے والے نے اسے پھر بھی شاعری ہی سمجھا اور پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر آگے بڑھ گیا۔ اس مردِ دانا نے ایک ٹھنڈی آہ کھینچی اور آسمان کی طرف دیکھ کر کہا۔

مغرب ز تو بیگانہ مشرق ہمہ افسانہ وقت است کہ در عالم نقشِ دگر انگیزی

دنیا اپنی روش پر بدستور چلی جا رہی تھی۔ تہذیبِ مغرب اپنے پورے شباب پر تھی۔ نظامِ افرنگ کی رعنائیوں میں روز بروز اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ لیکن یہ فقیرِ کج کلاہ برابر اپنی پکار کو دہرائے جا رہا تھا کہ

خدا اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

کسی کی سمجھ میں یہ معمہ نہیں آتا تھا کہ اس دیدہ ور کو کیا نظر آ رہا ہے جس کی بنا پر یہ اس شدت و اصرار سے اپنی بات کو دہرائے جا رہا ہے لیکن کسی کی سمجھ میں آئے یا نہ آئے یہ مغنیٔ آتش نفس، خلوت و جلوت، بستی اور ویرانہ میں ہر جگہ اپنے پیغام کو پہنچاتے جا رہا تھا۔

بایں بہانہ دریں بزم محرمے جویم		غزل سرایم و پیغام آشنا گویم
بخلوتے کہ سخن می شود حجاب آں جا		حدیثِ دل بزبانِ نگاہ می گویم

جب پوچھنے والے زیادہ اصرار کرتے تو وہ ایک ہلکے سے معنی خیز تبسم سے اتنا کہہ دیتا کہ

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں
محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

اس سے ان کی حیرت اور بھی بڑھ جاتی اور زیادہ کاوش سے بات کریدنے کی کوشش کرتے تو یہ خمکدۂ حجاز کا متوالا یارانِ میکدہ سے کہہ دیتا کہ

بگرداں جام و از ہنگامۂ افرنگ کم تر گو
ہزاراں کارواں بگذشت ازیں ویرانہ پے در پے

متجسسِ قلوب سے تو وہ اس شانِ دل ربائی سے باتیں کرتا لیکن اگر کوئی ضد اور کد سے ان حقائق کو جھٹلانے کی کوشش کرتا تو اس سے ذرا کھلے کھلے الفاظ میں گفتگو کرتا اور برملا کہہ دیتا کہ

گفت اے گندم نمائے جو فروش		از تو شیخ و برہمن اندر خروش
حکمتے کو عقدۂ اشیا کشاد		با تو غیر از فکرِ چنگیزی نداد
مرگِ تو اہلِ جہاں را زندگی است		باش! تا بینی کہ انجامِ تو چیست

وہ کچھ اسی قسم کی باتیں کرتا لیکن اس کی باتوں میں کچھ ایسی حلاوت تھی کہ ہر ایک کا جی چاہتا کہ اس سے ذرا اور قریب ہو کر اس کی باتیں سنی جائیں۔ لوگ قریب تر ہوتے تو وہ ذرا اور دُور ہو جاتا کہ اپنا محرمِ راز کسی کو نہ پاتا۔ وہ اپنی باتیں اپنے دل سے زیادہ اطمینان سے کرتا۔ لیکن غیر سے کرتا یا اپنے آپ سے۔ آنے والے انقلاب کے تصور سے اس کا دل طلسمِ پیچ و تاب بنا رہتا۔ وہ رات کی تنہائیوں میں اُٹھ اُٹھ کر روتا اور دعائیں مانگتا کہ

یا بکش در سینۂ من آرزوئے انقلاب
یا دگرگوں کن نہادِ ایں زمان و ایں زمیں
یا چناں کن یا چنیں!

وہ زمانہ کی بے کیف گردشِ دولابی سے گھبرا اٹھتا اور خالقِ فطرت سے اپنے عجیب محبوبانہ انداز

ہیں کہتا کہ

طرحِ نو افگن کہ ما جدت پسند افتادہ ایم　　این چہ حیرت خانۂ امروز و فردا ساختی

زمانہ آگے بڑھتا گیا اور اس کے ساتھ ہی اس نے نواز کی نوا میں تلخی اور نَے میں سوز بھی زیادہ ہوتا گیا۔ وہ اب حقائق کو زیادہ نکھرے ہوئے الفاظ میں بیان کرنے لگ گیا۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ جو چیزیں اس کے عالمِ تصور میں دھندلے سے خواب کی صورت میں متشکل تھیں اب محسوس پیکر اختیار کر رہی ہیں۔ اب وہ کھُلے کھُلے الفاظ میں کہتا کہ

یہ عناصر کا پرانا کھیل یہ دنیائے دوں
ساکنانِ عرشِ اعظم کی تمناؤں کا خوں
اس کی بربادی پر آج آمادہ ہے وہ کارساز
جس نے اس کا نام رکھا تھا جہانِ کاف و نوں

(ابلیس کی مجلسِ شوریٰ۔ ارمغانِ حجاز آخری تصنیف)

ابلیس کے ایک دوسرے مشیر کی زبان سے کہلوایا گیا ہے۔

زاغِ دشتی ہو رہا ہے ہمسرِ شاہین و چرخ　　کتنی سرعت سے بدلتا ہے مزاجِ روزگار
چھا گئی آشفتہ ہو کر وسعتِ افلاک پر　　جس کو نادانی سے ہم سمجھے تھے اک مشتِ غبار
فتنۂ فردا کی ہیبت کا یہ عالم ہے کہ آج　　کانپتے ہیں کوہسار و مرغزار و جوئبار
میرے آقا وہ جہاں زیر و زبر ہونے کو ہے　　جس جہاں کا ہے فقط تیری سیادت پر مدار

غرضیکہ وہ صاحبِ خرد و جنوں اس تہذیب کے مآل سے دنیا بھر کو آگاہ کئے جاتا رہا۔ لیکن دنیا کی وہی حالت رہی کہ اس کی باتوں کو سُنا اور اپنے دھندوں میں مصروف ہو گئے۔ زمانہ یونہی گزرتا گیا کہ ایک دن بستی والوں نے دیکھا کہ یہ مردِ درویش کچھ اس انداز سے مضطرب و بیتاب ہے جس طرح بعض پرندے طوفان آنے سے پیشتر اضطراب و سراسیمگی میں اِدھر اُدھر اُڑتے اور چکر لگاتے نظر آتے ہیں۔ انہوں نے پوچھا کہ بابا خیر ہے! آج یہ بے کلی اور بے چینی کیوں ہے؟ کہا کہ تمہیں کیا بتاؤں۔ اگر عافیت چاہتے ہو تو اب بھی اپنے آپ اور اپنی نسلوں کو خدائے قوی و مقتدر کی حفاظت میں لے آؤ۔ ورنہ یاد رکھو کہ طوفانِ بلا انگیز میں خس و خاشاک

کی طرح بہ جاؤ گے۔

خبر ملی ہے خدایانِ بحر و بر سے مجھے فرنگ رہگذرِ سیلِ بے پناہ میں ہے

بستی والوں نے سُنا اور حسبِ دستور ایک خفیف سی ہنسی سے اس کا استقبال کیا۔ رات کو معمولاً محفلِ رقص و سرود میں محوِ کیف و سرور رہے۔ آخرِ شب آنکھ لگی تو محسوس ہوا کہ گویا زلزلہ کے جھٹکے آ رہے ہیں۔ آنکھیں ملتے ہوئے اٹھے۔ دیوانگی میں اِدھر اُدھر بھاگے۔ دیکھا تو اس قصرِ مشید کی بنیادیں تک ہل رہی ہیں جس کے متعلق کبھی تصور میں بھی نہ آتا تھا کہ متزلزل ہو سکے گا۔ آندھی اور جھکڑ کا طوفان، زلزلے کے جھٹکے، یہ مکان گرا وہ دیوار ٹوٹی، باہر تند و تیز بارش، اندر تباہی و بربادی۔ سامنے ڈنزگ کی پہاڑیوں کو دیکھا تو آتش فشاں چوٹیوں سے لاوے کا سیلاب اُمنڈا چلا آرہا ہے اور جو کچھ سامنے آتا ہے اسے اپنے مہیب شعلوں کی لپیٹ میں لئے بربادیوں کے جہنم میں دھکیلتا چلا جاتا ہے۔ بستی والوں کو اپنے پرائے کا کچھ ہوش نہ تھا۔ اب ان کی سمجھ میں آیا کہ وہ مردِ دانا کیا کہتا تھا۔ اس سراسیمگی میں اٹھے اور اس فقیر کی کٹیا کی طرف لپکے کہ اسی دانائے راز سے پوچھیں کہ اس سیلابِ فنا سے بچنے کی کوئی صورت بھی ہے۔ بھاگے بھاگے کٹیا پر پہنچے لیکن دیکھا تو کٹیا خالی ہے۔ وہ مردِ درویش کہیں چلا گیا۔ سر پکڑ کر بیٹھ گئے کہ اب کوئی تدبیر سجھائی نہیں دیتی تھی۔ کٹیا کے اندر عین وسط میں نورِ قرآنی کی قندیل جگمگ جگمگ کر رہی تھی۔ ایک طرف ایک کدوئے کہنہ میں عشقِ محمدیؐ کی شرابِ کوثرین چھلک رہی تھی اور سامنے دیوار پر جبریل کے پروں سے لکھا تھا کہ

سرودے رفتہ باز آید کہ ناید؟
نسیمے از حجاز آید کہ ناید؟
سر آمد روزگارِ ایں فقیرے
دگر دانائے راز آید کہ ناید؟

○

بستی والوں نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی تو ایک طرف ایک کشکول دکھائی دی جس پر جلی حروف

۱؎ دوسری جنگِ عظیم کا آغاز۔

میں لکھا تھا۔

بحضورِ ملت

دیکھا تو اس میں کاغذ کے کچھ ٹکڑے نہایت ترتیب سے رکھے ہیں۔ سب سے اوپر ۱۹۰۷ء کا ایک ٹکڑا ہے۔ یہ وہ وقت تھا جب ملتِ بیضا کا انحطاط اپنی انتہائی پستی تک پہنچ چکا تھا اور کہیں کسی طرف سے امید کی کوئی کرن نظر نہیں آتی تھی۔ عین اس مایوسی اور بے کسی کے ماحول میں اس امیدوں کے شہزادے نے گرتی ہوئی قوم کا بازو تھاما اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ کیوں گھبراتے ہو۔ کیوں خوف کھاتے ہو؟

نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو الٹ دیا تھا
سُنا ہے یہ قدسیوں سے میں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہوگا
سفینۂ برگِ گُل بنالے گا قافلہ مورِ ناتواں کا
ہزار موجوں کی ہو کشاکش مگر یہ دریا سے پار ہوگا

لوگوں نے سُنا اور معنی خیز تبسم سے اس کا استقبال کیا کہ انحطاط کا یہ عالم اور اس پر یہ "موہوم" امیدیں! اس کے نیچے ۱۹۱۲ء کا ایک پرزہ تھا۔ یہ وہ وقت تھا جب جنگِ بلقان میں ملتِ اسلامیہ کے ترکش کا آخری تیر بھی نشانہ خطا کر کے ٹوٹ کر گر چکا تھا۔ سطوتِ اسلامیہ کے ابھرنے کی بظاہر کوئی امید نظر نہ آتی تھی۔ مایوسیوں کی تاریکی نے چاروں طرف سے گھیرا ڈال رکھا تھا۔ اس ظلمت و تاریکی میں وہ شمع بردارِ کاروانِ حجاز اٹھا اور اپنی مخصوص لَے میں پکار کر کہا کہ مایوس ہونے کی کوئی بات نہیں۔ آ ــــ اور ــــ جلوۂ تقدیر میرے دل کے آئینے میں دیکھ ــــ دیکھ اور اپنی آنکھوں سے دیکھ کہ کس طرح

آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش		اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائیگی
اس قدر ہوگی ترنم آفریں بادِ بہار		نگہتِ خوابیدہ غنچے کی نوا ہو جائیگی
آملیں گے سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک		بزمِ گل کی ہم نفس بادِ صبا ہو جائیگی
آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں		محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائیگی

اس کے ساتھ ہی ایک اور ٹکڑے پر یہ لکھ رکھا تھا۔

دیکھ کر رنگِ چمن ہو نہ پریشاں مالی — کوکبِ غنچہ سے شاخیں ہیں چمکنے والی
خس و خاشاک سے ہوتا ہے گلستاں خالی — گل بر انداز ہے خونِ شہدا کی لالی
رنگ گردوں کا ذرا دیکھ تو عنابی ہے
یہ نکلتے ہوئے سورج کی افق تابی ہے
(جوابِ شکوہ)

اُدھر یورپ کے میدانوں میں خونِ مسلم کی یوں ارزانی ہو رہی ہے اور اِدھر ہندوستان میں ان ہی دنوں ایک ایسی تحریک کی ابتدا تھی جو آتشِ خاموش کی طرح وحدتِ ملت اور عالمگیریتِ اسلام کو اندر ہی اندر جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا دینے والی تھی۔ اس مردِ دانا کی نگاہِ دوررس اگر ایک طرف لالہ زارِ مغرب کے آتشیں منظر پر محوِ خوننابہ نشانی تھی تو دوسری طرف اس تحریکِ جدید کی ہلاکت سامانیوں سے بھی غافل نہ تھی۔ یہ وہ وقت تھا جب یہ چیز کسی کے حیطۂ تصور میں بھی نہیں آسکتی تھی کہ قومیت پرستی (یعنی وطن کو وجۂ جامعیت قرار دے کر متحدہ قومیت کی تشکیل) میں بھی مسلمانوں کے لئے کسی قسم کا کوئی خطرہ ہے۔ بڑے بڑے دردمندانِ ملت اپنی وطن پرستی پر فخر کرتے نظر آتے تھے۔ لیکن ان سب میں اکیلا یہ مردِ دانا تھا جس نے بلند آہنگی سے پکار کر کہا کہ

اس دور میں مے اور ہے جام اور ہے جم اور — ساقی نے بنا کی روشِ لطف و ستم اور
مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور — تہذیب کے آذر نے ترشوائے صنم اور
ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

یہ وہ زمانہ تھا جب تہذیبِ مغرب کی تقلید میں نیشنلزم گویا وطن کا فیشن بن رہی تھی۔ مہذب ہونے کا ثبوت یہ تھا کہ انسان نیشنلسٹ ہو۔ عین اُس زمانہ میں اس دیدہ ور کی نگاہوں نے دیکھ لیا کہ یہ نیا فتنہ کس قدر اسلام کے بنیادی خطوط سے متضاد و متباین ہے۔ اس نے قوم کو جھنجھوڑ کر کہا کہ

اپنی ملت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر — خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمیؐ
اُن کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار — قوتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری

دامنِ دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں　　اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملت بھی گئی

اس لیے کہ :-

نرالا سارے جہاں سے اس کو عرب کے معمار نے بنایا
بنا ہمارے حصارِ ملت کی اتحادِ وطن نہیں ہے!

اس کے بعد ایک اور ورق ملا۔ یہ اس زمانہ کا لکھا ہوا تھا جب ہندوستان میں جدید اصطلاحات کا دَور دَورہ تھا جس کی رو سے یہاں مغربی انداز کے جمہوری نظام کی طرح ڈالی گئی تھی۔ یہ وقت وہ تھا کہ مغربی جمہوریت کو نوعِ انسان کی تمام مصیبتوں کا حل بتایا جاتا تھا۔ اسی میں اصل آزادی کا راز مضمر سمجھا جاتا تھا۔ تمام ہندوستان نے جمہوری نظام کی طرف ان اصلاحی اقدام کا خیر مقدم کیا حتّٰی کہ مسلمانوں کی طرف سے بلند آہنگی سے نعرے لگنے شروع ہو گئے کہ اسلام جمہوریت کا مذہب ہے اور کسی نے یہ نہ سمجھا کہ اس جمہوریت اور اسلامی جمہوریت میں کس قدر بُعد المشرقین ہے۔ یہ جمہوریت وہ تھی جس کی رُو سے قانون سازی کا اختیار انسانوں کی ایک جماعت کو تفویض کر دیا جاتا تھا اور یوں اقلیت پر اکثریت کے فیصلوں کی پابندی لازم تھی۔ اِدھر ساری دنیا اور ہندوستان کے مسلمان ان جمہوری اصلاحات پر چراغاں کر رہے تھے اور اِدھر یہ مردِ دانا انہیں متنبہ کر رہا تھا کہ یاد رکھو!

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام　　جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری
دیوِ استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب　　تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری
مجلسِ آئین و اصلاح و رعایاتِ حقوق　　طبِ مغرب میں مزے میٹھے اثر خواب آوری

اس سرابِ رنگ و بو کو گلستان سمجھا ہے تو
آہ اے ناداں قفس کو آشیاں سمجھا ہے تو

اس ورق کے دوسری طرف لکھا تھا۔

گریز از طرزِ جمہوری غلامِ پختہ کارے شو
کہ از مغزِ دو صد خر فکرِ انسانے نمے شود

ان ہی دنوں کا لکھا ہوا ایک اور ورق ملا۔ زمانہ وہ تھا جب یورپ کے گِدھ، ترکی کے مردِ بیمار کی لاش

پر منڈلا رہے تھے۔ عرب و عجم میں مسلمانوں کی رہی سہی قوتیں بھی ختم ہو رہی تھیں۔ (پہلی) جنگِ عظیم کے بعد کے اثرات سے ملّتِ اسلامیہ کا جسمِ ناتواں نڈھال ہو رہا تھا۔ وہ زمانہ جس میں

لے گئے تثلیث کے فرزند میراثِ خلیل — خشتِ بنیادِ کلیسا بن گئی خاکِ حجاز
ہو گیا مانندِ آبِ ارزاں مسلماں کا لہو — مضطرب ہے تو کہ تیرا دل نہیں دانائے راز

اس عالمگیر مایوسی میں جب کہیں سے شعاعِ اُمید جلوہ افروز نظر نہیں آتی تھی، اس مردِ مومن نے اپنی قرآنی فراست سے دیکھا کہ مایوسیوں کے ان خوفناک بادلوں کے پیچھے امید کی سنہری کرن بھی موجود ہے۔ اس نے آگے بڑھ کر ڈوبتی ہوئی قوم کو حوصلہ دیا کہ وجہِ اضطراب کچھ نہیں۔

دلیلِ صبح روشن ہے ستاروں کی تنک تابی — افق سے آفتاب ابھرا گیا دورِ گراں خوابی
عروقِ مردۂ مشرق میں خونِ زندگی دوڑا — سمجھ سکتے نہیں اس راز کو سینا و فارابی!

عطا مومن کو پھر درگاہِ حق سے ہونے والا ہے
شکوہِ ترکمانی ذہنِ ہندی نطقِ اعرابی

اس کے نیچے لکھا تھا۔

سرشکِ چشمِ مسلم میں ہے نیساں کا اثر پیدا — خلیل اللہ کے دریا میں ہوں گے پھر گہر پیدا
کتابِ ملّتِ بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہے — یہ شاخِ ہاشمی کرنے کو ہے پھر برگ و بر پیدا

ادھر اس قدر تابناک امیدوں کی قندیل کو روشن کیا، لیکن اس کے ساتھ ہی یورپ کی ہمسائیگی میں بسنے والے ترکوں کو اس سے بھی آگاہ کر دیا کہ یاد رکھو کہیں تم بھی تہذیبِ مغرب کے فریب میں نہ آ جانا۔

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیبِ حاضر کی — یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے
وہ حکمت ناز تھا جس پر خردمندانِ مغرب کو — ہوس کے پنجۂ خونیں میں تیغِ کارزاری ہے

تدبّر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا
جہاں میں جس تمدّن کی بنا سرمایہ داری ہے

پھر ایک اور یادداشت ملی۔ یہ اس زمانہ میں لکھی گئی تھی جب روس کا بالشویکی نظام عالمگیر حیثیت اختیار کئے جا رہا تھا۔ اور چونکہ یہ نظامِ سرمایہ داری کا ردِ عمل تھا اور گھبرایا ہوا انسان یہ سمجھ رہا

تھا کہ بس وہ تریاق ہاتھ آگیا جو زمانۂ حاضر کے ہر قسم کے زہر کا مداوا ہے۔ اسی لئے اپنے مرکز سے ہٹا ہوا مسلمان بھی یہی سمجھ رہا تھا کہ ہاں! یہ نظام عین اسلامی نظام ہے۔ اس عالمگیر غلغلہ اندازی میں اس مردِ دانا نے اس نظامِ اشتراکیت کا تجزیہ کیا اور فریب خوردہ مسلمان سے کہا کہ یاد رکھو قومیں صرف تخریب (لَا) سے زندہ نہیں رہا کرتی۔ اس کے ساتھ تعمیر (اِلَّا) کی بھی ضرورت لاینفک ہوتی ہے۔ نظامِ اشتراکیت پر غور کرو۔

فکرِ او در تُند بادِ لَا بماند		مرکبِ خود را سوئے اِلَّا نراند
آیدش روزے کہ از زورِ جنوں		خویش را زیں تندباد آرد بروں
در مقامِ لَا نیاساید حیات		سُوئے اِلَّا می خرامد کائنات
لَا و اِلَّا سازوبرگِ اُمتاں
نفیٔ بے اثبات مرگِ امتاں

پھر ایک اور یادداشت ملی۔ یہ اس زمانہ کا ذکر ہے جب یورپ نے بین الاقوامی معاملات کے تصفیہ کے لئے مجلسِ اقوام کی طرح ڈالی تھی اور دنیا خوش تھی کہ اب نزاع اور جھگڑوں کا زمانہ ختم ہو گیا۔ جنگ نابود ہو گئی۔ اب کمزوروں پر ظلم و استبداد روا نہیں رکھا جائے گا۔ ہر ایک کی دادرسی ہوگی۔ دنیا خوش اور مطمئن تھی لیکن اس مردِ دانا نے سر ہلا دیا اور کہہ دیا کہ

برفتد تا روشِ رزم دریں بزمِ کہن		دردمندانِ جہاں طرحِ نو انداختہ اند
من ازیں بیش ندانم کہ کفن دزدے چند		بہرِ تقسیمِ قبور انجمنے ساختہ اند

اس کے نیچے لکھا ہے ؎

نقشِ نو اندر جہاں باید نہاد		از "کفن دزداں" چہ امید کشاد
در جنیوا چیست غیر از مکر و فن		صید تو ایں میش و آں نخچیرِ من
نکتہ ہا کو می نگنجد در سخن		یک جہاں آشوب و یک گیتی فتن

ادھر یہ ہو رہا تھا اور اُدھر ہندوستان میں وطن پرستی، متحدہ قومیت کا دامِ ہمرنگِ زمین وسیع

۱؎ لیگ آف نیشنز سے مراد ہے جس کا ہیڈ کوارٹر جنیوا تھا۔

سے وسیع تر ہوتا جا رہا تھا اور بھولا بھالا مسلمان بلا سوچے سمجھے اپنے ہاتھوں اس دام کے حلقے کستا چلا جا رہا تھا۔ لیکن یہ دانائے راز برابر پکارتا چلا جا رہا تھا کہ یاد رکھو یہ سرابِ رنگ و بُو ہے۔ یہ تمہاری غلامی کی نئی زنجیریں ہیں۔ وطن کی بنا پر قومیت کا تصور تمہیں دورِ اسلام سے نکال کر عہدِ جاہلیت کی طرف لے جائے گا۔

ایک کاغذ کے پُرزے پر اس بحری تار کی نقل تھی جو گول میز کانفرنس میں شریک ہونے والے نمائندوں کے نام بھیجی گئی تھی کہ دیکھنا کہیں مخلوط انتخاب کو تسلیم نہ کر لینا۔ یہ تمہاری جمعیتِ اسلامی کی بنیادیں اکھیڑ کر رکھ دے گا۔ ایک یادداشت کا تھوڑا سا ٹکڑا موجود تھا جس پر نہرو رپورٹ کی مخالفت کی تلقین تھی۔ ۱۹۳۰ء کی لکھی ہوئی ایک لمبی چوڑی دستاویز ایک خریطہ کے اندر سنبھال کر رکھی ہوئی تھی۔ اس میں بڑے کام کی باتیں تھیں۔ ایک مقام پر جلی حروف میں لکھا تھا:۔

> میری آرزو یہ ہے کہ پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک واحد ریاست قائم کی جائے۔ ہندوستان کو حکومتِ خود اختیاری زیرِ سایہ برطانیہ ملے یا اس سے باہر کچھ بھی ہو۔ مجھے تو یہی نظر آتا ہے کہ شمال مغربی ہندوستان میں ایک متحدہ ریاست کا قیام اس علاقہ کے مسلمانوں کے مقدر میں لکھا جا چکا ہے۔[۱]

بستی کے لوگ کشکول کی ان دستاویزوں کو کھول رہے تھے اور فقیر کی ہیبت ان کے دلوں پر چھائے جا رہی تھی۔ وہ محسوس کرتے تھے گویا وہ ابھی تک کٹیا کے اندر ہی ہے۔ ان دستاویزوں کا انداز کچھ ایسا لاہوتی سا تھا کہ وہ اس زمین کی باتیں نظر ہی نہیں آتی تھیں۔

پھر کچھ اور متفرق یادداشتیں ملیں۔ کسی میں افسردہ دل صوفی سے کہا گیا تھا کہ

یہ حکمتِ ملکوتی یہ علمِ لاہوتی　　　حرم کے درد کا درماں نہیں تو کچھ بھی نہیں
یہ ذکرِ نیم شبی یہ مراقبے یہ سرور　　　تری خودی کے نگہباں نہیں تو کچھ بھی نہیں

کہیں ظواہر پرست مُلّا سے مخاطب تھا کہ:۔

---

[۱] خطبۂ صدارت آل انڈیا مسلم لیگ۔ منعقدہ الٰہ آباد۔

فقیہِ شہر بھی رہبانیت پہ ہے مجبور کہ معرکے ہیں شریعت کے جنگ دست بدست
گریز کشمکشِ زندگی سے مردوں کی اگر شکست نہیں ہے تو اور کیا ہے شکست

کہیں اس زمانہ کے جھوٹے مدّعیانِ امامت و نبوّت سے خطاب کیا تھا کہ

فتنۂ ملّتِ بیضا ہے امامت اس کی جو مسلماں کو سلاطیں کا پرستار کرے

کہیں افرنگ زدہ مسلمان سے کہا گیا تھا کہ

ترا وجود سراپا تجلّیِ افرنگ کہ تو وہاں کے عمارت گروں کی ہے تعمیر
مگر یہ پیکرِ خاکی خودی سے خالی ہے فقط نیام ہے تو زرنگار و بے شمشیر

کہیں اربابِ فنونِ لطیفہ کو مخاطب کر کے کہا گیا تھا کہ

اے اہلِ نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا
شاعر کی نوا ہو کہ مغنی کا نفس ہو جس سے چمن افسردہ ہو وہ بادِ سحر کیا

کہیں فلسفہ دانوں کو مخاطب کر کے کہا گیا تھا کہ

سُن مجھ سے یہ نکتۂ دل افروز

انجامِ خرد ہے بے حضوری ہے فلسفہ زندگی سے دوری

بستی والے ان یادداشتوں کو دیکھتے تھے اور حیران ہوتے جاتے تھے کہ یہ مردِ قلندر کس مقامِ بلند پر تھا کہ اس کے سامنے ہر شے اپنی اصلی شکل میں بے نقاب ہو جاتی تھی اور وہ ان تمام چیزوں کے محاسن و معائب کو کس طرح کھلے کھلے الفاظ میں بیان کر دیتا تھا اور یہ سب کچھ اس چھوٹی سی کٹیا کے اندر بیٹھے بیٹھے، اس کی نگاہ کس طرح

یک چمن گل، یک نیستاں نالہ، یک خم خانہ مے

اپنے دامن میں رکھتی تھی کہ زندگی کا کوئی شعبہ اور علم و سائنس کا کوئی گوشہ ایسا نہ تھا جس کو یہ محیط نہ ہو۔ ایک پرزہ دیکھا تو اس پر گویا آتشیں حروف میں چند شعر لکھے ہوئے ملے۔

عجم ہنوز نداند رموزِ دیں ورنہ ز دیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی است
سرود بر سرِ منبر کہ ملّت از وطن است چہ بے خبر ز مقامِ محمدِ عربی است
بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست اگر باو نرسیدی تمام بولہبی است

پڑھنے والوں میں سے ایک نے کہا کہ جن صاحب کا نام لیا گیا ہے یہ تو سُنا ہے کسی دینی مکتب کے صدر مدرس تھے۔ ایک گوشے میں ایک سفید ریش بزرگ بیٹھے تھے۔ انہوں نے کہا کہ یہ تو واقعی صدر مدرس تھے لیکن اس فقیرِ دانا کو تم کیا سمجھے ہو۔ اس کی شکل و صورت اور وضع قطع پر نہ جاؤ۔ اس کے لگتے کا عالم ہم نے تو اپنی زندگی میں دیکھا نہیں۔ بستی والے یہ سب کچھ دیکھ اور سُن رہے تھے اور بیٹھے سر پیٹ رہے تھے کہ ہم نے اس دانائے راز کی کچھ قدر نہ کی۔ یہ تو بیٹھے ہی بیٹھے دنیا کو کچھ سے کچھ کر گیا ہے۔ بستی والوں نے اس مردِ بزرگ سے پوچھا کہ سائیں بابا! یہ تو بتاؤ کہ یہ مردِ دانا اس قسم کی باتیں کہتا کس طرح سے تھا! یہ تو ہمیں کسی اور ہی دنیا کا انسان نظر آتا ہے۔ اس نے کہا کہ لوگوں کی یہی تو بھول ہے۔ یہ مردِ دانا اِسی دنیا کا انسان تھا۔ اس نے نہ (معاذ اللہ) نبی ہونے کا دعویٰ کیا نہ مہدی کا۔ نہ وہ مجددیت کا مدّعی ہوا نہ امامت کا۔ اس نے اپنے آپ کو سیدھا سادا مسلمان کہا اور بس۔ بستی والوں نے پوچھا کہ ہماری بات تو وہیں کی وہیں رہی کہ جب اس نے کوئی دعویٰ بھی نہیں کیا تو پھر وہ ایسی باتیں کس طرح کہتا تھا۔ مردِ بزرگ نے کہا کہ میں نے خود اس سے یہ سوال کیا تھا جس کے جواب میں مردِ دانا نے اپنے مخصوص تبسم سے کہا تھا کہ اس میں "کرامات" کی کوئی بات نہیں۔ اپنی آنکھیں جن پر کسی بیرونی اثر کا رنگین چشمہ نہ ہو اور قرآنِ کریم کی روشنی۔ اس سے وہ فراست پیدا ہو جاتی ہے جس سے ہر شے کی حقیقت بے نقاب ہو کر سامنے آجاتی ہے۔

میانِ آب و گِل خلوت گزیدم ز افلاطون و فارابی بریدم
نکردم از کسے دریوزہ چشمم جہاں را جُز بچشمِ خود ندیدم

"میری صہبائے بصیرت" (مردِ دانا نے کہا) خمکدۂ حجاز سے سربمہر آبگینوں میں آتی ہے جس میں خالص قرآن ہوتا ہے۔" یہ کہا اور مردِ دانا کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔ فرمایا کہ کیا آپ نے میری وہ دعا نہیں سنی جو آہِ سحرگاہی اور نالۂ نیم شبی کے حقیر سے نذرانے کے ساتھ میں نے بحضور خواجہؐ کونینؐ پیش کی ہے۔ سنیئے کہ میں نے کیا درخواست پیش کی ہے۔

گر دلم آئینہ بے جوہر است ور بحرفم غیرِ قرآں مضمر است
پردۂ ناموسِ فکرم چاک کُن ایں خیاباں را ز خارم پاک کُن
روزِ محشر خوار و رسوا کُن مرا بے نصیب از بوسۂ پا کُن مرا

آخری مصرع پڑھا اور پڑھتے ہی وہ مردِ دانا بچوں کی طرح ہچکیاں لے کر رونے لگا۔ یوں معلوم ہوتا تھا گویا سر سے پاؤں تک قلب ہی قلب ہے۔ جو سوز و گداز و تپش و خلش کا نازک آبگینہ ہے۔

بستی والے اس مردِ بزرگ کی باتیں سُن رہے تھے۔ ہر ایک کی آنکھوں میں آنسو اور دل میں طلسم اضطراب موجزن تھا۔ انہوں نے دیکھا تو ایک پُرزے پر لکھا تھا۔

پس از من شعرِ من خوانند و مے یابند و می گویند
جہانے را دگرگوں کرد یک مردِ خود آگاہے

بستی والوں نے اس شعر کو دیکھا اور بلک بلک کر رونے لگ گئے۔ جب ذرا سنبھلے تو کہا کہ اے کاش! ہمیں یہ بھی بتا دیا ہوتا کہ بالآخر اب ہم کیا کریں۔ دیکھا تو ایک ورق پر لکھا تھا۔

اے اسیرِ رنگ پاک از رنگ شو مومنِ خود کافرِ افرنگ شو
رشتۂ سود و زیاں در دستِ تست آبروئے خاوراں در دستِ تُست
ایں کہن اقوام را شیرازہ بند رایتِ صدق و صفا را کن بلند
اہلِ حق را زندگی از قوت است قوتِ ہر ملت از جمعیت است

رائے بے قوت ہمہ مکر و فسوں
قوتِ بے رائے جہل است و جنوں

بستی والے افسردہ و غمگین کٹیا سے باہر آ گئے۔ ہر ایک کی آنکھیں متلاشی اور قلب متمنی تھا کہ اے کاش وہ مردِ دانا کہیں سے پھرتا پھراتا ایک مرتبہ پھر اِدھر آ نکلے۔ وہ اسی سوچ میں ڈوبے ہوئے آہستہ آہستہ جا رہے تھے کہ انہوں نے سُنا کہ دُور پہاڑی کے دامن میں میٹھے میٹھے سروں میں کوئی گا رہا تھا کہ

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

اقبالؒ کی کہانی خود اقبالؒ کی زبانی

یومِ اقبالؒ ۱۹۵۱ء کی تقریر

یہ کہانی "سوانحعمری نہیں جس میں ترتیبِ واقعات کو پیشِ نظر رکھا جاتا ہے یہ صرف اقبالؒ کے قلب و دماغ کی مختلف کیفیتوں کا مطالعہ ہے جسے زمان و مکان کی قیود سے الگ ہٹ کر پیش کیا گیا ہے۔ لہٰذا اس "کہانی" کو اسی زاویۂ نگاہ سے دیکھئے۔

برادرانِ عزیز!

علامہ اقبالؒ نے اپنے آخری کلام "ارمغانِ حجاز" میں کہا ہے کہ

چو رختِ خویش بربستم ازیں خاک — ہمہ گفتند با ما آشنا بود
ولیکن کس ندانست ایں مسافر — چہ گفت و با کہ گفت و از کجا بود

جب کیفیت یہ ہے کہ خود اقبالؒ کے اپنے اندازے کے مطابق کوئی شخص اقبالؒ کی حقیقت سے کماحقہ واقف نہیں تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر حقیقی اقبالؒ کی جھلک دیکھی کہاں سے جائے؟ اس سوال کا جواب چنداں مشکل نہیں اس لئے کہ اقبالؒ خود اپنے متعلق اتنا کچھ بتا گیا ہے کہ اس سے اقبالؒ کی پوری تصویر نگہِ تجسس کے سامنے آجاتی ہے۔ میرے لئے تو یہ مشکل ہے کہ اس مختصر سے وقت میں اس پوری تصویر کے تمام گوشوں کی تفاصیل آپ کے لئے جنتِ نگاہ بنا سکوں۔ اس وقت صرف اتنا ہو سکے گا کہ اس کے اُبھرے ہوئے نقش و نگار اور نمایاں خط و خال سامنے لائے جا سکیں۔ اس

مرقع نگہ تاب اور پیکر خوش انداز کی تفصیلی گل کاریوں اور جلوہ طرازیوں کو میں نے اپنی اس تصنیف کے لئے اٹھا رکھا ہے جو "پیامِ اقبالؒ اور قرآن کریم" کے عنوان سے بہ پیشِ نظر ہے اور جسے میں حضرت علامہ کے ان احسانات کی بنا پر، جن سے میری نگہ تشکر ہمیشہ نگوں سار ہے، اپنے ذمہ ایک قرض سمجھتا ہوں. خدا مجھے اس قرض سے سبکدوش ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ وَمَا تَوْفِيقِيْ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ ۔

اس وقت میری دوسری مشکل یہ ہے کہ حضرت علامہ کے کلام کا بیشتر حصہ فارسی میں ہے اور اس قسم کا مخلوط مجمع فارسی زبان کا متحمل نہیں ہو سکتا. اس لئے مجھے تو اُن کے اُردو کلام ہی پر اکتفا کرنا ہوگا اور فارسی اشعار صرف ان مقامات پر پیش کئے جائیں گے جہاں ایسا کرنا ناگزیر ہو۔

اب سنئے اقبالؒ کی کہانی، خود اقبال کی زبانی۔

انیسویں صدی کے آخر شب کے ستارے جھلملا رہے ہیں اور بیسویں صدی کی نازنینۂ سحر انگڑائیاں لے رہی ہے. قلبِ زندہ دلانِ پنجاب یعنی لاہور کی کیف بار فضائیں، شباب و شعر کی نکہتوں اور رنگ و تعطر کی نزہتوں سے دامانِ باغبان و کف گل فروش کا منظر پیش کر رہی ہیں. گورنمنٹ کالج کی درس گاہ اپنے معیارِ تعلیم کی پابندی کے ساتھ ساتھ دولت مند خاندانوں کے عشرت پسند نونہالوں کی لااُبالیوں کے لئے دُور دُور تک شہرت حاصل کر چکی ہے کہ اتنے میں سیالکوٹ کے ایک متوسط خاندان کا نہایت ذہین طالب العلم اس حیرت کدۂ علم و تماشا میں آ نکلتا ہے۔ شروع شروع میں جہاں وہ نوجوان اس فضا کو اپنے لئے غیر مانوس پاتا ہے وہاں خود وہ فضا بھی اس نووارد کو اجنبی سا محسوس کرتی ہے. لیکن رفتہ رفتہ کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ وہ نووارد طالب العلم اپنی سحر طرازیوں سے اس پوری فضا پر چھا جاتا ہے اور جس محفل میں شریک ہو جاتا ہے اسے تبسم فشان و قہقہہ بار بنا دیتا ہے. تعلیمی منازل میں اس کا یہ عالم ہے کہ اساتذہ اس کا معلّم کہلانے میں فخر محسوس کرتے ہیں. دوستوں کی مجلس میں یہ کیفیت کہ ہر شخص اس سے قریب تر ہونے میں ایک خاص نشاطِ رُوح محسوس کرتا ہے. اس کی شرکت سے شعر و سخن کی محفلوں میں ایک تازہ حرارت پیدا ہو جاتی ہے. غرضیکہ تھوڑے ہی دنوں میں یہ محسوس ہونے لگ جاتا ہے کہ

اس سے بیشتر لاہور محض ایک پیکرِ آب و گل تھا اور اس میں زندگی اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ

کالج کا زمانہ

پہلے پہل ابھی مسکرائی ہے لیکن اس کے باوجود اس نوجوان کی حالت یہ ہے کہ وہ اس محفلِ طرب ونشاط کے کسی ساز کو اپنا ہم آہنگ اور اس گل کدہ حسن وتماشا کے کسی پھول کو اپنا ہم رنگ نہیں دیکھتا۔ اسے ہر ایک اپنا ہمنوا اور اپنا ہم ذوق سمجھتا ہے لیکن وہ کسی کو بھی اپنا ہم صفیر و ہم نگاہ نہیں پاتا۔ اس کی شرکت سے اجڑی ہوئی محفلوں پر بھی بہار آجاتی ہے۔ لیکن یہ بھری محفلوں میں بھی اپنے آپ کو تنہا پاتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کسی شے کی جستجو ہے جس نے اسے سراپا اضطراب بنا رکھا ہے۔ کوئی خلشِ تجسس ہے جو اسے کسی پہلو چین نہیں لینے دیتی۔ وہ اپنی تشنگیٔ ذوق کی تسکین کے لئے ہر دور سے نظر آنے والے چشمہ کی طرف لپکتا ہے لیکن اسے سراب پاکر مضطرب وبیقرار واپس آجاتا ہے۔ وہ کبھی اس تسکین خاطر کے لئے لارنس گارڈن میں جانکلتا ہے لیکن اس جہانِ رنگ وبو کی جمال افروز شادابی وشگفتگی بھی اس کے لئے جاذبِ نگاہ نہیں بنتی۔ وہ ایک حسین شاخ پر مسکرانے والے "گلِ رنگیں" کو نہایت غور سے دیکھتا ہے اور اس سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ

تو شناسائے خراشِ عقدۂ مشکل نہیں اے گلِ رنگیں ترے پہلو میں شاید دل نہیں
زیبِ محفل ہے شریکِ شورشِ محفل نہیں یہ فراغت بزمِ ہستی میں مجھے حاصل نہیں

اس چمن میں میں سراپا سوز وسازِ آرزو
اور تیری زندگانی بے گدازِ آرزو

سو زبانوں پر بھی خاموشی تجھے منظور ہے راز وہ کیا ہے ترے سینے میں جو مستور ہے
میری صورت تو بھی اک برگِ ریاضِ طور ہے میں چمن سے دور ہوں تو بھی چمن سے دور ہے

مطمئن ہے تو پریشاں مثلِ بو رہتا ہوں میں
زخمیٔ شمشیرِ ذوقِ جستجو رہتا ہوں میں

ہو سکتا تھا کہ وہ اس خلشِ پیہم اور سوزِ مسلسل کے ہاتھوں تنگ آکر اپنی زندگی کا رخ بدل لے لیکن کوئی بے صوت صدا ہے جو چپکے ہی چپکے اس کے کان میں کچھ کہہ دیتی ہے اور وہ پکار اٹھتا ہے کہ نہیں مجھے گھبرانا نہیں چاہئے۔ کہیں

یہ پریشانی مری سامانِ جمعیت نہ ہو یہ جگر سوزی چراغِ خانۂ حکمت نہ ہو
ناتوانی ہی مری سرمایۂ قوّت نہ ہو رشکِ جامِ جم مرا آیئنۂ حیرت نہ ہو
یہ تلاشِ متصل شمعِ جہاں افروز ہے
توسنِ ادراکِ انساں کو خرام آموز ہے

یہ تجسّس اسے پھر آمادۂ تجسّس کر دیتی اور وہ ہلاکِ ذوقِ جستجو پھر اسی تپش و خلش کے لئے سیماب پا ہو جاتا ہے۔ جب اس سے پوچھا جاتا کہ بالآخر اس سوزِ پیہم اور خلشِ مسلسل کی وجہ کیا ہے۔ ہر شخص نے اپنی زندگی کا کوئی نہ کوئی مقصود متعیّن کر رکھا ہے اور اس کا دل اس سے مطمئن ہے لیکن ایک تم ہو کہ تمہیں کسی پہلو قرار ہی نہیں۔ کوندے کی لپک کی طرح یہاں سے وہاں اور شعلے کی تڑپ کی طرح وہاں سے یہاں۔
وہ سب کچھ سنتا اور ایک آہ بھر کر کہہ دیتا کہ

چہ کنم کہ فطرتِ من بہ مقام درنسازد دلِ ناصبور دارم چو صبا بہ لالہ زارے
چو نظر قرار گیرد بہ نگارِ خوبروے تپد آں زماں دلِ من پئے خوب تر نگارے
ز شرر ستارہ جویم ز ستارہ آفتابے سرِ منزلے ندارم کہ بمیرم از قرارے
طلبم نہایتِ آں کہ نہایتے ندارد بہ نگاہِ ناشکیبے بدلِ امیدوارے

اس کی فطرت کی یہی سیمابیت اور ذوقِ جستجو کی اضطرابیت تھی جو اسے ہر محفل میں دیوانہ وار لئے لئے پھرتی تھی۔ کبھی حکمت و فلسفہ کی خشک گھاٹیوں میں اور کبھی شعر و ادب کی شاداب وادیوں میں کبھی مسجد و خانقاہ کی خلوتوں میں اور کبھی محفلِ رنگ و چنگ کی جلوتوں میں۔ اور یہ سب کچھ اس بیباکانہ اعتراف کے ساتھ کہ

مدّتے با لالہ رویاں ساختم عشق با مرغولہ مویاں باختم
بادہ ہا با ماہ سیمایاں زدم بر چراغِ عافیت داماں زدم

چنانچہ اس کی یہ، ہر رہ نوردی اور ہر منزل نشینی کی کیفیت جسے قرآن نے فی کل واد یھیمون کی شاعرانہ نفسیاتی کیفیت سے تعبیر کیا ہے، دیکھنے والوں کے دل میں اس کے متعلق عجیب و غریب خیالات پیدا کیا کرتی۔ اسی کیفیت کو ایک مولوی صاحب کی زبان سے سنیئے جو اس زمانہ میں اقبالؒ کی ہمسائیگی میں رہتے تھے۔ اقبالؒ کے الفاظ ہیں :۔

حضرت نے مرے ایک شناسا سے یہ پوچھا — اقبال کہ ہے قمری شمشادِ معانی
پابندیِ احکامِ شریعت میں ہے کیسا؟ — گو شعر میں ہے رشکِ کلیمِ ہمدانی
سمجھا ہے کہ ہے راگ عبادات میں داخل — مقصود ہے مذہب کی مگر خاک اڑانی
کچھ عار اُسے حسن فروشوں سے نہیں ہے — عادت یہ ہمارے شعرا کی ہے پرانی
گانا جو ہے شب کو تو سحر کو ہے تلاوت — اس رمز کے اب تک نہ کھلے ہم پہ معانی
لیکن یہ سُنا اپنے مریدوں سے ہے میں نے — بے داغ ہے مانندِ سحر اس کی جوانی

○

اس شہر میں جو بات ہو اُڑ جاتی ہے سب میں — میں نے بھی سنی اپنے احبا کی زبانی
اِک دن جو سرِ راہ ملے حضرتِ زاہد — پھر چھڑ گئی باتوں میں وہی بات پرانی
میں نے یہ کہا کوئی گلہ مجھ کو نہیں ہے — یہ آپ کا حق تھا ز رہِ قربِ مکانی
اگر آپ کو معلوم نہیں میری حقیقت — پیدا نہیں کچھ اس سے قصورِ ہمہ دانی
میں خود بھی نہیں اپنی حقیقت کا شناسا — گہرا ہے مرے بحرِ خیالات کا پانی
مجھ کو بھی تمنا ہے کہ اقبال کو دیکھوں — کی اس کی جدائی میں بہت اشک فشانی

اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے
کچھ اس میں تمسخر نہیں، واللہ نہیں ہے

واعظ کو اس قسم کے مسلک سے وجۂ شکایت بجا تھی۔ لیکن حیرت تو یہ ہے کہ اس باب میں زندانِ میکدہ بھی کچھ کم گلہ طراز نہ تھے۔ اس کی بھی سمجھ میں بھی نہیں آتا تھا کہ اقبال ہے کیا؟ وہ بھی یہ کہتے تھے کہ

ہے عجب مجموعۂ اضداد اے اقبال تو — رونقِ ہنگامۂ محفل بھی ہے تنہا بھی ہے
عینِ شغلِ مے میں پیشانی ہے تیری سجدہ ریز — کچھ ترے مسلک میں رنگِ مشربِ مینا بھی ہے
ہے حسینوں میں وفا نا آشنا تیرا خطاب — اے تلون کیش! تو مشہور بھی ہے رسوا بھی ہے

لے کے آیا ہے جہاں میں عادتِ سیماب تو
تیری بیتابی کے صدقے ہے عجب بیتاب تو

یہ سُنکر اقبالؒ مسکراتا اور کہتا کہ

عشق کی آشفتگی نے کر دیا صحرا جسے — مشتِ خاک ایسی نہاں زیرِ قبا رکھتا ہوں میں
آرزو ہر کیفیت میں اک نئے جلوے کی ہے — مضطرب ہوں دل سکوں نا آشنا رکھتا ہوں میں

فیض ساقی شبنم آسا ظرفِ دل دریا طلب
تشنۂ دائم ہوں آتش زیرِ پا رکھتا ہوں میں

خلشِ آرزو سے اقبالؒ کی یہ آشفتگی روز بروز بڑھتی گئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس کے سینۂ شعلہ ساماں و آذر فشاں میں جو حشر بپا ہو رہا ہے اسے اپنے ہم جلیس احباب کو کس طرح دکھائے؟ یہی وجہ تھی کہ وہ بھری محفل میں بھی اپنے آپ کو تنہا پاتا تھا اور یہ تنہائی اسے رہ رہ کر ستاتی تھی۔ حتیٰ کہ وہ یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا تھا کہ

لطف مرنے میں ہے باقی نہ مزہ جینے میں — کچھ مزہ ہے تو اسی خونِ جگر پینے میں
کتنے بیتاب ہیں جو مرے آئینے میں — کس قدر جلوے تڑپتے ہیں مرے سینے میں

اس گلستاں میں مگر دیکھنے والے ہی نہیں
داغ جو سینے میں رکھتے ہیں وہ لالے ہی نہیں

اسے تلاش تھی کسی ایسے محرمِ راز کی جو اسے کی سنتا اور اسے سمجھتا لیکن اسے کہیں ایسا رفیقِ ہمنوا نہیں ملتا تھا حتیٰ کہ وہ اپنی تلاش میں تھک کر کہہ اٹھتا کہ

یہاں کہاں ہم نفس میسر یہ دیس نا آشنا ہے اے دل
وہ چیز تو مانگتا ہے مجھ سے کہ زیرِ چرخِ کہن نہیں ہے

اسے اس تنہائی کا احساس آخر تک رہا اس لئے کہ وہ جس دیس کی بولی بولتا تھا اسے سمجھنے والا یہاں کوئی نہ تھا۔ اس لئے وہ ہر راہرو سے کہتا کہ

غریبِ شہر ہوں میں سُن تو لے مری فریاد — کہ تیرے سینے میں بھی ہوں قیامتیں آباد
مری نوائے غم آلود ہے متاعِ عزیز — جہاں میں عام نہیں دولتِ دلِ ناشاد
گلہ ہے مجھ کو زمانہ کی کور ذوقی سے — سمجھتا ہے مری محنت کو محنتِ فرہاد
صدائے تیشہ کہ بر سنگ می خورد دگر است — خبر بگیر کہ آوازِ تیشہ و جگر است

یہ تنہائی بعض اوقات اس قدر شدت اختیار کر جاتی کہ وہ سمجھتا کہ وہ کسی اور دنیا کا انسان ہے جو بھولے بھٹکے یہاں چلا آیا ہے۔ وہ راتوں کی تنہائیوں میں اُٹھ اُٹھ کر روتا اور خدا سے کہتا کہ

دریں میخانہ اے ساقی ندارم محرمے دیگر
کہ من شاید نخستیں آدمم از عالمے دیگر

دانشکدۂ فرنگ

لیکن اس تنہائی کے باوجود کسی فردوسِ گم گشتہ کی تلاش تھی جو اُسے ہر وقت گوشہ بگوشہ لئے لئے پھرتی تھی۔ تلاشِ حقیقت کی یہی خلشِ بے پایاں تھی جو اسے دانشکدۂ فرنگ میں لے گئی۔ وہاں پہنچ کر ایک اور کشمکش شروع ہوگئی یا یوں کہیئے کہ اس کی دیرینہ کشمکش کی نوعیت متعین ہوگئی۔ اقبالؒ کی کیفیت یہ تھی کہ ابتدائی تعلیم و تربیت کے اثر سے ایمان اس کے قلب کی گہرائیوں میں پیوست ہو چکا تھا۔ اس کے تحت الشعور میں اس کے نقوش بہت گہرے تھے۔ لیکن دماغی طور پر وہ ابھی تک فلسفی تھا۔ فلسفہ سے اُسے شُغف بھی خاص تھا۔ مغرب میں پہنچے تو وہاں کے فلاسفرز کی صحبت اور تعلیم نے اس شغف کو اور گہرا کر دیا۔ لیکن اس سے ہوا یہ کہ جو کچھ قلب کی گہرائیوں میں بلا دلیل و برہان جاگزیں تھا فلسفہ اس کی تائید نہیں کرتا تھا اور جو کچھ فلسفیانہ دلائل و براہین سے ثابت ہوتا تھا اس کی گواہی دل نہیں دیتا تھا۔ دل اور دماغ کی یہی وہ کیفیت تھی جو آگے چل کر مشرق اور مغرب کی کشمکش کے نام سے ابھری۔ یہی وہ کشمکش ہے جو اقبالؒ کے سارے پیغام میں مختلف اصطلاحات سے سامنے آتی ہے۔ عقل و عشق دل و دماغ، خرد و جنوں، علم و حضور، خبر و نظر، ذکر و فکر، رازی و رومی، ابلیس و جبریل، مصطفیٰ و بولہب، اہرمن و یزداں، یہ سب تقابل درحقیقت ادراک و جذبات کی اسی کشمکش کے مظہر تھے۔ مغرب میں میکانکی تصورِ حیات نے انسان کو ایک پیکرِ آب و گل سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں دی تھی۔ اس تصور کی رُو سے زندگی مادی تبدیلیوں سے وجود میں آجاتی تھی اور انہی اجزاء کے پریشان ہو جانے سے اس کا خاتمہ ہو جاتا تھا۔ اس کے برعکس، ایمانی تصورِ حیات کی رُو سے حیاتِ انسانی کا سرچشمہ مادہ سے ماوراء تھا اور موت اس کی آخری حد نہیں تھی بلکہ زندگی کی جوئے نغمہ خواں اس کے بعد بھی مسلسل رواں دواں رہتی تھی۔ مغربی سائنس کی رو سے علم کا دائرہ محسوسات کی چار دیواری تک محدود تھا۔ اس کے برعکس ایمانیات کی رُو سے علمِ حقیقی کا سرچشمہ وحی

تھا جو سرحدِ ادراک سے ماورا تھا۔ مغربی معاشرے کی بنیادیں تنہا عقل پر استوار تھیں جن کا تقاضا ہر فرد کے اپنے مفاد کا تحفظ ہوتا ہے۔ اس کے برعکس، ایمانیات کی رو سے معاشرے کی اساس ان مستقل اقدار پر رکھی جاتی تھی جو تمام نوعِ انسانی کے لئے یکساں طور پر نفع و نقصان اور خیر و شر کی میزان ہوتی ہیں۔ عقل کا تقاضا دوسروں کا سب کچھ چھین کر اپنا آپ بنانا تھا۔ لیکن عشق کا تقاضا دوسروں کی ربوبیت سے اپنے نشوو ارتقاء کا سامان بہم پہنچانا تھا۔ عقلِ انسانی زندگی کو سمٹا کر انفرادی دائرہ میں محبوس کر دیتی تھی، عشق اسے پھیلا کر ساری دنیا پر محیط کر دیتا تھا۔ عقل خود بیں تھی، عشق جہاں بیں۔ عقل من و تو کے امتیاز سے درخت کو شاخوں اور پتوں میں منقسم دیکھتی تھی۔ عشق کو ہر ذرہ میں آفتاب پنہاں نظر آتا تھا۔ عقل محوِ تماشائے لبِ بام رہتی تھی۔ عشق آتشِ نمرود میں بے خطر کود پڑنے کا متقاضی تھا۔ عقل بولہبی حیلہ جوئیاں سکھاتی تھی اور عشق روحِ مصطفویؐ کا پیامبر تھا اور یہ حقیقت ہے کہ

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تاامروز چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی

عقل و عشق کی یہی کشمکش تھی جس نے دانشکدۂ مغرب میں اقبالؒ کے سینے کو وقفِ اضطراب کر دیا اور اس سے دن کا چین اور رات کا آرام چھین لیا۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ

اسی کشمکش میں گزریں مری زندگی کی راتیں
کبھی سوز و سازِ رومی کبھی پیچ و تابِ رازی

یہی وہ دَور تھا جسے یاد کر کے وہ بعد میں کہا کرتے تھے کہ

مجھے وہ درسِ فرنگ آج یاد آتے ہیں کہاں حضور کی لذت کہاں حجابِ دلیل

اقبالؒ کی زندگی میں یہ مقام بڑا مشکل اور یہ دور ایا بڑا فیصلہ کن تھا۔ اگر اس کشمکش میں دماغ دل پر غالب آجاتا۔ اگر مملکتِ عشق میں عقل کی حکمرانی ہو جاتی۔ اگر فلسفہ کی دلیلیں ایمان کی بنیادوں کو متزلزل کر دیتیں۔ اگر زندگی کی سوداگرانہ مصلحت کوشیاں متاعِ فقر و قلندری کو خرید لیتیں، تو اس کے بعد نہ صرف یہ کہ اقبالؒ، اقبالؒ نہ ہوتا بلکہ نہ دنیا کے نقشے پر پاکستان کا وجود ہوتا اور نہ ہم آپ آج عشق و محبت کے ان جگر سوز افسانوں کو اس طرح دہراتے۔ نہ ملتِ اسلامیہ ہندیہ کا اپنا کوئی مستقر و مقام ہوتا اور نہ آج یہاں ایمان و قرآن کے انسانیت ساز تصورات کے چرچے ہوتے

اس نازک وقت میں خود اقبالؒ پر کیا گزر رہی تھی اس کا اندازہ وہی کر سکتا ہے جس پر کبھی یہ کیفیات خود وارد ہوئی ہوں۔ جب عقل و حکمت کی فسوں سازیاں اس کے لئے فریب نگاہ بننے کی کوشش کرتیں تو عشق و مستی کی رندانہ جرأت فرمائیاں عروسِ حقیقت کے حسین چہرے سے ذرا نقاب سرکا دیتیں۔ وہ حقیقت کی اس ایک جلیبی جھلک سے فریبِ عقل سے جھنجھلا کر منہ موڑ لیتا اور اثر درد میں ڈوبی ہوئی نولائے جگر گداز سے کہتا کہ

الٰہی عشقِ خجستہ پا کو ذرا سی دیوانگی سکھا دے
اسے ہے سودائے بخیہ کاری مجھے سر پیرہن نہیں ہے

اور کبھی بے تاب ہو کر دعائیں مانگتا کہ

عطا اسلاف کا جذبِ دروں کر شریکِ زمرۂ لَا یَحْزَنُوْن کر
خرد کی گتھیاں سلجھا چکا ہیں مرے مولا مجھے صاحبِ جنوں کر

مبدا فطرت کا یہ انداز عجیب ہے کہ جب تلاشِ حقیقت کی تڑپ و خلش انتہائی شدت اختیار کر لیتی ہے تو حقیقت اپنے چہرے سے خود آپ نقاب اٹھا دیتی ہے۔ یہی وہ مقام تھا جہاں نبی اکرمؐ سے فرمایا گیا کہ وَ وَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدٰى۔ ہم نے تمہیں تلاشِ حقیقت میں سرگرداں پایا تو منزلِ حیات کی طرف راہ نمائی کر دی۔ چنانچہ جو شخص بھی تلاشِ حقیقت میں سرگرداں رہتا ہے فطرت کا غیر مرئی ہاتھ اس کی راہ نمائی کر دیتا ہے۔ عام انسانوں کی صورت میں یہ راہ نمائی سُبل (پگڈنڈیوں) کی طرف ہوتی ہے۔ وَ الَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ؕ (۲۹/۶۹) لیکن رسول کی راہ نمائی صراطِ مستقیم یعنی زندگی کی متوازن شاہراہ کی طرف ہوتی ہے۔ پگڈنڈیوں پر چلنے والے اگر اپنا رُخ اس صراطِ مستقیم کی طرف کر لیں جس پر رسول گامزن ہوتا ہے تو ان کی پگڈنڈیاں بھی اسی شاہراہِ حیات سے جا ملتی ہیں ورنہ ان کاروانِ حیات فضائے عقل و خرد کے پیچ و خم میں گم ہو کر رہ جاتا ہے۔ جب تلاشِ حقیقت میں قلبِ اقبالؒ کی تپش و خلش بھی شدت تک پہنچ گئی تو اس فیصلہ کن لمحہ میں مبداء فیض کی کرم گستری سے اس کا قدم صحیح راستہ کی طرف اٹھ گیا۔ جب عقل کی شر انگیزیوں نے اسے چاروں طرف سے گھیر کر کہا کہ اس طلسم پیچ و تاب سے نکلنے کی راہ کون سی ہے تو وہ گھبرایا لیکن ایک ثانیہ میں اس کا دلِ پرسوز پکار اٹھا کہ

چارہ ایں است کہ عشق کشادے طلبیم　　　پیشِ او سجدہ گزاریم و مرادے طلبیم

اس جواب سے اقبالؒ کا وہ قلبِ بیتاب جو اس کشمکشِ خرد وجنوں سے سراپا اضطراب بن رہا تھا، ایمان ویقین کی طمانیت بخش آسودگی سے قرار وسکون کی جنت بن گیا۔ یہی وہ لمحہ تھا جس کی یاد میں وہ اس کیف ومستی سے پکار اٹھتا تھا کہ

جستجو جس گل کی تڑپاتی تھی اے بلبل مجھے　　　خوبیٔ قسمت سے آخر مل گیا وہ گل مجھے[1]

جس کا نتیجہ یہ ہے کہ

اب تاثر کے جہاں میں وہ پریشانی نہیں　　　اہلِ گلشن پر گراں میری غزل خوانی نہیں
قید میں آیا تو حاصل مجھ کو آزادی ہوئی　　　دل کے مٹ جانے سے میرے گھر کی آبادی ہوئی
ضو سے اس خورشید کی اختر مرا تابندہ ہے　　　چاندنی جس کے غبارِ راہ سے شرمندہ ہے

یک نظر کردی و آدابِ فنا آموختی
اے خنک روزے کہ خاشاکِ مرا در سوختی

اس سے اقبالؒ کے دل کو کس قدر یکسوئی نصیب ہوگئی اس کی خفیف سی جھلک اس نے اپنی اس نظم میں دکھائی ہے جو "حسن وعشق" کے عنوان سے "بانگِ درا" میں شامل ہے۔ مضمون کے علاوہ اس نظم میں حسنِ شعریت، تراکیب کی ندرت، تشبیہات کی موزونیت اور استعارات کی برجستگی دیکھئے اور پھر اندازہ لگائیے کہ ابتدا ہی سے فطرت نے اس حقائق شناس قلب کو اسلوبِ بیان بھی کس قدر حسین و دلکش عطا فرمایا تھا۔ (یہ ۱۹۰۵ء اور ۱۹۰۸ء کے درمیانی دور کی نظموں میں سے ہے) کہتے ہیں۔

جس طرح ڈوبتی ہے کشتیٔ سیمینِ قمر　　　نورِ خورشید کے طوفان میں ہنگامِ سحر
جیسے ہو جاتا ہے گم نور کا آنچل لیکر　　　چاندنی رات میں مہتاب کا ہم رنگ کنول
جلوۂ طور میں جیسے یدِ بیضائے کلیم　　　موجۂ نکہتِ گلزار میں غنچے کی شمیم

---

[1] عام طور پر کہا جاتا ہے کہ اس سے اقبالؒ کا اشارہ کسی اور طرف ہے لیکن جہاں تک میرے مضمون کا تعلق ہے خواص کو مطلب ہے گہر سے نہ صدف سے

ہے ترے سیلِ محبت میں یونہی دل میرا

ہے مرے باغِ سخن کے لئے تو بادِ بہار میرے بیتاب تخیل کو دیا تو نے قرار
جب سے آباد ترا عشق ہوا سینے میں نئے جوہر ہوئے پیدا مرے آئینے میں
حسن سے عشق کی فطرت کو ہے تحریکِ کمال تجھ سے سرسبز ہوئے میری امیدوں کے نہال

قافلہ ہو گیا آسودۂ منزل میرا

یہ عشق کی پہلی منزل تھی جس میں قرار و سکون ہی مدعائے حیات سمجھا جاتا ہے۔ اس کے بعد وہ منزل آئی جس میں شورش و حرارت مقصودِ کائنات نظر آتا ہے۔ عشق کی ان بلا انگیز شورشوں میں وہ لذت تھی کہ اقبالؒ اس حظ و کیف کے لئے قدم قدم پر **هل من مزید** کی دعائیں مانگتا اور عجیب رقص و مستی میں پکار اٹھتا تھا کہ

گیسوئے تابدار کو اور بھی تابدار کر ہوش و خرد شکار کر، قلب و نظر شکار کر!
عشق بھی ہو حجاب میں حسن بھی ہو حجاب میں یا تو خود آشکار ہو یا مجھے آشکار کر!

جب اقبالؒ کو اس کشمکشِ پیہم سے اس طرح فراغ نصیب ہو گیا تو اس نے عقل و خرد کے اس تمام دفترِ بے معنی پر جو اپنے آپ کو وجہِ قیامِ کائنات سمجھے ہوئے تھا ایک تبسم ریز نگاہ ڈالی اور اس سے اپنے مخصوص انداز میں کہہ دیا کہ

تیری متاعِ حیات، علم و ہنر کا سرور میری متاعِ حیات، ایک دلِ ناصبور

فلسفہ نے یہ سُنا تو اقبالؔ سے پوچھا کہ ذرا یہ تو بتایئے کہ اس آشفتہ سامانی اور چاک گریبانی کی منطقی توجیہہ کیا ہے۔ اقبالؔ نے ہنس کر کہا کہ

حکیم میری نواؤں کا راز کیا جانے ورائے عقل ہیں اہلِ جنوں کی تدبیریں

چلتے چلتے طبیعیات کی جھاڑیوں نے اس کا دامن الجھایا اور کہا کہ ذرا ٹھہریئے کہ آپ کو آغازِ حیات کا راز بتاؤں۔ اقبالؒ نے سُنا اور قلندرانہ استغناء کی شان سے جواب دیا کہ

خردمندوں سے کیا پوچھوں کہ میری ابتدا کیا ہے
کہ میں اس فکر میں رہتا ہوں میری انتہا کیا ہے

فلکیات نے کہا کہ میری رصدگاہوں سے فضائے آسمانی کی محیر العقول پہنائیوں اور ان میں تیرنے والے

تحیّر انگیز کرّوں کا تماشا نظر آئے گا۔ اس مردِ دانا نے سُنا اور ایک خندۂ زیرِ لبی سے جواب دیا کہ اب یہ لا انتہا وسعتیں میرے لئے کوئی حقیقت نہیں رکھتیں۔

عشق کی اِک جست نے طے کر دیا قصّہ تمام
اس زمین و آسماں کو بے کراں سمجھا تھا میں

○

منزل کا تعیّن

اقبالؒ کے سامنے جب مقصودِ حیات اس طرح واضح ہو گیا تو اس نے اپنے لئے مستقبل کا راستہ متعیّن کر لیا۔ اس کے سامنے عشق کے اس زندگی بخش پیغام کو تمام دنیا کے انسانوں میں عام کرنا تھا۔ یاد رکھئے۔ جیسا کہ میں آگے چل کر بتاؤں گا عشق سے اقبالؒ کی مرادوہ نظامِ ربوبیّت تھا جو وحی کی بنیادوں پر استوار ہوتا تھا اور جس کا مقصود نوعِ انسانی کی فطری صلاحیتوں کا کامل نشوو ارتقاء تھا۔ یہ نظام تمام انسانیت کے لئے تھا۔ لیکن اس کی ابتدا کسی ایسے خطّۂ زمین اور ایسے گروہ سے کی جا سکتی تھی جو اس پیغام کی عملی تشکیل کے لئے اوّلین خمیر بن سکے۔ اس نے جب اپنی قوم پر نگاہ ڈالی تو اسے یکسر راکھ کا ڈھیر پایا۔ بایں ہمہ اسے اس راکھ کے ڈھیر کے نیچے سے کچھ سلگتی ہوئی چنگاریاں بھی دکھائی دیں۔ اس نے تہیّہ کر لیا کہ وہ اپنی آتش نوائی سے اس راکھ کے ڈھیر کو شعلہ جوّالہ بنا کر اس سے نوعِ انسانی کے لئے زندگی کی حرارت کا کام لے گا۔ چنانچہ اس نے اپنے رفقاء کو اس پروگرام سے آگاہ کر دیا۔ عبد القادر مرحوم کے نام اپنے خط میں لکھتے ہیں:

اُٹھ کہ ظلمت ہوئی پیدا اُفقِ خاور پر　　بزم میں شعلہ نوائی سے اُجالا کر دیں
ایک فریاد ہے مانندِ سپند اپنی بساط　　اسی ہنگامے سے محفل تہ و بالا کر دیں
اہلِ محفل کو دکھا دیں اثرِ صیقلِ عشق　　سنگِ امروز کو آئینۂ فردا کر دیں
شمع کی طرح جئیں بزم گہ عالم میں
خود جلیں دیدۂ اغیار کو بینا کر دیں

بلکہ اس سے بھی زیادہ واضح اور متعیّن انداز سے کہ

گئے وہ ایّام اب زمانہ نہیں ہے صحرا نوردیوں کا　　جہاں میں مانندِ شمع سوزاں میانِ محفل گداز ہو جا

وجودِ افراد کا مجازی ہے ہستیِ قوم ہے حقیقی فدا ہو ملت پہ یعنی آتش زنِ طلسم مجاز ہو جا
یہ ہند کے فرقہ ساز اقبال آذری کر رہے ہیں گویا
بچا کے دامن بتوں سے اپنا غبارِ راہِ حجاز ہو جا

ان آرزوؤں اور دعاؤں، ان ولولوں اور تمناؤں کو دل میں لے کر اقبالؒ ہندوستان واپس آ گیا۔ گیا تو ایک مجموعۂ اضداد تھا واپس آیا تو ہمہ تن یک رنگ و یک آہنگ۔ گیا تو دل میں شکوک و شبہات کی ہزاروں پھانسیں لئے ہوئے۔ آیا تو اسے سکون و طمانیت کی جنت بنائے ہوئے۔ گیا تھا فلسفی بننے کے لئے، آیا تو نوعِ انسانی کے لئے پیامبر بن کر۔ گیا تھا سازِ عقل لے کر، آیا سوزِ عشق خرید کر، اور اس متاعِ سوز و ساز اور سرمایۂ تپش و گداز کو لے کر آیا۔ اُس برف آلود سرزمینِ مغرب سے جہاں عشق و ایمان کی رہی سہی چنگاریاں بھی بجھ جایا کرتی ہیں، گیا تھا تو وہ انداز تھا اور واپس آیا تو اس شان سے کہ کیف و مستی کی فضاؤں میں جھوم رہا ہے اور وجد و رقص کے عالم میں گنگنا رہا ہے کہ

یورپ سے واپسی

کافرِ ہندی ہوں میں، دیکھ مرا ذوق و شوق دل میں صلوٰۃ و درود، لب پہ صلوٰۃ و درود
شوق مری لَے میں ہے، شوق مری نے میں ہے نغمۂ اللہ ھُو میرے رگ و پے میں ہے

لیکن عشق و جنوں کی ان وادیوں میں پہنچ کر اقبالؒ نے عقل کو تیاگ نہیں دیا۔ اس لئے کہ عقل و خرد کو تیاگ دینا قرآن کا پیغام نہیں، رہبانیت کا مسلک ہے۔ قرآن کی رُو سے عقل اور وحی کا تعلق ایسا ہی ہے جیسے انسان کی آنکھ اور روشنی کا تعلق ہے۔ جو شخص اپنی آنکھ سے کام نہیں لیتا اس کے لئے روشنی کا عدم و وجود برابر ہے اور آنکھ بغیر روشنی کے بیکار ہے۔ لہٰذا قرآن کا پیغام عقل کو وحی کے تابع رکھنا اور ان دونوں کے امتزاج سے ایک نئی دنیا کی تعمیر کرنا ہے۔ چنانچہ عقل و عشق، خرد و جنوں، ذکر و فکر، خبر و نظر، علم و حضور کے اس حسین امتزاج کا نام تھا اقبالؒ جس نے کہا کہ

خرد نے مجھ کو عطا کی نظر حکیمانہ سکھائی عشق نے مجھ کو حدیثِ رندانہ

اور مشرق کو مغرب دونوں کو یہ پیغام دیا کہ

غربیاں را زیرکی سازِ حیات شرقیاں را عشق رازِ کائنات
زیرکی از عشق گردد حق شناس کارِ عشق از زیرکی محکم اساس

عشق چوں با زیرکی ہمبر شود　　نقشبندِ عالمِ دیگر شود
خیز و نقشِ عالمِ دیگر بنہ　　عشق را با زیرکی آمیزدہ

مغرب نے تنہا عقل کی ابلہ فریبیوں سے ساری دنیا کو قمار خانہ بنا رکھا تھا مشرق میں مُلّا اور صوفی کی کم نگہی نے اسلام جیسے انقلاب در آغوش نظامِ حیات کو بے نتیجہ رسوم کا مجموعہ اور محکومی و نا اُمیدی کے مسلکِ گوسفندی کا نقیب قرار دے رکھا تھا۔ اقبالؒ کے پیشِ نظر مشرق اور مغرب کے ان دونوں تصوّراتِ زندگی کے خلاف جنگ کرنا تھا۔ چونکہ فطرت نے اقبالؒ سے یہ بڑا کام لینا تھا اس لئے اسے اس مقصدِ عظیم کے لئے خاص طور پر تیار کیا گیا۔ فرشتوں کے نام خدا کے پیغام میں ہے کہ

تہذیبِ نوی کارگہِ شیشہ گراں ہے　　آدابِ جنوں شاعرِ مشرق کو سکھا دو!

اور انہی آداب و جنوں کا اثر تھا کہ اس نے تہذیبِ حاضر کے اس نگاہ فریب طلسم کو توڑ کر رکھ دیا۔

فرنگی شیشہ گر کے فن سے پتھر ہو گئے پانی　　مری اکسیر نے شیشے کو بخشی سختیِ خارا

لیکن تہذیبِ نو کے اس سیلاب سے کہیں زیادہ ہلاکت انگیز خود اپنے ہاں کے مکتب و خانقاہیت کی تعلیم تھی جس کے خلاف اقبالؒ کو مسلسل جہاد کرنا تھا۔ اس کے لئے اس نے متلاشیانِ حقیقت کو پکار کر کہا کہ

مرے کدو کو غنیمت سمجھ کہ بادۂ ناب　　نہ مدرسے میں ہے باقی نہ خانقاہ میں ہے

وہ ان سے بار بار کہتا کہ

رہ و رسمِ حرم نامحرمانہ　　کلیسا کی ادا سوداگرانہ
تبرک ہے مرا پیراہنِ چاک　　نہیں اہلِ جنوں کا یہ زمانہ

اس نے دیکھا کہ مدّعیانِ علمِ شریعت انسانی زندگی کے ابتدائی مسائل تک سے ناواقف ہیں اس لئے ان کے لئے قطعاً ناممکن ہے کہ وہ مقامِ کبریا کو پہچان سکیں۔ اس نے مُلّا سے برملا کہا کہ ؎

عجب نہیں کہ خدا تک تری رسائی ہو　　تری نگہ سے ہے پوشیدہ آدمی کا مقام
تری نماز میں باقی جلال ہے نہ جمال　　تری اذاں میں نہیں ہے مری سحر کا پیام

جب اربابِ شریعت و طریقت کی سطح بین نگاہیں اس کے حقیقت رس پیغام پر تنقید کرتیں تو وہ اپنے مخصوص انداز میں مسکراتا اور بے نیازانہ کہہ دیتا کہ یہ بیچارے معذور ہیں اس لئے معاف کر دینے کے قابل۔ یہ نہیں جانتے کہ میں کیا کہتا ہوں اور کس مقام سے کہتا ہوں۔

کیا صوفی و مُلّا کو خبر میرے جنوں کی ان کا سرِ دامن بھی ابھی چاک نہیں ہے

لیکن جاننے والی نگاہیں جانتی تھیں کہ یہ دانندۂ اسرارِ حقیقت کیا کہتا ہے۔ وہ ایک دوسرے سے ملتے اور اعتراف کرتے کہ

رازِ حرم سے شاید اقبال باخبر ہے ہیں اس کی گفتگو کے انداز محرمانہ

وہ جانتا تھا کہ ہماری مروجہ شریعت اور طریقت دونوں کے مستعار تصورات اسلام کے عجمی ایڈیشن ہیں جن پر صرف ڈسٹ کور (DUST COVER) قرآن کا ہے۔ اسے خوب معلوم تھا کہ یہ عجمی نظریاتِ زندگی فکرِ اسلامی کے شجرِ طیب پر اکاس بیل کی طرح مسلط ہیں۔ جب تک اس اکاس بیل کو الگ نہیں کیا جائے گا، شجرِ ملت کبھی سرسبز و شاداب نہیں ہو سکے گا۔ اس لئے وہ پوچھنے والوں سے کہتا کہ

کئے ہیں فاش رموزِ قلندری میں نے کہ فکرِ مدرسہ و خانقاہ ہو آزاد

ظاہر ہے کہ ایسے انقلاب آفریں پیغام کی ہر طرف سے مخالفت ہونی تھی۔ لیکن اس نے اس کی مخالفت کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اپنی آتش نوائی کو مسلسل جاری رکھا اور اس طرح رفتہ رفتہ فضائے ملت اس کی آہِ نیم شبی اور نالۂ سحری سے اثر پذیر ہوتی چلی گئی۔ اسی حقیقت کے پیشِ نظر اس نے کہا تھا کہ

مری نوا سے ہوئے زندہ عارف و عامی دیا ہے میں نے انہیں ذوقِ آتش آشامی

لیکن اس کے باوجود اس کی قوم جس خوابِ گراں میں سو رہی تھی اسے اس سے جگانا کچھ آسان کام نہ تھا۔ ہزار برس سے گاڑی زندگی کی صراطِ مستقیم چھوڑ کر دوسری پٹڑی پر چلی جا رہی تھی۔ اسے اس مقام سے واپس لا کر پھر سے صحیح لائن پر ڈالنا آفتابِ مغرب کی طنابیں کھینچ کر اسے سوئے مشرق لانا تھا۔ اسے خدا سے شکایت ہی یہ تھی کہ

میں بندۂ ناداں ہوں مگر شکر ہے تیرا رکھتا ہوں نہاں خانۂ لاہوت سے پیوند

اک ولولۂ تازہ دیا میں نے دلوں کو لاہور سے تا خاکِ بخارا و سمر قند
تاثیر یہ ہے میرے نفس کی کہ خزاں میں مرغانِ سحر خواں مری صحبت میں ہیں خورسند
لیکن مجھے پیدا کیا اس دیس میں تو نے
جس دیس کے بندے ہیں غلامی پہ رضامند

آزادی کا پیغام

واضح رہے کہ اقبالؒ کے نزدیک آزادی سے مفہوم یہ نہیں تھا کہ انگریزوں کی بجائے حکومت ہمارے ہاتھ میں آجائے۔ بلکہ یہ کہ اس خطۂ زمین کے مسلمان انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین کی بجائے ضابطۂ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کریں۔ اسی مقصد کے لئے اس نے ملتِ اسلامیہ کو پاکستان کا تصور دیا تھا۔ لیکن قوم نے اس وقت اس تصور کو ایک شاعر کا افسانوی تخیل سمجھ کر اس پر غور و فکر کی بھی ضرورت نہ سمجھی۔ ایک طرف اپنی قوم کا یہ عالم تھا اور دوسری طرف مخالف قوتیں برق رفتاری کے ساتھ چاروں طرف سے ہجوم کرکے اُمنڈے چلی آرہی تھیں۔ حالات ایسے ناساعد تھے۔ لیکن بایں ہمہ وہ اس سیلابِ بلا انگیز میں روشنی کے مینار کی طرح کھڑا تھا کہ زمانہ کی تلاطم انگیز موجیں آئیں اور اپنا سر پھوڑ کر واپس چلی جائیں۔ یہی تھے وہ حالات جن کے متعلق اس نے کہا تھا کہ

ہوا ہے گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے
وہ مردِ درویش جس کو حق نے دیئے ہیں اندازِ خسروانہ

ان ناموافق حالات میں ہمراہانِ سست عناصر اسے مایوسیوں کے چھلاوے سے ڈراتے اور ٹھنڈی سانس بھر کر کہتے کہ

ہر نفس اقبالؔ تیرا آہ میں مستور ہے سینۂ سوزاں ترا فریاد سے معمور ہے
قصۂ گل ہمنوایانِ چمن سنتے نہیں اہلِ محفل تیرا پیغامِ کہن سنتے نہیں
زندہ پھر وہ محفلِ دیرینہ ہو سکتی نہیں شمع سے روشن شبِ دوشینہ ہو سکتی نہیں

تو اس کا چہرہ تمتما اٹھتا۔ پیشانی جوشِ حمیت سے شفق آلود ہو جاتی۔ وہ امیدوں کی ایک دنیا اپنے جلو میں لئے اٹھتا اور عزم و یقین کی پوری قوتوں سے کہتا کہ

ہمنشیں! مسلم ہوں میں توحید کا حامل ہوں میں اس صداقت پر ازل سے شاہدِ عادل ہوں میں

نبضِ موجودات میں پیدا حرارت اس سے ہے　　اور مسلم کے تخیل میں جسارت اس سے ہے
حق نے عالم اس صداقت کے لئے پیدا کیا　　اور مجھے اس کی حفاظت کے لئے پیدا کیا
میری ہستی، پیرہنِ عریانیِ عالم کی ہے　　میرے مٹ جانے سے رسوائی بنی آدم کی ہے
کب ڈرا سکتا ہے غم کا عارضی منظر مجھے　　ہے بھروسہ اپنی ملت کے مقدر پر مجھے
ہاں یہ سچ ہے چشم بر عہدِ کہن رہتا ہوں میں　　اہلِ محفل سے پرانی داستاں کہتا ہوں میں
یادِ عہدِ رفتہ میری خاک کو اکسیر ہے　　میرا ماضی میرے استقبال کی تفسیر ہے

سامنے رکھتا ہوں اس دورِ نشاط افزا کو میں
دیکھتا ہوں دوش کے آئینے میں فردا کو میں

وہ جانتا تھا کہ نااُمیدیوں کے چھلاوے سے ڈرانے والے وہ ہیں کہ مدت ہائے دراز سے تقلید اور بے عملی کے حیات سوز اثرات ان کی ہڈیوں کے گودے تک میں سرایت کر چکے ہیں اور وہ اپنی زندگی میں خفیف سی تبدیلی کے تصور تک سے گھبرا اٹھتے ہیں۔ وہ ان پیرانِ کہن سے کوئی توقع نہیں رکھتا تھا۔ اس لئے وہ اپنے پیغام کا حقیقی مخاطب ان نوجوانوں کو سمجھتا تھا جن کے قلب و نگاہ کی تبدیلی قوموں کی تقدیریں بدل دیا کرتی ہے۔ انہی کو وہ اپنی متاعِ سوز و گداز کا وارث سمجھتا اور انہی کے لئے راتوں کو اٹھ اٹھ دعائیں مانگا کرتا تھا کہ

شرابِ کہن پھر پلا ساقیا　　وہی جام گردش میں لا ساقیا
خرد کو غلامی سے آزاد کر!　　جوانوں کو پیروں کا استاد کر!
تڑپنے پھڑکنے کی توفیق دے!　　دلِ مرتضیٰؓ، سوزِ صدیقؓ دے!
ترے آسمانوں کے تاروں کی خیر!　　زمینوں کے شب زندہ داروں کی خیر!
جوانوں کو سوزِ جگر بخش دے　　مرا عشق میری نظر بخش دے
مرے دیدۂ تر کی بے خوابیاں!　　مرے دل کی پوشیدہ بیتابیاں!
مرے نالۂ نیم شب کا نیاز!　　مری خلوت و انجمن کا گداز
امنگیں مری، آرزوئیں مری!　　امیدیں مری جستجوئیں مری!
یہی کچھ ہے ساقی متاعِ فقیر!　　اسی سے فقیری میں ہوں میں امیر!

مرے قافلے میں لٹا دے اسے!
لٹا دے ٹھکانے لگا دے اسے!

ملت کے مستقبل کا یہی غمِ پنہاں تھا جس نے اقبالؒ پر راتوں کی نیند حرام کر رکھی تھی۔ علی بخش[1] کا بیان ہے کہ جن دنوں آپ کی طبیعت زیادہ خراب تھی۔ ایک رات پچھلے پہر میں نے سنا کہ پلنگ سے سسکیوں کی آواز آرہی ہے۔ چپکے سے قریب گیا تو دیکھا کہ آپ تکیہ پر کہنیاں ٹیکے دونوں ہاتھوں سے سر تھامے بیٹھے ہیں اور زار و قطار رو رہے ہیں۔ رو رہے اور گنگنا رہے ہیں کہ

مجھے آہ و فغانِ نیم شب کا پھر پیام آیا　　تھم اے رہرو کہ شاید پھر کوئی مشکل مقام آیا

اسی غزل کے دو شعر اور بھی سنئے۔ فرماتے ہیں:۔

ذرا تقدیر کی گہرائیوں میں ڈوب جا تو بھی　　کہ اس جنگاہ سے میں بن کے تیغِ بے نیام آیا
چل اے میری غریبی کا تماشہ دیکھنے والے　　وہ محفل اٹھ گئی جس دم تو مجھ تک دورِ جام آیا

علالت

علی الصباح حسبِ معمول حکیم صاحب آئے۔ دیکھا تو رنگ معمول سے زیادہ زرد ہے اور چہرہ پہلے سے زیادہ افسردہ۔ آنکھیں سوج رہی ہیں اور کمزوری بڑھ گئی ہے۔ کیفیتِ مزاج پوچھی تو آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے اور بمشکل اتنا کہہ سکے کہ

کس سے کہوں کہ زہر ہے میرے لئے مئے حیات
کہنہ ہے بزمِ کائنات تازہ ہیں میرے واردات

حکیم صاحب نے ہلکے سے تبسم سے کہا کہ آپ تو دنیا بھر کے مسائل کا حل دوسروں کو بتاتے رہتے ہیں، اپنی مشکل کا حل کیوں نہیں تلاش کر پاتے۔ انہوں نے بھی اسی انداز کے تبسم زیرِ لبی سے فرمایا کہ کیا کہوں!

مقامِ ہوش سے آساں گزر گیا اقبالؔ　　مقامِ شوق میں کھو یا گیا یہ دیوانہ

حکیم صاحب نے پوچھا کہ بالآخر وہ کونسی بات ہے جس کا غم آپ کو اس طرح نڈھال کئے جا رہا ہے۔ کہا کہ حکیم صاحب آپ دیکھتے نہیں کہ

---

[1] اقبالؒ کا فدائی جو دنیا میں عام طور پر اقبالؒ کے ملازم کی حیثیت سے متعارف ہے لیکن جو درحقیقت اقبالؒ کا عاشق تھا اور اس عشق کو آج تک زندہ رکھے ہوئے ہے۔ (اب اس کا بھی انتقال ہو چکا ہے)۔

جلوتیانِ مدرسہ کور نگاہ و مُردہ ذوق   خلوتیانِ میکدہ کم طلب و تہی کدو
بس کہ میری غزل میں ہے آتشِ رفتہ کا سراغ   میری تمام سرگذشت کھوئے ہوؤں کی جستجو

حکیم صاحب نے کہا کہ آپ کا مرض زیادہ تشویشناک ہوتا جارہا ہے۔ آپ کو کچھ دنوں کے لئے ان تفکرات کو چھوڑنا ہوگا۔ انہوں نے ایک ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا کہ حکیم صاحب! میں جانتا ہوں کہ

پھونک ڈالا ہے مری آتش نوائی نے مجھے

لیکن یہ بھی تو حقیقت ہے کہ

اور میری زندگانی کا یہی ساماں بھی ہے

اتنے میں ڈاک آگئی۔ دیکھا تو اس میں ایک خط ایسے فلسفہ زدہ نوجوان کا تھا جس کے والد سے آپ کے دیرینہ مراسم تھے۔ اس نے، جیسا کہ فلسفہ کے ابتدائی مراحل میں، جب کہ طالب علم کے افکار میں ہنوز پختگی نہیں آتی، اکثر ہوتا ہے، نفسِ انسانی؛ وحی، حیات بعد الممات، مستقل اقدار وغیرہ تصورات پر نہایت طنز آمیز اعتراضات کئے تھے۔ آپ نے خط پڑھ کر پنسل اٹھائی اور اس کی پشت پر لکھ دیا کہ :۔

میں اصل کا خاص سومناتی   آبا مرے لاتی و مناتی
تو سیدِ ہاشمی کی اولاد   میری کفِ خاک برہمن زاد!
ہے فلسفہ میرے آب و گِل میں   پوشیدہ ہے ریشہ ہائے دل میں
اقبالؔ اگرچہ بے ہنر ہے   اس کی رگ رگ سے باخبر ہے
شعلہ ہے ترے جنوں کا بے سوز   سُن مجھ سے یہ نکتۂ دل افروز
افکار کے نغمہ ہائے بے صوت   ہیں ذوقِ طلب کے واسطے موت
دیں مسلکِ زندگی کی تقویم   دیں سرِ محمدؐ و ابراہیمؑ
دل در سخنِ محمدی بند   اے پورِ علیؓ ز بوعلی چند

ابھی اس خط کا جواب ختم نہیں ہونے پایا تھا کہ لاہور کے ایک مشہور روزنامہ کے مدیر جن کا شمار آپ کے حلقۂ ارادت مندان میں ہوتا تھا، اندر آگئے۔ خیریتِ مزاج کے بعد کہا کہ آپ نے دیکھا ہے کہ آپ کے حالیہ بیان پر فلاں اخبار کے ایڈیٹر نے کیسے رکیک حملے کئے ہیں۔ آپ مسکرائے اور کہا کہ میں نے

دیکھا تو نہیں کل شام فلاں صاحب سے سنا ضرور تھا۔ انہوں نے جھجکتے ہوئے پوچھا کہ کیا آپ کوئی جواب لکھیں گے۔ آپ نے اس کی طرف مڑ کر دیکھا اور کہا کہ بھائی! میں ان جھمیلوں میں کبھی نہیں الجھتا۔ آپ مجھے جانتے ہیں کہ:

درویش خدامست نہ شرقی ہے نہ غربی　　گھر میرا نہ دلی نہ صفاہاں نہ سمرقند
کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق　　نے ابلۂ مسجد ہوں نہ تہذیب کا فرزند
اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش　　میں زہرِ ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند
ہوں آتشِ نمرود کے شعلوں میں بھی خاموش　　میں بندۂ مومن ہوں نہیں دانۂ اسپند
پُرسوز و نظر باز و نکوبین و کم آزار　　آزاد و گرفتار و تہی کیسہ و خورسند
ہر حال میں میرا دلِ بے قید ہے خرم　　کیا چھینے گا غنچے سے کوئی ذوقِ شکر خند

حتیٰ کہ میرا تو یہ عالم ہے کہ

چپ رہ نہ سکا حضرتِ یزداں میں بھی اقبال　　کرتا کوئی اس بندۂ گستاخ کا منہ بند

صحافی نے کہا کہ درحقیقت یہ ایک سازش ہے دو قوموں کے اس نظریہ کے خلاف جس کا تصور آپ نے پیش کیا ہے اور جس کی رُو سے مسلمانانِ ہند کو اپنے مستقبل کے لئے ایک واضح اور درخشندہ نصب العین مل گیا ہے۔ آپ نے پھر مسکرا کر فرمایا کہ سازش ہے تو ہوا کرے، مجھے اس کی کیا پرواہ ہے؟

رہے ہیں اور ہیں فرعون میری گھات میں اب تک　　مگر کیا غم کہ میری آستیں میں ہے یدِ بیضا

بعد سہ پہر حسبِ معمول پھر ملنے والوں کا اجتماع ہوا۔ دنیا بھر کے مسائل پر گفتگو ہوتی رہی۔ ایک صاحب نے کہا کہ (مولانا) حسین احمد مدنی نے آپ کے اشعار کے جواب میں جو بیان دیا ہے وہ آپ کی نظروں سے گزرا۔ فرمایا کہ ہاں میں نے دیکھا ہے۔ اس نے کہا کہ مولوی صاحب نے قوم اور ملت کے متعلق جو لفظی بحث چھیڑی ہے آپ اس کا کچھ جواب دیں گے؟ فرمایا کہ

معرکۂ دین و وطن

قلندر جز دو حرفِ لا الٰہ کچھ بھی نہیں رکھتا　　فقیہہ شہر قاروں ہے لغت ہائے حجازی کا
حدیثِ بادہ و مینا و جام آتی نہیں مجھ کو　　نہ کر خارا شگافوں سے تقاضا شیشہ سازی کا

پھر حقہ کا کش لگایا اور مسکراتے ہوئے فرمایا کہ:

کہاں سے تو نے اے اقبال سیکھی ہے یہ درویشی
کہ چرچا پادشاہوں میں ہے تیری بے نیازی کا

آپ کے حلقۂ احباب میں بعض لوگ ایسے بھی تھے جنہیں ہمیشہ اس بات کا قلق رہتا کہ نالائق اور جاہل لوگ بڑے بڑے مناصب و مدارج حاصل کئے جاتے ہیں اور آپ ہیں کہ جن کی قابلیت کا سکہ ساری دنیا مان رہی ہے لیکن اس طرح ایک گوشے میں پڑے ہیں۔ وہ آتے اور آپ سے کہتے کہ فلاں اسامی خالی ہو رہی ہے۔ آپ اپنی آمادگی ظاہر کر دیجئے فوراً کامیابی ہو جائے گی۔ آپ ان مخلص بہی خواہوں کی سادگی پر مسکراتے اور جی ہی جی میں کہتے میں انہیں کس طرح بتاؤں کہ مبدأ فیض کی عنایاتِ خسروانہ نے مجھے کیا عطا کیا ہے اور یہ مجھے کس طرف بلا رہے ہیں۔ وہ زیادہ اصرار کرتے تو آپ ان سے کہتے کہ:-

فطرت نے نہ بخشا مجھے اندیشۂ چالاک
رکھتی ہے مگر طاقتِ پرواز مری خاک
وہ خاک کہ ہے جس کا جنوں صیقلِ ادراک
وہ خاک کہ جبریل کی ہے جس سے قبا چاک
وہ خاک کہ پروائے نشیمن نہیں رکھتی
چنتی نہیں پہنائے چمن سے خس و خاشاک
اس خاک کو اللہ نے بخشے ہیں وہ آنسو
کرتی ہے چمک جن کی ستاروں کو عرقناک

جاوید جاوید سے آپ کو بہت محبت تھی۔ وہ ابھی بچہ تھا لیکن اس سے آپ بڑے کام کی باتیں کیا کرتے تھے۔ ایک دن اس نے پوچھا کہ ابا جان! آپ کے پاس نہ اچھے اچھے کپڑے ہیں نہ قیمتی صوفے اور قالین۔ نہ بہت سے نوکر چاکر ہیں نہ موٹر ہی ہے لیکن آپ کے پاس بڑے بڑے لوگ آتے ہیں۔ یہ آپ کی اتنی عزت کیوں کرتے ہیں۔ آپ نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور کہا کہ بیٹا!

ہے میری بساط کیا جہاں میں
بس ایک فغانِ زیر بامی
اک صدقِ مقال ہے کہ جس سے
میں چشمِ جہاں میں ہوں گرامی

جب آپ لندن گئے ہیں تو جاوید نے پہلا خط اپنے ہاتھ سے لکھ کر بھیجا۔ اس کے جواب میں آپ نے اسے لکھا کہ

دیارِ عشق میں اپنا مقام پیدا کر
نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کر

خدا اگر دلِ فطرت شناس دے تجھ کو　　سکوتِ لالہ و گل سے کلام پیدا کر
میں شاخِ تاک ہوں میری غزل ہے میرا ثمر　　مرے ثمر سے مئے لالہ فام پیدا کر
میرا طریق امیری نہیں فقیری ہے　　خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر

زمانہ آگے بڑھتا گیا اور اس کے ساتھ ہی اقبالؒ کے پیغام کی تندی اور تیزی بھی شدت اختیار کرتی چلی گئی۔ اس کی نگہِ بصیرت دیکھ رہی تھی کہ دنیا میں کیا ہونے والا ہے اور اس کی بساطِ سیاست پر مسلمان کس طرح پٹ رہا ہے۔ اس آنے والے انقلاب کے تصور سے جوں جوں اس کا احساس شدید ہوتا جاتا اس کی نوا کی تلخی بھی تیز ہوتی جاتی۔ اقبالؒ کے پیشِ نظر پوری انسانیت کے اندر ایک ایسا انقلاب برپا کرنا تھا جس سے یہ زمین بدل جائے، یہ آسمان بدل جائے اور خاکِ آدم کو وہ نمود حاصل ہو جس کے لئے اسے اس طرح سنوارا گیا تھا۔ انقلاب آفرینی کا یہی وہ جذبہ تھا جس کے متعلق اقبالؒ نے کہا ہے کہ

حضورِ حق میں اسرافیل نے میری شکایت کی　　یہ بندہ وقت سے پہلے قیامت کر نہ دے پیدا
ندا آئی کہ آشوبِ قیامت سے یہ کیا کم ہے　　گرفتہ چینیاں احرام و مکی خفتہ در بطحا!

دوسرے مقام پر کہتے ہیں کہ

کی حق سے فرشتوں نے اقبال کی غمازی　　گستاخ ہے کرتا ہے فطرت کی حنا بندی
خاکی ہے مگر اس کے انداز ہیں افلاکی　　رومی ہے نہ شامی ہے کاشی نہ سمرقندی
سکھلائی فرشتوں کو آدم کی تڑپ اس نے　　آدم کو سکھاتا ہے آدابِ خداوندی

ادھر آسمان پر تو یہ باتیں ہو رہی تھیں لیکن ادھر زمین والے ہنوز یہی طے نہیں کر پائے تھے کہ اقبالؒ جو کچھ کہتا ہے اس کا سرچشمہ کیا ہے؟ کوئی کہتا کہ اس کے کلام میں سوز و گداز اور کیف و مستی کے تذکرے ان نقوش کے اثرات کا نتیجہ ہیں جو بچپن کی مشرقی تعلیم اور تصوف آمیز ماحول نے اس کے تحت الشعور میں مرتسم کر رکھے ہیں۔ کوئی کہتا کہ ان کی فکر نیٹشے، برگسان، ایگزینڈر، وارڈ، جیمز جیسے مغربی مفکرین کے فلسفہ کی رہینِ منت ہے۔ اقبالؒ یہ سب کچھ سنتا اور ان سادہ لوح معترضین سے کہتا کہ جب تم اس منبع علم و یقین سے آشنا نہیں ہو جو میری فکر کا سرچشمہ ہے تو اس باب میں قیاس آرائیاں کیوں کرتے ہو؟

سرچشمۂ پیغامِ اقبالؒ

میری فکر نہ مشرقی مکتب و خانقاہ سے متاثر ہے نہ مغربی حکمت و فلسفہ کی منت پذیر۔

نہ فلسفی سے نہ مُلّا سے ہے غرض میری
یہ دل کی موت وہ اندیشہ و نظر کا فساد

میں نے مشرق و مغرب دونوں کے علوم و فنون کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ ان میں مجھے حقیقت کا سراغ سراغ نہیں ملا۔

بہت دیکھے ہیں میں نے مشرق و مغرب کے میخانے
یہاں ساقی نہیں پیدا وہاں بے ذوق ہے صہبا

میری فکر کسی سے بھی متاثر نہیں۔ میں نے کسی چیز کو تقلیداً دیکھا ہی نہیں بلکہ ہر شے کو از خود پرکھا ہے اور اپنے نتائج آپ مستنبط کئے ہیں۔

میانِ آب و گل خلوت گزیدم — ز افلاطون و فارابی بریدم
نکردم از کسے دریوزۂ چشم — جہاں را جز بہ چشمِ خود ندیدم

یہی میرا مسلک ہے جس سے اب کیفیت یہ پیدا ہو چکی ہے کہ لاکھ پردوں میں چھپی ہوئی حقیقت میری نگہِ تجسس کے سامنے از خود بے نقاب ہو جاتی ہے۔ کیا تم نے سنا نہیں کہ

اقبالؒ نے کل اہلِ خیاباں کو سنایا — یہ شعر نشاط آور و پُرسوز و طربناک
میں صورتِ گل دستِ صبا کا نہیں محتاج — کرتا ہے مرا جوشِ جنوں میری قبا چاک

یہی وہ حقیقت کشائی ہے جس سے میری دیدہ وری کا یہ عالم ہے کہ

حادثہ وہ جو ابھی پردۂ افلاک میں ہے
عکس اس کا مرے آئینۂ ادراک میں ہے

چنانچہ وہ جہانِ فردا جس کے انتظار میں آسمان کے تاروں کی آنکھیں ایک مدت سے محرومِ خواب ہیں، میرا پیغام اس کے لئے طائرِ پیش رس ہے۔

عالمِ نو ہے ابھی پردۂ تقدیر میں — میری نواؤں میں ہے اس کی سحر بے حجاب

لہٰذا، اس عالمِ ہست و بود کی حقیقت صرف اس پر کھل سکتی ہے جس کی سمجھ میں میرا پیغام آجائے۔

نظر آئے گا اُسی کو یہ جہانِ دوش و فردا
جسے آ گئی میسر مری شوخیِٔ نظارا

لوگ سمجھتے ہیں کہ اقبالؒ جاوید منزل میں پلنگ پر لیٹے حقہ پیتا رہتا ہے اور شاعری کرتا رہتا۔ انہیں کیا خبر کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔

مرے ہمصفیر اسے بھی اثرِ بہار سمجھے!
انہیں کیا خبر کہ کیا ہے یہ نوائے عاشقانہ

شاعری نہیں

یہ شاعری نہیں، نہ ہی شاعری کسی پیغام بر کے شایانِ شان ہوتی ہے۔ جس کے سامنے زندگی کا نصب العین متعین ہو۔ اس کا ہر قدم اُسی نصب العین کی طرف اٹھ رہا ہو اور اس لئے وہ ہر مخاطب کو اسی منزل کی طرف دعوت دے رہا ہو، اسے شاعری سے کیا واسطہ!

مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ　　　کہ میں ہوں محرمِ رازِ درونِ مے خانہ

یہ وہی "رازِ درونِ میخانہ" تھے جن کے متعلق میں نے زبورِ عجم میں کہا ہے کہ

زبرونِ در گذشتم ز درونِ خانہ گفتم
سخنے نگفتہ را چہ قلندرانہ گفتم

تم اسے شاعری سمجھتے ہو اور میں شاعری کو اپنے خلاف تہمت خیال کرتا ہوں۔

نہ پنداری کہ من بے بادہ بستم　　　مثالِ شاعراں افسانہ بستم
نہ بینی خیر ازاں مردِ فرودست　　　کہ بر ما تہمتِ شعر و سخن بست

تم اسے حُسن و شباب کے رنگین افسانے سمجھتے ہو۔ تم اسے عہدِ کہن کی خواب آور داستانیں تصوّر کرتے ہو۔ تم یہی سمجھے بیٹھے ہو کہ یہ گل و بلبل کی فرضی کہانیاں ہیں۔ تمہارا اندازہ یہی ہے کہ یہ ایک شاعر کی دنیائے تصوّرات کی پریشاں خیالیاں ہیں۔ اگر تمہارا یہی اندازہ ہے تو کس قدر غلط ہے تمہارا یہ اندازہ۔ اگر تمہارا یہی خیال ہے تو کس قدر باطل ہے تمہارا یہ خیال۔ اگر تم جاننا چاہتے ہو کہ جو کچھ میں کہتا ہوں وہ درحقیقت ہے کیا تو آؤ میرے مئے سخن کے پیالے میں جھانک کر دیکھو کہ اس میں کیا نظر آتا ہے؟

دو عالم را تواں دیدن بہ مینائے کہ من دارم کجا چشمے کہ بیند آں تماشائے کہ من دارم
دگر دیوانہ آید کہ در شہر انگند ہوئے دو صد ہنگامہ برخیزد ز سودائے کہ من دارم
مخور ناداں غم از تاریکئ شبہا کہ می آید کہ چوں انجم درخشد داغ سیمائے کہ من دارم
ندیم خویش می سازی مرا لیکن ازاں ترسم
نداری تاب آں آشوب و غوغائے کہ من دارم

سننے والے یہ سب کچھ سنتے لیکن ان کی سمجھ میں پھر بھی نہیں آتا تھا کہ اگر یہ خیالات نہ فکرِ مغرب سے مستعار لئے ہیں نہ تصوّراتِ مشرق سے۔ نہ یہ مکتب کی زلہ چینی ہے نہ خانقاہ کی دریوزہ گری۔ نہ یہ شاعری ہے نہ افسانہ طرازی۔ تو پھر بالآخر ان تصوّراتِ حیات کا سرچشمہ کیا ہے۔ وہ مردِ خود آگاہ و خدامست یہ کچھ سنتا اور کہتا کہ آؤ تمہیں بتاؤں کہ میرے انقلاب بردوش پیغام کا سرچشمہ کیا ہے۔ اس کا سرچشمہ ہے۔

قرآن

آں کتابِ زندہ قرآنِ حکیم حکمتِ او لایزال است و قدیم
نسخۂ اسرارِ تکوینِ حیات بے ثبات از قوتش گیرد ثبات

میں نے عمر بھر اسی شمع عالمتاب سے اکتسابِ ضیا کیا ہے۔ اسی یم ناپید اکنار سے حکمت کے موتی نکالے ہیں۔

گوہرِ دریائے قرآں سفتہ ام شرحِ رمزِ صبغۃ اللہ گفتہ ام

اس لئے

از تب و تابم نصیبِ خود بگیر بعد ازیں ناید چو من مردِ فقیر

لیکن سننے والے کہتے کہ اس قرآن کو تو ہم ہر روز پڑھتے ہیں۔ اس کی تفسیریں بھی دیکھتے ہیں۔ ہمیں تو اس میں یہ کچھ نظر نہیں آتا۔ وہ دانائے راز ان سادہ لوحوں کی یہ باتیں سنتا اور کہتا کہ قرآن اپنے آپ کو اس طرح بے نقاب نہیں کیا کرتا۔ اس کے سمجھنے کے انداز کچھ اور ہی ہیں۔

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحبِ کشاف

اس لئے

چوں مسلماناں اگر داری جگر　　　　در ضمیرِ خویش و در قرآں نگر

برادران! یہ ہے وہ اقبالؒ جس نے کہا تھا کہ

چو رختِ خویش بربستم ازیں خاک　　　　ہمہ گفتند با ما آشنا بود
ولیکن کس ندانست ایں مسافر　　　　چہ گفت و با کہ گفت و از کجا بود

میں نے بھی اسی اقبال کی تلاش میں ساری عمر گزار دی. اسے مختلف وادیوں اور متنوع شاہراہوں میں ڈھونڈتا رہا. لیکن آخرالامر قرآن ہی سے اس کی راہ اور منزل کا سراغ پایا.

اسی اقبالؒ کی میں جستجو کرتا رہا برسوں
بڑی مدّت کے بعد آخر یہ شاہیں زیرِ دام آیا

اے کشتۂ سلطانی و ملائی و پیری

یومِ اقبالؒ - اپریل ۱۹۶۷ء کی تقریر

آپ نوعِ انسانی کی تاریخ پر غور کیجئے۔ جس زمانہ میں، جس ملک میں اور جس قوم میں آپ کو فسادِ آدمیت کی جھلک نظر آئے، تحقیق کے بعد معلوم ہوگا کہ اس فساد انگیزی کے عوامل وعناصر تین ہی تھے۔ یعنی ملوکیت، مذہبی پیشوائیت اور سرمایہ داری ــــ زمانے کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ یہ ابالیسِ دہر اپنا پیکر بدلتے رہیں گے۔ لیکن روح ہر زمان اور ہر مکان میں وہی کارفرما رہے گی۔ اگر آپ قرآنِ کریم پر بہ نگاہِ تعمق غور کریں گے تو یہ حقیقت اُبھر کر سامنے آجائے گی کہ حضرات انبیاء کرامؑ کی دعوت، انہی فساد انگیز عناصر کے خلاف، نعرۂ انقلاب تھی۔ وہ انسانوں کو نظامِ خداوندی کے مرکز پر جمع کرتے تاکہ ملوکیت، مذہبی پیشوائیت اور سرمایہ داری کے تختوں کو الٹ دیا جائے انبیائے گزشتہ کے کوائف اور امم سابقہ کی داستانیں، جو قرآن میں مذکور ہیں، وہ اسی کشمکش کی سرگذشت اور اسی انقلابی جدوجہد کی تفاصیل ہیں۔ ان داستانوں میں قصۂ بنی اسرائیل کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس لئے اس کشمکش میں، فسادِ آدمیت کے یہ تینوں گوشے یکجا سامنے آگئے تھے۔ یعنی فرعونؔ، استبدادِ ملوکیت کا مجسمہ۔ ہامانؔ، مذہبی پیشوائیت کی ابلیسانہ روباہ بازیوں کا پیکر اور قارونؔ، سرمایہ داری کی خون آشامیوں کا نمائندہ ــــ یہ تینوں یک جا اور ان کے پنجۂ فولادی کی گرفت میں تڑپتی، پھڑکتی قومِ بنی اسرائیل جس کی

کے لئے ایک چھوڑ، دو دو اولوالعزم پیغمبر (صاحبِ ضربِ کلیم حضرت موسیٰؑ اور ان کے بھائی حضرت ہارونؑ) مصروفِ جہاد ___ اور اگر تاریخ کا بیان صحیح ہے تو وادیٔ سینا میں ایک اور پیغمبر حضرت شعیبؑ ان کے مددگار۔

یہ کشمکشِ حق و باطل، یہ چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی کی ستیزہ کاری، اسی طرح مسلسل چلی آرہی تھی کہ آج سے چودہ سو سال پہلے، خدا کی آخری کتاب ___ قرآنِ کریم ___ اور اس کا آخری رسول ___ نبی اکرمؐ ___ نوعِ انسان کو ان فساد انگیزیوں سے نجات

انقلابِ عظیم

دلانے کے لئے آئے۔ قرآنِ کریم نے حضور نبی اکرمؐ کی بعثت کا مقصد یہ بتایا ہے کہ وَ یَضَعُ عَنۡهُمۡ اِصۡرَهُمۡ وَ الۡاَغۡلٰلَ الَّتِیۡ کَانَتۡ عَلَیۡهِمۡ (۷/۱۵۷)۔ وہ ان زنجیروں کو توڑ دے گا جن میں انسانیت جکڑی ہوئی چلی آرہی تھی اور ان بوجھل سلوں کو اس کے سر سے اتار دے گا جن کے نیچے وہ کچلی جا رہی تھی ___ نبی اکرمؐ نے اپنی عدیم المثال انقلابی جدّ و جہد سے ملوکیت، مذہبی پیشوائیت اور نظامِ سرمایہ داری کی ان زنجیروں کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ دیا اور اس طرح خدا کی مخلوق دنیا میں سر اٹھا کر چلنے کے قابل ہو گئی۔

نقشِ قرآں تا دریں عالم نشست
نقش ہائے کاہن و پاپا شکست

لیکن یہ دورِ حریت و آزادی تھوڑے عرصہ تک قائم رہا اور اس کے بعد خود مسلمانوں نے ان زنجیروں کے بکھرے ہوئے ٹکڑوں کو اپنی "مژگانِ عقیدت" سے ایک ایک کر کے چنا اور اس طرح اپنے گلے میں ڈال لیا کہ پھر کوئی قوت انہیں توڑ نہ سکے۔ میں اس وقت اس تفصیل میں نہیں جانا چاہتا کہ ایسا کس طرح

حیرت انگیز رجعت

ہوا۔ (اس کی وضاحت میں اس سے پہلے متعدد مقامات پر کر چکا ہوں)۔ اس وقت میں صرف اتنا ہی کہوں گا کہ آسمان کی آنکھ نے اس سے زیادہ حیرت انگیز تماشا کہیں نہیں دیکھا ہو گا کہ

خود طلسمِ قیصر و کسریٰ شکست
خود سرِ تختِ ملوکیت نشست

جب ہم اپنی تاریخ پر نگاہ ڈالتے ہیں تو محوِ حیرت رہ جاتے ہیں کہ مسلمان اس غیر قرآنی زندگی کا

اس قدر خوگر ہو چکا ہے کہ اس کے نزدیک قفس حلال اور آشیانہ حرام ہے۔ اس کے اسباب و علل ظاہر ہیں۔ مفاد پرست گروہ نے اقتدار کی کرسیوں اور رزق کے سرچشموں پر قبضہ کر لیا۔ مذہبی پیشوائیت نے اس خلافِ اسلام نظام کو عین اسلام ثابت کرنے میں "شرعی سندات" مہیا کیں ــــ اربابِ حکومت ان کے وظیفے مقرر کر دیتے تھے اور یہ منبروں پر کھڑے ہو کر انہیں "ظل اللہ علی الارض" قرار دیتے اور ان کی سلامتی کی دعائیں مانگا کرتے تھے۔ یہ وہی فرعون، ہامان اور قارون کی ملی بھگت تھی جسے قرآن نے داستانِ بنی اسرائیل کے سلسلہ میں اس شرح و بسط سے بیان کیا ہے۔ گمان غالب ہے کہ اس دوران میں خدا کے ایسے بندے بھی پیدا ہوئے ہوں گے جنہوں نے اس کے خلاف آواز اٹھائی ہو۔ لیکن جیسا کہ ہر مستبد نظام کیا کرتا ہے، ان کا گلا گھونٹ دیا گیا اور ان کے آثار تک کو مٹا دیا۔ نتیجہ اس کا یہ کہ آج ہمارے ہاں ملوکیت اور مذہبی پیشوائیت کی تاریخ تو پوری تفصیل کے ساتھ موجود ہے لیکن اس کے خلاف آواز اٹھانے والوں کا ذکر تک نہیں ملتا۔ بجز اس کے کہ اس تاریخ میں کہیں طعن و تشنیع کے ساتھ انہیں ہدفِ ملامت بنا دیا گیا ہو۔ اس سارے طوفانِ بلا میں اگر امید کا کوئی سہارا ہے تو وہ یہ کہ خدا کی کتاب کے الفاظ ہمارے ہاں محفوظ چلے آتے ہیں۔

یہی تھی خدا کی وہ کتابِ محفوظ جس پر ہمارے دور کے ایک عظیم مفکر نے عمر بھر غور و فکر کیا اور اس کے بعد اس کی حقیقت کو واشگاف الفاظ میں امت کے سامنے پیش کیا کہ اس کی یہ حالت اس لئے ہوئی ہے کہ

چار مرگ اندر پئے ایں دیر میر سود خوار و والی و ملا و پیر

اور اس نے مسلمان کو مخاطب کر کے کہا کہ

باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری
اے کشتۂ سلطانی و ملائی و پیری

میں آج کی نشست میں مختصر الفاظ میں اس حقیقت کو آپ کے سامنے لانے کی کوشش کروں گا کہ قرآنِ کریم نے فسادِ آدمیت کے ان تینوں گوشوں ــــ ملوکیت، مذہبی پیشوائیت اور سرمایہ داری ــــ کے متعلق کیا کہا ہے اور اقبالؒ نے اس کی اپنے حسین و بلیغ انداز میں کس طرح تشریح کی ہے۔

ملوکیّت

ہمارے ہاں، ملوکیّت سے مراد موروثی بادشاہت لی جاتی ہے۔ یعنی باپ کے بعد بیٹے کا تخت نشین ہونا۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ میں جہاں یہ آیا ہے کہ (حضرت) معاویہؓ نے اپنے بیٹے کو اپنا ولی عہد مقرر کر دیا تو کہا جاتا ہے کہ اس سے ملوکیّت کا آغاز ہوا۔ دنیا کے عام تصوّر کے مطابق بھی ایک فرد کی حکومت کو پہلے ملوکیت (MONORCHY)، یا شخصی اقتدار (AUTOCRACY)، کہا جاتا تھا اور اب اسے آمریت (DICTATORSHIP)، سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی عام تصوّر کے مطابق اگر کسی ملک پر اس ملک کے رہنے والوں کی حکومت ہے تو اُسے آزادی کہا جاتا ہے اور اگر اس پر کسی دوسرے ملک کی قوم حکمران ہے تو اسے محکومی کہا جاتا ہے۔ آزادی اور محکومی کا یہ تصوّر تو دنیا میں اب تک موجود ہے لیکن انقلاب فرانس نے، ایک جدید سیاسی نظام کو جنم دیا جسے جمہوریت یا ڈیماکریسی کہہ کر پکارا گیا۔ لفظی طور پر تو اس سے مفہوم ہے پوری کی پوری قوم کی حکومت، لیکن عملاً اس سے مراد ہے نمائندگانِ قوم میں سے اس پارٹی کی حکومت جسے اکثریت حاصل ہو۔ یعنی اس میں اقتدارِ مملکت، ایک فرد کے بجائے ایک گروہ کو حاصل ہوتا ہے۔ میں اس وقت اس تفصیل میں نہیں جانا چاہتا کہ دو سو سال کے تجربہ نے اس جمہوریت کے متعلق خود یورپ کے اربابِ فکر و نظر اور اصحابِ سیاست و عمرانیت کو کس نتیجے پر پہنچایا ہے اور وہ کس طرح اس کے ہاتھوں تنگ آ چکے ہیں۔ میں اس وقت اتنا کہنے پر اکتفا کروں گا کہ مغربی جمہوریت کی مشینری ایسی ہے جس کی رُو سے وہی لوگ قوم کے نمائندوں کی حیثیت سے منتخب ہو سکتے ہیں جنہوں نے کسی نہ کسی طرح دولت سمیٹ کر معاشرہ میں اثر و رسوخ حاصل کر لیا۔ لہٰذا، اس طرزِ حکومت سے، جس گروہ کے ہاتھ میں زمامِ اقتدار آتی ہے وہ صلاحیت و قابلیت یا سیرت و کردار کی رُو سے قوم کا منتخب طبقہ نہیں ہوتا، مفاد پرستوں ہی کا ایک گروہ ہوتا ہے۔ لہٰذا، ملوکیت و آمریت اور جمہوریت میں فرق اتنا ہی ہوتا ہے کہ ملوکیت میں بزنس (کاروبار) ایک فرد کی ملکیت ہوتا ہے۔ جمہوریت میں یہ ایک لمٹیڈ کمپنی کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ مقصد دونوں کا سلب و نہب (EXPLOITATION)، ہوتا ہے۔

قرآن کریم نے انسانی آزادی اور محکومی کا بنیادی تصور ہی بدل دیا۔ اس نے کہا کہ انسانوں پر حکومت کا حق کسی کو حاصل ہی نہیں۔ نہ ایک فرد کو اور نہ افراد کی کسی جماعت کو ــــ مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَ الْحُكْمَ وَ النُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (۳/۷۸) کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں، خواہ اسے ضابطۂ قوانین اور اقتدارِ امور، حتٰی کہ نبوت تک بھی کیوں نہ مل چکی ہو کہ وہ لوگوں سے کہے کہ تم خدا کے نہیں بلکہ میرے محکوم و فرماں بردار بن جاؤ۔ حقِ حکومت صرف خدا کو حاصل ہے۔ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ (۱۲/۴۰) اور اس کی عملی شکل یہ ہے کہ کاروبارِ مملکت، خدا کی نازل کردہ کتاب کے مطابق سرانجام پائے۔ وَ مَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (۵/۴۴) جو لوگ خدا کی کتاب کے مطابق نظامِ مملکت قائم نہیں کرتے تو انہی کو کافر کہا جاتا ہے۔ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ○ (۵/۴۵) یہ لوگ ظالم ہیں۔ انسانوں کو حاکم اور محکوم کے طبقات میں تقسیم کر دینے سے بڑا ظلم اور کیا ہو سکتا ہے؟ لہٰذا، قرآن کی رُو سے مملکت، قوانینِ خداوندی کو نافذ کرنے کی ایجنسی ہے اور یہ مشورہ امت کے باہمی مشورہ سے سرانجام پاتا ہے کہ وَ اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ۖ (۴۲/۳۸) خدا کا ارشاد ہے۔ اس تصور کی رُو سے، ایک ملک پر اگر خود اس ملک کے رہنے والے حکمران ہوں اور حکومت کا انداز مغربی جمہوریت بھی ہو، لیکن کاروبارِ مملکت، خدا کی کتاب کے مطابق سرانجام نہ پا رہا ہو، تو وہ آزادی نہیں غلامی ہے۔ اسے ملوکیت کہا جائے گا۔ لیکن اگر نظامِ مملکت، قوانینِ خداوندی کے مطابق متشکل ہو اور امورِ مملکت امت کے باہمی مشورے سے طے پائیں تو یہ آزادی ہے خواہ طرزِ حکومت (FORM OF GOVERNMENT)، کسی قسم کا ہو۔ اسے ہماری اصطلاح میں "خلافت" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ دونوں تصوّراتِ حکومت، (ملوکیت اور خلافت) ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ ایک اسلامی ہے اور دوسرا غیر اسلامی۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ صدارتی نظامِ جمہوریت غیر اسلامی ہے اور پارلیمانی سسٹم مطابق اسلام، تو یہ محض سیاسی نعرہ بازی ہے۔ اسلامی نظامِ جمہوریت اس کے سوا کچھ نہیں کہ قرآنی حدود کے اندر رہتے ہوتے قوم کے مشورہ سے کاروبارِ مملکت سرانجام پائے۔

صدیوں کی ملوکیت کے خواب آور اثرات سے مسلمان، خلافت کے تصور کو فراموش کر چکا

تھا۔ دوسری طرف یورپ نے نظامِ جمہوریت کے حق میں اس قدر پراپیگنڈہ کیا کہ ساری دنیا اس سے مسحور ہو گئی اور یہ سمجھنے لگی کہ جنت سے نکلے ہوئے آدم نے پھر سے فردوسِ گم گشتہ کو پا لیا ہے۔ وہ اس نظام کو آیۂ رحمت اور نوعِ انسانی کے لئے سحابِ کرم خیال کرتی تھی۔ ان کی دیکھا دیکھی، خود مسلمان بھی اسے انعامِ خداوندی سمجھنے لگا اور یہ آوازیں چاروں طرف سے اٹھنی شروع ہو گئیں کہ نظامِ جمہوریت عین مطابق اسلام ہے۔ اس ہنگامۂ ہائے و ہو اور تلاطمِ شور و شغب میں، جبکہ ساری فضا اسی قسم کے نعروں سے گونج رہی تھی۔ اقبالؒ کی فراستِ قرآنی نے اس فتنہ کو بھانپا اور اپنی بھرپور آواز سے مسلمانوں کو للکار کر کہا کہ اس فریب میں مت آؤ۔ ؎

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری
دیوِ استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری!

اس نے کہا کہ یاد رکھو! نظامِ حکومت جمہوری ہو یا شخصی، اگر اس کی اساس خدا کی کتاب پر نہیں تو وہ ملوکیت ہے۔ اس کے برعکس جس نظام کی بنیاد، ضابطۂ قوانینِ خداوندی پر ہے وہ عین اسلام ہے۔ اسے خلافت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور ؎

خلافت بر مقامِ ما گواہی است حرام است آنچہ بر ما پادشاہی است
ملوکیت ہمہ مکر است و نیرنگ خلافت حفظِ ناموسِ الٰہی است

اس لئے ہر وہ نظام جس میں غیر قرآنی قوانین رائج ہوں، ملوکیت ہے اور ظلم و استبداد کا مظہر!

جلالِ پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

اقبالؒ کی آخری کتاب "ارمغانِ حجاز" میں (جو اس کی وفات کے بعد شائع ہوئی تھی) ایک نظم ہے جس کا عنوان ہے — ابلیس کی مجلسِ شوریٰ — میرے نزدیک وہ عصرِ حاضر کی تہذیب و تمدن اور سیاست و حکمت پر شدید ترین تنقید ہے اور فکرِ اقبالؒ کا نچوڑ۔ اس کے ساتھ ہی اسلام کے ایک زندہ و متحرک نظامِ حیات بننے کے خلاف جو قوتیں نہایت غیر محسوس طور پر مصروفِ تگ و تاز ہیں۔ اس میں ان کی نشاندہی اور نقاب کشائی بڑے شوخ اور حسین انداز سے کی گئی ہے۔ نظم کا پلاٹ یہ ہے کہ ابلیس کی کابینہ (CABINET) کا اجلاس ہو رہا ہے جس کی صدارت خود ابلیس کر رہا ہے۔

اس کابینہ میں ان تمام عوامل کو ایک ایک کر کے سامنے لایا جا رہا ہے جو ابلیسی نظام کے ضعف کا باعث بن سکتے ہیں. یہ عوامل زیرِ بحث آتے ہیں اور متعلقہ مشیر (وزیر) یہ بتاتا ہے کہ اس نے اس کی مدافعت کے لئے کیا حربہ تجویز کیا ہے. ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جمہوری نظام کی نمود اس حقیقت کی غمّاز ہے کہ انسان اس نظامِ ملوکیت سے تنگ آچکا ہے جسے ابلیس نے مدت ہوئی وضع کیا تھا. اگر انسان نے اس نظامِ نَو کو اختیار کر لیا تو پھر ابلیسی نظام کو زوال آجائے گا. چنانچہ اس مشیر نے وزیرِ سیاست سے دریافت کیا کہ ؎

خیر ہے سلطانیٔ جمہور کا غوغا کہ شر\
تو جہاں کے تازہ فتنوں سے نہیں ہے باخبر

وزیرِ امورِ سیاسیہ مسکرایا کہ کہا کہ "ہوں" یعنی میں ان سب تازہ فتنوں سے باخبر ہوں ؎

ہوں، مگر میری جہاں بینی بتاتی ہے مجھے — جو ملوکیت کا اک پردہ ہو کیا اس سے خطر\
ہم نے خود شاہی کو پہنایا ہے جمہوری لباس — جب ذرا آدم ہوا ہے خود شناس و خود نگر

بات یہ ہے کہ

کاروبارِ شہریاری کی حقیقت اور ہے — یہ وجودِ میر و سلطاں پر نہیں ہے منحصر\
مجلسِ ملّت ہو یا پرویز کا دربار ہو — ہے وہ سلطاں غیر کی کھیتی پہ ہو جس کی نظر\
تُو نے کیا دیکھا نہیں مغرب کا جمہوری نظام\
چہرہ روشن، اندروں چنگیز سے تاریک تر

زمانۂ قدیم کی ملوکیت اور عصرِ حاضر کی جمہوریت اصل کے اعتبار سے دونوں ایک ہیں. فرق صرف یہ ہے کہ دورِ جہالت کی شخصی ملوکیت جو کچھ کرتی تھی، کھلے بندوں کرتی تھی. لیکن عصرِ حاضر کی "جمہوری ملوکیت" وہی کچھ تہذیب کی اوٹ میں اور مفادِ عامہ کے تحفظ کے نقاب میں کرتی ہے. اُس زمانے کی سلب و نہب (EXPLOITATION) کو بادشاہ اپنا حق سمجھتا تھا. اس زمانے کی "ملوکیت" اس سلب و نہب کو (PUBLIC INTEREST) کہہ کر عوام کو دھوکا دیتی ہے. یہ ہے وہ جمہوریت جس کا — چہرہ روشن اندروں چنگیز سے تاریک تر ہے.

یہ تھا وہ جواب، جو ابلیس کی مجلسِ شوریٰ میں، وزیرِ امورِ سیاسیہ کی طرف سے دیا گیا. ابلیس

کا یہ حربہ کس قدر کارگر ہے، اس کی تشریح اقبالؒ نے، بالِ جبریل کی ایک نظم میں کی ہے جس کا عنوان ہے "ابلیس کی عرض داشت"۔ ابلیس خدا کے حضور ایک درخواست لے کر پہنچتا ہے جس میں تفصیل سے بتاتا ہے کہ اس دَور میں 'کارپردازانِ نظامِ مملکت' ان فرائض کو جو ابلیس کے سپرد کئے گئے تھے، کس حُسن وخوبی سے سرانجام دے رہے ہیں۔ اس لئے اب اس کی اس کرّۂ ارض پر ضرورت باقی نہیں رہی۔ اسے کہیں اور "ٹرانسفر" کر دیا جائے۔ وہ بحضور ربّ العزت عرض کرتا ہے کہ ؎

جمہور کے ابلیس ہیں اربابِ سیاست
باقی نہیں اب میری ضرورت تہِ افلاک

میرے یہاں سے چلے جانے سے، اہرمنی سیاست کے کاروبار میں کسی قسم کا خلل واقع نہیں ہوگا بلکہ وہ اور زیادہ چمک اٹھے گا۔ اس لئے کہ ؎

تری حریف ہے یارب سیاستِ افرنگ مگر ہیں اس کے پجاری فقط امیر و رئیس
بنایا ایک ہی ابلیس آگ سے تُو نے بنائے خاک سے اس نے دو صد ہزار ابلیس

پھر میری تو یہ کیفیت ہے کہ ہر شخص میرا نام سننے پر (زبان ہی سے سہی) لاحول پڑھتا ہے لیکن ؎

شیاطینِ ملوکیت کی آنکھوں میں ہے وہ جادُو
کہ خود نخچیر کے دل میں ہو پیدا ذوقِ نخچیری!

یوں اقبالؒ نے دورِ حاضر کی اس ملوکیت (یعنی مغربی نظامِ جمہوریت) کے خلاف مسلسل جہاد کیا۔

مذہبی پیشوائیت

اب برادرانِ عزیز! آگے بڑھئے!۔

آپ انسانی نفسیات پر غور کیجئے۔ دنیا میں کوئی انسان کبھی کسی دوسرے انسان کا محکوم اور غلام بننا نہیں چاہتا۔ اس کی طبیعت ان زنجیروں کے خلاف اِبا کرتی ہے۔ پھر یہ کیا ہے کہ انسانوں کا گروہِ عظیم، ایک انسان یا انسانوں کے گروہ کی محکومی اور غلامی پر اس طرح رضامند ہو جاتا ہے کہ

اس کے خلاف بغاوت کرنا تو ایک طرف اس کے دل میں اس کے خلاف نفرت کا جذبہ تک پیدا نہیں ہوتا! یہ کام مذہبی پیشوائیت کرتی ہے۔ اس کی سحر آفرینی کا اثر ہے کہ

صید خود صیّاد را گوید بگیر!

برہمن عوام کو یہ کہہ کر افیون پلاتا ہے کہ راجہ ایشور کا اوتار ہے۔ کلیسا کا اُسقف، سادہ لوح انسانوں سے کہتا ہے کہ بادشاہ کو حقوقِ خداوندی (DIVINE RIGHTS) حاصل ہوتے ہیں۔ محراب و منبر سے یہ سحر آفرین الفاظ دہرائے جاتے ہیں کہ۔ اَلسُّلطانُ ظِلّ اللّٰہ علی الارض۔ بادشاہ زمین پر خدا کا سایہ ہے۔ اس لئے بادشاہ کے حکم کی تعمیل درحقیقت اطاعتِ خداوندی ہے جو اس سے سرتابی کرتا ہے وہ خدا کی معصیت کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ اس قسم کے وعظ کہتا رہتا ہے کہ دنیا قابلِ نفرت شے ہے' اس سے دُور بھاگو۔ اس دنیا کی قوت و دولت، ثروت و حشمت، زیب و زینت، فاسق و فاجر لوگوں کے لئے ہے۔ خدا کے بندوں کی دنیا آخرت ہے۔ انہیں اسی پر نگاہ رکھنی چاہیئے۔ اور آخرت کے حصول کے لئے' وہ چند بے روح عقاید اور بے جان رسومات کو عینِ دین قرار دے کر، لوگوں کو ان میں زیادہ سے زیادہ منہمک رکھتا ہے' تاکہ اُن کی نگاہ دوسری طرف اٹھنے ہی نہ پائے۔

مذہبی پیشوائیت، عوام کو اس فریب میں مبتلا رکھتی ہے' تاکہ ملوکیت کو اپنی سلب و نہب میں کسی قسم کا خطرہ نہ رہے۔ اس طرح ملوکیت اور مذہبی پیشوائیت کا ساجھا ہو جاتا ہے۔ راجہ برہمن کی رکھشا (حفاظت) کرتا ہے اور برہمن راجہ کو اشیرباد و دعا دیتا ہے۔ کنگ کلیسائی نظام کے لئے جاگیریں مقرر کرتا ہے۔ کلیسا' بادشاہ کے حقوقِ خداوندی کا محافظ بنتا ہے۔ سلطان' مذہبی پیشواؤں کے وظائف مقرر کرتا ہے اور مذہبی پیشوا برسرِ منبر اس کے لئے تائید و نصرت کی دعائیں مانگتے رہتے ہیں۔ یہ ہے ملوکیت اور برہمنیت کی وہ ملی بھگت جس سے استبداد کے فولادی پنجہ کی گرفت کبھی ڈھیلی نہیں ہونے پاتی۔ یاد رکھئے! ہامان کی مدد کے بغیر کسی فرعون کی فرعونیت ایک دن بھی نہیں چل سکتی۔ اسلام نے ملوکیت کے ساتھ مذہبی پیشوائیت کا بھی خاتمہ کر دیا۔ لیکن جب مسلمانوں میں دوبارہ ملوکیت کی نمود ہوئی تو فطری طور پر اس کے ساتھ مذہبی پیشوائیت بھی جلوہ دہِ محراب و منبر ہو گئی۔ اقبالؒ نے قوم کو اس مہیب خطرہ سے بھی آگاہ کیا اور عمر بھر، سلطانی کے ساتھ ملّائی و پیری کے خلاف بھی صرفِ فغاں

جہاد رہا۔

قرآن کریم نے مذہبی پیشوائیت کے فتنہ کے سلسلہ میں کہا تھا کہ۔ اِنَّ کَثِیْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَ الرُّھْبَانِ لَیَاْکُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَ یَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ (۹/۳۴) یاد رکھو! یہ علماء اور مشائخ عوام کی کمائی مفت میں کھا جاتے ہیں۔ یہ لوگوں سے کہتے یہ ہیں کہ ہم تمہیں خدا کا رستہ دکھاتے ہیں حالانکہ خدا کے راستے میں سب سے بڑی روک خود یہی لوگ ہیں۔ ان کی ہر ممکن کوشش یہ ہوتی ہے کہ لوگ اس راستہ پر چلنے ہی نہ پائیں جو خدا نے ان کے لئے تجویز کیا ہے۔ انہی کے متعلق اقبالؒ نے کہا ہے کہ ؎

یہی شیخ حرم ہے جو چُرا کر بیچ کھاتا ہے
گلیم بوذرؓ و دلقِ اویسؓ و چادرِ زہراؓ

خدا اپنے رسولوں کی وساطت سے جو دین بھیجتا تھا وہ ایک مکمل ضابطہ حیات ہوتا تھا جس کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ دنیا سے ظلم و استبداد اور سلب و نہب پر مبنی ہر نظام کو مٹا کر اس کی جگہ نظامِ خداوندی متشکل کر دیا جائے۔ دین کے بنیادی تصورات اور ارکان و مناسک سب اسی انقلابی پروگرام کے اجزا ہوتے تھے۔ مذہبی پیشوائیت کی ٹیکنیک یہ ہوتی تھی کہ دین کے ان تصورات کے الفاظ اسی طرح باقی رکھے جائیں لیکن ان کا مفہوم بدل دیا جائے۔ اس کے ارکان و مناسک کی ظاہری شکل و صورت وہی رہے لیکن وہ چند بے مقصد رسومات کا مجموعہ بن کر رہ جائیں۔ یوں "مذہبی پیشوائیت کا وضع کردہ مذہب" دینِ خداوندی کی ممی شدہ لاش بن کر رہ جاتا تھا جس کے خط و خال تو وہی رہیں لیکن جس کی حقیقت ایک جسدِ بے روح سے زیادہ کچھ نہ ہو۔ اقبالؒ نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے جب کہا کہ

الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں لیکن ملّا کی اذاں اور مجاہد کی اذاں اور
پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور

دوسرے مقام پر کہا ہے کہ ؎

اندازِ بیاں گرچہ بہت شوخ نہیں ہے شاید کہ ترے دل میں اُتر جائے مری بات
یا وسعتِ افلاک میں تکبیر مسلسل یا خاک کے آغوش میں تسبیح و مناجات

وہ مذہبِ مردانِ خود آگاہ و خدا مست — یہ مذہبِ ملّا و جمادات و نباتات

قرآنِ کریم نے فرعون کے خلاف سب سے بڑا الزام یہ عاید کیا تھا کہ جَعَلَ اَھْلَھَا شِیَعًا یَّسْتَضْعِفُ طَآئِفَۃً مِّنْھُمْ (۲۸/۴) وہ قوم میں افتراق پیدا کرتا رہتا. انہیں پارٹیوں میں تقسیم کر دیتا. کبھی ایک پارٹی کو اوپر چڑھا دیتا اور دوسری کو نیچے گرا دیتا اور اس طرح انہیں کمزور کرتا رہتا کہ وہ اس کے خلاف اٹھنے نہ پائیں. قرآنِ کریم نے امت میں تفرقہ کو خدا کا عذاب قرار دیا اور واضح الفاظ میں کہا کہ وَ لَا تَکُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ ۙ مِنَ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَھُمْ وَ کَانُوْا شِیَعًا ؕ کُلُّ حِزْبٍۭ بِمَا لَدَیْھِمْ فَرِحُوْنَ ۝ (۳۰/۳۱-۳۲) مسلمانو! دیکھنا تم ایک خدا پر ایمان لا کر کہیں پھر سے مشرک نہ بن جانا. یعنی تم فرقوں میں نہ بٹ جانا. فرقہ بندی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہر فرقہ اپنے آپ کو حق پر سمجھتا ہے اور دوسروں کو باطل پر. اس طرح امت میں مسلسل پھوٹ پڑی رہتی ہے. ملوکیت کا اس میں فائدہ ہوتا ہے. وہ یہ کام مذہبی پیشوائیت سے کراتی ہے. مذہبی پیشوائیت امت کو مختلف فرقوں میں بانٹ دیتی ہے. یہ فرقے ایک دوسرے کی تکفیر کرتے رہتے اور اس طرح انہیں باہم لڑاتے رہتے ہیں اور ملوکیت اطمینان سے اپنی مفاد پرستیوں میں مصروف رہتی ہے. اقبالؒ نے جاوید نامہ میں، سعید حلیم پاشا کی زبان سے اسی حقیقت کو واشگاف کیا ہے. وہ کہتے ہیں کہ ؎

دینِ حق از کافری رسواتر است — زانکہ مُلّا مومنِ کافر گر است
کم نگاہ و کور ذوق و ہرزہ گرد — ملت از قال و اقولش فرد فرد
مکتب و مُلّا و اسرارِ کتاب؟ — کورِ مادر زاد و نورِ آفتاب
دینِ کافر فکر و تدبیرِ جہاد — دینِ مُلّا فی سبیل اللہ فساد

بالِ جبریل میں انہوں نے اسی حقیقت کو ذرا شوخ انداز میں بیان کیا ہے جب کہا ہے کہ قیامت میں ؎

میں بھی حاضر تھا وہاں ضبطِ سخن کر نہ سکا — حق سے جب حضرتِ مُلّا کو ملا حکمِ بہشت
عرض کی میں نے الٰہی! مری تقصیر معاف — خوش نہ آئیں گے اسے حور و شراب و لبِ کشت
نہیں فردوس مقامِ جدل و قال و اقوال — بحث و تکرار اس اللہ کے بندے کی سرشت

اور جنت میں نہ مسجد نہ کلیسا نہ کنشت ہے بد آموزیٔ اقوام و ملل کام اس کا

دین کے پروگرام کا ماحصل یہ تھا کہ جماعتِ مومنین، فطرت کی قوتوں کو مسخر کرکے، انہیں قرآن کی عطا کردہ مستقل اقدار کے مطابق، نوعِ انسان کی منفعت کے لئے عام کردے۔ ظاہر ہے کہ اس مقصدِ جلیل کے حصول کے لئے علومِ سائنس پر پوری پوری دسترس کے علاوہ، عالمگیر انسانیت کے مقتضیات اور عصرِ حاضر کے تقاضوں پر بھی گہری نگاہ ہونی چاہیئے لیکن جو کچھ ہماری مذہبی درسگاہوں میں پڑھایا جاتا ہے اس سے تو اتنا بھی معلوم نہیں ہو سکتا کہ سوئی کیسے بنائی جاتی ہے اور یونائیٹڈ نیشنز کس بلا کا نام ہے۔ ان درس گاہوں کے فارغ التحصیل "علمائے کرام" کو زندگی کے عملی مسائل سے دُور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا۔ اسی لئے اقبالؒ نے کہا ہے کہ

قوم کیا چیز ہے قوموں کی امامت کیا ہے؟
اس کو کیا سمجھیں یہ بیچارے دو رکعت کے امام؟

اتنا ہی نہیں — ان کے نصاب میں اٹھارہ اٹھارہ علوم تو ہوتے ہیں لیکن قرآنِ کریم کے لئے اس میں کوئی جگہ نہیں ہوتی۔ جو علوم وہاں پڑھائے جاتے ہیں، ان سے ان کے ذہنوں میں فرسودہ یونانی علم الکلام اور پامال شدہ عجمی تصورات اس طرح ٹھونس دیئے جاتے ہیں کہ ان میں دین کے مبادیات تک کے سمجھنے کی صلاحیت نہیں رہتی۔ اس کا رونا روتے ہوئے اقبالؒ نے کہا تھا کہ ؎

بیاں میں نکتۂ توحید آ تو سکتا ہے تیرے دماغ میں بت خانہ ہو تو کیا کہیئے
وہ رمزِ شوق جو پوشیدہ لاالٰہ میں ہے طریقِ شیخ فقیہانہ ہو تو کیا کہیئے

طریقت

یہ تو اربابِ شریعت کا حال ہے۔ اصحابِ طریقت ان سے بھی گئے گزرے ہیں — بالِ جبریل میں ہے۔

رمز و ایما اس زمانے کے لئے موزوں نہیں اور آتا بھی نہیں مجھ کو سخن سازی کا فن
قُم باذن اللہ کہہ سکتے تھے جو رخصت ہوئے! خانقاہوں میں مجاور رہ گئے یا گورکن

دین کا انقلابی پروگرام یکسر مجاہدانہ زندگی کا متقاضی تھا جس کے لئے ایک ایسی جماعت کی ضرورت تھی جس کے رگ و پے میں بجلیاں بھری ہوئی ہوں۔ تصوف زندگی سے فرار سکھاتا ہے اس لئے خدا کے دین سے اس کا تعلق کیا ہو سکتا ہے؟ — اقبالؒ کے الفاظ میں — "تصوف اسلام کی سرزمین میں

اجنبی پودا ہے"۔ دین، قوموں کے عروقِ مردہ میں خونِ زندگی دوڑا دیتا ہے۔ تصوف رگِ حیات میں رواں دواں خون کو منجمد کر کے رکھ دیتا ہے۔ دین، وہ شعلۂ جوالا ہے جو باطل کے ہر نظام کو خس و خاشاک کی طرح راکھ کا ڈھیر بنا دیتا ہے۔ تصوف زندگی کی رہی سہی حرارت کو بھی افسردہ کر کے قوموں کو موت کی نیند سلا دیتا ہے۔ یہی وہ تاسف انگیز منظر تھا جسے دیکھ کر اقبالؒ نے ایک سرد آہ بھر کر کہا تھا کہ ؎

صوفی کی طریقت میں فقط مستیٔ احوال — ملّا کی شریعت میں فقط مستیٔ گفتار
وہ مردِ مجاہد نظر آتا نہیں مجھ کو — ہو جس کے رگ و پے میں فقط مستیٔ کردار

اس نے اربابِ خانقاہیت کو پکار کر کہا کہ ؎

یہ حکمتِ ملکوتی یہ علمِ لاہوتی — حرم کے درد کا درماں نہیں تو کچھ بھی نہیں
یہ ذکرِ نیم شبی، یہ مراقبے یہ سرور — تری خودی کے نگہباں نہیں تو کچھ بھی نہیں

اقبالؒ سے بھی پہلے، ایک اور قرآنی نگاہ رکھنے والے مردِ مومن ــ سرسید علیہ الرحمتہ ــ نے ان اجارہ دارانِ روحانیت کے متعلق کہا تھا کہ ــ "مسکینی اور انکساری ان کو آسمان پر چڑھاتی ہے اس لئے یہ اور زیادہ مسکین و منکسر بنتے ہیں۔ سادہ لوحی پر لوگ فریفتہ ہوتے ہیں اس لئے اور سادہ بنتے جاتے ہیں۔ دنیا سے نفرت ان کو دنیا دلاتی ہے اس لئے یہ دنیا سے زیادہ نفرت کرتے جاتے ہیں۔ بے طمعی، محنت کے بغیر درہم و دینار دلاتی ہے اس لئے یہ اور زیادہ بے طمع ہوتے جاتے ہیں۔ لوگ ان کی ہر بات پر آمنا و صدقنا کہتے ہیں اس لئے ان کے دل میں دوسروں کی ہر بات کی حقارت جمتی جاتی ہے۔

ان، بظاہر حجرہ نشینوں" کی یہ کیفیت ہے کہ لوگوں کو یہ دنیاوی آسائشوں اور زیبائشوں سے نفرت دلاتے رہتے ہیں۔ لیکن خود ان کے محلات ہر قسم کی عیش سامانیوں کے مراکز ہوتے ہیں۔ اقبالؒ نے (بالِ جبریل میں) ایک "باغی مرید" کی زبان سے اسی حقیقت کی پردہ کشائی کی ہے جب کہا ہے کہ ؎

ہم کو تو میسر نہیں مٹی کا دیا بھی — گھر پیر کا بجلی کے چراغوں سے ہے روشن
شہری ہو دہاتی ہو مسلمان ہے سادہ — مانندِ بتاں پجتے ہیں کعبے کے برہمن!

نذرانہ نہیں، سود ہے پیرانِ حرم کا — ہر خرقۂ سالوس کے اندر ہے مہاجن
میراث میں آئی ہے انہیں مسندِ ارشاد — زاغوں کے تصرف میں عقابوں کے نشیمن!

یہ تھا ملوکیت اور مذہبی پیشوائیت کا وہ دجل و فریب جس کے احساس سے اقبالؒ نے خون کے آنسو روتے ہوئے بحضور رب العزت فریاد کی تھی کہ ؎

خداوندا! تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں
کہ سلطانی بھی عیاری ہے درویشی بھی عیاری

نظامِ سرمایہ داری

اس میں شبہ نہیں کہ ملوکیت کی گرہیں کسنے کے لئے پیشوائیت کی سحر آفرینی بڑی مؤثر ہوتی ہے لیکن اس میں یہ خطرہ ضرور ہوتا ہے کہ اگر لوگوں نے ذرا بھی علم و عقل سے کام لینا شروع کر دیا تو اس طلسمِ سامری کی نگاہ فریبی کا جال دھواں بن کر اڑ جائے گا۔ اس کے لئے ایک اور حربہ استعمال کیا جاتا ہے۔

آپ نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ سرکس کا شیر، اتنی مہیب قوتوں کے باوجود، رنگ ماسٹر کے سامنے بکری کیوں بنا رہتا ہے؟ اس لئے کہ اسے متواتر بھوکا رکھا جاتا ہے۔ بھوک، وہ مؤثر ترین حربہ ہے جس سے بڑے بڑے قوی ہیکل سرکشوں کو گردن جھکانے پر مجبور کر دیا جاتا ہے۔ انسانی دنیا میں اس حربہ کا نام نظامِ سرمایہ داری ہے جو حکمتِ ابلیسی کا نادر شاہکار ہے۔ اس میں عیار طبقہ رزق کے سرچشموں پر سانپ بن کر بیٹھ جاتا ہے اور اس طرح جب لوگ روٹی کے لئے اس کے محتاج ہو جاتے ہیں تو ان سے جو کام چاہتا ہے، لیتا ہے۔ دینِ خداوندی، نظامِ سرمایہ داری کے خلاف کھلا ہوا چیلنج تھا۔ وہ اسے جڑ بنیاد سے اکھیڑنے کے لئے آیا تھا۔ نظامِ سرمایہ داری کی عمارت، فاضلہ دولت (یعنی ضرورت سے زیادہ سرمایہ جمع رکھنے) کی بنیاد پر استوار ہوتی ہے۔ قرآن نے اس بنیاد ہی کو منہدم کر دیا اور ضرورت سے زیادہ دولت جمع کرنے والوں کو عذابِ جہنم کا مستحق قرار دیا۔ اس نے واضح الفاظ میں کہا کہ ـــ وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا

فِی سَبِیۡلِ اللّٰہِ ۙ فَبَشِّرۡہُمۡ بِعَذَابٍ اَلِیۡمٍ ۙ (۹/۳۴) جو لوگ دولت کے انبار جمع کرتے رہتے ہیں اور اُسے دوسروں کی ضروریات کے لئے عام نہیں کرتے۔ اے رسول! تو ان سے کہہ دے کہ ان کی اس روش کا انجام الم انگیز تباہی ہوگا۔ یَّوۡمَ یُحۡمٰی عَلَیۡہَا فِیۡ نَارِ جَہَنَّمَ فَتُکۡوٰی بِہَا جِبَاہُہُمۡ وَ جُنُوۡبُہُمۡ وَ ظُہُوۡرُہُمۡ ؕ جس دن اس دولت کے سکّوں کو جہنم کی آگ میں تپایا جائے گا اور ان سے ان کی پیشانیوں، ان کے پہلوؤں اور ان کی پشت کو داغا جائے گا اور کہا جائے گا کہ ۔ ہٰذَا مَا کَنَزۡتُمۡ لِاَنۡفُسِکُمۡ فَذُوۡقُوۡا مَا کُنۡتُمۡ تَکۡنِزُوۡنَ ○ (۹/۳۵) یہ ہے وہ دولت جسے تم نے اپنی ذات پر صرف کرنے کے لئے جمع کر رکھا تھا۔ لہٰذا اب اس دولت کا مزہ چکھو۔

نظامِ سرمایہ داری کی بنیاد تو فاضلہ دولت (SURPLUS MONEY) پر ہوتی ہے۔ لیکن یہ فاضلہ دولت زمانۂ قدیم میں زمینداری سسٹم سے حاصل ہوتی تھی اور عصرِ حاضر میں نظامِ کارخانہ داری (انڈسٹری) کی رُو سے اکٹھی کی جاتی ہے۔ قرآنِ کریم نے نظامِ زمینداری کو یہ کہہ کر ختم کر دیا کہ زمین، تمام نوعِ انسان کے لئے رزق پیدا کرنے کا ذریعہ ہے اس لئے اس پر کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی۔ وَ الۡاَرۡضَ وَضَعَہَا لِلۡاَنَامِ (۵۵/۱۰) "زمین کو ہم نے تمام مخلوق کے فائدے کے لئے پیدا کیا ہے۔" اس لئے اسے سَوَآءً لِّلسَّآئِلِیۡنَ (۴۱/۱۰) ہر ضرورت مند کے لئے یکساں طور پر کھلا رہنا چاہیئے۔ اس سے جس قدر رزق پیدا ہوتا ہے اس میں کاشتکار کی محنت شامل ہوتی ہے اور باقی سب کچھ فطرت کی طرف سے بلا مزد و معاوضہ ملتا ہے۔ زمیندار فطرت کی ان بخشائشوں کو بھی اپنی ذاتی ملکیت بنا لیتا ہے اور کاشتکار کی محنت کا بیشتر حصہ بھی ہتھیا لیتا ہے۔ قرآنِ کریم اس حقیقت کو بڑے دلنشین انداز میں بیان کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اَفَرَءَیۡتُمۡ مَّا تَحۡرُثُوۡنَ ۔ کیا تم نے اس پر بھی کبھی غور کیا ہے کہ تم جو کھیتی کرتے ہو تو اس میں تمہارا حصہ کس قدر ہوتا ہے اور ہمارا کس قدر۔ تم زمین میں ہل چلا کر تخم ریزی کر دیتے ہو۔ اس کے بعد ءَاَنۡتُمۡ تَزۡرَعُوۡنَہٗۤ اَمۡ نَحۡنُ الزّٰرِعُوۡنَ ○ کیا اس دانے کو تم اگاتے ہو یا ہمارا قانون ایسا کرتا ہے؟ لَوۡ نَشَآءُ لَجَعَلۡنٰہُ حُطَامًا فَظَلۡتُمۡ تَفَکَّہُوۡنَ ○ اِنَّا لَمُغۡرَمُوۡنَ ○ بَلۡ نَحۡنُ مَحۡرُوۡمُوۡنَ ○ اگر ایسا ہمارا قانون مشیّت یوں ساتھ نہ دیتا تو کھیتی کا اُگنا تو ایک طرف تمہارا بیج بھی ضائع ہو

جاتا اور تم سر پکڑ کر بیٹھ جاتے کہ ہم پر مفت میں چٹی پڑ گئی۔ اَفَرَءَيْتُمُ الْمَآءَ الَّذِىْ تَشْرَبُوْنَ ؕ پھر تم نے کبھی اس پانی پر بھی غور کیا ہے جس پر زندگی کا اور کھیتی کا دارومدار ہے۔ ءَاَنْتُمْ اَنْزَلْتُمُوْهُ مِنَ الْمُزْنِ اَمْ نَحْنُ الْمُنْزِلُوْنَ ہ کیا اسے تم بادلوں سے برساتے ہو یا ہم ایسا کرتے ہیں؟ لَوْ نَشَآءُ جَعَلْنٰهُ اُجَاجًا فَلَوْلَا تَشْكُرُوْنَ ہ اگر ہمارا قانونِ مشیّت ساتھ نہ دیتا اور جس طرح کا تلخ اور نمکین پانی سمندر میں تھا ویسا ہی یہ بادلوں سے برستا تو کھیتی کا اگنا تو ایک طرف تم خود بھی زندہ نہ رہ سکتے۔ اَفَرَءَيْتُمُ النَّارَ الَّتِىْ تُوْرُوْنَ ؕ پھر کیا تم اس آگ پر غور نہیں کرتے جسے تم جلاتے ہو اور جس کی حرارت میں زندگی کا راز سربستہ ہے۔ ءَاَنْتُمْ اَنْشَاْتُمْ شَجَرَتَهَآ اَمْ نَحْنُ الْمُنْشِـُٔوْنَ ہ کیا درختوں کی سبز شاخوں میں اس شعلہ سامانی کو ہم نے محفوظ رکھ چھوڑا ہے یا تم نے ایسا کیا ہے۔ نحن جَعَلْنٰهَا تَذْكِرَةً۔ ہم نے اس داستان کو اس لئے دہرایا ہے کہ تمہیں ایک فراموش کردہ حقیقت کی یاددہانی کرا دی جائے اور وہ حقیقت یہ ہے کہ زراعت کا یہ سارا کاروبار تمہارا اور ہمارا مشترکہ ہے۔ اس لئے اس کے ماحصل میں سے تم اپنا حصہ لے لو اور ہمیں ہمارا حصہ دے دو۔ تم پوچھو گے کہ تمہارا حصہ ہم کسے دیں، سو سن لو کہ مَتَاعًا لِّلْمُقْوِيْنَ ؕ (۵۶/۶۳-۷۳) اسے بھوکوں کو دے دو، یہ ہم تک پہنچ جائے گا۔ اقبالؒ نے انہی آیات کے مفہوم کو اپنے حسین انداز میں اس طرح بیان کیا ہے کہ ؎

پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون　　کون دریاؤں کی موجوں سے اٹھاتا ہے سحاب
کون لایا کھینچ کر پچھم سے بادِ سازگار　　خاک یہ کس کی ہے کس کا ہے یہ نورِ آفتاب
کس نے بھر دی موتیوں سے خوشۂ گندم کی جیب　　موسموں کو کس نے سکھلائی ہے خوئے انقلاب

دِہ خدایا! یہ زمیں تیری نہیں تیری نہیں
تیرے آبا کی نہیں، تیری نہیں، میری نہیں

پھر اس نے صنعتی نظام (انڈسٹری) کی چکی میں پسے ہوئے خاک نشیں مزدور کو اٹھا کر گلے سے لگایا اور اس کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا کہ ؎

اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دارِ حیلہ گر　　شاخِ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات
دستِ دولت آفریں کو مزد یوں ملتی رہی　　اہلِ ثروت جیسے دیتے ہیں غریبوں کو زکات

مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار　　انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات

اُٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دَور کا آغاز ہے

اقبالؔ نے "بندۂ مزدور" کو یہ پیغام ۲۳-۱۹۲۲ء میں دیا تھا۔ اس کے بعد اس نے بالِ جبریل اور ضربِ کلیم میں اسی پیغام کو اور بھی زیادہ واشگاف الفاظ میں دہرایا۔ بالِ جبریل میں ایک نظم کا عنوان ہے ـ فرشتوں کا گیت ـ اس میں ملائکہ خدا سے شکوہ سنج ہیں کہ ؎

عقل ہے بے زمام ابھی عشق ہے بے مقام ابھی　　نقش گرِ ازل تیرا نقش ہے ناتمام ابھی
خلقِ خدا کی گھات میں رند و فقیہہ و میر و پیر　　تیرے جہاں میں ہے وہی گردشِ صبح و شام ابھی

تیرے امیر مال مست تیرے فقیر حال مست
بندہ ہے کوچہ گرد ابھی خواجہ بلند بام ابھی

اس پر خدا کی طرف سے فرشتوں کو حکم دیا جاتا ہے کہ

اٹھو! میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو　　کاخِ امراء کے در و دیوار ہلا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی　　اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو
کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے　　پیرانِ کلیسا کو کلیسا سے اٹھا دو
حق را بسجودے صنماں را بطوافے　　بہتر ہے چراغِ حرم و دیر بجھا دو

میں ناخوش و بیزار ہوں مرمر کی سلوں سے
میرے لئے مٹی کا حرم اور بنا دو

"فرشتے" وہ کائناتی قوتیں ہیں جو مشیتِ خداوندی کے پروگرام کو بروئے کار لانے کے لئے، زمانے کے تقاضوں کی شکل میں سامنے آتی ہیں۔ یہی وہ "زمانے کے تقاضے" تھے جنہیں دیکھ کر، اقبالؒ کی نگہِ دُور رس نے بہت عرصہ پہلے اس حقیقت کو بھانپ لیا تھا کہ اب ؎

زمانے کے انداز بدلے گئے　　نیا راگ ہے، ساز بدلے گئے
پرانی سیاست گری خوار ہے　　زمیں میر و سلطاں سے بیزار ہے
گیا دورِ سرمایہ داری گیا　　تماشا دکھا کر مداری گیا

حتیٰ کہ انہوں نے یہاں تک بھی کہہ دیا کہ ؎

گراں خواب چینی سنبھلنے لگے　　ہمالہ کے چشمے اُبلنے لگے

یہ ۱۹۳۵ء کی بات ہے جب ہنوز (شاید) خود چینیوں کو بھی اپنے سنبھلنے کا حتمی طور پر اندازہ نہیں ہوا ہوگا۔ قرآن پر غور و فکر انسان میں ایسی بصیرت پیدا کر دیتا ہے کہ وہ حوادثِ زمانہ سے اس کا اندازہ کر سکتا ہے کہ اب ہوا کا رُخ کدھر کو ہے۔

قرآن نے نظامِ سرمایہ داری کے ختم کرنے کے سلسلہ میں کہا تھا کہ — یَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ۔ اے رسولؐ! تجھ سے یہ لوگ پوچھتے ہیں کہ ہم اپنی کمائی میں سے کس قدر دوسروں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے دے دیں۔ قُلِ الْعَفْوَ ؕ (۲/۲۱۹) ان سے کہہ دو کہ جس قدر تمہاری اپنی ضروریات سے زاید ہے سب کا سب۔ جب روس میں اشتراکی انقلاب آیا تو اقبالؒ نے کہا کہ ؎

قوموں کی روش سے مجھے ہوتا ہے یہ معلوم　　بے سود نہیں روس کی یہ گرمیٔ گفتار

انساں کی ہوس نے جنہیں رکھا تھا چھپا کر　　کھلتے نظر آتے ہیں بتدریج وہ اسرار

قرآن میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلماں　　اللہ کرے تجھ کو عطا جدتِ کردار

جو حرف قل العفو میں پوشیدہ ہے اب تک

اس دَور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار

"شاید" اس لئے کہ وہ جانتے تھے کہ روس نے جس اشتراکی نظام کی ایسی عظیم عمارت استوار کرنے کا دعویٰ کیا ہے، اس کے ہاں ایسی بنیاد کوئی نہیں جو اس عمارت کا بوجھ اٹھا سکے۔ اس نے اہلِ روس سے اسی زمانے میں کہا تھا کہ ؎

اے کہ می خواہی نظامِ عالمے　　جستۂ اُو را اساسِ محکمے؟

یہ بنیاد قرآن کے علاوہ اور کہیں سے نہیں مل سکتی۔ اس لئے کہ ؎

داستانِ کہنہ شستی باب باب　　فکر را روشن کن از اُمّ الکتاب

اور آپ دیکھ رہے ہیں عزیزانِ گرامی قدر کہ اس اساسِ محکم کے نہ ہونے کی وجہ سے روس میں اشتراکیت کس بُری طرح سے ناکام ہو رہی ہے۔ یہ معاشی نظام قرآن ہی کی بنیادوں پر کامیابی سے اٹھایا جا سکتا ہے۔ اس حقیقت کو اقبالؒ نے "ابلیس کی مجلسِ شوریٰ" کی نظم کے آخری بند میں

نہایت اُجلے نکھرے اور حسین و شاداب انداز میں بیان کیا ہے۔ اسے غور سے سنئے۔

ابلیس کی کابینہ کے مشیر اول نے کہا کہ دنیا میں اشتراکیت کا چرچا عام ہو رہا ہے اس لئے مجھے خطرہ ہے کہ ہمارا وضع کردہ نظامِ سرمایہ داری کہیں پامال نہ ہو جائے۔ اس لئے ہمیں اس کی بابت کچھ فکر کرنی چاہیئے۔ ابلیس نے یہ سُن کر کہا کہ تم نے صحیح نہیں سمجھا۔ مجھے اشتراکیت سے کچھ خطرہ نہیں۔ یہ ہمیں شکست نہیں دے سکتی۔ ہمارے لئے خطرہ کا گوشہ ایک اور ہے جس کی طرف تم میں سے کسی کی بھی نگاہ نہیں گئی۔

جانتا ہے جس پہ روشن باطنِ ایام ہے　　مزدکیت فتنۂ فردا نہیں، اسلام ہے

اس پر اس کے مشیروں کی آنکھوں میں خفیف سی ہنسی پیر گئی جو اس تنقید کی غماز تھی کہ موجودہ مسلمان قوم سے بھلا ہمیں کیا خطرہ ہو سکتا ہے؟ اس پر ابلیس نے کہا کہ ؎

جانتا ہوں میں یہ امت حاملِ قرآں نہیں　　ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دیں
جانتا ہوں میں کہ مشرق کی اندھیری رات میں　　بے یدِ بیضا ہے پیرانِ حرم کی آستیں

عصرِ حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف
ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبر کہیں

کون سی شرعِ پیغمبرؐ؟

الحذر! آئینِ پیغمبرؐ سے سو بار الحذر　　حافظِ ناموسِ زن، مرد آزما، مرد آفریں
موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لئے　　نے کوئی فغفور و خاقاں، نے فقیرِ رہ نشیں
کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک صاف　　منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں

اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب
پادشاہوں کی نہیں، اللہ کی ہے یہ زمیں

یہ ہے ہمارے لئے حقیقی خطرہ کا موجب۔ اس لئے ؎

چشمِ عالم سے رہے پوشیدہ یہ آئیں تو خوب
یہ غنیمت ہے کہ خود مومن ہے محرومِ یقیں

اب ابلیس کے مشیروں کی سمجھ میں آیا کہ ان کے لئے حقیقی خطرہ کیا ہے۔ اس پر انہوں نے ابلیس

سے پوچھا کہ اس خطرہ کی روک تھام کے لئے ہمیں کیا پروگرام اختیار کرنا چاہیئے۔ اس نے کہا، کرنا کیا چاہیئے؟ — وہی جو ہم کرتے چلے آتے ہیں۔ تم جاؤ اور اپنے نظام کی آلۂ کار مذہبی پیشوائیت کو کھٹکھٹاؤ اور اس سے کہو کہ وہ مسلمانوں کو اس قسم کے اختلافی اور نظری مسائل میں الجھائے رکھیں کہ ؎

ابنِ مریم مر گیا یا زندۂ جاوید ہے؟ | ہیں صفاتِ ذاتِ حق، حق سے جدا یا عینِ ذات!
آنے والے سے مسیحِ ناصری مقصود ہے | یا مجدد جس میں ہوں فرزندِ مریم کے صفات!
ہیں کلام کے الفاظ حادث یا قدیم | امتِ مرحوم کی ہے کس عقیدے میں نجات!

ذرا سوچو کہ ؎

کیا مسلماں کیلئے کافی نہیں اس دور میں | یہ الٰہیات کے ترشے ہوئے لات و منات!

اسے ان نظری مسائل کے الجھاؤ میں ڈالے رکھو اور اس طرح ؎

تم اسے بیگانہ رکھو عالمِ کردار سے
تا بساطِ زندگی میں اس کے سب مہرے ہوں مات!

خیر اسی میں ہے قیامت تک رہے مومن غلام | چھوڑ کر اوروں کی خاطر یہ جہانِ بے ثبات
ہے وہی شعر و تصوف اسکے حق میں خوب تر | جو چھپا دے اسکی آنکھوں سے تماشائے حیات

ہر نفس ڈرتا ہوں اس اُمت کی بیداری سے میں
ہے حقیقت جس کے دیں کی احتسابِ کائنات!

لہٰذا، تم پوری کوشش سے ؎

مست رکھو ذکر و فکرِ صبحگاہی میں اسے
پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اسے

اس سے زیادہ اور کچھ کرنے کا کام نہیں۔ یہ ہو گیا تو تم چین کی نیند سوؤ۔ اس سے یہ قوم، ملوکیت، مذہبی پیشوائیت اور نظامِ سرمایہ داری کی زنجیروں میں جکڑی رہے گی اور ہمارا پورا لاؤ لشکر فسادِ آدمیت کے پروگرام کی تکمیل میں آزادانہ مصروف رہے گا۔

پاکستان اقبالؒ نے ابلیس کی اسی سازش کو ناکام بنانے کے لئے پاکستان کا تصور دیا تھا۔ پاکستان سے اس کی مراد تھی ایک ایسا خطۂ زمین جس میں قوانینِ خداوندی

کی حکمرانی ہوتا کہ اسلام پر جو ملوکیت کا ٹھپہ لگ چکا ہے وہ دُور ہو جائے۔ مذہبی پیشوائیت کا اقتدار ختم ہو اور سرمایہ داری کی جگہ صحیح قرآنی نظامِ معیشت رائج کیا جا سکے۔ اس سے "اشتراکیت" کو وہ اساسِ محکم میسر آجائے گی جس کے بغیر وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی۔

۱۹۴۷ء میں وہ خطۂ زمین ہمیں مل گیا لیکن اُس وقت وہ حکیم الامت یہاں سے جا چکا تھا۔ اگر وہ اس وقت موجود ہوتا تو ہمیں "ابلیس کی مجلسِ شوریٰ" کی اُس نشست کی روئیداد بھی اپنے الفاظ میں سُناتا جو حصولِ پاکستان کے وقت، ہنگامی طور پر منعقد ہوئی تھی۔ اس کی تفصیل کچھ اس قسم کی ہوتی کہ جب تقسیمِ ہند کا اعلان ہوا تو ابلیس کے مشیر چیختے چلاتے اس کے پاس آئے اور کہا کہ جہاں پناہ! غضب ہو گیا۔ تحریکِ پاکستان کامیاب ہو گئی۔ مسلمانوں کو ایک آزاد مملکت قائم کرنے کے لئے جداگانہ خطۂ زمین مل گیا۔ اس تحریک کے قائد نے بہت پہلے اعلان کر دیا تھا کہ اسلامی مملکت جس کے قیام کے لئے ہم جدوجہد کر رہے ہیں، قرآنی احکام و قوانین نافذ کرنے کی ایجنسی ہوتی ہے۔ اس نے زمینداروں اور سرمایہ داروں کو وارننگ دے دی تھی کہ تمہیں اپنی روش بدلنی پڑے گی۔ ایسا نہ کرو گے تو تمہارے لئے پاکستان میں کوئی جگہ نہیں ہو گی کیونکہ وہاں نظامِ سرمایہ داری نہیں چل سکے گا۔ اس نے ابھی ابھی (۱۹۴۸ء میں) ایک براڈ کاسٹ میں کہا ہے کہ پاکستان میں تھیاکریسی نہیں ہو گی۔ ہم نے دس برس تک مذہبی پیشوائیت کو برابر آگے بڑھا رکھا کہ وہ تحریکِ پاکستان کی مخالفت کرے اور "خدا اور رسول" کے نام پر عوام کو اس کی حمایت کرنے سے باز رکھے۔ لیکن ان کی کسی نے نہ سُنی اور وہ تحریک کامیاب ہو گئی۔ اب اس خطۂ زمین میں قرآنی نظام قائم ہو جائے گا اور ہماری حکمرانی ختم ہو جائے گی — عالی جاہ! یہ کیا ہو گیا؟ — یہ کیسا انقلاب آ گیا؟ ؎

چھا گئی آشفتہ ہو کر وسعتِ افلاک پر — جس کو نادانی سے ہم سمجھے تھے اک مشتِ غبار

فتنۂ فردا کی ہیبت کا یہ عالم ہے کہ آج — کانپتے ہیں کوہسار و مرغزار و جوئبار

میرے آقا! وہ جہاں زیر و زبر ہونے کو ہے

جس جہاں کا ہے فقط تیری سیادت پر مدار

ابلیس نے یہ سب کچھ خاموشی سے سُنا اور اس کے بعد نہایت سکون و اطمینان سے کہا کہ

اس میں شبہ نہیں کہ یہ انقلاب ہمارے لئے ایک بہت بڑے فتنہ کا پیش خیمہ بن سکتا ہے. لیکن اس سے اس طرح گھبرانے اور چیخ و پکار کرنے کی کوئی بات نہیں. مسلمان، مذہب پرست قوم ہے. اسے اسی راستے سے بہکایا جا سکتا ہے. اسلام دشمن قوتیں بے نقاب ہو کر سامنے آئیں تو مسلمان ان کا ڈٹ کر مقابلہ کرتا ہے. لیکن یہی قوتیں جب مذہب کا لبادہ اوڑھ کر آئیں تو یہ سادہ لوح نہایت آسانی سے ان کے دامِ فریب میں آجاتا ہے. لہٰذا، تم اپنی قوتوں کو ایک بار پھر مجتمع کرو۔ ان کا جال سارے ملک میں بچھا دو۔ وَ اسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ بِصَوْتِكَ ۔ ان کی پراپیگنڈہ کی مشینری کو تیز تر کر دو. وَ اَجْلِبْ عَلَيْهِمْ بِخَيْلِكَ وَ رَجِلِكَ. اپنے لاؤلشکر ان کے (DISPOSAL). پر چھوڑ دو کہ یہ چاروں طرف سے اس امت پر یورش کریں وَ شَارِكْهُمْ فِي الْاَمْوَالِ وَ الْاَوْلَادِ. روپے پیسے سے ان کی مدد کرو اور ایسا انتظام کرو کہ قوم کا نوجوان طبقہ ان کی گرفت میں رہے. وَعِدْهُمْ (۱۷/۶۴) اور انہیں حکومت و اقتدار کے سبز باغ دکھا دکھا کر اپنے پیچھے لگاتے رہو. تم یہ کچھ کرو اور پھر دیکھو کہ اس خطۂ زمین میں بھی تمہاری حکمرانی کس طرح بدستور قائم رہتی ہے. یہ میرے مدتوں کے آزمائے ہوئے تیر ہیں جن کا نشانہ کبھی خطا نہیں جاتا. تم نے دیکھا نہیں کہ انہیں حربوں سے میں نے مسلمانوں کی اتنی اتنی بڑی مملکتوں کی کیا حالت بنا رکھی ہے؟ وہاں کے مسلمانوں کی کیفیت یہ ہے کہ ؎

آرزو اوّل تو پیدا ہو نہیں سکتی کہیں
ہو اگر پیدا تو مر جاتی ہے یا رہتی ہے خام!

تم دیکھتے نہیں کہ ؎

یہ ہماری سعیٔ پیہم کی کرامت ہے کہ آج صوفی و ملا ملوکیت کے بندے ہیں تمام!

تمہارے لئے گھبرانے کی کوئی بات نہیں ؎

ہے طوافِ و حج کا ہنگامہ اگر باقی تو کیا کُند ہو کر رہ گئی مومن کی تیغِ بے نیام!

ان حربوں نے جو کچھ ان ممالک میں کیا ہے، وہی کچھ اس نوزائیدہ مملکت میں بھی کیا جا سکتا ہے جب تک دنیا میں مذہبی پیشوائیت باقی ہے، ہمارے لئے خطرہ کی کوئی وجہ نہیں. تم اسے ہر طرح سے تقویت پہنچاتے رہو اور جو پروگرام میں نے پہلے تجویز کیا تھا اُس پر اور بھی زیادہ شدت سے

عمل پیرا ہو جاؤ۔ یعنی جہاں جہاں بھی مسلمان نظر آئے ؎

مست رکھو ذکر و فکرِ صبحگاہی میں اسے

پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اسے

اس پروگرام کے مطابق، تشکیلِ پاکستان کے ساتھ ہی، وہ مذہبی پیشوائیت، جو مسلسل دس سال تک تحریکِ پاکستان کی مخالفت کرتی چلی آرہی تھی، پاکستان میں آن موجود ہوئی۔ اقبالؒ اس سے بہت پہلے دنیا سے جاچکا تھا اور جناحؒ قیامِ پاکستان کے تھوڑے ہی عرصہ بعد ہم سے رخصت ہوگیا۔ اس لئے مذہبی پیشوائیت کو یہاں پوری طرح کھل کھیلنے کا موقعہ مل گیا۔ اس نے سب سے پہلے یہ اعلان کیا کہ

> چونکہ پاکستان، اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا اور حصولِ پاکستان کی تحریک اسی مقصد کے تحت چلائی گئی تھی کہ یہاں اسلامی حکومت قائم کی جائے .... اور چونکہ یہاں مسلمانوں کی قومی قیادت اب تک جن لوگوں کے ہاتھ میں رہی ہے وہ ایک اسلامی حکومت کو چلانے کی صلاحیت سے عاری محض ہیں۔ لہٰذا، انہیں چاہیئے کہ وہ مسندِ قیادت و سیادت سے دستبردار ہوجائیں اور ایک نئی قیادت کے لئے جگہ خالی کر دیں۔ (جماعت اسلامی)

اٹھائیس سال سے مسلسل یہاں یہی جنگ جاری ہے جس نے قوم کو ان مقاصد کے حصول کی طرف آنے ہی نہیں دیا جن کی خاطر پاکستان کا قیام عمل میں لایا گیا تھا۔ ملک کا سرمایہ دار طبقہ حسبِ معمول اس جنگ میں مذہبی پیشوائیت کے ساتھ ہے کیونکہ مذہبی پیشوائیت ان کے مفاد کی پوری پوری نگہداشت کرتی ہے۔ مثلاً یہاں جب یہ تجویز سامنے آئی کہ اللہ کی زمین جاگیرداروں اور زمینداروں کے قبضہ سے نکال کر، غریب کاشت کاروں کو دے دی جائے اور اس نہج کا قانون پاس کر دیا جائے کہ کسی شخص کے قبضہ میں اتنے ایکڑ سے زیادہ اراضی نہیں رہنے پائے گی تو مذہبی پیشوائیت کی طرف سے یہ فتوےٰ صادر فرمایا گیا کہ ایسا کرنا خلافِ شریعت ہے۔

> اسلام نے کسی نوع کی ملکیت پر بھی مقدار اور کمیت کے لحاظ

سے کوئی حد نہیں لگائی .... روپیہ، پیسہ، جانور، استعمالی اشیاء
مکانات، سواری، غرض کسی چیز کے معاملہ میں بھی قانوناً ملکیت
پر کوئی حد نہیں .... وہ جس طرح ہم سے یہ نہیں کہتا کہ
تم زیادہ سے زیادہ اتنا روپیہ، اتنے مکان، اتنا تجارتی کاروبار، اتنا
صنعتی کاروبار، اتنے مویشی، اتنی موٹریں، اتنی کشتیاں اور اتنی
فلاں چیز اور اتنی فلاں چیز رکھ سکتے ہو۔ اس طرح وہ تم سے یہ بھی
نہیں کہتا کہ تم زیادہ سے زیادہ اتنے ایکڑ زمین کے مالک ہو سکتے ہو۔

(مسئلہ ملکیت زمین' از سید ابوالاعلیٰ مودودی' صفحہ ۵۲ - ۴۲)

جب یہ سوال سامنے آیا کہ اتنے اتنے بڑے کارخانے سرمایہ داروں کی ذاتی ملکیت ہیں' انہیں ان کی ذاتی ملکیت سے نکال کر قوم کی مشترکہ تحویل میں دے دیا جائے تاکہ ان کی آمدنی قوم کے اجتماعی مفاد کے کام آئے تو مذہبی پیشوائیت کی طرف سے فتویٰ صادر ہو گیا کہ

ذرائع پیداوار کو قومی ملکیت بنانے کا تخیل بنیادی طور پر اسلام
کے نقطۂ نظر کی ضد ہے۔

(مسئلہ ملکیت زمین' صفحہ ۷۰)

نتیجہ اس کا یہ ہے کہ ملک کی ساری دولت سمٹ کر چند گھرانوں میں محدود ہو گئی ہے اور غریب طبقہ دن بدن روٹی تک بھی محتاج ہوتا چلا جا رہا ہے۔ مذہبی پیشوائیت خوش ہے کہ ان کا جہادِ عظیم کامیاب ہو رہا ہے اور سرمایہ دار مطمئن کہ اسلام کی ڈھال ان کے لئے تیار کر دی گئی ہے جس کے پیچھے وہ 'جو جی میں آئے کر سکتے ہیں۔

لیکن اس میں' عزیزانِ من! گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ جب ابلیس اپنے مشیروں کو یہ پروگرام دے رہا تھا تو آنسوئے افلاک سے یہ نشیدِ جلال بھی اس کے کانوں میں پہنچ رہی تھی کہ تم جو جی میں آئے کر دیکھو ــــ اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْھِمْ سُلْطٰنٌ (۱۷/۶۴) میرے بندوں پر تیرا کوئی جادو نہیں چل سکے گا ــــ وہ بندے کہ

جن کی خاکستر میں ہے اب تک شرارِ آرزو!

وہ شمعِ قرآنی کو لے کر اٹھیں گے اور تمہارے مکر و دجل کی پھیلائی ہوئی تاریکیوں کے پردے چاک کر کے، ان کے پیچھے چھپے ہوئے ایک ایک چہرے کو بے نقاب کرتے جائیں گے۔ یہ کشمکش نئی نہیں ہے

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی

اور تاریخ کے اوراق اس پر شاہد ہیں کہ جہاں اور جب بھی "چراغِ مصطفویؐ" کے علمبرداروں نے استقامت سے کام لے کر اپنی جدّوجہد جاری رکھی۔ "شرارِ بولہبی" خاکستر ہو کر رہ گیا۔ اور "فرعون، ہامان اور قارون" کا متحدہ محاذ بھی اسے بجھنے سے نہ بچا سکا ـــــ فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ؕ (۶/۴۵) اس طرح ہر ظلم کرنے والی جماعت کی جڑ کٹ گئی ـــــ وَ خَسِرَ هُنَالِكَ الْمُبْطِلُوْنَ (۴۰/۷۸) ـــــ اور قرآنی نظام کی مخالفت کرنے والی ہر قوت، خاکستر و نامراد رہ گئی۔ یہی پہلے ہوا ہے۔ یہی اب ہوگا۔ حقیقت ہے نہیں میرے تخیّل کی یہ خلّاقی!

اور یہ اس دن ہوگا جب مسلمانوں میں خدا کے عطا کردہ دین اور مذہبی پیشوائیت کے خود ساختہ مذہب میں فرق کرنے والی نگاہ پیدا ہو گئی اور اس قسم کی نگاہ قرآن کے علاوہ اور کہیں سے نہیں مل سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ جو اقبالؒ نے کہا تھا کہ

گر تو می خواہی مسلمان زیستن
نیست ممکن جز بقرآن زیستن

لہٰذا، عزیزانِ من! ہمارے لئے اقبالؒ کا پیغام یہ ہے ـــــ اور یہ پیغام اقبالؒ کا نہیں، درحقیقت قرآن کا پیغام ہے ـــــ کہ اس خطۂ زمین، ارضِ پاکستان کی حفاظت کا پورا پورا سامان کیا جائے۔ کہ اگر یہ خطۂ زمین ہی (خدانخواستہ) باقی نہ رہا تو قرآنی نظام نافذ کس جگہ ہو سکے گا۔ ـــــ اور جو تخریبی قوتیں اسلام کے نام پر ملک میں انتشار پیدا کرتی ہیں، ان کے فریب میں نہ آیا جائے۔ اور اس کے ساتھ ہی ملک میں قرآنی پیغام کو عام کرتے جائیں۔ جب یہ پیغام فضا میں عام ہو گیا تو تخریبی قوتیں اس طرح کافور ہو جائیں گی جس طرح طلوعِ سحر سے

رات کی تاریکی کفن پوش ہو جاتی ہے۔ اگر آپ نے ایسا کر لیا، تو یقین جانیئے کہ ؎

آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش	اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی
اس قدر ہوگی ترنم آفریں بادِ بہار	نکہتِ خوابیدہ غنچے کی نوا ہو جائے گی
شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ جہاں معمور ہوگا نغمۂ توحید سے

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ ؁

کیا اقبالؒ اشتراکی تھا؟

جولائی ۱۹۶۹ء

آج کل ہمارے ہاں، یہ موضوع بڑی شدت سے مرکزِ بحث و جدل بن رہا ہے کہ علامہ اقبالؒ اشتراکی تھے یا نہیں۔ ایک فریق انہیں، بدلائل و شواہد، اشتراکی ثابت کر رہا ہے اور دوسرا فریق انہیں انہی کے کلام اور تحریرات سے اشتراکیت کا دشمن بتا رہا ہے۔ اربابِ دانش مرحوم کو اس طرح رگید رہے ہیں اور عوام انگشت بدنداں ہیں کہ یہ ہمارا کس قسم کا حکیم الامت ہے جس کی کیفیت یہ ہے کہ

جناب شیخ کے نقشِ قدم یوں بھی ہیں اور یوں بھی

حضرت علامہ کا جو احترام ہمارے دل میں؛ اور ان کا جو مقام دنیائے علم و فکر میں ہے، اس کا تقاضا ہے کہ ہم حقیقتِ حال کو سامنے لا کر انہیں (کم از کم) اس الزام سے بچائیں کہ وہ اس قدر اہم موضوع پر ایسے متضاد خیالات کے حامل تھے۔ اس میں شک نہیں کہ اقبالؒ چونکہ شاعر بھی تھے اس لئے ان کے کلام میں بعض مقامات پر تضاد بھی پایا جاتا ہے اور بعض نکات کے متعلق ہمیں ان کے فہمِ قرآن سے بھی اختلاف ہے۔ لیکن ہمارے مطالعۂ اقبالؒ کی رُو سے، مسئلہ زیرِ نظر کے متعلق ان کے ہاں تضاد نہیں۔ اور وہ جس نتیجہ پر پہنچے ہیں، وہ ہمارے نزدیک قرآنی تعلیم کے مطابق ہے۔

واضح رہے کہ ہم اس موضوع پر اس لئے قلم نہیں اٹھا رہے کہ اگر ثابت ہو جائے کہ علامہ اقبالؒ اشتراکیت کے حامی اور مؤید تھے تو ہم کہہ دیں کہ اشتراکیت عین مطابق اسلام ہے اور اگر ایسا ثابت نہ ہو تو کہہ دیا جائے کہ اسلام اشتراکیت کے خلاف ہے۔ ہمارے نزدیک، کسی نظریہ یا مسلک کے اسلام کے مطابق یا مخالف ہونے کی سند اور حجت خدا کی کتاب زندہ قرآن حکیم ہے، نہ کہ کسی فرد کا قول یا خیال۔ حتیٰ کہ ہم کسی شخص کے فہم قرآن کو بھی قرآنی سند اور حجت کا مقام نہیں دے سکتے۔

ہم نے جب اس بحث پر غور کیا تو یہ حقیقت سامنے آئی کہ اس مجادلہ کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ جس طرح ہمارے ہاں "اسلام" کا کوئی متعین مفہوم نہیں — ہر فرد کا اسلام کا مفہوم الگ الگ ہے، حتیٰ کہ ایک ہی شخص کا، مختلف اوقات میں اسلام کا مفہوم مختلف ہوتا ہے۔ کبھی "زمین پر بے حد و نہایت ذاتی ملکیت" عین اسلام ہے اور کبھی "دو سو ایکڑ رقبہ کی تحدید" عین دین۔ اسی طرح اشتراکیت کا بھی کوئی متعین مفہوم سامنے نہیں لایا جا رہا اور ارباب علم اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ جب کسی اصطلاح کا مفہوم متعین نہ رہے تو اس کا نتیجہ الجھاؤ کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ کسی لفظ یا اصطلاح کا مفہوم متعین کیجئے۔ آدھا مسئلہ اسی سے حل ہو جائے گا۔ لہٰذا، مسئلہ زیر نظر کے سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے اشتراکیت کا مفہوم متعین کیا جائے گا۔ واضح رہے کہ "اشتراکیت" سے ہماری مراد وہ سوشلزم ہے جس کا تصور مارکس نے دیا تھا۔

کارل مارکس محض ایک ماہر معاشیات نہیں تھا۔ اس کا شمار فلاسفرز کے زمرہ میں بھی ہوتا ہے۔ اس نے بنیادی طور پر ایک فلسفہ پیش کیا تھا اور پھر اس فلسفہ کی بنیادوں پر ایک معاشی نظام کا نقشہ دیا تھا جس کی ابتدائی شکل سوشلزم اور انتہائی کمیونزم ہے۔ لہٰذا، سوشلزم سے مراد ہے مارکس کا پیش کردہ فلسفہ حیات اور اس پر متفرع معاشی نظام۔ مارکس کے فلسفہ حیات کی رُو سے، انسان کی زندگی بس یہی طبیعی زندگی ہے اور اس سے متعلق مسائل مادی۔ اس تصورِ حیات کے مطابق، نہ خدا کا وجود باقی رہتا ہے نہ وحی کا۔ جب وحی کا وجود باقی نہ رہے تو نہ نبوت کا تصور باقی رہتا ہے، نہ اس کی وساطت سے عطا کردہ مستقل اقدار کا۔ اور ظاہر ہے کہ اس کے بعد حیاتِ اُخروی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ ہے (مسئلہ زیر نظر کی حد تک) مارکس کے فلسفہ حیات

کا ملخص.

جہاں تک معاشی نظام کا تعلق ہے، مارکس کے نظریہ کا ماحصل یہ ہے کہ

(۱) نظامِ سرمایہ داری کا دور ختم ہو چکا ہے. اب اس کی جگہ ایسا نظام لے گا جو اس نظام (سرمایہ داری) کی ضد ہوگا.

(۲) اس (جدید) نظام میں ذرائع پیداوار، افراد کی ذاتی ملکیت کے بجائے، محنت کشوں کی مشترکہ ملکیت (یا تحویل) میں رہیں گے.

(۳) فاضلہ دولت، جو نظامِ سرمایہ داری کی اصل و بنیاد ہے کسی کے پاس نہیں رہے گی.

(۴) جب فاضلہ دولت کسی کے پاس نہیں رہے گی تو دولت کی بنیاد پر، دوسروں کی محنت کو غصب کر کے مزید دولت کمانے کا سوال باقی نہیں رہے گا. نہ ذاتی جائیدادیں کھڑی کی جا سکیں گی. نہ انفرادی کارخانے لگائے جا سکیں گے. نہ سودی کاروبار ہو سکے گا. نہ یہ صورت پیدا ہو سکے گی کہ

اُمتے بر اُمتے دیگر چرد
دانہ ایں می کارد آں حاصل بُرد

ان تصریحات سے واضح ہے کہ جو شخص اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہے وہ مارکس کے پیش کردہ فلسفۂ حیات کا کبھی مویّد نہیں ہو سکتا. اسلام کا فلسفۂ حیات اور مارکسی فلسفۂ حیات ایک دوسرے کی ضد ہیں.

اب رہا معاشی نظام. سو اگر اسلام کا مفہوم غیر متعین رکھا جائے تو پھر مارکسی نظام، خلافِ اسلام بھی ہو سکتا ہے اور مطابقِ اسلام بھی. لیکن اگر اس کے مفہوم کے لئے قرآنِ کریم کو حرفِ آخر قرار دے لیا جائے تو اس کے اثبات میں کوئی شبہ نہیں رہ جاتا کہ قرآنِ کریم نظامِ سرمایہ داری کا سخت دشمن ہے اور اشتراکی نظام قرآن کے معاشی نظام کے مماثل[۱] ہے.

آیئے، ہم دیکھیں کہ اقبالؒ اس باب میں کیا کہتا ہے.

---

[۱] میں نے سوشلزم اور قرآن کے معاشی نظام کی تشریح اپنے اس خطاب میں کی تھی جو "اسلامی سوشلزم" کے عنوان سے طلوعِ اسلام کنونشن منعقدہ اپریل ۱۹۷۲ء میں پیش کیا گیا تھا.

اقبالؒ کا قلبِ دردآگیں

اقبالؒ نے اپنے سینے میں ایک دردآگیں قلب پایا تھا جو مفلسوں اور ناداروں، محنت کشوں اور مزدوروں کی زبوں حالی پر خون کے آنسو بن کر اس کی چشمِ گریاں سے ٹپک پڑتا تھا۔ ان کی سب سے پہلی (نثر کی) کتاب "علم الاقتصاد" ۱۹۰۳ء میں شائع ہوئی تھی۔ وہ اس کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

> اس میں کچھ شک نہیں کہ تاریخِ انسانی کے سیلِ رواں میں اصولِ مذہب بھی بے انتہا مؤثر ثابت ہوئے ہیں۔ مگر یہ بات بھی روزمرہ کے تجربہ اور مشاہدہ سے ثابت ہوتی ہے کہ روزی کمانے کا دھندہ ہر وقت انسان کے ساتھ ساتھ ہے اور چپکے سے اس کے ظاہری اور باطنی قویٰ کو اپنے سانچے میں ڈھالتا رہتا ہے۔ ذرا خیال کرو کہ غریبی یا یوں کہو کہ ضروریاتِ زندگی کے کامل طور پر پورا نہ ہونے سے انسانی طرزِ عمل کہاں تک متاثر ہوتا ہے۔ غریبی قویٰ انسانی پر بہت بُرا اثر ڈالتی ہے۔ بلکہ بسا اوقات انسانی روح کے مجلا آئینہ کو اس قدر زنگ آلود کر دیتی ہے کہ اخلاقی اور تمدنی لحاظ سے اس کا وجود و عدم برابر ہو جاتا ہے۔ معلمِ اوّل یعنی حکیم ارسطو سمجھتا تھا کہ غلامی تمدنِ انسانی کے قیام کے لئے ایک ضروری جزو ہے مگر مذہب اور زمانۂ حال کی تعلیم نے انسان کی جبلی آزادی پر زور دیا اور رفتہ رفتہ مہذب قومیں محسوس کرنے لگیں کہ یہ وحشیانہ تفاوتِ مدارج، بجائے اس کے کہ قیامِ تمدن کے لئے ایک ضروری جزو ہو، اس کی تخریب کرتا ہے اور انسانی زندگی کے ہر پہلو پر نہایت مذموم اثر ڈالتا ہے۔ اسی طرح اس زمانے میں یہ سوال پیدا ہوا ہے کہ آیا مفلسی بھی نظمِ عالم میں ایک ضروری جزو ہے؟ کیا یہ ممکن نہیں کہ ہر فرد مفلسی کے دکھ سے آزاد ہو؟ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ گلی کوچوں میں چپکے چپکے کراہنے والوں کی دلخراش صدائیں ہمیشہ کے لئے خاموش ہو جائیں اور ایک دردمند دل کو ہلا دینے والے افلاس کا دردناک نظارہ ہمیشہ کے لئے صفحۂ عالم سے حرفِ غلط کی طرح مٹ جائے۔

یہ ۱۹۰۳ء کی بات ہے۔ غور کیجئے کہ اتنی سی عمر میں، اقبالؒ کے دل میں کس قسم کے سوالات اُبھر رہے تھے۔ یہ سوالات کہ (۱) آیا مفلسی بھی نظمِ عالم میں ایک ضروری جزو ہے اور (۲) کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ گلی کوچوں میں چپکے چپکے کراہنے والوں کی دلخراش صدائیں ہمیشہ کے لئے خاموش ہو جائیں اور ایک دردمند دل کو ہلا دینے والا نظارہ ہمیشہ کے لئے صفحۂ عالم سے حرفِ غلط کی طرح مٹ جائے؟ ـــــ ان سوالات میں "ہمیشہ کے لئے" کے الفاظ بڑے غور طلب ہیں۔ اقبالؒ کی باقی زندگی (منجملہ دیگر) انہی سوالات کے اطمینان بخش جواب کی تلاش میں گزری۔ ظاہر ہے کہ ان کا جواب ہمارے "مروجہ مذہب" کے معاشی نظام سے نہیں مل سکتا تھا کہ جس کی بنیاد اس عقیدہ پر ہے کہ نظمِ عالم کے لئے مفلسی ایک جزوِ لازم ہے۔ کیونکہ اگر مفلسی نہ رہے تو دولت مند لوگ صدقہ اور خیرات دے کر ثواب کیسے حاصل کر سکیں گے اور مفلسی سے کراہنے والوں کی دلخراش صدائیں ہمیشہ کے لئے خاموش نہیں ہونی چاہئیں۔ کیونکہ اگر ایسا ہو گیا تو صدقہ دخیرات سے متعلق احکامِ شریعت معطل ہو کر رہ جائیں گے!

اقبالؒ اور نظامِ سرمایہ داری

لیکن اقبالؒ نے ان سوالات کا جواب قرآنِ حکیم کے عالمگیر ابدی ضابطۂ حیات سے پا لیا اور انہی جوابات کو وہ امت اور عالمگیر انسانیت کے سامنے پیش کرتے رہے۔ سب سے پہلے انہیں قرآن کی دفتین سے یہ جواب ملا کہ مفلسی اور ناداری کا بنیادی سبب نظامِ سرمایہ داری ہے اور جب تک اس نظام کی جڑیں نہیں کٹتیں کراہنے والوں کی دلخراش صدائیں خاموش نہیں ہو سکتیں۔ ان صداؤں کا علاج، محتاجوں اور مفلسوں کی جھولی میں بھیک کے ٹکڑے ڈال دینے میں نہیں۔ ان کا علاج، اس نظام کے الٹ دینے میں ہے جو انہیں مفلس اور محتاج بناتا ہے۔ اس حقیقت کے پیشِ نظر، اقبالؒ نے نظامِ سرمایہ داری کے خلاف جہاد کو اپنی زندگی کا مشن قرار دے لیا۔ وہ اپنی مشہور نظم "خضرِ راہ" میں خضر سے سوال کرتے ہیں کہ

زندگی کا راز کیا ہے؟ سلطنت کیا چیز ہے؟
اور یہ سرمایہ و محنت میں ہے کیسا خروش؟

اور خضر کی زبانی اس سوال کا یہ جواب دیتے ہیں کہ

بندۂ مزدور کو جا کر مرا پیغام دے　　خضر کا پیغام کیا ہے یہ پیامِ کائنات!
اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دارِ حیلہ گر　　شاخِ آہو پر رہی صدیوں تیری برات
مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار　　انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات
اُٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دَور کا آغاز ہے

اسی زمانہ میں، ان کا فارسی مجموعۂ کلام "پیامِ مشرق" شائع ہوا۔ اس کے آخری باب "نقشِ فرنگ" کا بیشتر حصّہ، محنت اور سرمایہ کے اہم موضوع کے لئے وقف ہے۔ وہ اس میں "صحبتِ رفتگاں" کے عنوان کے تحت ٹالسٹائے کی زبان سے کہلواتے ہیں۔

دارُوئے بیہوشی است، تاج، کلیسا، وطن
جانِ خداداد را خواجہ بجامے خرید!

اور کارل مارکس کے یہ الفاظ دہراتے ہیں کہ

رازدانِ جزو کل، از خویش نامحرم شد است　　آدم از سرمایہ داری قاتلِ آدم شد است

ٹالسٹائے، ہیگل کے فلسفۂ اضداد کو "عقلِ دو رو" کی آفرینش کی تخلیق قرار دے کر اس پر ان الفاظ میں سخت تنقید کرتا ہے کہ اس کی رُو سے وہ

درسِ رضا می دہی بندۂ مزدور[1] را

ایرانی تحریکِ کمیونزم کا بانی "مزدک"، دورِ حاضر کی اضطراب انگیزیوں کو دیکھ کر، پکار اٹھتا ہے کہ

ذاتۂ ایراں زکشتِ زار و قیصر بردمید　　مرگِ نومی رقصد اندر قصرِ سلطان و امیر
مدتے در آتشِ نمرود می سوزد خلیل　　تا تہی گردد خریش از خداوندانِ پیر
دورِ پرویزی گذشت اے کشتۂ پرویز خیز
نعمتِ گم گشتۂ خود را ز خسرو باز گیر

اس کے ساتھ ہی، مزدوروں کا نمائندہ، "کوہکن"، اس نفیرِ قیامت خیز کے ساتھ سامنے آتا ہے۔

---

[1] انسانوں کا خود ساختہ مذہب، غریب کو تقدیرِ خداوندی پر شاکر رہنے کی تلقین سے درسِ رضا دیتا ہے۔

نگارِ من کہ بسے سادہ و کم آمیز است | ستیزہ کیش و ستم کوش و فتنہ انگیز است
برونِ او ہمہ بزم و درونِ او ہمہ رزم | زبانِ او ز مسیح و دلش ز چنگیز است
اگرچہ تیشۂ من کوہ را ز پا آورد | ہنوز گردشِ گردوں بکامِ پرویز است

زخاک تا بہ فلک ہر چہ ہست رہ پیماست
قدم کشائے کہ رفتارِ کارواں تیز است

اس کے بعد ہمارے سامنے فرانسیسی فلاسفر آگسٹس کومٹ اور مردِ مزدور کا مکالمہ آتا ہے۔ کومٹ، فلسفۂ مادیت کا علمبردار تھا اور طبقات کی تفریق کو عین مطابقِ فطرت قرار دیتا تھا۔ اس کے فلسفہ کے جواب میں، مردِ مزدور کہتا ہے۔

فریبِ حکمت مرا اے کلیم | کہ نتواں شکست ایں طلسمِ قدیم
مسِ خام را از زر اندودۂ | مرا خوئے تسلیم فرمودۂ
تو کوہکن دادی اے نکتہ سنج | بہ پرویز پرکار و نابردہ رنج؟
جہاں راست بہروزی از دستِ مزد | ندانی کہ ایں ہیچ کاراست دزد

پئے جرم او پوزش آوردۂ؟
بایں عقل و دانش فسوں خوردۂ؟

ازاں بعد، سرمایہ دار اور مزدور کا قسمت نامہ ہمارے سامنے آتا ہے۔ اس تقسیم کی رو سے، سرمایہ دار مزدور سے کہتا ہے کہ میاں، اس حقیقت کو فراموش نہ کرو کہ

غوغائے کارخانۂ آہنگری ز من | گلبانگِ ارغنونِ کلیسا ازانِ تو
نخلے کہ شہ خراج بروی نہد ز من | باغِ بہشت و سدرہ و طوبیٰ ازانِ تو
تلخابۂ کہ دردِ سر آرد ازانِ من | صہبائے پاکِ آدم و حوّا ازانِ تو

ایں خاک و آنچہ در شکمِ او ازانِ من
وز خاک تا بہ عرشِ معلےٰ ازانِ تو

اور پھر، مزدور کی یہ دلخراش صدائے دردناک ہمارے کانوں میں آتی ہے۔

ز مزدِ بندۂ کرپاس پوش و محنت کش | نصیبِ خواجۂ ناکردہ کار رختِ حریر

زخوئے فشانیِ من لعلِ خاتمِ والی | زاشکِ کودکِ من گوہرِ ستامِ امیر
زخونِ من چو زلوفہ بہی کلیسا را | بزورِ بازوئے من دستِ سلطنت ہمہ گیر

خرابہ رشکِ گلستاں زگریۂ سحرم
شبابِ لالہ و گل از طراوتِ جگرم

اور اس کا ردِ عمل —

بیاکہ تازہ نوا می تراود از رگِ ساز | مئے کہ شیشہ گداز د بساغر اندازیم
مغان و دیرِ مغاں را نظامِ تازہ دہیم | بناتے میکدہائے کہن بر اندازیم
ز رہزنانِ چمن انتقامِ لالہ کشیم | بہ بزمِ غنچہ و گل طرحِ دیگر اندازیم

بطوفِ شمع چو پروانہ زیستن تاکے
زخویش ایں ہمہ بیگانہ زیستن تاکے

یہی حشر بداماں پیغامِ انقلاب ہے جسے "زبورِ عجم" میں ان الفاظ میں وجۂ تزلزلِ قصرِ سرمایہ داری بنایا گیا ہے۔

خواجہ از خونِ رگِ مزدور سازد لعلِ ناب | از جفائے دہ خدایاں کشتِ دہقاں خراب

انقلاب

انقلاب اے انقلاب

"بالِ جبریل" میں فرشتوں کا گیت' اسی رُوحِ انقلاب کا مظہر یہ نشتر ہے۔ وہ خدائے کائنات کو مخاطب کر کے شکوہ سنج ہیں کہ

خلقِ خدا کی گھات میں رند و فقیر و میر و پیر | تیرے جہاں میں ہے وہی گردشِ صبح و شام ابھی!
تیرے امیر مال مست تیرے فقیر حال مست | بندہ ہے کوچہ گرد ابھی خواجہ بلند بام ابھی!

اور یہی وہ "عرش کے کنگورے ملا دینے والا" احتجاج ہے جس کے جواب میں خدا کی طرف سے فرشتوں کو حکم ملتا ہے کہ

اٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو | کاخِ امرا کے در و دیوار ہلا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی | اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے — پیرانِ کلیسا کو کلیسا سے اٹھا دو
حق را بسجودے صنماں را بطوافے — بہتر ہے چراغِ حرم و دیر بجھا دو
میں ناخوش و بیزار ہوں مرمر کی سلوں سے
میرے لئے مٹی کا حرم اور بنا دو

یہی بات ضربِ کلیم میں ان الفاظ میں کہی گئی ہے کہ

اے شیخ امیروں کو مسجد سے نکلوا دے — ہے ان کی نمازوں سے محراب ترش ابرو

اس لئے کہ

کثرتِ نعمت گداز از دل برد — ناز می آرد نیاز از دل برد
سالہا اندر جہاں گردیدہ ام — نم بچشم منعماں کم دیدہ ام (جاوید نامہ)

ہم پوچھتے ہیں کہ کیا کسی اشتراکی (ہی نے نہیں بلکہ کسی کمیونسٹ) نے اس سے زیادہ تند و تیز الفاظ میں، نظامِ سرمایہ داری کو الٹنے کے لئے دعوتِ انقلاب دی ہے؟ بالِ جبریل میں لینن خدا کے حضور یہ شکایت کرتا دکھائی دیتا ہے کہ

تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں — ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات
کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ — دنیا ہے تری منتظرِ روزِ مکافات

اور اس کا جواب، چار ہی قدم آگے چل کر، ہمیں اقبالؒ کے الفاظ میں یہ ملتا ہے کہ

گیا دورِ سرمایہ داری گیا — تماشہ دکھا کر مداری گیا

جاوید نامہ میں، مسلمان کی تباہی و بربادی کے اسباب کا تجزیہ کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

چار مرگ اندر پئے ایں دیر میر — سود خوار و والی و ملّا و پیر

دوسری جگہ ہے۔

باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری — اے کشتۂ سلطانی و ملّائی و پیری

ملّا و پیر، غریبوں اور ناداروں کو جس اسلام کا سبق پڑھاتے ہیں، اقبالؒ اسے ابلیس کا پیدا کردہ فریب قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ ارمغانِ حجاز میں، ابلیس کی زبان سے کہلوایا گیا ہے کہ

میں نے ناداروں کو سکھلایا سبق تقدیر کا — میں نے منعم کو دیا سرمایہ داری کا جنوں

اور دورِ حاضر کے علم و فلسفہ اور تجارت و سیاست کو ملوکیت کی دیسہ کاریوں کی تخلیق۔

یہ علم یہ حکمت یہ سیاست یہ تجارت
جو کچھ ہے وہ ہے فکرِ ملوکانہ کی ایجاد　　(ارمغانِ حجاز)

مثبت نظامِ معیشت

اقبالؒ اس طرح نظامِ سرمایہ داری کے بُتِ سامری کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے آگے بڑھتے ہیں اور قرآنی نظامِ معیشت کی بنیادی شقوں کو سامنے لاتے ہیں۔ نظامِ سرمایہ داری کی بنیاد اس نظریہ پر ہے کہ ذرائع پیداوار افراد کی ذاتی ملکیت میں رہنے چاہئیں۔ اقبالؒ کے نزدیک یہ نظریہ قرآنی نظریہ معیشت کی یکسر نقیض ہے اور ابلیسانہ فکر کی ایجاد۔ ذرائع پیداوار میں بنیادی حیثیت زمین (ارض) کو حاصل ہے۔ اس باب میں اقبالؒ کا نظریہ اس قدر واضح ہے کہ اس میں دو آراء ہو نہیں سکتیں۔ جاوید نامہ میں انہوں نے "محکماتِ عالمِ قرآنی" کے جو تین ستون بیان کئے ہیں، ان میں ایک ستون یہ ہے کہ

ارض ملکِ خداست

اس عنوان کے تابع وہ لکھتے ہیں:۔

حق زمیں را جز متاعِ ما نہ گفت　　ایں متاعِ بے بہا مفت است مفت
دہ خدایا! نکتہ از من پذیر　　رزق و گور از وے بگیر اُو را مگیر

باطنِ "الارض للہ" ظاہر است
ہر کہ ایں ظاہر نہ بیند کافر است

ہم نہیں سمجھتے کہ اقبالؒ، اس مسئلہ کے متعلق، اس سے واضح تر الفاظ میں، اور کیا کہہ سکتا تھا۔ آپ نے غور نہیں فرمایا کہ وہ مسئلہ ملکیتِ زمین کو، 'کفر و ایمان'، کی بنیاد قرار دیتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ زمین کو افراد کی ذاتی ملکیت قرار دینا کفر ہے۔

آگے چل کر کہتے ہیں۔

رزقِ خود را از زمیں بُردن رواست　　ایں "متاعِ" بندہ و ملکِ خداست

اور اس کی تشریح ان الفاظ میں کرتے ہیں:۔

ایں کہ می گوئی متاعِ ما زِ ماست مردِ ناداں ایں ہمہ ملکِ خداست
ارضِ حق را ارضِ خود دانی ، بگو چیست شرحِ آیۂ لَا تُفْسِدُوا!
ابنِ آدم دل بہ ابلیسی نہاد من ز ابلیسی ندیدم جز فساد
بردۂ چیزے کہ از آنِ تو نیست
داغم از کارے کہ شایانِ تو نیست

اور اس کے بعد کہتے ہیں کہ

ملکِ یزداں را بہ یزداں باز دِہ تا ز کارِ خویش بکشائی گرہ

"ابلیس کی مجلسِ شوریٰ" (ارمغانِ حجاز) میں، ابلیس کی زبان سے کہلوایا گیا ہے۔

اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب
پادشاہوں کی نہیں، اللہ کی ہے یہ زمیں

"بالِ جبریل" میں اس اجمال کی تفصیل حسبِ ذیل الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔ نظم کا عنوان ہے۔

الْاَرْضُ لِلّٰهِ

وہ زمیندار کو (جو اپنے آپ کو زمین کا مالک سمجھتا ہے) مخاطب کر کے کہتے ہیں۔

پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون کون دریاؤں کی موجوں سے اٹھاتا ہے سحاب
کون لایا کھینچ کر پچھم سے بادِ سازگار خاک یہ کس کی ہے، کس کا ہے یہ نورِ آفتاب
کس نے بھر دی موتیوں سے خوشۂ گندم کی جیب موسموں کو کس نے سکھلائی یہ خوئے انقلاب
دِہ خدایا! یہ زمیں تیری نہیں، تیری نہیں
تیرے آبا کی نہیں، تیری نہیں، میری نہیں

جب یہ زمین تیرے آبا کی نہیں تھی تو اسے وراثت میں پا کر مالک بننے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور جب یہ نہ تیری ہے نہ میری تو اسے کسی دوسرے کے ہاتھ فروخت کیسے کیا جا سکتا ہے؟ یہ خدا کی ہے اور قرآن کی رُو سے جس چیز کو خدا اپنی طرف منسوب کرتا ہے، اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ وہ تمام انسانوں کے فائدے کے لئے کھلی رہے گی۔ کسی کی ذاتی ملکیت میں نہیں جا سکے گی۔ جیسے اس نے جب کعبہ کے متعلق کہا کہ وہ میرا گھر (بیتی) ہے تو اس کے ساتھ ہی کہہ دیا گیا کہ اسے للناس بنایا

گیا ہے یعنی تمام نوعِ انسانی کے فائدے کے لئے۔ اس لئے وہ سواء ن العاکف و الباد۔ یعنی وہاں کے رہنے والوں اور باہر سے آنے والوں، سب کے لئے یکساں طور پر کھلا یہی حیثیت زمین کی ہے، وہ نوعِ انسان کے لئے متاع (سامانِ زیست حاصل کرنے کا ذریعہ) ہے کسی کی ذاتی جائیداد نہیں۔

فاضلہ دولت جیسا کہ شروع میں لکھا جاچکا ہے، نظامِ سرمایہ داری کی بنیاد فاضلہ دولت (SURPLUS MONEY) ہے۔ اس سلسلہ میں قرآنِ کریم کا فیصلہ صاف اور واضح ہے۔ سورۂ بقرہ میں ہے۔ یَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ۔ اے رسول! تجھ سے یہ لوگ پوچھتے ہیں کہ ہم کس قدر دولت رفاہِ عامہ کے لئے دے دیں۔ قُلِ الْعَفْوَ (۲/۲۱۹) ان سے کہہ دو کہ تمہاری ضروریات سے زاید جس قدر ہے، سب کی سب۔ اس فیصلہ نے فاضلہ دولت کا تصور ہی ختم کر دیا۔ قرآنِ کریم کے اسی فیصلہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اقبالؒ جاوید نامہ میں کہتے ہیں کہ قرآن نے

با مسلماں گفت جاں برکف بنہ ہر چہ از حاجت فزوں داری بدہ

جب روس میں اشتراکیت کا انقلاب برپا ہوا تو اقبالؒ کی نگہ ژرف بیں و دُور رس نے اس میں فطرت کے اس اشارہ کو مضمر دیکھا کہ وہ دَور قریب آ رہا ہے جب قرآن کا معاشی نظام وجۂ شادابیٔ عالم بن جائے گا۔ ضربِ کلیم کی یہ نظم (جس کا عنوان اشتراکیت ہے) اسی حقیقت کی پردہ کشائی کرتی ہے۔

قوموں کی روش سے مجھے ہوتا ہے یہ معلوم بے سود نہیں روس کی یہ گرمیٔ رفتار
اندیشہ ہوا شوخیٔ افکار پہ مجبور فرسودہ طریقوں سے زمانہ ہوا بیزار
انساں کی ہوس نے جنہیں رکھا تھا چھپا کر کھلتے نظر آتے ہیں بتدریج وہ اسرار
قرآں میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلماں اللہ کرے تجھ کو عطا جدّتِ کردار
جو حرفِ قُلِ الْعَفْوَ میں پوشیدہ ہے اب تک
اس دَور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار

جب قرآن کی یہ مضمر حقیقت نمودار ہو گی تو اس وقت اس دنیا کا نقشہ کیا ہو گا، اسے اقبالؒ نے

جاوید نامہ میں، فلکِ مریخ پر، شہرِ مرغدین (دین کا گلستان) کے رنگ میں پیش کیا ہے اس میں

سخت کش دہقاں چراغش روشن است — از نہابِ دِہ خدایاں ایمن است
کِشت وکارش بے نزاعِ آبجوست — حاصلش بے شرکتِ غیرے از اوست

اور

نے بہ بازاراں زبیکاراں خروش — نے صداہائے گدایاں دردِ گوش

اقبالؒ اپنی ۱۹۰۳ء کی آرزو کو (جس کا ذکر شروع میں کیا جاچکا ہے) قرآنی نظام کی اس آئیڈیل دنیا میں پورا ہوتے دیکھتا ہے جہاں کیفیت یہ ہے کہ

کس دریں جا سائل و محروم نیست
عبد و مولا حاکم و محکوم نیست

اسی کو وہ دین کا ماحصل قرار دیتا ہے جب کہتا ہے کہ

کس نگردد در جہاں محتاجِ کس — نکتۂ شرعِ مبیں این است و بس

اقبالؒ نے معاشی نظام کے متعلق جو کچھ کہا ہے، وہ آپ کے سامنے ہے۔ آپ اس پر غور کیجئے اور دیکھئے کہ اس میں اور اشتراکی نظام میں کس قدر مماثلت ہے۔ اقبالؒ کو یقین تھا کہ جس معاشی نظام کو اس نے قرآن سے سمجھا ہے وہ عہدِ رسالتمآبؐ میں عملاً متشکل ہوگیا تھا اور چونکہ وہ نظام، اشتراکیت کے مماثل تھا، اس لئے ابوجہل کو یہ مغالطہ لگ رہا تھا کہ

ایں مساوات ایں مواخات اعجمی است
خوب می دانم کہ سلماں مزدکی است

۲۔ اِشتراکیت کی مخالفت

یہاں تک ہم نے دیکھ لیا ہے کہ اقبالؒ، اشتراکی نظامِ معیشت کا حامی تھا کیونکہ وہ نظام قرآن کے معاشی نظام کے مماثل ہے۔ لیکن اقبالؒ اشتراکیت کے فلسفہ حیات کا تو حامی نہیں

ہو سکتا تھا۔ کیونکہ وہ فلسفہ، قرآن کے فلسفۂ زندگی کی یکسر نقیض ہے۔ لہٰذا، اس فلسفۂ حیات کی تردید اور مخالفت کی اور سخت مخالفت۔ اس فلسفہ کی بنیاد "انکار" پر ہے، جسے اقبالؒ لاؔ سے تعبیر کرتا ہے۔ ۔ خدا کا انکار، وحی کا انکار، مستقل اقدار کا انکار، اُخروی حیات کا انکار ۔ اقبالؒ نے اس فلسفہ پر تنقید کی اور کہا کہ اس پر متفرع نظامِ زندگی کبھی پروان نہیں چڑھ سکتا۔ وہ اپنی مثنوی ۔ پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق ۔ میں روس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

کردہ ام اندر مقاماتش نگہ
لا سلاطیں، لا کلیسا، لا الٰہ!

لا سلاطیں اور لا کلیسا تک تو بات درست ہے کہ یہ نظامِ سرمایہ داری کے کل پُرزے ہیں لیکن لا الٰہ کے بعد، الا اللہ نہایت ضروری ہے۔ اس لئے کہ

در مقامِ لا نیاساید حیات سُوئے اِلّا می خرامد کائنات
لاؔ و اِلّاؔ برگ و سازِ امتاں نفیٔ بے اثبات مرگِ امتاں

وہ جاوید نامہ میں ملتِ روسیہ کو حسبِ ذیل پیغام دیتے ہیں:

تو کہ طرحِ دیگرے انداختی دل ز دستورِ کہن پرداختی
کردۂ کارِ خداونداں تمام بگذر از لاؔ جانبِ اِلّاؔ خرام
درگذر از لاؔ اگر جویندۂ تا رہِ اثبات گیری زندۂ

ایکہ می خواہی نظامِ عالمے
جستۂ اُو را اساسِ محکمے

یہ اساسِ محکم اُسے کہاں سے ملے گی؟ ۔ کہتے ہیں۔

داستانِ کہنہ شستی باب باب فکر را روشن کن از اُمّ الکتاب

ان تصریحات سے آپ نے دیکھ لیا کہ اقبالؒ، اشتراکیت کے معاشی نظام کی حمایت تو کرتا ہے لیکن اشتراکیت کے فلسفۂ حیات کا سخت مخالف ہے۔ خود کارل مارکس کی یہی دو حیثیتیں ہیں جنہیں وہ بڑے حسین اور بلیغ انداز میں بیان کرتا ہے۔ وہ اس کے متعلق کہتا ہے۔

صاحبِ سرمایہ[1] از نسلِ خلیل　　یعنی آں پیغمبرِ بے جبرئیل

یعنی وہ پیامبرِ انقلاب تو ہے لیکن وحی کی راہ نمائی سے محروم ہے۔ اس کا انقلابی پروگرام (جو نظامِ سرمایہ داری کو مٹا کر اس کی جگہ اشتراکی نظام قائم کرنے کا مدّعی ہے جو قرآنی نظام کے مماثل ہے) برحق ہے۔ لیکن اس کا فلسفۂ زندگی یکسر باطل ہے۔

زانکہ حق در باطلِ اُو مضمر است　　قلبِ اُو مومن دماغش کافر است

کس قدر برجستہ اور بلیغ ہے یہ تجزیہ! اس کا قلب دردآگیں، مفلسوں، محتاجوں، مزدوروں، محنت کشوں کے مصائب سے وقفِ اضطراب ہے اور ان کی مشکلات کے حل کے لئے کوئی انسانیت ساز نظام تجویز کرنا چاہتا ہے۔ اس لئے اس کا قلب مومن ہے۔ لیکن اس کا فلسفہ یکسر باطل ہے اس لئے دماغش کافر است — اس مقام پر مارکس کو "پیغمبرِ بے جبرئیل" کہا گیا ہے۔ ارمغانِ حجاز میں مشیرِ ابلیس کی زبان سے اس کے متعلق کہلوایا ہے کہ

وہ کلیمِ بے تجلّی وہ مسیحِ بے صلیب
نیست پیغمبر ولیکن در بغل دارد کتاب

یعنی ایک عظیم داعیٔ انقلاب، جو وحی کی روشنی سے محروم ہے، مارکس (یا اشتراکیت) کی اس محرومی اور بے بصری پر اقبالؒ کا دل کڑھتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ وحی کی اساس محکم نہ ہونے کی وجہ سے اس قدر عظیم انقلابِ انسانیت، ناکام رہ جائے گا۔ وہ ہزار جان سے چاہتا ہے کہ اس انقلاب کے داعی، اپنے فلسفۂ حیات کے لئے قرآن سے رہنمائی حاصل کریں تاکہ یہ معاشی انقلاب ابد درکنار ہو جائے۔ اس امتزاج سے یہ عین مطابقِ اسلام ہو جائے گا۔ جب اقبالؒ نے سر فرانسس ینگ ہسبنڈ کو (۱۹۳۱ء میں) لکھا تھا کہ

بالشوزم + خدا = اسلام

اس سے اس کا مقصد یہی تھا کہ اشتراکیت کے معاشی نظام کو اگر قرآن کے فلسفۂ حیات کی بنیادوں پر استوار کر لیا جائے تو یہ اسلام کے مماثل ہو جائے گا اور اسی میں نوعِ انسانی کی نجات کا راز وابستہ ہے۔ مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيَانِ!

---

[1] کارل مارکس کی کتاب کا نام ہے۔

انہوں نے اس سے بھی بہت پہلے، اپنے ایک مراسلہ میں اپنے مسلک کی وضاحت کر دی تھی۔ بات یوں ہوئی کہ جب انہوں نے (بانگِ درا اور پیامِ مشرق میں) اشتراکیت کے معاشی نظام کی تائید میں لکھا تو ایک صاحب شمس الدین حسن نے، جو کمیونزم کے بہت بڑے حامی (اور ہفتہ دار اخبار انقلاب اور خاور کے ایڈیٹر رہ چکے تھے) روزنامہ زمیندار (لاہور) کی اشاعت بابت ۲۲ جون ۱۹۲۳ء میں ایک مضمون میں لکھا کہ:۔

> بالشویک خیالات کا حامی ہونا جرم ہے تو پھر ہمارے ملک کا سب سے بڑا شاعر، اقبالؔ، قانون کی زد سے کس طرح بچ سکتا ہے۔ بالشوزم کارل مارکس کے فلسفۂ سیاسیات کا لبِ لباب ہے اور اسی کو عام فہم زبان میں سوشلزم اور کمیونزم کہا جاتا ہے۔ اقبالؔ کی نظم۔ خضرِ راہ۔۔۔ اور ان کے مجموعۂ کلام 'پیامِ مشرق' کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک اشتراکی ہی نہیں بلکہ اشتراکیت کے مبلغِ اعلیٰ ہیں۔

اس کے جواب میں حضرت علامہ کا ۲۴ جون ۱۹۲۳ء کے زمیندار میں خط شائع ہوا جس میں انہوں نے تحریر فرمایا کہ

> (۱) میرے افکار کو بالشوزم سے منسوب کرنا غلط ہے۔ بالشویک خیالات رکھنا میرے نزدیک دائرۂ اسلام سے خارج ہو جانے کے مترادف ہے۔
>
> (۲) میں مسلمان ہوں اور میرا عقیدہ ہے کہ انسانی جماعتوں کے اقتصادی امراض کا بہترین حل قرآن مجید نے تجویز کیا ہے۔
>
> (۳) روسی بالشوزم یورپ کی ناعاقبت اندیش اور خود غرض سرمایہ داری کے خلاف ایک زبردست ردِ عمل ہے لیکن مغرب کی سرمایہ داری اور روس کا بالشوزم دونوں افراط و تفریط کا نتیجہ ہیں۔ اعتدال کی راہ وہی ہے جو قرآن نے ہم کو بتائی ہے۔[1]

اس کے بعد انہوں نے ۱۹۳۶ء میں، خواجہ غلام السیدین کے نام ایک خط میں لکھا:۔

---

[1] بحوالہ ہفتہ وار چٹان، لاہور، بابت ۱۸ مارچ ۱۹۷۴ء۔

سوشلزم کے معترف ہر جگہ روحانیت اور مذہب کے خلاف ہیں اور اسے افیون تصور کرتے ہیں۔ لفظ افیون اس ضمن میں سب سے پہلے کارل مارکس نے استعمال کیا تھا۔ میں مسلمان ہوں اور انشاء اللہ مسلمان مروں گا۔ میرے نزدیک تاریخِ انسانی کی مادی تعبیر سراسر غلط ہے۔ روحانیت کا میں قائل ہوں مگر روحانیت کے قرآنی مفہوم کا..... جو روحانیت میرے نزدیک مغضب ہے یعنی افیونی خواص رکھتی ہے' اس کی تردید میں نے جابجا کی ہے۔ باقی رہا سوشلزم سو اسلام خود ایک قسم کا سوشلزم ہے جس سے مسلمان سوسائٹی نے بہت کم فائدہ اٹھایا ہے۔ (مکاتیبِ اقبالؒ)

اس سے سوشلزم اور اسلام کا فرق نمایاں ہو جاتا ہے اور یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ سوشلزم کا فلسفۂ حیات ماننے والا' مسلمان نہیں ہو سکتا۔

انہوں نے اپنی وفات سے ایک سال پہلے قائدِ اعظمؒ کے نام ایک خط میں لکھا تھا کہ:-

شریعتِ اسلامیہ کے طویل و عمیق مطالعہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اسلامی قانون کو معقول طریق پر سمجھا اور نافذ کیا جائے تو ہر شخص کو کم از کم عام معاش کی طرف سے اطمینان ہو سکتا ہے..... اسلام کے لئے سوشل ڈیماکریسی کی کسی موزوں شکل میں ترویج' جب اسے شریعت کی تائید و موافقت حاصل ہو حقیقت میں کوئی انقلاب نہیں بلکہ اسلام کی حقیقی پاکیزگی کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔

ان حقائق سے واضح ہے کہ علامہ اقبالؒ سوشلزم کے فلسفۂ حیات کو اسلام کی نقیض قرار دیتے اور اس کے شدید مخالف تھے اور وہ قرآن کے معاشی نظام کو (جو سوشلزم کے معاشی نظام کے مماثل ہے) نوعِ انسانی کی مشکلات کا حل قرار دیتے تھے۔

اقبالؒ اور دو قومی نظریہ

یوم اقبالؒ، اپریل ۱۹۷۳ء کی تقریر

کاروانِ انسانیت کی داستان بھی عجیب و غریب ہے۔ اس میں سے لاکھوں انسان روزانہ کہیں گم ہو جاتے ہیں اور لاکھوں نئے افراد کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ افراد کی آمد و رفت کا یہ سلسلہ پہلے دن سے جاری ہے اور آخری دن تک جاری رہے گا۔ ان آنے جانے والوں کی گمنامی کا یہ عالم ہے کہ ان کی داستانِ حیات تو ایک طرف، زمانے کی ریگِ رواں پر ان کے نقوشِ قدم تک بھی نہیں ملتے۔ لیکن اسی گمنام ہجوم اور بے نام و نشان انبوہ میں کبھی کبھار ایسے افراد بھی آ جاتے ہیں جو زندہ و پائندہ روشنی کے میناروں کی طرح چمکنے اور کاروانِ انسانیت کے لئے نشاناتِ راہ اور سراغِ منزل بنتے ہیں۔ تاریخِ انسانیت درحقیقت انہی قندیلوں کی تابندہ شعاعوں سے عبارت ہے۔ اسی قسم کے افراد تعمیرِ انسانیت کے معمار اور تحسینِ کائنات کے نقش گر ہوتے ہیں۔ یہی وہ سیرت سازِ اقوامِ ملل ہیں جن کے متعلق کہا گیا ہے کہ

فطرت کے مقاصد کا عیار اس کے ارادے
دنیا میں بھی میزان، قیامت میں بھی میزان

انہی زندۂ جاوید ہستیوں میں اس مردِ خود آگاہ و خدا مست کا شمار ہوتا ہے جس کی یاد تازہ کرنے کے لئے ہم آج یہاں جمع ہوئے ہیں۔ وہ یگانۂ روزگار جس کے متعلق خود اس نے کہا تھا کہ

عمرہا در کعبہ و بُت خانہ می نالد حیات
تا ز بزمِ عشق یک دانائے راز آید بروں

صدفِ زمانہ ہزاروں سال تغیراتِ حوادث کی موجوں کے تھپیڑے کھاتی ہے تب جا کر اس قسم کے گوہر یک دانہ کی نمود ہوتی ہے۔

نقیبِ قرآن

عزیزانِ من! مشرق نے علامہ اقبالؒ کو ایک شاعر کی حیثیت سے جانا (اسی لئے انہیں زیادہ سے زیادہ "شاعرِ مشرق" کے لقب سے نوازا گیا) مغرب نے انہیں ایک فلاسفر کی حیثیت سے پہچانا اور دنیا کے ممتاز مفکرین کی صف میں انہیں جگہ دی۔ اس میں شبہ نہیں کہ شعر و فکر کی دنیا میں بھی ان کا مقام بہت بلند ہے لیکن میرے نزدیک ان کا صحیح مقام کچھ اور ہے اور وہ مقام ہے پیغامبرِ قرآن ہونے کا (پیغمبر نہیں پیغام بر یا نقیب)، میرے دل میں حضرت علامہ کی جو عظمت و عقیدت ہے وہ ان کے اسی مقام کی بنا پر ہے۔ خدا کی یہ کتابِ عظیم ہمارے ہاں صدیوں سے مقدس غلافوں میں لپٹی زینت دہ طاقِ نسیاں ہو رہی تھی۔ اقبالؒ نے اسے ان غلافوں سے نکالا اور اس کے پیغامِ حیات بخش کو اس انداز سے عام کیا کہ اس کے غلغلوں سے فضا گونج اٹھی۔ اس نے خوابیدہ ملّتِ اسلامیہ کو جھنجھوڑا اور کہا کہ:

منزل و مقصودِ قرآں دیگر است
رسم و آئینِ مسلماں دیگر است

اس نے کہا کہ کس قدر مقامِ تاسف ہے کہ

بندۂ مومن ز قرآں برنخورد
در ایاغِ اُو نہ مے دیدم نہ دُرد

خود طلسمِ قیصر و کسریٰ شکست
خود سرِ تختِ ملوکیت نشست

اس نے اس انقلاب آفریں ضابطۂ حیات کا تعارف ان الفاظ میں کرایا کہ

چیست قرآں خواجہ را پیغامِ مرگ
دستگیرِ بندۂ بے ساز و برگ

یعنی:-

موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لئے
نے کوئی فغفور و خاقاں نے فقیرِ رہ نشیں

کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک صاف
منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں

اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب
پادشاہوں کی نہیں اللہ کی ہے یہ زمیں

ایک طرف قرآن نے ملوکیت اور نظامِ سرمایہ داری کا خاتمہ کر دیا اور دوسری طرف اس نے مذہبی پیشوائیت کو حرفِ غلط کی طرح مٹا کر رکھ دیا۔

نقشِ قرآں تا دریں عالم نشست   نقشہائے کاہن و پاپا شکست

اس نے قرآن کے اس پیغام کو عام کیا کہ

کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے   پیرانِ کلیسا کو کلیسا سے اٹھا دو

اس نے کہا کہ ان خود ساختہ "نمائندگانِ خداوندی" کی حالت یہ ہے کہ:-

حق را بسجودے، صنماں را بطوافے

یہ طواف بتوں کا کرتے ہیں اور خدا کو اپنے سجدوں سے دھوکا دیتے ہیں۔ اس لئے ؎

بہتر ہے چراغِ حرم و دیر بجھا دو

قرآن انسانی زندگی کے ہر گوشے کے لئے رہنمائی دیتا ہے اس لئے پیغامِ اقبالؒ کے بھی متعدد پہلو ہیں۔ میرے لئے یہ مشکل ہی نہیں، ناممکن ہے کہ میں ایک نشست میں تمام گوشوں کا احاطہ کر سکوں۔ ایک نشست میں ان میں سے کسی ایک گوشے ہی کی وضاحت کی جا سکتی ہے۔ میں نے آج کی تقریب کے لئے ایک ایسے گوشے کا انتخاب کیا ہے جس نے پاکستان کی اجتماعی زندگی میں انتہائی اہمیت اختیار کر رکھی ہے اور جس پر میرے نزدیک، اس مملکت کی موت و حیات کا انحصار ہے۔ یہ موضوع ہے ــ دو قومی نظریہ ــ بظاہر ایسا نظر آئے گا کہ یہ مسئلہ ہنگامی سیاست سے متعلق ہے جس کا فیصلہ ہمیں اپنی سیاسی مصلحتوں کے مطابق کر لینا چاہیئے۔ لیکن جیسا کہ آپ دیکھیں گے کہ اس مسئلہ کا تعلق ہماری ہنگامی سے نہیں۔ یہ قرآن کی پیش کردہ ابدی حقیقت ہے اور دین کا اصل الاصول۔ علامہ اقبالؒ نے اسے اسی حیثیت سے پیش کیا اور اسی کی بنیادوں پر اس مملکت کا قیام عمل میں آیا تھا۔ ظاہر ہے کہ جس طرح کسی عمارت کے استحکام کا انحصار اس کی بنیاد پر ہوتا ہے اسی طرح مملکتِ پاکستان کی سالمیت کا دارومدار اسی نظریہ پر ہے اور اس کی یہی اہمیت ہے جس کے پیشِ نظر میں نے اسے اپنے خطاب کا موضوع قرار دیا ہے۔

عزیزانِ من! اگر کوئی یہ کہے کہ ایک فقرہ میں بتائیے کہ اسلام کا مقصود و منتہیٰ اور دین کی غایت الغایات کیا ہے تو اسے پورے حتم ولیقین کے ساتھ، متعین طور پر یوں کہا جا سکتا ہے کہ اسلام کا مقصود اور اس کے عملی نظام (دین) کی غایت یہ ہے کہ نوعِ انسان کے اختلافات و افتراقات کو ختم کر کے اُسے آسمانی اقدار کی بنیادوں پر ایک عالمگیر برادری بنا دیا جائے۔ انسانوں نے جب اپنی تمدنی زندگی کا آغاز کیا، تو قرآنِ کریم نے اپنے مخصوص انداز میں اس کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے کہ كَانَ

دین کی غایت

النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً (۲/۲۱۳) اس وقت تمام انسان ایک برادری (امتِ واحدہ) کی شکل میں رہتے تھے۔ ان میں نہ باہمی اختلاف تھا نہ افتراق۔ نہ تزاحم تھا نہ تصادم۔ رزق کے سرچشمے ہر ایک کے لئے یکساں طور پر کھلے تھے۔ ان میں "میری اور تیری" کی کوئی تمیز نہ تھی اس لئے جس کو جہاں بھوک لگے وہیں سے پیٹ بھر کر کھانے کو مل جاتا تھا (۲/۳۵)۔ اس طرزِ زندگی میں "نہ کسی کو بھوک کا خوف ستاتا تھا نہ پیاس کا، نہ کپڑے کی فکر وجہِ پریشانی ہوتی تھی نہ مکان کی" (۲۰/۱۲۱۔۱۱۸)۔ ان سے کہا گیا تھا کہ تم اسی طرح ایک برادری بن کر رہنا۔ وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ (۲/۳۵) باہمی مشاجرت اختیار نہ کر لینا۔ مشاجرت کے معنی ہیں شجر کی طرح ہو جانا کہ جس کی اصل ایک ہونے کے باوجود شاخیں الگ الگ ہو جاتی ہیں۔ لیکن انسانوں نے اس سے اعراض برتا۔ فَاخْتَلَفُوْا (۱۰/۱۹) اور آپس میں اختلاف پیدا کر لیا۔ یہ ابتدائی اختلاف کیا تھا؟ یہ کہ وہ نسل کی بنیاد پر قبیلوں میں بٹ گئے اور بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ (۲/۳۶) اس طرح ایک دوسرے کے دشمن ہو گئے۔ اس سے معاشرہ میں ناہمواریاں پیدا ہو گئیں جسے قرآن نے فساد کہہ کر پکارا ہے اور باہمی خونریزیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا (۲/۳۰)؛ (۵/۳۰۔۲۷)۔ ان اختلافات کا مٹانا اور فساد انگیزیوں اور خونریزیوں کے بنیادی سبب کا ختم کرنا انسانوں کے اپنے بس کی بات نہ تھی۔ یہ اسی صورت میں ممکن تھا کہ انسان اپنے معاشرہ کو اقدارِ خداوندی کے مطابق متشکل کرے۔ اسی لئے کہا کہ فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ۪ اس مقصد کے لئے خدا نے انبیاء کرامؑ کو بھیجنا شروع کیا جو لوگوں کو متنبہ کرتے تھے کہ اگر تم اسی طرح خاندانوں اور قبیلوں اور فرقوں میں بٹے رہے تو تباہ ہو جاؤ گے اور اگر تم اقدارِ خداوندی کے مطابق امتِ واحدہ بن گئے تو اس کا نتیجہ زندگی کی خوشگواریاں اور سرفرازیاں ہوگا۔ وَ اَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا

اَخْتَلَفُوْا فِیْہِ (۲/۲۱۳) اس مقصد کے لئے ان انبیاء میں سے ہر ایک کو الکتاب[1] (ضابطہ ہدایات و قوانین) بھی دیا تاکہ وہ اس کے ذریعے لوگوں کے اختلافی امور کا فیصلہ کر کے انہیں ایک امت کے قالب میں ڈھال دیں۔

یہ تھا عزیزانِ من! انبیاءؑ کے بھیجنے اور ان کے ساتھ کتابیں نازل کرنے کا مقصد یعنی ان اختلافات کو مٹا کر جن کی وجہ سے نوعِ انسان مختلف خاندانوں، قبیلوں اور قوموں میں بٹ گئی تھی اور اس لئے باہمی خونریزیوں اور فساد انگیزیوں کا حشر بپا ہو رہا تھا، اسے امتِ واحدہ (ایک عالمگیر برادری) بنا دیا جاتے۔ جو لوگ انبیاء کرامؑ کی دعوت پر لبیک کہتے ہوئے اپنے نسلی، قبائلی اور قومی امتیازات کو مٹا کر وحی کی راہنمائی کے مطابق امتِ واحدہ کی زندگی بسر کرنے پر آمادہ ہو جاتے وہ ایک مرکز پر جمع ہو جاتے۔ جو اس دعوت کی مخالفت کر کے اپنے امتیازات کو برقرار رکھتے ہوئے مختلف قبائل اور اقوام کی گروہ بندیوں کو قائم رکھنا چاہتے وہ ان کے برعکس دوسرا گروہ بن جاتے۔ اول الذکر کو امتِ مسلمہ یا جماعتِ مومنین کہا جاتا۔ یعنی امتِ واحدہ کے نظریہ کو تسلیم کرنے اور اس کی صداقت پر ایمان لانے والے۔ اور دوسری جماعت کو کفار کہا جاتا۔ یعنی اس نظریۂ زندگی سے انکار کر کے نسلی اور قومی امتیازات کو برقرار رکھنے پر اصرار کرنے والے۔ اس طرح پوری نوعِ انسانی دو گروہوں میں بٹ جاتی۔ اسے برادرانِ عزیز! دو قومی نظریہ کہتے ہیں۔ آپ نے دیکھ لیا کہ یہ نظریہ نہ تو تحریکِ پاکستان کے دوران وضع کیا گیا تھا اور نہ ہی اسے حصولِ مملکتِ پاکستان کے لئے سیاسی حربہ کے طور پر اختیار کیا گیا تھا۔ یہ اسلام کی غایت اور دین کا اساسی اصول تھا جو اس دن وجود میں آگیا تھا جب خدا کی طرف سے سلسلۂ وحی کا آغاز ہوا تھا۔ قرآنِ کریم میں اس سلسلۂ زریں کی داستان کا آغاز حضرت نوحؑ سے ہوتا ہے۔ انہوں نے اس دعوت کو پیش کیا تو ان کی قوم کے کچھ افراد اس پر لبیک کہہ کر ان کے ساتھ شامل ہو گئے اور باقی قوم نے اس نظریہ کی مخالفت کی۔ اس طرح ایک قوم کے بجائے دو قومیں وجود میں آگئیں۔ ان دونوں قوموں کی نسل ایک تھی، زبان ایک تھی، قبیلہ ایک تھا، وطن ایک تھا۔ لیکن اس کے باوجود وہ ایک قوم

---

[1] جو لوگ کہتے ہیں کہ نبی بغیر کتاب کے بھی آسکتا ہے وہ قرآنِ کریم کی اس واضح آیت کی تکذیب کرتے ہیں جس میں کہا گیا ہے کہ تمام انبیاء کو کتابیں دی گئی تھیں۔

نہیں رہی تھی۔ قومیں بن گئی تھیں۔ ان کے دو قومیں بن جانے کی بنیاد کیا تھی؟ بس ایک نظریہ کا اختلاف۔ اسے کہا جاتا ہے دین یا ایمان کی بنیاد پر قومیت کی تشکیل۔ ان دو گروہوں میں یہ خلیج اتنی گہری اور ناقابلِ عبور تھی کہ جب حضرت نوحؑ نے نسلی رشتہ کی بنیاد پر کہا کہ ان کا بیٹا ان کے اہل میں سے ہے تو خدا نے یہ کہہ کر ان کی غلط فہمی کو دُور کر دیا کہ اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ ۚ (۱۱/۴۶) وہ تیرے اہل میں سے نہیں کیونکہ وہ اس نظریہ پر ایمان نہیں لایا جسے تم نے پیش کیا ہے۔ یعنی نظریہ کے اختلاف سے۔ وطنی اور قبائلی تعلق تو ایک طرف، خاندانی اور نسلی رشتہ بھی باقی نہیں رہتا۔ باپ اور بیٹے کا رشتہ بھی ٹوٹ جاتا ہے۔

قرآنِ کریم نے حضرت نوحؑ کے بعد مختلف اقوام اور ان کی طرف بھیجے گئے انبیاء کرامؑ کا ذکر کیا ہے اور وضاحت سے بتایا ہے کہ انہوں نے اس دو قومی نظریہ پر کس طرح عمل کیا اور اس کے نتیجہ میں ایک ہی وطن میں نسل، قبیلہ، زبان، رنگ اور خون کے اشتراک کے باوجود نظریہ کے اختلاف کی بنیاد پر دو قومیں وجود میں آتی رہیں۔ ان کا پیش کردہ معیار جس سے اپنے اور بیگانے کی تخصیص ہوتی تھی یہ تھا کہ

فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَاِنَّهٗ مِنِّيْ ۚ (۱۴/۳۶)

جو میرے مسلک کا اتباع کرتا ہے وہ میرا ہے (جو اس کے خلاف چلتا ہے میرا اس سے کوئی واسطہ نہیں)۔

یہ سلسلۂ رشد و ہدایت اسی طرح جاری رہا تا آنکہ آج سے چودہ سو سال پہلے، سرزمینِ عرب میں اس نبیِ آخر الزماںؐ کا ظہور ہوا جس پر دین کی تکمیل ہو گئی اور سلسلۂ نبوت کا اختتام۔ خدا کے اس آخری

حضور خاتم النبیینؐ کے دور میں

رسولؐ نے دو قومی نظریہ پر اس طرح عمل کر کے دکھایا کہ اس کا مفہوم سمجھنے میں نہ کسی قسم کا شک و شبہ رہا نہ کوئی ابہام و التباس۔ اس نظریہ کی دو شقیں تھیں۔ ایک یہ کہ ایک ہی ملک میں بسنے والے، ایک ہی زبان بولنے والے، ایک ہی نسل سے تعلق افراد اگر اس نظریہ کی صداقت پر ایمان نہیں رکھتے تو وہ اس قوم کے افراد نہیں بن سکتے جو اس کی صداقت پر ایمان رکھتی ہے۔ بالفاظِ دیگر، مسلم اور غیر مسلم مل کر ایک قوم نہیں بن سکتے خواہ وہ ایک ہی وطن کے باشندے اور ایک ہی نسل کے افراد کیوں نہ ہوں اور

دوسری شق یہ تھی کہ ایمان کے اشتراک کی بنیاد پر جو قوم (امت) متشکل ہو گی اس میں زبان، رنگ، نسل، وطن کی کوئی تخصیص باقی نہیں رہے گی۔ وہ سب ایک قوم کے افراد اور ایک تسبیح کے دانے ہوں گے۔ شق اوّل کا عملی مظاہرہ اس طرح ہوا کہ رنگ، نسل، وطن کا اشتراک تو ایک طرف حضورؐ کا حقیقی چچا ابولہب جس نے اس نظریہ کو تسلیم نہیں کیا تھا اس قوم کا فرد تسلیم نہیں کیا گیا جو ایمان کے اشتراک کی بنا پر وجود میں آئی تھی اور حضورؐ کے دوسرے چچا عباسؓ اور داماد ابوالعاص بھی اس وقت تک اس جدید قوم میں شمار نہیں کئے گئے جب تک وہ ایمان نہیں لے آئے۔ جہاں تک دوسری شق کا تعلق تھا حبش کا بلالؓ اور روم کا صہیبؓ، فارس کا سلمانؓ اور عرب کا ابوبکر (رضی اللہ عنہم اجمعین) وطن، زبان، رنگ، نسل کے اختلافات کے باوجود ایک امت کے افراد قرار پا گئے اور ان میں ایسی وحدت اور یگانگت پیدا ہو گئی کہ اس کے بعد وطن، زبان، رنگ، نسل کی سابقہ نسبتوں کا تصور تک بھی ان کے ذہن میں نہ آیا۔ اس لئے کہ وہ جانتے تھے کہ خدا کی توحید پر ایمان کا عملی مفہوم امت کی وحدت ہے اور اس وحدت میں کسی قسم کی تفریق شرک ہے۔ قرآن کریم نے جو کہا ہے کہ:

> وَ لَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَ كَانُوْا شِيَعًا ؕ (۳۰/۳۲-۳۱)
>
> مسلمانو دیکھنا! کہیں توحید پرست ہونے کے بعد پھر سے مشرک نہ بن جانا۔ یعنی ان لوگوں میں سے نہ ہو جانا جنہوں نے اپنے دین میں تفرقہ پیدا کر لیا اور قوم مختلف گروہوں میں بٹ گئی۔

تو اس تفرقہ سے مراد صرف مذہبی فرقہ پرستی نہیں، اس سے مراد ہے ہر قسم کی تفریق خواہ وہ مذہبی فرقوں کی شکل میں ہو یا سیاسی پارٹیوں کی صورت میں۔ وہ ذاتوں اور برادریوں کے رنگ میں ہو اور خواہ "چار قومیتوں" کے پیکر میں جن کا آجکل نعرہ لگایا جاتا ہے۔ یہ تمام اختلافات شرک ہیں۔ اور چونکہ امت کی تشکیل رسول کی نسبت سے ہوتی ہے اس لئے اللہ تعالیٰ نے نبی اکرمؐ سے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ اِنَّ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَ كَانُوْا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِيْ شَيْءٍ ؕ (۶/۱۵۹) جو لوگ اپنے دین میں تفرقہ پیدا کر دیں اور اسی طرح امت واحدہ رہنے کے بجائے

مختلف گروہوں میں بٹ جائیں، اے رسولؐ! تیرا ان سے کوئی واسطہ نہیں۔ اس باب میں احتیاط کا یہ عالم تھا کہ کسی جنگ میں دو (مسلمان) سپاہیوں میں کسی بات پر باہمی جھگڑا ہو گیا تو ان میں سے ایک نے سابقہ عادت کی بنا پر، غیر شعوری طور پر اپنے قبیلہ کو مدد کے لئے پکارا اور دوسرے نے اپنے قبیلہ کو۔ حضورؐ کے گوش مبارک تک یہ آواز پہنچی تو آپ فوراً خیمہ سے باہر تشریف لائے اور سخت برافروختگی کے عالم میں فرمایا کہ "تم لوگ ایمان لانے کے بعد پھر عہدِ جاہلیہ کی طرف پلٹ رہے ہو۔ یاد رکھو! یہ اسلام نہیں"۔ اسلام وہ تھا جس کا اعلان حضورؐ نے حجتہ الوداع کے خطبہ میں، جو عالمگیر انسانیت کا منشورِ عظمیٰ ہے، ان الفاظ میں فرمایا تھا کہ:-

> عہدِ جاہلیہ کے تمام باطل نظریات میرے پاؤں تلے ہیں۔ یاد رکھو! تم سب ایک امت ہو۔ تمہارا رب ایک ہے۔ اصل کے اعتبار سے تم سب ایک ہو۔ اس لئے کالے کو گورے پر یا گورے کو کالے پر، عربی کو عجمی پر یا عجمی کو عربی پر کسی قسم کی کوئی فضیلت نہیں بجز تقوےٰ کے۔

حضورؐ کے بعد

یوں دین کی تکمیل ہو گئی۔ حضورؐ کے بعد کچھ عرصہ تک امت، امتِ واحدہ ہی رہی۔ اس میں کسی قسم کا کوئی تفرقہ پیدا نہ ہوا۔ لیکن اس کے بعد یہ گاڑی دوسری پٹڑی پر جا پڑی اور سب سے پہلے اسی قبائلی تفریق نے سر نکالا جسے حضورؐ نے اپنے پاؤں تلے روند ڈالا تھا۔ پہلے مملکت خلافتِ راشدہ تھی۔ اس کے بعد یہ بنو امیہ، بنی عباس، بنو فاطمہ کی قرار پا گئی۔ جب سلطنت اور حکومت کی نسبت قبائل کی طرف ہوئی تو مسلمان بھی امتِ واحدہ نہ رہے۔ مذہب کی دنیا میں یہ جس طرح فرقوں میں بٹی، اس سے قطع نظر، یہ قومی اعتبار سے ترکوں، مغلوں، عربوں، افغانوں، ایرانیوں میں بٹ گئی۔ پھر ان میں ذاتوں اور برادریوں کی تفریق در آئی۔ اب مسلمان اسلام کی طرف نسبت سے امتِ مسلمہ بننے کے بجائے سید، پٹھان، قریش، راجپوت، جاٹ، اعوان، ارائیں کی نسبتوں سے الگ الگ برادریوں میں تقسیم ہو گئے۔ یہی وہ حقیقت تھی جس کے پیشِ نظر اقبالؒ نے کہا تھا کہ

> یوں تو سید بھی ہو، مرزا بھی ہو، افغان بھی ہو
> تم سبھی کچھ ہو، بتاؤ تو مسلمان بھی ہو

اس طرح صدرِ اوّل کے بعد، یہ امت "امتِ واحدہ" نہ رہی۔ مختلف گروہوں اور قوموں میں بٹ گئی۔ یہ چیز یقیناً موجبِ صد انتشار و تشتت تھی۔ لیکن اس کے باوجود ایک بات باعثِ اطمینان بھی تھی۔ اور وہ یہ کہ اس دوران میں دو قومی نظریہ کی دوسری شق بہر حال قائم رہی۔ یعنی مسلمان غیر مسلموں کے ساتھ مل کر ایک قوم کبھی نہ بنے۔ یہ کسر مغرب کے نظریۂ قومیت نے پوری کردی۔ اس نظریہ کی

نیشنلزم کی لعنت

رُو سے ایک ملک میں بسنے والے تمام افراد، بلا لحاظ مذہب و ملت، ایک قوم کے افراد قرار پاگئے۔ اس نظریہ کو نیشنلزم کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ مغلوں کی حکومت کے زمانے تک، اس نظریہ نے ہندوستان میں بار نہیں پایا تھا۔ اس وقت تک، مسلمان، غیر مسلموں سے الگ ایک متعین اور منفرد قوم کے افراد تھے۔ انگریزوں نے اس نظریہ کو یہاں بھی عام کیا اور بیسویں صدی کے آغاز میں اس کا چرچا ہر جگہ ہونے لگا۔ یہیں سے ہمارے سامنے وہ اقبالؒ آتا ہے جس کی یاد منانے کے لئے ہم آج یہاں جمع ہوتے ہیں۔

اقبالؒ کی پیدائش، تعلیم و تربیت اسی (غیر منقسم) ہندوستان میں ہوئی تھی جہاں کی فضا

اقبالؒ کا ذہنی انقلاب

نیشنلزم کے پراپیگنڈے سے معمور تھی۔ ظاہر ہے کہ ایک ہونہار طالب علم کا اس فضا سے متاثر ہو جانا فطری امر تھا۔ وہ انہی خیالات کو اپنے ذہن میں لئے مزید تعلیم کے حصول کے لئے ۱۹۰۵ء میں یورپ گیا اور تین سال تک وہاں رہا۔ جیسا کہ میں نے ابھی ابھی کہا ہے، یہ وہ زمانہ تھا جب اقوامِ یورپ میں نیشنلزم کی مدح و ستائش کے غلغلے بلند ہو رہے تھے۔ دانایانِ مغرب اس نظامِ نو کو نوعِ انسان کی مشکلات کا مداوا قرار دے رہے تھے۔ چاروں طرف سے اس کی بارگاہ میں تبریک و تہنیت کے تحائف پیش کئے جارہے تھے۔ ان حالات میں، ایک ایسے نوجوان طالب علم کو جو پہلے ہی سے نیشنلزم سے متاثر ذہن لے کر یورپ گیا ہو، متشدد نیشنلسٹ ہو جانا چاہیئے تھا۔ لیکن مورخ کی نگاہ یہ دیکھ کر محوِ حیرت رہ جاتی ہے کہ اس طالب علم کے قلب و نگاہ میں ایک عجیب انقلاب رونما ہوا۔ وہ گیا تھا تو یہ کہتے ہوئے کہ

ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

اور واپس آیا تو یہ گاتا ہوا کہ

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

وہ گیا تھا تو یہ گنگناتا ہوا کہ

خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے!

اور واپس آیا تو یہ الاپتا ہوا کہ

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے جو پیرہن اسکا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

وہ گیا تھا تو یہ سندیش دیتا ہوا کہ

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

اور آیا تو یہ اعلان کرتا ہوا کہ

نرالا سارے جہاں سے اس کو عرب کے معمار نے بنایا

بنا ہمارے حصارِ ملت کی اتحادِ وطن نہیں ہے!

اقبالؒ کے قلب و دماغ میں اس قسم کا انقلاب کس طرح آیا تھا، اس کی وضاحت انہوں نے سنہ ۱۹۳۸ء میں (مولانا) حسین احمد مدنی (مرحوم) کے ساتھ نظریہ وطنیت کے موضوع پر بحث و تمحیص کے سلسلہ میں کی تھی. (اس معرکہ کی تفصیل ذرا آگے چل کر سامنے آتی ہے). انہوں نے کہا تھا کہ وطن سے محبت اور اس کی خیر سگالی کا جذبہ ایک فطری امر ہے جس سے کوئی بھی انکار نہیں کرسکتا. لیکن

زمانہ حال کے سیاسی لٹریچر میں "وطن" کا مفہوم محض جغرافیائی نہیں بلکہ "وطن" ایک اصول ہے ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ کا اور اس اعتبار سے ایک سیاسی تصور ہے. چونکہ اسلام بھی ہیئت اجتماعیہ انسانیہ کا ایک قانون ہے اس لئے "وطن" کو جب ایک سیاسی تصور کے طور پر استعمال کیا جائے تو وہ اسلام سے متصادم ہوتا ہے (اور یہ وجہ ہے کہ میں اس نظریہ قومیت کی مخالفت کرتا ہوں).

چونکہ وطنیت یا قومیت کا یہ نظریہ، اسلام کے نظریہ قومیت کے خلاف تھا، اس لئے اقبالؒ نے اسے اپنی زندگی کا مشن قرار دیا کہ اس کے خلاف شد و مد سے جہاد کیا جائے. بانگِ درا میں وطنیت کے عنوان سے جو نظم زیب دہِ اوراق ہے

اقبالؒ کا جہاد

اور جسے اقبالؒ نے یورپ سے واپسی کے بعد لکھا تھا' اس میں انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں بتایا ہے کہ یہ نظریہ کس طرح اسلام کا نقیض اور نوعِ انسان کے حق میں زہرِ قاتل ہے. اس نظم کی اہمیت کا تقاضا ہے کہ اسے تماماً آپ کے سامنے پیش کر دیا جائے. وہ کہتے ہیں.

اس دَور میں مے اور ہے جام اور ہے جم اور ساقی نے بنا کی روشِ لطف و ستم اور
مُسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور تہذیب کے آذر نے ترشوائے صنم اور
ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

یہ بُت کہ تراشیدۂ تہذیبِ نوی ہے غارت گرِ کاشانۂ دینِ نبویؐ ہے
بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے
نظارۂ دیرینہ زمانے کو دکھا دے
اے مصطفویؐ خاک میں اس بُت کو ملا دے

ہو قیدِ مقامی تو نتیجہ ہے تباہی رہ بحر میں آزادِ وطن صورتِ ماہی
ہے ترکِ وطن سنتِ محبوبِ الٰہی دے تو بھی نبوت کی صداقت کی گواہی
گفتارِ سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے
ارشادِ نبوتؐ میں وطن اور ہی کچھ ہے

اقوامِ جہاں میں ہے رقابت تو اسی سے تسخیر ہے مقصودِ تجارت تو اسی سے
خالی ہے صداقت سے سیاست تو اسی سے کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے
اقوام میں مخلوقِ خدا بٹتی ہے اِس سے
قومیتِ اسلام کی جڑ کٹتی ہے اِس سے

اقبالؒ مسلسل اپنی اس پکار کو دہراتا رہا اور قوم کے نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کو (بالخصوص) اس نظریۂ قومیت کی تباہ کاریوں اور فتنہ سامانیوں سے آگاہ کرتا چلا گیا. کبھی وہ ان سے' رمز و ایما کے انداز سے کہتا کہ

بادطن وابستہ تقدیرِ اُمم برنسب بنیادِ تعمیرِ اُمم

ملتِ مارا اساسِ دیگر است این اساس اندر دلِ ما مضمر است

اور کبھی اس اجمال کی تفصیل ان الفاظ میں بیان کرتا..... کہ

اپنی ملت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی
اُن کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار قوتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری
دامنِ دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں
اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملت بھی گئی

اقبالؒ کا یہ پیغام، ہندی مسلمانوں تک محدود نہیں تھا۔ جیسا کہ میں نے شروع میں بتایا ہے، اسلام کا اصولِ قومیت یہ ہے کہ تمام دنیا کے مسلمان خواہ وہ کسی خطۂ زمین میں بستے ہوں ایمان کے اشتراک کی بنا پر ایک قوم کے افراد ہیں۔ محض ایک قوم کے افراد نہیں، ایک دوسرے کے بھائی ـــ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ (۴۹/۱۰) ـــ قرآن کا ارشاد ہے۔ اس اخوت کو اس نے کتاب اللہ سے وابستگی کا لازمی نتیجہ اور خدا کی خصوصی نعمت قرار دیا ہے جب کہا ہے کہ۔ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًا (۳/۱۰۲) خدا نے تمہیں اپنی نعمت کی رُو سے بھائی بھائی بنا دیا۔ اس اخوت کی بنا پر یہ امت کسی ایک خطۂ زمین میں محدود و محصور نہیں تھی۔ مسلمان جہاں بھی تھا، دنیا کے کسی خطے میں بھی سکونت پذیر تھا، دنیا کے باقی مسلمانوں کا بھائی اور امتِ مُسلمہ کا فرد تھا۔ تمام دنیا کے مسلمان ایک قوم کے اجزاء تھے۔ بنابریں، جس طرح نسلی وابستگی کی بنا پر مسلمانو کی الگ الگ قومیت کا تصور خلافِ اسلام ہے، اسی طرح جغرافیائی حدود (یعنی وطن کی نسبت) کی بنا پر ان کی جداگانہ قومیتوں کا نظریہ بھی دین کی نقیض ہے۔ اقبالؒ نے جو اسلام کی اس عالمگیر دعوت کا گہرا احساس رکھتا تھا، اپنے اس پیغام کو ہندوستان کی چار دیواری سے آگے لے جا کر، پورے کے پورے عالمِ اسلام تک پھیلایا۔

عالمگیر اُمّت

اس نے ۱۹۲۲ء میں جب پہلی جنگِ عظیم کے بعد، تمام مسلم ممالک کی بالعموم اور ترکی کی بالخصوص، حالت بڑی سقیم ہو رہی تھی، جملہ عالمِ اسلام کو مخاطب کر کے کہا کہ یاد رکھو! ہماری نکبت و زبوں حالی کا ایک ہی علاج ہے اور وہ یہ کہ:۔

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے　　نیل کے ساحل سے لے کر تابخاکِ کاشغر
جو کریگا امتیازِ رنگ و خوں مٹ جائے گا　　تُرکِ خرگاہی ہو یا اعرابیٔ والا گہر
نسل اگر مسلم کی مذہب پر مقدم ہوگئی
اُڑگیا دنیا سے تو مانندِ خاکِ رہگذر

اور اس سے اگلے سال (۱۹۲۳ء میں) انہوں نے اپنی مشہور نظم 'طلوعِ اسلام' میں انہی اقوام کو مخاطب کر کے کہا کہ

ہوس نے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے نوعِ انساں کو　　اخوت کا بیاں ہو جا، محبت کی زباں ہو جا
یہ ہندی، وہ خراسانی، یہ افغانی، وہ تورانی　　تو اے شرمندۂ ساحل اچھل کر بیکراں ہو جا
غبار آلودۂ رنگ و نسب ہیں بال و پر تیرے
تو اے مرغِ حرم اڑنے سے پہلے پرفشاں ہو جا

اس سلسلہ میں میں عزیزانِ من! آپ کی توجہ ایک عظیم حقیقت کی طرف منعطف کرانا چاہتا ہوں۔ ہم میں سے کون ہے جسے اس کا علم و احساس، بلکہ شکایت نہیں کہ دوسرے ملکوں کی مسلمان سلطنتوں نے، ہم ہندو پاک کے مسلمانوں کے مصائب و آلام میں بالعموم اس ہمدردی اور یگانگت کا ثبوت کبھی نہیں دیا جس کی ان سے بجا طور پر توقع کی جاتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود ہماری کیفیت یہ ہے کہ اگر افریقہ

ہمارا احساسِ اخوت

میں کسی حبشی مسلمان کے پاؤں میں کانٹا چبھ جائے تو ہماری آنکھ کے آبگینے سے آنسو چھلک پڑتے ہیں۔ آپ نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ اس کی کیا وجہ ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمیں، اس حکیم الامت نے اسلام کی عالمگیر اخوت کا وہ پیغام دیا ہے جو نسل، رنگ، وطن کی حدود و ثغور سے ماورا ہے اور جو ہماری ملت کے رگ و پے میں سرایت کر چکا ہے۔ اس لئے مسلمانانِ عالم پر کہیں مصیبت آئے، غیر شعوری طور پر ہمارے قلوب وقفِ اضطراب اور ہماری آنکھیں خوننابہ فشاں ہو جاتی ہیں۔ ۱۹۱۲ء کے جنگ طرابلس میں ایک عرب لڑکی، فاطمہ بنت عبداللہ غازیوں کو پانی پلاتی ہوئی شہید ہوگئی تو اس کی یاد میں اقبالؒ نے جو نظم خونچکاں لکھی، اس کے سننے سے آج بھی حساس قلوب سینوں میں تڑپ اٹھتے ہیں۔ اس میں انہوں نے کہا تھا کہ:-

فاطمہ! تو آبروئے امتِ مرحوم ہے — ذرہ ذرہ تیری مشتِ خاک کا معصوم ہے
یہ سعادت حورِ صحرائی تری قسمت میں تھی — غازیانِ دین کی سقائی تری قسمت میں تھی

اس کے بعد اقبالؒ نے یہ نہیں کہا کہ ایسی بچی عربی نسل یا طرابلسی قوم کے لئے باعثِ فخر ہے۔ کہا یہ کہ فاطمہ خود ہماری بچی تھی۔ وہ صدفِ امتِ مسلمہ کا گوہرِ تابدار تھی۔ اس لئے اس کا یہ کارنامہ ساری امت کے لئے باعثِ صد شرف و عزت ہے۔

یہ کلی بھی اس گلستانِ خزاں منظر میں تھی — ایسی چنگاری بھی یارب اپنی خاکستر میں تھی
اپنے صحرا میں بہت آہو ابھی پوشیدہ ہیں — بجلیاں برسے ہوئے بادل میں بھی خوابیدہ ہیں

اور شاہی مسجد (لاہور) کے صحن میں، وہ قیامت بھی تو جنگِ طرابلس ہی کے شہیدوں کی یاد میں برپا ہوئی تھی جس کے تصور سے آج بھی جگر کے ٹکڑے ہوجاتے ہیں۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ شہدائے طرابلس کی بارگاہ میں خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لئے شاہی مسجد میں ایک اجتماعِ عظیم منعقد ہوا جس میں علامہ اقبالؒ سے نظم کی فرمائش کی گئی۔ وہ ان شہدار کے غم سے نڈھال تھے۔ افتاں و خیزاں سٹیج پر آئے اور اپنے مخصوص محاکاتی انداز میں حضور رسالتمآبؐ میں اپنی حاضری کا نقشہ اس طرح کھینچا کہ جب میں خدمتِ بابرکت میں پہنچا تو حضورؐ نے فرمایا کہ

نکل کے باغِ جہاں سے برنگِ بُو آیا — ہمارے واسطہ کیا تحفہ لے کے تُو آیا

تو میں نے (اقبالؒ نے) بصد احترام عرض کیا کہ!

حضورؐ! دہر میں آسودگی نہیں ملتی — تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی
ہزاروں لالہ و گل ہیں ریاضِ ہستی میں — وفا کی جس میں ہو بُو وہ کلی نہیں ملتی

لہٰذا، ان حالات میں، میں ایسا تحفہ کہاں سے لاتا جو حضورؐ کے شایانِ شان ہوتا۔

مگر میں نذر کو اک آبگینہ لایا ہوں — جو چیز اس میں ہے جنت میں بھی نہیں ملتی
جھلکتی ہے تری امت کی آبرو اس میں
طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

اس پر مجمع کا کیا حال ہوا ہوگا، آپ اندازہ لگا سکتے ہیں۔

اور ۱۹۲۲ء میں جب یونانیوں نے ترکوں کو شکست دی ہے تو اسلامیہ کالج (لاہور) کے

میدان میں اقبالؒ نے جس درد و کرب سے اپنی نظم — خضرِ راہ — پڑھی تھی اس کی یاد آج بھی خون کے آنسو رُلاتی ہے۔

لے گئے تثلیث کے فرزند میراثِ خلیلؑ
خشتِ بنیادِ کلیسا بن گئی خاکِ حجاز
ہو گئی رسوا زمانے میں کلاہِ لالہ رنگ
جو سراپا ناز تھے ہیں آج مجبورِ نیاز

اور انتہائی مایوسی کی اس تاریک فضا میں، اس امیدوں کے شہزادے نے آخر میں یہ پیغام دیا کہ

مسلم استی! سینہ را از آرزو آباد دار
ہر زماں پیشِ نظر لَا یُخْلِفُ الْمِیْعَاد دار

ایسا نظر آتا ہے کہ یہ پیغامِ حیات بخش دیتے وقت، اس دیدہ ور کی نگہِ دُور رس نے اُس انقلاب کو بے نقاب دیکھ لیا تھا جو اُس وقت ضمیرِ کائنات میں پہلو بدل رہا تھا اور جس کی رُو سے، دوسرے ہی سال، ترکوں نے یونانیوں کو شکستِ فاش دے کر اپنے لئے حیاتِ نو کا سامان پیدا کر لیا تھا۔ ترکوں کی اس محیر العقول کامیابی پر اقبالؒ، طرب و نشاط کی ہزار جنتیں اپنے جلو میں لے کر رقصاں و فرحاں جس طرح اسٹیج پر آیا اور جوشِ مسرت میں جس ولولہ اور طنطنہ سے اپنی نظم، طلوعِ اسلام پڑھی اس کی یاد کبھی دلوں سے محو نہیں ہو سکتی۔ آتے ہی کہا کہ

دلیلِ صبحِ روشن ہے ستاروں کی تنک تابی
افق سے آفتاب اُبھرا گیا دورِ گراں خوابی
عروقِ مردۂ مشرق میں خونِ زندگی دوڑا
سمجھ سکتے نہیں اس راز کو سینا و فارابی

اور

اگر عثمانیوں پر کوہِ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے
کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا

یورپ کی مخالفت

جب تک اقبالؒ نے اسلام کے معیارِ قومیت کے پیغام کو ہندی مسلمانوں تک محدود رکھا۔ اس کے خلاف کوئی ایسا ردِ عمل نہ ہوا۔ اسے محض ایک شاعر کا خواب سمجھ کر نظر انداز کر دیا گیا۔ اس لئے کہ اُس زمانے میں یہاں کی سیاسی فضا پر اس کا کچھ اثر نہیں تھا۔ لیکن جب اس نے اس پیغام کو دیگر مسلم ممالک تک پہنچایا تو مغربی سیاست کے مہرہ بازوں کے دل میں اس سے طرح طرح کے خطرات نمودار ہوئے۔ ان

خطرات کی وضاحت علامہ اقبالؒ نے ان الفاظ میں کی تھی:۔

> مجھے یورپین مصنفوں کی تحریروں سے ابتداء ہی سے یہ بات اچھی طرح معلوم ہو گئی تھی کہ یورپ کی ملوکانہ اغراض اس امر کی متقاضی ہیں کہ اسلام کی وحدتِ دینی کو پارہ پارہ کرنے کے لئے اس سے بہتر اور کوئی حربہ نہیں کہ اسلامی ممالک میں "افرنگی نظریہ وطنیت" کی اشاعت کی جائے۔ چنانچہ ان لوگوں کی یہ تدبیر جنگِ عظیم میں کامیاب بھی ہو گئی۔
>
> (بیان، مولانا حسین احمد کے جواب میں)

یہ تھی مغربی اقوام کی وہ سازش جس کے لئے مہرہ بازانِ افرنگ، پیغامِ اقبالؒ میں خطرہ محسوس کرتے تھے۔ چنانچہ ان کے مفکرین نے گوسفندانہ ہمدردی کے لباس میں، اُسے یہ طعن دیا کہ وہ اپنے عالمگیر انسانیت کے پیغام سے ہٹ کر، اس قسم کی "فرقہ وارانہ" تنگنائے کی طرف کیسے چلا گیا؟ پروفیسر نکلسن کے نام علامہ اقبالؒ کا خط اس سازش کی غمازی کرتا ہے جس میں انہوں نے لکھا تھا کہ:۔

> اسلام ہمیشہ رنگ و نسل کے عقیدے کا، جو انسانیت کے نصب العین کی راہ میں سب سے بڑا سنگِ گراں ہے، نہایت کامیاب حریف رہا ہے۔ رینان کا یہ خیال غلط ہے کہ سائنس اسلام کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ دراصل اسلام بلکہ کائناتِ انسانیت کا سب سے بڑا دشمن رنگ و نسل کا عقیدہ ہے اور جو لوگ نوعِ انسان سے محبت رکھتے ہیں، ان کا فرض ہے کہ انہیں کی اس اختراع کے خلاف علمِ جہاد بلند کریں۔۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ قومیت کا عقیدہ جس کی بنیاد نسل یا جغرافیائی حدودِ ملک پر ہے، دنیائے اسلام میں استیلا حاصل کر رہا ہے اور مسلمان، عالمگیر اخوت کے نصب العین کو نظر انداز کر کے اس عقیدہ کے فریب میں مبتلا ہو رہے ہیں جو قومیت کو ملک و وطن کی حدود میں مقید رکھنے کی تعلیم دیتا ہے۔ اس لئے میں ایک مسلمان اور ہمدردِ نوعِ انسان کی حیثیت سے انہیں یہ یاد دلانا مناسب

سمجھتا ہوں کہ ان کا حقیقی فریضہ سارے بنی آدم کی نشوو ارتقاء ہے۔

یہ درست ہے کہ مجھے اسلام سے محبت ہے لیکن مسٹر نکلسن کا یہ خیال درست نہیں کہ میں نے محض اس کی محبت کے پیشِ نظر مسلمانوں کو اپنا مخاطب ٹھہرایا ہے حقیقت یہ ہے کہ عملی حیثیت سے میرے لئے اس کے سوا چارہ نہیں تھا کہ ایک خاص جماعت یعنی مسلمانوں کو اپنا مخاطب قرار دیا جائے کیونکہ تنہا یہی جماعت میرے مقاصد کے لئے موزوں واقع ہوئی ہے۔.....

(فورِ فلاح انسانیت کے پروگرام کو عمل میں لانے کے لئے ضروری ہے کہ اس نظریہ کو پہلے ایک ایسی سوسائٹی تک محدود کر دیا جائے جو ایک مستقل عقیدہ اور معین راہِ عمل رکھتی ہو لیکن اپنے عملی نمونے اور ترغیب و تبلیغ سے ہمیشہ اپنا دائرہ وسیع کرتی جائے۔ میرے نزدیک اس قسم کی سوسائٹی اسلام ہے۔

جس عملی ضرورت کے پیشِ نظر، علامہ اقبالؒ نے اپنے عالمگیر پیغام کو ابتداءً مسلمانوں تک محدود رکھنا ضرور سمجھا۔ اسی قسم کے تقاضا نے انہیں اس پر مجبور کیا کہ وہ اس دائرے کو پہلے مسلمانانِ ہند تک محدود کر دیں۔

ہندوستان میں سیاسی تغیّرات

اس کی وجہ اُس زمانے میں ہندوستان میں سیاسی تغیرات کی نمود تھی۔ انگریز کے اپنے حالات اسے مجبور کر رہے تھے کہ مملکتِ ہند میں زیادہ سے زیادہ اختیارات اہلِ ہند کی طرف منتقل کر دے۔ ہندو نے اس موقعہ کو غنیمت سمجھا اور وطنیت کی بنا پر نظریۂ قومیت کو عام کرنا شروع کر دیا۔ اس کا مفہوم یہ تھا کہ:۔

(۱) ہندوستان کی جغرافیائی حدود میں بسنے والے تمام لوگ، بلحاظ مذہب و ملت ایک قوم کے افراد ہیں۔

(۲) حکومت کے اختیارات اس قوم کی طرف منتقل ہوں گے۔

(۳) یہاں جمہوری نظام رائج کیا جائے گا جس میں مملکت سے متعلق تمام فیصلے اکثریت کی آراء سے ہوتے ہیں۔

(۴) اور یہ ظاہر ہے کہ ہندوستان میں اکثریت ہندو کی تھی اور ہندو ہی کی رہنی تھی۔

(۵) اس کا منطقی نتیجہ یہ تھا کہ مسلمان ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہندو اکثریت کے محکوم رہیں۔
یہ تھا یہاں کے بدلتے ہوئے حالات کا فوری تقاضا جس کی وجہ سے علامہ اقبالؒ کو اپنی تمام تر توجہ مسلمانانِ ہند پر مرکوز کر دینی پڑی اور انہوں نے نہایت شد و مد سے اس حقیقت کو عام کرنا شروع کر دیا کہ وطنیت کے معیار کے مطابق قومیت کی تشکیل اسلام کے بنیادی اصول کے خلاف ہے ہندوستان میں بسنے والے تمام مسلمان، دین کے اشتراک کی بنا پر ایک منفرد اور مستقل بالذات قوم ہیں اور یہاں کے غیر مسلم ان سے الگ دوسری قوم کے افراد۔

آپ نے دیکھا برادرانِ عزیز! کہ دو قومی نظریہ نہ تو کسی ہنگامی سیاسی تقاضا کی پیداوار تھا اور نہ ہی اسے مسلمانوں کی جداگانہ مملکت کے لئے حربہ کے طور پر اختیار کیا گیا تھا۔ دو قومی نظریہ اس دن وجود میں آیا تھا جس دن خدا نے پہلی وحی عالمِ انسانیت کی طرف بھیجی تھی۔ یہ دینِ خداوندی کا اساسی اصول ہے اور توحید اور شرک میں خطِ امتیاز۔ اشتراکِ دین کے سوا کوئی بھی معیارِ قومیت ہو وہ اسلام کے خلاف ہے۔ اقبالؒ نے اس نظریہ قومیت کی نشر و اشاعت، یورپ سے واپسی

ہندو کی طرف سے مخالفت

کے بعد شروع کر دی تھی۔ وہ ساری عمر اس پیغام کو عام کرتے رہے۔ ان کے اس پیغام کے مخاطب کسی خاص خطے کے مسلمان نہیں تھے، ساری دنیا کے مسلمان تھے۔ لیکن جب اقبالؒ نے دیکھا کہ ہندوستان کے سیاسی تغیرات اس تیزی سے رونما ہو رہے ہیں کہ اگر یہاں مسلمانوں کی جداگانہ قومیت کے نظریہ کو خصوصیت کے ساتھ عام نہ کیا گیا تو نیشنلزم کی رُو سے یہاں مسلمانوں کا وجود ہی ختم ہو جائے گا، تو انہوں نے اس خطۂ زمین کو اپنے پیغام کا اوّلیں مخاطب قرار دے دیا۔ یہ کہتے ہوئے کہ اگر ہم یہاں اس نظریہ کو عمل میں لانے کے قابل ہو گئے تو یہ چیز باقی ممالکِ اسلامیہ کے لئے نظیر بن جائے گی اور اس طرح یہاں کی مسلم قوم، عالمگیر امتِ مسلمہ کی تشکیل کے لیے ذرّہ اوّلین (FIRST CRYSTAL) کا کام دے گی۔

جب ہندو نے دیکھا کہ اقبالؒ کا پیغام کس طرح ان کے اس خواب کو جس کی رُو سے وہ مسلمانانِ ہند کو ابدی طور پر اپنا محکوم رکھنا چاہتا تھا، خوابِ پریشاں بنا دے گا تو اس نے اس کی مخالفت کی اور سخت مخالفت۔ اقوامِ مغرب، مسلمانانِ عالم کے امتِ واحدہ بن جانے میں اپنے

استعمار کے لئے خطرہ محسوس کرتی تھیں اس لئے انہوں نے اسے مذہبی جنون کہہ کر اس کی مذمت اور مخالفت کی۔ ہندو نے مسلمانانِ ہند کے ایک الگ اور منفرد قوم کی حیثیت اختیار کر لینے میں، اپنے سیاسی تغلّب کے منصوبے بکھرتے دیکھے اس لئے اس نے بھی اس کی مخالفت کی۔ یہ ہے ہندوستان میں نیشنلزم اور دو قومی نظریہ کی کشمکش کی تمہید۔ یاد رہے کہ ہندو کے نزدیک تو دو قومی نظریہ کی مخالفت یکسر سیاسی نوعیت کی تھی لیکن مسلمانوں کی طرف سے اس نظریہ پر اصرار ان کے دین کا تقاضا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ اس دینی تقاضا کے پورا ہونے سے انہیں سیاسی مفاد بھی حاصل ہو جاتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام میں ملّت کے سیاسی مفادات اتباعِ دین کا فطری نتیجہ ہوتے ہیں۔ اسی لئے ان کی دنیا ان کے دین سے الگ نہیں ہوتی۔

آئیے! اب دیکھیں کہ ہندوستان میں نیشنلزم اور دو قومی نظریہ کی یہ جنگ کیسے لڑی گئی!

یہ حقیقت بڑی جگر پاش اور اس کا تذکرہ بڑا جاں سوز ہے کہ مخالفین نے جب کبھی اسلام اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کا تہیہ کیا تو اس مقصد کے لئے انہیں خود مسلمانوں میں سے آلۂ کار مل گئے۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں دو قومی نظریہ اسلام کے بنیادی اصولوں میں سے تھا اور ہندو کی طرف سے اس کی مخالفت سیاسی وجوہ پر تھی۔ لیکن اسے خود ہندی مسلمانوں میں ایسے لوگ مل گئے جو اس نظریہ کی مخالفت میں ہندوؤں سے بھی آگے بڑھ گئے۔ ان میں بعض لوگ تو محض سیاسی حیثیت کے حامل تھے اور سیکولر حکومت کے قائل۔

نیشنلسٹ مسلمان

ان کی طرف سے اس نظریہ کی مخالفت قابلِ فہم تھی اگرچہ یہ امر موجبِ تاسف تھا کہ مسلمان ہوتے ہوئے اس کی مخالفت کرتے تھے۔ لیکن سب سے زیادہ المناک اور زہرہ گداز یہ سانحہ تھا کہ ان مخالفین کی قیادت مذہبی پیشواؤں یعنی نیشنلسٹ علماء کی طرف سے ہو رہی تھی۔ ہندو مطمئن تھا کہ مسلمان اپنے جس دعویٰ کو مذہب کی بنیادوں پر پیش کر رہے ہیں اس کی مخالفت خود انہی کے مذہبی پیشواؤں کی طرف سے ہو رہی ہے۔ یہ مخالفت اپنے انتہائی نکتہ پر اس وقت پہنچی جب شروع ۱۹۳۸ء میں (مولانا) حسین احمد مدنی (مرحوم) نے دہلی کے ایک جلسہ عام میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ "قومیں اوطان سے بنتی ہیں، مذہب سے نہیں"۔ ہندوستان کے سب سے بڑے

معرکۂ دین و وطن

دار العلوم، دیوبند، کے شیخ الحدیث کی طرف سے اس قسم کا اعلان، کوئی ایسا حادثہ نہیں تھا جسے آسانی سے برداشت کیا جا سکتا۔ علامہ اقبالؒ اس زمانے میں، یوں کہیے کہ مرض الموت میں مبتلا تھے۔ جب انہوں نے اس نعرۂ جاہلیہ کو سُنا تو ان کے دلِ صد چاک سے ایک آہ اُبھری جو ان الفاظ کی شکل میں فضا کو چیرتی ہوئی آں سوئے افلاک تک جا پہنچی کہ:-

عجم ہنوز نداند رموزِ دیں ورنہ ز دیوبند حسین احمد این چہ بوالعجبی است

سرود بر سرِ منبر کہ ملّت از وطن است چہ بے خبر ز مقامِ محمد عربی است

مصطفےٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست

اگر باُو نرسیدی تمام بولہبی است

ان اشعار میں "مصطفےٰ برساں خویش را" کے الفاظ گہرے غور و فکر کے متقاضی اور ایک عظیم حقیقت کے عکاس ہیں۔ دین خدا کی طرف سے ملتا ہے لیکن اُمت کی تشکیل اس رسول کی طرف نسبت سے ہوتی ہے جو اس دین کو انسانوں تک پہنچاتا اور اس کے مطابق ایک معاشرہ کی تشکیل کرتا ہے۔ اسی نسبت سے، اسلام کے پَیرو، امتِ محمدیہ کہلاتے ہیں۔ اگر قومیت کی اساس وطن یا نسل قرار پا جائے تو رسول سے نسبت ختم ہو جاتی ہے اور جب رسول سے نسبت منقطع ہو جائے تو پھر اسلام بھی باقی نہیں رہتا۔ جیسا کہ میں شروع میں کہہ چکا ہوں، اس حقیقت پر قرآن کی وہ آیہ جلیلہ شاہد ہے جس میں کہا گیا ہے کہ اِنَّ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَهُمْ وَ كَانُوْا شِیَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِیْ شَیْءٍ (۶/۱۵۹) جو لوگ اپنے دین میں تفرقہ پیدا کریں اور اس طرح الگ الگ گروہ، پارٹیاں قومیں بن جائیں، اے رسولؐ! تیرا ان سے کوئی واسطہ نہیں۔ یعنی اگر قومیت کی اساس، رسول اللہؐ کی طرف نسبت کے بجائے کوئی اور قرار دے لی جائے تو ایسے لوگوں کا رسول سے تعلق منقطع ہو جاتا ہے۔ اسی بنا پر، علامہ اقبالؒ نے کہا کہ وطن کو قومیت کی اساس قرار دینے سے، رسول اللہؐ سے رشتہ منقطع ہو جاتا ہے۔ اگر تم مسلمان رہنا چاہتے ہو تو اپنی قومیت کی نسبت، وطن کے بجائے حضور نبی اکرمؐ کی طرف کرو — مصطفےٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست — اگر باُو نرسیدی — اگر تم نے اپنی نسبت حضورؐ کی طرف نہ کی تو — تمام بولہبی است — پھر دین باقی نہیں رہتا۔ بولہبی رہ جاتی ہے جس میں قومیت کی نسبت وطن یا نسل کی طرف جاتی ہے۔

علامہ اقبالؒ کی یہ تنبیہہ اس قدر واضح تھی کہ اس کے بعد مولانا مدنی اور ان کے ساتھ دیگر نیشنلسٹ علماء کو نہ صرف اپنی غلطی کا اعتراف کر لینا چاہیئے تھا بلکہ نیشنلزم کا مسلک بھی ترک کر دینا چاہیئے تھا۔ لیکن اس کے بجائے، مولانا مدنی نے اپنے دعوے کی مدافعت میں لمبا چوڑا بیان داغ دیا۔ اس کے جواب میں علامہ اقبالؒ نے وہ بیان شائع کیا جو "معرکہ دین و وطن" کے نام سے مشہور ہے اور جو اسلامی قومیت کے مسئلہ پر ناقابل تردید حقائق کی تابندہ دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ چونکہ مرورِ زمانہ سے یہ دستاویز (بالعموم) نگاہوں سے اوجھل ہوگئی ہے اور پاکستان میں وطنیت کی تحریک پھر سے باندازِ نو اُبھاری جا رہی ہے اس لئے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ اس کے اہم حصے سامعین کے گوش گذار کر دیئے جائیں۔ ان حقائق کی اہمیت کے پیشِ نظر ان اقتباسات کی طوالت کے لئے مجھے معذرت خواہ ہونے کی بھی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ علامہ اقبالؒ نے سب سے پہلے یہ کہا کہ:-

> مولانا حسین احمد صاحب سے بہتر اس بات کو کون جانتا ہے کہ اسلام، ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ کے اصول کی حیثیت میں کوئی لچک اپنے اندر نہیں رکھتا اور ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ کے کسی اور آئین سے کسی قسم کا راضی نامہ یا سمجھوتہ کرنے کو تیار نہیں بلکہ اس امر کا اعلان کرتا ہے کہ ہر دستور العمل جو غیر اسلامی ہو، نامعقول و مردود ہے۔

اس کے بعد انہوں نے فرمایا:-

> کون نہیں جانتا کہ حضرت ابراہیمؑ سب سے پہلے پیغمبر تھے جن کی وحی میں قوموں، نسلوں اور وطنوں کو بالائے طاق رکھا گیا۱۔ نوعِ آدم کی صرف ایک تقسیم کی گئی۔ یعنی موحد اور مشرک۔ اس وقت سے صرف دو ہی ملتیں دنیا میں ہیں۔ تیسری کوئی ملت نہیں۔ کعبۃ اللہ کے محافظ آج دعوتِ ابراہیمی اور دعوتِ اسماعیلی سے غافل ہوگئے۔ قوم اور

---

۱ "سب سے پہلے پیغمبر" صرف اس اعتبار سے کہ آپ نے تعمیرِ کعبہ سے امتِ مسلمہ کے لئے ایک محسوس مرکز کی بنا رکھی ورنہ دو قومیتوں کی بنیاد تو خدا کی طرف سے اولین وحی نے رکھ دی تھی جو حضرت ابراہیمؑ سے بہت پہلے کی بات ہے۔

قومیت کی ردا اوڑھنے والوں کو اس ملت کے بانیوں کی وہ دعا یاد نہ آئی جو اللہ کے گھر کی بنیاد رکھتے وقت ان دونوں پیغمبروں نے کی تھی. وَ اِذْ یَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ وَ اِسْمٰعِیْلُ ؕ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ۝ رَبَّنَا وَ اجْعَلْنَا مُسْلِمَیْنِ لَكَ وَ مِنْ ذُرِّیَّتِنَاۤ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ص (۱۲۷-۱۲۸/۲) کیا خدا کی بارگاہ سے امتِ مسلمہ کا نام رکھوانے کے بعد بھی یہ گنجائش تھی کہ آپ کی ہیئتِ اجتماعیہ کا کوئی حصہ کسی عربی، ایرانی، افغانی، انگریزی، مصری یا ہندی قومیت میں جذب ہو سکتا. امتِ مسلمہ کے مقابل میں تو صرف ایک ہی ملت ہے اور وہ الکفر ملۃ واحدۃ کی ہے.

اس اصولی حقیقت کی وضاحت کے بعد کہا.

اگر وطنیت کا جذبہ ایسا ہی اہم اور قابلِ قدر تھا تو رسول اللہ کے بعض اقارب ہم نسلوں اور ہم قوموں کو آپؐ سے پرخاش کیوں ہوئی. کیوں نہ رسول اللہ نے اسلام کو محض ایک ہمہ گیر ملت سمجھ کر بلحاظ قوم یا قومیت، ابوجہل اور ابولہب کو اپنا لئے رکھا اور ان کی دلجوئی کرتے رہے. بلکہ کیوں نہ عرب کے سیاسی امور میں ان کے ساتھ قومیتِ وطنی قائم رکھی..... محمدؐ (فداہ ابی وامی) کی قوم آپ کی بعثت سے پہلے ایک قوم تھی اور آزاد تھی. لیکن جب محمدؐ کی امت بننے لگی تو اب قوم کی حیثیت ثانوی رہ گئی. جو لوگ رسول اللہؐ کی متابعت میں آ گئے وہ خواہ ان کی قوم میں سے تھے یا دیگر اقوام سے، وہ سب امتِ مسلمہ یا ملتِ محمدیہؐ بن گئے. پہلے وہ ملک و نسب کے گرفتار تھے. اب "ملک و نسب" ان کا گرفتار ہو گیا.

کسے کو پنجہ زد ملک و نسب را　　نہ داند نکتۂ دینِ عرب را
اگر قوم از وطن بودے، محمدؐ　　نہ دادے دعوتِ دیں بولہب را

حضور رسالتمآبؐ کے لئے یہ راہ بہت آسان تھی کہ آپ بولہب یا بوجہل یا کفارِ مکہ

سے یہ فرماتے کہ تم اپنی بُت پرستی پر قائم رہو' ہم اپنی خدا پرستی پر قائم رہتے ہیں مگر اس نسلی اور وطنی اشتراک کی بنا پر جو ہمارے اور تمہارے درمیان موجود ہے ایک وحدتِ عربیہ قائم کی جا سکتی ہے. لیکن اگر حضورؐ (نعوذ باللہ) یہ راہ اختیار کرتے تو اس میں شک نہیں کہ یہ ایک وطن دوست کی راہ ہوتی، نبیِؐ آخرالزماںؐ کی راہ نہ ہوتی.

آپ نے غور فرمایا برادرانِ گرامی قدر! علامہ اقبالؒ نے اپنے اس بیان میں اسلامی نظریہ قومیت کو کس طرح اُبھار اور نکھار کر بیان کر دیا ہے. لیکن ابھی اس نظریہ کا ایک رُخ باقی ہے. جیسا کہ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں' دین تو خدا کی طرف سے ملتا ہے لیکن امت کی تشکیل اس نبی کی طرف نسبت سے ہوتی ہے جس کی وساطت سے وہ دین ہم تک پہنچتا ہے. میں اس حقیقت کو اس سے پہلے بھی متعدد بار واضح کر چکا ہوں لیکن موضوع کی اہمیت کے پیشِ نظر اسے آج پھر دہرا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ امت کی یہ تشکیل اس رسول کی طرف نسبت سے ہوتی ہے جسے سلسلۂ انبیاء کی آخری کڑی تسلیم کیا جائے. مثلاً ایک عیسائی' حضرت عیسیٰؑ اور ان سے پہلے کے جملہ انبیائے بنی اسرائیل پر ایمان رکھتا ہے. لیکن چونکہ وہ حضرت عیسٰیؑ کو اس سلسلہ کی آخری کڑی سمجھتا ہے. یعنی نبوت کو حضرت عیسٰیؑ کی ذات پر ختم قرار دیتا ہے' اس لئے وہ امتِ حضرت عیسیٰؑ کا فرد (یا عیسائی) کہلاتا ہے لیکن جونہی وہ حضرت عیسٰیؑ کے بعد ایک اور نبی (یعنی محمد رسول اللہ) پر ایمان لے آتا ہے' وہ امتِ عیسوی سے کٹ کر ایک نئی امت یعنی امتِ محمدیہ کا فرد بن جاتا ہے. اسی اصول کی رو سے' اگر کوئی شخص محمد رسول اللہ کے بعد کسی اور نبی پر ایمان لے آتا ہے تو وہ امتِ محمدیہ سے کٹ کر ایک نئی امت کا فرد قرار پا جاتا ہے. علامہ اقبالؒ نے اپنے بیان میں اس حقیقت کو بھی واضح کر دیا کہ جس طرح رسولؐ اللہ کے بعد کسی کو نبی تسلیم کرنے والے کا رشتہ امتِ محمدیہ سے کٹ جاتا ہے اسی طرح نسل یا وطن کو قومیت کی اساس قرار دینے سے بھی امتِ محمدیہ کے ساتھ رشتہ باقی نہیں رہتا. انہوں نے کہا کہ:۔

حقیقت یہ ہے کہ مولانا حسین احمد یا ان کے دیگر ہم خیالوں کے افکار میں نظریۂ وطنیت ایک معنی میں وہی حیثیت رکھتا ہے جو قادیانی افکار میں انکارِ خاتمیت"

کا نظریہ. وطنیت کے حامی بالفاظِ دیگر یہ کہتے ہیں کہ امتِ مسلمہ کے لئے ضروری ہے کہ وقت کی مجبوریوں کے سامنے ہتھیار ڈال کر اپنی اس حیثیت کے علاوہ جس کو قانونِ الٰہی ابدالآباد تک متعین و متشکل کر چکا ہے کوئی اور حیثیت بھی اختیار کر لے. جس طرح قادیانی نظریہ ایک جدید نبوت کی اختراع سے قادیانی افکار کو ایسی راہ پر ڈال دیتا ہے کہ اس کی انتہا نبوتِ محمدیہ کے کامل و اکمل ہونے سے انکار ہے. بعینہٖ اسی طرح وطنیت کا نظریہ بھی امتِ مسلمہ کی بنیادی سیاست کے کامل ہونے سے انکار کی راہ کھولتا ہے.

آپ نے دیکھا کہ علامہ اقبالؒ نے کس طرح اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ وطن یا نسل کی بنیاد دں پر قومیت کا تصور، ذاتِ رسالتمآبؐ سے اپنا رشتہ منقطع کر کے، ایک جدید امت یا نئے دین کو وجود میں لانے کے مرادف بن جاتا ہے. اسی بنا پر انہوں نے اپنے اس بیان میں متنبہ کیا تھا کہ

اگر بعض مسلمان اس فریب میں مبتلا ہیں کہ دین اور وطن، بہ حیثیت ایک سیاسی تصور کے یکجا رہ سکتے ہیں تو میں بروقت مسلمانوں کو انتباہ کرتا ہوں کہ اس راہ کا آخری مرحلہ اوّل تو لادینی ہوگی اور اگر لادینی نہیں تو اسلام کو محض ایک اخلاقی نظریہ سمجھ کر اس کے اجتماعی نظام سے لاپرواہی.

آنے والا مورّخ جب اس دَور کی تاریخ پر نگاہ ڈالے گا تو وہ یہ دیکھ کر یقیناً محوِ حیرت رہ جائے گا کہ علامہ اقبالؒ نے جو کہا تھا کہ وطنیت کی اساس پر قومیت کا تصور، اسلام کی اصولی تعلیم کے خلاف ہے تو اس حقیقت کو نہ دار العلوم دیوبند کے شیخ الحدیث، مولانا حسین احمد مدنی سمجھے اور نہ ہی دیگر نیشنلسٹ علماء. (جن میں مولانا ابوالکلام آزاد، مفتی کفایت اللہ، مولانا احمد سعید اور علمائے مجلس احرار جیسے نامور مذہبی رہنما سب شامل تھے) لیکن اسے سمجھا تو ہندو راہنماؤں نے سمجھا. چنانچہ

ہندو لیڈروں کا اعتراف

جس زمانہ میں متحدہ قومیت کا مسئلہ بحث و نزاع کا مرکز بن رہا تھا، لالہ لاجپت رائے نے (جو اسی لاہور کے رہنے والے بڑے متشدد ہندو تھے) مسٹر سی. آر. داس کو ایک خط میں لکھا (جو اخبار مرہٹہ کی ۲؍ فروری ۱۹۴۰ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا) کہ:-

> ایک اور چیز جو کچھ عرصہ سے میرے لئے بے حد وجہ اضطراب ہو رہی ہے' ہندو مسلم اتحاد کا مسئلہ ہے اور میں چاہتا ہوں کہ آپ کو اس پر دعوتِ غور و فکر دوں. گذشتہ چھ ماہ میں نے اپنے وقت کا بیشتر حصہ اسلامی تاریخ اور اسلامی قوانین کے مطالعہ میں صرف کیا ہے اور اس سے جس نتیجہ پر میں پہنچا ہوں' وہ یہ ہے کہ یہ چیز (یعنی ہندو مسلم اتحاد) ایک امرِ محال اور ناقابلِ عمل شے ہے....... میں تہ دل سے ہندو مسلم اتحاد کی ضرورت کا قائل ہوں. اس کے لئے میں مسلمان راہنماؤں پر اعتماد کرنے کو بھی تیار ہوں. لیکن قرآن و حدیث کے احکام کو ہم کیا کریں گے؟ مسلمان راہنما ان پر تو خطِ تنسیخ نہیں کھینچ سکتے.

لیکن مسلمانوں کے مذہبی راہنماؤں نے سینہ تان کر کہا کہ قرآن و حدیث کے احکام پر خطِ تنسیخ کیوں نہیں کھینچا جا سکتا؟ ہم ہزار برس سے یہی کچھ کرتے چلے آئے ہیں' اب بھی یہی کریں گے.

لالہ لاجپت رائے کے اسی خیال کی تائید میں' آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے رکن' مسٹر این. سی. دت نے اپنی کھلی چٹھی میں (جو اخبار مدینہ کی یکم فروری ۱۹۴۰ء کی اشاعت میں شائع ہوئی تھی) لکھا کہ

> ان حالات میں میرا خیال ہے کہ ہندو مسلم قضیہ کا حل یہی ہوگا کہ ہندوستان میں ہندو اور مسلمانوں کو دو قومیں سمجھ لیا جائے اور پھر دو قوموں کی حیثیت سے ان کے متعلق ایک متحدہ قومیت کا خیال ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دل سے نکال دیا جائے.

بہرحال' میں یہ کہہ رہا تھا کہ علامہ اقبالؒ اپنی زندگی کے آخری سانس تک' مسئلہ قومیت کی' اسلامی نقطۂ نگاہ سے' وضاحت کرتے رہے اور اسی کی بنیاد پر انہوں نے مسلمانوں کے لئے ایک جداگانہ مملکت کا تصور پیش کیا. وہ ملتِ اسلامیہ کو یہ پیغام دیتے دیتے عالمِ جاوداں کی طرف سدھار گئے اور اس شمع کو ایسے ہاتھوں میں دے گئے جن کی امانت و دیانت پر انہیں پورا پورا اعتماد تھا. یہ ہاتھ تھے' اللہ کے بندے' محمد علی جناحؒ کے جنہیں ملتِ اسلامیہ نے قائداعظمؒ کے برجستہ' موزوں ترین اور ان کے شایانِ شان لقب سے پکارا. رحمہما اللہ تعالیٰ!

میں نے شروع میں کہا ہے کہ اقبالؒ' ہندوستان سے گیا تو "میرا وطن' میرا وطن" کہتے ہوئے

اور انگلستان سے واپس آیا تو اس نظریۂ وطنیت کو انسانیت اور اسلام کا سب سے بڑا دشمن اور ابلیس کی اختراع قرار دیتے ہوئے۔ اقبالؒ کی زندگی میں یہ انقلاب بڑا تحیر انگیز ہے۔ لیکن اس سے کہیں

جناحؒ کی زندگی کا عظیم انقلاب

زیادہ حیرت افزا اور تعجب انگیز ہے وہ انقلاب جو محمد علی جناحؒ کی زندگی میں رونما ہوا۔ وہ نہ صرف یہ کہ عقیدۂ وطنیت پر نظری طور پر اعتقاد رکھتے تھے۔ بلکہ عملاً بھی ان کا شمار کانگریس کے بلند ترین رہنماؤں میں ہوتا تھا۔ بمبئی کا "جناح کانگرس ہال" آج بھی ان کے عقیدۂ وطنیت کی یاد تازہ کراتا ہے۔ حیرت ہے کہ اقبالؒ کی نگہ دوررس نے کیسے بھانپ لیا کہ مسلمانوں کے لئے دو قومی نظریہ کی بنا پر ایک جداگانہ مملکت کا حصول اس شخص کے ہاتھوں ممکن ہوگا جو اس قدر کٹر وطن پرست اور صفِ اوّل کا کانگرسی تھا۔ اسے کہتے ہیں دیدہ وری اور مومنانہ فراست! قائداعظمؒ کے سوانح حیات کا مرتب ہکٹر بولیتھو (HECTOR BOLITHO) اس حقیقت کی پردہ کشائی کرتا ہے کہ "اپنے قیام انگلستان کے دوران، مسٹر جناحؒ نے اقبالؒ سے کئی ملاقاتیں کیں۔ وہ نہایت اچھے دوست تھے لیکن اس کے باوجود جناحؒ نے اقبالؒ کے دلائل کو فوری طور پر تسلیم نہ کیا۔ اس میں قریب دس سال کا عرصہ لگ گیا۔" (ص ۹۹)۔ معلوم نہیں، اقبالؒ نے کس کس طریق سے جناحؒ کو (CONVERT) کرنے کی کوشش کی۔ اگرچہ ان کی کوششیں جلد نتیجہ خیز نہ ہوئیں۔ لیکن انہوں نے دامنِ امید کو اپنے ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں جناحؒ کی ذات پر کس قدر بھروسہ اور اپنی مساعی کے بارآور ہونے پر کس قدر یقینِ محکم تھا۔ برسوں کی کوششوں کے بعد انہوں نے ۲۱ جون ۱۹۳۷ء کو جناحؒ کو وہ خط لکھا جو ان کے ترکش کا آخری تیر تھا۔ وہ تیر ٹھیک نشانہ پر بیٹھا۔ اس خط میں انہوں نے لکھا تھا کہ

> میں جانتا ہوں کہ آپ بہت مصروف انسان ہیں لیکن مجھے امید ہے کہ میرا آپ کو بار بار لکھنا آپ پر گراں نہیں گزرتا ہوگا۔ (میرے اس اصرار و تکرار کی وجہ یہ ہے) کہ میری نگاہوں میں اس وقت ہندوستان بھر میں آپ ہی وہ واحد مسلمان ہیں

۱؎ اس سے غالباً یہ مراد ہے کہ اقبالؒ نے مسلمانوں کی الگ مملکت کا جو تصور ۱۹۳۰ء میں پیش کیا تھا اسے قائداعظمؒ نے ۱۹۴۰ء میں قراردادِ پاکستان کی شکل میں متعین کر دیا۔

جس کے ساتھ ملّتِ اسلامیہ کو اپنی یہ امیدیں وابستہ کرنے کا حق ہے کہ آپ اِس طوفان میں جو یہاں آنے والا ہے، اس کی کشتی کو ثابت و سالم، بہ امن و عافیت، ساحلِ مراد تک لے جائیں گے۔ (ص ۱۱۵)

یہ تیر اقبالؒ کے قلب سے نکلا اور راد سیدھا جناحؒ کے دل میں پیر گیا۔ اور پھر اقبالؒ اپنے پیغام کی شمع جناحؒ کے ہاتھوں میں دے کر نہایت سکون اور اطمینان کے ساتھ یہ کہتا ہوا دنیا سے رخصت ہو گیا کہ

پس از من شعرِ من خوانند و دریابند و می گویند
جہانے را دگرگوں کرد یک مردِ خود آگاہے

میرے نزدیک نیشنلسٹ جناحؒ میں یہ نظری تغیّر پیدا کرنا، اقبالؒ کا اتنا بڑا احسان ہے جس سے ملّتِ اسلامیہ کبھی عہدہ برآ نہیں ہو سکتی۔

قائدِ اعظمؒ نے اس جنگ کو دس سال تک جاری رکھا اور بالآخر نہ صرف ہندوؤں سے بلکہ ساری دنیا سے اس حقیقت کو منوالیا کہ مسلمان، دین کے اشتراک کی بنا پر ایک جداگانہ قوم ہیں اور ایک الگ آزاد مملکت کے مستحق۔ چونکہ آج کی نشست میں میرا موضوع علامہ اقبالؒ اور دو قومی نظریہ ہے۔ اس لئے میں اس وقت اس جنگ کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتا جو قائدِ اعظمؒ نے دس سال تک لڑی۔ اس کی تفاصیل میں گذشتہ پچیس سال سے بیان کرتا چلا آرہا ہوں اور آئندہ بھی بتوفیقِ ایزدی مناسب مواقع پر بیان کرتا رہوں گا کہ یہ جنگ درحقیقت دین و وطن کی آویزش اور کفر و اسلام کا معرکہ تھا جسے بیان کرنا میری زندگی کا مشن ہے۔

قائدِ اعظمؒ نے دس سال تک یہ جنگ لڑی اور بالآخر پاکستان وجود میں آگیا۔ یہاں سے پھر ایک ایسی داستان کا آغاز ہوتا ہے جو سابقہ داستان سے بھی زیادہ حیرت افروز، عبرت انگیز اور اس کے ساتھ ہی جگر سوز اور دلدوز ہے۔

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، دو قومی نظریہ کی دو شقیں تھیں۔ ایک یہ کہ غیر مسلم اور مسلم مل کر ایک قوم نہیں بن سکتے اور دوسری شق یہ کہ تمام مسلمان، دین کے اشتراک کی بنا پر اُمّتِ واحدہ (ایک قوم) ہیں۔ نسل، وطن، زبان، ثقافت وغیرہ کے اختلاف سے یہ مختلف قومیتوں اور گروہوں میں نہیں بٹ سکتے۔ قائدِ اعظمؒ کی وفات ۱۹۴۸ء میں ہوگئی اور اس کے بعد جب مملکتِ پاکستان کے لئے آئین

مرتب کرنے کا مرحلہ پیش آیا تو دنیا یہ دیکھ کر محوِ حیرت رہ گئی کہ اس میں پہلی شق کو مسترد کر دیا گیا ہے۔ یعنی پاکستان کی حدود میں بسنے والے تمام باشندوں۔ مسلمانوں اور غیر مسلموں۔ کو ایک قوم قرار دے دیا گیا ہے۔ یہ چیز نہ صرف یہ کہ اسلام کے بنیادی اصول کے خلاف تھی، بلکہ اس دعوے کے بھی خلاف جس کی بنا

حصولِ پاکستان کے بعد

پر ہم نے ایک الگ مملکت حاصل کی تھی۔ اس سے ہم نے وطنیت کو معیارِ قومیت قرار دے دیا اور اس طرح پاکستان کی وجہِ جواز کی خود ہی نفی کر دی۔ یہاں پچیس سال سے آئین سازی کی مہم جاری ہے۔ مسلسل مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ پاکستان کا آئین اسلامی ہونا چاہیئے۔ لیکن یہ مطالبہ کرنے والوں میں سے آج تک کسی نے یہ نہیں کہا کہ وطنیت کی بنیاد پر تشکیلِ قومیت، اسلام کو جڑ بنیاد سے اکھیڑ دیتی ہے۔ یہ اس لئے کہ ہمارے ہاں کی مذہبی پیشوائیت بالعموم ان علماء (یا ان کے شاگردوں) پر مشتمل ہے جنہوں نے مطالبہ پاکستان کی مخالفت کی تھی۔ یہ لوگ وطنیت کو معیارِ قومیت قرار دے کر نہ صرف یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ تحریکِ پاکستان کے دوران ان کا (یا ان کے اساتذہ کا) موقف صحیح تھا بلکہ حصولِ پاکستان سے انہیں جو شکستِ پندار ہوئی تھی اس کا انتقام بھی لینا چاہتے ہیں۔ پاکستان میں متحدہ قومیت کی تشکیل سے سب سے زیادہ نقصان مشرقی پاکستان میں ہوا۔ ایک تو اس لئے کہ وہاں غیر مسلموں (ہندوؤں) کی آبادی کثیر تھی اور دوسرے اس لئے کہ وہاں غیر مسلم بڑی مؤثر حیثیت رکھتے تھے۔ نہ صرف یہ کہ وہاں کی اقتصادیات اور سیاست ان کے ہاتھ میں تھی، مسلمان بچوں کی تعلیم کے نگران بھی وہی تھے۔ تعلیم کی بات چلی ہے تو اس سے ایک اہم نکتہ سامنے آ گیا۔ وطن یا نسل کو بنائے قومیت قرار دینے سے، قوم کی تشکیل کے لئے کسی قسم کی جدوجہد کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ہر بچہ پیدائشی طور پر اس قوم کا فرد ہوتا ہے لیکن کسی نظریہ کی بنا پر قوم کی تشکیل کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ قوم کے بچوں کو اس نظریہ کی تعلیم دی جائے۔ ہم نے نہ صرف یہ کہ تعلیم کے اس اہم مقصد سے اغماض برتا بلکہ اپنی نژادِ نو کی تعلیم ان لوگوں کے ہاتھ میں دے دی جو اس نظریہ کے مخالف تھے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ہماری نئی نسل وہ ذہنیت لے کر ابھری جس کی ترجمانی ڈھاکہ یونیورسٹی کے ایک طالب علم، عزیز الرحمٰن نے اپنے اس خط میں کی تھی جو ۱۹۶۹ء میں وہاں کے اخبار آنت میں شائع ہوا تھا۔ اس میں اس نے کہا تھا کہ ہم سے جو کہا جاتا رہا کہ مسلمان، مذہب کی بنا پر ہندوؤں سے الگ قوم ہیں تو اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ:-

> ہم شری چیتنا، خودی رام، سبھاش بوس، بیجائے سنگھ جیسے اپنے قومی ہیروز کو فراموش کر بیٹھے اور ان کی جگہ خالدؔ، طارقؔ، موسےٰ اور علیؔ جیسوں کو اپنا ہیرو سمجھنے لگ گئے۔ ہم نے اپنے دیس کے بھگوان کو بھلا دیا اور اس کی جگہ ایک غیر ملکی خدا ــــ یعنی اللہ ــــ کو اپنا معبود تصور کر لیا۔ ہم اپنے بچوں کے نام اپنی زبان کے بجائے ایک اجنبی زبان میں رکھنے میں خوشی محسوس کرنے لگے۔ ہم نور اللہ اور خلیل اللہ جیسے ناموں پر ریجھ گئے اور ناگنی، کھاگنی جیسے سیدھے سادے ناموں کو تیاگ دیا۔

اس کے بعد اس نے لکھا تھا کہ

> اب ہمارا بنگالی جذبہ آہستہ آہستہ بیدار ہو رہا ہے اس سے اسلامی قومیت کے بند ڈھیلے پڑ جائیں گے اور علاقائی قومیت کے رشتے مضبوط ہو جائیں گے۔ مغربی پاکستان میں ہمارے سندھی بھائی بھی بیدار ہو رہے ہیں۔ انہوں نے بھی یہ سمجھنا سیکھ لیا ہے کہ ہم راجہ داہر کی اولاد ہیں اور پہلے سندھی اور اس کے بعد کچھ اور ہیں۔

مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بعد ہم تحقیقاتی کمیشن بٹھا رہے ہیں یہ معلوم کرنے کے لئے کہ اس حصّہ پاکستان کی علیحدگی کے اسباب کیا تھے۔ کوئی اس کی وجہ اقتصادی استحصال قرار دیتا ہے کوئی سیاسی غلطیاں۔ کوئی کچھ کہتا ہے کوئی کچھ۔ لیکن کسی کی نگاہ اس حقیقت تک نہیں پہنچتی کہ اس کا بنیادی سبب ہمارا یہ غلط اقدام اور غلط تعلیم ہے جس کی رُو سے ہم نے وطنیت کو معیارِ قومیت قرار دے لیا ہے۔ جب آپ وطن کو معیارِ قومیت قرار دے لیں گے تو جس علاقے کے لوگ چاہیں گے اپنے علاقہ کو اپنا وطن قرار دے کر اپنے آپ کو جداگانہ قوم قرار دے لیں گے اور جب وہ ایک الگ قوم بن جائیں گے تو اس کے بعد ان کی جداگانہ مملکت کا دعویٰ اور مطالبہ جائز قرار پا جائے گا۔ ہم مشرقی پاکستان کی

مغربی پاکستان میں وطنیت کا تصوّر

علیحدگی کو رو رہے ہیں اور نہیں دیکھتے کہ مغربی پاکستان بھی اسی راستے پر چلا جا رہا ہے جس پر مشرقی پاکستان چل رہا تھا۔ آپ کو یاد ہو گا کہ ۱۹۶۸ء میں کراچی کی "عوامی ادبی انجمن"

کی طرف سے ایک پمفلٹ شائع ہوا تھا جس میں منجملہ دیگر "دانشورانِ قوم" جوش ملیح آبادی اور فیض احمد فیض کے دستخط ثبت تھے۔ اس پمفلٹ میں کہا گیا تھا:۔

> ہمارے نزدیک جمہوری آزادی میں قوموں کی ترقی کا مسئلہ بھی شامل ہے ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے ملک میں، جو مختلف قوموں کا وطن ہے، وہ حالات پیدا کئے جائیں کہ سب قومیں ان کی زبانیں اور تہذیبیں کسی ایک قوم کے اثر و تسلط سے آزاد ہو کر خود مختارانہ ترقی کر سکیں..... ہمارے نزدیک پاکستان کی تمام قومیں مساوی حقوق کی مالک ہیں۔

یہ پہلی چنگاری تھی جو مغربی پاکستان کے نیستانِ ملت میں پھینکی گئی۔ اس کے بعد دیکھتے ہی دیکھتے یہ آگ اس تیزی سے بھڑکی کہ اب اس حصۂ پاکستان کا بھی کوئی گوشہ اس کی زد سے محفوظ نہیں رہا چونکہ جداگانہ قوموں کے لفظ سے یہاں کے عوام بدکتے تھے اس لئے محض بغرض تلبیس "قوموں" کی جگہ "قومیتوں" کی اصطلاح وضع اور اختیار کی گئی ہے۔ یہ محض لفظی فریب ہے ورنہ قومیت سے درحقیقت ان کی مراد قوم ہی ہے۔ مغربی پاکستان میں وطن سے مراد صوبہ لیا جا رہا ہے اور چونکہ یہاں چار صوبے ہیں

عام پراپیگنڈا

اس لئے چار قومیتوں کا تصور عام کیا جا رہا ہے۔ قوم ہو یا قومیتیں اور پانچ ہوں یا چار مقصد اسلامی معیارِ قومیت کے بجائے وطنی معیارِ قومیت کا نظریہ عام کرنا اور اس طرح مغربی پاکستان کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے، بالآخر اس کے جداگانہ وجود کو ختم کرنا ہے۔ سقوطِ ڈھاکہ کے بعد (ہندوستان کی وزیر اعظم) مسز اندرا گاندھی نے اپنی فتح کا جشن مناتے ہوئے کہا تھا کہ

> یہ کامیابی نہ ہماری فوجوں کی کامیابی ہے اور نہ ہماری حکومت کی کامیابی۔ یہ کامیابی ہے حق پر مبنی نظریہ کی، اس نظریہ پر جو باطل پر مبنی تھا اور جس پر مسلمانوں نے تحریک پاکستان کی بنیاد رکھی تھی۔

اس نے اُدھر یہ کہا اور اِدھر سرحد کے رہنما خان عبدالولی صاحب نے اعلان فرمایا کہ

> دو قومی نظریہ ختم ہو چکا ہے۔ اسلام کی باتیں ڈیڑھ ہزار سال پرانی اور فرسودہ ہیں پچیس سال کے تجربہ نے ثابت کر دیا ہے کہ نظریہ پاکستان غلط تھا۔

(نوائے وقت، ۱۳ اکتوبر ۷۲ء)

بیٹے نے یہ کہا اور ان کے والد بزرگوار (خان عبدالغفار خان) نے ٹائمز آف انڈیا کے نمائندے، مسٹر دلیپ کمار مکرجی کو انٹرویو دیتے ہوئے فرمایا کہ

> چند سال پہلے کا پاکستان اب مر چکا ہے. مغربی پاکستان میں چار قومیتوں کے درمیان رشتہ کے لئے اسلام کافی نہیں رہے گا. اس کے لیے سیکولر بنیادوں پر رشتے کی تعمیر کرنی ہوگی.

انہوں نے یہ بات آج نہیں کہی. وہ پہلے دن سے نیشنلسٹ ہیں اور ہندوؤں سے بھی زیادہ متشدد نیشنلسٹ. وہ اپنے اس عقیدہ کا برابر پرچار کرتے رہتے ہیں. ۱۹۶۹ء میں جب وہ کابل سے بھارت گئے ہیں تو انہوں نے وہاں کہا تھا کہ

> میں نے دو قومی نظریہ کبھی تسلیم نہیں کیا. نہ ہی میں کبھی ایسا کروں گا. مذہب قومیت کا معیار کس طرح ہو سکتا ہے؟ میں افغانستان کے باشندوں کو بھی کہتا رہا ہوں اور دوسرے لوگوں کو بھی کہ اسلام دنیا میں انسان کے بعد آیا ہے جب اسلام یا کوئی اور مذہب دنیا میں نہیں آیا تھا اس وقت بھی تو یہاں انسان بستے تھے. ان کی کوئی نہ کوئی قومیت تو تھی ہی. لہذا میں اسے کس طرح تسلیم کروں کہ قومیت کا معیار مذہب ہو سکتا ہے؛ حقیقت یہ ہے کہ ہماری اکثر مشکلات کا سبب یہ ہے کہ ہم مذہب کو قومیت کے ساتھ ملا دیتے ہیں.
>
> (اسٹیٹسمین، ۱۶ اکتوبر ۱۹۶۹ء بحوالہ پاکستان ٹائمز ۱۹ ؍۳)

چار قومیتوں کا نظریہ نیشنل عوامی پارٹی کے منشور میں داخل ہے اور اس کے راہنما اٹھتے بیٹھتے اس کا پرچار کرتے رہتے ہیں. ابھی حال ہی میں (گذشتہ مارچ) میں مسٹر غوث بخش بزنجو نے، مرکزی اسمبلی کے ایوان میں اس نظریہ کو دہرایا تھا. یہ آواز، اب نیشنل عوامی پارٹی یا اس کے ہمنواؤں تک محدود نہیں رہی، ہماری نئی نسل کے ہر نوجوان کے لب پر عام ہو رہی ہے جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے پاکستان میں مذہبی پیشوائیت کی اکثریت ان لوگوں پر مشتمل ہے جنہوں نے خود (یا ان کے اساتذہ اور مقتداؤں نے) تحریکِ پاکستان کے دوران، دو قومی نظریہ کی مخالفت کی تھی. اس لئے جب وہ دیکھتے ہیں کہ یہاں نظریۂ وطنیت عام ہو رہا ہے تو بہت خوش ہوتے ہیں کہ آخر الامر جیت انہی کی ہوئی. جماعت اسلامی

کا دعویٰ ہے کہ دو قومی نظریہ کے سب سے پہلے داعی ان کے امیر سید ابوالاعلیٰ مودودی تھے لیکن مودودی صاحب کی کیفیت یہ ہے کہ نہ صرف یہ کہ انہوں نے کبھی اس کا مطالبہ نہیں کیا کہ یہاں دو قومی نظریہ کو عملی شکل دی جائے بلکہ انہوں نے ۱۹۶۳ء میں انتخابات کے سلسلہ میں یہاں تک کہہ دیا تھا کہ

> اگر کنونشن مسلم لیگ کسی فرشتے کو بھی امیدوار کھڑا کرے گی تو جماعت اسلامی اس کی حمایت نہیں کرے گی۔ کیونکہ ہمیں اس کے اصولوں سے اتفاق نہیں اس کے برعکس اگر ایک ہندو جمہوری نظام کی حمایت کرتا ہے تو اُسے میری تائید حاصل ہو گی۔ اس لئے کہ اس نے یہ اصول تو تسلیم کر لیا کہ ملک کا نظام اکثریت کے نظریئے کے مطابق ہونا چاہیئے۔ (امروز ۲۰/۶/۶۳)

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ مغربی پاکستان کے مختلف حصوں میں بسنے والے لوگوں کا کلچر مختلف ہے اس لئے ان کی قومیتیں مختلف ہیں۔ کلچر کا لفظ ایسا ہے جو آج تک شرمندۂ معنی نہیں ہوا۔ کلچر کے مدعیوں سے پوچھئے کہ اس کا مفہوم کیا ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ وہ اس کے جواب میں متعین طور پر کچھ نہیں بتا سکیں گے۔ بات سمٹا کر خوراک، لباس، تراش خراش، وضع قطع، طرزِ بود و ماند یا فنونِ لطیفہ پر آجائے گی۔ ان "دانش وردوں" کو کون بتائے کہ جو اسلام، وطن، نسل یا زبان کے اختلاف کو بھی جداگانہ قومیت کا معیار قرار نہیں دیتا کیا وہ وضع قطع، تراش خراش یا شعر و نغمہ کے اختلاف کو معیارِ قومیت تسلیم کر لے گا؟ قرآنِ کریم، اختلافِ رنگ اور زبان (الوان والسنہ) کو بیشک تسلیم کرتا ہے لیکن وہ انہیں معیارِ قومیت قرار نہیں دیتا۔ اس نے جو اُمتِ واحدہ متشکل کی تھی اس میں عرب، ایران، شام، عراق، روم، مصر، شمالی افریقہ، حبش وغیرہ کے باشندے سب شامل تھے جن میں اسلام لانے سے پہلے کوئی چیز بھی مشترک نہیں تھی اسلام نے ایمان کو قدرِ مشترک قرار دیا تو ان اختلافات کے باوجود وہ سب ایک اُمت کے افراد بن گئے حالانکہ اس وقت بھی ان کا طرزِ بود و ماند (بقول ان حضرات کے، ان کا کلچر) الگ الگ تھا۔ اسلام طرزِ بود و ماند کو نہ چنداں اہمیت دیتا ہے نہ ہی اس سے تعرض کرتا ہے۔ مختلف ملکوں کے مسلمان اپنا طرزِ بود و ماند الگ الگ رکھ سکتے ہیں لیکن اس اختلاف سے وہ الگ الگ قومیتوں میں نہیں بٹ جاتے۔ اگر کلچر نامی کوئی شے ہے تو وہ تمام دنیا کے مسلمانوں کا ایک ہے۔ اس سے مراد اندازِ بود و ماند نہیں بلکہ وہ ذہنیت اور نفسیاتی کیفیت مراد ہے جو مستقل اقدار پر ایمان لانے سے پیدا ہوتی ہے۔ اس

ذہنیت کے مظاہر اور ان اقدار کو بروئے کار لانے کے طریق الگ الگ ہو سکتے ہیں. لیکن اس کا ان کے ملّتِ واحدہ ہونے پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا.

لیکن ہمارے ان دانش وروں کا تو باوا آدم ہی نرالا ہے. یہ غیر ملکی سیاحوں کو "پاکستانی کلچر" دکھانے کے لئے موہنجوداڑو[1] لے جاتے ہیں اور اتنا بھی نہیں سوچتے کہ جو کلچر وہاں کے کھنڈرات میں مدفون ہے وہ پاکستان کے وجود میں آنے سے ہزاروں سال پہلے کا ہے. نیز یہ بھی محض اتفاق ہے کہ وہ علاقہ تقسیم ہند کے وقت حدودِ پاکستان میں شامل ہوگیا. اگر تقسیم کی لکیر ذرا اِدھر کھینچ جاتی تو وہ بھارتی کلچر کا مظہر قرار پا جاتا.

یہ تو ان لوگوں کی کیفیت ہے جو دو قومی نظریہ کی مخالفت کرتے ہیں لیکن جو اس نظریہ کی تائید اور مدافعت کرتے ہیں، بنظرِ تعمق دیکھا جائے تو وہ بھی اس نظریے کے بنیادی اصول کو تسلیم نہیں کرتے بلکہ محض اپنے سیاسی حریفوں کی مخالفت کے لئے ایسا کہہ دیتے ہیں.

دو قومی نظریہ کے مدّعی

ہم دیکھ چکے ہیں کہ دو قومی نظریہ کا بنیادی اصول یہ ہے کہ اسلام میں معیارِ قومیت وطن کا اشتراک نہیں، دین کا اشتراک ہے. اس کے معنی یہ ہیں کہ ایک وطن میں بسنے والے مسلم اور غیر مسلم ایک قوم قرار نہیں پا سکتے. چار قومیتوں کے مدّعی وطن کو معیارِ قومیت قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مختلف صوبے مختلف وطن ہیں اس لئے ہر صوبے کے باشندے، بلا امتیازِ مذہب، الگ قوم ہیں. دو قومی نظریہ کے مدّعی کہتے ہیں کہ پاکستان (یا اب مغربی پاکستان) ایک وطن ہے اور اس میں بسنے والے مسلم اور غیر مسلم ایک قوم ہیں. فرمایئے کہ اصل کے اعتبار سے ان دونوں گروہوں میں فرق کیا ہے. وطن کو بطور معیارِ قومیت دونوں تسلیم کرتے ہیں. فرق صرف وطن کی حدود میں ہے. ایک گروہ صوبوں کی حدود کو وطن قرار دیتا ہے. دوسرا گروہ پورے مغربی پاکستان کو وطن کہتا ہے. اسلام کو معیارِ قومیت نہ یہ تسلیم کرتے ہیں نہ وہ. یاد رکھئے کہ جب تک اس حقیقت کو تسلیم نہیں کیا جاتا کہ مسلم اور غیر مسلم ایک قوم کے افراد نہیں ہو سکتے خواہ وہ ایک وطن ہی میں کیوں نہ رہتے ہوں، اس وقت تک دو قومی نظریہ کا دعوےٰ حقیقت نہیں بن سکتا. دو قومی نظریہ کے حامیوں

---

[1] سندھ کا ایک خطہ جہاں سے ہزاروں سال پہلے کے آثارِ قدیمہ برآمد ہوتے ہیں.

سے آپ پوچھئے کہ آپ جن دو قوموں کے مدعی ہیں، فرمایئے کہ پاکستان میں وہ قومیں کون کون سی ہیں آپ دیکھیں گے کہ ان کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں ہوگا۔

کہا جائے گا کہ مغربی پاکستان میں غیر مسلموں کی تعداد بہت کم ہے اس لئے ان کا یہاں کے مسلمانوں کا ہم قوم قرار پا جانا ہماری سیاست کو متاثر نہیں کر سکتا۔ لیکن سوال سیاست کا نہیں دین کے اصول کا ہے۔ غیر مسلم خواہ ایک ہی کیوں نہ ہو، اگر اسے اور مسلمانوں کو ایک قوم تسلیم کر لیا جائے تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ ہم نے ایمان کے اشتراک کو نہیں بلکہ وطن کے اشتراک کو معیارِ قومیت تسلیم کر لیا۔ یہاں کے غیر مسلموں اور مسلموں کو ایک قوم قرار دے دینا، اس متحدہ قومیت کو وجود میں لے آنا ہے جس کی ہم نے تحریکِ پاکستان کے دوران اس شدت سے مخالفت کی اور جو اسلام کے نظریۂ قومیت کی حریف ہے۔ لہٰذا جب تک یہاں غیر مسلموں کو آئینی طور پر مسلمانوں سے الگ قوم قرار نہیں دیا جاتا، دو قومی نظریہ کا دعویٰ کوئی معنی نہیں رکھ سکتا۔

مسٹر نراد۔ سی چوہدری کا اعتراف

میں نے پہلے کہا ہے کہ جس زمانے میں، غیر منقسم ہندوستان میں، ہمارے "علماء کرام" کی طرف سے دو قومی نظریہ کی مخالفت کی جا رہی تھی، ہندو راہنما مثل لالہ لاجپت رائے اور این۔ سی۔ دت یہ کہہ رہے تھے کہ متحدہ قومیت کا تصور، قرآن اور حدیث کے خلاف ہے۔ یہ چیز اُس زمانے تک محدود نہیں رہی۔ آج جبکہ پاکستان میں دو قومی نظریہ کی اس قدر (بالواسطہ یا بلاواسطہ) مخالفت ہو رہی ہے، ہندوستان میں ایسے ہندو موجود ہیں جو وہاں اس نظریہ کی تائید کر رہے ہیں۔ مسٹر نراد۔ سی چوہدری دہلی کا بین الاقوامی شہرت کا حامل قلمکار ہے۔ اس نے ہندوستان میں، ہندو مسلم فسادات کی بڑھتی ہوئی لہر سے متاثر ہو کر ۱۹۶۸ء میں ایک مقالہ شائع کیا تھا جس نے وہاں کی فضا میں ارتعاش پیدا کر دیا تھا۔ اس میں اس نے کہا تھا کہ

> میں یہ بات پہلے بھی کہہ چکا ہوں اور اب دوبارہ کھل کر، پورے شدومد سے مجھے یہ کہہ لینے دیجئے کہ جب تک ہندوستان کی حکومت اور ہندوستان کے ہندو یہ رٹ لگاتے رہیں گے کہ یہاں کے مسلمان ایک متحدہ قومیت کا جزو ہیں اُس

وقت تک (ہندو مسلم فسادات کے) مسئلہ کو سلجھایا ہی نہیں جاسکتا.........
امر واقعہ یہی ہے کہ ہندو اور مسلمان دو الگ الگ معاشرے ہیں جو دو الگ الگ تہذیبوں کی نمائندگی کرتے ہیں. ان کے اندر یہ اختلاف ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا.....
...اگر میری یہ بات مان لی جائے تو پھر اگلا قدم یہ ہونا چاہیئے کہ اسے تسلیم کر لیا جائے کہ ہندو اور مسلم دو الگ الگ قومیں ہیں.

(طلوعِ اسلام. بابت جون ۱۹۶۹ء)

یہی بات مسٹر چوہدری نے اس سے پہلے اپنی شہرۂ آفاق کتاب (THE CONTINENT OF CIRCLE) میں بھی کہی تھی جو ۱۹۶۵ء میں شائع ہوئی تھی. غور کیجئے کہ ہندوستان کا ہندو تو یہ کہہ رہا ہے کہ ہندوستان کی سیکولر حکومت کے تحت رہنے والے ہندو اور مسلمان دو الگ الگ قومیں ہیں اور پاکستان کو اسلامی مملکت قرار دینے کے مدّعی، ایک طرف یہاں کے مسلموں اور غیر مسلموں کو ایک قوم تسلیم کر رہے ہیں اور دوسری طرف خود مسلمانوں کو بھی علاقائی تفریق کے اعتبار سے، چار قوموں میں تقسیم کر رہے ہیں.

بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است

آئینِ پاکستان میں، خدا خدا کر کے ختمِ نبوت کے عقیدہ کو مسلمان ہونے کی شرط قرار دے دیا گیا. اس کے لئے اس آئین کے مرتبین مستحقِ مبارک باد ہیں. لیکن یاد رکھئے بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی.

۱. جب تک ہمارے آئین میں یہ شق نہ رکھی جائے کہ مسلم اور غیر مسلم ایک قوم نہیں قرار دیئے جاسکتے، نہ یہ مملکت اسلامی ہو سکتی ہے نہ ہمارا آئین اسلامی.

۲. جب تک ہمارے آئین میں یہ شق نہیں رکھی جاتی کہ مسلمانوں میں متعدد قومیتوں کا نظریہ اسلام کی ضد اور مملکت کے خلاف بغاوت کے مترادف ہے، نہ ملّتِ واحدہ وجود میں آسکتی ہے نہ پاکستان محفوظ رہ سکتا ہے.

۳. جب تک دوقومی نظریہ کو ہمارے نصابِ تعلیم میں داخل نہیں کیا جاتا، پاکستان کا مستقبل مستحکم نہیں رہ سکتا. اور

۴. جب تک آپ قرآنی نظریۂ پاکستان کو اپنی تقریروں اور تحریروں کا مرکزی موضوع قرار نہیں

دیتے۔ نہ اقبالؒ کی یاد میں اجتماعات منعقد کرنے سے کچھ حاصل ہو سکتا ہے، نہ قائداعظمؒ کے یوم منانے سے کوئی فائدہ۔ اقبالؒ نے کہا تھا کہ اگر وطنیت کو معیارِ قومیت قرار دے لیا گیا تو اس کا نتیجہ لادینی ہوگا۔ اور قائداعظمؒ نے فرمایا تھا کہ اگر ہم نے دو قومی نظریہ کی بنا پر پاکستان حاصل نہ کیا تو برصغیر میں مسلمان باقی رہیں گے، نہ اسلام۔ اور آپ مجھے اپنی زندگی کے اس ڈھلتے ہوئے دور میں اس جگر شگاف اور جاں سوز حقیقت کو زبان تک لانے کی اجازت دیجئے کہ ہم نے نظریۂ پاکستان اور اس کے عملی تضمنات کو نظر انداز کر دیا جو درحقیقت قرآن ہی کے نظریۂ حیات کا دوسرا نام ہے تو اوّل تو یہ مملکت ہی باقی نہیں رہ سکے گی کیونکہ اس کی وجۂ جواز ہی ختم ہو جائے گی۔ اور اگر یہ باقی بھی رہی تو یہ اسلام کی نشاطِ ثانیہ کا گہوارہ نہیں بن سکے گی جس کے لئے اسے حاصل کیا گیا تھا۔ اس سے اسلام کا کچھ نہیں بگڑے گا کہ وہ اپنے ظہور (غلبہ) کے لئے کوئی اور خطۂ زمین تلاش کر لے گا۔ لیکن ہمارا کچھ بھی باقی نہیں رہے گا۔ یہی وہ المیہ تھا جس کے پیشِ نظر اقبالؒ نے کہا تھا کہ

حق اگر از پیش ما بردارش پیشِ قومے دیگرے بگزاردش

ترسم از روزے کہ محرومش کنند آتشِ خود بر دلِ دیگر زنند!

ویلیتنی مت قبل ھذا وکنت نسیاً منسیا۔

والسّلام

اقبالؒ کا مردِ مومن

یومِ اقبالؒ، اپریل ۱۹۷۴ء کا خطاب

عزیزانِ گرامی قدر۔ السلام علیکم ورحمتہ اللہ۔

ہم آج ایک ایسی واجب الاحترام ہستی کا یومِ وفات منانے کے لئے جمع ہوئے ہیں جو ملتِ اسلامیہ کا بالعموم اور ہم اہلِ پاکستان کا بالخصوص عظیم محسن ہے۔ پوری ملت کا اس لئے کہ اس نے خدا کی اس کتابِ جلیل کو جسے ہم نے صدیوں سے نقش ونگارِ طاقِ نسیاں بنا کر رکھ چھوڑا تھا اور جس کا مقصد اس سے زیادہ کچھ نہیں رہ گیا تھا کہ از یسین او آساں بمیری ــ پھر سے کتابِ زندہ کی صورت میں پیش کیا اور اہلِ پاکستان کا اس لئے کہ اس نے اس بے مقصد مصروفِ دشت پیمائی اور صحرانوردی قوم کے سامنے زندگی کا ایک بلند نصب العین رکھا۔ یعنی ایک ایسی آزاد مملکت کا تصور جس میں اسلام پھر سے ایک عملی نظام کی حیثیت سے کارفرما ہو سکے۔ علامہ اقبالؒ کے یہ بہت بڑے احسانات ہیں جن سے ہم عہدہ برآ نہیں ہو سکتے۔ ان کے احسانات کا یہی احساس ہے جس کی بنا پر میں ۱۹۳۸ء سے آج تک ان کے زندگی بخش پیغام کی یاد تازہ کراتے چلا آ رہا ہوں اور یہی آج کے اجتماع سے بھی مقصود ہے۔ "پیغامِ اقبالؒ اور قرآن کریم" میرا مخصوص موضوع ہوتا ہے۔ اس موضوع کے متنوع گوشے ہیں جنہیں بہ تمام وکمال کسی ایک نشست میں پیش کرنا ناممکن ہے۔ ایک نشست میں ان میں سے کوئی ایک گوشہ ہی سامنے لایا جا سکتا ہے۔ میں آج جس گوشہ کو نمایاں کرنا چاہتا ہوں اس کا عنوان ہے "اقبالؒ کا مردِ مومن"۔ اس

موضوع تک پہنچنے کے لئے ایک تمہید ناگزیر ہے ۔ ایسے ہی ناگزیر جیسے فصل بونے کے لئے زمین کا ہموار اور نرم کرنا ناگزیر ہوتا ہے کہ "تمہید" کے بنیادی معنی یہی ہیں۔ اور اقبالؒ تو خود اس دنیا کی زندگی کو مزرعِ آخرت کی تمہید قرار دیتا ہے جب کہتا ہے کہ

زمین خاکِ درِ میخانۂ ما　　فلک یک گردشِ پیمانۂ ما
حدیثِ سوز و سازِ ما دراز است　　جہاں دیباچۂ افسانۂ ما

اور ہمارے موضوع کی تمہید یا دیباچہ یہ ہے:۔

تمہید

قرآنِ کریم، داستانِ حیات کو بڑے عجوبانہ لیکن اس کے ساتھ ہی نہایت حکیمانہ انداز سے بیان کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ زندگی، ناقابلِ نمو، جامد مادہ (INORGANIC MATTER) میں محوِ خواب تھی کہ پانی کے چھینٹے نے اس کی آنکھ کھول دی۔ یوں پانی اور مٹی کے امتزاج سے اوّلین جرثومۂ حیات وجود میں آیا۔ یہ جرثومہ جوشِ نمو سے دو حصّوں میں بٹ گیا جس سے نر و مادہ کا امتیاز عمل میں آگیا اور ان کے اختلاط سے کاروانِ حیات، شاخ در شاخ مختلف سمتوں میں بڑھتا، پھولتا، پھلتا، رواں دواں پھیلتا اور آگے بڑھتا چلا گیا۔ تا آنکہ وہ کروڑوں سال کی منزلیں طے کرتا اور پہلو بدلتا پیکرِ حیوانی میں نمودار ہو گیا اور جب اس نے ایک ارتقائی جست اور آگے لگائی تو زندگی نے لباسِ بشریت اختیار کر لیا[1]۔

یورپ کے سائنس دان اپنی صدیوں کی تحقیق و کاوش کے بعد اُس نتیجہ پر پہنچے ہیں جسے قرآن نے چودہ سو سال پہلے ان اشارات میں بیان کر دیا تھا۔ لیکن اس کے بعد حکمائے مغرب کے نظریہ اور قرآنی حقائق میں ایسا ناقابلِ مفاہمت اختلاف سامنے آتا ہے جسے کفر اور ایمان کے افتراق سے تعبیر کیا جائے گا۔ مغربی محققین کا نظریہ یہ ہے کہ انسانی اور حیوانی زندگی میں کوئی فرق نہیں۔ بجز اس کے کہ انسانی شعور کی سطح ذرا زیادہ بلند ہے۔ دونوں فطرت کے طبعی قوانین کے تابع زندگی بسر کرتے

---

[1] میں نے اس مقام پر محض اشارات سے کام لیا ہے۔ تفصیل اس اجمال کی میری کتاب "ابلیس و آدم" میں ملے گی۔

کھاتے پیتے، افزائشِ نسل کرتے اور بالآخر مرجاتے ہیں. موت کے ہاتھوں جس طرح دیگر حیوانات کا خاتمہ ہوجاتا ہے اسی طرح انسانی زندگی بھی ختم ہوجاتی ہے. بالفاظِ دیگر، انسانی پیکر، ارتقاء کے سلسلۂ دراز کی آخری کڑی ہے. اس کے بعد فنا ہے. قرآنِ کریم اس تصورِ حیات کو کفر، یعنی حقیقت سے انکار قرار دیتا ہے جب کہتا ہے کہ وَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا یَتَمَتَّعُوْنَ وَ یَاْکُلُوْنَ کَمَا تَاْکُلُ الْاَنْعَامُ (۴۷/۱۲) حقیقت سے انکار کرنے والے (یعنی کفار) حیوانی سطح پر زندگی بسر کرتے ہیں. یعنی کھاتے پیتے اور بالآخر مرجاتے ہیں. وہ کہتا ہے کہ ذرا سوچو تو سہی کہ فطرت کا وہ تخلیقی پروگرام جس کی ابتداء اس قدر معجزانہ انداز سے ہوئی، پھر کاروانِ حیات جس انداز سے مختلف وادیوں میں سے گزرا. اس نے جس طرح انواع و اقسام کے کروڑوں پیکر اختیار کئے. اپنی خاصیتیں بدلیں، نوعیتیں تبدیل کیں. اس میں ایسے ساحرانہ تغیرات نمودار ہوئے کہ کوئی کہہ ہی نہیں سکتا کہ عروسِ حیات جو بہ ہزار عشوہ و رعنائی پیکرِ انسانی میں کھڑے مسکرا رہی ہے، وہی ہے جس کا آغاز ایک جرثومۂ حیات سے ہوا تھا. ذرا سوچو کہ یہ تمام محیر العقول پروگرام۔ یہ حیرت بدوش زندگی. یہ سرتاسر طلسماتی منزلیں. اس تمام نظامِ ارتقاء کا ماحصل یہی تھا کہ موت کی ایک ٹھوکر اس کارگہ نمود و وجود کو مٹی کے گھروندے کی طرح پامال کرکے رکھ دے؟ سوچو کہ یہ تصور کس قدر بے معنی اور یہ نظریہ کیسا بعید از قیاس ہے. العبث خاک ساختن می نسزد خدائے را.

قرآن نے کہا کہ پیکرِ بشریت سلسلۂ ارتقاء کی آخری کڑی نہیں. یہ ایک جدید سلسلۂ ارتقاء کی اوّلین کڑی ہے. یہاں سے کاروانِ حیات ایک نئی منزل میں داخل ہوتا ہے. انسانی زندگی اس کے طبعی جسم ہی سے عبارت نہیں. اس میں ایک اور چیز بھی ہے جسے انسانی ذات، نفس یا خودی کہہ کر پکارا جاتا ہے. اس سے پہلے مقصود صرف طبعی جسم کی نشوونما تھا لیکن اب مطلوب انسانی ذات کی نشوونما ہے. انسانی جسم کی نشوونما دیگر حیوانات کی طرح طبعی قوانین کی رُو سے ہوتی ہے. لیکن انسانی ذات کی نشوونما ان غیر متبدل اقدار کی رُو سے ہوتی ہے جو وحی کے ذریعے ملتی رہی ہیں اور جواب قرآن کے اندر محفوظ ہیں. انسانی جسم کی نشوونما کیسے ہی لطیف و نفیس انداز سے کیوں نہ ہو وہ انسانی جسم ہی رہتا ہے. ارتقاء کی اگلی منزل میں نہیں پہنچتا. لیکن جب انسانی ذات کی نشوونما سے انسان، سلسلۂ ارتقاء کی اگلی اور بلند منزل میں پہنچ جاتا ہے، پھر موت سے اس کا جسم تو پیوندِ خاک ہوکر ختم ہوجاتا ہے لیکن اس کی ذات کا اس سے کچھ نہیں بگڑتا. وہ زندگی کی مزید ارتقائی

منازل طے کرنے کے لئے آگے بڑھ جاتی ہے۔ جس انسان میں اس کی ذات کی نشوونما شروع ہو جائے اُسے قرآن کی اصطلاح میں مومن کہا جاتا ہے۔ دین (یعنی اسلامی نظامِ حیات) کا مقصد انسان کو مومن بنانا ہے۔ قرآنِ کریم وہ ضابطۂ زندگی یا پروگرام عطا کرتا ہے جس کی رُو سے ایک انسان مردِ مومن بن سکتا ہے۔ اس پروگرام کی رُو سے حسنات وہ اعمال ہیں جن سے انسانی ذات کی نشوونما اور تعمیر ہوتی ہے اور سیئات وہ کام جن سے اس کی تخریب ہوتی ہے۔ یہی خیر و شر کا نقطۂ امتیاز اور نیکی اور بدی کا معیار و مقیاس ہے۔

آگے بڑھنے سے بیشتر اس حقیقت کا سمجھ لینا ضروری ہے کہ مغرب کے تصورِ حیات اور قرآنی تصور کا فرق محض نظری (THEORETICAL) یا سائنسی تحقیق کے نتائج کا فرق نہیں۔ یہ ایسا بنیادی فرق ہے جس سے انسانی زندگی کا ہر شعبہ — معاشرتی، معاشی، سیاسی، تمدنی وغیرہ اساسی طور پر متاثر ہوتا ہے اسی وجہ سے قرآن نے اُسے کفر اور ایمان کے فرق سے تعبیر کیا ہے۔ مغربی نظریہ کی رُو سے انسانی زندگی محض طبعی زندگی ہے جو دیگر حیوانات کی طرح طبعی قوانینِ فطرت کے تابع رہتی ہے۔ اس زندگی میں طبعی قوانین سے ماورا، یا بلند کوئی اور قانون نہیں۔ یہ جو آپ اقوامِ مغرب کے ہاں ہر جگہ "جنگل کا قانون" کارفرما دیکھتے ہیں تو یہ اسی نظریۂ زندگی کا عملی اور فطری نتیجہ ہے۔ اسی کو سیکولرازم یا لادینیت کہا جاتا ہے اور جس جہنم میں آج ساری دنیا ماخوذ ہے وہ اسی نظریہ کے برگ و بار ہیں۔ اقبالؒ کے الفاظ میں

یورپ از شمشیرِ خود بسمل فتاد　　زیرِ گردوں رسمِ لادینی نہاد
در نگاہش آدمی آب و گل است　　کاروانِ زندگی بے منزل است

(پس چہ باید کرد۔ صفحہ ۵۶)

آپ نے دیکھا کہ سائنس کا ایک غلط نظریہ کس طرح انسانی زندگی کے ہر شعبے کو زیر و زبر کر دیتا ہے۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ قرآن کی رُو سے دین اور دنیا میں کوئی مغایرت یا ثنویت نہیں تو اس سے یہی مراد ہے۔ جب تک انسانی زندگی کے متعلق اقوامِ مغرب کا زاویۂ نگاہ نہیں بدلتا، وہاں کے سیاسی، معاشی، معاشرتی نظام میں کوئی صالح تبدیلی پیدا نہیں ہو سکتی۔ اس غلط نظریۂ حیات کے تخریبی نتائج نے جو قیامت برپا کر رکھی ہے اس سے متاثر ہو کر اب یورپ کے مفکر رفتہ رفتہ اس طرف آ رہے ہیں کہ

انسانی زندگی محض حیوانی زندگی نہیں۔ اس سے آگے کچھ اور ہے اور اب مزید ارتقاء طبعی جسم کا نہیں بلکہ اس کی انسانی مضمرات کا ہوگا۔ روس کا مشہور مفکر اوسپنسکی اپنی مشہور کتاب (IN SEARCH OF THE MIRACULOUS) میں لکھتا ہے۔

> اب انسانی ارتقاء کا مفہوم ہے ان ذہنی اور ممکنات کا نشوونما پانا جو از خود نشوونما نہیں پا سکتیں یعنی جن میں میکانکی طور پر بالیدگی پیدا نہیں ہو سکتی صرف اس نہج کی نشوونما صرف اس انداز کی بالیدگی انسان کا حقیقی ارتقاء کہلا سکتی ہے۔ اس کے سوا کسی اور چیز کو انسانی ارتقاء نہیں کہا جا سکتا۔

برگسان اس سلسلہ میں لکھتا ہے کہ اب ارتقائی منازل سے مقصود یہ ہے کہ "انسان ان حدود سے آگے بڑھ جائے جو مادی فطرت نے نوعِ انسان پر عاید کر رکھی ہیں۔"

اور پروفیسر آرتھر تھامس اپنی کتاب (GOSPEL OF EVOLUTION) کا خاتمہ ان الفاظ پر کرتا ہے کہ:۔

> ہم یہ کہنے کی جرأت کر سکتے ہیں کہ ہکسلے نے یہ غلط کہا تھا کہ کائناتی تجربہ کا اخلاقی مقاصد سے کچھ تعلق نہیں۔ اس کے برعکس ہم پروفیسر (FATRICK GEEDS), سے متفق ہیں کہ فطرت درحقیقت اخلاقی عمل ہی کی مادی شکل کا نام ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو یہ حقیقت ارتقائی کتابِ مقدس کا نہایت اہم جزو ہے۔ حیوانات سے ہمارا تعلق اب ہمیں ملائکہ کی طرف لئے جا رہا ہے۔

آپ نے دیکھا کہ یہ حضرات اب خالص مادی نظریہ ارتقاء کو باطل قرار دے کر کس طرح انسانی ارتقاء کی طرف آ رہے ہیں لیکن چونکہ قرآن کی شمعِ تابندہ ان کے سامنے نہیں اس لئے مزید ارتقائی منازل کے راستے اور ان کے طے کرنے کا پروگرام، ہنوز نکھر اور ابھر کر ان کے سامنے نہیں۔ کچھ عرصہ کے بعد یہ بھی ہو جائے گا کہ اس کے سوا انسان کے لئے کوئی چارۂ کار نہیں۔

مستقل اقدار

میں نے پہلے کہا ہے کہ انسانی ذات کی نشوونما مستقل اقدار کے مطابق زندگی بسر

کرنے سے ہوتی ہے۔ ان اقدار کی اصل و حقیقت کا سمجھ لینا ضروری ہے۔ قرآنِ کریم نے ذاتِ خداوندی کا تعارف اس کی صفات کی رُو سے کرایا ہے جنہیں الاسماء الحسنٰی کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ ان صفات یا اسماء کی رُو سے ذاتِ خداوندی کے مختلف گوشوں کی جھلک سامنے آتی ہے۔ انسانی دنیا میں انہی کو مستقل اقدار کہا جاتا ہے۔ ان میں سے کچھ تو ایسی صفات ہیں جو ذاتِ خداوندی سے مختص ہیں۔ مثلاً ھو الاوّل و الاٰخر۔ ھو الظاھر و الباطن۔ یعنی اس کا زمان اور مکان کی حدود سے ماوراء ہونا۔ یا فاطر السمٰوٰت و الارض۔ کائنات کو عدم سے وجود میں لانے والا۔ اس قسم کی صفات کے سوا، باقی صفات ایسی ہیں جنہیں انسان علیٰ حدِ بشریت، اپنی ذات میں منعکس کر سکتا ہے۔ انہی کو مستقل اقدار کہا جاتا ہے۔ قرآن نے انہیں صبغۃ اللّٰہ (۲/۱۳۸) یا اللہ کا رنگ کہہ کر پکارا ہے۔ جوں جوں انسان ان صفات کو اپنی ذات میں منعکس کئے جاتا ہے اُس کی ذات کی نشوونما ہوتی جاتی ہے۔ قرآن میں بیان کردہ صفاتِ خداوندی پر نگاہ ڈالئے، یہ حقیقت سامنے آئے گی کہ ان میں سے بیشتر صفات ایک دوسرے سے متضاد ہیں۔ مثلاً خدا غفور الرّحیم بھی ہے اور شدید العقاب بھی۔ وہ عفوٌ کریم بھی ہے اور جبّار و متکبّر بھی۔ ان صفات میں باہمدگر تضاد نہیں۔ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ مختلف خصوصیات کا مجموعہ ہے جن میں سے ہر خصوصیت (صفت) کا ظہور اس کے مناسب موقعہ پر ہوتا ہے۔ وہ ظالم کے لئے نہایت سخت گیر ہے اور مظلوم کے لئے رحیم و کریم۔ وہ قوانینِ خداوندی کے سامنے جھکنے والے کو سرفرازی اور سربلندی عطا کرتا ہے اور ان کے سرکشی برتنے والے کی نخوت و تکبّر کو توڑ کر رکھ دیتا ہے۔ سوال ان صفات ہی کا نہیں، اس کے ساتھ سوال یہ بھی ہے کہ کس موقعہ پر خدا کی کس صفت کا ظہور ہوتا ہے۔ یہ بات قرآنِ کریم کے گہرے مطالعہ سے سمجھ میں آ سکتی ہے۔

ہمارے ہاں جب مومنین کی خصوصیات کا ذکر ہوتا ہے تو اس کے لئے عام طور پر چند اخلاقی خوبیاں گنا دی جاتی ہیں (مثلاً) وہ جھوٹ نہیں بولتے، بددیانتی نہیں کرتے وغیرہ۔ یہ ٹھیک ہے۔ مومنین ان خصوصیات کے حامل ہوتے ہیں۔ لیکن جس باب میں مومن، دوسرے "نیک لوگوں" سے منفرد ہوتے ہیں وہ اور ہے۔ وہ خصوصیت یہ ہے کہ جب کوئی واقعہ خارجی دنیا میں ظہور میں آئے تو اس وقت جس صفتِ خداوندی کو ظہور میں آنا ہو، مومن کی طرف سے اسی صفت کا ظہور ہو یعنی

ہر واقعہ پر اس کا ردِ عمل وہی ہو جو اس کے خدا کا "ردِ عمل" ہو۔ گرفت کے موقعہ پر گرفت۔ رحم کے موقعہ پر رحم۔ سرسام زدگان کی فصد کھولنے کے لئے نوک نشتر اور زخموں کے اندمال کے لئے مرہم کا پھایا۔

اس تمہید سے یہ حقیقت سامنے آ گئی ہو گی کہ قرآنِ کریم نے ذاتِ خداوندی کی صفات اور مختلف مواقع پر ان کے ظہور کی جو تفاصیل بیان کی ہیں وہ حدودِ بشریت کے اندر درحقیقت مومن کی خصوصیات کا تذکرہ ہے۔ بالفاظِ دیگر قرآنِ کریم کی ساری تعلیم کا منتہٰی و مقصود یہ بتانا ہے کہ ایک انسان کس طرح مومن بنتا ہے اور مومن کی زندگی سے کس کس قسم کی خصوصیات کی نمود ہوتی ہے۔ میں نے "نمود" کا لفظ ارادۃً استعمال کیا ہے۔ بتانا اس سے یہ مقصود ہے کہ ایک مومن (مثلاً) جب عدل کرتا ہے تو وہ محنت و کاوش سے (WITH EFFORT) ایسا نہیں کرتا۔ عدل اس کی ذات کی خصوصیت ہے جو مناسب موقعہ پر خود بخود نمودار ہو جاتی ہے۔ جس طرح روشنی اور حرارت سورج کی ذاتی خصوصیت ہے جس کا انعکاس خود بخود ہوتا رہتا ہے۔ پھر یہ بھی نہیں کہ مومن جس وقت سخت گیر ہوتا ہے اس وقت اس میں رحیمی اور کریمی کی صفت موجود نہیں ہوتی۔ مومن کی ذات میں یہ تمام صفات ہر وقت موجود رہتی ہیں اور مناسب مواقع پر خود بخود ظہور میں آتی رہتی ہیں۔ یوں کہیے کہ مومن مختلف صفات کا مجموعہ نہیں ہوتا۔ اس کی ذات ہمہ گیر ہوتی ہے جس میں یہ تمام صفات یوں سموئی ہوتی ہیں جس طرح پھول میں خوشبو، رنگینی، لطافت، نزاکت اور طبی خواص جیسا کہ میں نے کہا ہے قرآنِ مجید درحقیقت مومنین کی اپنی صفات و محاسن کا تذکرۂ جمیلہ ہے اس کا ارشاد ہے کہ لَقَدۡ اَنۡزَلۡنَاۤ اِلَیۡکُمۡ کِتٰبًا فِیۡہِ ذِکۡرُکُمۡ ؕ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ (۲۱/۱۰) ہم نے تمہاری طرف ایک کتاب نازل کی ہے جس میں خود تمہارا ذکر ہے۔ اس حقیقت کو عقل و بصیرت کی رو سے سمجھو۔ دیکھئے اس عظیم حقیقت کو اقبالؒ کس حسین انداز میں بیان کرتا ہے جب کہتا ہے کہ

محمدؐ بھی ترا، جبریل بھی، قرآں بھی تیرا
مگر یہ حرفِ شیریں ترجماں تیرا ہے یا میرا

اور جس طرح قرآنِ کریم مختلف طرق و اسالیب سے مومنین کی خصوصیاتِ کبریٰ کا تذکرہ کرتا ہے اسی طرح اقبالؒ بھی گوناگوں انداز سے مومن کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو سامنے لاتا ہے۔

یہاں یہ اہم سوال سامنے آتا ہے کہ ارتقاء کے اس عظیم نظام سے مقصد افرادِ انسانیہ کی ذات کی نشوونما ہی ہے یا یہ نظامِ کائنات کے خدائی پروگرام میں بھی کوئی اہم کردار ادا کرتا ہے۔ قرآن بتاتا ہے کہ یہ درحقیقت خدائی پروگرام کی تکمیل کے سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ وہ ان افراد (مومنین) کو حزب اللہ (۵/۵۶) کہہ کر پکارتا ہے یعنی خدا کی پارٹی۔ یہ ایک عظیم حقیقت ہے جسے قرآن نے ان دو لفظوں میں اپنے مخصوص معجزانہ انداز میں بیان کر دیا ہے۔ اس سے مقصود یہ ہے کہ انسانی دنیا میں خدا نے جس قدر ذمہ داریاں اپنے اوپر لے رکھی ہیں، وہ خدا کی اس پارٹی (جماعتِ مومنین) کے ہاتھوں سرانجام پاتی ہیں۔ مثلاً مدینہ میں اس جماعت کی اپنی مملکت قائم ہوئی لیکن مکہ میں ابھی ایسے مسلمان تھے جو گھر کر رہ گئے تھے اور مخالفین انہیں طرح طرح کی اذیتیں دیتے تھے۔ یہ لوگ اپنی انتہائی مظلومیت کی حالت میں خدا کو مدد کے لئے پکارتے تھے۔ خدا قادرِ مطلق ہے۔ اس کے لئے کچھ بھی مشکل نہ تھا کہ وہ ان ستم زدگان کی براہِ راست مدد کر کے انہیں وہاں سے نکال لیتا۔ لیکن اس نے خود ایسا نہیں کیا۔ اس نے اپنی پارٹی (یعنی مدینہ کے مسلمانوں) سے کہا کہ

> (اے ہماری پارٹی کے لوگو!) تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم ظالمینِ مکہ کے خلاف جنگ کے لئے نہیں نکلتے؟ تم سنتے نہیں کہ وہاں کے مظلوم مرد، عورتیں، بچے کس طرح بلک بلک کر ہمیں پکار رہے ہیں اور فریاد کر رہے ہیں کہ اے ہمارے نشوونما دینے والے! ہمیں اس بستی سے جس کے باشندوں نے ظلم پر کمر باندھ رکھی ہے بحفاظت نکال لینے کا سامان پیدا کر دے۔ تو ہمارے لئے کوئی مددگار بھیج۔ تو کسی کو ہمارا پشت پناہ بنا۔ (۴/۷۵)۔

آپ نے غور فرمایا کہ وہ لوگ خدا کو مدد کے لئے پکار رہے تھے اور خدا "حزب اللہ" یعنی اپنی پارٹی سے کہہ رہا تھا کہ تم سنتے نہیں ہو کہ وہ لوگ ہمیں کس طرح پکار رہے ہیں۔ تم ان کی مدد کے لئے کیوں نہیں اٹھتے! یہ ان کی مدد کے لئے اٹھے اور ان کے دشمنوں کو میدانِ جنگ میں فنا کے گھاٹ اتار دیا۔ اس جنگ کا ذکر کرتے ہوئے خدا نے بعد میں کہا کہ فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ۔ وہاں ان مخالفین کو تم قتل نہیں کر رہے تھے، ہم قتل کر رہے تھے۔ وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى (۸/۱۷) تم تیر نہیں چلا رہے تھے، ہم چلا رہے تھے۔ اور یہ اس لئے تھا

وَجَعَلَ کَلِمَةَ الَّذِیْنَ کَفَرُوا السُّفْلٰی ط وَ کَلِمَةُ اللّٰہِ هِیَ الْعُلْیَا ط (۹/۴۰)۔۔ کہ مخالفینِ حق و صداقت کے پروگرام کو شکست ہو اور خدا کا پروگرام غالب آئے اور اس کے لئے کہا کہ اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰہَ یَنْصُرْکُمْ (۴۷/۷) اگر تم خدا کی مدد کے لئے اٹھو گے تو خدا تمہاری مدد کرے گا کہ درحقیقت خدا کے پروگرام کی تکمیل کے لئے مصروفِ تگ و تاز ہوتے ہو۔

یہ ہے عزیزانِ من! جماعتِ مومنین کا مقام اور یہ ہے وہ دلکش و بصیرت افروز انداز جس سے خدا ان کا تذکرہ کر رہا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے بار بار کہا ہے کہ ان کا پیغام، قرآن کے پیغام ہی کی تشریح و تبیین ہے، اس لئے ان کا کلام، بنیادی طور پر، مردِ مومن کی خصوصیات، مقام، فریضۂ حیات اور مطمعِ زندگی کا تابندہ و درخشندہ آئینہ ہے۔ آیئے اس آئینہ میں مردِ مومن کی چند ایک جھلکیاں دیکھیں۔

بندۂ مولا صفات

ہم دیکھ چکے ہیں کہ مومن وہ ہے جس کی ذات میں، صفاتِ خداوندی علیٰ حدِ بشریت جھلمل جھلمل کر رہی ہوں اور کائنات کے خدائی پروگرام اس کے ہاتھوں تکمیل تک پہنچیں۔ دیکھئے حضرت علامہ ان حقائق کو اپنی نظم مسجدِ قرطبہ میں کس وجد آفریں انداز سے بیان کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں:۔

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ ۔۔۔ غالب و کار آفریں، کارکشا، کارساز
خاکی و نوری نہاد، بندۂ مولا صفات ۔۔۔ ہر دو جہاں سے غنی اس کا دلِ بے نیاز
اس کی امیدیں قلیل، اس کے مقاصد جلیل ۔۔۔ اس کی ادا دلفریب، اس کی نگہ دلنواز
نرم دمِ گفتگو، گرم دمِ جستجو! ۔۔۔ رزم ہو یا بزم ہو، پاک دل و پاک باز
نقطۂ پرکارِ حق، مردِ خدا کا یقیں ۔۔۔ اور یہ عالم تمام، وہم و طلسم و مجاز

عقل کی منزل ہے وہ عشق کا حاصل ہے وہ
حلقۂ آفاق میں گرمیٔ محفل ہے وہ

آپ اس مصرعہ میں "عقل کی منزل" اور "عشق کا حاصل" کی اصطلاحات پر غور فرمایئے اور پھر

قرآنِ کریم کی اس آیۂ جلیلہ کو سامنے لایئے جس میں کہا گیا ہے کہ

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْأَرْضِ وَ اخْتِلَافِ الَّيْلِ وَ النَّهَارِ لَآيٰتٍ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ ۝ الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَ يَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْأَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا .... (۱۹۰ - ۳/۱۹۱)

یہ حقیقت ہے کہ جو لوگ عقل و بصیرت سے کام لیتے ہیں ان کے لئے کائنات کی تخلیق اور رات دن کی گردش میں قوانینِ خداوندی کی محکمیت کی بڑی بڑی نشانیاں ہیں اُن صاحبانِ علم و بصیرت کے لیے جو زندگی کے ہر گوشے میں کھڑے، بیٹھے، لیٹے، قوانینِ خداوندی کو اپنی نگاہوں کے سامنے رکھتے اور کائنات کے تخلیقی پروگرام پر غور و فکر کرتے رہتے ہیں اور اپنی تحقیقات کے بعد علیٰ وجہ البصیرت پکار اٹھتے ہیں کہ اے ہمارے نشو و نما دینے والے! تو نے اس کارگہِ ہستی کو نہ تو بے کار پیدا کیا ہے اور نہ ہی تخریبی نتائج پیدا کرنے کے لئے۔

لہٰذا، مردِ مومن، علم و ایقان، فکر و ایمان، عقل و عشق، خبر و نظر کا حسین امتزاج ہوتا ہے۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، اس کی ذات متضاد صفات کا مجموعہ ہوتی ہے جن میں سے ہر صفت اپنے اپنے وقت پر اُبھر سامنے آجاتی ہے اور یوں دنیا اس طلسم کدۂ رنگا رنگ (KALEIDOSCOPE) کے مختلف پہلوؤں کو دیکھ کر محوِ حیرت رہ جاتی اور وجد و کیف کے عالم میں بے ساختہ پکار اٹھتی ہے کہ

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن ‌ ‌ ‌ گفتار میں، کردار میں، اللہ کی برہان
قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت ‌ ‌ ‌ یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان
قدرت کے مقاصد کا عیار اس کے ارادے
دنیا میں بھی میزان، قیامت میں بھی میزان

اللہ کی بُرہان

ان ابیات میں دو باتیں قابلِ غور ہیں. ایک تو یہ کہ مومن کے متعلق کہا گیا ہے کہ گفتار میں، کردار میں اللہ کی بُرہان. تو اس سے مراد کیا ہے. یہ حقیقت ہے کہ ہر مخلوق اپنے خالق کے جوہرِ تخلیق کی زندہ شہادت ہوتی ہے. مونا لیزا کے سحر آفرین تبسم کا خدنگِ بے کمان، لیونارڈو کے عظیم فنکار ہونے کی دلیل اور شہادت ہے. خدا نے اپنی مخلوق میں سے انسان کے متعلق کہا ہے کہ اُسے احسنِ تقویم میں پیدا کیا گیا ہے. یعنی حسین ترین ہیئتِ ترکیبی لئے ہوئے. ظاہر ہے کہ اس ہیئتِ ترکیبی سے مراد انسانی جسم کی رعنائی اور زیبائی نہیں. کیونکہ اس کے بعد ہے. ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ ۙ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (۹۵/۶-۵) انسان کے اندر حسین ترین مخلوق ہونے کے ممکنات پوشیدہ ہیں. لیکن چونکہ اسے اس امر کا اختیار دیا گیا ہے کہ وہ ان ممکنات کو جس قالب میں چاہے ڈھال لے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ اپنے بے باک جذبات کی رَو میں بہہ کر پست ترین درجہ پر پہنچ جاتا ہے. لیکن جو لوگ اپنی ذات کے ارتقائی مدارج پر یقین رکھتے ہوئے خدا کے تجویز کردہ صلاحیت بخش پروگرام پر عمل پیرا ہوں وہ پستی کے گڑھے میں گرنے کے بجائے انسانی ہیئت کے بلند ترین اور حسین ترین مقام پر پہنچ جاتے ہیں. انہی کو مومن کہا جاتا ہے. لہذا مومن کی ہر نقل و حرکت خدا کے احسن الخالقین ہونے کی شہادت ہوتی ہے. اس کے کردار کو دیکھ کر ہر شخص بلا ساختہ پکار اٹھتا ہے کہ جس ہستی کا تخلیقی شاہکار ایسا ہے اس کے بے مثل و بے نظیر ہونے میں کوئی کلام نہیں. اس لئے مومن — گفتار میں، کردار میں، اللہ کی برہان بن جاتا ہے.

تقدیرِ یزداں

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ قدرت کے مقاصد کا عیار اس کے ارادے. یہ بھی ایک عظیم حقیقت کا اظہار ہے. مطلب اس سے یہ ہے کہ اگر کسی نے یہ معلوم کرنا ہو کہ فلاں معاملہ میں خدا کی مشیت اس کا ارادہ کیا ہے. وہ کیا کرنا چاہتا ہے تو اس کا آسان طریقہ یہ ہے کہ وہ معلوم کرے کہ اس باب

میں مردِ مومن کا فیصلہ اور ارادہ کیا ہے۔ اس موقعہ پر جو فیصلہ مردِ مومن کا ہو، سمجھ لیجئے کہ وہی خدا کی مشیّت ہے۔ خدا ایسا ہی کرنا چاہتا ہے۔ اس لئے کہ مومنین کے متعلق بتایا یہ گیا ہے کہ وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ ط (۳۰/۷۶) وہ وہی چاہتے ہیں جو خدا چاہتا ہے۔ ان کی مشیّت، مشیّتِ خداوندی کی مظہر ہوتی ہے اور ان کا چاہنا خود خدا کا چاہنا۔ اس حقیقت کو حضرت علامہؒ نے اپنے شعر میں باندازِ نو بیان کیا ہے۔ جسے دہرایا تو اکثر جاتا ہے لیکن سمجھا بہت کم یعنی

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

خودی کی بلندی کے معنی یہ ہیں کہ انسانی ذات، صفاتِ خداوندی کی آئینہ دار بن جائے۔ جب ایسا ہو جائے تو پھر مومن کا ارادہ وہی ہوتا ہے جو خدا کا ارادہ ہو۔ اس کا فیصلہ وہی ہوتا ہے جو خدا کا فیصلہ ہو۔

چوں فنا اندر رضائے حق شود ۔۔۔ بندۂ مومن قضائے حق شود

اس طرح مومن کے ارادے اور فیصلے، خدا کے مقاصد کے پہچاننے اور ناپنے کا مقیاس بن جاتے ہیں۔ ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ بدر کے میدان میں جماعتِ مومنین کی مقاتلانہ تگ و تاز کے متعلق خدا نے کہا تھا کہ تم تلواریں نہیں مار رہے تھے، ہم مار رہے تھے۔ تم تیر نہیں چلا رہے تھے ہم چلا رہے تھے۔ اس طرح خدا کی مرضی تمہارے ہاتھوں سے پوری ہو رہی تھی۔ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضرت علامہؒ جاوید نامہ میں کہتے ہیں:-

عزمِ اُو خلّاقِ تقدیرِ حق است
روزِ ہیجا تیرِ او، تیرِ حق است

یہ اندازِ گفتگو فلسفیانہ سا ہے۔ اس کو ذرا شوخ انداز میں یوں کہتے ہیں کہ

کافر ہے تو ہے تابعِ تقدیر مسلماں ۔۔۔ مومن ہے تو وہ آپ ہے تقدیرِ الٰہی

تقدیر کے ہاتھوں رونے والے مسلمان کو وہ جھنجوڑ کر کہتے ہیں کہ

ترے دریا میں طوفاں کیوں نہیں ہے ۔۔۔ خودی تیری مسلماں کیوں نہیں ہے
عبث ہے شکوۂ تقدیرِ یزداں ۔۔۔ تو خود تقدیرِ یزداں کیوں نہیں ہے

جب مومن اس طرح خود "تقدیرِ یزداں" بن جاتا ہے تو پھر وہ زمانے کی تقدیروں کو بدل دیتا ہے۔ تاریخ کے دھارے کا رُخ موڑ دیتا ہے۔ اقوامِ عالم کی بساط اُلٹ دیتا ہے۔ رنگِ کائنات تبدیل کر دیتا ہے۔ یہ کچھ بن جاتا ہے مردِ مومن جب اپنے ارادوں کو خدا کے ارادوں کے تابع کر دیتا ہے۔

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اسکے زورِ بازو کا
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

یہ ہے مطلب حضرت علامہؒ کے یہ کہنے کا کہ ـــــ قدرت کے مقاصد کا عیار اس کے ارادے ـــــ یہ تو رہا اس دنیا کا معاملہ۔ اور اگر کوئی یہ دیکھنا چاہے کہ اس کے اعمال اسے جنت کا مستحق بنا دیں گے یا نہیں تو اس کا آسان طریقہ یہ ہے کہ وہ مومن کے اعمال نامہ کو سامنے رکھ کر دیکھ لے کہ اس کے اعمال اس پیمانے پر پورے اُترتے ہیں یا نہیں۔ اس لئے کہ مومن کی خصوصیت یہ ہے کہ

دنیا میں بھی میزان قیامت میں بھی میزان

عقل و جذبات

اب آگے بڑھئے۔ عقل اور جذبات کو دو متضاد عناصر خیال کیا جاتا ہے جن میں ہمیشہ باہمی کشمکش رہتی ہے اور جب جذبات عقل پر غالب آجاتے ہیں تو انسان تباہ ہو جاتا ہے۔ رہبانیت (یعنی تصوّف) میں اس کا علاج یہ بتایا جاتا ہے کہ جذبات کو فنا کر دیا جائے۔ بظاہر یہ بات کچھ ناقابلِ قبول سی نظر آئے گی، لیکن یہ حقیقت ہے کہ تصوف کا یہ مسلک خود شدّت جذبات کا پیدا کردہ ہے۔ جذبات کو اس قدر قابلِ نفرت سمجھنا کہ انہیں فنا کر دینا ہی مقصودِ حیات قرار دے لیا جائے عقل کا فیصلہ قرار نہیں پا سکتا۔ عقل اسے بخوبی جانتی ہے کہ اگر انسان میں جذبات نہ ہوں تو اس کا (عقل کا) کوئی فیصلہ بروئے کار آہی نہ سکے۔ عقل کے فیصلے عملی پیکر اختیار ہی جذبات کی قوت سے کرتے ہیں۔ لہٰذا، عقل کا کب یہ تقاضا ہو سکتا ہے کہ وہ ایسے کار آمد عنصر کو اپنے ہاتھوں فنا کر کے خود عضوِ معطل بن کر رہ جائے۔ ترکِ جذبات کے معنی ہیں ترکِ آرزو، ترکِ مقاصد۔ اور یہ خالص جذباتی چیز ہے اس کے علاوہ ایک اور حقیقت بھی قابلِ غور ہے۔ انسانی جذبات بھی

اسی خدا کے پیدا کردہ ہیں جس خدا نے انسان کو عقل عطا کی ہے۔ لہٰذا خدا کی پیدا کردہ اتنی بڑی خصوصیت اور صلاحیت کو شر "فلہٰذا" قابلِ نفرت اور لائقِ ترک قرار دینا خدا کے عظیم تخلیقی پروگرام کے خلاف جنگ کرنا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ خدا سے جنگ کرنا خدا کے مقربین کا شیوہ نہیں ہو سکتا اور آخری بات یہ کہ جذبات ایسی قوت نہیں جسے آپ فنا کر سکیں۔ انہیں آپ وقتی طور پر دبا تو سکتے ہیں، فنا نہیں کر سکتے۔ اور دبانے کی صورت میں بھی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ آپ ان کا ایک راستہ بند کرتے ہیں تو وہ اپنے لئے دس اور راستے تراش لیتے ہیں۔ نفسیات کی اصطلاح میں اسے بدنہادی (PERVERSION) کہا جاتا ہے۔ قرآن کریم نے جذبات کو قابلِ نفرت فلہٰذا، فنا کر دینے کے لائق قرار نہیں دیا۔ وہ انہیں بڑی اہمیت دیتا ہے اور ان کا اسی طرح احترام کرتا ہے جس طرح عقل کا۔ لیکن وہ کہتا یہ ہے کہ انسانی جذبات کو سرکش اور بے باک نہیں ہونے دینا چاہیے۔ انہیں ہمیشہ — ہدایت — یعنی اقدارِ خداوندی — کے تابع رکھنا چاہیے۔ جب جذبات آسمانی ہدایت کے تابع رہیں گے تو ان کا نتیجہ تعمیر ہی تعمیر ہوگا۔ لیکن جب یہ اس سے سرکشی اختیار کر جائیں گے تو اس سے تباہی و بربادی، تخریب اور فساد پیدا ہوگا۔ اس کا ارشاد ہے کہ وَمَنْ أَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰىهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللهِ (۲۸/۵۰) "اس سے زیادہ راہ گم کردہ کون ہو سکتا ہے جو ہدایتِ خداوندی سے بے نیاز ہو کر اپنے جذبات کا اتباع کرتا ہے"۔ مومن میں عقل اور جذبات دونوں اپنی انتہائی شکل میں موجود ہوتے ہیں۔ لیکن وہ ان دونوں کو ہدایتِ خداوندی کے تابع رکھتا ہے۔ اس پس منظر میں اس نظم کو سامنے لائیے جو ضربِ کلیم میں مدنیتِ اسلام کے عنوان سے شائع ہوئی ہے۔

بتاؤں تجھ کو مسلماں کی زندگی کیا ہے	یہ ہے نہایتِ اندیشہ و کمالِ جنوں
نہ اس میں عصرِ رواں کی حیا سے بیزاری	نہ اس میں عہدِ کہن کے فسانہ و افسوں
حقائقِ ابدی پر اساس ہے اسکی	یہ زندگی ہے نہیں ہے طلسمِ افلاطوں
عناصر اس کے ہیں روح القدس کا ذوقِ جمال
عجم کا حسنِ طبیعت، عرب کا سوزِ دروں

اس سراپا مرصع نظم کا ایک ایک شعر قرآن کی روشنی میں توضیح و تشریح کا متقاضی ہے۔

لیکن نقطۂ زیرِ نظر کی رعایت سے ہم سرِدست اس کے مطلع تک محدود رہتے ہیں جس میں کہا گیا ہے کہ مومن کی زندگی ـــ یہ ہے نہایتِ اندیشہ و کمالِ جنوں ـــ یعنی عقل جو اپنے انتہائے کمال تک پہنچی ہوئی ہو اور جذبات کی ایسی شدت جو سطح بیں لوگوں کی نگاہ میں دیوانگی نظر آئے۔ قرآنِ کریم نے عقل و جذبات کے اسی امتزاج کو چند الفاظ میں سمٹا کر رکھ دیا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ وَ شَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللهِ (۳/۱۵۹) اے رسولؐ! تم مہماتِ امور میں اپنے رفقاء سے مشورہ کیا کرو۔ اس کے بعد جب تم فیصلہ پر پہنچ جاؤ اور اپنے پروگرام کو بروئے کار لانے کا عزم کر لو، تو پھر قوانینِ خداوندی کی محکمت پر یقینِ کامل رکھ کر میدان میں نکل آؤ، اور تمام خطرات سے بیگانہ ہو کر جانبِ منزل بڑھتے چلے جاؤ ـــ یقیناً فتح و نصرت تمہارے قدم چومے گی۔

ظاہر ہے کہ مشورہ، نہایتِ اندیشہ، کمالِ عقل و فکر کا نام ہے جس میں جذبات کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ اگر مشورہ میں جذبات دخل انداز ہو جائیں تو انسان کبھی صحیح نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتا۔ لہٰذا وحیٔ خداوندی کی روشنی میں عقل و بصیرت کی رُو سے، پیشِ نظر معاملہ کا باہمی مشاورت سے فیصلہ کرو۔ اب اگلا قدم اس فیصلہ کو بروئے کار لانا ہے۔ اس کے لئے پہلی شرط عزمِ راسخ ہے اور دوسری چیز اپنے فیصلہ کے مبنی برحق ہونے پر یقینِ کامل۔ ان کا تعلق جذبات سے ہے۔ اُن مومنانہ جذبات سے جن کے حاملین کے متعلق کہا کہ اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا ۖ وَّقَالُوْا حَسْبُنَا اللهُ وَ نِعْمَ الْوَكِيْلُ ۝ (۳/۱۷۳) وہ لوگ کہ جب ان سے دوسروں نے کہا کہ تمہارے مخالفین نے ہمارے خلاف ایک لشکرِ جرّار جمع کر رکھا ہے۔ اس لئے ان سے ڈرو اور آگے نہ بڑھو۔ تو اس سے، بجائے اس کے کہ وہ خائف ہوں، ان کا ایمان اور بڑھ گیا اور انہوں نے کہا کہ ہمیں ان کی پرواہ کیا ہے۔ ہمارا بھروسہ قوانینِ خداوندی کی محکمیت پر ہے اور یہ اتنی بڑی قوت ہے جس کا مقابلہ دنیا کی کوئی طاقت نہیں کر سکتی۔ یہ ہے مردانِ مومن کا عزم و توکل جس کی رُو سے وہ دیوانہ وار، آتشِ نمرود میں کُود جاتے اور مخالفت کی ہر قوت پر غالب آجاتے ہیں۔ دیکھئے اقبالؒ اس حقیقت کو کیسے بصیرت افروز انداز میں بیان کر رہا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ

اُمتاں را زندگی جذبِ دروں کم نظر ایں جذب را گوید جنوں
ہیچ قومے زیرِ چرخِ لاجورد بے جنونِ ذو فنون کارے نکرد!

مومن از عزم و توکل قاہر است
گر ندارد ایں دو جوہر کافر است

لیکن جذبات کی اس قدر اہمیت کے باوجود مومن کی زندگی میں یہ کس طرح اقدارِ خداوندی کے تابع رہتے ہیں، اسے قرآن کریم نے ایک آیت میں نہایت جامعیت سے واضح کر دیا ہے جہاں کہا ہے کہ قُلْ اِنْ کَانَ اٰبَآؤُکُمْ وَ اَبْنَآؤُکُمْ وَ اِخْوَانُکُمْ وَ اَزْوَاجُکُمْ وَ عَشِیْرَتُکُمْ اے رسولؐ! ان سے کہہ دو کہ اگر تمہارے ماں باپ، بیٹے بیٹیاں، بھائی برادر، تمہاری بیویاں یا دیگر رشتہ دار، وَ اَمْوَالُ ۨ اقْتَرَفْتُمُوْهَا. تمہارا مال و دولت جسے تم نے محنتِ شاقہ سے حاصل کیا ہے وَ تِجَارَۃٌ تَخْشَوْنَ کَسَادَهَا. تمہارا کاروبار جس کے مندا پڑ جانے سے تم خائف رہتے ہو. وَ مَسٰکِنُ تَرْضَوْنَهَآ اور تمہارے یہ محلات جنہیں تم اس قدر پسند کرتے ہو. غرضیکہ دنیا کی کوئی کشش و جاذبیت اَحَبَّ اِلَیْکُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ جِهَادٍ فِیْ سَبِیْلِهٖ تمہارے نزدیک، خدا، رسول اور اس کے راستے میں جہاد سے زیادہ محبوب ہو جائیں. فَتَرَبَّصُوْا تو انتظار کرو. حَتّٰی یَاْتِیَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ (۹/۲۴) تا آنکہ قانونِ خداوندی اپنا فیصلہ صادر کر دے اور تم تباہ و برباد ہو جاؤ ــــ یہ ہے قرآن کی رُو سے، اقدارِ خداوندی سے ٹکراؤ کی صورت میں انسانی جذبات کی حیثیت. اس قسم کے تصادم کے وقت مومن جذبات کا دامن جھٹک کر اقدارِ خداوندی کے تحفظ کے لئے دیوانہ وار آگے بڑھ جاتا ہے. اسے پھر دہرا دیا جائے کہ مومن تمام معاملات کے فیصلے ہدایتِ خداوندی کی روشنی میں عقل و فکر اور غور و تدبر کی رُو سے کرتا ہے. اور جب کسی معاملہ میں فیصلہ کر کے اسے بروئے کار لانے کا عزم کر لیتا ہے تو پھر وقتی مصلحت کوشیوں سے بے نیاز ہو کر راستے کی تمام مشکلات کا مقابلہ کرتے ہوئے آگے بڑھتا چلا جاتا ہے. اقبالؒ نے اس حقیقت کو دو لفظوں میں سمٹا دیا ہے جب کہا ہے کہ

فرزانہ بگفتارم، دیوانہ بہ کردارم

لیکن یہی جذبات جب اس کی راہ کے کانٹے بنتے نظر آئیں تو وہ یہ کہتا ہوا آگے بڑھ جاتا ہے کہ

یہ مال و دولتِ دنیا، یہ رشتہ و پیوند
بتانِ وہم و گماں لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ

عملِ تخلیق

اب ایک اور گوشے کی طرف آیئے۔ خدا کی ایک صفت فَاطِرُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ہے۔ یعنی کائنات کو عدم سے وجود میں لانے والا۔ یہ صفت خدا کے لئے مختص ہے اور انسانی ذات، خواہ وہ کتنی ہی نشوونما یافتہ کیوں نہ ہو جائے، اس صفت میں شریک نہیں ہو سکتی۔

حیوانی سطح پر افزائشِ نسل کا ذریعہ تولید ہے۔ یعنی جنسی اختلاط۔ خدا اس سے بلند و برتر ہے۔ اسی لئے اس نے اپنے متعلق کہا ہے کہ لَمْ يَلِدْ وَ لَمْ يُوْلَدْ (۱۱۲/۳) اس کی ذات افزائش کے طریقِ تولید سے بلند و بالاتر ہے۔ لیکن انسانی نسل کی افزائش، طریقِ تولید کی رُو سے ہوتی ہے اس اعتبار سے حیوان اور انسان میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔

لیکن پیدائش کا ایک اور طریق ہے جسے عملِ تخلیق کہا جاتا ہے۔ تخلیق کا عمومی مفہوم یہ ہے کہ جو عناصر موجود ہیں ان میں مختلف تراکیب سے امتزاج کے ذریعے نئی نئی چیزیں پیدا کرنا۔ خدا نے اپنے آپ کو اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ کہا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ خدا کے علاوہ اور خالق ہو سکتے ہیں، اگرچہ ان کا عملِ تخلیق، خدا کے تخلیقی نوادر جیسا حسین نہیں ہو سکتا کیونکہ خدا احسن الخالقین ہے۔ اس سے تین نکات ہمارے سامنے آتے۔ (۱) فاطر صرف خدا ہو سکتا ہے کوئی اور نہیں۔ (۲) عملِ تولید حیوانی سطح پر طریقِ افزائش ہے اور (۳) مومن عملِ تخلیق میں خدا کا رفیق ہوتا ہے۔ تولید میں صرف تکرار ہوتی ہے۔ اس کی رُو سے ہر حیوان جس میں انسان بھی شامل ہے، صرف اپنے جیسا بچہ پیدا کر سکتا ہے۔ اس میں نُدرت نہیں ہوتی۔ ارتقاء نہیں ہوتا۔ فکر کی دنیا میں اسے تقلید کہتے ہیں یعنی جو ہوتا چلا آ رہا ہے اسی طرح ہوتا چلا جائے۔ تخلیق کے لئے نئی فکر، نئے خیال، نئی آرزوئیں نئے مقاصد کا دل میں اُبھرنا، نئی نئی تمناؤں کا بیدار ہونا شرطِ اوّلیں ہے۔ آپ کوئی چیز پیدا نہیں کر سکتے جب تک آپ کے دل میں اس کے لئے ایک نیا خیال نہ اُبھرے۔ مومن کی زندگی تخلیقی کارناموں کا مظہر ہوتی ہے۔ تقلید و تکرار اس کا شیوہ نہیں ہوتا۔ اقبالؒ کے پیغام کا

نقطہ ماسکہ تخلیقِ مقاصد اور بیداریٔ آرزو ہے۔ وہ اپنی سب سے پہلی تصنیف "اسرارِ خودی" کے ابتدائی باب میں کہتے ہیں کہ

زندگانی را بقا از مدعا است   کاروانش را درا از مدعا است

اور

ما ز تخلیقِ مقاصد زندہ ایم   از شعاعِ آرزو تابندہ ایم

عملِ تخلیق کے لیے، زندگی کے بلند مقاصد پر یقین ضروری شرط ہے۔ اسی لئے وہ کہتے ہیں کہ:۔

بے یقیں را لذتِ تحقیق نیست
بے یقیں را لذتِ تخلیق نیست

اقبالؒ کے نزدیک ایمان کا فطری نتیجہ تخلیقِ مقاصد ہے۔ وہ واشگاف الفاظ میں کہتے ہیں کہ

ہر کہ او را لذتِ تخلیق نیست   نزدِ ما جز کافر و زندیق نیست

مومن کارگہ کائنات میں اپنے عملِ تخلیق میں نت نئے اضافے کرتا چلا جاتا ہے۔ اس کو اقبالؒ مردِ حُر یا بندۂ آزاد کہتا ہے۔ اس کے برعکس غلام ہے جس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ

کیشِ اُو تقلید و کارش آذری است   ندرت اندر مذہبِ اُو کافری ست
تازگی ہا وہم و شک افزائدش   کہنہ و فرسودہ خوش می آیدش

حضرت علامہؒ فکر کی تازگی کی اہمیت کے متعلق کہتے ہیں کہ

جہانِ تازہ کی افکارِ تازہ سے ہے نمود
کہ سنگ وخشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا

اس کی تشریح (بالِ جبریل میں) ان الفاظ سے کرتے ہیں کہ:۔

ندرتِ فکر و عمل کیا شے ہے؟ ذوقِ انقلاب   ندرتِ فکر و عمل کیا شے ہے؟ ملت کا شباب
ندرتِ فکر و عمل سے معجزاتِ زندگی   ندرتِ فکر و عمل سے سنگِ خارا لعلِ ناب

خدا نے اپنے عملِ تخلیق کے متعلق کہا تھا کہ یَزِیْدُ فِی الْخَلْقِ مَا یَشَآءُ (۳۵/۱) وہ اپنے قانونِ مشیت کے مطابق کائنات میں نت نئے اضافے کرتا رہتا ہے۔ مومن بھی ندرتِ فکر و عمل سے نئی نئی ایجادات سے خدا کے تخلیقی پروگرام میں اس کا رفیق بن جاتا ہے۔ پولینڈ کا مفکر

بارڈیو اس سلسلہ میں کہتا ہے کہ "امرِ تخلیق صرف خدا کی طرف سے انسان کی طرف نہیں آتا بلکہ خدا بھی انسان سے تخلیقی جدتوں کا تقاضا کرتا ہے۔ وہ انسانی آزادی کے کارناموں کا منتظر رہتا ہے"۔

نسل و رنگ

(THE DIVINE AND THE HUMAN).

اب تولید و تخلیق کے فرق کا اگلا مرحلہ دیکھئے۔

جہاں تک انسان کی تمدنی زندگی کا تعلق ہے، تولید کی حیوانی سطح پر، افراد کا باہمی رشتہ خون اور نسل کے اشتراک کی بنا پر ہوتا ہے۔ ایک خاص نسل کے گھوڑے، خاص نسل کے بیل، خاص نسل کی بھیڑیں، الگ الگ نوع قرار پاتی ہیں۔ ان میں نسلی اشتراک کے سوا کوئی قدر مشترک نہیں ہوتی۔ جب انسان بھی حیوانی سطح پر زندگی بسر کرے تو وہ بھی خون اور نسل کے اشتراک سے مختلف قبیلوں اور قوموں میں بٹ جاتا ہے۔ لیکن جب وہ مومن کی سطح پر آجائے تو پھر ان میں وجۂ جامعیت خون اور نسل کا اشتراک نہیں رہتی۔ اقدار کا اشتراک وجۂ جامعیت یا معیارِ قومیت قرار پاتا ہے۔ اس کو دو قومی نظریہ کہتے ہیں۔ یعنی وہ لوگ جو حیوانی سطح پر زندگی بسر کریں، ایک قوم کے افراد اور جو لوگ مومنانہ سطح پر زندگی بسر کریں، دوسری قوم کے ارکین۔ ماں باپ، زن و فرزند، اعزا و اقارب سے تعلقات معاشرتی زندگی کا تقاضا ہے۔ لیکن اگر اس تقاضا اور اقدارِ خداوندی میں ٹکراؤ ہو تو یہ تعلقات یا یوں کہیئے کہ خون اور نسل کا اشتراک کچھ حقیقت نہیں رکھتا۔ مومن ان رشتوں کو بلا تأمل توڑ کر ان لوگوں سے الگ ہو جاتا ہے۔ اسی بنا پر قرآن کریم نے کہا ہے کہ يَآأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا آبَاءَكُمْ وَإِخْوَانَكُمْ أَوْلِيَاءَ إِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَى الْإِيمَانِ اے جماعتِ مومنین! اگر تمہارے ماں باپ یا بھائی بند، ایمان کے مقابلہ میں کفر کو زیادہ پسند کرتے ہوں تو تم ان سے دوستداری کے تعلقات مت وابستہ رکھو۔ وَمَنْ يَتَوَلَّهُمْ مِنْكُمْ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ (۹/۲۳) یاد رکھو! جو ایسا نہیں کرے گا اور ان سے بدستور دوستانہ تعلقات وابستہ رکھے گا تو اس کا شمار بھی ظالمین میں سے ہوگا۔ اسی بنا پر اقبالؒ نے کہا تھا کہ

قومِ تو از رنگ و خوں بالاتر است　　قیمتِ یک اسودش صد احمر است
گر نسب را جزدِ ملت کردۂ　　رخنہ در کارِ اخوت کردۂ
(بے خودی)

یعنی　　نسل اگر مسلم کی مذہب پر مقدم ہو گئی
اڑ گیا دنیا سے تو مانندِ خاکِ رہ گذر

میں چونکہ اس موضوع پر سالہا سال سے مسلسل اور متواتر لکھتا چلا آ رہا ہوں اس لئے اس مقام پر انہی اشارات پر اکتفا کیا جاتا ہے. ان اشارات سے آپ نے اس حقیقت کو سمجھ لیا ہوگا کہ اسلام میں قومیت کا مسئلہ سیاسی یا تمدنی سوال نہیں. یہ کفر اور ایمان کا خطِ امتیاز ہے. اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ حیوانی سطح پر زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں یا انسانی سطح پر — حیوانی سطح زندگی کو کفر کہا جاتا ہے اور اقدارِ خداوندی کے مطابق انسانی سطح زندگی کو ایمان. قرآن کے عباد اللہ اور اقبالؒ کے مردانِ مومن کا ایک امتیازی جوہر یہ بھی ہے کہ وہ خون اور نسل کے حیوانی رشتہ کے بجائے ایمان و اقدار کے انسانی (مومنانہ) رشتہ سے وابستہ ہوتے ہیں.

رحم اور قوت

اب ایک اور گوشے کی طرف آیئے. دنیا میں رحم اور قوت دو ایسے عناصر ہیں جن کے متعلق سمجھا جاتا ہے کہ یہ اکٹھے ہو ہی نہیں سکتے. عیسائیت نے خدا کو سرتاسر رحم قرار دیا ہے اور قوت کے ہر قسم کے تصور کو شر سے تعبیر کیا. خدا کے اس تصور نے جس قسم کا ضابطۂ اخلاق مرتب کیا، اس کے نتائج و عواقب کے متعلق عصرِ حاضر کا ایک عظیم مفکر "وھائٹ ہیڈ" لکھتا ہے کہ:-

> اس ضابطہ کو اگر موجودہ معاشرہ میں نافذ کر دیا جائے تو اس کا نتیجہ فوری موت کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔ (ADVENTURES OF IDEAS).

اس تصور کے خلاف ردِ عمل کا انتہائی مظہر جرمن فلاسفر نیٹشے ہے جس کے نزدیک زندگی کا راز "قوت اور بے پناہ قوت میں ہے. وہ اس خصوصیت کے سوا کسی قدر کا قائل ہی نہیں. اس تصورِ حیات نے کیا نتائج پیدا کئے، اس کی زندہ شہادت وہ جہنم ہے جس میں اس وقت ساری دنیا

مبتلائے عذاب ہے. قرآن نے کہا کہ یہ دونوں تصورات باطل اور غلط نگہی پر مبنی ہیں. خدا ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ (۵۱/۵۸) یعنی بے انتہا محکم قوتوں کا مالک بھی ہے اور اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ٥ (۷/۱۵۱) بھی. یعنی سب سے زیادہ رحم کرنے والا. وہ ظالم کی کلائی مروڑنے کے لئے صاحبِ قوت ہے اور مظلوم کے زخموں پر مرہم رکھنے کے لیے انتہائی شفقت و رحمت کا مظہر. عبدِ مومن خدا کی ان دونوں صفات کا حامل ہوتا ہے اور اقبالؒ نے ان صفات کے حسین و جمیل امتزاج کو مختلف اسالیب و انداز سے اس شرح و بسط سے بیان کیا ہے کہ اگر میں اس کی تفصیل میں جانا چاہوں تو اس کے لئے کئی نشستیں درکار ہوں گی. قرآن نے جماعت مومنین اور ان کے سربراہ حضور نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کہا ہے کہ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَ الَّذِيْنَ مَعَهٗۤ. خدا کے پیغامبر محمدؐ اور ان کے رفقاء کی کیفیت یہ ہے کہ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ (۴۸/۲۹) وہ حق و صداقت کے مخالفین کے لئے چٹان کی طرح سخت ہیں اور باہمدگر حریر و اطلس کی طرح نرم. اقبالؒ ان متضاد خصوصیات اور ان کے امتزاج کو انتہائی وجد و کیف کے عالم میں بیان کرتا چلا جاتا ہے. وہ کہتا ہے کہ مومن کی کیفیت یہ ہے کہ

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

ضربِ کلیم کی وہ تابندہ نظم جس کا مطلع ہے — ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن — اور جس کے چند اشعار میں اس سے پہلے پیشِ خدمت کر چکا ہوں. اس کے آخر میں کہا ہے کہ مومن کی کیفیت یہ ہے کہ

جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفاں

بانگِ درا کی مشہور نظم — طلوعِ اسلام — میں وہ مسلمان تک خدا کا یہ پیغام پہنچاتے ہیں کہ،

مصافِ زندگی میں سیرتِ فولاد پیدا کر
شبستانِ محبت میں حریر و پرنیاں ہو جا

گذر جا بن کے سیلِ تند رو کوہ و بیاباں سے
گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہو جا

قیام و سجود

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ۭ وَ الَّذِیْنَ مَعَہٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ. اس کے بعد قرآنِ کریم نے فدائیوں کی اس جماعت کی خصوصیت یہ بتائی کہ تَرٰىھُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا (۴۸/۲۹) تو انہیں دیکھے گا کہ کبھی رکوع میں جھکے ہوتے کبھی سجدہ میں گرے ہوئے.

علامہ اقبالؒ مومن کی صلوٰۃ سے کئی نادر معانی اخذ کرتے ہیں. وہ کبھی کہتے ہیں کہ

بسوزد مومن از سوزِ وجودش — کشود ہر چہ بستند از کسودش
جلالِ کبریائی در قیامش — جمالِ بندگی اندر سجودش

عبد مومن کے قیام و سجود کے جلال و جمال کے حسین منظر سے، میرے افقِ ذہنی پر، بلا ساختہ افغانستان کی ایک شاعرہ پری بدخشنی کی غزل کا ایک شعر نمودار ہو گیا. اس نے کہا ہے اور دیکھئے کس ساحرانہ انداز سے کہا ہے کہ

برخاستی! قیامتِ کبریٰ بلند شد
بنشیں دے! کہ فتنۂ محشر نشستہ بہ

لیکن اقبالؒ کسی اور ہی مقام سے بات کرتا ہے. ارمغانِ حجاز کا ایک قطعہ آپ نے ابھی ابھی سُن لیا. اسی مضمون کا دوسرا قطعہ ہے کہ

دو گیتی را صلا از قرأتِ اوست — مسلماں لاموت از رکعتِ اوست
نداند کشتۂ ایں عصرِ بے سوز — قیامت ہا کہ در قد قامتِ اوست

مومن کا قیام و سجود آئینہ دار ہے اس حقیقت کا کہ وہ ایک خدا کے حضور جھک کر دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت کے سامنے مردانہ وار کھڑا ہو جاتا ہے. سجدہ، اگر بغیر قیام کے ہو تو وہ عیسائیت (بلکہ یوں کہئے کہ) مسلکِ رہبانیت کے "خدا" کا خود ساختہ تصور ہے. اور اگر قیام بلا سجدہ ہو تو وہ نیٹشے کے تصور کا (SUPERMAN) ہے جو اندھی قوت کا قہرمانی مجسمہ ہوتا ہے.

قرآن نے قوت اور اقدارِ خداوندی کے امتزاج کو نہایت بصیرت افروز الفاظ میں بیان کیا ہے جب کہا ہے کہ لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنٰتِ وَ اَنْزَلْنَا مَعَھُمُ

اَلْكِتٰبَ وَ الْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ؕ ہم نے اپنے رسولوں کو واضح ہدایت اور میزانِ عدل دے کر بھیجا تاکہ لوگ عدل و انصاف کے مطابق زندگی بسر کریں. لیکن اس مقصد کے لئے نظری تعلیم یا پند و نصائح کافی نہیں تھے. اس لئے وَ اَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ ہم نے ان کے ساتھ شمشیرِ خارہ شگاف بھی نازل کی. فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ (۵۷/۲۵) اگر اسے خدا کے نازل کردہ ضابطۂ ہدایت کے مطابق استعمال کیا جائے تو وہ نوعِ انسان کے لئے بڑی منفعت بخش ثابت ہوتی ہے. ضابطۂ خداوندی اور اس کے ساتھ تلوار (یعنی مادی قوت) — یہ ہے اسلام. تلوار کے متعلق اقبالؒ کہتا ہے کہ:

سوچا بھی ہے اے مردِ مسلماں کبھی تو نے کیا چیز ہے فولاد کی شمشیرِ جگر دار
اس بیت کا یہ مصرعِ اوّل ہے کہ جس میں پوشیدہ چلے آتے ہیں توحید کے اسرار

تنہا تلوار، بیتِ زندگی کا صرف ایک مصرع ہے اور ظاہر ہے کہ جب تک اس کے ساتھ دوسرا مصرع نہ ہو، یہ شعر نہیں بن سکتا. وہ دوسرا مصرعہ اقدارِ خداوندی کا ضابطہ ہے. اقبالؒ نے اپنی زندہ و پائندہ تصنیف، جاوید نامہ میں تلوار اور قرآن کے باہمی تعلق کو ایسے عمیق لیکن درخشندہ انداز سے بیان کیا ہے کہ جوں جوں چشمِ بصیرت اس پر غور کرتی ہے، انسان وجد میں آجاتا ہے. (مغلیہ خاندان کے) شاہ عالم کے زمانہ میں، پنجاب کے گورنر، نواب خان بہادر خان کی صاحبزادی محترمہ شرف النساء کے متعلق مشہور ہے کہ وہ ہمیشہ کمر سے تلوار باندھے رکھتی تھیں اور ہاتھ میں قرآن. اور انہوں نے اپنی والدہ کو وصیت کی تھی کہ اس کی وفات کے بعد یہ دونوں چیزیں اس کی قبر کے اوپر رکھ دی جائیں.

اقبالؒ اپنے آسمانی سفر میں، جنت الفردوس میں اس شہزادی والا تبار سے ملتے ہیں اور اس سے پوچھتے ہیں کہ اس کے اس شعارِ زندگی اور آخری وصیت کی حکمت کیا تھی — وہ جواب میں کہتی ہیں کہ میں تلوار اور قرآن کو اس لئے ساتھ رکھتی تھی کہ

ایں دو قوت حافظِ یک دیگر اند کائناتِ زندگی را محور اند!
مومناں را تیغ با قرآں بس است تربتِ ما را ہمیں ساماں بس است

تلوار سے مراد، عسکری قوت ہی نہیں بلکہ ہر قسم کا اقتدار ہے. جب دین بلا اقتدار کے ہو تو

وہ مذہب کی شکل اختیار کر لیتا ہے جس کا منتہیٰ وعظ و نصیحت کی منت خوشامد سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا۔ اور جب اقتدار ضابطۂ خداوندی سے الگ ہو جائے تو وہ ہر دَور میں فرعونیت کا مظہر بن جاتا ہے۔ ضربِ کلیم کی اس جلال آفریں نظم کو پڑھئے اور دیکھئے کہ حکیم الامت نے اس حقیقت کو کیسے واشگاف الفاظ میں بیان کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ

تاریخِ اُمم کا یہ پیامِ ازلی ہے ۔۔۔ صاحبِ نظراں نشۂ قوت ہے خطرناک
اس سیلِ سبک سیر و زمیں گیر کے آگے ۔۔۔ عقل و نظر و علم و ہنر ہیں خس و خاشاک
لادیں ہو تو ہے زہرِ ہلاہل سے بھی بڑھ کر
ہو دیں کی حفاظت میں تو ہر زہر کا تریاق

واضح تر الفاظ میں کہ:

جلالِ پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو ۔۔۔ جُدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

مومن کی سیاست دین کے تابع رہتی ہے۔ قرآن اس کی تلوار کا محافظ ہوتا ہے کہ وہ بے راہ رَد نہ ہونے پائے اور تلوار قرآن کی محافظ کہ وہ مذہب بن کر نہ رہ جائے۔ اس طرح مومن کی تلوار اس کی قوت، اس کا اقتدار، اس کی سیاست، اس کی مملکت، دنیا میں مقاصدِ خداوندی کو بروئے کار لانے کا ذریعہ بنتے ہیں۔ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ جب مکہ کے مظلوموں نے اپنی امداد کے لئے خدا سے فریاد کی تو اس نے کس طرح مدینہ کے صاحبِ اقتدار مسلمانوں سے کہا کہ تم ان مظلوموں کی فریاد کو سنتے نہیں؛ تم اُن کی مدد کے لئے کیوں نہیں اٹھتے؟ اسی حقیقت کو اقبالؒ نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ:

اللہ کو پامردیٔ مومن پہ بھروسہ ۔۔۔ ابلیس کو یورپ کی مشینوں کا سہارا

مومن کو خدا کے قانونِ مکافات کی محکمیت پر بھروسہ ہوتا ہے اور خدا کو جماعتِ مومنین کی استقامت اور پامردی پر بھروسہ کہ جب یہ مشیتِ خداوندی کے بروئے کار لانے کے لئے اٹھتے ہیں، تو اس کی (مشیت) بروئے کار آ کر رہتی ہے۔ اس لئے کہ اُولٰٓئِکَ حِزْبُ اللّٰہِ۔ "یہ خدا کی پارٹی ہے۔ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰہِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (۵۸/۲۲) اور سُن رکھو کہ خدا کی پارٹی کامیاب ہو کر رہتی ہے۔ صرف کامیاب ہی نہیں فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰہِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ ۝ (۵/۵۶)

یہ سب پر غالب آکر رہتے ہیں۔ دنیا کی کوئی طاقت ان کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔ کوئی قوم ان سے آگے نہیں بڑھ سکتی۔ آگے بڑھنا تو ایک طرف، کوئی قوم ان کے ہمدوش نہیں ہوسکتی۔ ان کی برابری کا دعویٰ بھی نہیں کرسکتی۔

مومنے بالائے ہر بالا ترے غیرتِ او برنتابد ہمسرے

اس لئے کہ ان کے خدا کا ارشاد ہے کہ وَ اَنۡتُمُ الۡاَعۡلَوۡنَ اِنۡ كُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِيۡنَ٥ (۳/۱۳۹) جب تم مومن ہو تو پھر تم سے بڑا کوئی نہیں ہوسکتا۔ وَ لَنۡ يَّجۡعَلَ اللّٰهُ لِلۡكٰفِرِيۡنَ عَلَى الۡمُؤۡمِنِيۡنَ سَبِيۡلًا٥ (۴/۱۴۱) یہ ہو نہیں سکتا کہ کفار کبھی مومنوں پر غالب آجائیں۔ جب صورت یہ ہے تو پھر واضح ہے کہ دنیا میں (خدا کی طرف سے) حقِ حکومت صرف جماعتِ مومنین کو حاصل ہوگا۔ کسی اور کو نہیں۔

عالم ہے فقط مومنِ جانباز کی میراث مومن نہیں جو صاحبِ لولاک نہیں ہے

مومن جس ماحول میں آنکھ کھولتا ہے، اپنے آپ کو اس ماحول کے مطابق نہیں ڈھال لیتا۔ وہ اس ماحول کو اپنے نظریات و تصورات کے مطابق ڈھلنے کے لئے مجبور کر دیتا ہے۔ اسی کا نام انقلاب ہے اور مومن دنیا میں سب سے بڑا انقلابی ہوتا ہے۔ مثنوی اسرار و رموز میں ہے کہ

مردِ خود دارے کہ باشد پختہ کار با مزاجِ اُو بسازد روزگار
گر نہ سازد با مزاجِ او جہاں می شود جنگ آزما با آسماں
برکند بنیادِ موجودات را می دہد ترکیبِ نو ذرات را
گردشِ ایّام را برہم زند چرخِ نیلی فام را برہم زند
می کند از قوّتِ خود آشکار
روزگارِ نو کہ باشد سازگار

اس قسم کا انقلاب، مردِ مومن کا ایمان ہی برپا کرسکتا ہے اور اس کا طریق یہ ہے کہ

ہو صداقت کے لئے جس دل میں مرنے کی تڑپ
پہلے اپنے پیکرِ خاکی میں جاں پیدا کرے

پھونک ڈالے یہ زمین و آسمانِ مستعار
اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے

(MARTIN BUBAR) نے اس حقیقت کو جس خوبصورت انداز میں بیان کیا ہے، جی نہیں چاہتا کہ اس کیف میں آپ کو شریک کئے بغیر آگے بڑھا جائے وہ کہتا ہے کہ

جب قوتِ تخلیق ہم پر اثر انداز ہوتی ہے تو وہ اپنے آپ کو جلا کر ہمارے اندر جذب ہو جاتی ہے اور اس آگ کے بھڑکتے ہوئے شعلوں سے ہماری تخلیق نو کرتی ہے۔ ہم اس کے آتشیں جلال کے حضور میں پہلے کانپتے ہیں گڑگڑاتے ہیں۔ سربسجود ہو جاتے ہیں۔ لیکن اس کے بعد ہم خود عملِ تخلیق میں شریک ہو جاتے ہیں اور خالق سے جا ملتے ہیں اس کے معاون اور رفیق کی حیثیت سے۔

(I AND THOU).

اس قسم کا جہانِ نو، مردِ مومن کی قوتِ بازو ہی سے وجود میں آسکتا ہے۔ ایسا انقلاب کوئی اور پیدا نہیں کر سکتا جس میں کیفیت یہ ہو کہ یَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَیْرَ الْاَرْضِ وَ السَّمٰوٰتُ (۱۴/۴۸) یہ زمین بدل جائے، یہ آسمان بدل جائے۔ وَ بَرَزُوْا لِلّٰہِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ (۱۴/۴۸) اور ان میں ایک نئی دنیا اُبھرے جس میں صرف خدائے واحد کا سکہ رواں ہو۔ وَ اَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا (۳۹/۶۹) اور زمین اپنے نشو و نما دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھے۔ یہ ہیں وہ مردانِ حُر جو ہیگل کے "روحِ زمانہ" اور مارکس کے "تاریخی وجوب" کے تابع مجبور و مقہور زندگی بسر کرنے کے بجائے تاریخ کے دھارے کا رُخ موڑ دیتے ہیں۔

باردیو کے الفاظ ہیں:۔

یہی وہ انسان ہے جو تاریخ اور کائنات کی زندگی جیتا ہے اور اس میں باعمل و متحرک رہتا ہے لیکن تاریخ اور کائنات سے متاثر نہیں ہوتا بلکہ انہیں اپنے ارادوں کے تابع ڈھال لیتا ہے۔ اس قسم کا انسان صرف اپنی

لے بوبر چونکہ یہودی ہے اس لئے اس کا اشارہ حضرت موسیٰؑ کے واقعہ طور کی طرف ہے۔

ذات کی یا ان لوگوں کی ذمہ داری ہی نہیں لیتا جو اس کے گرد و پیش ہوں
بلکہ تمام نوعِ انسان کے مقدمات کی ذمہ داری اپنے سر لیتا ہے۔

(THE DIVINE AND HUMAN)

قرآن کے الفاظ ہیں وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ (۲/۱۴۳) اور اس طرح ہم نے تمہیں ایک بین الاقوامی امت بنایا تاکہ تم تمام نوعِ انسان کے اعمال و کردار کی نگرانی کرو۔

یہ ہے مومن کا مقام اِس دنیا میں اور چونکہ زندگی یہیں ختم نہیں ہو جاتی، آگے بھی چلنی ہے، اس لئے جہانِ فردا میں بھی امامت کا سزاوار یہی ہوگا۔ اس لئے اقبالؒ نے کہا ہے کہ

فرنگ سے بہت آگے ہے منزلِ مومن
قدم اُٹھا یہ مقام انتہائے راہ نہیں

بانگِ درا میں ہے۔

پرے ہے چرخِ نیلی فام سے منزل مسلماں کی
ستارے جس کی گردِ راہ ہوں وہ کارواں تو ہے

اور بالِ جبریل کی یہ رقصندہ و سرایندہ غزل۔

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

قناعت نہ کر عالمِ رنگ و بو پر
چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں

تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا
ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں

اسی روز و شب میں اُلجھ کر نہ رہ جا
کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں!

قرآنِ کریم کی رُو سے تو، جنت بھی مومن کے سفرِ حیات کی آخری منزل نہیں، راستے میں سستانے کا مقام ہے یعنی دم لے کر آگے چلنے کا مقام۔ کاروانِ حیات نے اس کے بعد بھی کئی ارتقائی منازل طے کرنی ہیں۔ اسی لئے اہلِ جنت کے متعلق کہا گیا ہے کہ نُوْرُهُمْ يَسْعٰى بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَ بِاَيْمَانِهِمْ۔ ان کی (پیشانی کا) نور ان کے آگے اور دائیں بائیں راستے روشن کرتا جائے گا۔ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَ اغْفِرْ لَنَا (۶۶/۸) اور ان کی پکار یہ ہوگی کہ اے

ہمارے نشو ونما دینے والے، ہمارے نُور کی تکمیل کر دے. اس نورانی سفر کی آخری منزل کونسی ہوگی، اس کے متعلق کچھ نہیں بتایا گیا. اس لئے کہ ہمارے شعور کی موجودہ سطح پر یہ حقیقت ہمارے حیطۂ ادراک میں آ نہیں سکتی تھی. اس کی سمت کا اشارہ کرتے ہوئے اتنا کہا گیا کہ وَ اَنَّ اِلٰی رَبِّکَ الْمُنْتَھٰی (۵۳/۴۲) اس سفر کا منتہیٰ تیرے رب کی طرف ہے. یاد رہے کہ اہلِ تصوّف کا جو نظریہ ہے کہ انسانی ذات، ذاتِ خداوندی کا ایک جزد ہے اور زندگی کی تمام تگ و تاز کا ماحصل یہ ہے کہ یہ جزد اپنی اصل یعنی ذاتِ خداوندی میں جا کر جذب اور فنا ہو جائے، یہ تصوّر قرآنِ کریم کی تعلیم کے خلاف ہے اور دوسروں کے ہاں سے مستعار لیا ہوا. خود اقبالؒ بھی اس نظریہ کے خلاف ہے. اس کی تلقین یہ ہے کہ

چناں با ذاتِ حق خلوت گزینی ترا اُو بیند و اُو را تو بینی

بخود محکم گذار اندر حضورش مشو ناپید اندر بحرِ نورش

(گلشنِ رازِ جدید)

یہ بہرحال ایک الگ موضوع ہے جس کی وضاحت کا یہ مقام نہیں. میں کہہ یہ رہا تھا کہ مومن وہ ہے جو زندگی کی ارتقائی منازل طے کرتا آگے بڑھتا چلا جائے. اس کے مقامات کا ہم اندازہ ہی نہیں کر سکتے.

مقامِ بندۂ مومن کا ہے ورائے سپہر زمیں سے تا بہ ثریا تمام لات و منات

حریمِ ذات ہے اس کا نشیمنِ ابدی نہ تیرہ خاکِ لحد ہے نہ جلوہ گاہِ صفات

خود آگہاں کہ ازیں خاکداں بروں جستند

طلسمِ مہر و سپہر و ستارہ بشکستند (ارمغانِ حجاز)

عزیزانِ من! جیسا کہ میں نے شروع میں کہا تھا، قرآنِ کریم کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آئے گی کہ اس میں مختلف پہلوؤں اور متنوع گوشوں سے مردانِ مومن کی خصوصیات

لے ذاتِ خداوندی میں فنا ہو کر نہیں، بلکہ اسی حریم میں؛ اس سے الگ.

کیفیات کا تذکرہ ہے اور علامہ اقبالؒ کا پیغام بھی چونکہ حقائقِ قرآنی ہی کا ترجمان ہے اس لئے اس میں بھی مومن کی صفات و تجلیات کو پہلو بدل بدل کر بیان کیا گیا ہے۔ اکثر مقامات پر وہ پھول کی بکھری ہوئی پتیوں کی طرح فرداً فرداً سامنے آتی ہیں اور کہیں انہیں گلدستہ کی طرح جامع حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ میں ایسے مقامات کی دو ایک مثالیں پیش کرتا ہوں تاکہ اقبالؒ کے مردِ مومن کی ایک جھلک بیک نظر آپ کے سامنے آجائے۔ وہ اپنی سب سے پہلی تصنیف 'مثنوی اسرار و رموز' میں سورۂ اخلاص کی آیت وَ لَمْ یَکُنْ لَّہٗ کُفُوًا اَحَدٌ' کی شرح کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

رشتہ با لَمْ یَکُنْ باید قوی تا تو در اقوامِ بے ہمتا شوی
آنکہ ذاتش واحد است و لاشریک بندہ اش ہم در نسازد با شریک
مومنے بالائے ہر بالا ترے غیرتِ او برنتابد ہمسرے
پیشِ باطل تیغ و پیشِ حق سپر امر و نہیِ او عیارِ خیر و شر
عفو و عدل و بذل و احسانش عظیم ہم بقہر اندر مزاجِ او کریم
سازِ او در بزمہا خاطر نواز سوزِ او در رزمہا آہن گداز

زیرِ گردوں می نیا ساید دلش
بر فلک گیرد قرار آب و گلش

میں یہ اشعار پڑھ رہا ہوں اور میرے حافظہ میں ایک ایسے واقعہ کی یاد تازہ ہو رہی ہے جو ہے تو ذاتی لیکن جی نہیں چاہتا کہ میں اسے یہاں بیان کئے بغیر آگے بڑھ جاؤں۔ میری ابتدائی تعلیم و تربیت، میرے لائقِ صد احترام، دادا جان (مرحوم و مغفور) کے زیرِ سایہ عاطفت ہوئی تھی۔ انہوں نے حضرت علامہؒ کی یہ مثنوی مجھے خود پڑھائی تھی۔ اس وقت میری عمر چھوٹی سی تھی۔ انہوں نے جب اقبالؒ کے اشعار اور قرآن کی روشنی میں، مردِ مومن کی صفات و خصائص بیان کیں تو مجھ پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہو گئی اور میں نے نہایت استعجاب اور کچھ خوف کے سے، ملے جلے جذبات کے ساتھ ان سے کہا کہ بابا جان! مردِ مومن اگر ایسا ہوتا ہے تو مجھے تو آج ساری دنیا میں کوئی مردِ مومن نظر نہیں آتا۔ انہوں نے اپنے مخصوص محبت بھرے انداز سے کہا کہ یہ ٹھیک ہے کہ آج مردِ مومن کہیں

نظر نہیں آتا. لیکن غنیمت ہے کہ اگر ہمارے دور میں کوئی مومن نہیں تو دنیا میں آج کوئی کافر بھی موجود نہیں. اگر صورت یہ ہوتی کہ ابوجہل تو ہوتا اور عمرؓ نہ ہوتا تو پھر البتہ گھبرانے کی بات تھی. دنیا آج کفر اور ایمان دونوں کی طرف سے بے اعتنا (INDIFFERENT). ہوتی جارہی ہے اور جو لوگ زندگی کے حقائق کی طرف سے (INDIFFERENT). ہوجائیں ان سے کوئی خطرہ نہیں ہوتا. یہ تھا جو کچھ دادا جان (مرحوم) نے فرمایا. اس واقعہ کے کافی عرصہ بعد جب ضربِ کلیم سامنے آئی تو اس کے شروع میں یہ شعر نظر پڑا.

نہ دیر میں، نہ حرم میں، خودی کی بیداری
کہ خاوراں میں ہے قوموں کی روحِ تریاقی

تو میری سمجھ میں آیا کہ دادا جان نے اتنا عرصہ پہلے کیا بات کہی تھی.

یہ جملۂ معترضہ تھا. میں کلامِ اقبالؒ سے مردِ مومن کی صفات وخصوصیات کی مثالیں پیش کر رہا تھا. ضربِ کلیم میں وہ مردِ بزرگ کے عنوان سے لکھتے ہیں.

اس کی نفرت بھی عمیق اس کی محبت بھی عمیق — قہر بھی اس کا ہے اللہ کے بندوں پہ شفیق
پرورش پاتا ہے تقلید کی تاریکی میں — ہے مگر اس کی طبیعت کا تقاضا تخلیق
انجمن میں بھی میسر رہی خلوت اس کو — شمعِ محفل کی طرح سب سے جدا سب کا رفیق
مثلِ خورشیدِ سحر فکر کی تابانی میں — بات میں سادہ و آزادہ معانی میں دقیق

اس کا اندازِ نظر اپنے زمانے سے جدا
اس کے احوال سے محرم نہیں پیرانِ طریق

میں ابھی ابھی عرض کر چکا ہوں کہ جب اقبالؒ کے کلام سے مردِ مومن کی خصوصیات میرے سامنے آئیں تو میں نے بصد تاسف کہا کہ دادا جان! مجھے اس بھری دنیا میں کوئی مومن نظر نہیں آتا. اب سوچئے کہ جب کلامِ اقبالؒ کے سامنے آنے سے میری یہ کیفیت ہوگئی تھی تو اس باب میں خود اقبالؒ کی کیفیت کیا ہوگی؟ اقبالؒ ساری عمر مردِ مومن کی تلاش کرتا رہا اور گلی گلی، کوچہ کوچہ، صحرا صحرا، دریا دریا پکارتا گیا کہ :-

درمعرکہ بے سوزِ تو ذوقے نتواں یافت — اے بندۂ مومن! تو کجائی، تو کجائی؟

اس کی ساری عمر اسی پکار میں گذر گئی۔ لیکن زندگی بھر کی طلب و جستجو کے باوجود جب اسے مردِ مومن کی آواز کہیں سے سنائی نہ دی تو وہ ہار تھک کر بیٹھ گیا اور انتہائی کرب والم کے ساتھ پکار اٹھا کہ

مسلماں ہے توحید میں گرم جوش		مگر دل ابھی تک ہے زنار پوش
تمدن، تصوف، شریعت، کلام		بتانِ عجم کے پجاری تمام
حقیقت خرافات میں کھو گئی		یہ امت روایات میں کھو گئی
بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے		مسلماں نہیں، راکھ کا ڈھیر ہے

اور یہ اس لئے کہ

منزلِ و مقصودِ قرآں دیگر است		رسم و آئینِ مسلماں دیگر است

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ

دینِ حق از کافری رسوا تر است		زانکہ مُلّا مومنِ کافر گر است

لہٰذا، مردانِ مومن کہاں سے آئیں؟

والسّلام

آدم کی کہانی اقبالؒ کی زبانی

یومِ اقبالؒ ۱۹۵۴ء کی تقریر

اسلام سے پہلے تمام مذاہب میں تصوّر یہ تھا کہ دنیا ایک جیل خانہ ہے جس میں انسان ایک بے کس و مجبور قیدی کی طرح زندگی کے دن کاٹ رہا ہے۔ ہندوؤں کا عقیدہ یہ تھا کہ انسان اپنے پچھلے جنم کے گناہوں کی سزا بھگتنے کے لئے دنیا میں پابندِ سلاسل ہے۔ عیسائیوں کا عقیدہ تھا کہ ابنِ آدم اپنے اولیں ماں باپ، آدم و حوّا کے گناہ کی پاداش میں ماخوذ ہے۔ بدھ مت کے نزدیک انسان کی مصیبتوں کا راز اس کی آرزوؤں میں تھا اور اس مصیبت سے چھٹکارے کا علاج ترکِ آرزو۔ ویدانت کی رُو سے انسان کی ہستی ہی ایک فریبِ تصوّر اور عالم تمام حلقۂ دامِ خیال تھا۔ قرآن آیا اور اس نے سب سے پہلے یہ اعلان کیا کہ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ (۱۷/۷۰) ہم نے ابنِ آدم کو واجب التکریم بنایا ہے۔ یہ مسجودِ ملائک اور مخدومِ خلائق ہے۔ کائنات کی پستیاں اور بلندیاں اس کے لئے مسخّر کر دی گئی ہیں۔ یہ شاہکارِ فطرت ہے۔ اس کی تخلیق احسنِ تقویم کی مظہر ہے۔ اس کے مدارج بڑے بلند اور اس کے مناصب بڑے رفیع الشان ہیں۔

اقبالؒ چونکہ قرآن کا ترجمان ہے اس لئے اس کے کلام میں مقامِ آدم کو ایک خاص حیثیت حاصل ہے۔ آپ حضرت علامہؒ کی کسی کتاب کو اٹھا کر دیکھئے، یہاں سے وہاں تک آدم کے احوال

ظروف کا تذکرہ ملے گا۔ کلامِ اقبالؒ میں آدم کی یہ سرگذشت اس قدر پھیلی ہوئی ہے کہ اس سے ایک مستقل کتاب مرتب ہوسکتی ہے۔ اس کے لئے تو بڑی فرصت درکار ہے۔ سردست کچھ اُبھرے ہوئے عنوانات ہیں جن سے اس طویل و عریض داستان کے کچھ گوشے آپ کے سامنے لانے کی کوشش کی جائے گی۔ یہ سرگذشت حسبِ ذیل ابواب پر مشتمل ہے۔

(۱) تخلیقِ کائنات۔
(۲) پیدائشِ آدم۔
(۳) ہبوطِ آدم۔
(۴) آدم کی نیند۔ اور
(۵) اس کی بیداری۔

علاوہ قلتِ وقت کے، میری بڑی دشواری یہ ہے کہ حضرت علامہؒ کے کلام کا بیشتر حصہ فارسی میں ہے اور اس قسم کی مخلوط محفلوں میں اُردو کے اشعار ہی زیادہ موزوں رہتے ہیں۔ لہٰذا، مجھے بھی زیادہ تر انحصار ان کے اُردو کلام پر ہی کرنا پڑے گا اور فارسی اشعار صرف وہاں پیش کروں گا جہاں اس کے بغیر چارہ نہ ہو۔

اب سنئے سرگذشتِ آدم۔ یعنی اپنی اور میری سرگزشت۔

پہلا عنوان تخلیقِ کائنات

ذرا تصور میں لایئے اس منظر کو کہ اس کائنات کی کوئی شے وجود میں نہیں آئی تھی۔ نہ زمین نہ آسمان۔ نہ چاند نہ ستارے۔ نہ شجر تھے نہ حجر۔ نہ صحرا تھے نہ سمندر۔ نہ حیوان تھے نہ انسان۔ ایک خدا کی ذات تھی اور باقی سب ہُو کا عالم۔ ظاہر ہے کہ ایسی سنسان حالت کب تک رہ سکتی تھی؟ ہر تصور اپنی نمود کے لئے بیتاب ہوتا ہے۔ ہر حقیقت، لباسِ مجاز میں آنے کے لئے پیکرِ اضطراب ہوتی ہے۔ ہر نقش اپنے اُبھرنے کے لئے پیچ و تاب کھاتا ہے۔ ہر جلوہ اپنے نکھرنے کے لئے برق درآغوش ہوتا ہے۔ ہر سبز پوش سرِ بام آنے کے لئے سیماب پا ہوتا ہے۔ یعنی ہر قوتِ خاموش ذوقِ نمود و لذتِ تخلیق سے عمل بیدار بننے کے لئے ہمہ تن شوق ہوتی ہے۔ شانِ الوہیت کی اسی لذتِ تخلیق اور ذوقِ نمود نے

انگڑائی لی۔ خطیرۂ قدس کی ملکوتی فضا میں ہلکا سا تموج پیدا ہوا۔ عدم کے پردے اٹھے اور افق کے اس پار نگارخانۂ کائنات خاموشی سے ابھرنا شروع ہوا۔ یہ دن کارکنانِ قضا و قدر کی زندگی میں بڑی گہما گہمی کا دن اور یہ ساعت مدبرانِ امورِ الٰہیہ کے اوقات میں بڑی ہمہ ہمی کی ساعت تھی۔ یعنی وہ وقت جب کیفیت یہ تھی کہ:-

سہانی نمودِ جہاں کی گھڑی تھی　　تبسم فشاں زندگی کی کلی تھی
کہیں مہر کو تاجِ زر مل رہا تھا　　عطا چاند کو چاندنی ہو رہی تھی
سیہ پیرہن شام کو دے رہے تھے　　ستاروں کو تعلیمِ تابندگی تھی
فرشتے سکھاتے تھے شبنم کو رونا　　ہنسی گل کو پہلے پہل آ رہی تھی

ہیولائے کائنات ابھرنے کو تو ابھرا لیکن بڑا بے کیف اور بہت بے رنگ۔ سورج اپنی نور افشانیوں اور حرارت سامانیوں کو لئے لئے سارا دن پھرتا رہتا لیکن نہ اسے کوئی آنکھ ایسی ملتی جو اس کی روشنی کی داد دیتی نہ کوئی سینہ ایسا ملتا جو اس کی تپش کو اپنی متاعِ سوز بناتے۔ چاند اپنے بلوریں ساغر میں مئے نور بھرے رات بھر محوِ تلاش رہتا لیکن اسے کوئی ایسا رندِ مست نہ ملتا جو اس آتشِ خنک کے جامِ مرمریں کو لپک کر اٹھا لے۔ ستارے سرِ شام نقاب الٹ الٹ کر سرگرمِ تماشا ہو جاتے لیکن کوئی نگہ نظارہ باز ایسی نہ ملتی جو ان کی چلمنی مسکراہٹوں سے آنکھ مچولی کھیلتی۔ لالہ اپنا سینۂ شق کئے دن بھر کسی کے انتظار میں چاروں طرف آنکھیں اٹھا اٹھا کر دیکھتا اور شام کو یاس و ناامیدی سے لڑکھڑا کر گر پڑتا۔ صحنِ چمن میں پھول خود ہی کھلتے اور تھوڑی دیر مسکرا کر خود ہی مرجھا جاتے۔ یعنی یہ وہ زمانہ تھا جب

عروسِ شب کی زلفیں تھیں ابھی ناآشنا خم سے　　ستارے آسماں کے بے خبر تھے لذتِ رم سے
قمر اپنے لباسِ نو میں بیگانہ سا لگتا تھا　　نہ تھا واقف ابھی گردش کے آئینِ مسلم سے
ابھی امکاں کے ظلمت خانے سے ابھری تھی دنیا
مذاقِ زندگی پوشیدہ تھا پہنائے عالم سے

کائنات کی اس تنہائی اور غمگینی، اس بے نوری اور بے سوزی، اس بے کیفی اور بے رنگی پر نقش طرازِ ازل کا جی بھر آیا۔ اس کے پاس سامانِ سوز و ساز کی کمی نہ تھی۔ صرف ایک ترکیبِ نو کی ضرورت

تھی۔ اس نے فرشتۂ میر سامان کی طرف دیکھا۔ وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ پاکر تعظیم کے لئے جھکا اور سبُّوحٌ قدوسٌ کی بے صوت صداؤں میں تعمیلِ ارشاد کے لئے روانہ ہوا۔ اس نے

چمک تارے سے مانگی چاند سے داغِ جگر مانگا ۔۔۔ اڑائی تیرگی تھوڑی سی شب کی زلفِ برہم سے
تڑپ بجلی سے پائی حور سے پاکیزگی پائی ۔۔۔ حرارت لی نفسہائے مسیحِ ابنِ مریم سے

ذرا سی پھر ربوبیت سے شانِ بے نیازی لی!
ملک سے عاجزی' افتادگی تقدیرِ شبنم سے

اور ان اجزا سے ایک مرکب تیار کیا۔ پھر اس میں کچھ آگ کی چنگاریاں بھریں اور اس پر خون کے چھینٹے دیئے۔ تسبیح بدست فرشتے چیکے ہی چیکے اس پیکرِ آب و گل کو دیکھتے جو ایسے متضاد عناصر سے ترکیب پا رہا تھا۔ وہ آج تک ہر عنصر کو الگ الگ دیکھنے کے عادی تھے۔ پانی کو پانی۔ آگ کو آگ۔ اس لئے ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ آگ اور پانی۔ روشنی اور تاریکی۔ محبت اور عداوت۔ زہر اور تریاق۔ صلح اور فساد کا مجموعہ بالآخر بنے گا کیا؟ ہزار ہا سال کی گردشوں کے بعد اس مشتِ خاک نے ایک متعیّن صورت اختیار کی۔ بکھری ہوئی شوخیاں سمٹ کر بجلیاں بن گئیں۔ زمین کانپی۔ آسمان تھرتھرایا۔ چاند کا ساغرِ زریں چھلک گیا۔ ستاروں کے نغمے سے دل دہل گئے۔ فضا میں اک شور اٹھا اور

نعرہ زد عشق کہ خونیں جگرے پیدا شُد ۔۔۔ حسن لرزید کہ صاحب نظرے پیدا شُد
فطرت آشفت کہ از خاکِ جہانِ مجبور ۔۔۔ خودگرے خودشکنے' خودنگرے پیدا شُد
خبرے رفت زگردوں بہ شبستانِ ازل ۔۔۔ حذر اے پردگیاں' پردہ درے پیدا شُد
آرزو بے خبر از خویش بآغوشِ حیات ۔۔۔ چشم وا کرد و جہانِ دگرے پیدا شُد

زندگی گفت کہ در خاک تپیدم ہمہ عمر
تا ازیں گنبدِ دیرینہ درے پیدا شُد

اقبالؒ کی فارسی نظموں کا اُردو میں ترجمہ بہت مشکل ہے۔ ترجمہ میں یوں بھی اصل کی رُوح نکل جاتی ہے۔ لیکن اس نظم کا ترجمہ علامہ اسلم جیراجپوریؒ نے کیا تھا۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ ان اشعار کو اُردو داں طبقہ کو سمجھانے کے لئے اس سے زیادہ موزوں الفاظ ملنے مشکل ہیں۔ وہ ترجمہ یہ ہے:۔

عشق چیخ اٹھا کہ اک خوں میں جگر پیدا ہوا حسن کانپ اٹھا کہ اک صاحب نظر پیدا ہوا
فطرت آشفتہ کہ خاکِ عالمِ مجبور سے اک خود گر، خود شکن اور خود نگر پیدا ہوا
پہنچی گردوں سے شبستانِ ازل میں یہ خبر پردہ دارو! ہوشیار اک پردہ در پیدا ہوا
آرزو تھی زندگی کی گود میں سوئی ہوئی آنکھ کھولی اک جہانِ خیر و شر پیدا ہوا

زندگی بولی کہ تھی میں آب و گل میں مضطرب
بارے آج اس گنبدِ بے در میں در پیدا ہوا

علامہ اسلمؒ نے ان اشعار کے ترجمہ کے بعد کچھ اپنی طرف سے اضافہ بھی فرمایا ہے. ارشاد ہے۔

مسکرا کر یہ ملائک سے کہا ابلیس نے لو تمہارا اک حریفِ تازہ تر پیدا ہوا
چرخ سے آئی ندا اے ساکنانِ بحر و بر اک جہاں آشوب، ظالم، فتنہ گر پیدا ہوا
جس کی خاطر یہ زمین و آسماں چکر میں تھے مادرِ فطرت کا وہ نورِ نظر پیدا ہوا

تھا فضائے عالمِ ناسوت کا بربط خموش
آخر اس سازِ کہن کا زخمہ ور پیدا ہوا

فرشتے اس پیکرِ خاکی کو دیکھ کر محوِ حیرت تھے کہ بالآخر اس میں وہ کون سی خصوصیت ہے جس کی بنا پر اسے تمام کائنات میں سب سے اونچے مقام پر بٹھایا جا رہا ہے. خلاّق فطرت نے ان کا استعجاب دور کرنے کے لئے آدم کو باغ جناں میں بھیج دیا جہاں ہر شے ایک خاص انداز سے رکھی گئی تھی اور کسی کو مجال نہ تھی کہ اس میں ذرا سی بھی تبدیلی پیدا کر سکے. آدم نے صحنِ چمن پر ایک تیرتی ہوئی نگاہ ڈالی اسے اس کی ترتیب کچھ پسند نہ آئی. اس نے اپنے دل میں کہا کہ یہ پیڑ وہاں ہونا چاہیئے. وہ روش یوں ہونی چاہیئے. اس پھول کا رنگ ایسا ہونا چاہیئے. اس پھل کے ذائقے میں یہ تبدیلی ہونی چاہیئے. وہ ابھی ان تبدیلیوں کا خیال ہی کر رہا تھا کہ جانبِ عرشِ عظیم سے آواز آئی کہ آدم! ہماری دی ہوئی ترتیب میں کوئی تبدیلی نہیں ہونی چاہیئے. آدم نے سر اٹھایا اور نہایت تمکنت سے کہا کہ معاف فرمایئے! جس جگہ مجھے رہنا ہے اس کی ترتیب میری پسند کے مطابق ہونی چاہیئے۔

گفت یزداں کہ چنیں است و چنیں خواہد بود
گفت آدم کہ چنیں ہست و چناں خواہد بود

آدم کے اس جواب پر صحنِ چمن سے دُور ایک طرف سے بلند قہقہے کی آواز اٹھی جس میں ابلیسانہ سرکشی کی گرج سی محسوس ہو رہی تھی۔ فضائے چمن پر سناٹا چھا گیا۔ معصوم فرشتے سہم کر کونوں گوشوں میں جا چھپے۔ ہر شے اپنی اپنی جگہ ساکت و صامت انگشت بدنداں کھڑی ہو گئی۔ اس سکوت کو ایک دلکش آواز نے یہ کہتے ہوئے توڑا کہ یہی وہ اختیار ُ ارادہ کی قوت ہے جو آدم کی سرفرازی و سربلندی کا موجب ہے۔ اسی سے یہ مسجودِ ملائک اور مخدومِ خلائق ہے۔ کشمکشِ حیات میں پُرکیف جاذبیتیں ہیں تو اسی سے اور کشاکشِ زندگی میں رنگیں کیفیتیں ہیں تو اسی کے دم سے۔ بربطِ ہستی کے خوابیدہ نغمے بیدار ہوتے ہیں تو اسی کے مضراب سے اور مینائے حیات کے سادہ پانی میں کیفِ رنگ و تعطر کی ارغوانی موجیں اٹھتی ہیں تو اسی کے جوش سے۔ تم کائنات کی دوسری چیزوں پر غور کرو اور پھر انسان کی اس خصوصیتِ کبریٰ کو دیکھو۔ بات سمجھ میں آجائے گی کہ ان میں اور انسان میں کیا فرق ہے۔

منظر چمنستان کے زیبا ہوں کہ نازیبا — محرومِ عمل نرگس مجبورِ تماشا ہے
رفتار کی لذت کا احساس نہیں اس کو — فطرت ہی صنوبر کی محرومِ تمنا ہے
تسلیم کی خوگر ہے جو چیز ہے دنیا میں — انسان کی ہر قوت سرگرمِ تقاضا ہے
اس ذرّہ کو رہتی ہے وسعت کی ہوس ہر دم — یہ ذرّہ نہیں شاید سمٹا ہوا صحرا ہے

چاہے تو بدل ڈالے ہیئت چمنستاں کی
یہ ہستیٔ دانا ہے، بینا ہے، توانا ہے

اب فرشتوں کو معلوم ہوا کہ اس پیکرِ آب و گل میں وہ کون سی قوتیں خوابیدہ ہیں جن کی بنا پر اسے کائنات میں یہ مقام عطا ہوا ہے۔ اس احساس سے ان کی نگاہیں تعظیم کے لئے جھک گئیں۔ آدم نے تبسم فشاں نظروں سے ان کی طرف دیکھا اور کہا کہ اب مجھے اس دنیا میں جانا چاہیئے جسے میں اپنے نقشے کے مطابق ترتیب دے سکوں۔ آدم خراماں خراماں نیچے اُترا۔ اس کے جلو میں قطار در قطار فرشتے اسے رُخصت کرنے کے لئے ساتھ تھے۔ وہ نسیمِ سحر کی طرح آہستہ آہستہ ساتھ آ رہے تھے اور اپنی نور پاش بے صوت صداؤں سے یہ نغمۂ تبریک و تہنیت گا رہے تھے کہ

عطا ہوئی ہے تجھے روز و شب کی بیتابی — خبر نہیں کہ تو خاکی ہے یا کہ سیمابی
سُنا ہے خاک سے تیری نمود ہے لیکن — تری سرشت میں ہے کوکبی و مہتابی

جمال اپنا اگر خواب میں بھی تو دیکھے ہزار ہوش سے خوشتر تری شکر خوابی
گراں بہا ہے ترا گریۂ سحر گاہی اسی سے ہے ترے نخلِ کہن کی شادابی
تری نوا سے ہے بے پردہ زندگی کا ضمیر
کہ تیرے ساز کی فطرت نے کی ہے مضرابی

یہ خسروانہ جلوس، بایں شوکت وسطوت جانبِ فلک سے سوئے زمین آیا۔ خاک کے ذرّے آنکھیں ملتے ہوئے اٹھے۔ سبزۂ خوابیدہ جوشِ نمود سے بیدار ہوا۔ غنچے چٹکے، پھول کھلے، چاندنی مسکرائی۔ سینۂ بحر سے بیتاب موجیں اُبھر اُبھر کر دیکھنے لگیں۔ عروسِ فطرت نے اپنے حسین چہرے سے نقاب اُلٹی اور رُوحِ ارضی، اس تمام سامانِ رنگ وچنگ اور جہانِ شوخ وشنگ کو ساتھ لئے استقبال کے لئے آگے بڑھی۔ بربطِ ہستی کے خاموش تاروں میں ارتعاش پیدا ہوا اور سازِ فطرت کی ہم آہنگی سے رُوحِ ارضی نے یہ کہتے ہوئے آدم کی طرف اپنا ہاتھ بڑھایا کہ:۔

کھول آنکھ، زمیں دیکھ، فلک دیکھ، فضا دیکھ مشرق سے اُبھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ
اس جلوۂ بے پردہ کو پردوں میں چھپا دیکھ ایامِ جدائی کے ستم دیکھ جفا دیکھ
بے تاب نہ ہو معرکۂ بیم و رجا دیکھ
ہیں تیرے تصرف میں یہ بادل یہ گھٹائیں یہ گنبدِ افلاک یہ خاموش فضائیں
یہ کوہ یہ صحرا یہ سمندر یہ ہوائیں تھیں پیشِ نظر کل تو فرشتوں کی ادائیں
آئینۂ ایام میں آج اپنی ادا دیکھ
خورشیدِ جہاں تاب کی ضَو تیرے شرر میں آباد ہے اِک تازہ جہاں تیرے ہنر میں
جچتے نہیں بخشے ہوئے فردوس نظر میں جنت تری پنہاں ہے ترے خونِ جگر میں
اے پیکرِ گِل کوششِ پیہم کی جزا دیکھ

آدم نے اس کرۂ ارضی کا جائزہ لیا تو دیکھا کہ یہ ایک مٹی کا گھروندا ہے جس کا نہ کوئی متعین نقشہ ہے نہ ترتیب۔ سر پر آگ برسانے والا آتشیں گولہ۔ چاروں طرف بڑے بڑے پہاڑ۔ اِدھر اُدھر ساحل ناآشنا سمندر اور اس کی مہیب طغیانیاں۔ ڈراؤنے جنگل اور ان میں بڑے بڑے خطرناک درندے اور اژدہے۔ چاروں طرف خوفناک بلاؤں کا ہجوم اور ان میں نہتا ابنِ آدم، بے کس و

بے بس اور بے یار و مددگار۔ شروع شروع میں ان لرزہ انگیز بلاؤں نے اسے دبانا چاہا لیکن اس کے بعد اس کی مضمر قوتوں نے بیدار ہونا شروع کیا۔ اس نے پہاڑوں کے جگر شق کر دیئے۔ سمندر کے سینہ پر کشتیاں چلا دیں۔ بڑے بڑے مہیب طوفانوں کا مقابلہ کرنے کے لئے آہنی دیواریں کھڑی کر دیں، دریاؤں کے رُخ بدل دیئے۔ ہواؤں کی سمتیں تبدیل کر دیں۔ آسمان کی بجلیاں مقید کر لیں۔ غرضیکہ اس زمین کا پورے کا پورا نقشہ بدل دیا۔ نہ وہ انداز رہے نہ وہ ترتیب، نہ وہ رنگ رہا نہ وہ ڈھنگ۔ اس نے فطرت کی ہر شے کو اپنے مطلب کے مطابق متشکل کر لیا۔ اس شکست و ریخت اور حرب و ضرب کو دیکھ کر ایک دن اللہ میاں نے اس سے کہا کہ تو نے یہ کیا کر دیا؟

جہاں را زیک آب و گل آفریدم — تو ایران و تاتار و زنگ آفریدی
من از خاک پولادِ ناب آفریدم — تو شمشیر و تیر و تفنگ آفریدی
تبر آفریدی نہالِ چمن را — قفس ساختی طائرِ نغمہ زن را

آدم نے یہ سُن کر کلہاڑا ایک طرف رکھ دیا اور کہا کہ گستاخی معاف! ذرا اپنی اور میری تخلیق پر غور تو کیجئے۔

تو شب آفریدی چراغ آفریدم — سفال آفریدی ایاغ آفریدم
بیابان و کہسار و راغ آفریدی — خیابان و گلزار و باغ آفریدم
من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم — من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

ذرا اس مخلوق کو سامنے لایئے جسے تسبیح و تقدیس سے فرصت نہیں اور اس کے بعد یہ دیکھئے کہ میں نے اس دنیا کو کیا سے کیا بنا دیا ہے؟

قصور وار غریب الدّیار ہوں لیکن — ترا خرابہ فرشتے نہ کر سکے آباد
مری جفا طلبی کو دعائیں دیتا ہے — وہ دشتِ سادہ وہ تیرا جہانِ بے بنیاد
مقامِ شوق ترے قدسیوں کے بس کا نہیں — انہیں کا کام ہے یہ جن کے حوصلے ہیں زیاد

یہ تبدیلیاں تو وہ ہیں جو صرف مٹی اور پانی کی دنیا میں میرے ہاتھوں نمودار ہوئی ہیں لیکن ان سے کہیں اہم ہیں وہ نقوش و آثار جو دنیائے فکر و جہانِ تصوّرات میں میری کاہش و کاوش سے صورت پذیر ہوتے ہیں۔

میری نوائے شوق سے شور حریمِ ذات میں — غلغلہ ہائے الاماں بتکدۂ صفات میں
حور و فرشتہ ہیں اسیر میرے تخیّلات میں — میری نگاہ سے خلل تیری تجلّیات میں
گاہ میری نگاہِ تیز چیر گئی دلِ وجود — گاہ اُلجھ کے رہ گئی میرے توہمات میں

تو نے یہ کیا غضب کیا مجھ کو بھی فاش کر دیا
میں ہی تو ایک راز تھا سینۂ کائنات میں

آدم کے اس دعوٰی کی شہادت زمین کے ذرّے ذرّے نے دی. چاروں طرف پہاڑوں سے اس کی صدائے بازگشت نے فضا کو معمور کر دیا اور پستیوں اور بلندیوں سے یہ آواز آنے لگی کہ یہ بالکل درست ہے.

ہے گرمئ آدم سے ہنگامۂ عالم گرم
سورج بھی تماشائی تارے بھی تماشائی

دن گذرتے گئے. آدم اپنے ہنگاموں میں سرگرم عمل رہا. ایک دن اس کے دو بیٹے کھیت میں کام کر رہے تھے. ایک کی کسی بات پر دوسرے کو تاؤ آگیا. یہ تھا ذرا زور آور. اٹھا اور اسی کے تبر سے اس کا گلا کاٹ دیا. کھیت پر دُور دُور تک سُرخ خون کے چھینٹے بکھر گئے. اس نے اس سے پہلے کبھی سُرخ رنگ کے چھینٹے نہیں دیکھے تھے. وہ گھبرا گیا اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ کیا ہو گیا. وہ دیوانہ وار بھاگ کھڑا ہوا. اس نے اپنے پیچھے کسی کے پاؤں کی آہٹ سنی. مُڑ کر دیکھا تو اس کا بھائی اپنا سر ہتھیلی پر لئے اس کے پیچھے پیچھے بھاگے آ رہا تھا. اس منظر سے اس پر وحشت سی چھا گئی. یہ پہلا دن تھا کہ اسے ڈر معلوم ہوا. وہ جتنی تیزی سے بھاگتا اس کا بھائی اسی رفتار سے اس کا پیچھا کرتا. کام کرنے والے یہی دونوں بھائی تھے. دونوں اس افراتفری میں پڑ گئے. ایک کے پیچھے دوسرا. ایک ہاتھ میں کھلا ہوا خنجر، دوسرے کی ہتھیلی پر کٹا ہوا سر. زمین خون کے چھینٹوں سے لالہ زار. ان کی کھیتیاں اُجڑ گئیں. باغ ویران ہو گئے. مکان گر گئے. غاروں میں چھپے ہوئے درندے پھر باہر نکل آئے. پہاڑوں میں رُکے ہوئے طوفان دوبارہ اُمنڈ آئے. مسرّتوں کے چشمے سُوکھ گئے. شادابیوں کے پھُول مُرجھا گئے. صحنِ عالم قتل گاہ بن گیا. جس پتھر کو اٹھایا نیچے سے خون کا فوارہ اُبھر آیا. جس شاخ کو توڑا لہو کے قطرے ٹپکنے لگ گئے. دنیا کا ہر بناؤ بگاڑ میں اور ہر تعمیر تخریب

میں بدل گئی. آدم کی ان وحشت سامانیوں کو فرشتے تعجب کی نگاہوں سے دیکھتے اور آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے سے کچھ کہہ جاتے. مطلب صاف تھا کہ یہی ہے وہ اشرف المخلوقات، صدرِ بزمِ کائنات، گلِ سرسبدِ ممکنات جس کے سامنے جھکنے کے لئے ہمیں کہا گیا تھا! رفتہ رفتہ یہ باتیں اشاروں کنایوں سے گذر کر زبانوں تک آنے لگیں. اب بساطِ کائنات کے ہر گوشے میں یہی چرچا تھا. کارکنانِ قضا وقدر کی محفلوں میں ہر ایک ہی زبان پر یہی تذکرہ تھا. جو ان میں ذرا دیدہ ور تھے وہ کبھی کبھی یہ کہہ دیتے کہ آدم کا یہ جنوں عارضی ہے. اس کی یہ گراوٹ وقتی ہے. ہمیں یقین ہے کہ

گرچہ ابھی ہوئی تقدیر کے پیچاک میں ہے — توڑ ڈالے گی یہی خاک طلسمِ شب و روز

فرشتے یہ سُنکر سر ہلا دیتے. وہ درحقیقت آدم کی اس بربادی کو اپنی فتح سمجھتے تھے. اگرچہ وہ اس حرف کو زبان تک نہیں لا سکتے تھے. لیکن وہ خلّاقِ فطرت سے کہنا یہی چاہتے تھے کہ "کیوں! ہم نہ کہتے تھے؟" ان کی اس سادہ لوحی کا طلسم کبھی کبھی اس قسم کی آواز توڑ دیتی ہے کہ یہ تمہاری خام خیالی ہے. ایاز! قدرِ خود بشناس!

کجا خاکے کہ در آغوش دارد آسمانے را — کجا نورے کہ غیر از قاصدی چیزے نمی داند

یعنی

گرچہ کفِ خاک کی حد ہے سپہر کبود — عرشِ معلّٰی سے کم سینۂ آدم نہیں

اس کو میسّر نہیں سوز و گدازِ سجود — پیکرِ نوری کو ہے سجدہ میسّر تو کیا

بہرحال بزمِ پردگیانِ راز میں صبح و شام اس قسم کے چرچے رہتے. طعنے دینے والے طنز آمیز لہجے میں اور غمگساری کرنے والے ہمدردانہ انداز میں اس قسم کی باتیں کرتے کہ

وہ مشتِ خاک ابھی آوارگانِ راہ میں ہے — مہ و ستارہ سے آگے مقام ہے جس کا

ابنِ آدم بھی یہ سب کچھ سنتا لیکن اس کی سمجھ میں کچھ نہ آتا کہ کیا کرے. وہ ہزار چاہتا کہ اپنے خنجر کو اٹھا کر کہیں دُور پھینک دے اور کسی طرح بھائی کا کٹا ہوا سر پھر سے اس کی گردن کے ساتھ جوڑ دے لیکن وہ نہ یہ کر سکتا نہ وہ. اب اس پر مایوسی چھانے لگی. وہ اپنے مستقبل سے ناامید ہونے لگا. وہ ایک چٹان پر بیٹھ گیا. خاسر و نامراد، شرمندہ اور ناکام. ہتھیلی پر سر رکھ کر گہری سوچ میں ڈوب گیا اور اسی حالت میں سو گیا. آدم ہزاروں سال اسی طرح سویا رہا. سورج حسبِ معمول اس

کے دن کو روشن کرتا اور شام کو اسے سوتا چھوڑ کر اپنا چکر پورا کرنے چلا جاتا۔ چاند حسبِ دستور اپنی منزلیں پوری کرتا۔ لیکن آدم میں بیداری کے کوئی آثار نہ دیکھتا۔ فرشتوں سے اب نہ رہا گیا۔ انہوں نے جرأت کر کے بحضور رب العزت عرض کر ہی دیا کہ

عقل ہے بے زمام ابھی عشق ہے بے مقام ابھی
نقش گرِ ازل! ترا نقش ہے ناتمام ابھی
خلقِ خدا کی گھات میں رند و فقیہہ و میر و پیر
تیرے جہاں میں ہے وہی گردشِ صبح و شام ابھی
تیرے امیر مال مست تیرے فقیر حال مست
بندہ ہے کوچہ گرد ابھی خواجہ بلند بام ابھی
دانش و دین و علم و فن بندگیٔ ہوس تمام
عشقِ گرہ کشائے کا فیض نہیں ہے عام ابھی
جوہرِ زندگی ہے عشق جوہرِ عشق ہے خودی
آہ کہ ہے یہ تیغِ تیز پردگیٔ نیام ابھی

فرشتوں کو اس کا جواب سوائے ایک حسین تبسم کے اور کچھ نہ ملا۔ ایک دن جبریل کو ابلیس سرِ راہے مل گیا۔ اس نے اس سے کہا کہ ہمدمِ دیرینہ! یہ آدم کا معمہ کیا ہے۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔ اگر تم اس راز کو پا سکے ہو تو ذرا ہمیں بھی بتا دو۔ ابلیس مسکرایا اور کہا کہ

یکے در معنیٔ آدم نگر، از من چہ می پرسی
ہنوز اندر طبیعت می خلد موزوں شود روزے
چناں موزوں شود ایں پیش پا افتادہ مضمونے
کہ یزداں را دل از تاثیرِ اُو پرخوں شود روزے

بہرحال، زمانہ اسی طرح آگے بڑھتا گیا اور آدم خواب سے بیدار نہ ہوا۔ تا آنکہ

بیداری۔ آسمان پر کانفرنس

اِک رات ستاروں نے کہا نجمِ سحر سے
آدم کو بھی دیکھا ہے کسی نے کبھی بیدار
کہنے لگا مریخ ادا فہم ہے تقدیر
ہے نیند ہی اس چھوٹے سے فتنے کو سزاوار
زہرہ نے کہا اور کوئی بات نہیں ہے
اس کرمکِ شب کور سے کیا ہم کو سروکار
بولا مہِ کامل کہ وہ کوکب ہے زمینی
تم شب کو نمودار ہو وہ دن کو نمودار
واقف ہو اگر لذتِ بیداریٔ شب سے
اونچی ہے ثریا سے بھی یہ خاکِ پُراسرار
آغوش میں اس کی وہ تجلی ہے کہ جس میں
کھو جائیں گے افلاک کے سب ثابت و سیار

ناگاہ فضا بانگِ اذاں سے ہوئی لبریز
وہ نعرہ کہ ہل جاتا ہے جس سے دلِ کہسار

اذان کی آواز پہاڑوں سے ٹکرائی اور ساری وادی اس ولولہ انگیز نعرے سے گونج اٹھی کہ

برخیز کہ آدم را ہنگامِ نمود آمد — ایں مشتِ غبارے را انجم بہ سجود آمد

آدم نے ہزاروں سال کے بعد آنکھ کھولی۔ اس کے جاگنے سے سارا عالم جاگ اُٹھا۔ اس نے اپنے گرد و پیش نظر دوڑائی۔ جس دنیا میں وہ سویا تھا وہ دنیا کبھی کی ختم ہو چکی تھی۔ اب وہ ایک نئی دنیا میں تھا۔ روحِ کائنات ایک بار پھر بے نقاب ہو کر اس کے سامنے آئی۔ اس نے پوچھا کہ یہ آواز کیا تھی، کہاں سے آئی اور کس نے دی؟ اس نے کہا کہ یہ آواز خاکِ پاکِ حجاز سے اٹھی۔ بلالؓ کے حلق سے نمودار ہوئی اور ساری دنیا کو یہ کہہ گئی کہ

خودی کا سرِ نہاں لا الٰہ الّا اللہ — خودی ہے تیغِ فساں لا الٰہ الّا اللہ
یہ مال و دولتِ دنیا یہ رشتہ و پیوند — بُتانِ وہم و گماں لا الٰہ الّا اللہ
یہ نغمہ فصلِ گل و لالہ کا نہیں پابند
بہار ہو کہ خزاں لا الٰہ الّا اللہ

اس آواز کو اذان کہتے ہیں۔ یعنی وحدتِ خالق اور وحدتِ آدم کا نعرۂ انقلاب۔ وہی اذان جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ

یہ سحر جو کبھی فردا ہے کبھی ہے امروز — نہیں معلوم کہ ہوتی ہے کہاں سے پیدا!
وہ سحر جس سے لرزتا ہے شبستانِ وجود — ہوتی ہے بندۂ مومن کی اذاں سے پیدا

یہی اذان ہے جو تمہاری بیداری کا موجب ہوئی ہے۔ اگر یہ اذان بلند نہ ہوتی تو آدم کبھی خواب سے بیدار نہ ہو سکتا۔ اب تو اٹھ اور پھر اپنا مقام پہچان۔

تو مردِ میداں تو میرِ لشکر — نُوری حضوری تیرے سپاہی
کچھ قدر اپنی تو نے نہ جانی — یہ بے سوادی یہ کم نگاہی

تو نے اذان کے الفاظ کو سنا ہے۔ اس کی حقیقت کو بھی اچھی طرح سمجھ لے کہ

رہے گا تو ہی جہاں میں یگانہ و یکتا — اُتر گیا جو ترے دل میں لَاشَرِیْکَ لَہٗ

جس کے دل میں "لَا شَرِیْکَ لَہٗ" اُتر جائے اسے بندۂ مومن کہتے ہیں اور

مقامِ بندۂ مومن کا ہے وراۓ سپہر زمیں سے تا بہ ثریا تمام لات و منات
حریم ذات ہے اس کا نشیمنِ ابدی نہ تیرہ خاکِ لحد ہے نہ جلوہ گاہِ صفات

اس پیامِ زندگی سے آدم کے دل میں نئی آرزوئیں بیدار ہو گئیں۔ اس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی۔ اس کی مایوسیاں امیدوں سے بدل گئیں۔ دنیا اس کی نگاہوں میں پھر حسین نظر آنے لگی۔ وہ نئے ارادوں اور نئے ولولوں سے اٹھا اور ذوق و شوق کی ایک دنیا اپنے دل میں لئے اس سمت روانہ ہوا جدھر سے بانگِ اذان اس کے کان میں پڑی تھی، چلتے چلتے وہ حجاز کی وادیوں میں جا پہنچا۔ اس نے دیکھا کہ ایک وسیع و رفیع قلعہ ہے جس کے دروازے پر جلی حروف لکھا ہے۔

مَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا ؕ (۳/۹۷)

وہ دروازے پر ٹھٹکا کہ نہ معلوم اس حصارِ امن و عافیت میں داخلے پر کیا پابندیاں ہوں۔ پہرے دار نے کہا کہ اس میں داخل ہونے پر کوئی پابندی نہیں۔ صرف ایک شرط ہے اور وہ یہ کہ انسان کے پاس قلبِ سلیم ہونا چاہیئے۔ اور تمہارے خلوص اور تسلیم کی اس سے بڑھ کر دلیل اور کیا ہو گی کہ تم امن و سلامتی کی تلاش میں ہزاروں میل سے چل کر آئے ہو۔ اُدْخُلُوْهَا بِسَلٰمٍ اٰمِنِيْنَ ۞ وَ نَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ اِخْوَانًا (۱۵/۴۶-۴۷) اس میں امن و سلامتی کے ساتھ داخل ہو جاؤ۔ اس میں داخل ہونے والوں کے دلوں سے کدورت، کینہ، عداوت، باہمی کبیدگی کی تمام آلائشیں دور ہو جاتی ہیں اور وہ خلوصِ قلب سے ایک دوسرے کے بھائی بن جاتے ہیں۔

آدم کو کسی ایسے ہی مقام کی تلاش تھی۔ اس نے پہرہ دار کو سلام کیا اور شاداں و فرحاں قلعے کے اندر چلا گیا۔

وہ جانے کو تو اندر چلا گیا لیکن اسے یقین نہیں آتا تھا کہ یہ فی الواقعہ ایک ایسا مقام ہے جہاں کوئی انسان دوسرے انسان کا گلا نہیں کاٹتا۔ جہاں کوئی سر بریدہ اپنا سر ہتھیلی پر لئے جوشِ انتقام میں دیوانہ وار کسی کے پیچھے پیچھے نہیں پھرتا؟ وہ رہ رہ کر اپنے آپ سے پوچھتا کہ یہاں فی الواقعہ خوف اور حزن کو کوئی دخل نہیں؟ کیا یہاں پہنچ کر انسان سچ مچ زمین کی پستیوں سے آسمان کی بلندیوں کی طرف اُبھرنے لگ جاتا ہے؟ اس کے دل میں رہ رہ کر یہ خیالات پیدا ہو رہے

تھے۔ ان وساوس کے ہجوم نے اس کے پاؤں میں لڑکھڑاہٹ سی پیدا کردی۔ قریب تھا کہ وہ بیٹھ جائے یا پیچھے لوٹ آئے کہ اس نے سُنا کہ کہیں دُور افق کے اس پار سے یہ حیات آفریں آواز آرہی ہے کہ کیوں گھبراتا ہے، کیوں خوف کھاتا ہے۔

خدائے لم یزل کا دستِ قدرت تو زباں تو ہے   یقیں پیدا کر اے غافل مغلوبِ گماں تو ہے
پرے ہے چرخِ نیلی فام سے منزل مسلماں کی   ستارے جس کی گردِ راہ ہوں وہ کارواں تو ہے
تری فطرت امیں ہے ممکناتِ زندگانی کی
جہاں کے جوہرِ مضمر کا گویا امتحاں تو ہے

نہ معلوم اس آواز میں کیا سحر تھا کہ اس نے محسوس کیا کہ اس کے اندر ایک نئی دنیا بیدار ہو رہی ہے۔ اسے ایسا نظر آرہا تھا کہ جو کچھ وہ پہلے تھا وہ گم ہو رہا ہے اور اس کی جگہ ایک نیا آدم جنم لے رہا ہے وہ آدم کہ جس کی خاک کا ذرہ ذرہ اُبھر کر کہہ رہا ہے کہ

زمیں خاکِ درِ میخانۂ ما   فلک یک گردشِ پیمانۂ ما
حدیثِ سوز و سازِ ما دراز است   جہاں دیباچۂ افسانۂ ما

اس نئے آدم نے محسوس کیا کہ اس کے اندر عجیب و غریب قوتیں نمودار ہو رہی ہیں۔ اسے ایسا نظر آتا تھا کہ بحر و بر کی وسعتیں سمٹ کر اس کی مٹھی میں آگئی ہیں۔ پہاڑوں بلکہ آسمانوں کی بلندیاں نیچے اتر کر اس کے لئے فرشِ راہ بن گئی ہیں۔ وہ اب اپنے آپ کو ساری کائنات سے اونچا دیکھ رہا تھا۔ اسے یوں دکھائی دیتا تھا گویا وہ زمین کو چھوڑ کر فضا میں اڑتا چلا جا رہا ہے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ تبدیلیاں کس طرح پیدا ہو رہی ہیں۔ یہ انقلاب کس وجہ سے آرہا ہے۔ وہ اسی حیرت میں گم تھا کہ اس کے کان میں آواز آئی کہ اس میں حیرت و استعجاب کی کوئی بات نہیں حقیقت یہ ہے کہ

جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا
تو کر لیتا ہے یہ بال و پرِ روح الامیں پیدا

اس یقین سے اس کے جوہرِ خفتہ کی نمود ہو جاتی ہے۔ اسی سے اس کی خوابیدہ قوتیں بیدار ہوتی ہیں۔ یہ قوتیں زمان و مکان کے محدود پیمانوں سے نہیں ماپی جا سکتیں۔

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زورِ بازو کا
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

وہ حیران تھا کہ یہ آوازیں بار بار کہاں سے آتی ہیں جو اس کے دل میں پیدا ہونے والے ہر شبہ کا ازالہ کر کے اس کے اضطراب کو تسکین میں بدل دیتی ہیں۔ وہ تیزی سے قدم اٹھاتے اس سمت کو ہو لیا جدھر سے یہ آوازیں آ رہی تھیں۔ آگے بڑھا تو اس نے دیکھا کہ ایک وسیع و عریض میدان ہے۔ نہایت سرسبز و شاداب، سایہ دار گھنیرے درخت پھلوں سے لدے ہوئے، ٹھنڈے اور میٹھے پانی کے اُبلتے ہوئے چشمے اور ناچتی ہوئی ندیاں، ہرے بھرے کھیت اور ان کے اناج سے لدے ہوتے خوشے۔ ہر سمت تازگی اور ہر طرف شگفتگی۔ اس میدان میں اِدھر اُدھر تندرست و توانا انسانوں کے گروہ تھے۔ جن کے چہروں سے سکون و طمانیت کا نور برس رہا تھا۔ ہر شخص کام میں مصروف لیکن کسی کی کسی حرکت سے تکان یا افسردگی کا شائبہ تک نہیں پایا جاتا تھا۔ جونہی یہ آدمِ نو اس میدان میں داخل ہوا چاروں طرف سے سلاماً سلاماً کی طمانیت تہنیت سے فضا گونج اٹھی اور اس کے ساتھ ہی اس کے دل سے غیریت اور بیگانگی کے تمام حجابات دُور ہو گئے۔ اس نے ایسا محسوس کیا کہ وہ انہی میں سے ایک ہے اور یہ سب اس کے عمر بھر کے ساتھی ہیں۔ اتنے میں کھانے کا وقت آ گیا اور وہ سب ایک دسترخوان کے گرد بیٹھ گئے۔ نے کوئی فغفور و خاقاں نے فقیرِ رہ نشیں۔ کسی میں کوئی فرق اور کوئی تخصیص نہ تھی۔ اس نو وارد کے لئے یہ انداز بالکل نرالا اور یہ اسلوب غیر مانوس تھا۔ ان میں سے ایک نے اس کی حیرت کو بھانپ کر کہا کہ اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں؛

آب و نانِ ماست یک مائدہ　　دودۂ آدم کنفسِ واحدہ

یہاں ہر شخص کام کرتا ہے لیکن کام کے ماحصل کا کوئی مالک نہیں ہوتا۔

بندۂ مومن امیں، حق مالک است　　غیرِ حق ہر شے کہ بینی ہالک است

یہ باتیں تمہیں نئی نئی سی اس لئے دکھائی دیتی ہیں کہ تم ایک دوسری دنیا سے آئے ہو ورنہ یہ تو ایسی کھلی ہوئی حقیقت پر مبنی ہیں کہ ان کے سمجھنے میں ذرا بھی دقت نہیں ہو سکتی۔ تم حیران ہو کہ ہم زمین میں ہل چلاتے ہیں۔ سال بھر محنت کرتے ہیں اور اس کے بعد ساری فصل کو خدا کے بندوں کے لئے کھلا چھوڑ دیتے ہیں اور اپنے لئے صرف اپنی ضروریات کے مطابق رکھتے ہیں۔ تم ہماری محنت کو تو دیکھتے

ہو لیکن یہ بھی سوچو کہ

پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون؟ کون دریاؤں کی موجوں سے اٹھاتا ہے سحاب
کون لایا کھینچ کر پچھم سے بادِ سازگار خاک یہ کس کی ہے کس کا ہے یہ نورِ آفتاب
کس نے بھر دی موتیوں سے خوشۂ گندم کی جیب موسموں کو کس نے سکھلائی ہے خوئے انقلاب

جس نے یہ سب کچھ کیا ہے، ملکیت کا حق اس کا ہے یا تمہارا اور میرا؟ بس اتنا سا تل ہے جس کی اوٹ زندگی کا سارا پہاڑ کھڑا ہے۔ جو یہ سب کچھ کرتا ہے اس کا نام رازق ہے اور اتنی سی بات کے سمجھ لینے سے سارے مسئلے حل ہو جاتے ہیں۔

اپنے رازق کو نہ پہچانے تو محتاجِ ملوک
اور پہچانے تو ہیں تیرے گدا دارا و جم

ہماری دنیا میں حرام اور حلال کا یہی معیار ہے جو رزق اس معاشرے سے ملے جس میں انسان صرف امین ہوں وہ رزق حلال، اور جس میں رزق، انسانوں کی ملکیت قرار پا جائے اور اس طرح اس کی نسبت غیر اللہ کی طرف ہو جائے وہ رزق حرام۔ تم یہاں جس قدر قوت و توانائی اور طاقتِ پرواز و برومندی دیکھ رہے ہو سب رزقِ حلال کی بدولت ہے۔

علم و حکمت زاید از نانِ حلال عشق و رقت آید از نانِ حلال

اور اس نکتے کو یاد رکھو کہ

زندگی جز لذتِ پرواز نیست آشیاں با فطرتِ او ساز نیست

جب زندگی نام ہی لذتِ پرواز کا ہے تو اس بات کے سمجھنے میں کیا دشواری پیش آ سکتی ہے کہ

اے طائرِ لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

ہمارے معاشرے میں چونکہ ہر ایک کو رزقِ حلال ملتا ہے اس لئے کسی کی پرواز میں کوتاہی نہیں آ سکتی۔ اور اس کا راز یہ ہے کہ یہاں ہر فرد، دوسرے کی سود و بہبود کی فکر میں مصروفِ کار رہتا ہے۔ "سودِ خویش" کی جگہ "سودِ ہمہ" یہاں کے نظام کا عروۃ الوثقٰی ہے کیونکہ یہاں ہر فرد خدا کی صفتِ ربّ العالمینی کا مظہر ہے۔ ہماری ساری تعلیم کا ماحصل یہ ہے کہ

کس نباشد درجہاں محتاجِ کس نکتۂ شرعِ مبیں این است و بس

اس نووارد نے پوچھا کہ تم اپنے معاملات کس طرح طے کرتے ہو. یعنی یہاں حکومت کا انداز کیا ہے؟ حکومت کا لفظ سُن کر اس مخاطب کے لبوں پر مسکراہٹ آگئی۔ اس نے کہا کہ ہمارے ہاں حکومت کا تصور ہی نہیں. یہاں کوئی انسان کسی دوسرے انسان پر حکم نہیں چلا سکتا. ہمارا ایمان یہ ہے کہ

سروری زیبا فقط اس ذاتِ بےہمتا کو ہے حکمراں ہے اِک وہی باقی بتانِ آذری

ہمیں خدا کی طرف سے ایک کتاب ملی ہے جس میں نظامِ زندگی کے لئے محکم اور غیر متبدّل اصول درج ہیں. اس کا نام قرآن ہے — اس لفظ کے ساتھ ہی اس کی آنکھوں میں چمک اور چہرے پر تمتماہٹ آگئی. ایک ثانیہ کے لئے گہری سوچ میں ڈوب کر اس نے سر اوپر کو اٹھایا اور کہا کہ تم نہیں جانتے قرآن کیا ہے!

چیست قرآں؟ خواجہ را پیغامِ مرگ دستگیرِ بندۂ بے ساز و برگ
نقشِ قرآں تا دریں عالم نشست نقشہائے کاہن و پاپا شکست
فاش گویم آنچہ در دل مضمر است ایں کتابے نیست چیزے دیگر است
چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود جاں چو دیگر شد جہاں دیگر شود

اس ضابطۂ زندگی کے محکم اصولوں کی روشنی میں ہم اپنے معاملات علم و عقل کی رُو سے طے کرتے ہیں. اور ہم میں جو سب سے زیادہ صاحبِ فکر و عمل ہوتا ہے وہ ان فیصلوں کو جماعتی حیثیت سے نافذ کرتا ہے. نووارد نے پوچھا کہ اس صاحبِ فکر و عمل کو تم کیا کہتے ہو؟ اس نے جواب دیا کہ وہ ہمارے ہی جیسا ابنِ آدم ہوتا ہے. اسے ہم بندۂ حق کہتے ہیں اور

بندۂ حق بے نیاز از ہر مقام نَے غلام اُو را نہ اُو کس را غلام
بندۂ حق مردِ آزاد است و بس ملک و آئینش خدا داد است و بس
رسم و راہ و دین و آئینش ز حق زشت و خوب و تلخ و نوشینش ز حق

اس کا نام ہماری اصطلاح میں مردِ مومن ہے. وہ مردِ مومن جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان

قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت — یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان
ہمسایۂ جبریل امیں بندۂ خاکی — ہے اس کا نشیمن نہ بخارا نہ بدخشان
یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن — قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن
قدرت کے مقاصد کا عیار اس کے ارادے — دنیا میں بھی میزان قیامت میں بھی میزان
جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم — دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان

فطرت کا سرودِ ازلی اس کے شب و روز
آہنگ میں یکتا صفتِ سورۂ رحمٰن

خاک کے ذرّے اپنی ارتقائی منازل طے کرتے کرتے پیکرِ آدم تک پہنچے اور آدم اپنی ارتقائی منازل طے کرلے کے بعد مقامِ مومن تک پہنچتا ہے۔ اور

مومن کے جہاں کی حد نہیں ہے — مومن کا مقام ہر کہیں ہے

مومن، فطرت کا شاہکار اور دائرۂ کائنات کا نقطۂ پُرکار ہے۔ کائنات میں مومن کے مقام سے بلند اور کوئی مقام نہیں۔

مومنے بالاتے ہر بالاترے — غیرت او برنتابد ہمسرے

پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے سب اس کے لئے مسخر کردیا گیا ہے۔ کیا چاند تارے کیا مرغ و ماہی۔

عالم ہے فقط مومنِ جانباز کی میراث — مومن نہیں جو صاحبِ لولاک نہیں ہے

یہ مومن ہی ہے جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ

ہر اک مقام سے آگے مقام ہے تیرا — حیات ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں

لیکن اس کا ذوقِ سفر، ناقۂ بے زمام کی آوارگی نہیں کہ جدھر مُنہ اٹھا یا چل دیئے۔ اس کے سامنے زندگی کا متعین نصب العین ہے اور اس کا ہر قدم اس نصب العین کی طرف اٹھتا ہے۔ یہ نصب العین اس کا اپنا متعین کردہ نہیں بلکہ اس ضابطۂ حیات کی رُو سے متعین شدہ ہے جو اس کی زندگی کی اساس ہے۔ وہ فضا کی پہنائیوں میں پورے زورِ بازو سے اڑتا ہے لیکن اپنی منزلِ مقصود کو کبھی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونے دیتا۔

پرد در وسعتِ گردوں یگانہ — نگاہِ اُو بشاخِ آشیانہ

مہ و انجم گرفتارِ کمندش بدستِ اوست تقدیرِ زمانہ

قرآن کے محکم اصولوں کے ساتھ اس درجہ وابستگی اور اس کے بعد اپنے زمانے کے تقاضوں کا ساتھ دینے میں اس درجہ آزادی۔ یہ ہیں وہ عناصر جن سے اس کی سیرت مرتب ہوتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ

نہ اس میں عصرِ رواں کی حیا سے بیزاری نہ اس میں عہدِ کہن کے فسانہ و افسوں
حقائقِ ابدی پر اساس ہے اس کی یہ زندگی ہے نہیں ہے طلسمِ افلاطوں
عناصر اسکے ہیں رُوح القدس کا ذوقِ جمال عجم کا حسنِ طبیعت عرب کا سوزِ دروں

آدمِ نَو نے کہا کہ میں نے یہ سب کچھ سمجھ لیا۔ میں لفظاً لفظاً تم سے متفق ہوں کہ زندگی اسی کا نام ہے باقی سب وہم و تخیلات ہیں۔ میں اپنا ہاتھ بڑھاتا ہوں۔ مجھے اس حلقے میں شامل کر لیجئے۔ سننے والے نے کہا کہ ذرا اور سوچو۔

یہ شہادت گہِ الفت میں قدم رکھنا ہے لوگ آساں سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

اس نے کہا کہ میں نے اچھی طرح سمجھ لیا ہے کہ میں کیا کر رہا ہوں۔ میرا فیصلہ مشرق اور مغرب کے خلاف اعلانِ جنگ ہے۔ لیکن میں یہ اعلان عقل و ہوش اور قلب و نگاہ کی پوری تائید کے ساتھ کر رہا ہوں۔ اشھد ان لا الہ۔ اشھد ان لا الہ۔ سننے والے نے کہا کہ

لا الٰہ گوئی بگو از روئے جاں تا ز اندامِ تو آید بوئے جاں
ایں دو حرفِ لا الٰہ گفتار نیست لا الٰہ جز تیغِ بے زنہار نیست
زیستن با سوزِ او قہاری است لا الٰہ ضرب است و ضرب کاری است

اس نے کہا کہ میں نے یہ بھی سمجھ لیا۔ اب مجھے بتا دیجئے کہ مجھے کرنا کیا ہے؟ اس نے کہا کہ اس کا سمجھنا کیا مشکل ہے۔ جاؤ دنیا میں چلو پھرو اور جہاں جہاں انسان اور خدا کے درمیان کوئی قوت حائل نظر آئے۔ اسے درمیان سے ہٹا دو تاکہ بندہ اپنے خدا کو اپنے سامنے بے حجاب دیکھ لے اور زمین اپنے پرورش کرنے والے کے نور سے جگمگا اٹھے۔ تم دیکھو گے کہ

ابھی تک آدمی صیدِ زبونِ شہریاری ہے قیامت ہے کہ انساں نوعِ انساں کا شکاری ہے

جاؤ اور صورِ اسرافیل لے کر ساری دنیا میں اعلان کر دو کہ

سلطانیٔ جمہور کا آتا ہے زمانہ جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے مٹا دو

تم دیکھو گے کہ اللہ کے دیئے ہوئے رزق کے سرچشموں پر انسان سانپ کی طرح گھیرا ڈال کر بیٹھے ہیں۔ جاؤ اور انہیں نقیبِ فطرت کا یہ پیغام ازلی سنا دو کہ

تدبّر کی فسوں سازی سے محکم ہو نہیں سکتا جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہے

تم مکتبوں اور خانقاہوں میں دیکھو گے کہ

شہری ہو دہاتی ہو مسلمان ہے سادہ مانندِ بتاں پجتے ہیں کعبے کے برہمن
نذرانہ نہیں سود ہے پیرانِ حرم کا ہر خرقۂ سالوس کے اندر ہے مہاجن
میراث میں آئی ہے انہیں مسندِ ارشاد زاغوں کے تصرف میں عقابوں کے نشیمن

یہ فریب کب تک قائم رہے گا۔ جاؤ اور انسانوں کے ان خود ساختہ پردوں کو الگ اٹھا کر پھینک دو۔

کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے پیرانِ کلیسا کو کلیسا سے اٹھا دو
حق را بسجودے صنماں را بطوافے بہتر ہے چراغِ حرم و دیر بجھا دو

جاؤ اور ان تک خدا کا یہ پیغام پہنچاؤ کہ

میں ناخوش و بیزار ہوں مرمر کی سلوں سے میرے لئے مٹی کا حرم اور بنا دو

تم دیکھو گے کہ۔ ہوس نے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے نوعِ انساں کو۔ آدمی کی تعظیم آدمی کی حیثیت سے کہیں باقی نہیں رہی۔ کہیں اس کی عزت، دولت کی وجہ سے ہوتی ہے کہیں جاہ و منصب کی وجہ سے۔ کہیں وہ رنگ و نسب سے پہچانا جاتا ہے کہیں ملک و قوم کی نسبت سے۔ دنیا میں انسان کی سب حیثیتیں اضافی رہ گئی ہیں۔ اس کی ذاتی حیثیت کہیں باقی نہیں رہی حالانکہ اس کے پیدا کرنے والے نے کہا تھا کہ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ۔ ہم نے آدم کو بہ حیثیتِ آدم باعثِ عزت و تکریم بنایا ہے۔ جاؤ اور مہذب دنیا کے ایک ایک گوشے میں اعلان کر دو کہ

برتر از گردوں مقامِ آدم است اصلِ تہذیب احترامِ آدم است

اس نے کہا کہ اس انقلابِ عظیم کے لئے مجھے کچھ ساز و سامان دے دیجئے۔ اس نے اس کے ایک ہاتھ میں قرآن اور دوسرے میں تلوار دے کر کہا کہ

ایں دو قوت حافظِ یک دیگر اند کائناتِ زندگی را محور اند

اور ان دونوں کے مجموعے کا مطلب یہ ہے کہ یہی تلوار

لا دیں ہو تو ہے زہرِ ہلاہل سے بھی بڑھ کر   ہو دیں کی حفاظت میں تو ہر زہر کا تریاق

اور دین سے مراد ہے جمعیتِ آدم کا ضابطۂ نظام جو وحی کی بنیادوں پر متشکل کیا گیا ہو۔ اس لئے

باخبر شو از مقامِ آدمی

آدمِ نو اس ساز و یراق اور اس جاہ و طمطراق کے ساتھ خراماں خراماں سوئے قوم آیا اور اک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا۔ وہ اس طرح دنیا میں رہنے والوں کی طرف آ رہا تھا اور زمین کے ذرّے ابھر ابھر کر اس کے قدم چوم رہے تھے۔ آسمان جھک جھک کر اسے سلام کر رہا تھا اور فضا میں چاروں طرف سے یہ تہنیت بار زمزمہ بیدار ہو رہا تھا کہ

برتر از گردوں مقامِ آدم است   اصلِ تہذیب احترامِ آدم است

اور آسمان کی بلندیوں سے کوئی پکار کر کہہ رہا تھا کہ

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں   کہ یہ ٹوٹا ہوا تارہ مہِ کامل نہ بن جائے

اتنے میں آنسوئے افلاک سے ندائے جمال نے نہایت محبت آمیز انداز سے کہا کہ آدم! تم یہاں سے گئے تھے۔ اب پھر یہیں آجاؤ۔ آدم نے نگاہ اوپر کو اٹھائی اور تعظیم اور شوخی کے ملے جلے حسین تبسم آمیز لہجے میں کہا۔

باغِ بہشت سے مجھے حکمِ سفر دیا تھا کیوں؟
کارِ جہاں دراز ہے اب میرا انتظار کر

مجلسِ قلندرانِ اقبالؒ

ہم دیکھ چکے ہیں کہ ڈاکٹر عبدالوہاب عزامؒ کے 'ضربِ کلیم کے عربی ترجمہ کا تعارف پرویز صاحب نے لکھا تھا۔ ڈاکٹر عزام (مرحوم) نے صرف ضربِ کلیم کا ترجمہ نہیں کیا تھا اصل یہ ہے کہ دنیائے عرب کو پیامِ اقبالؒ کی روشنی سے منوّر کرنے کا سہرا انہی کے سر ہے۔ یہ شمع کس طرح سے روشن ہوئی اور اس کی روشنی کس طرح پھیلی، یہ داستان بڑی دلکش بھی ہے اور بصیرت افروز بھی۔ اسے پرویزؒ صاحب کے رفیقِ قدیم محترم خورشید عالم صاحب نے قلمبند کیا تھا اور وہ طلوعِ اسلام میں شائع ہوئی تھی۔ ہم زیرِ نظر تالیف کا اختتام اسی داستان پر کرتے ہیں کہ اس سے موزوں تر مقطع کا بند کوئی اور ہو نہیں سکتا۔ (طلوعِ اسلام ٹرسٹ)

شروع ۱۹۵۱ء کا ذکر ہے کہ محترم پرویز صاحب کو یہ پیغام ملا کہ نئے سفیرِ مصر اُن سے ملنے کے متمنّی ہیں۔ مملکتِ مصر کا نمائندہ اور ایک درویش سے ملنے کی خواہش! بات سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ پرویز صاحب اسی پر کم متحیّر نہ تھے کہ پیغامبر نے کہا کہ ان کے اس شوقِ ملاقات کا جذبۂ محرکہ وہ نسبت ہے جو آپ کو اقبالؒ سے ہے۔ اس پر پرویز صاحب کی آنکھوں کے سامنے یہ سارا نقشہ پھر گیا (جس کا تجربہ انہیں عمر بھر ہوتا رہا ہے) کہ کس طرح "بڑے لوگ" ضرورت کے وقت اقبالؒ سے وابستگی کا اظہار کرتے ہیں اور یوں طالب علمانِ اقبالؒ سے کس طرح فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اس خیال نے پرویز صاحب کے دل سے اس ہلکے سے ردّعمل کو بھی ختم کر دیا جو مجرّد تمنائے ملاقات سے قدرتاً

پیدا ہوا تھا، چنانچہ انہوں نے معذوری کا اظہار کیا۔ لیکن پیغامبر (سید عبدالواحد صاحب سیکرٹری مجلسِ اقبالؒ) نے اصرار کیا اور یہ یقین دلانے کی کوشش کی کہ صاحبِ موصوف کی طلب صادق ہے اور جذبہ خالص۔ ناچار پرویز صاحب آمادۂ ملاقات ہو گئے۔

پہلی ملاقات سفارت خانۂ مصر میں ہوئی۔ یہ اس لئے کہ پرویز صاحب وہاں خود چلے گئے تھے ورنہ سفیر صاحب نے تو یہ کہلا بھیجا تھا کہ انہیں بتایا جائے کہ کب اور کس وقت وہ پرویز صاحب سے ملنے کے لئے آئیں؟ سفارت خانے عجیب دنیا ہوتے ہیں۔ ان میں جھانک کر دیکھئے۔ شان و شوکت، ٹھاٹھ باٹھ، تصنع، تکلف، ظاہر داری (بے اختیار منافقت کا لفظ زبان پر آ رہا ہے) اور دیگر بے شمار بظاہر حسین مگر بباطن خبیث، دخترانِ مادر ڈپلومیسی قدم قدم پر نظر آئیں گی۔ یہ تن کی دنیا ہے جو "سود و سودا مکر و فن" سے معمور ہے نہ کہ "سوز و مستی جذب و شوق" سے آباد من کی دنیا۔ اس جہانِ گندم و جو میں ان درویشوں کا کہاں گزر جن کے قلوب و اذہان میں قرآن اور اقبالؒ نے اقدار کی ایک ایسی دنیا بسا رکھی ہو جس میں اضطرابِ موج کے ساتھ ساتھ سکونِ گہر بھی ہو جو بدلتے رہنے کے باوجود نہ بدلیں اور جن کی حالت یہ ہو۔

زبرونِ در گذشتم زدرونِ خانہ گفتم
سخنے نگفتہ را چہ قلندرانہ گفتم

بہرحال پرویز صاحب گئے اس حال میں کہ "آیا نہیں لایا گیا ہوں"۔ سفیرِ مصر ڈاکٹر عبدالوہاب عزام سے ملاقات ہوئی اور گفتگو شروع ہوئی۔ چند ہی لمحوں کے بعد پرویز صاحب نے محسوس کیا کہ وہ کاخِ نمایندۂ شاہی میں نہیں بلکہ کسی حجرۂ درویش میں ہیں۔ وہ درویشِ خدامست نہ شرقی ہے نہ غربی۔ ایک طرف ان کا علم و فضل تھا جو عالمانہ نمائش سے پاک تھا۔ اس میں سراسر طالبِ علمانہ تجسس تھا۔ دوسری طرف ان کا عشق تھا جس نے انہیں سراپا سوز و گداز بنا رکھا تھا۔ یہ اقبالؒ ہی کا فیض ہو سکتا تھا۔ اب پرویز اور عزام اس دنیا میں تھے جہاں تمام حجابات یک لخت اٹھ جاتے ہیں اور ملنے والے من تو شدم تو من شدی کی حقیقی "اَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِکُمْ" کی تصویر بن جاتے ہیں۔

یہ منفرد ملاقات "مجلسِ قلندرانِ اقبالؒ" کا نقشِ اول بنی۔ اس بے مثل مجلس کی کوئی باقاعدہ

رسمی تاسیس نہیں ہوئی۔ حق تو یہ ہے کہ اس کا بیج ارکانِ مجلس کی کشتِ جاں میں بو دیا گیا۔ اس کا باقاعدہ نام بھی تجویز نہیں ہوا۔ جوں جوں سفر بڑھتا گیا مجلس کا نقشہ صاف تر ہوتا گیا تاآنکہ اسے ایک وقت اسے مجلسِ قلندرانِ اقبالؒ کہہ دیا گیا اور پھر اسے یہی کہا جانے لگا۔ بہرحال مجلس کی طرح یوں پڑی کہ عزام صاحب نے جو پیامِ مشرق کا عربی ترجمہ مکمل کر چکے تھے اور اس کی اشاعت کے انتظامات میں مصروف تھے، یہ خواہش ظاہر کی کہ انہیں (عزام صاحب اور پرویز صاحب کو) باقاعدہ ملتے رہنا چاہیئے تاکہ وہ آیندہ جس کتاب کا ترجمہ کریں، اسے ترجمے سے پہلے اکٹھے بیٹھ کر ازل تا آخر پڑھ لیں۔ سید عبدالواحد صاحب جنہوں نے پیغامبری کے فرائض سرانجام دیتے تھے بے اختیار بول اٹھے کہ اگر ایسی بات ہے تو اس میں انہیں بھی شریک کیا جائے تاکہ وہ بھی ان مباحث سے مستفید ہو سکیں۔ اس سے بات چل نکلی اور یہ فیصلہ ہوا کہ جو اور احباب اس محفل میں شریک ہونا چاہیں انہیں بھی شریک کر لیا جائے لیکن صرف انہی کو جو اس میں قلندرانہ رنگ میں شریک ہونا چاہیں۔ اس طرح ایک باقاعدہ اجتماع منعقد ہونا شروع ہوا۔

رفتہ رفتہ قلندروں کی تعداد ایک درجن کے لگ بھگ پہنچ گئی۔ گو ایسے حضرات بھی تھے جو کبھی کبھی آجاتے تھے لیکن ایک درجن کے قریب بالعموم پابندی سے شریکِ مجلس ہوتے رہے۔ لفظ "پابندی" شاید موزوں نہ ہو، لیکن ہم سب کا یہ حال تھا کہ مجلس ہو رہی ہوتی تو ہم اس میں شریک ہوتے تھے اور نہیں ہو رہی ہوتی تھی تو اس کے لئے انتظار اور تیاری میں لگے رہتے تھے۔ ہمارے لئے یہ وہ غذا جس کے بغیر نہ سینے کی کشود ممکن ہے، نہ قلب کا حضور، اور جب یہ دولت ہاتھ آجاتی ہے تو — کوئی اس کو بہ قیامِ ہوش و حواس ہاتھ سے نہیں جانے دیتا اور قلندرانِ اقبالؒ کے لئے تو ہوش و حواس کا کھونا از قبیلِ محالات ہے۔

باچنیں زورِ جنوں پاسِ گریباں داشتم
در جنوں از خود نہ رفتن کارِ ہر دیوانہ نیست

مجلس بالعموم ہفتے میں ایک بار منعقد ہوا کرتی تھی۔ ہفتہ واری اجتماع کسی مجلس کے لئے بظاہر بڑا کافی ہے لیکن جن کے نزدیک گردشِ لیل و نہار کا معیار اوقات ہماں بود کہ با یار بسر رفت" انھیں تو ہر وقت یہ خلشِ احساس رہتی ہے کہ "حیف در چشم زدن صحبتِ یار آخر شد" مجلس کے لئے دن کا کوئی

تعین نہیں تھا۔ گو وقت عموماً شام کے پانچ بجے کا ہوا کرتا تھا۔ یہ دن کی عدم تعیین قلندروں کے شوق
کا عجیب امتحان ہوا کرتی تھی۔ ہر بار نئی واردات اور نئی کیفیات کی حامل۔ عام طور پر مجلس برخاست
ہونے سے پہلے یہ طے کر لیا جاتا تھا کہ آئندہ اجتماع کب ہو؟ اس میں ایک رکاوٹ ہوا کرتی تھی اور
وہ تھی سفیر صاحب کی سرکاری مصروفیات۔ انہیں بہرحال ان کے مطابق وقت مقرر کرنا پڑتا
تھا۔ اور محفل صرف اسی ایک رکاوٹ کے سامنے جھکنے کے لئے تیار ہوا کرتی تھی ورنہ کوئی اور مصروفیت
آئندہ یوم انعقاد کے تعین میں حائل نہیں ہو سکتی تھی۔ یہ تعین کا منظر بھی قابلِ دید ہوا کرتا تھا۔ "آئندہ
کب؟" کے سوال پر سفیر صاحب اپنی ڈائری منگواتے تاکہ معین مصروفیات کا جائزہ لیں۔ گو انتظار
کیا جاتا کہ سفیر صاحب ڈائری دیکھ کر فارغ دن کا اعلان کریں لیکن بے صبری یا بے خودی کا یہ عالم
ہوتا تھا کہ ڈائری آتے آتے کئی دن "مقرر" ہو جایا کرتے تھے۔ ڈائری آتی تو سفیر صاحب اس کی
ورق گردانی کرتے اور مجلس ان کے چہرے کو پڑھتی۔ خود سفیر صاحب کی یہ کیفیت تھی کہ اگر کہیں ہفتے سے
زیادہ کا وقفہ ہو گیا ہے تو وہ متردد نظر آتے تھے۔ اس وقت عجیب "سودا بازی" شروع ہو جاتی۔ چلئے ہم
صبح صبح آجائیں گے۔ اچھا یوں کیجئے۔ آپ ڈنر سے واپس آئیے اور پھر شب درمیان ہوئی۔ بہت سا
حساب بیباک ہو جائے گا۔ ایک مرتبہ ایسے ہی رات کی بات ہو رہی تھی تو سفیر صاحب نے بڑی بیساختگی
سے کہا "حَتّٰی مَطْلَعِ الْفَجْرِ" اس کے بعد مجلس میں یہ ضرب المثل ہو گئی تھی۔ اس سے ذوق و شوق کے
پیمانوں کا کچھ اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ بعض دفعہ ایسا بھی ہوا ہے کہ مجلس کا وقت اس خیال سے مقرر
کیا گیا کہ اس سے فارغ ہو کر سفیر صاحب اپنی "غیر مجلسی" مصروفیت سے عہدہ برآ ہو سکیں گے لیکن ذوق
حضورِ دل میں طرح طرح کی راہیں تراشنا شروع کر دیتا۔ "یہ موضوع زیادہ اہم ہے۔" "یہ ٹکڑا زیادہ غور طلب
ہے۔" "اسے ایک ہی نشست میں نمٹا لینا چاہیئے۔" وغیرہ وغیرہ۔ سب کو رہ رہ کر خیال (اور بہت
حد تک افسوس) سفیر صاحب کی مصروفیت کا آ رہا ہے۔ سفیر صاحب ہیں کہ فرما رہے ہیں کہ مجھے بھی جلدی
نہیں، تیار ہو کر چلے جانا ہے۔ چند منٹ اور بیٹھ لیتے ہیں، چند منٹ اور ۔۔۔ تا آنکہ ایک منٹ کا بس و
پیش خلافِ مصلحت ہو جاتا اور سب بادلِ نخواستہ اٹھ کھڑے ہوتے۔

کسی مجلس کے ذکر یا تصور سے معاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کے عہدیدار کون ہیں؟ سطور بالا
سے آپ کی توجہ شاید اس طرف نہ گئی ہو۔ یا ہو سکتا ہے کہ آپ نے یہ نتیجہ نکال لیا ۔۔۔ ہو کہ

مجلسِ قلندرانِ اقبالؒ میں مناصب کی تقسیم نہیں ہوگی۔ اور کہا جاسکتا ہے کہ ہو بھی کیسے؟ اس مجلس کو باقاعدہ طور پر معرضِ وجود میں نہیں لایا گیا اور یوں بھی اس کی اٹھان اور فضا انجمنوں کے عام انداز و معیار سے بالکل مختلف رہی۔ لیکن نہیں۔ اس میں بھی مناصب پیدا ہو گئے تھے اور اس طرح سے جیسے وہ پہلے سے "مقدر" تھے۔

سب سے بڑا "عہدہ" پرویز صاحب کو ملا۔ وہ شیخِ قلندراں کہلائے۔ اس کی صورت یوں ہوئی ہر چند مجلس کی تشکیل سفیر صاحب کی تحریک پر ہوئی لیکن یہ حقیقت ہے کہ اگر پرویز صاحب نہ ہوتے تو یہ تحریک لباسِ تشکیل اختیار ہی نہ کرسکتی۔ اگر سفیر صاحب نے مجلس کا ڈھانچہ تیار کیا تو پرویز صاحب نے اس میں روح پھونکی۔ چونکہ پرویز صاحب ہی اقبالؒ پڑھا اور پڑھایا کرتے تھے اور اپنے مطالعۂ اقبالؒ اور تدبر فی القرآن کی بدولت وہی اس کے اہل بھی تھے۔ اس لئے انہیں شیخِ قلندراں کہا جانے لگا۔ سفیر صاحب کو بھی منصب سے محروم نہیں رکھا گیا۔ اس میں ان کے سرکاری عہدے اور علمی مشاغل کی یہ رعایت رکھی گئی کہ انہیں "سفیرِ اقبالؒ" کا لقب دیا گیا۔ وہ نہ محض والہانہ جوش سے ہر جگہ اقبالؒ کا پیغام پہنچاتے تھے بلکہ کلامِ اقبالؒ کا عربی میں ترجمہ کرکے آپ نے پوری دنیائے عرب کو فکرِ اقبالؒ کے نور سے منور کردیا اور اس طرح اس دنیا کے لئے تنہا "سفیرِ اقبالؒ" قرار پائے۔

ایک منصب "ساقی" کا تھا۔ آج وہی ساقی، ساقی گری کی شرم رکھ کر اس اجڑی محفل کی یاد کو دل و دماغ میں بسائے اس کی داستان گوئی کا فریضہ ادا کر رہا ہے۔ یہ منصب بھی بلاوجہ عطا نہیں ہوا۔ دراصل منصب بقدرِ ظرفِ عمل ہوتا تھا۔ ہر منصب کا استحقاق عمل تھا۔ قاعدہ یہ تھا کہ مجلس شروع ہوتی تو سفیر صاحب کے ملازمین چائے کی تیاری شروع کردیتے (میں نے اس وقت انہیں "ملازمین" محض تعارف کے لئے لکھا ہے۔ ورنہ وہ بھی درحقیقت اس مجلس کا ایک جزو بن چکے تھے اور انہیں کسی بڑے سے بڑے مہمان کی تواضع میں وہ لطف نہیں ملتا تھا) جب چائے تیار ہوچکتی تو چائے کا دور چلتا۔ شروع شروع میں ایسا ہوا کہ چائے آئی تو اتفاق سے راقم الحروف نے چائے بنائی۔ دو ایک مرتبہ ایسا اتفاق ہوا۔ ایک مرتبہ چائے رکھ دی گئی لیکن شروع نہ کی گئی کیونکہ شیخِ قلندراں اپنا بیان ختم نہیں کرچکے تھے۔ جونہی بیان ختم ہوا سفیر صاحب نے فرمایا "ساقی" اور چائے کی طرف اشارہ کیا۔ اس کی بیساختہ داد دی گئی اور ساقی پر ساقی گری کی دائمی ذمہ داری آپڑی۔ چائے کے ساتھ ساتھ کچھ نہ کچھ کھانے کے لئے ضرور ہوتا تھا اس کی تقسیم کی ذمہ داری ساقی پر نہ تھی۔

ساقی کا کام "سقایتِ مجلس" تک محدود تھا. تقسیم کا کام "قاسم" کے سپرد ہوا. قاسم ہمیشہ ساقی کے معاون رہے. ساقی کا پیالہ بڑھتا تو قاسم کی پلیٹ اس کے ساتھ پہنچتی. ساقی گری بڑی نازک ذمہ داری ہے پھر قلندروں کی ساقی گری! کچھ پوچھئے نہیں. دس بارہ قلندر جن کی "ہر لحظہ نئی شان نئی آن" اسے کم دودھ اُسے تیز قہوہ. یہ اتنی شکر وہ اتنی شکر. مجلسِ قلندران کی ساقی گری ظرف شناسی سے کہیں زیادہ مزاج شناسی تھی اور مزاج شناسی کا امتحان شکر کے معاملہ میں ہوا کرتا تھا. کیونکہ جہاں ایسے قلندر تھے کہ جو چائے کو شکر آمیز کرنے کے روادار نہیں تھے وہاں ایسے قلندر بھی تھے جو تلخیٔ چائے کو شکر سے انگبیں بنا کر کام و دہن کی آزمائش کیا کرتے تھے. ساقی کو اس نشیب و فراز کی خصوصی رعایت مدِ نظر رکھنا پڑتا تھی. ساقی کو قاسم کی بھی خصوصیت سے رعایت رکھنا پڑتی تھی. کیونکہ اس کی "قسمت" کی پلیٹ قاسم کے ہاتھ میں ہوا کرتی تھی. قریباً ہر محفل میں دونوں آنکھوں آنکھوں میں پیالی اور پلیٹ کے ایسے سودے کر لیتے تھے کہ قلندروں کو خبر تک نہ ہوتی تھی. اس راز کا افشا کرتے ہوئے ساقی کو یقین ہے کہ اگر وہ اہلِ محفل سے پوچھتے کہ کیا وہ مجھے ساقی تسلیم نہیں کرتے تو اس کا جواب "بلیٰ" ہوگا. قلندروں کے انداز بڑے نرالے ہوتے ہیں. ہاں تو یہ قاسم تھے سب کے ہر دلعزیز عزیز الحسن[۱].

ایک عہدہ جو دیا نہیں گیا لیکن جس کا پورا پورا استحقاق پایا جاتا ہے "علی بخش" کا ہے. یہ ان خدامِ مجلس کو زیب دیتا ہے جن کے دماغ اقبالؒ کو نہ پا سکے لیکن جن کے دل قلندروں کی طرح گرم اور ہاتھ قلندروں کی طرح سرگرم تھے. ابراہیم، خمیس، محمد وہ "علی بخش" ہیں جو سفیر صاحب کے خدامِ خانہ تھے. وہ مجلس کے دن کا اتنی ہی بیتابی سے انتظار کرتے تھے جتنا کہ بڑے سے بڑا قلندر کر سکتا ہے. دوپہر کے بعد ان کا سارا کاروبار بند ہوتا تھا. وہ محبت آمیز انہماک سے چائے اور اس کے لوازمات تیار کرتے تھے. یہ ذہنی طور پر ہمارے شریک نہیں تھے لیکن روحانی طور پر ہم سے بالکل جدا نہیں تھے.

مجلس کا معمول یہ تھا کہ پرویز صاحب اقبالؒ کے اشعار پڑھتے جاتے اور ساتھ ساتھ ان کی تشریح بھی کرتے جاتے. یوں بھی ہوتا تھا کہ نئی کتاب یا نیا موضوع شروع کرنے سے پہلے ایک جامع تمہیدی تقریر ہوتی جس میں موضوع کا بسوط بیان ہوتا. اقبالؒ کا کلام اور پرویز صاحب کا بیان، محفل علمی اور وجدانی طور پر ایک نئی دنیا میں پہنچ جاتی. کراچی کی بے آب و گیاہ وادی میں مصری سفارت خانہ بمنزلہ نخلستان تھا. وہ نخلستان

---

[۱] یہ لکھتے ہوئے کلیجہ سے اک ہُوک سی اٹھتی ہے کہ وہ اب مرحوم ہو چکے ہیں۔ (۱۹۷۴ء)

جہاں روح کی بالیدگی کے بے حساب سامان تھے۔ پرویز صاحب کے بیان کے بعد یوں تو بہت کم کسی سوال کی گنجائش رہ جاتی لیکن جب کبھی ان کے علم کے تخیلِ بلند تک کسی کا کوتاہ ہاتھ نہ پہنچتا وہ درخت خود جھک کر اس کے دامن کو بھرپور کر دیتا۔

ایسا بیان کوئی آدھے گھنٹے تک کے لئے ہوتا۔ اس کے بعد "علی بخش" محفل کا رنگ بدل دیتے۔ پھر محفل کا چارج ساقی کے سپرد ہوتا اور شیخ ذرا سُستا لیتے۔ قلندر مطالعہ اقبالؒ میں مستغرق بحرِ قرآں کی غواصی کر رہا ہو تو کیا اور چائے کی میز پر مائل بہ تفریح ہو تو کیا۔ وہ ـــ رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاک باز ـــ ہوتا ہے۔ دونوں اس کی ذات کے شئون ہیں اور وہ دونوں میدانوں میں قلندر رہے۔ وقفہ چائے میں لطافت و ظرافت کی مخصوص فضا پیدا ہوتی۔ وہ فضا جس کے تصور سے اب بھی روح میں شگفتگی پیدا ہو جاتی ہے۔

اس کے بعد "شمع" پھر شیخِ قلندران کے سامنے پہنچ جاتی۔ پرویز صاحب ہمیں ان گذرگاہوں میں لے جاتے کہ ستارے بھی جن کی گردِ راہ بن جاتے اور فلک زمین معلوم دیتے۔ اس جذب و انہماک میں "سفرِ اقبالؒ زمین کے ہنگاموں" کو نہ بھولتے اور انہیں پتہ ہوتا کہ ترجمہ کرتے وقت ان کو کیا کیا دقتیں پیش آئیں گی۔ وہ ان دقتوں کو پیش کرتے اور پرویز صاحب ان کا حل کرتے۔ سفیرِ اقبالؒ کے متعلق غالباً یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ وہ ایک زمانے سے اقبالؒ کے مطالعہ میں مصروف ہیں۔ خود بلند پایہ ادیب اور شاعر ہیں۔ عربی تو ان کی مادری زبان ہے، انگریزی، فرانسیسی، ترکی اور فارسی تک میں انہیں دستگاہ ہے۔ اس کے باوصف جب وہ پرویز صاحب سے ملے تو انہیں معلوم ہوا کہ جب علم و فکر، قرآن کی بھٹی سے ہو کر نکلتے ہیں تو کیا بن جاتے ہیں۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ انہوں نے اب اقبالؒ کو سمجھا ہے۔ انہوں نے سمجھا ہی نہیں وہ سمجھاتے بھی پھرتے ہیں "سفیرِ اقبالؒ" کا لقب انہی کو زیب دے سکتا ہے۔ اب تک وہ پیامِ مشرق، ضربِ کلیم اور اسرار و رموز کا عربی ترجمہ کر چکے ہیں۔ پہلے دونوں ترجمے شائع ہو چکے ہیں اور تیسرا پریس میں تھا کہ آپ کا تبادلہ ہو گیا۔ آپ نے ایک کتاب اقبالؒ کی سیرت فلسفہ اور شاعری پر بھی لکھی ہے۔ آپ نے ضربِ کلیم کے ترجمے کا تعارف پرویز صاحب سے لکھوایا اور اپنے مقدمہ میں مجلسِ قلندران کا بڑی عقیدت سے ذکر کیا ہے۔

اس مجلس میں ضربِ کلیم، بالِ جبریل، ارمغانِ حجاز (حصہ اُردو) جاوید نامہ، اسرار و رموز، پس چہ باید کرد، بانگِ درا (چیدہ چیدہ) لفظاً لفظاً پڑھی گئیں۔ ہمیں اس کمی کا احساس رہا کہ کوئی مختصر نویس مہیا نہ ہو سکا کہ جو ان مجالس کے نوٹ لے سکتا۔ یہ دعوے سے کہا جا سکتا ہے کہ اقبالؒ کے متعلق اس سے پہلے کبھی اتنا کچھ اور

اس طرح کہا یا سُنا نہیں گیا۔ اگر یہ سب کچھ جمع ہوجاتا تو اقبالؒ پر کئی مجلدات تیار ہوجاتیں اور پھر شاید ایک عرصہ تک اس سے آگے بات نہ کی جاسکتی۔ لیکن بقول غالب۔

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں　　خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں

سفیرِ اقبالؒ نے دامن بھر بھر کے اس متاعِ فقیر کو دنیائے عرب میں لٹا دیا۔

قارئین یہ سُن کر متعجب ہوں گے کہ مجلسِ قلندراں — ایک "ختم" کی تقریب بھی منایا کرتی تھی۔ یہ تقریب ہر کتاب کے خاتمہ پر منائی جاتی تھی۔ جب کسی کتاب کا اس قدر حصّہ باقی رہ جاتا جسے آیندہ نشست میں ختم ہوجانا تھا تو اس کتاب کی آخری مجلس معمول سے ذرا دیر میں یعنی مغرب کے لگ بھگ منعقد کی جاتی۔ سفیرِ اقبالؒ اپنی کتاب پر لکھتے کہ فلاں تاریخ کو فلاں وقت فلاں جگہ کتاب ختم کی گئی۔ پھر اس تحریر کے نیچے تمام قلندروں کے دستخط ہوتے۔ اس کے بعد سب مل کر کھانا کھاتے۔ اس دعوت میں ساقی اور قاسم کے سب امتیازات ختم کر دیئے جاتے۔ ہر کوئی اپنا ساقی ہوتا اور اپنا قاسم۔ تکمیلِ مرحلہ کی خوشی قلندروں کی پیشانیوں سے ہویدا ہوتی اور گفتگو میں لطافت اور شگفتگی بن کر ظاہر ہوتی۔ محفل کا یہ رنگ چائے کے لگ بھگ تو ہوتا مگر اس کا دوران زیادہ ہوتا۔

اس مجلس کی آخری نشست ۱۱ دسمبر ۱۹۵۴ء کی شام کو منعقد ہوئی۔ یہ نشست عاجلانہ طور پر طلب کی گئی۔ کیونکہ کسی فرزانے قلندر کو یہ سوجھ گئی کہ سفیرِ اقبالؒ پاکستان سے رخصت ہو رہے ہیں تو ایک نشست کو "منتشل" کر کے محفوظ کر لیا جائے۔ قلندرانِ اقبالؒ جو نقوش و کیفیات کو دل کی لوح پر لیے پھرتے تھے اس کے قائل ہوگئے۔ آخری نشست کا سماں دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ سینوں میں تلاطم تھا۔ مگر چہرے سنجیدہ تھے۔ نہ گریاں نہ خنداں۔ فراق کی خلش ضرور تھی لیکن یہ اطمینان تھا۔

نہ کر ذکرِ فراق و آشنائی　　کہ اصلِ زندگی ہے خود نمائی
نہ دریا کا زیاں ہے نہ گہر کا　　دلِ دریا سے گوہر کی جدائی

اس لئے ہر ایک کی حالت یہ تھی۔

کشادم چشم و بربستم لب خویش　　سخن اندر طریقِ ما گناہیست

ہمیں اطمینان تھا کہ ہمارا سفیرِ اقبالؒ اس محفل کو سونا کر جائے گا تو کیا۔ وہ جہاں جائے گا نئی محفلیں آباد کرے گا جو اس ویرانی کا صلہ بن جائیں گی۔ یہ ضبط بھی درحقیقت پیامِ اقبالؒ اور تعلیمِ قرآن ہی کے صدقے میں تھا۔

دربہ سینے میں تلاطم خیزیاں ساحل ناآشنا ہو رہی تھیں۔

یہاں تک تو ضبط نے ساتھ دیا۔ لیکن جب محفل شروع ہوئی تو اس کا نقشہ کچھ اور ہو گیا۔ اتفاق سے اس دن "پس چہ باید کرد" کا آخری باب زیرِ مطالعہ تھا جس کا عنوان ہے "درحضور رسالتمآبؐ"۔ ایک طرف اقبالؒ حضور رسالتمآبؐ میں۔ آپ اندازہ لگایئے کہ اس کی کیفیت کیا ہو سکتی ہے؟ دوسری طرف شیخ قلندران اور سفیرِ اقبالؒ۔ دونوں کی حالت یہ ہے کہ حضور ختمی مرتبتؐ کی محبت میں ہمہ تن سوز۔ انہی کے سوز سے باقی قلندروں کے سینے بھی حرارتوں سے معمور۔ پوچھئے نہیں کہ مجلس پر کس قدر والہانہ کیفیت طاری تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ آسمان سے نور کی بارش ہو رہی ہے۔ اس کا اہتمام کر لیا گیا تھا کہ جہاں اس آخری محفلِ سوز و ساز کے نقشے کو کیمرے کی پلیٹ میں محفوظ کر لیا جائے وہاں اس کے الفاظ کو بھی ریکارڈ میں ضبط کر لیا جائے۔ چنانچہ ایسا کر لیا گیا۔ اب جس وقت اس محفل کی یاد سے قلندروں کے سینے میں ہُوک سی اٹھتی ہے، وہ اسے اپنے لئے فردوسِ گوش بنا لیتے ہیں۔

یہ آخری محفل اس کیف بار وحیات آور وعدہ پر ختم ہوئی کہ اگلی کتاب (ارمغانِ حجاز) خود حرمِ کعبہ اور صحنِ مسجدِ نبویؐ میں بیٹھ کر پڑھی جائے گی۔ یہی وعدہ ہے جو اب قلندروں کی تمناؤں کا حسین مرکز بن رہا ہے اور جس سے آنے والے دن، ان کی نگاہوں میں اس قدر تابناک ہو رہے ہیں۔ (دسمبر ۱۹۵۴ء)۔ (خورشید عالم)

اس کے بعد سفیر صاحب جدہ تشریف لے گئے اور اپنے ہر خط میں اس وعدہ کو دہراتے رہے کہ جونہی حالات مساعد ہوئے وہ تمام "قلندروں" کو دعوت دیں گے اور "ارمغانِ حجاز" کا مطالعہ اور ختم "حرمِ کعبہ اور صحنِ مسجدِ نبویؐ (علیہ التحیۃ والسلام) میں ہو گا۔ (اس دوران میں حالات ناسازگار سے رہے جن کے تذکرہ کی یہاں ضرورت نہیں)۔ دسمبر ۱۹۵۷ء میں، وہ انٹرنیشنل اسلامک کلوکیم (منعقدہ لاہور) میں تشریف لا رہے تھے۔ انہوں نے مجھے اس کی پہلے سے اطلاع دے دی اور تاکید سے لکھا کہ تم کلوکیم میں ضرور آنا تاکہ ملاقات کے لئے کافی وقت مل جائے۔ چنانچہ میں لاہور آ گیا اور جس گرمجوشی سے وہ ملے اس سے میرے سینے میں ابھی تک حرارت باقی ہے۔ انہی کے ایما سے کلوکیم کے دوران، دیال سنگھ کالج ہال میں "من و یزداں" کے عنوان پر میری تقریر ہوئی جس کی انہوں نے صدارت فرمائی۔ پھر یہیں یہ بھی طے ہو گیا کہ وہ کلوکیم کے بعد کراچی پہنچ کر ایک عام مختص کرنا چاہتے ہیں تاکہ ایک بار پھر مجلسِ قلندران کا انعقاد ہو جائے۔ ۹۔ جنوری ۱۹۵۸ء کی شام (سفارتخانے

کے سجائے میرے کاشانے میں، اس مجلس کا انعقاد ہوا اور زمانے کی طنابیں چار سال پیچھے کو کھنچ گئیں۔ نہ معلوم ان کے دل میں کیا خیال آیا کہ انہوں نے خاص طور پر کہا کہ اس مجلس کا ریکارڈ بھی ٹیپ پر محفوظ کر لینا۔ چنانچہ ایسا کر لیا گیا۔ رخصت کے وقت انہوں نے تمام قلندروں سے باچشمِ نم کہا کہ اب حریمِ کعبہ میں ملاقات ہوگی۔

کیا معلوم تھا کہ یہ ملاقات "حریمِ جنت" پر ملتوی ہو جائے گی! جنوری ۱۹۵۹ء میں ان کا (الریاض میں) حرکتِ قلب بند ہو جانے سے انتقال ہو گیا۔　　طوبیٰ لہ وحسن مآب۔

(پرویز)

برگ و ساز ما کتاب و حکمت است

این دو قوت اعتبار ملّت است

اقبالؒ اور قرآن کریم

فکر و پیامِ اقبالؒ ــــــ قرآن کی روشنی میں

جلد دوم

پرویزؒ

طلوعِ اسلام ٹرسٹ ۲۵/بی، گلبرگ ۲، لاہور

جملہ حقوق محفوظ

نام کتاب	-------	اقبال اور قرآن
		(مبنی برخطابات محترم پرویز صاحب)
تالیف	-------	محمد عمر دراز
ناشر	-------	طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)
	-------	25-B گلبرگ II لاہور 54660
طابع	-------	دوست ایسوسی ایٹس
	-------	الکریم مارکیٹ اردو بازار لاہور 54000
مطبع	-------	عصمت اسلم پرنٹرز
پہلا ایڈیشن	-------	اگست 1988ء
دوسرا ایڈیشن	-------	مئی 1996ء

طلوعِ اسلام ٹرسٹ کی مطبوعات سے حاصل شدہ آمدن

قرآنی فکر عام کرنے پر صرف ہوتی ہے۔

فہرست

نمبر شمار	عنوان		صفحہ
۱۔	متداول اقبالؒ	ستمبر اکتوبر سنہ ۱۹۳۲ء	۱
۲	اقبالؒ اور ختم نبوّت	اپریل سنہ ۱۹۷۵ء	۱۸
۳	متاعِ دین و دانش لٹ گئی اللہ والوں کی	اپریل سنہ ۱۹۷۶ء	۴۴
۴	اسلامی مملکت کا تصور اقبالؒ کے نزدیک	اپریل سنہ ۱۹۷۷ء	۹۴
۵	فکرِ اقبالؒ کا سرچشمہ قرآن	اپریل سنہ ۱۹۷۸ء	۱۲۲
۶	روٹی کا مسئلہ اقبالؒ کی نظر میں	اپریل سنہ ۱۹۷۹ء	۱۴۳
۷	قانونِ شریعت میں اصولِ ارتقاء	اپریل سنہ ۱۹۷۹ء	۱۷۳
۸	اقبالؒ اور کمیونزم	اپریل سنہ ۱۹۸۰ء	۲۰۷
۹	دو قومی نظریۂ اقبالؒ اور قائداعظمؒ کی نگاہوں میں	نومبر سنہ ۱۹۸۰ء	۲۳۰
۱۰	احترامِ آدمیت کس نہ گردد در جہاں	اپریل سنہ ۱۹۸۱ء	۲۵۸
۱۱	پاکستان کا مطلب کیا لا الٰہ الا اللہ	اگست سنہ ۱۹۸۱ء	۲۸۹
۱۲	نذرِ اقبالؒ	نومبر سنہ ۱۹۸۱ء	۲۹۷
۱۳	حقیقت خرافات میں کھو گئی	اپریل سنہ ۱۹۸۳ء	۳۱۵
۱۴	خلقِ خدا کی گھات میں رند و فقیہ و میر و پیر	اپریل سنہ ۱۹۸۴ء	۳۲۹

پیش لفظ

(طبع اوّل)

"اقبالؒ اور قرآن" محترم پرویزؒ صاحب کے ان مقالات اور خطابات کا مجموعہ ہیں جو انہوں نے وقتاً فوقتاً ارزاں فرمائے۔ اس کتاب کے اب تک تین ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں اور اس میں ۱۹۷۴ء تک کے خطابات و مقالات آ گئے ہیں۔ اس بات کی ضرورت شدّت سے محسوس کی جا رہی تھی کہ محترم پرویزؒ صاحب کے ۱۹۷۵ء اور بعد (ان کی وفات تک) کے مقالات کو بھی کتابی صورت میں شائع کیا جائے۔ جلد دوم اسی ضرورت کے پیشِ نظر طبع کی جا رہی ہے، اور اس کے ساتھ، ان کا وہ مقالہ بھی زینت دہ اوراق ہے جو اوراقِ گم گشتہ سے ڈھونڈ کر نکالا گیا ہے کیونکہ (غالباً) یہ فکرِ اقبالؒ پر ان کی پہلی نگارش ہے اور اوّلاً ماہنامہ نیرنگ خیال لاہور کے خصوصی شمارہ۔ اقبالؒ نمبر، بابت ستمبر، اکتوبر ۱۹۳۲ء میں شائع ہوا تھا۔ بعد میں یہ انجمن ترقی اردو کی طرف سے شائع کردہ کتاب "اقبال معاصرین کی نظروں میں" میں بھی شائع ہوا، اور جس کا عنوان ہے متناول اقبالؒ۔

ہمیں امید ہے کہ اس جلد دوم کی طباعت سے محترم پرویزؒ صاحب کی فکرِ اقبالؒ سے متعلق تمام نگارشات کتابی صورت میں اکٹھی کر دی گئی ہیں۔

اس کے بعد، اگر ان کی اس سلسلہ کی کوئی تحریر سامنے آئی تو اسے جلد دوم کی آئندہ اشاعت میں شامل کر دیا جائے گا۔

واللہ المستعان!

طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)

گلبرگ لاہور (۱۹۸۸ء)

ماہنامہ نیرنگ خیال
اکتوبر ۱۹۳۲ء

متفاولِ اقبالؒ

کوئی تین برس اُدھر کا ذکر ہے، مجلسِ ترقیِ ادب، لاہور کی طرف سے ایک کتاب شائع ہوئی، جس کا عنوان تھا ——— اقبالؒ معاصرین کی نظر میں ——— کتاب کے مرتّب تھے پروفیسر وقار عظیم صاحب (جواب مرحوم ہو چکے ہیں)۔ اس میں ایک مقالہ بہ عنوان "متفاولِ اقبالؒ" پرویزؒ صاحب کے قلم سے بھی شامل تھا، حوالہ صرف "۱۹۳۲ء" دیا گیا تھا۔ ایک دوست کی نگاہوں سے یہ مقالہ گزرا تو انہوں نے ہم سے کہا کہ مقامِ حیرت ہے کہ پرویز صاحب کا یہ مقالہ (جو غالباً علامہ اقبالؒ پر ان کی اوّلین نگارش ہے) طلوعِ اسلام یا اس کی طرف سے شائع کردہ کسی کتاب میں درج نہیں۔ انہوں نے فرمایا کہ اس مقالہ (بلکہ پرویز صاحب کی اس قسم کی اور تحریروں کو بھی) طلوعِ اسلام کے صفحات میں محفوظ کر لینا چاہئے کہ ان کا شمار نوادرات میں ہوتا ہے۔ ہم نے ان سے اتفاق کیا۔ چنانچہ یہ مقالہ پیشِ خدمتِ قارئین ہے۔

پس منظر اس کا یہ ہے کہ ستمبر، اکتوبر ۱۹۳۲ء میں، ماہنامہ نیرنگِ خیال (لاہور) نے اپنا خصوصی شمارہ، اقبال نمبر کے نام سے شائع کیا۔ (وہ غالباً کسی ماہنامہ کا پہلا اقبالؒ نمبر تھا) اور پرویز صاحب نے ان کے حسبِ فرمائش یہ مقالہ تحریر فرمایا۔ یہ آج سے پینتالیس سال پہلے کی بات ہے جب پرویز صاحب کی عمر ۲۸/۲۹ سال کی ہوگی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب پرویز صاحب، تلاشِ حقیقت میں، تجسّس و تحقیق کی مختلف وادیوں میں سرگرداں تھے۔ اور اگرچہ وہ اپنے دامن کو قدامت پرستی کی خار دار جھاڑیوں سے بڑی حد تک چھڑا چکے تھے لیکن ہنوز اُن سے بالکلیہ باہر نہیں نکل پائے تھے۔ چنانچہ آپ کو ان کے اس مقالہ میں، اس ماضی کے کئی ایک نقوش دکھائی دیں گے، جو لبعد میں قرآن خالص پر آنے سے مٹ گئے۔ ہم نے مقالہ کے حواشی میں ان کی نشاندہی کر دی ہے۔

اس مقالہ کی اشاعت سے ہمارے پیشِ نظر جہاں یہ مقصد ہے کہ اس قسم کے نوادرات

طلوعِ اسلام کے اوراق میں محفوظ ہو جائیں، وہاں یہ دکھانا بھی مطلوب ہے کہ ایک مفکر کی فکر کن ارتقائی مراحل سے گزرتی ہے۔ علامہ اقبالؒ پر جب ایک دفعہ یہ اعتراض کیا گیا کہ انہوں نے اپنے سابقہ خیالات میں تبدیلی کر لی ہے تو انہوں نے فرمایا کہ جامد تو پتھر ہوتا ہے۔ میں انسان ہوں۔ اور انسانی فکر میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ قائدِ اعظمؒ پر جب یہ اعتراض کیا گیا کہ آپ پہلے نیشنلسٹ تھے، اب دو قومی نظریہ کے داعی کیسے ہو گئے، تو انہوں نے کہا کہ میں کبھی پرائمری میں بھی پڑھا کرتا تھا اور پرویز صاحب تو اپنی ہر تصنیف کے آخر میں وضاحت سے لکھتے چلے آ رہے ہیں کہ میری فکر نہ حرفِ آخر ہے نہ سہو و خطا سے منزّہ ہے۔ یہ قرآن کریم کے سمجھنے کی انسانی کوشش ہے اگر اس میں کوئی بات قرآن مجید کے خلاف نظر آئے تو میں ان پر مزید غور کرنے کے لئے ہر وقت تیار ہوں اور اس کے غلط ثابت ہونے پر اصلاح کے لئے آمادہ۔ اس مقالہ کے مطالعہ کے وقت اس حقیقت کو پیشِ نظر رکھئے اور پھر یہ دیکھئے کہ آج سے پینتالیس سال پہلے بھی، پیامِ اقبالؒ اور قرآنی حقائق پر انہیں بہ حیثیتِ مجموعی کس قدر عبور حاصل تھا۔

اب آپ وہ مقالہ ملاحظہ فرمائیے۔　　مئی ۱۹۷۷ء

متفاولِ اقبالؒ

ترا چنانکہ توئی ہر کسے کجا داند
بقدرِ طاقتِ خود می کنند ادراک

عام انسان ملائکہ سے افضل ہیں یا نہیں۔ یہ امر تو علم الاخلاق میں کسی حد تک متنازعہ فیہ رہا ہے۔ لیکن اس میں

---

۱۵ متفاول (OPTIMIST) متشائم (PESSIMIST)

تو کسی کو کلام نہیں کہ عالمِ خلق میں حضرتِ انسان سے زیادہ شرف واعتبار کسی اور کے حصہ میں نہیں آیا۔[۱] ایک طرف صحفِ مقدسہ اس کی تصدیق میں رطب اللسان ہیں اور دوسری طرف دورِ جدید کے انکشافات اس کے مؤید۔ انجیل بتاتی ہے کہ آدم کو خدا نے اپنی شکل پر پیدا کیا ہے۔ خود قرآنِ حکیم خلقتِ انسانی کو " احسنِ تقویم " سے تعبیر کرتا ہے اور اس کی ممکناتِ زندگی کو لامحدود قرار دیتا ہوا فرماتا ہے۔ وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مِّنْهُ ... (۴۵/۱۳) کہ پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے سب حضرتِ انسان کے تابع فرمان ہے۔ ادھر ماہرینِ نظریۂ ارتقاء نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ موجوداتِ عالم کی زنجیر کی آخری کڑی حضرتِ انسان ہے اور اس سے بڑھ کر اشرف و مکمل ہستی ہنوز صفحۂ ارض پر نمودار نہیں ہوئی۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اگر ہمارے پاس یہ نظری شہادات نہ بھی موجود ہوتیں تو بھی انسانی قدرت و امکان کی داستانیں ہمیں مجبور کر دیتیں کہ اس کی خلافت و نیابتِ الٰہی پر آمنّا و صدّقنا کہا جائے۔[۲]

لیکن طبائع و اخلاقِ انسانی کی بوقلمونی بھی کچھ کم حیرت انگیز نہیں۔ ایک طرف تو اس کی ہمت و حوصلہ کی وسعتوں کا یہ عالم، اور دوسری طرف، جب بعض ناگزیر اسباب و علل کے ماتحت اس کے ارادوں میں تزلزل اور عزائم میں فسخ شروع ہوتا ہے تو یہ دوں ہمتی، یاس و قنوط، افسردگی و پژمردگی، تعطّل و تفلّج کا عجیب نمونہ پیش کرتا ہے، باید و شاید۔ پتہ نہیں سب سے پہلے وہ کون سا شکستہ خاطر و اندوہگیں انسان تھا، جو حوادث و آلام سے مجبور ہو کر دل چھوڑ بیٹھا۔ اور اپنے ماحول، دنیا و مافیہا، بلکہ خود اپنی ذات سے تنگ آ گیا اور وہ کونسے ناقابلِ برداشت مصائب و آلام تھے، جن سے تنگ آ کر اس نے یہ نظریہ قائم کر لیا کہ دنیا، حزن و آلام، رنج و کرب، عقوبات، صعوبات، مشکلات و تکالیف کا گھر ہے اور مسرّت و انبساط و سرور کی کچھ حقیقت نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ متشائم نظریہ قرونِ اولیٰ ہی سے انسانی دماغوں پر کالی گھٹاؤں کی طرح چھا گیا تھا۔ حکمتِ یونان نے اوجِ کمال پر پہنچ کر افلاطون کا فلسفۂ نفیِ حقیقت رائج ہو گیا۔ ادھر ہندوستان میں ویدوں کے زمانہ میں بھی اس کا سراغ مل جاتا ہے۔ اُپ نشدھ کی تعلیم کے مطابق آتما حقیقی اور اس کے ماورا سب کچھ وہام یعنی نفی ہے اور موجوداتِ عالم مایا یعنی سراب۔

۱ـ پرویز صاحب نے قرآن مجید پر مزید غور و فکر کے بعد، ان نظریات میں تصحیح کر لی ہے۔ خدا نے آدم کو (جس سے مراد آدمی ہے) مسجودِ ملائکہ قرار دیا ہے اور انسان کے متعلق کہا ہے کہ انسے " اکثر مخلوق " پر فضیلت عطا کی ہے (۱۷/۷۰)، قرآن کریم اس کی بھی تصدیق نہیں کرتا کہ خدا نے آدم کو اپنی شکل پر پیدا کیا۔ یہ تصور غیر قرآنی ہے۔

۲ـ آدم کے خلیفۃ اللہ ہونے کا نظریہ بھی صحیح نہیں۔ پرویز صاحب نے اس موضوع پر تفصیل سے لکھا ہے۔

اس کے بعد بدھ مت کا زمانہ آتا ہے اور اس نے تو یوں کہئے کہ امیدوں کی چمکتی دنیا کا گویا جنازہ نکال کر رکھ دیا۔ مہاتما بدھ کی تعلیم کے مطابق، حزن وملال خلقت انسانی کے اندر ودیعت کر کے رکھ دیئے گئے ہیں۔ دنیا میں انسان کا وجود بذات خود ایک بلائے عظیم ہے۔ اس تعلیم کا بنیادی تجزیہ ہے کہ " زندگی نام ہے خواہش و آرزو کا۔ اور آرزو سراپا درد والم ہے۔ لہٰذا زندگی فی نفسہ درد والم ہے۔ اور صرف ترک علائق، نفی خودی اور تعطل آرزو یعنی امید ولی کی فنا اور خواہشات کی موت سے انسان اس سکون ابدی اور راحت سرمدی کو حاصل کر سکتا ہے۔ جس کا نام نروان ہے"
دوسری طرف عیسائیت میں مسئلہ کچھ اور بھی لچک لے کر ابھرا۔ ان کے نزدیک اس مجلس آب وگل میں انسان تشریف ہی اس لئے لاتا ہے کہ اپنے اوّلین ماں باپ (آدم وحوا) کے گناہوں کی سزا بھگتے۔ لہٰذا جتنا اس جیل خانہ سے دور رہے اتنا ہی سکھ ہے کہ بس

نہ رہے بانس نہ بجے بانسری

فلاسفر یورپ میں LIBNITZ کے وقت تک پھر بھی ایک حد تک متفاول نظریہ حیات کا چرچا تھا۔ ہیوم نے اس روش کا کچھ کانٹا بدلا۔ ہکسلے اور سپنسر اثبات سے تشکیک پر اترے اور شوپنہار نے تو بالکل بدھ مت کا چولا پہن لیا۔ وہ "زندگی اور خواب کو ایک ہی کتاب کے دو ورق" گردانتا ہے۔ اس کے نزدیک " انسان ایک غیر فانی درد و کرب کا تختہ مشق ہے اور مسرت وانبساط کا جو سراب اسے نظر آتا ہے وہ محض اس لئے ہے کہ یہ مصائب جھیلنے کے لئے ارتباط جسم وجان قائم رکھ سکے۔" لیکن چونکہ یورپ نے اپنے فلسفیانہ نظریات کو عملی دنیا میں دخل نہ دینے دیا۔ اس لئے یہ چیزیں ان کی مادی ترقی میں مانع نہ ہوئیں۔

اسلام دنیا میں آیا اور امیدوں کی ایک دنیا اپنے ساتھ لایا۔ اس نے آتے ہی للکار کر کہا کہ:۔
لَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (۳/۱۳۹)

"مت گھبراؤ، بالکل خوف نہ کھاؤ۔ تم ہی سب سے بلند و برتر ہو۔ بس قوانین خداوندی کو ہاتھ سے نہ چھوڑو۔"

اس نے موجودات عالم، اس کی فرمانبردار ٹھہرائیں۔ متاع دنیا اور مال و منال اس کے لئے باعث زینت وافتخار قرار دیئے۔ سرخروئی عقبیٰ کے ساتھ ساتھ دنیاوی فلاح وبہبود کی زندگی کو بھی خاصۂ حیات گردانا

اور ایک مسلم کی زبان سے یہ دعا نکلوائی کہ:۔

رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَّ فِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً ...(۲/۲)

اس نے ایمان و عمل اور یکسر ایمان و عمل کو رازِ حیات بتایا۔ اور یاس و قنوط، ناامیدی اور عدمِ آرزو کو کفر سے تعبیر کیا اور صاف صاف فرمادیا کہ: لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَۃِ اللّٰہِ (۳۹/۵۳) مصائب و آلام کی گھٹائیں چاروں طرف چھا رہی ہیں۔ مسلمان ...... بے یار و مددگار نظر آتے ہیں۔ بظاہر دل ہلا دینے والے اسباب جمع ہیں۔ لیکن اسلام زندہ آرزوؤں کا مذہب اسلام، اس وقت پکار پکار کر کہتا ہے:۔

لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا (۹/۴۰) مت گھبراؤ، اللہ ہمارے ساتھ ہے۔

اِنَّ نَصْرَ اللّٰہِ قَرِیْبٌ (۲/۲۱۴) وہ دیکھو نصرتِ خداوندی سامنے کھڑی ہے۔

وَاسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوۃِ (۲/۴۵) ہمت و استقلال سے کام لو۔ ہمت بھی کرو۔ دعائیں بھی مانگو۔ حوصلہ رکھو۔ تم دس ہوگے تو سو پر فتح پاؤ گے۔ سو ہوگے تو ہزار پر بھاری ہوگے۔ بشرطیکہ امید کو ہاتھ سے نہ جانے دو۔

یہ قانونِ فطرت دنیا میں خدا کا آخری پیغام بن کر آیا اور چند دنوں میں، صدیوں میں نہیں چند دنوں میں، اس نے سرزمینِ عرب کی کایا پلٹ کر رکھ دی۔ قیصر و کسریٰ کے خزانوں کی کنجیاں، بوریا نشین، بادیہ پیما، اونٹ چرانے والے بدوؤں کے ہاتھوں میں دے دیں۔

لیکن افسوس، یہ تابناک و درخشندہ عہد کچھ زیادہ دیر نہ رہنے پایا تھا کہ فطرت کے یہ سیدھے سادے قوانین گرد و پیش کی فضا سے متاثر ہونے لگ گئے۔ شروع شروع میں شام و فلسطین کے کلیساؤں نے ان پر اپنا رنگ چڑھایا۔ پھر جب حکمتِ یونان عربی میں منتقل ہوئی شروع ہوئی، فلسفۂ اشراقین نے اپنا اثر ڈالا۔ عجم میں زرتشتی آتش کدے ان اثرات کو جلا دینے کے لئے تیار تھے اور اس کے بعد جب ہندوستان میں پہنچے تو ویدانت نے ایسا "من تو شدم تو من شدی" کا منتر پھونکا کہ ایک دوسرے میں مدغم ہو کر یکسر "ہمہ اوست" ہو گئے۔ تا کس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری۔ جہاں جہاں اور جب تک حکومت ہاتھ میں رہی اس کے اثرات زیادہ نہ ابھرے، لیکن جونہی حکومت کا سلسلہ ہاتھ سے چھوٹا ان کا رنگ زبانِ حال سے کہہ رہا تھا کہ ؏ :۔

بالیقیں من نیم، و وہم و گمانم باقیست

میرے نزدیک تصوّف تہذیبِ نفسِ انسانی اور قوائے ملکیّہ کی جِلا کے لئے ازبس ناگزیر ہے۔ لیکن وہی تصوّف جو "نانِ شعیر" سے قوّتِ حیدری پیدا کر دے جس سے اویس قرنیؓ کا سا عشق، ابوذرؓ کا سا فقر، سلمانؓ کا سا صدق، صدیقؓ کا سا ایثار اور خبیبؓ کا سا استقلال پیدا ہو جائے۔ جو خوفِ غیر اللہ کو اس طرح قلبِ مومن سے محروم کر دے کہ راجپوتانے کے سے کفرستان میں تنہا توحید کا نعرہ بلند کرنے میں باک نہ سمجھے۔ جو سرزمینِ دہلی کو جاں سپاری و سرفروشی کی امتحان گاہ بنا دے، جو یہ سبق سکھلائے کہ پانی پت کے میدان میں مسلمان سپاہیوں کی قبروں کے پہلو بہ پہلو حضرت مخدوم جلال اور ترک شیرازی کے مقبرے بھی ہونے ضروری ہیں۔

ہاں تو عرض یہ کرنا تھا کہ ہندوستان میں پہنچ کر فلسفۂ ویدانت نے اسلامی تصوّف پر اس قدر گہرا رنگ چڑھا دیا تھا۔ یہ کیوں ہوا، اس کا جواب مثنوی اسرار و رموز کی ایک تمثیلی حکایت سے ملے گا۔ لکھا ہے کہ ایک جنگل میں بہت سی بھیڑیں رہتی تھیں۔ کچھ دنوں کے بعد وہاں کچھ شیر آ گئے اور ان بھیڑوں کا شکار کرنے لگے۔ ان میں سے ایک بھیڑ بڑی دانا اور ہشیار تھی اس نے سوچا کہ بھیڑوں کو شیر بنانا تو مشکل ہے۔ آؤ ایک ایسی چال چلیں کہ شیر بھیڑوں کی خُو بُو اختیار کر لیں۔ وہ ایک مقدّس صورت اختیار کر کے شیروں کے پاس گئی اور ناپائداریٔ دنیا، نفیٔ وجود، سرابِ ہستی کی خوش آئند تعلیم دینی شروع کی۔ رفتہ رفتہ شیر اس پند خواب آور سے اس درجہ متأثر ہو گئے کہ انہوں نے دینِ گوسفندی اختیار کر لیا۔ حتیٰ کہ سے

شیرِ بیدار از فسونِ میش خفت
انحطاطِ خویش را تہذیب گفت

کچھ گرد و پیش کا اثر جس کے متعلق BLOOMFIELD ایک جگہ لکھتا ہے۔ "ارضِ ہند اپنی آب و ہوا، فطری اثرات اور معاشرتی حالات کی بنا پر متشائم فلسفۂ حیات کی کافی وجوہ اپنے اندر رکھتی ہے" اس پر فلسفۂ ویدانت کا رنگ۔ نتیجہ یہ کہ اکبر کے وقت تک اچھے خاصے ہمہ اوست کے رنگ میں رنگے گئے اور اگر سچ پوچھو تو عالمگیرؒ کے بعد جو سلطنت کو زوال ہوا تو اصولی طور پر سب سے پہلے "شطحیاتِ دارا شکوہ" اس کے ذمہ دار ہیں۔

شاعری بقول میکالے جیکتی ہی دورِ تنزّل و انحطاط میں ہے۔ جہاں تگ و دوِ حیات، کش مکشِ روزگار

لہ اس زمانے میں پرویز صاحب ہنوز تصوّف کی بھول بھلیوں سے نکل نہیں پائے تھے لیکن اس کے باوجود آپ دیکھئے کہ وہ اس وقت بھی کسی قسم کے تصوّف کے قائل تھے۔

جہد للبقاء کا سوال درپیش ہو۔ وہاں فرصت کہاں کہ تیری تمنا کرے کوئی۔ یہی وجہ ہے کہ قدیم ایام سے متشائم فلسفۂ حیات جذباتی شعراء کو ہمیشہ عزیز رہا ہے۔ ہومر کا یہ المیہ گیت کسے یاد نہیں :۔

"دنیا میں جتنی چیزیں ہیں انسان سے زیادہ المناک کسی اور کی زندگی نہیں۔"

اور سوفکلیس کا یہ نوحہ کسے بھولا ہوا ہے :۔

بہترین آرزو یہ ہے کہ دنیا میں انسان آئے ہی نہیں۔

اور اگر آچکا ہے تو پھر سب سے بہتر یہ ہے کہ :۔

انسان جہاں سے آیا ہے جتنی جلدی ہو سکے وہیں واپس لوٹنے کی کوشش کرے۔

عرب کے ولولہ خیز، خون میں حرارت پیدا کرنے والے رجزیہ زمزمے جب عجمی دور تعیش و تنعم کی مجلس میں آئے تو یہاں دنیا ہی نرالی دیکھی۔ نتیجہ یہ کہ :۔ ع

آں قدح بشکست و آں ساقی نماند

حرارت و اضطراب، تڑپ اور سیمابیت کی جگہ کیف و خمار، آسودگی و تن آسانی نے لے لی۔ اس دور کی شاعری پر نظر ڈالئے تو صاف نظر آجائے گا کہ کہاں یہ کہ :۔

اگر جز بکام من آید جواب　　من و گرز و میدان افراسیاب

اور کہاں یہ کہ :۔

حدیث مے و مطرب گو و راز دہر کمتر جو　　کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت ایں معما را

ہندوستان میں اول تو سلطنت مغلیہ کے زوال کے ساتھ ہی لیکن بالخصوص غدر کے بعد اردو شاعری پر یہ دور یاس و قنوط چھا گیا اور خوب اچھی طرح سے چھا گیا۔ شعر کی انتہائی خوبی یہ قرار دی گئی کہ اس میں سوز و گداز ہو، افسردگی ہو، یاس ہو، موت ہو۔ بلکہ موت کے بعد بھی کوئی تڑپ، کوئی حرکت نہ ہو۔ کامل سکوت اور بے حسی ہو غرضیکہ واہ واہ کی جگہ، ہائے ہائے ہو۔ محفل میں چاروں طرف ایک کہرام مچ رہا ہو اور بزم مشاعرہ پر ماتم کدہ کا گمان گزرے۔ اس دور کی شاعری پر ایک طائرانہ نظر ڈالنے سے واضح ہو جائے گا کہ جن شعراء کو اساتذۂ فن کے زمرہ میں صف اولین میں جگہ دی جاتی ہے۔ ان کا طرۂ امتیاز یہی افسردگی و یاس کا فلسفہ ہے۔ کسی ایسے شاعر کا دیوان اٹھا کر دیکھ لیجئے۔ یہی رنگ نظر آئے گا۔ دو چار شعر ملاحظہ ہوں :۔

اب تو یہ چاہتا ہوں کہ اے انتہائے غم　　آئے مجھے ہنسی بھی تو میں رو دیا کروں

عالم کی فضا پوچھو، محرومِ تمنا سے
بیٹھا ہوا دنیا میں، اُٹھ جائے جو دنیا سے

کیا ہنسے انسان اور کیا رو سکے
جی ٹھکانے ہو تو سب کچھ ہو سکے

میرے دم پر جو گزرتی ہے گذر جانے دو
قصۂ غم نہ بڑھاؤ مجھے مر جانے دو

تمہید ہے خزاں کی یہ ہنگامۂ بہار
اچھا ہے میرا نخلِ تمنا ہرا نہ ہو

چال ہے مجھ ناتواں کی مرغِ بسمل کی تڑپ
ہر قدم پہ ہے گماں یاں رہ گیا واں رہ گیا

دلِ مایوس میں اُمید نے لی اس طرح کروٹ
اُبھر کر کوئی سطحِ آب پر گویا حباب آیا

کیا کروں شرحِ خستہ جانی کی
ہم نے مر مر کے زندگانی کی

صبا شکستہ پروں کی دعائیں لیتی جا
جھکا دے اور ذرا شاخ آشیانے کی

فنا سے پہلے غمِ دل کی انتہا معلوم
مگر یہ دل بھی مٹے گا کبھی یہ کیا معلوم

غم ایک ہی ایسا ہے جو دنیا کو بھلا دے
غم کیا ہے یہ نعمت ہے مگر جس کو خدا دے

پوچھا اثرؔ سے میں نے جو دل کا معاملہ!
اک آہ سرد کھینچ کے خاموش ہو گیا

مجبوری و بے بسی ملاحظہ ہو:-

خدا عدو کو بھی یہ خوابِ بد نہ دکھلائے　　قفس کے سامنے جلتا تھا آشیاں اپنا

غرضیکہ کہاں تک لکھتے جائیے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ایک صفِ ماتم بچھ رہی ہے۔ جس پر دنیا و مافیہا کی نوحہ خوانی ہو رہی ہے۔ اور قوا اور جو چیزیں کبھی حصول سرور و انبساط کی غرض سے اختراع کی گئی تھیں، ان سے بھی مقصود حزن وغم ہی لیا جاتا ہے۔ شراب تک کی بھی خواہش محض اس لئے رہ گئی کہ ایک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہئے۔ اور ہمارے اس "موروثی ذوقِ ماتم کدہ" کا اندازہ آج بھی اس سے لگ سکتا ہے کہ موسیقی جیسی طرب انگیز اور گرما دینے والی چیز بھی اس وقت تک محظوظ نہیں کر سکتی جب تک اس میں نغمہ ہائے جانگداز اور "سوز" کی سریں نہ ہوں۔

غرضیکہ افسردگی و غنودگی کا یہ عالم مسلمانانِ ہند پر چھا رہا تھا۔ اور لطف یہ کہ اس کا نام "تہذیب و اخلاق" رکھ چھوڑا تھا۔ قاعدہ ہے کہ انحطاط و زوال کے وقت خدا کے بندے پیدا ہوتے ہیں۔ اور اُمتِ مرحومہ میں تو ایسے ایسے صاحبانِ حکمت و بصیرت پیدا ہوتے ہیں جو نبی اسرائیل کے انبیاء کرام کے سے کام کر کے دکھاتے ہیں (حدیث شریف[1]) چنانچہ شعراء میں حالی مرحوم نے اس کا احساس کیا۔ قوم پر بڑی لے دے کی۔ ہر چند دل میں بڑا درد تھا۔ لیکن صدیوں کے نشہ کو چند "طعنوں" سے اتارنا مشکل تھا۔ اکبر مرحوم بھی جب دل کی ٹیس سے مجبور ہوئے تو مریض کو ہوش میں لانے کے لئے کچو کے دیئے اور حقیقت یہ ہے کہ خوب دیئے اور ہنسا ہنسا کر، گدگدا گدگدا کر ایسی ایسی پتے کی کہہ گئے کہ جو سن لاگے سو سن جانے۔ لیکن مرض کی کہنگی اور مریض کی ضد سے وہاں بھی یاس کا پہلو غالب رہا۔

لیکن قدرتِ کاملہ نے "بانگِ درا" کی خدمت کسی اور کے حصہ میں رکھی تھی۔ وقت آیا اور وہ ہستی پنجاب کے ایک اقبالؒ کے نام سے منصۂ شہود پر جلوہ فگن ہوئی۔ اس کی چشمِ حقیقت بیں نے واقعات کو چھوڑ کر ان کے علل و اسباب پر غور کیا۔ اور اس رموز شناسِ فطرت نے خوب محسوس کیا کہ فقدانِ عمل، بے حسی اور مُردہ دلی کا سبب یہ ہے کہ سینوں میں دل اور دلوں میں آرزوئیں اور اُمنگیں، جوش و ولولے پیدا کرنے والی حرارت موجود نہیں۔ آتش دان ہیں، لیکن افسردہ اور ٹھٹھرے ہوئے اور علتِ مرض یہ ہے کہ قوم اپنی حقیقت سے بے خبر ہو چکی ہے

---

[1] اس حدیث کی صحت بھی مشکوک ہے۔

افرادِ ملّت کا نظریۂ حیات متشائم ہو چکا ہے۔ لہٰذا سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ انہیں ان کی حقیقت سے آگاہ کیا جائے۔ انہیں امکاناتِ زندگی کی وسعتوں سے روشناس کرایا جائے۔ اور مثنوی کے تمثیلی شیر کی طرح جو ایک عرصہ تک بھیڑ کے گلہ میں پرورش پاکر اپنے آپ کو بھیڑ ہی شمار کرنے لگا تھا، کسی آئینہ میں اسے اس کے اصلی خط و خال سے واقف کرا دیا جائے۔ ایک حقیقت بیں نبّاض کی طرح اس نے علتِ مرض دریافت کی اور بہترین معالج کی طرح اس کے لئے نسخے تجویز کئے اور ہر چند مرض مزمن اور مریض ضدی۔ اور ضدی بھی ایسا کہ خود درد کو دوا سمجھنے لگ گیا تھا۔ لیکن اس کی پیشانی پر شکن تک نہیں آیا۔ اس نے طبائع کی کمزوریوں کو حقارت کی نگاہ سے نہیں دیکھا، بلکہ ان کے حال زبوں پر رحم کھایا اور مشفقانہ طور پر گرے ہوئے کو اٹھایا اور اٹھا کر سینے سے لگا لیا۔

سب سے پہلے ہم یہی دیکھتے ہیں کہ اس نے زندگی کی درخشندہ و تابناک تصویر، جس پر صدیوں سے یا بوۂ مُردہ دلی کا گرد و غبار پڑ رہا تھا، کس طرح اپنے اصلی خط و خال میں پیش کی۔ ہر چند علامہ ممدوح کا سارا کلام انہیں رموز و حقائق سے لبریز ہے۔ لیکن مثال کے طور پر چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں۔

فرماتے ہیں :-

آشنا اپنی حقیقت سے ہو اے دہقاں ذرا		دانہ تو، کھیتی بھی تو، باراں بھی تو، حاصل بھی تو

اپنی اصلیت سے ہو آگاہ اے غافل کہ تو		قطرہ ہے لیکن مثالِ بحرِ بے پایاں بھی ہے
ہفت کشور جس سے ہو تسخیر بے تیغ و تفنگ		تو اگر سمجھے تو تیرے پاس وہ ساماں بھی ہے
کیوں گرفتارِ طلسمِ ہیچ مقداری ہے تو		دیکھ تو پوشیدہ تجھ میں شوکتِ طوفاں بھی ہے

بے خبر تو جوہرِ آئینۂ ایام ہے		تو زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہے

اور وسعت ملاحظہ فرمائیں :-

وہ مشتِ خاک ہوں فیضِ پریشانی سے صحرا ہوں		نہ پوچھو میری وسعت کو زمیں سے آسماں تک ہے

شبِ معراج سے یہ سبق اخذ فرماتے ہیں کہ :-

رہ یک گام ہے ہمت کے لئے عرشِ بریں		کہہ رہی ہے یہ مسلمان سے معراج کی رات

اس کے "دست و بازو" کو یہ مادیات تک ہی محدود نہیں گردانتے، بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ جاتے ہیں۔

ارشاد ہے:۔

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زورِ بازو کا — نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

دامِ تسخیر کی وسعت اور ملاحظہ فرمائیے:۔

در دشتِ جنونِ من جبریل زبوں صیدے — یزداں بکمند آور اے ہمتِ مردانہ

وہ "حیاتِ جاوداں کو" زندگی کی چار دیواری تک محصور نہیں سمجھتے۔ ان کے نزدیک:۔

زندگی کی آگ کا انجام خاکستر نہیں — ٹوٹنا جس کا مقدر ہو یہ وہ گوہر نہیں

جب حضرتِ انسان کی ممکناتِ زندگی کی یہ وسعتیں ہوں، تو اسے کیوں نہ یہ درسِ حیات دیا جائے کہ:۔

اے ز آدابِ امانت بے خبر — از دو عالم خویش را بہتر شمر
تا کجا خود را شماری ماء و طیں — از گلِ خود شعلۂ طور آفریں

یاد رکھیے:۔

ناتواں خود را اگر رہرو شمرد
نقدِ جانِ خویش با رہزن سپرد

اور یہ کیوں ہے؟ اس لئے کہ:۔

ولے ایں راز جز من کس نداند — ضمیرِ خاک و خرمِ بے چگون است

انتہا یہ ہے کہ:۔

قدم در جستجوئے آدمے زن — خدا ہم در تلاشِ آدمے ہست

اس سے زیادہ اور کیا قیمت ہو سکتی ہے کہ خدا ہم در تلاشِ آدمے ہست۔ اللہ اکبر۔ یہ قدر و قیمت! ہاں! اور چلتے چلتے ذرا اس معرکۃ الآراء۔ زندۂ جاوید نظم کے دو چار شعر بھی سنتے جائیے۔ جس کا عنوان ہی اس پیامبرِ حیات نے "زندگی" رکھا ہے۔ دیکھئے اور غور فرمائیے کہ کیا یہ ہمارا ہی ذکر ہو رہا ہے۔ زندگی کی بقا، ملاحظہ فرمائیے:۔

برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی — ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیمِ جاں ہے زندگی
تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ — جاوداں، پیہم دواں، ہر دم جواں ہے زندگی
اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے — سرِ آدم ہے ضمیرِ کن فکاں ہے زندگی

آشکارا ہے یہ اپنی قوتِ تسخیر سے	گرچہ اک مٹی کے پیکر میں نہاں ہے زندگی

پھر اس کے اثرات ملاحظہ فرمائیے :-

پھونک ڈالے یہ زمین و آسمانِ مستعار	اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے
زندگی کی قوتِ پنہاں کو کر دے آشکار	تا یہ چنگاری فروغِ جاوداں پیدا کرے

ممکناتِ زندگی کے ساتھ ساتھ متاعِ دنیا کے تمتع اور تسخیرِ قوائے نظامِ عالم کا درس بھی ضروری تھا۔ کیونکہ منشائم فلسفۂ حیات نے متاعِ دنیا کو حرام سمجھ رکھا تھا۔ فرماتے ہیں :- ؎

اے کہ از تاثیرِ افیوں خفتۂ	عالمِ اسباب را دوں گفتۂ
خیز و واکن دیدۂ مخمور را	دوں مخواں ایں عالمِ مجبور را
حق جہاں را قسمتِ نیکاں شمرد	جلوہ اش با دیدۂ مومن سپرد
نائبِ حق در جہاں آدم شود	بر عناصر حکمِ او محکم شود
دست رنگیں کن ز خونِ کوہسار	جوئے آب گوہر از دریا برار
جستجو را محکم از تدبیر کن	انفس و آفاق را تسخیر کن
غنچۂ از خود چمن تعمیر کن	شبنمی؟ خورشید را تسخیر کن

یعنی عناصرِ عالم کے سامنے سر نیوڑھا کر، ہاتھ باندھ کر اطاعت کے لئے کھڑا نہ ہو جا۔ بلکہ ان سے خدمت لے۔ انہیں تابعِ فرمان بنا اور متاعِ دنیا سے پورا پورا فائدہ اٹھا۔

حقیقت سے آگاہی کا لازمی نتیجہ تھا کہ قوم کو اپنی بے حسّی اور جمود و سکوت کا احساس پیدا ہوتا۔ چنانچہ جب دیکھا کہ قلبِ ملّت میں خوابیدہ حسیات کی بیداری کی علامات ظاہر ہو رہی ہیں۔ عروقِ مردہ میں خونِ زندگی کے آثار نمایاں ہونے لگے ہیں، تو تخلیقِ آرزو (یا کم از کم تجدیدِ آرزو) کی ضرورت پڑی۔ کیونکہ جب ایک طرف متاعِ حیات کی قدر و قیمت اور دوسری طرف اپنی قوتِ بازو کا احساس پیدا ہو گیا تو جلبِ منفعت اور دفعِ مضرت کے لئے آرزوؤں کا پیدا ہونا اس کا لازمی نتیجہ تھا۔ لہٰذا آرزو کی اہمیت مختلف پیرایوں میں واضح کی گئی اور میں کہوں گا کہ یہی چیز علامہ ممدوح کا حقیقی پیغام ہے۔ پہلی منزل کو اس کا مقدمہ سمجھنا چاہئے اور قوتِ عمل کو اس کا نتیجہ۔ یہی جوہر تھا جس کے فقدان سے قوم پر مردہ دلی اور بے حسّی کی گھٹائیں چھا رہی تھیں

اور اس کی تخلیق بار جعت اس مرض کا علاج تھا۔ اب ملاحظہ فرمائیے کہ کس جوش اور ولولے سے اُمید دل کی بستی از سرِ نو تعمیر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ سب سے پہلے للکار کر یہ پیغام سنایا کہ :—

مسلم استی سینہ را از آرزو آباد دار ہر زماں پیشِ نظر لایخلف المیعاد دار

دیکھئے اس ایک شعر کے اندر کس قدر سربستہ رازِ حیات پوشیدہ ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ سارے فلسفۂ حیات کا نچوڑ اس پیغام کے اندر موجود ہے۔ آرزو سے خالی دل کی کچھ قدر و قیمت ان کے نزدیک نہیں ہے۔ فرماتے ہیں :—

اگر ز رمزِ حیات آگہی بجوئے مگیر دِلے کہ از خلشِ خارِ آرزو پاک است

مثنوی اسرار و رموز میں جس میں علامہ ممدوح کا حقیقی معنوں میں مکمل پیغامِ حیات محفوظ ہے اور اس کے بعد کا کلام اسی کلام کی تفسیر و تشریح۔ مسئلہ آرزو پر بڑی شرح و بسط سے بحث کی گئی ہے اور مختلف انداز سے اس کی اہمیت پر زور ڈالا گیا ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں :—

زندگی در جستجو پوشیدہ است اصلِ او در آرزو پوشیدہ است
آرزو را در دلِ خود زندہ دار تا نگردد مشتِ خاکِ تو مزار!
آرزو جانِ جہانِ رنگ و بوست فطرتِ ہر شے امینِ آرزوست
از تمنا رقصِ دل در سینہ ھا سینہ ہا از تابِ او آئینہ ہا
طاقتِ پرواز بخشد خاک را خضر باشد موسئِ ادراک را
دل ز سوزِ آرزو گیرد حیات غیرِ حق میرد چو او گیرد حیات
چوں ز تخلیقِ تمنا باز ماند شہپرش بشکست و از پرواز ماند
آرزو ہنگامہ آرائے خودی موجِ بے تابے ز دریائے خودی
آرزو صیدِ مقاصد را کمند دفترِ افعال را شیرازہ بند
زندہ را، نفیِ تمنا مردہ کرد شعلہ را نقصانِ سوز افسردہ کرد

ما ز تخلیقِ مقاصد زندہ ایم
از شعاعِ آرزو تابندہ ایم

دوسری جگہ فرماتے ہیں:-

گرم خون انساں ز داغ آرزو — آتش ایں خاک از چراغ آرزو
از تمنائے بجام آمد حیات — گرم خیز و تیز گام آمد حیات
زندگی مضمون تسخیر است و بس — آرزو افسون تسخیر است و بس
زندگی صید افگن و دام آرزو — حسن را از عشق پیغام آرزو

ایک جگہ یاس و حزن و خوف کو امّ الخبائث و قاطعِ حیات قرار دیتے ہوئے رقمطراز ہیں:-

مرگ را ساماں ز قطع آرزوست — زندگانی محکم از لاتقنطوست
تا امید از آرزوئے پیہم است — ناامیدی زندگانی را سم است
زندگی را یاس خواب آور بود — ایں دلیلِ سستیِ عنصر بود
از دمش میرد قوائے زندگی — خشک گردد چشمہ ہائے زندگی

یاس و ناامیدی فی الحقیقت ان کے پاس تک نہیں پھٹکتی، سخت سے سخت مصیبت میں بھی سررشتۂ امید ہاتھ سے نہیں چھوٹنے دیتے۔ فرماتے ہیں:-

کب ڈرا سکتا ہے غم کا عارضی منظر مجھے — ہے بھروسا اپنی ملت کے مقدر پر مجھے

اور:-

یاس کے عنصر سے ہے آزاد میرا روزگار — فتحِ کامل کی خبر دیتا ہے جوشِ کارزار

ریاضِ ملت پر خزاں مسلط ہو چکی ہے۔ بادِ سموم کے جھونکوں نے ہرے بھرے درختوں کو خشک کر دیا ہے۔ برگ و گل مرجھا مرجھا کر گر پڑے ہیں۔ ایک ادھ پتا کہیں کہیں مثل چہرۂ مدقوق زرد نظر آتا ہے۔ یاس و قنوط کے اس اندوہناک سماں میں کسے امید ہو سکتی ہے کہ یہ اجڑا چمن پھر بھی آباد ہوگا۔ لیکن ہمارا امیدوں کا شہزادہ ہے کہ اب بھی متشائم نظریہ کو پاس تک نہیں آنے دیتا اور چپکے سے آ کر یہ درسِ حیات دیتا ہے کہ:-

ملت کے ساتھ رابطہ استوار رکھ — پیوستہ رہ شجر سے امیدِ بہار رکھ

اس مضمون کو مثنوی میں اس طرح فرمایا ہے:-

برگ سبزے کز نہالِ خویش ریخت — از بہاراں تارِ امیدش گسیخت
در خزاں اے بے نصیب از برگ و بار — از شجر مگسل بامیدِ بہار

اُمید — اُمید — اور ہر حالت میں اُمید — کبھی مایوسی نہیں — کبھی افسردگی نہیں۔ پھر اس گلچینِ بہار میں وسعتِ داماں ملاحظہ فرمایئے :- ؎

نہ ہو قناعت شعار گلچیں اسی سے قائم ہے شان تیری
وفورِ گل ہے اگر چمن میں تو اور دامن دراز ہو جا

اسی مضمون کو دوسری جگہ اس طرح بیان کیا ہے :- ؎

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا
ورنہ گلشن میں علاجِ تنگیٔ داماں بھی ہے

اُمید و آرزو کا ایسا متغاول فلسفۂ حیات کم ہی کسی کے ہاں ملے گا۔

اب جبکہ آرزوئیں پیدا ہو گئیں۔ اُمیدیں وابستہ ہو گئیں۔ ناامیدی کا چھلاوا غائب ہو گیا۔ حزن و ملال کا بوجھ دل سے ہلکا ہوا تو حصولِ مدعا کے لئے فطری طور پر دل میں ایک تڑپ پیدا ہوئی۔ یہاں پہنچ کر اب یہ بتانے کی ضرورت تھی کہ یاد رکھو، کامیابی و کامرانی، فتح و نصرت کا راز عمل اور قوت میں پوشیدہ ہے اور آرزو بغیر عمل کے بالکل مہمل چیز ہے۔ چنانچہ یہ رازِ سربستہ کھول کر سامنے رکھ دیا کہ :- ؎

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

مثنوی میں فرماتے ہیں :- ؎

در عمل پوشیدہ مضمونِ حیات
لذتِ تخلیق قانونِ حیات

قوت کی اہمیت کے متعلق ذیل کے دو مصرعوں میں جن دو حقائق کا انکشاف کیا گیا ہے۔ بڑی بڑی ضخیم کتابوں میں بھی مضمون سما نہ سکتا تھا۔ ملاحظہ فرمایئے :- ؎

زندگی کشت است و حاصل قوت است
شرحِ رمزِ حق و باطل قوت است

یہ وہ معارف و حقائق ہیں جو کسی دلیل کے محتاج نہیں۔ مِلل و اقوامِ عالم کی تاریخ۔ اور خود دورِ حاضرہ کے روزانہ مشاہدات اس کی زندہ مثالیں ہیں۔

جب اپنی حقیقت سے آگہی۔ دل میں آرزو اور جوشِ عمل اور بازو میں قوت پیدا ہو گئی تو ایک ایسا معیارِ حیات مقرر کر دیا جس سے زندگی کی خامیاں دور ہو کر اس میں پختگی پیدا ہو جائے اور زندگی اس درجہ محکم و استوار ہو جائے کہ بڑے سے بڑا خطرہ اور مہیب سے مہیب حادثہ اس میں تزلزل نہ پیدا کر سکے۔ اس مقام پر قرآنِ حکیم نے فرمایا کہ : وَلَنَبْلُوَنَّكُم بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ .... إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ

راجعون ۲/۱۵۵ ۔ کہ "دنیا میں تمہارے اوپر مختلف قسم کی آزمائشیں آئیں گی ۔ منجملہ ان کے خوف و حزن ، بھوک پیاس نقصِ مال و جان وغیرہ ہوں گی ۔ پس فتح و کامرانی کی خوشخبری ان کے لئے ہے کہ جب ان پر کوئی مصیبت آتی ہے تو ہمت و استقلال سے کام لیتے ہیں اور بے باکانہ کہہ دیتے ہیں کہ ہماری زندگی اور موت ، رنج و غم ، سود و زیاں جو کچھ بھی ہے ، سب اللہ کے لئے ہے اور ہم سب کو اسی کی طرف پلٹنا ہے ۔"

چنانچہ ایک ایسی ہی زندگی کا نقشہ علامہ ممدوح نے پیش کیا ہے ۔ فرماتے ہیں :-

بہ کیشِ زندہ دلاں زندگی جفا طلبی است
سفر بکعبہ نکردم کہ راہ بے خطر است

دوسری جگہ اس کو یوں بیان فرماتے ہیں :-

مرا صاحبدلے این نکتہ آموخت
ز منزل جادۂ پیچیدہ خوشتر

بے باک زندگی کے متعلق فرماتے ہیں :-

دلِ بے باک را ضرغام رنگ است
دلِ ترسندہ را آہو پلنگ است
اگر بیمے نداری بحر صحرا است
اگر ترسی بہ ہر موجش نہنگ است

پوچھا گیا کہ رازِ حیات کس چیز میں ہے ۔ جواب سن لیجئے :-

رفیقش گفت اے یارِ خردمند
اگر خواہی حیات اندر خطر زی
خطر تاب و توان را امتحان است
عیارِ ممکناتِ جسم و جان است

لالۂ طور میں فرماتے ہیں :-

سکندر با خضر خوش نکتہ گفت
شریکِ سوز و سازِ بحر و بر شو
تو این جنگ از کنارِ عرصہ بینی
بمیر اندر نبرد و زندہ تر شو

دوسری جگہ اس کو یوں بیان فرماتے ہیں :-

بدریا غلط و با موجش در آویز
حیاتِ جاوداں اندر ستیز است

آپ نے غالباً یہ تعلیم بھی سنی ہوگی :-

بدریا در منافع بے شمار است
وگر خواہی سلامت بر کنار است

اب ذرا اوپر کے شعر کو دوبارہ ملاحظہ فرمائیے :-

خیال کن تو کجائی و ما کجا واعظ

دوسروں کے آسرے پر زندگی کے متعلق ایک جگہ لکھتے ہیں :۔ ؎

مرا از شکستن چنیں عار ناید ۔۔۔ کہ از دیگراں خواستن مومیائی

اسی طرح ؎ :۔

نفس دارد و لیکن جاں ندارد ۔۔۔ کسے کو بر مراد دیگراں زیست

یہ شعر تو یقیناً آج ہر مسجد کے محراب پر کندہ کروا دینا چاہیے اور اس کے قطعات ہر مکان اور ہر دکان میں آویزاں ہونے چاہئیں ۔

بخود خزیدہ و محکم چو کوہساراں زی!
چو خس مزی کہ ہوا تیز و شعلہ بیباک است

اللہ اکبر ۔ کس قدر " زندگی " ہے اس پیغام کے اندر ۔
پھر جب زندگی اس قالب میں ڈھل جائے ۔ قوم کی قوم اس رنگ میں رنگی جائے تو امیدوں کی چہکتی دنیا کا تخیل کس جنتِ ارضی کا نظارہ پیش کرتا ہے ۔ سن لیجئے :۔ ؎

فروغِ خاکیاں از نوریاں افزوں شود روزے ۔۔۔ زمین از کوکبِ تقدیرِ ما گردوں شود روزے

یہ ہے مختصراً پیغامِ حیات ہمارے متفادل رموز شناس فطرت شاعر کا ۔ جس نے فی الواقعہ مسیحا کا کام کیا ہے ۔ اور اگر یہ صحیح ہے کہ قوم کی حالت بدلنے کے لئے پہلے افرادِ ملت کی ذہنیت بدلنی ضروری ہوتی ہے تو بلا خوفِ تردید کہا جائے گا کہ آج تعلیم یافتہ مسلمانوں میں اگر کچھ زندگی کے آثار نظر آنے لگے ہیں ۔ تو یہ علامہ ممدوح مدظلہ العالی کے پیامِ حیات بخش کے رہینِ منت ہیں ۔ آج اگر ان اثرات کی ابتدا ہے ۔ تو کل بعونہٖ تعالیٰ یہ شجرِ طیب اصلہا ثابت و فرعہا فی السماء بن کر بڑھے پھولے گا اور اسلام کی حیاتِ جدیدہ میں علامہ موصوف کا نام درخشندہ ستارے کی طرح تابناک رہے گا ۔

اے کاش مُردوں کی یادگاریں قائم کرنے والی قوم اپنے زندہ افراد کی قدر کرنا بھی سیکھے !

حکایت بود بے پایاں بخاموشی ادا کردم

پرویز

تحریر کردہ ۱۹۳۲ء برائے اقبالؒ نمبر ماہنامہ نیرنگِ خیال لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اقبالؒ اور ختمِ نبوّتؐ

(بتقریب یومِ اقبالؒ اپریل ۱۹۷۵ء)

پرویز

عزیزانِ گرامی قدر۔ السلامُ علیکم!

اِمسال یومِ اقبالؒ کی تقریب کے لیئے جو موضوع تجویز کیا گیا ہے، میرے نزدیک حالات کی مناسبت سے وہ نہایت موزوں ہے۔ ایک تو اس لیئے کہ ختمِ نبوّت دین کی اساس و بنیاد ہے اور دوسرے اس بنا پر کہ علاّمہ اقبالؒ نے جس طرح پاکستان کا تصوّر دے کر مسلمانانِ ہند کی جدّوجہدِ آزادی کے لیئے ایک نصب العین متعیّن کر دیا، اسی طرح انہوں نے عقیدۂ ختمِ نبوّت کی اہمیّت اور عظمت کی وضاحت سے اس تحریک کو بھی نشانِ منزل عطا کر دیا۔ حضرتِ علاّمہ کے یہ اتنے بڑے احسانات ہیں کہ ان کی یاد قائم رکھنا قوم کا ملّی فریضہ ہے، اس لیئے بھی کہ خود اس کی دینی زندگی کا راز بھی اسی میں پوشیدہ ہے۔

آجکل اس افتراء کو فضا میں عام کیا جا رہا ہے کہ علاّمہ اقبالؒ مرزا غلام احمد کے دعویٰ کی صداقت کے قائل تھے اور ان کی جماعت کی حقّانیت کے معترف۔ "احمدی" حضرات کا یہ عام شعار ہے کہ یہ تلبیس سے کام لیتے ہیں ۔۔ مثلاً وہ اپنے امام (مرزا غلام احمد) کی تحریروں سے چُن چُن کر وہ عبارتیں پیش کریں گے جن میں مرزا صاحب نے، اپنی زندگی کے ابتدائی دَور میں مسلمانوں جیسے عقائد و نظریات کی تلقین کی تھی اور ان کی اُن تحریروں کو کبھی سامنے نہیں لائیں گے جن کی رُو سے انہوں نے نبوّت کا دعویٰ کیا اور تمام مسلمانوں کو خارج از اسلام قرار دے کر اپنی الگ اُمّت کی تشکیل کی تھی۔ علاّمہ اقبالؒ نے ۱۹۱۱ء میں علی گڑھ یونیورسٹی میں ایک تقریر کی تھی جس کا اُردو ترجمہ "ملّتِ بیضا پر ایک عمرانی نظر" کے عنوان سے شائع ہوُا تھا۔ اس میں انہوں نے کہا تھا۔

میری رائے میں قومی سیرت کا وہ اسلوب جس کا سایہ عالمگیر کی ذات نے ڈالا ہے، ٹھیٹھ

اسلامی سیرت کا نمونہ ہے اور ہماری تعلیم کا یہ مقصد ہونا چاہیئے کہ اس نمونہ کو ترقی دی جائے۔ اور مسلمان ہر وقت اسے پیشِ نظر رکھیں۔ پنجاب میں اسلامی سیرت کا ٹھیٹھ نمونہ اس جماعت کی شکل میں ظاہر ہوا ہے جسے فرقۂ قادیانی کہتے ہیں۔

علامہ اقبالؒ کا اظہارِ حقیقت

"احمدی حضرات اِس اقتباس کو ہر جگہ اُچھالتے پھرتے ہیں اور اسے اپنے امام کے دعویٰ کی صداقت کے لیئے بطورِ سند پیش کرتے ہیں اور کبھی یہ نہیں بتاتے کہ خود علامہ اقبالؒ نے اس عبارت کے متعلق کیا کہا تھا۔ انہوں نے کہا تھا:

جہاں تک مجھے یاد ہے، یہ تقریر میں نے ۱۹۱۱ء یا اس سے قبل کی تھی اور مجھے یہ تسلیم کرنے میں کوئی باک نہیں کہ اب سے (یعنی ۱۹۳۵ء سے) ربع صدی پیشتر مجھے اِس تحریک سے اچھے نتائج کی اُمید تھی۔ اس تقریر سے بہت پہلے مولوی چراغ علی مرحوم نے جو مسلمانوں میں کافی سربرآوردہ تھے اور انگریزی میں اسلام پر بہت سی کتابوں کے مصنف بھی تھے، بانیٔ تحریک کے ساتھ تعاون کیا اور جہاں تک مجھے معلوم ہے، کتاب "براہینِ احمدیہ" میں بیش قیمت مدد پہنچائی۔ لیکن مذہبی تحریک کی اصل روح ایک دن میں نمایاں نہیں ہو جاتی۔ اسے اچھی طرح ظاہر ہونے کے لیئے برسوں چاہئیں۔ تحریک کے دو گروہوں کے باہمی نزاعات اس امر پر شاہد ہیں کہ خود ان لوگوں کو جو بانیٔ تحریک کے ساتھ ذاتی رابطہ رکھتے تھے۔ معلوم نہ تھا کہ تحریک آگے چل کر کس راستہ پر پڑ جائے گی ذاتی طور پر میں اس تحریک سے اُس وقت بیزار ہوا تھا جب ایک نئی نبوّت ــــ بانیٔ اسلام کی نبوّت سے اعلیٰ تر نبوّت ــــ کا دعویٰ کیا گیا اور تمام مسلمانوں کو کافر قرار دیا گیا۔ بعد میں یہ بیزاری بغاوت کی حد تک پہنچ گئی۔ جب میں نے تحریک کے ایک رُکن کو اپنے کانوں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق نازیبا کلمات کہتے سُنا۔ درخت جڑ سے نہیں، پھل سے پہچانا جاتا ہے۔ اگر میرے موجودہ رویّہ میں کوئی تناقض ہے تو یہ بھی ایک زندہ اور سوچنے والے انسان کا حق ہے کہ وہ اپنی رائے بدل سکے۔ بقول ایمرسن اپنے آپ کو صرف پتھر جھٹلا نہیں سکتے۔

(احمدیت اور اسلام)

مفکرین کی یہی کیفیت ہوتی ہے کہ جُوں جُوں ان کے معاملہ میں وسعت اور فکر میں گہرائی پیدا ہوتی ہے، وہ اپنے سابقہ خیالات پر نظرِثانی کرکے ان میں تبدیلی ۔ ۔ ۔ کرتے رہتے ہیں۔ یہ تو صرف خاصۂ نبوت ہے کہ اس کا پیغام روزِ اوّل سے آخری دن تک یکساں اور واحد رہتا ہے۔ یہ اس لئے کہ اس پیغام کا سرچشمہ علم خداوندی ہوتا ہے جو زمان اور مکان کی حدود سے ماوراء اور ہر آن بدلنے والے احوال و کوائف کی اثر پذیری سے منزّہ و معرّا ہوتا ہے۔ علّامہ اقبالؒ نے اپنی تقریر کے متعلق جو وضاحت کی ہے، اس کے علاوہ خود "احمدی" حضرات کے ہاں سے بھی ایسی شہادت ملتی ہے جس کی رُو سے ان حضرات کا یہ دعویٰ کہ علّامہ اقبالؒ بھی قادیانیت کی صداقت کے معترف تھے، پاش پاش ہو جاتا ہے۔ مرزا غلام احمد کے بیٹے مرزا بشیر احمد نے "سیرت المہدی" کے عنوان سے اپنے والد کے سوانح حیات قلمبند اور شائع کئے ہیں۔ وہ اس میں لکھتے ہیں کہ :۔

ڈاکٹر سر محمد اقبالؒ جو سیالکوٹ کے رہنے والے تھے، ان کے والد کا نام شیخ نور محمد تھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ شیخ نور محمد صاحب نے غالباً ۱۸۹۱ء یا ۱۸۹۲ء میں مولوی عبدالکریم صاحب مرحوم اور سید حامد شاہ صاحب مرحوم کی تحریک پر حضرت مسیح موعود علیہ السلام (مرزا غلام احمد قادیانی) کی بیعت کی تھی۔ ان دنوں سر محمد اقبالؒ اسکول میں پڑھتے تھے اور اپنے باپ کی بیعت کے بعد وہ بھی اپنے آپ کو احمدیت میں شمار کرتے تھے اور حضرت مسیح موعود کے معتقد تھے۔ چونکہ سر محمد اقبالؒ کو بچپن سے شعر و شاعری کا شوق تھا اس لئے ان دنوں میں انہوں نے سعداللہ لدھیانوی کے خلاف حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی تائید میں ایک نظم بھی لکھی تھی۔ مگر اس کے چند سال بعد جب سر اقبالؒ کالج میں پہنچے تو ان کے خیالات میں تبدیلی آگئی اور انہوں نے اپنے باپ کو سمجھا بجھا کر احمدیت سے منحرف کر دیا۔ چنانچہ شیخ نور محمد صاحب نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی خدمت میں ایک خط لکھا جس میں یہ تحریر کیا کہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آپ میرا نام اس جماعت سے الگ رکھیں۔ اس پر حضرت صاحب کا جواب میر حامد شاہ مرحوم کے نام گیا جس میں لکھا گیا کہ شیخ نور محمد کو کہہ دیں کہ وہ جماعت سے الگ نہیں بلکہ اسلام سے بھی الگ ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ڈاکٹر سر محمد اقبالؒ اپنی زندگی کے آخری ایام میں احمدیت کے شدید طور پر مخالف رہے اور ملک کے نوتعلیم یافتہ طبقہ میں احمدیت کے خلاف جو زہر پھیلا ہوا ہے اس کی بڑی وجہ ڈاکٹر سر اقبالؒ کا مخالفانہ پروپیگنڈہ تھا۔ (سیرت المہدی۔ جلد سوم صفحہ ۲۴۹۔ طبع اوّل اپریل ۱۹۳۹ء)

میں ان بیانات کے تنقیدی جائزہ سے صرفِ نظر کرتے ہوئے، کہنا صرف یہ چاہتا ہوں کہ "احمدی" حضرت علّامہ اقبالؒ

کی تقریر کے ایک فقرہ کو تو اُچھالتے پھرتے ہیں لیکن نہ ان کی طرف سے پیش کردہ وضاحت کا کبھی ذکر کرتے ہیں اور نہ ہی خود مرزا صاحب کے صاحبزادہ کی اس شہادت کو سامنے لاتے ہیں۔ یہ ہے ان کے تلبیسی پراپیگنڈے کے انداز کی ایک مثال۔

علامہ اقبالؒ کی طرف سے تحریک "احمدیت" کی اس (بقول مرزا بشیر احمد) زہر آلود مخالفت کی ابتدا ۱۹۳۵ء میں ہوئی۔ اور یہیں سے میں بھی اس داستان کا آغاز کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن اس کی تمہید کے طور پر ایک اور واقعہ کا پیش کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ اسے پیش کرتے وقت مجھے کچھ جھجک سی محسوس ہوتی ہے کیونکہ ذکر علامہ اقبالؒ کا ہو رہا ہے اور اس واقعہ کا تعلق خود میری اپنی ذات سے ہے۔ لیکن اس کی اہمیت کا تقاضا اس جھجک پر غالب آجاتا ہے اور اس جرأت کا کفارہ بن جاتا ہے۔ وہ واقعہ یہ ہے کہ ۱۹۲۶ء کی بات ہے

بہاول پور کا مقدمہ

کہ سابق ریاست بہاولپور کی ایک عدالت میں ایک مقدمہ دائر ہوا جس میں ایک مسلمان خاتون نے یہ دعویٰ کیا کہ اس کے خاوند نے قادیانی مسلک اختیار کر لیا ہے جس کی وجہ سے وہ مرتد ہو گیا ہے۔ اس لئے اس شخص سے مدعیہ کا نکاح فسخ قرار دیا جائے۔ اس مقدمہ نے ملک گیر شہرت حاصل کر لی اور مسلمانوں میں ایک ہیجان پیدا ہو گیا۔ اس لئے نہیں کہ اس میں فریقین کی حیثیت بڑی ممتاز تھی — وہ تو بالکل غیر معروف سے تھے۔ یہ اس لئے کہ (غیر منقسم) ہندوستان میں (غالباً) یہ اپنی نوعیت کا پہلا مقدمہ تھا جس میں فیصلہ طلب سوال یہ تھا کہ ایک شخص قادیانی مسلک اختیار کرنے کے بعد مسلمان رہتا ہے یا نہیں؟ اس اعتبار سے یہ متعلقہ فریقین کا مابہ النزاع معاملہ نہ رہا بلکہ قادیانیوں اور غیر قادیانیوں کے مابین ایک دینی سوال بن گیا جس کا عدالتی فیصلہ، ظاہر ہے کہ، بڑی اہمیت کا حامل تھا۔ یہ مقدمہ قریباً نو سال تک زیرِ سماعت رہا اور آخرالامر محمد اکبر صاحب ڈسٹرکٹ جج بہاولنگر نے (جو اَب مرحوم ہو چکے ہیں) ۷ / فروری ۱۹۳۵ء کو اس کا فیصلہ سُنا دیا۔ یہ فیصلہ اپنی شہرت اور اہمیت کے پیشِ نظر، اس زمانے میں بھی الگ چھپ گیا تھا اور اس کے بعد بھی چھپتا رہا۔ میرے سامنے اس وقت اس کا وہ نسخہ ہے جسے جون ۱۹۷۳ء میں "محفل ارشادیہ، سیالکوٹ" نے شائع کیا اور جو اَب عام طور پر دستیاب ہو جاتا ہے۔ اس فیصلہ میں یہ بتایا گیا ہے کہ مدعیہ کی طرف سے بڑے بڑے جید علمائے کرام بطورِ گواہ پیش ہوئے۔ مثلاً مولانا غلام محمد صاحب شیخ الجامعہ عباسیہ بہاولپور۔ مولانا نجم الدین صاحب پروفیسر اورینٹل کالج لاہور۔ مولانا محمد شفیع صاحب مفتی دارالعلوم دیوبند۔ مولانا مرتضیٰ حسن صاحب چاندپوری اور مولانا سید انور شاہ صاحب شیخ الحدیث

دارالعلوم دیوبند[1] وغیرہم۔ اس سے اس معاملہ کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے۔ فاضل جج نے اپنے فیصلہ میں لکھا کہ اس مسئلہ کا دارومدار اس بات پر تھا کہ نبوت کی حقیقت کیا ہے اور نبی کسے کہتے ہیں؟ لیکن (انہوں نے کہا کہ) مشکل یہ ہے کہ:

"موجودہ زمانہ میں بہت سے مسلمان نبی کی حقیقت سے بھی ناآشنا ہیں۔ اس لیئے بھی ان کے دلوں میں یہ مسئلہ گھر نہیں کر سکتا کہ مرزا صاحب کو نبی ماننے میں کیا قباحت ہوتی ہے کہ جس پر اس قدر چیخ و پکار کی جا رہی ہے۔ اس لیئے ضروری ہے کہ اس کی کچھ تھوڑی سی حقیقت بیان کر دی جائے۔ مدعیہ کی طرف سے نبی کی کوئی تعریف نہیں بیان کی گئی۔ صرف یہ کہا گیا ہے کہ نبوت ایک عہدہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے برگزیدہ بندوں کو عطا کیا جاتا ہے۔ اور نبی اور رسول میں فرق بیان کیا گیا ہے کہ ہر رسول نبی ہوتا ہے اور نبی کے لیئے لازمی نہیں کہ وہ رسول بھی ہو۔ فریقِ ثانی نے بیان کیا ہے کہ رسول ایک انسان ہوتا ہے جسے اللہ تعالیٰ احکامِ شریعت کی تبلیغ کے لیے بھیجتا ہے، برخلاف نبی کے کہ وہ عام ہے۔ کتاب لائے نہ لائے۔ رسول کے لیئے کتاب لانا شرط ہے۔ اسی طرح رسول کی ایک تعریف یہ بھی کی گئی ہے کہ رسول وہ ہوتا ہے جو صاحبِ کتاب ہو یا سابقہ شریعت کے بعض احکام کو منسوخ کر دے۔" (فیصلہ صفحہ ۱۰۷—۱۰۶)

اس کے بعد فاضل جج نے لکھا:

"یہ تعریفیں چونکہ اس حقیقت کے اظہار کے لیے کافی نہ تھیں، اس لیئے میں اس جستجو میں رہا کہ نبی یا رسول کی کوئی ایسی جامع تعریف مل جائے جو تصریحاتِ قرآنی کی رُو سے تمام لوازمِ نبوت پر حاوی ہو۔" (صفحہ ۱۰۷)

اس کے بعد انہوں نے لکھا کہ انہوں نے اس باب میں کافی جستجو کی۔ لیکن نبی کی کوئی جامع تعریف انہیں نہ مل سکی۔

"آخرکار ایک رسالہ میں ایک مضمون بعنوان "میکانکی اسلام" از جناب چوہدری غلام احمد صاحب پرویز میری نظر سے گزرا۔ اس میں انہوں نے مذہبِ اسلام کے متعلق آجکل کے روشن ضمیر طبقہ کے خیالات کی ترجمانی کی ہے اور پھر خود ہی اس کے حقائق بیان کیئے ہیں۔ اس سلسلہ میں

---

[1] ان کا نام زبان پر آتے ہی، ان کے علم و تقویٰ کے احساس سے نگاہیں ان کے احترام میں جھک جاتی ہیں۔

نبوّت کی جو حقیقت انہوں نے بیان کی ہے میری رائے میں اس سے بہتر اور کوئی بیان نہیں کی جا سکتی[1]۔ اور میرے خیال میں فریقین میں سے کسی کو اس سے انکار بھی نہیں ہو سکتا۔ اس لیئے میں ان کے الفاظ میں ہی اس حقیقت کو بیان کرتا ہوں (صفحہ نمبر ۱۰۷)

ازاں بعد انہوں نے میرے اس مضمون سے، خاصہ مفصّل اقتباس درج کیا اور نبی کی جو تعریف میں نے پیش کی تھی اس پر مبنی بحث کے بعد اپنے فیصلہ میں کہا:

مدّعا علیہ قادیانی عقائد اختیار کرنے کی وجہ سے مرتد ہو چکا ہے۔ لہٰذا اس کے ساتھ مدّعیہ کا نکاح تاریخِ ارتدادِ مدّعا علیہ سے فسخ ہو چکا ہے۔ (صفحہ ۱۸۲)

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے، اس مقدمہ میں ہندوستان کے بڑے بڑے جیّد علمائے کرام پیش ہوئے تھے جن میں سے ایک ایک کا بیان سینکڑوں صفحات پر مشتمل تھا۔ لیکن فاضل جج حقیقتِ نبوّت کے متعلق ان میں سے کسی کے بیان سے بھی مطمئن نہ ہو سکے۔ وہ مطمئن ہوئے تو میرے ایک ایسے مضمون سے جو اس مقدمہ سے بالکل الگ آزادانہ لکھا گیا تھا۔ سوال یہ ہے کہ میرے مضمون کی وہ کون سی خصوصیت تھی جس کی بنا پر وہ اس قدر اطمینان بخش اور قولِ فیصل ثابت ہوگا۔ وہ خصوصیت یہ تھی کہ میں نے مقامِ نبوّت کی وضاحت قرآن کریم کی روشنی میں کی تھی اور خارج از قرآن بحثوں کو اس میں دخیل نہیں ہونے دیا تھا۔ یہی مسلک علّامہ اقبالؒ کا بھی تھا۔ اور میرے دل میں ان کے احترام کی بنیاد بھی یہی ہے۔

اقبالؒ اور قرآن

انہوں نے اپنی سب سے پہلی تصنیف ــــ اسرار و رموز کے آخر میں بحضورِ رحمۃ اللعالمین ایک عرضداشت پیش کی ہے جس میں وہ بصد سوز و گداز کہتے ہیں ؎

گر دلم آئینۂ بے جوہر است   ور بحرفم غیرِ قرآں مضمر است

تو

پردۂ ناموسِ فکرم چاک کن   ایں خیاباں راز خارم پاک کن

اور انتہا یہ کہ۔۔

---

[1] یہ اُس شخص کے متعلق "عدالتی سند" ہے جس کے خلاف "منکرِ رسالت" ہونے کا پروپیگنڈہ کیا جاتا ہے اور ایسا کہنے والے نہ کوئی جھجک محسوس کرتے ہیں، نہ ندامت۔ (طلوعِ اسلام)

روزِ محشر خوار و رسوا کن مرا ... بے نصیب از بوسۂ پا کن مرا

اس کے برعکس

گر دُرِ اسرارِ قرآں سفتہ ام ... با مسلماناں اگر حق گفتہ ام
عرض کن پیشِ خدائے عزّ و جل ... عشقِ من گردد ہم آغوشِ عمل
در عمل پائندہ تر گرداں مرا
آبِ نیسانم گہر گرداں مرا

اور اس کے بعد بھی وہ تمام عمر مسلمانوں سے یہی کہتے رہے کہ:-

گر تو می خواہی مسلماں زیستن ... نیست ممکن جز بقرآں زیستن

ختمِ نبوّت کی ماہیّت

ختمِ نبوّت کی حقیقت و ماہیّت کو سمجھنے کے لیئے ضروری ہے کہ یہ سمجھ لیا جائے کہ نبوّت کہتے کسے ہیں۔ یہ موضوع بڑی فرصت چاہتا ہے جس کی اس وقت گنجائش نہیں۔ لیکن بایں ہمہ میں چند الفاظ میں اس کا ملخص پیش کر دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ انسان، عقل و فکر، مطالعہ، مشاہدہ، تجربہ سے علم حاصل کرتا ہے۔ یہ ذرائع علم ہر شخص کے لیئے کھلے ہوتے ہیں۔ اس لیئے جو شخص بھی چاہے اپنی صلاحیت اور محنت کے مطابق اکتسابِ علم کر سکتا ہے۔ لیکن علم کا ایک اور ذریعہ بھی ہے جس میں انسان کی اپنی عقل و فکر اور سعی و کاوش کا کوئی دخل نہیں ہوتا تھا۔ وہ علم خدا کے ایک برگزیدہ بندے کو خدا کی طرف سے براہِ راست ملتا تھا۔ اس کی کیفیت یہ تھی کہ جس منتخب ہستی کو یہ علم عطا ہوتا تھا اسے اس سے ایک دن پہلے تک بھی اس کا علم و احساس نہیں ہوتا تھا کہ اسے یہ علم عطا ہونے والا ہے۔ اس علم کو وحیٔ خداوندی یا منزّل من اللہ کہا جاتا تھا اور جس برگزیدہ ہستی کو یہ وحی عطا ہوتی تھی اسے نبی یا رسول کہہ کر پکارا جاتا۔ اس کی وحی کو خدا کی طرف سے عطا کردہ کتاب سے بھی تعبیر کیا جاتا تھا۔ اس سے واضح ہے کہ ہر نبی کو خدا کی طرف سے کتاب ملتی تھی۔ نبی اور رسول میں یہ فرق کہ رسول وہ ہوتا تھا جسے کتاب ملتی تھی اور نبی بلا کتاب آتا تھا، قرآنِ کریم کی تعلیم سے بے خبری کی دلیل ہے۔ قرآنِ کریم نے انبیاء اور رسل دونوں کے متعلق کہا ہے کہ انہیں کتاب دی جاتی تھی۔ مثلاً سورۂ بقرہ میں ہے۔

فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ ..... (۲/۲۱۳)

یعنی اللہ تعالیٰ نے حضرات انبیائے کرام کو مبعوث فرمایا اور ان سب کو کتاب دی۔ دوسری جگہ سورہ حدید میں ہے کہ :-

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنٰتِ وَ اَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ ۔ ۔ ۔ ۔ (۵۷/۲۵)

یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمام رسولوںؑ کو کتاب ملی۔ ان آیات (اور انہی جیسی متعدد دیگر آیات) سے واضح ہے کہ ہر نبیؑ اور ہر رسولؑ کو خدا کی طرف سے کتاب ملتی تھی اور "احمدیوں" کا یہ کہنا کہ نبیؑ بلا کتاب آتا تھا۔ قرآن کریم کی نصوصِ صریحہ کے خلاف ہے۔ واضح رہے کہ نبیؑ اور رسولؑ بھی الگ الگ نہیں ہوتے تھے۔ یہ ایک ہی ہستی کی دو خصوصیات تھیں۔ یوں کہیئے کہ خدا کی طرف سے وحی پانے کی حیثیت سے اسے نبی کہا جاتا تھا اور اس وحی کو دوسروں تک پہنچانے کی حیثیت سے رسول۔ نبوت اور رسالت ایک ہی حقیقت کے دو گوشے تھے۔

خدا کی طرف سے وحی یا کتاب نازل ہونے کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ تاآنکہ مشیت کے پروگرام کے مطابق وہ زمانہ آگیا جب یہ سمجھا گیا کہ انسانی راہنمائی کے لیئے جو کچھ خدا کی طرف سے دیا جانا مقصود و مطلوب ہے اسے نہایت واضح اور مکمل حیثیت سے آخری مرتبہ دے دیا جائے۔ چنانچہ یہ آخری وحی حضور نبیؐ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا کی گئی اور اسے قرآن کریم کے اندر محفوظ کر دیا گیا اور یہ اعلان کر دیا گیا کہ۔

وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّ عَدْلًا لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ (۶/۱۱۵)۔

"خدا کو جو کچھ انسانوں سے کہنا تھا، جو کلام ان سے کرنا تھا، جو باتیں ان سے کرنی تھیں اس کتاب میں انہیں مکمل طور پر دے دیا گیا ہے۔ ان میں اب کوئی تبدیلی نہیں کی جا سکتی۔ اس کے ساتھ ہی یہ ضمانت بھی دے دی کہ:

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (۱۵/۹)

"ہم نے اس کتاب کو نازل کیا ہے اور ہم اس کی حفاظت کا ذمہ لیتے ہیں"۔ اور اس کے بعد وحی کا سلسلہ ختم کر دیا گیا۔ ظاہر ہے کہ وحی تو خدا کی طرف سے انسانوں کے لیئے راہنمائی کی خاطر آتی تھی۔ جب وہ راہنمائی مکمل اور غیر متبدل طور پر دے دی گئی اور قیامت تک اس کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لے لیا تو پھر وحی کی ضرورت کیا باقی رہی اور جب وحی کی ضرورت ہی نہ رہی تو پھر کسی نبی یا رسول کے آنے کا مقصد کیا! اسی حقیقت کو ختم نبوت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اسلام میں یہ نظریہ اس قدر صاف، واضح اور مسلّم تھا کہ مسلمانوں کو اس باب میں نہ کبھی کوئی شک گزرا، نہ الجھن پیدا ہوئی۔ امام اعظمؒ کے زمانے میں ایک شخص نے نبوّت کا دعویٰ کیا اور اپنے سچا ہونے کی نشانیاں دکھلانے کے لیئے مہلت چاہی۔ امام صاحب نے سُنا تو فرمایا کہ جس شخص نے اس مدعیِ نبوت سے کوئی علامت بھی طلب کی وہ بھی کافر ہو جائے

گا کیونکہ اس سے مترشح ہوگا کہ اسے نبی اکرمؐ کے آخری نبی ہونے کی بابت تردد ہے۔ اس سے آپ اندازہ فرمائیے کہ ختمِ نبوت کا عقیدہ مسلمانوں میں کس قدر مسلّم اور ہر قسم کے شک و شبہ سے بالاتر تھا۔ ختمِ نبوت کا عملی مفہوم یہ ہے کہ اب انسان اس راہنمائی کی روشنی میں جسے قندیلِ قرآنی میں محفوظ کر دیا گیا ہے۔ اپنے معاملات کا حل آپ دریافت کرے۔ واضح رہے کہ اس کے یہ معنی نہیں کہ انسان کو اب وحی کی راہنمائی کی ضرورت نہیں رہی اور اب وہ تنہا اپنی عقل و فکر کی رُو سے اپنے معاملات حل کر سکتا ہے۔ ایسا سمجھنا قطعاً غلط ہے۔ انسانی عقل اسی طرح وحی کی محتاج ہے جس طرح انسانی آنکھ سورج کی روشنی کی محتاج۔ علامہ اقبالؒ نے اس حقیقت کو متعدد مقامات پر (بالخصوص اپنے خطبات میں) بڑی وضاحت سے بیان کیا ہے۔ انہوں نے اس کی بھی وضاحت کی ہے کہ وحی کی روشنی میں انسانی معاملات کا حل انفرادی طور پر نہیں کیا جائے گا۔ بلکہ یہ ایک اجتماعی نظام کی رُو سے ہوگا جسے خلافت علیٰ منہاجِ نبوت کہا جاتا ہے۔ مزید سمجھنے کے لیئے اسے قرآنی نظامِ مملکت کہہ لیجئے۔ یعنی مسلمانوں کی اپنی آزاد مملکت جس میں تمام کاروبار قرآنِ کریم کے عطا کردہ اصول و اقدار و قوانین کے تابع رہ کر سر انجام دیا جائے۔ اسی کو نظریۂ پاکستان کہتے ہیں جسے علامہ اقبالؒ نے ۱۹۳۰ء میں پیش کیا تھا۔

یہ سیاسی تحریک تھی

مرزا غلام احمد نے نبوت کا دعویٰ کیا تو اسے ایک مذہبی مسئلہ کی حیثیت سے پیش کیا تاکہ مسلمان اسی اُلجھاؤ میں رہیں اور اس مقصد اور غایت کی طرف ان کی نگاہ ہی نہ اُٹھنے پائے جس کے لیئے یہ سارا ڈرامہ اسٹیج کیا گیا تھا۔ علامہ اقبالؒ نے اس حقیقت کو بے نقاب کیا کہ تحریکِ "احمدیت" مذہبی تحریک ہے ہی نہیں۔ یہ ایک خالصتہً سیاسی تحریک ہے جسے انگریزوں کے حکومتی مصالح نے پیدا کیا ہے اور جسے عوام کو دھوکہ دینے کے لیئے مذہبی نقاب اوڑھا دیا گیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ انگریزوں نے یہاں اپنی حکومت قائم کی تو اس کے خلاف اُنہیں سب سے بڑا خطرہ مسلمانوں کی طرف سے تھا۔ سیاسی طور پر تو اس لیئے کہ انگریزوں نے مسلمانوں سے سلطنت چھینی تھی اور مذہبی سطح پر اس لیئے کہ وہ اس حقیقت سے اچھی طرح باخبر تھا کہ مسلمان غیر مسلموں کی حکومت کے تابع زندگی بسر کرنا خلافِ اسلام سمجھتے تھے اور ایسی حکومت کے خلاف جہاد کرنا اپنا دینی فریضہ۔ آپ ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب (THE INDIAN MUSALMANS) اُٹھا کر دیکھئے۔ اس نے اس حقیقت کو بڑے واشگاف

الفاظ میں بیان کیا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ اسی دینی جذبہ کے ماتحت حضرت سید احمد بریلویؒ اور شاہ اسماعیل شہیدؒ نے تحریکِ جہاد شروع کی۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی تہ میں بھی اُسے یہی جراثیم کارفرما نظر آتے ہیں۔ اور اس کے بعد وہابی تحریک کو بھی وہ اسی سلسلہ کی ایک کڑی بیان کرتا ہے۔ انگریزوں نے ہندوستان کے دین فروش علماء سے اس قسم کے فتاویٰ بھی حاصل کر لئے جن میں کہا گیا کہ انگریزوں کی اطاعت فرض ہے اور ان کے خلاف جہاد حرام۔ لیکن مسلمانوں پر ان فتاویٰ کا چنداں اثر نہ ہؤا۔ ہمارے علماء کے فتاویٰ عام طور پر اپنی اثر انگیزی کھو چکے تھے۔ اس سلسلہ میں برطانوی سیاستدان اس نتیجہ پر پہنچے کہ مسلمان صرف وحی سے متأثر ہو سکتا ہے اس لئے ضرورت اس امر کی ہے کہ انہیں یہ بتایا جائے کہ ان پر خود خدا نے حکومتِ برطانیہ کی اطاعت فرض قرار دی ہے اور اس نے جہاد کو منسوخ اور حرام قرار دیا ہے۔ یہ تھا وہ پردہ جسے علامہ اقبالؒ نے ۱۹۳۵ء میں یہ کہہ کر اٹھایا کہ:

> مسلمانوں کے مذہبی تفکر کی تاریخ میں "احمدیت" کا مؤقف ہندوستان کی موجودہ سیاسی غلامی کی تائید میں الہامی بنیاد فراہم کرتا ہے۔

(احمدیت اور اسلام۔ بحوالہ ختم نبوت اور تحریکِ احمدیت۔ پہلا ایڈیشن صفحہ ۱۹۴)

اس تشریح میں انہوں نے کہا کہ:

> مسلمان عوام کو جن میں مذہبی جذبہ بہت شدید ہے، صرف ایک چیز قطعی طور پر متأثر کر سکتی ہے یعنی وحی کی سند۔ لہٰذا راسخ عقائد کو مؤثر طریق پر جڑ بنیاد سے اکھیڑنے اور مذکورہ بالا سوالات میں جو دینی نظریات مضمر ہیں ان کی ایک ایسی نئی تفسیر و تعبیر کرنے کے لئے جو سیاسی طور پر مفید مطلب ہو، یہ ضروری سمجھا گیا کہ اس کی بنیاد وحی پر رکھی جائے۔ یہ بنیاد "احمدیت" نے فراہم کر دی۔ خود "احمدیوں" کا دعویٰ ہے کہ برطانوی شہنشاہیت کی یہ سب سے بڑی خدمت ہے جو انہوں نے سرانجام دی ہے۔
>
> (احمدیت اور اسلام۔ انگریزی ایڈیشن صفحہ ۱۲۶)

میں نے اس اجمال کی تفصیل اپنی کتاب "ختم نبوت اور تحریکِ احمدیت" میں مرزا غلام احمد صاحب کی تحریروں کی روشنی میں پیش کی ہے۔ انہی میں سے چند ایک میں اس وقت آپ حضرات کے سامنے پیش کرتا ہوں۔

مرزا صاحب کی خاندانی خدمات

انگریزوں کو اس مقصد کیلئے جس قسم کی شخصیت کی ضرورت تھی اس کے لئے اپنے آپ کو بطورِ "اُمیدوار"

پیش کرتے ہوئے مرزا غلام احمد نے عرضداشت پیش کی کہ ۔

میں ایک ایسے خاندان سے ہوں جو اس گورنمنٹ کا پکا خیر خواہ ہے ۔ میرا والد مرزا غلام مرتضیٰ گورنمنٹ کی نظر میں ایک وفادار اور خیر خواہ آدمی تھا جن کو دربارِ گورنری میں کرسی ملتی تھی اور جن کا ذکر مسٹر گریفن صاحب کی تاریخ رئیسانِ پنجاب میں ہے اور ۱۸۵۷ء میں انہوں نے اپنی طاقت سے بڑھ کر سرکارِ انگریزی کو مدد دی تھی ۔ یعنی پچاس سوار اور گھوڑے بہم پہنچا کر عین زمانۂ غدر کے وقت سرکارِ انگریزی کی امداد میں دیئے تھے ۔ (کتاب البریہ ۔ صفحہ نمبر ۳)

اس کے بعد انہوں نے کہا ۔

پھر میرے والد کی وفات کے بعد میرا بڑا بھائی مرزا غلام قادر خدماتِ سرکاری میں مصروف رہا اور جب تموّ کی رہگذر پر مفسدوں کا سرکارِ انگریزی کی فوج سے مقابلہ ہوا تو وہ سرکارِ انگریزی کی طرف سے لڑائی میں شریک ہوئے ۔ (ایضاً ۔ صفحہ ۵)

ان "خدماتِ جلیلہ" کی روشنی میں، مرزا صاحب اس منصب کے لیئے منتخب کر لیئے گئے اور انہوں نے مامور من اللہ ہونے کے دعاوی شروع کر دیئے ۔ انہوں نے پہلی ہی جست میں اپنے نبی ہونے کا دعویٰ نہیں کیا بلکہ ایک سوچے سمجھے پروگرام کے مطابق بتدریج اس مقام پر پہنچے ۔ ملہم ربانی، صاحب کشف و الہام ۔ محدّث ۔ مجدّد ۔ مسیح موعود، ظلّی، بروزی، حلولی نبوّت اور پھر آخر الامر مکمل نبوّت اور رسالت ۔ ایسا تدریجی پروگرام کیوں اختیار کیا گیا ۔ اس کی مصلحت خود انہی کی زبان سے سُنیئے ۔ مرزا صاحب شروع میں عام مسلمانوں کی طرح یہی کہتے چلے آرہے تھے کہ قرآنِ مجید میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق جو آیات آئی ہیں ان میں حضرت عیسیٰ سے مراد وہی پیغمبر ہیں جو رسول اللہ سے پہلے ہو گزرے ہیں ۔ لیکن بعد میں انہوں نے دعویٰ کیا کہ میں مسیح موعود ہوں اور ان آیات میں میرے ہی متعلق ذکر کیا گیا ہے ۔ شروع کے بیانات اور اس دعویٰ میں اختلاف کیوں ہوا ، اس کے متعلق لکھتے ہیں ۔

پیچ میں پھنسانے کے لئے

"یہ الہامات اگر میری طرف سے اس موقعہ پر ظاہر ہوتے جبکہ علماء مخالف ہو گئے تھے ، تو وہ ہزارہا اعتراض کرتے ۔ لیکن وہ ایسے موقعہ پر شائع کئے گئے جبکہ یہ علماء میرے موافق تھے ۔ یہی سبب ہے کہ باوجود اس قدر جوشوں کے ، ان الہامات پر انہوں نے اعتراض نہیں کیا کیونکہ وہ ایک دفعہ ان کو قبول کر

چکے تھے اور سوچنے سے ظاہر ہوگا کہ میرے دعویٰ مسیح موعود ہونے کی بنیاد انہی الہامات سے پڑی ہے انہی میں خدا نے میرا نام عیسیٰ رکھا اور جو مسیح موعود کے حق میں آیتیں تھیں وہ میرے حق میں بیان کر دیں۔ اگر علماء کو خبر ہوتی کہ ان الہامات سے تو اس شخص کا مسیح ہونا ثابت ہوتا ہے تو وہ کبھی ان کو قبول نہ کرتے یہ خدا کی قدرت ہے کہ انہوں نے قبول کر لیا اور اس پیچ میں پھنس گئے۔" (اربعین نمبر ۲ - صفحہ ۲۱)

انگریزوں کی اطاعت

آپ نے غور فرمایا کہ بتدریج دعویٰ کرنے میں کیا مصلحت پنہاں تھی ! یہ تو بہرحال ان کے دعاوی کی سیڑھیاں تھیں۔ لیکن ہر دعوے کی لم اور غایت ایک ہی تھی۔ یعنی یہ کہ انگریزوں کی اطاعت فرض ہے۔ مثلاً قرآن کریم میں ہے کہ اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ (۴/۵۹)۔ مرزا صاحب نے اس آیت کے لکھنے کے بعد تحریر کیا کہ

"اولی الامر سے مراد جسمانی طور پر بادشاہ اور روحانی طور پر امام الزمان ہے اور جسمانی طور پر جو شخص ہمارے مقاصد کا مخالف نہ ہو اور اس سے مذہبی فائدہ ہمیں حاصل ہو سکے وہ ہم میں سے ہے۔ اس لئے میری نصیحت اپنی جماعت کو یہی ہے کہ وہ انگریزوں کی بادشاہت کو اپنے اولی الامر میں داخل کریں اور دل کی سچائی سے ان کے مطیع رہیں"۔

(ضرورت الامام - صفحہ ۲۳)

علامہ اقبالؒ ضربِ کلیم میں نفسیاتِ غلامی کے عنوان سے کہتے ہیں کہ :

سخت باریک ہیں امراضِ اُمم کے اسباب   کھول کر کہیے تو کرتا ہے بیاں کوتاہی
دینِ شیری میں غلاموں کے امام اور شیوخ   دیکھتے ہیں فقط اک فلسفۂ روباہی
ہو اگر قوتِ فرعون کی درپردہ مُرید   قوم کے حق میں ہے لعنت وہ کلیم اللّٰہی

جہاد حرام ہے

اس طرح مرزا صاحب آہستہ آہستہ اُس مقام پر پہنچ گئے جس کے لئے یہ سارا ڈرامہ کھیلا گیا تھا۔ یعنی انہوں نے اعلان کر دیا کہ جہاد حرام ہے۔ انہوں نے کہا۔

"آج سے انسانی جہاد جو تلوار سے کیا جاتا تھا، خدا کے حکم کے ساتھ بند کیا گیا۔ اب اس کے بعد جو شخص کافر پر تلوار اٹھاتا اور اپنا نام غازی رکھتا ہے وہ اس رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کرتا ہے جس نے آج سے تیرہ سو برس پہلے فرما دیا ہے کہ مسیح موعود کے آنے پر تمام تلوار کے جہاد ختم ہو جائیں گے۔ سو اب میرے ظہور کے بعد تلوار کا کوئی جہاد نہیں۔"

(اربعین نمبر۴ - صفحہ ۴۷)

اپنے اسی "الہام" کو نظم میں یوں بیان فرمایا کہ:-

اب چھوڑ دو جہاد کا اے دوستو خیال — دیں کے لئے حرام ہے اب جنگ اور قتال
اب آگیا مسیح، جو دیں کا امام ہے — دیں کی تمام جنگوں کا اب اختتام ہے
اب آسماں سے نورِ خدا کا نزول ہے — اب جنگ اور جہاد کا فتویٰ فضول ہے

دشمن ہے وہ خدا کا جو کرتا ہے اب جہاد
منکر نبیؐ کا ہے جو یہ رکھتا ہے اعتقاد

(مندرجہ تبلیغ رسالت جلد نہم - صفحہ ۴۹)

گورنمنٹ کی خدمت میں درخواستیں

اس کے بعد ان کی "نبوت" کا فریضہ یہ قرار پاگیا کہ وہ اس خیال کو عام کرتے رہیں کہ جہاد حرام ہے، جہاد حرام ہے۔ وہ یہ کرتے تھے اور ساتھ کے ساتھ اس کی اطلاع حضور گورنمنٹ برطانیہ کو دیتے رہتے تھے۔ مثلاً انہوں نے ۱۰ دسمبر ۱۸۹۴ء کو ایک اشتہار شائع کیا جس کا عنوان تھا "اشتہار لائقِ توجہ گورنمنٹ جو جناب ملکۂ معظمہ قیصرۂ ہند اور جناب گورنر جنرل ہند اور لیفٹیننٹ گورنر پنجاب اور دیگر معزز حکام کے ملاحظہ کے لئے شائع کیا گیا"۔ اس میں انہوں نے کہا۔

"میں برابر سولہ برس سے یہ اپنے پر حق واجب ٹھہرا لیا ہے کہ اپنی قوم کو اس گورنمنٹ کی خیر خواہی کی طرف بلاؤں اور ان کو سچی اطاعت کی طرف ترغیب دوں۔ چنانچہ میں نے اس مقصد کے سرانجام کے لئے اپنی ہر ایک تالیف میں یہ لکھنا شروع کیا کہ اس گورنمنٹ کے ساتھ کسی طرح مسلمانوں کو جہاد درست نہیں ہے۔"

دوسری جگہ لکھا ہے۔

"میں نے خدا تعالیٰ سے یہ عہد کیا ہے کہ کوئی مبسوط کتاب بغیر اس کے تالیف نہیں کروں گا۔ جو اس میں احسانات قیصرۂ ہند کا ذکر نہ ہو۔"

(نور الحق۔ حصّہ اوّل صـ۳۸ـ)

وہ اپنی کتاب تریاق القلوب میں لکھتے ہیں:۔

"میری عمر کا اکثر حصّہ اس سلطنتِ انگریزی کی تائید اور حمایت میں گزرا ہے اور میں نے ممانعتِ جہاد اور انگریزی اطاعت کے بارے میں اس قدر کتابیں لکھی ہیں اور اشتہارات شائع کئے ہیں کہ اگر وہ رسائل اور کتابیں اکٹھی کی جائیں تو پچاس الماریاں ان سے بھر سکتی ہیں"۔

(صفحہ ۱۵)

چنانچہ وہ فخریہ بیان کرتے ہیں کہ میری ان کوششوں کا نتیجہ یہ ہے کہ:۔

"لاکھوں انسانوں نے جہاد کے وہ غلیظ خیالات چھوڑ دیئے جو نافہم ملّاؤں کی تعلیم سے ان کے دلوں میں تھے۔ یہ ایک ایسی خدمت ظہور میں آئی کہ مجھے اس بات پر فخر ہے کہ برٹش انڈیا کے تمام مسلمانوں میں سے اس کی نظیر کوئی مسلمان دکھلا نہ سکا"۔

(ستارۂ قیصرہ۔ صفحہ ۴)

یہ تھا اس نبوّتِ جدیدہ کا ماحصل۔ اقبالؒ کس درد و سوز سے کہتے ہیں کہ:۔

ہو بندۂ آزاد اگر صاحبِ الہام ہے اس کی نگہ فکر و عمل کے لئے مہمیز
اس کے نفسِ گرم کی تاثیر ہے ایسی ہو جاتی ہے خاکِ چمنستان شرر آمیز
شاہیں کی ادا ہوتی ہے بُلبل میں نمودار کس درجہ بدل جاتے ہیں مرغانِ سحر خیز
اُس مردِ خود آگاہ و خدامست کی صحبت دیتی ہے گداؤں کو شکوہِ جم و پرویز
محکوم کے الہام سے اللہ بچائے
غارت گرِ اقوام ہے وہ صورتِ چنگیز

(ضربِ کلیم صـ۵۱ـ)

فریاد! مجھے مولوی ستاتے ہیں!

وحیِ خداوندی کی تاثیر سے تو فی الواقعہ خاکِ چمنستان شررآمیز اور بلبلِ ناتواں میں شاہین کی ادا نمودار ہوجاتی ہے لیکن ہمارے دور کے مدعیِ نبوت کی کیفیت یہ ہے کہ وہ "حضور گورنمنٹ عالیہ کی خدمت میں عاجزانہ درخواست" پیش کرتے ہیں جس میں کہتے ہیں کہ :-

"میں اس گورنمنٹِ محسنہ کے زیرِ سایہ ہر طرح سے خوش ہوں۔ صرف ایک رنج اور درد اور غم مجھے لاحق ہے جس کا استغاثہ پیش کرنے کے لئے اپنی محسن گورنمنٹ کی خدمت میں حاضر ہوں اور وہ یہ کہ اس ملک کے مولوی، مسلمان اور ان کی جماعتوں کے لوگ حد سے زیادہ مجھے ستاتے اور دکھ دیتے ہیں۔" (مندرجہ تبلیغِ رسالت جلد ہشتم ص۵۳)

انگریزوں کا خودکاشتہ پودا

اس کے بعد وہ سرکارِ عالیہ سے کہتے ہیں کہ ہم جو آپ کو مدد کے لئے پکارتے ہیں تو کچھ اپنی حفاظت کے لئے نہیں بلکہ یہ اس پودے کی حفاظت کے لئے ہے جو خود آپ کے اپنے ہاتھوں کا لگایا ہوا ہے۔ چنانچہ وہ لیفٹیننٹ گورنر بہادر کے نام اپنی درخواست مورخہ ۲۴ فروری ۱۸۹۸ء میں کہتے ہیں :-

"میری اس درخواست سے جو حضور کی خدمت میں مع اسمائے مریدین روانہ کرتا ہوں، مدعا یہ ہے کہ اگرچہ میں ان خدماتِ خاصہ کے لحاظ سے جو میں نے اور میرے بزرگوں نے محض صدقِ دل اور اخلاص اور جوش اور وفاداری سے سرکارِ انگریزی کی خوشنودی کے لئے کی ہیں، عنایتِ خاص کا مستحق ہوں۔ صرف یہ التماس ہے کہ سرکارِ دولت مدار۔ ۔ ۔ اس خودکاشتہ پودے کی نسبت نہایت حزم و احتیاط اور تحقیق و توجہ سے کام لے اور اپنے ماتحت حکام کو ارشاد فرمائے کہ وہ بھی اس خاندان کی ثابت شدہ وفاداری اور اخلاص کا لحاظ رکھ کر مجھے اور میری جماعت کو ایک خاص عنایت اور مہربانی کی نظر سے دیکھے۔ ۔ ۔ اس لئے کہ یہ ایک ایسی جماعت ہے جو سرکارِ انگریزی کی نمک پروردہ اور نیک نامی حاصل کردہ موردِ مراحم گورنمنٹ ہے۔"

وہ دوسری جگہ لکھتے ہیں:

"ہم نے جو اس گورنمنٹ کے زیرِ سایہ آرام پایا اور پا رہے ہیں وہ آرام ہم کسی اسلامی گورنمنٹ میں بھی نہیں پا سکتے۔ ہرگز نہیں پا سکتے۔" (ازالۂ اوہام۔ ص ۵۰۹)

وہ اپنے اشتہار مورخہ ۲۲ مارچ ۱۸۹۷ء میں لکھتے ہیں:

"میں اپنے کام کو نہ مکہ میں اچھی طرح چلا سکتا ہوں نہ مدینہ میں، نہ روم میں نہ شام میں، نہ ایران میں، نہ کابل میں۔ مگر اس گورنمنٹ میں جس کے اقبال کے لئے میں دُعا کرتا ہوں۔"

(مندرجہ تبلیغِ رسالت۔ جلد ششم ص ۶۹)

وقت کی کمی کی بنا پر میں انہی اقتباسات پر اکتفا کرتا ہوں۔ جو احباب مزید تفصیل دیکھنا چاہیں وہ میری کتاب "ختمِ نبوت اور تحریکِ احمدیت" کا مطالعہ فرمائیں جو حال ہی میں شائع ہوئی ہے۔ اس میں، میں نے یہ بھی تفصیل سے بتایا ہے کہ مرزا صاحب نے کس طرح نبوت کا دعویٰ کیا، مسلمانوں کو کافر اور خارج از اسلام قرار دیا اور اپنے متبعین پر مشتمل ایک نئی اُمت کی تشکیل کی۔ یہ نکتہ زیادہ اہم ہے اور اب میں اسی کے متعلق کچھ تفصیل سے عرض کرنا چاہتا ہوں۔

اُمت رسولؐ کی نسبت سے متشکل ہوتی ہے

دُنیا میں خدا کے ماننے والے عام ہوتے ہیں اور ان میں کسی قسم کی تخصیص و تمیز نہیں ہوتی۔ لیکن ایک جداگانہ اُمت کی تشکیل اس رسولؐ پر ایمان لانے سے ہوتی ہے جسے اس کے پیرو سلسلۂ انبیاء کی آخری کڑی سمجھیں۔ مثلاً ایک یہودی حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پیشتر کے تمام انبیائے بنی اسرائیل پر ایمان لاتا ہے۔ لیکن بایں ہمہ وہ اُمتِ عیسوی کا فرد قرار نہیں پاتا۔ جس دن وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت پر ایمان لے آتا ہے وہ قومِ یہود کا فرد نہیں رہتا، عیسائی اُمت کا فرد بن جاتا ہے۔ اسی طرح ایک عیسائی، رسول اللہؐ سے پہلے کے تمام انبیاء پر ایمان رکھتا ہے لیکن وہ اُمتِ محمدیہ کا فرد نہیں بنتا۔ جس دن وہ نبوتِ محمدیہ پر ایمان لے آتا ہے وہ عیسائی اُمت کا فرد نہیں رہتا۔ اُمتِ محمدیہ کا فرد قرار پا جاتا ہے۔ اسی اصول کے مطابق اگر کوئی شخص رسول اللہؐ کے بعد کسی نبوت پر ایمان لے آتا ہے تو وہ اُمتِ محمدیہ کا فرد نہیں رہتا اس نئے نبی کی اُمت کا فرد قرار دیا جاتا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے اس حقیقت کو "رموزِ بے خودی" میں بڑے

دلآویز انداز میں بیان کیا ہے۔ جب کہا ہے۔

حق تعالیٰ پیکرِ ما آفرید ! دز رسالت در تنِ ما جاں دمید

حرفِ بے صوت اندریں عالم بدیم از رسالت مصرعِۂ موزوں شدیم

ما ز حکمِ نسبت اُو ملتیم اہلِ عالم را پیامِ رحمتیم

فرد از حق ملت از وے زندہ است از شعاعِ مہرِ اُو تابندہ است

از رسالت ہمنوا گشتیم ما

ہم نفس ، ہم مدعا گشتیم ما

مسلمان جو ایک جداگانہ اُمت کے فرد قرار پاتے ہیں تو خدا پر ایمان کی بنا پر نہیں بلکہ محمدؐ رسول اللہ کی رسالت پر ایمان لانے کی بنا پر ایسا قرار پاتے ہیں۔ یہ اُمتِ محمدیہ کے فرد اسی صورت میں قرار پا سکتے ہیں کہ یہ حضورؐ کو سلسلۂ انبیاء کی آخری کڑی سمجھیں۔ ختمِ نبوت کے معنی یہی نہیں کہ حضورؐ کی ذاتِ گرامی پر نبوت ختم ہو گئی بلکہ اس کا عملی مفہوم یہ ہے کہ اب دنیا میں دین کی بنیادوں پر کوئی نئی اُمت وجود میں نہیں آسکتی۔ حضرتِ علامہ اس باب میں فرماتے ہیں :۔

پس خدا بر ما شریعت ختم کرد بر رسولِ ما رسالت ختم کرد

اور اس ساری بحث کا نکتۂ آخریں یہ ہے :۔

رونق از ما محفلِ ایام را اُو رسل را ختم و ما اقوام را

ساری بحث چار لفظوں میں ختم ۔۔ اُو رسل را ختم و ما اقوام را ۔۔ اسی حقیقت کو وہ بانگِ درا میں مسلمانوں کو مخاطب کر کے ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں :۔

بے خبر تو جوہرِ آئینۂ ایام ہے تو زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہے

وہ " احمدیت اور اسلام " میں تحریر فرماتے ہیں :۔

" ہمارا ایمان ہے کہ اسلام بحیثیت دین خدا کی طرف سے ظاہر ہوا۔ لیکن اسلام بحیثیت سوسائٹی یا ملت ، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت کا مرہونِ منت ہے۔"

خود مرزا غلام احمد بھی اس حقیقت سے اچھی طرح واقف تھے۔ چنانچہ وہ اپنی کتاب " آئینہ کمالاتِ اسلام '' میں لکھتے ہیں :

"جو شخص نبوت کا دعویٰ کرے گا۔ اس دعویٰ میں ضرور ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کی ہستی کا اقرار کرے اور نیز یہ بھی کہے کہ خدائے تعالیٰ کی طرف سے میرے پر وحی نازل ہوئی اور نیز خلق اللہ کو وہ کلام سُنا دے جو اس پر خدائے تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا ہے اور ایک اُمت بنا دے جو اس کو نبی سمجھتی ہو اور اس کی کتاب کو کتاب اللہ جانتی ہو۔"
(ص ۳۴۴)

اسی بنا پر مرزا صاحب نے اپنے متبعین کو مسلمانوں سے الگ قرار دیا اور ان کی ایک نئی اُمت تشکیل کی اور ۱۹۰۱ء کی مردم شماری میں خود درخواست دے کر ان کا ایک الگ جماعت کی حیثیت سے شمار کرایا۔ اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے کہ مرزا صاحب نے اپنی الگ اُمت کیوں بنائی، اخبار الفضل نے لکھا:۔

"کیا مسیح ناصری نے اپنے پیروؤں کو یہود سے الگ نہیں کیا؟ کیا وہ انبیاء جن کے سوانح کا علم ہم تک پہنچا ہے اور ہیں ان کے ساتھ جماعتیں بھی نظر آتی ہیں۔ انہوں نے اپنی جماعتوں کو غیروں سے الگ نہیں کر دیا؟ ہر ایک شخص کو ماننا پڑے گا کہ بے شک کیا ہے۔ پس اگر حضرت مرزا صاحب نے بھی جو کہ نبی اور رسول ہیں اپنی جماعت کو منہاجِ نبوت کے مطابق غیروں سے الگ کر دیا تو نئی اور انوکھی بات کون سی کی؟"

(الفضل بابت ۲۶، فروری — ۲، مارچ ۱۹۱۸ء)

انہوں نے، اپنی اُمت کو اُمتِ محمدیہ سے الگ بھی ایسے واضح اور نکھرے الفاظ سے کیا کہ اس میں کسی قسم کا شک و شبہ نہ رہ جائے۔ انہوں نے کہا کہ:

"خدائے تعالیٰ نے میرے پر ظاہر کیا ہے کہ ہر ایک وہ شخص جس تک میری دعوت پہنچی ہے اور اس نے مجھے قبول نہیں کیا ہے وہ مسلمان نہیں۔"

(ارشاد مرزا صاحب منقول از اخبار الفضل۔ بابت ۱۵ جنوری ۱۹۳۵ء)

میاں محمود صاحب اس سے بھی آگے بڑھے اور فرمایا کہ:

"کُل مسلمان جو حضرت مسیح موعود کی بیعت میں شامل نہیں ہوتے خواہ انہوں نے حضرت مسیح موعود کا نام بھی نہیں سُنا۔ وہ کافر اور دائرہ اسلام سے خارج ہیں۔"

(آئینۂ صداقت ص۳۵)

مرزا صاحب کے دوسرے صاحبزادہ، بشیر احمد کہتے ہیں:

" ہر ایک شخص جو موسیٰؑ کو مانتا ہے مگر عیسیٰؑ کو نہیں مانتا۔ یا عیسیٰؑ کو مانتا ہے مگر محمدؐ کو نہیں مانتا۔ یا محمدؐ کو مانتا ہے مگر مسیح موعود کو نہیں مانتا۔ وہ نہ صرف کافر بلکہ پکا کافر اور دائرہ اسلام سے خارج ہے۔" (کلمۃ الفضل۔ مصنفہ صاحبزادہ بشیر احمد)

جب مسلمان، دائرہ اسلام سے خارج قرار پاگئے تو دین کی بنیادوں پر ان سے ہر قسم کے تعلقات بھی ناجائز ہوگئے۔ ان کے پیچھے نماز پڑھنا ناجائز۔ ان کا جنازہ پڑھنا بھی ناجائز۔ مرزا صاحب نے خود اپنے بیٹے (فضل احمد) کا جنازہ بھی اس لئے نہ پڑھا کہ وہ "غیر احمدی" تھا۔ اور چوہدری ظفر اللہ خان صاحب، قائداعظمؒ کے جنازہ کی نماز میں بھی اسی لئے شریک نہ ہوئے، غیر مسلموں کے ساتھ ایک طرف الگ کھڑے رہے۔ جہاں تک مسلمانوں کے ساتھ رشتوں ناطوں کا تعلق ہے، انہوں نے فیصلہ کیا کہ ان کی لڑکیاں لی تو جا سکتی ہیں انہیں لڑکیاں دی نہیں جا سکتی۔ مرزا محمود صاحب نے کہا تھا کہ اس باب میں ان کی پوزیشن، ہندوؤں اور سکھوں جیسی ہے کہ ان کی لڑکیاں بھی لی جا سکتی ہیں۔ انہیں لڑکیاں دی نہیں جا سکتیں۔ (الفضل۔ ۱۷ جولائی ۱۹۲۲ء)

انہی فیصلوں کی رُو سے، صاحبزادہ بشیر احمد نے لکھا کہ:

" غیر احمدیوں سے ہماری نمازیں الگ ہوگئیں۔ ان کو لڑکیاں دینا حرام قرار دیا گیا۔ ان کے جنازے پڑھنے سے روکا گیا۔ اب باقی کیا رہ گیا ہے جو ہم ان کے ساتھ مل کر کر سکتے ہیں۔ دو قسم کے تعلقات ہوتے ہیں۔ ایک دینی دوسرے دنیوی۔ دینی تعلق کا سب سے بڑا ذریعہ عبادت کا اکٹھا ہونا ہے اور دنیوی تعلق کا بھاری ذریعہ رشتہ و ناطہ ہے۔ سو یہ دونوں ہمارے لئے حرام قرار دے دیئے گئے ہیں۔" (کلمۃ الفضل)

الگ قوم قرار دی جائے

علامہ اقبالؒ نے ان حقائق کو سامنے رکھتے ہوئے ۱۹۳۵ء میں یہ تحریک اٹھائی اور تجویز یہ کیا کہ:۔

" میری رائے میں حکومت کے لئے بہترین طریق کار یہ ہوگا کہ وہ قادیانیوں کو ایک الگ جماعت تسلیم کرے۔ یہ قادیانیوں کی پالیسی کے عین مطابق ہوگا اور مسلمان ان سے ویسی ہی رواداری سے کام لے گا جیسے وہ باقی اہل مذاہب کے معاملے میں اختیار کرتا ہے۔"

(احمدیت اور اسلام)

میں نے جو اقتباسات آپ حضرات کے سامنے پیش کئے ہیں ان سے یہ حقیقت واضح ہو گئی ہو گی کہ مرزا غلام احمد کے متبعین روزِ اوّل سے اپنے آپ کو مسلمانوں سے الگ اُمت تصور کرتے تھے۔ وہ اس تصوّر کی عام نشر و اشاعت بھی کرتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود اپنے آپ کو کہتے مسلمان ہی تھے۔ وہ ایسا کیوں کرتے تھے۔ اس کے متعلق، علّامہ اقبالؒ نے کہا تھا :-

"اس امر کے سمجھنے کے لئے کسی خاص ذہانت یا غور و فکر کی ضرورت نہیں ہے کہ جب قادیانی مذہبی اور معاشرتی معاملات میں علیحدگی کی پالیسی اختیار کرتے ہیں۔ پھر وہ سیاسی طور پر مسلمانوں میں رہنے کے لئے کیوں مضطرب ہیں۔ علاوہ سرکاری ملازمتوں کے مفاد کے ان کی موجودہ آبادی جو چھپن ہزار ہے۔ انہیں کسی اسمبلی میں ایک نشست بھی نہیں دلا سکتی اور اس لئے انہیں سیاسی اقلیت کی ۔۔۔ بھی نہیں مل سکتی۔ یہ واقعہ اس امر کا ثبوت ہے کہ قادیانیوں نے اپنی جداگانہ سیاسی حیثیت کا مطالبہ نہیں کیا۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ مجالسِ قانون ساز میں ان کی نمائندگی نہیں ہو سکتی"۔ (احمدیت اور اسلام)

ان لوگوں کی اسی دو رُخی پالیسی کے پیشِ نظر انہوں نے (علّامہ اقبالؒ نے) کہا تھا کہ، بہائیت قادیانیت سے زیادہ دیانت دار ہے کہ انہوں نے اگر دعویٰ نبوّت کیا ہے تو اپنے آپ کو مسلمانوں سے الگ اُمّت قرار دیا ہے۔ اسی بنا پر انہوں نے حکومت سے کہا یہ تھا کہ وہ اس معاملہ کو یکسو کر دے اور جس بات کو یہ الگ اپنے عقیدے کے طور پر اختیار کئے ہوئے ہیں (یعنی مسلمانوں سے ایک الگ اُمّت) اسے قانونی حیثیت دے دیں۔ انگریزی حکومت نے اس تجویز کو قابلِ قبول نہ سمجھا کیونکہ یہ خود ان کے مصالح اور مقاصد کے بھی خلاف جاتی تھی۔ تشکیلِ پاکستان کے بعد بھی مسلمانوں نے اس مطالبہ کو متعیّن طور پر پیش نہ کیا، یا یوں کہئے کہ یہ آواز شور و غوغا میں گم ہو جاتی رہی۔ الیتہ طلوعِ اسلام اسے متعیّن طور پر دہراتا رہا تاآنکہ ستمبر ۱۹۷۴ء میں اس نے قانونی شکل اختیار کر لی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کا سہرا بالواسطہ حضرتِ علّامہؒ ہی کے سر بندھتا ہے۔

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

لاہوری "احمدی"

لاہوری "احمدی" یہ کہہ کر لوگوں کو دھوکا دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ ہم مرزا صاحب کو نبی نہیں مانتے۔ مسیح موعود مانتے ہیں اور یہ ایسا دعویٰ نہیں جس کے نہ ماننے سے کوئی مسلمان کافر قرار پا جائے۔ اس لئے ہم مسلمانوں کو کافر نہیں کہتے۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ قادیانیوں کے ساتھ ہمیں بھی کیوں دائرہ اسلام سے خارج قرار دیا جاتا ہے۔ آیئے ہم دیکھیں کہ حقیقت کیا ہے۔

مرزا صاحب نے مسیح موعود ہونے کا بھی دعویٰ کیا تھا۔ اور انہوں نے کون سا دعویٰ نہیں کیا تھا؛ ملہم۔ مامور من اللہ۔ محدّث۔ مجدّد۔ مہدی۔ ظلّی۔ بروزی۔ حلولی۔ حقیقی نبی۔ محمدؐ کا اوتار۔ خود محمدؐ۔ کرشن گوپال وغیرہ۔ انہوں نے ان کے دعویٰ مسیح موعود کے منکرین کے متعلق کہا:۔

"کفر دو قسم پر ہے۔ ایک کفر یہ ہے کہ ایک شخص اسلام سے ہی انکار کرتا ہے اور آنحضرتؐ کو رسولؐ نہیں مانتا۔ دوسرے یہ کفر کہ مثلاً وہ مسیح موعود کو نہیں مانتا اور اس کو باوجود اتمام حجت کے جھوٹا جانتا ہے جس کے ماننے اور سچا جاننے کے بارے میں خدا اور رسولؐ نے تاکید کی ہے اور پہلے نبیوں کی کتابوں میں بھی تاکید پائی جاتی ہے۔ پس اس لئے کہ وہ خدا اور رسولؐ کے فرمان کا منکر ہے، کافر ہے اور اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ دونوں قسم کے کفر ایک ہی قسم میں داخل ہیں۔" (حقیقۃ الوحی۔ ص ۱۷۱)

آپ دیکھیں گے کہ لاہوری "احمدی" حضرات مرزا صاحب کی اس عبارت کو کبھی پیش نہیں کریں گے۔ یہ تو رہا مرزا صاحب کو مسیح موعود نہ ماننے والوں کے متعلق کہ وہ کافر ہیں۔ اب مرزا صاحب کا خود اپنے متعلق فتویٰ بھی سن لیجئے۔ یہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ انہوں نے جہاد بالسیف کو منسوخ قرار دیا اور اسے حرام بتایا۔ جہاد بالسیف قرآن کریم کا جس قدر اہم حکم ہے اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں قرآن کے کسی حکم کو منسوخ قرار دینے والے کے متعلق مرزا صاحب کا فیصلہ ملاحظہ فرمایئے۔ وہ اپنی کتاب ازالہ اوہام میں لکھتے ہیں۔

"ہم پختہ یقین کے ساتھ اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ قرآن شریف خاتم کتب سماوی ہے۔ اور ایک شعشہ یا نقطہ اس کی شرائع اور حدود اور احکام اور اوامر سے زیادہ نہیں ہو سکتا نہ کم ہو سکتا ہے اور اب کوئی ایسی وحی یا الہام منجانب اللہ نہیں ہو سکتا جو احکام فرقانی کی ترمیم

تنسیخ یا کسی ایک حکم کی تبدیلی و تغییر کر سکتا ہو۔ اور اگر کوئی ایسا خیال کرے تو وہ ہمارے نزدیک جماعتِ مومنین سے خارج اور ملحد اور کافر ہے۔" (ص ۱۳۸۔ بحوالہ پیغام صلح۔ بابت ۵ دسمبر ۱۹۷۲ء)

اب آپ سوچئے کہ مسلمانوں نے اگر مرزا صاحب کو دائرۂ اسلام سے خارج قرار دیا ہے تو یہ خود مرزا صاحب کے فیصلے کے مطابق ہے۔ لیکن ہمارے نزدیک یہ بحث ہی بیکار ہے کہ لاہوری جماعت مرزا صاحب کو کیا مانتی ہے اور قادیانی (ربوی) جماعت کیا؟ لاہوری جماعت کا یہی کہنا ہے نا، کہ مرزا صاحب کو نبی تو ربوہ والے مانتے ہیں۔ ہم انہیں ایسا نہیں مانتے۔ اس لئے ربوہ والوں کے ساتھ ہمیں بھی دائرۂ اسلام سے خارج کیوں قرار دیا جاتا ہے؟ اس کے معنی یہ ہیں کہ ان کے نزدیک جو لوگ مرزا صاحب کو نبی مانتے ہیں انہیں دائرۂ اسلام سے خارج قرار دیا جانا درست ہے۔ لیکن ٹھہریئے۔ یہ بھی فریب دہی کی ایک اور شکل ہے۔ لاہوری "احمدی" قادیانیوں (اہلِ ربوہ) کو بھی دائرۂ اسلام سے خارج قرار دیئے جانے کے لیے تیار نہیں۔ جس زمانے میں یہ سوال زیرِ غور تھا کہ "احمدیوں" کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے تو لاہوری جماعت نے اپنے اخبار "پیغامِ صلح" کی اشاعت بابت ۳۰ مئی ۱۹۷۴ء میں لکھا تھا۔

"ان حالات میں اوّل تو کسی جماعت کو غیر مسلم اقلیت قرار دینا صحیح نہیں۔ اور اگر اس شوق کو پورا ہی کرنا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ تو کم از کم "احمدیوں" کے اس گروہ کو اس سے مستثنیٰ کرنا ضروری ہے جو حضرت خاتم النبیینؐ کے بعد کسی بھی نبی کے آنے کے قائل نہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کے حق میں ہیں۔ ہمارے نزدیک قادیانی ہو یا غیر قادیانی ہر کلمہ گو مسلمان ہے۔ اس کو غیر مسلم قرار دینا کسی صورت میں بھی جائز نہیں۔"

آپ نے دیکھا کہ قادیانی اور لاہوری، اصل میں دونوں ایک ہیں۔ ان کا باہمی نزاع، جنگِ زرگری سے زیادہ کچھ حقیقت نہیں رکھتا۔ میں نے اسی بنا پر تجویز کیا تھا کہ قانون یہ پاس ہونا چاہیئے کہ مرزا غلام احمد کو مسلمان سمجھنے والا دائرۂ اسلام سے خارج ہے۔

مقامِ نبوّت

ان تصریحات سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ علاّمہ اقبالؒ نے ۱۹۳۵ء میں جو تجویز پیش کی تھی کہ مرزا

غلام احمد کے متبعین کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے اور جسے قانونی حیثیت ستمبر ۱۹۷۴ء میں مملکت پاکستان میں دی گئی۔ وہ کس قدر مبنی بر حقیقت اور خود مرزا صاحب کے مسلک کے عین مطابق تھی۔ لیکن قطع نظر ان قانونی مباحث کے، مرزا صاحب کے دعوئ نبوت نے خود منصبِ نبوت کی اس قدر تذلیل کی ہے جس کے تصور سے روح کانپ اُٹھتی ہے۔ انہوں نے نبوت جیسے بلند و بالا منصب کو، جو شرف و مجدِ انسانیت کی معراجِ کبریٰ ہے، انتہائی پست سطح پر لاکھڑا کر دیا۔ میں نے شروع میں بتایا ہے کہ بہاول نگر کے ڈسٹرکٹ جج محمد اکبر مرحوم نے اپنے فیصلہ میں کہا تھا کہ انہوں نے مقامِ نبوت کو میرے ایک مضمون سے سمجھا اور اسی بنا پر اپنا فیصلہ صادر کیا۔ میں نے اس کے بعد مقامِ نبوت کے متعلق اپنی کتاب، معراجِ انسانیت، میں بڑی شرح و بسط سے لکھا تھا۔ جی چاہتا ہے کہ میں اس سلسلہ میں اس کا ایک اقتباس آپ کی خدمت میں پیش کروں۔ میں نے اس میں لکھا ہے :-

> "نبوت کا مقام اس قدر عظیم المرتبت ہے کہ اس کے تصور سے روح میں بالیدگی، نگاہوں میں بصیرت، ذہن میں جِلا، قلب میں روشنی، خون میں حرارت، بازوؤں میں قوت، ماحول میں درخشندگی، فضا میں تابندگی اور کائنات کے ذرہ ذرہ میں زندگی کے آثار نمودار ہو جاتے ہیں۔ نبیؑ کا پیغام انقلاب آفریں دین و دُنیا کی سرفرازیوں اور سربلندیوں کا امین ہوتا ہے۔ وہ مُردوں کی بستی میں صورِ اسرافیل پھونک دیتا ہے اس سے قوم کے عروقِ مفلوج میں پھر سے خونِ حیات رقص کرنے لگ جاتا ہے۔ وہ اپنی ملت کو زمین کی پستیوں سے اُٹھا کر آسمان کی بلندیوں تک پہنچا دیتا ہے اور ان کے ایک ہاتھ میں زمین کی خلافت اور دوسرے میں آسمان کی بادشاہت دے دیتا ہے۔ وہ اپنی ہوش رُبا تعلیم اور محیّر العقول عمل سے باطل کے تمام نظامہائے کہنہ کی بنیادیں اکھیڑ کر آئینِ کائنات کو ضابطۂ خداوندی پر متشکل کر دیتا ہے۔ اس سے زندگی ایک نئی کروٹ لیتی ہے۔ آرزوئیں آنکھیں ملتی ہوئی اُٹھتی ہیں۔ ولولے جاگ پڑتے ہیں۔ ایمان کی حرارتیں دلوں میں سوز اور جگر میں گداز پیدا کرتی ہیں۔ روح کی مسرتوں کے چشمے اُبلتے ہیں، قلب و جگر کی نورانیت کی سوتیں پھوٹتی ہیں۔ تازہ اُمیدوں کی کلیاں مہکتی ہیں۔ زندہ مقاصد کے غنچے چٹکتے ہیں اور اس خوش بخت قوم کا صحنِ چمن، دامانِ صد باغبان و کفِ ہزار گلفروش کا فردوسی منظر پیش کرتا ہے۔ حکومتِ الٰہیہ کا قیام اس کا نصب العین اور قوانینِ خداوندی کا نفاذ اس کا منتہیٰ ہوتا ہے جب اس کے ہاتھوں خدا کی بادشاہت کا تختِ اجلال بچھتا ہے تو باطل کی ہر طاغوتی قوت

پہاڑوں کے غاروں میں منہ چھپاتی پھرتی ہے۔ جور و استبداد کے قصرِ فلک بوس کے کنگورے سجدہ ریز ہو جاتے ہیں۔ طغیان و سرکشی کے آتش کدے ٹھنڈے پڑ جاتے ہیں۔ وہ اپنے ساتھیوں کی قدوسی جماعت کے ساتھ اعلائے کلمۃ الحق کے لئے باہر نکلتا ہے تو فتح و ظفر اس کی رکاب چومتی ہے۔ شوکت و حشمت اس کے جلو میں چلتی ہے۔ سرکش اور خود پرست قوتیں اس کے خدائے واحد القہار کا کلمہ پڑھتی ہیں اور خدا اور اس کے فرشتے ان انقلاب آفریں ملکوتی کارناموں پر تحسین و تبریک کے پھولوں کی بارش کرتے ہیں۔ ان اللّٰہ و ملٰئکتہ یصلّون علی النبی۔"

یہ تھا مقامِ نبوت جسے شمع قرآنی سے اکتسابِ ضیا کے بعد میں نے ان الفاظ میں پیش کیا تھا۔ اس کے بعد ہمارے سامنے ایک مدعیٔ نبوت آتا ہے جس کی ساری عمر انگریزوں جیسی ابلیسی سیاست کی حامل قوم کی غلامی کی تلقین و تاکید میں گزر جاتی ہے۔ وہ لیفٹیننٹ گورنر بہادر کو درخواستوں پر درخواستیں گزارتا ہے کہ میں نے آپ کی اس قدر خدمت کی ہے، آپ اس کے صلہ میں میری حفاظت بھی کریں اور خصوصی مراعات سے بھی نوازیں! سوچئے عزیزانِ من! کہ اس سے نبوت کو کس مقام پہ لے آیا گیا ہے؟ یہی وہ احساس تھا جس سے تڑپ کر اقبالؒ نے کہا تھا کہ:۔

فتنۂ ملت بیضا ہے امامت اس کی
جو مسلماں کو سلاطیں کا پرستار کرے

مقامِ نبوت کے تعارف کے بعد میں نے اپنی مذکورہ صدر کتاب میں لکھا تھا:۔

"مقامِ نبوت تو ایک طرف شمعِ نبوی سے اکتسابِ ضیا کرنے والے مردِ مومن کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ اس کی نگاہوں سے قوموں کی تقدیریں بدل جاتی ہیں۔ ایک اللہ کے سوا کسی کا خوف اس کے دل تک نہیں پہنچ سکتا۔ دنیا کی بڑی بڑی طاقتیں اس کی شمشیرِ جگر دار کے سامنے لرزہ براندام ہوتی ہیں۔ اس کی قوتِ بازو حکومتِ خداوندی کے تمکن و بقا کی ضامن ہوتی ہے۔ وہ قوانینِ خداوندی کا عملاً نفاذ کرتا ہے۔ یہ وہ "مجدد" ہوتا ہے جس کی قوتِ ایمانی اور بصیرتِ فرقانی سے محمدٌ رسول اللّٰہ والذین معہٗ کے عہدِ سعادت مہد کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ یہ وہ "مسیحا" ہوتا ہے جس کے اعجازِ نفس سے مردہ قوم میں از سرِ نو زندگی کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ یہ وہ "مہدی" ہوتا ہے جو خود اللہ کے صراطِ مستقیم پر گامزن ہو کر ساری دنیا کے لئے ہدایت و رشادت کا نمونہ بن جاتا ہے۔ یہی وہ مرکز ہوتا ہے جس کے گرد ایسی جماعت کا دائرہ کھنچ جاتا ہے

جس کے متعلق فرمایا کہ۔

یُحِبُّھُمْ وَ یُحِبُّوْنَہٗٓ اَذِلَّۃٍ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ اَعِزَّۃٍ عَلَی الْکٰفِرِیْنَ ز یُجَاھِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَلَا یَخَافُوْنَ لَوْمَۃَ لَآئِمٍ ..... (۵/۵۴)

"اللہ ان سے محبت کرتا ہے اور وہ اللہ سے۔ وہ مومنوں کے سامنے جھکے ہوئے اور مخالفین کے مقابل میں غالب ہوتے ہیں۔ اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈرنے والے"۔

مؤمنین کی جرأتِ ایمانی

حضرات انبیاء کرامؑ کا مقام تو ایک طرف رہا، عام مؤمنین کی جرأت ایمانی کی کیا کیفیت ہوتی ہے، اس کے لئے خود قرآن کریم نے ایک واقعہ درج کیا ہے جو عبرت و موعظت کی ہزار داستانیں اپنے دامن میں رکھتا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ جب ساحرینِ دربارِ فرعون نے صداقت کو اپنے سامنے بے نقاب دیکھ کر خدا پر ایمان کا اعلان کر دیا تو فرعون نے بجلی کی سی کڑک اور شیر کی سی دھاڑ کے ساتھ کہا کہ تمہیں یہ جرأت کس طرح سے ہو گئی کہ میری اجازت کے بغیر ایمان کا اعلان کر دو! تم دیکھو کہ میں تمہارے ساتھ کیا کرتا ہوں۔ میں تمہیں حوالہ دار و رسن کر دوں گا اور تمہارے ایک ایک حصۂ بدن کو کٹوا کر الگ کر دوں گا۔ اِن مؤمنین نے (جنہیں ایمان لائے ابھی چند ثانیے ہی گزرے تھے) اس قہر آلود دھمکی کو نہایت سکون و سکوت کے ساتھ سنا اور ایک تبسم زیرِ لب کے ساتھ کہا ——— فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ (۲۰/۷۲) —— جو تیرے جی میں آئے کر لے۔ اِنَّآ اٰمَنَّا بِرَبِّنَا (۲۰/۷۳) ہم اپنے رب پر ایمان لے آئے ہیں اور پھر تو ہمارے ساتھ کر بھی کیا سکتا ہے۔ اِنَّمَا تَقْضِیْ ھٰذِہِ الْحَیٰوۃَ الدُّنْیَا (۲۰/۷۲) ——— تیرا دائرۂ اختیار ہماری اسی دنیاوی زندگی تک ہے اور زندگی تو یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ یہ آگے بھی بڑھتی ہے۔ اور اُس دائرے تک تجھے رسائی ہی حاصل نہیں ہو سکتی۔ اس لئے تو ہمیں ڈراتا کس بات سے ہے!

یہ ہوتی ہے مؤمنین کی جرأتِ ایمانی! اس کے برعکس اس مدعیٔ نبوت کی "جرأتِ ایمانی" کا اندازہ صرف ایک واقعہ سے لگائیے۔ مرزا صاحب نے جب اپنے ان الہامات کی نشر و اشاعت کی جن میں اپنے مخالفین پر خدا کے عذاب کی وعید تھی تو بٹالہ کے مولوی محمد حسین (مرحوم) نے ان کے خلاف زیرِ دفعہ (۱۰۷) تعزیراتِ ہند، ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ، گورداسپور کی عدالت میں استغاثہ دائرہ کر دیا۔ دفعہ (۱۰۷) کے تحت اگر جرم ثابت بھی ہو جائے تو سزا پھانسی

نہیں ہوتی، ضمانتیں ہو جاتی ہیں۔ لیکن مرزا صاحب کی "جرأتِ ایمانی کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے عدالت میں معافی نامہ داخل کر دیا جس کے الفاظ یہ تھے۔

"میں، مرزا غلام احمد قادیانی بحضور خداوند تعالیٰ باقرار صالح اقرار کرتا ہوں کہ آئندہ:۔

(۱) میں آئندہ ایسی پیش گوئی شائع کرنے سے پرہیز کروں گا جس کے یہ معنی ہوں یا ایسے معنی خیال کئے جاسکیں کہ کسی شخص کو (یعنی مسلمان ہو خواہ ہندو ہو یا عیسائی وغیرہ) ذلت پہنچے گی یا وہ موردِ عتابِ الٰہی ہوگا۔

(۲) میں خدا کے پاس ایسی اپیل (فریاد و درخواست) کرنے سے بھی اجتناب کروں گا کہ وہ کسی شخص کو (یعنی مسلمان ہو یا ہندو یا عیسائی وغیرہ) ذلیل کرنے سے یا ایسے نشان ظاہر کرنے سے کہ وہ موردِ عتابِ الٰہی ہے، یہ ظاہر کرے کہ مذہبی مباحثہ میں کون سچا اور کون جھوٹا ہے۔

(۳) میں کسی چیز کو الہام بتا کر شائع کرنے سے مجتنب رہوں گا جس کا یہ منشاء ہو یا جو ایسا منشاء رکھنے کی معقول وجہ رکھتا ہو کہ فلاں شخص (یعنی مسلمان ہو، خواہ ہندو یا عیسائی وغیرہ) ذلت اٹھائے گا یا موردِ عتابِ الٰہی ہوگا۔ ۔ ۔ ۔

(۴) جہاں تک میرے احاطۂ طاقت میں ہے میں تمام اشخاص کو جن پر کچھ میرا اثر یا اختیار ہے، ترغیب دوں گا کہ وہ بھی بجائے خود اس طریق پر عمل کریں جس طریق پر کاربند ہونے کا میں نے دفعہ ۱ تا ۳ میں اقرار کیا ہے۔

العبد | گواہ شد
مرزا غلام احمد بقلم خود | خواجہ کمال الدین بی۔اے۔ایل۔ایل۔بی۔

دستخط۔ جے۔ایم۔ڈوئی۔ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ۔ ۲۴؍ فروری ۱۸۹۹ء۔

سچ کہا تھا اقبالؒ نے کہ:۔

میں نہ عارف نہ مجدد نہ محدث نہ فقیہہ ۔۔۔ مجھ کو معلوم نہیں کیا ہے نبوت کا مقام
ہاں مگر عالمِ اسلام پہ رکھتا ہوں نظر ۔۔۔ فاش ہے مجھ پہ ضمیرِ فلکِ نیلی فام
عصرِ حاضر کی شبِ تار میں دیکھی میں نے ۔۔۔ یہ حقیقت کہ ہے روشن صفتِ ماہِ تمام

وہ نبوت ہے مسلماں کے لئے برگِ حشیش
جس نبوت میں نہیں قوت و شوکت کا پیام

والسلام
پرویز

بتقریب یوم اقبالؒ
اپریل سنہ ۱۹۷۶ء

متاعِ دین و دانش لُٹ گئی اللہ والوں کی

عزیزانِ گرامی قدر۔ سلام و رحمت!

آپ نے جب سے ہوش سنبھالا ہے یہ آواز آپ کے کان میں مسلسل آتی رہی ہوگی کہ مسلمانوں میں اتحاد نہیں، اتفاق نہیں۔ ان میں انتشار ہے، تشتت ہے۔ یہ مختلف قوموں اور گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ مختلف مذہبی فرقوں اور سیاسی پارٹیوں میں منقسم ہیں۔ اگر ان میں کہیں اتحاد پیدا ہو جائے تو یہ ساری دنیا پر چھا سکتے ہیں۔ دنیا کی کوئی طاقت ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ یہ سب پر غالب آ سکتے ہیں۔ اس قسم کی آوازیں زمانہ حال ہی کی پیدا شدہ نہیں۔ یہ قصہ صدیوں پرانا ہے۔ ہمارے اختلافات اور تفرقات کی داستان ہزار بارہ سو سال سے مسلسل آگے بڑھتی چلی آ رہی ہے۔ ان اختلافات کو مٹانے کی کوششیں بھی بہت ہوئیں۔ دور کیوں جایئے۔ ابھی پچھلی صدی میں جمال الدین افغانی جیسی شخصیت ہمارے سامنے آتی ہے۔ وہ ساری عمر نعل بر آتش، اسی اتحاد کا درد اور تڑپ سینے میں لئے مسلمانوں کے مختلف ممالک میں بگولے کا سا رقص کرتے رہے۔ مسلسل سفر کی مشقتیں اٹھائیں۔ کہیں قید و بند کی صعوبات برداشت کیں۔ کہا جاتا ہے کہ آخر میں انہیں زہر تک بھی دے دیا گیا۔ بہرحال وہ ساری عمر اسی جدوجہد میں مصروف اور اسی تگ و تاز میں سرگرداں رہے لیکن انہیں کوئی کامیابی نصیب نہ ہوئی سجھے اُن کی تحریک پان اسلامزم کے مالہٗ و ما علیہ سے بحث نہیں۔ میرا مقصد صرف یہ بتانا ہے کہ ان کی عمر بھر کی جدوجہد بلا نتیجہ ثابت ہوئی۔ بلکہ مسلمانوں کی مختلف مملکتوں کے اختلافات کم ہونے کی بجائے اور بڑھ گئے۔ ان کے بعد ہمارے دور میں حکیم الاُمت علامہ اقبالؒ بھی اسی درد کو دل میں لئے ہوئے اُٹھے۔ انہوں نے بھی اپنی ساری عمر اسی آہ و فغاں میں بسر کر دی۔ آپ جوابِ شکوہ کو دیکھئے۔ وہ کس کرب و اذیت سے کہتے ہیں۔

منفعت ایک ہے اس قوم کی، نقصان بھی ایک
ایک ہی سب کا نبیؐ، دین بھی، ایمان بھی ایک

حرم پاک بھی، اللہ بھی، قرآن بھی ایک　　کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک
فرقہ بندی ہے کہیں، اور کہیں ذاتیں ہیں!
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں ؟

اُن کے شکوہ کا جو جواب ندائے جمال کی طرف سے علامہ اقبالؒ سے کہا گیا کہ تم نے مسلمانوں کی ذلت و پستی کی دردانگیز داستان بھی سنائی اور اس باب میں ہماری بے اعتنائی کا شکوہ بھی کیا۔ لیکن ذرا سوچو تو سہی کہ :-

شور ہے ہو گئے دنیا سے مسلماں نابود　　ہم یہ کہتے ہیں کہ تھے بھی کہیں مسلم موجود؟
وضع میں تم ہو نصاریٰ، تو تمدن میں ہنود　　یہ مسلماں ہیں! جنہیں دیکھ کے شرمائیں یہود!
یوں تو سید بھی ہو، مرزا بھی ہو، افغان بھی ہو
تم سبھی کچھ ہو، بتاؤ تو مسلمان بھی ہو!

یہاں تو انہوں نے مسلمانوں کی مختلف ذاتوں اور گوتوں کا ہی ذکر کیا ہے لیکن آگے چل کر انہوں نے اپنے اس پیغام کی آماجگاہ کو وسیع تر کرتے ہوئے دنیا بھر کے مسلم ممالک کو مخاطب کیا اور کہا:-

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کیلئے　　نیل کے ساحل سے لے کر تابخاکِ کاشغر
جو کرے گا امتیازِ رنگ و خوں مٹ جائیگا　　ترک خرگاہی ہو یا اعرابیِ والا گہر

یہ کچھ اُنہوں نے خضرِ راہ میں کہا اور اس سے اگلے ہی سال، اپنی مشہور نظم طلوعِ اسلام میں انہوں نے خون کے آنسوؤں کے ساتھ کہا کہ :-

ہوس نے کر دیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوعِ انساں کو　　اخوت کا بیاں ہو جا، محبت کی زباں ہو جا
یہ ہندی وہ خراسانی، یہ افغانی وہ تورانی　　تو اے شرمندۂ ساحل، اُچھل کر بیکراں ہو جا
غبار آلودۂ رنگ و نسب ہیں بال و پر تیرے
تو اے مرغِ حرم اُڑنے سے پہلے پرفشاں ہو جا

میں نے حضرتِ علامہؒ کے یہ چند اشعار مثال کے طور پر پیش خدمت کئے ہیں، ورنہ ان کا سارا کلام اسی حقیقت کا ترجمان اور ان کا پیام اسی نصب العین کا داعی ہے۔ لیکن بصد حسرت یہ کہنا پڑتا ہے کہ ان کی یہ آتش نوائی بھی کوئی مثبت نتیجہ پیدا نہ کر سکی۔ اور وہ یہ کہتے ہوئے دنیا سے رخصت ہو گئے کہ :-

دیا اقبالؒ نے ہندی مسلمانوں کو سوز اپنا
یہ اک مردِ تن آساں تھا تن آسانوں کے کام آیا

سوال یہ ہے کہ جب اختلاف و افتراق کے نقصانات کا بھی سب کو احساس ہے اور مسلمانوں کی ستر اسی کروڑ آبادی میں ایک فرد بھی ایسا نہیں ملے گا جو آپس کے اتحاد و ائتلاف کی ضرورت اور اہمیت کا قائل نہ ہو، تو پھر کیا وجہ ہے کہ ان میں یہ اتحاد پیدا نہیں ہوتا؟ اس ضمن میں دردمندانِ ملت کی تمام کوششیں کیوں بے نتیجہ رہتی ہیں؟

اس کی وجہ کیا ہے؟

یہ وہ سوال ہے جو ہر دلِ دردمند میں بار بار اُٹھتا ہے اور پھر کوئی جواب نہ پاکر کاشانۂ قلب میں بصد حسرت و یاس واپس لوٹ جاتا ہے۔ اسی سوال کا جواب میرے آج کے خطاب کا مرکزی خیال ہے۔

آج جہاں ہر شخص مسلمانوں کے اختلافات کا شکوہ سنج اور ان کے افتراق کا نوحہ خواں ہے، وہاں ہر فرد اس حقیقت کا معترف بھی ہے کہ اسلام کے صدرِ اوّل میں اُمت میں کامل اتحاد ہی نہیں بلکہ وحدت تھی، مسلمانوں میں کسی قسم کا اختلاف اور افتراق نہیں تھا۔ اس اتحاد کے لئے اُن کے جسم ہی آپس میں ملے ہوئے نہیں تھے۔ بلکہ، قرآن کریم کے الفاظ میں، ان کے دل بھی ایک دوسرے کے ساتھ جُڑے ہوئے تھے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ ان میں ایسی وحدت کس طرح پیدا ہو گئی تھی۔ اور اس کے بعد وہ کون سا عنصر تھا جس کے نہ رہنے سے یہ وحدت اس طرح پارہ پارہ ہو گئی کہ وہ پھر دوبارہ آج تک پیدا نہ ہو سکی۔ اگر ہم اس کھوئی ہوئی حقیقت کو تلاش کر لیں تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ ہم نے اپنے مزمن مرض کی صحیح تشخیص کر لی ہے اور ظاہر ہے کہ صحیح تشخیص کے بعد مرض کا علاج ممکن ہو جاتا ہے۔ آئیے ہم اس اصل و بنیاد کی تلاش کے لئے بقلبِ سلیم، تاریخ کی راہوں پر چودہ سو منازل پیچھے کی طرف لوٹیں۔

سب سے پہلی بات یہ ہے کہ اسلام، مذہب نہیں دین تھا۔ مذہب میں مقصود ہر شخص کی انفرادی نجات ہوتا ہے جس کے لئے وہ انفرادی طور پر کچھ رسوم بجا لاتا اور مذہب کے بتائے ہوئے نیک کام کرتا ہے۔ اس میں اجتماعیت کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اس میں ہر شخص اپنے اپنے طور پر ہر مقام پر اور ہر قسم کے حالات میں مذہب پر کاربند رہ سکتا ہے۔ اس کے برعکس، دین ایک اجتماعی نظام کا نام ہوتا ہے۔ اس اجتماعی نظام کو قائم کرنے کے لئے ایک اُمت کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ افراد، جو دین کے نظریہ یا آئیڈیالوجی کی صداقت کو بطیبِ خاطر تسلیم کرتے ہیں، وہ انفرادی زندگی بسر نہیں کرتے بلکہ اس اُمت کے اجزا بن

جاتے ہیں۔ یہ جو آج کل آپ عام طور پر سُنتے چلے آرہے ہیں اور سُنتے رہتے ہیں کہ اسلام میں قومیت کا مدار ایمان کا اشتراک ہے تو اس کے یہی معنی ہیں۔ اس پوری کی پوری اُمّت کا نصب العین حیات بھی ایک ہوتا ہے اور اس کے حصول کے لئے راستہ بھی ایک۔ اسے وحدتِ فکر و عمل کہتے ہیں۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی معیار اور منہاج کے مطابق ایک اُمّت کی تشکیل کی تھی۔ یہی وہ اُمّت تھی جس کے متعلق خود اللہ تعالیٰ نے کہا تھا۔ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا۔ (۲/۱۴۳) اس آیۂ جلیلہ میں تین اہم حقیقتوں کا بیان ہے۔ پہلی یہ کہ مسلمان مختلف

اُمّت کی تشکیل

افراد نہیں تھے بلکہ ایک اُمّت تھے۔ دوسری حقیقت یہ کہ اس اُمّت کا وجود خود اپنی منفعت ہی کے لئے نہیں تھا، اس کا فریضہ یہ تھا کہ یہ اقوامِ عالم کے اعمال کی نگرانی کرے۔ اسی اعتبار سے اسے اُمّتِ وسطیٰ کہا گیا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ اُمّت دنیا کی ہر قوم کے لئے یکساں فاصلے پر ہوگی، جس طرح دائرے کا مرکز اس کے محیط کے ہر نقطہ سے یکساں فاصلے پہ ہوتا ہے۔ اسی اعتبار سے دوسری جگہ کہا گیا کہ كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (۳/۱۰۹) "تم وہ بہترین قوم ہو جسے نوعِ انسان کی بہبود و منفعت کے لئے پیدا کیا گیا ہے"۔ اور تیسری حقیقت یہ کہ خود اس اُمّت کی بھی ایک مرکزیت ہوگی۔ وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس تھی۔ حضورؐ کا منصب یہ تھا کہ وہ اس اُمّت کے اعمال کی نگرانی کریں۔ یہ تھا اس اُمّت کا منہاج اور طریق کار۔ سوال یہ ہے کہ وہ کون سا نقطۂ اتصال تھا جس نے ان افراد کو ایک اُمّتِ واحدہ کے قالب میں ڈھال دیا تھا۔ بُنْیَانٌ مَّرْصُوْصٌ یعنی سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح۔ (۶۱/۴) قرآن کریم نے اس حقیقت کی ان الفاظ میں وضاحت کر دی کہ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا (۳/۱۰۲) یعنی ان کی وجہِ جامعیت "اعتصام بحبل اللہ تھی"۔ حبل اللہ کے لفظی معنی "اللہ کی رسی" کے ہیں اور اس سے مقصد خدا کی کتاب قرآن کریم ہے۔ حبل اللہ یا رسّی کی تشبیہ سے بات بڑی واضح ہوجاتی ہے۔ بہاروں (جھاڑو) کے سینکڑوں تنکے ایک تاگے یا رسّی سے بندھے ہوتے ہیں۔ جو کام ان تنکوں کو باہم گر پیوست رکھنے میں جھاڑو کی رسّی کرتی ہے وہی کام مختلف افراد کو اُمّتِ واحدہ بنانے کے لئے اللہ کی رسی یعنی اس کی کتاب سرانجام دیتی ہے۔ یعنی خدا کی کتاب وہ ضابطۂ حیات تھی جو ان مختلف افراد کی باہم گر پیوستگی کا ذریعہ تھی۔ لیکن کتاب تو حروف اور الفاظ کا مجموعہ ہوتی ہے اور مجرّد (ABSTRACT)

الفاظ مختلف افراد کے لئے وجہ جامعیت نہیں بن سکتے۔ اس کے لئے کسی محسوس اتھارٹی کی ضرورت ہوتی ہے جو ان افراد کو یکجا رکھ سکے اور ان کے اختلافی معاملات میں حکم بن جائے۔ یہ محسوس اتھارٹی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس تھی۔ قرآن کریم نے افرادِ اُمّت کے مومن ہونے کے لئے شرط ہی یہ بتائی تھی کہ

رسول اللہؐ کا منصب

وہ اس سنٹرل اتھارٹی کے فیصلوں کو بطیبِ خاطر قبول کریں۔ چنانچہ سورۃ النساء میں ہے۔ فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا۔ (۴/۶۵)

"تیرا رب اس حقیقت پر شاہد ہے کہ یہ لوگ کبھی مومن نہیں ہو سکتے جب تک ان کی حالت یہ نہ ہو کہ یہ اپنے ہر اختلافی معاملے میں تجھے اپنا حکم تسلیم کریں اور اس کے بعد ان کی کیفیت یہ ہو کہ تیرے فیصلے کے خلاف ان کے دل کی گہرائیوں میں بھی کوئی گرانی محسوس نہ ہو۔ یہ اسے بہ طیبِ خاطر قبول کریں اور اس کے سامنے ..... سرِ تسلیم خم کر دیں۔" افرادِ اُمّت کے مومن ہونے کے لئے تو یہ شرط عائد کی گئی اور دوسری طرف خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا گیا کہ فَاحْكُم بَيْنَهُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ (۵/۴۸) "تم ان کے اختلافی معاملات کے فیصلے کتاب اللہ کے مطابق کیا کرو۔" دوسرے مقام پر اس حقیقت کی وضاحت ان الفاظ میں کر دی گئی۔ وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيهِ مِن شَيْءٍ فَحُكْمُهُ إِلَى اللَّهِ (۴۲/۱۰)۔ "تمہارے تمام اختلافی امور کا فیصلہ کتاب اللہ کے مطابق ہونا چاہئے۔" ان تصریحات کی روشنی میں اُس اجتماعی نظام کا پورا پورا نقشہ ہمارے سامنے آجاتا ہے جسے قائم کرنے کے لئے یہ اُمّت وجود میں لائی گئی تھی اور جس سے خود اس اُمّت کی وحدت قائم رہتی تھی، یعنی :۔

(۱) ان افراد کے فکر و عمل کا مرکز قرآن مجید

(۲) لیکن قرآن مجید کی اطاعت انفرادی طور پر نہیں بلکہ ایک جیتی جاگتی اتھارٹی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وساطت سے اجتماعی طور پر۔ اس اتھارٹی کے لئے جیتی جاگتی ہونے کی شرط نہایت اہم اور لاینفک ہے۔

زندہ اتھارٹی

یہی ہے وہ محور جس کے گرد اسلامی نظام گردش کرتا ہے۔ اور یہی ہے وہ نقطہ ماسکہ جس سے اُمّت کی وحدت قائم رہتی ہے۔ آپ قرآن کریم میں دیکھئے۔ اس میں اطاعت کے لئے وَاسْمَعُوا بنیادی شرط ہے۔ یعنی احکام کا سُننا، اور ان کی اطاعت کرنا۔ سورۃ تغابن میں ہے فَاسْمَعُوا وَأَطِيعُوا (۶۴/۱۶)۔ "احکام کو سنو اور ان کی اطاعت کرو۔" سورۃ انفال میں ہے۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَا تَوَلَّوْا عَنْهُ وَأَنتُمْ تَسْمَعُونَ (۸/۲۰) "اے جماعتِ مومنین۔ اے

اُمّتِ مسلمہ۔ تم اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور اس سے روگردانی مت کرو۔ درآں حالیکہ تم اس کے احکام کو سن رہے ہو" اور مومنین کی طرف سے اس کا جواب آتا تھا۔ سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا (۲/۲۸۵) "ہم نے سُنا اور ہم اس کی اطاعت کرتے ہیں" ان تصریحات سے واضح ہے کہ اطاعت کے لئے احکامات کا سُننا بنیادی شرط ہے اور احکامات وہی سُنے جا سکتے ہیں جو کسی زندہ اتھارٹی کی طرف سے دیئے جائیں۔ اس نقطہ کو عزیزانِ من! بڑی اچھی طرح سے ذہن نشین فرما لیجئے کہ یہی دین کی لم ہے۔ اطاعت کتابوں کی رُو سے نہیں کی جا سکتی، زندہ اتھارٹی کی رُو سے کی جا سکتی ہے۔

اب آگے بڑھیئے۔

اللہ اور رسول سے مراد

قرآن کریم میں قانون یا نظام کے الفاظ نہیں آئے کیونکہ یہ قرآن کریم کی اوّلین مخاطب قوم کے ہاں مروج نہیں تھے۔ اس نظام کو "اطاعتِ خدا اور رسول" کہہ کر پکارا گیا۔ یعنی خدا کی اطاعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وساطت سے۔ قرآن مجید میں "اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ" کی جامع اصطلاح اسی مفہوم کی ادائیگی کے لئے آئی ہے۔ دورِ حاضرہ میں اسے اسلامی نظام یا اسلامی مملکت کہہ کر پکارا جائے گا جو کتاب اللہ کی اطاعت کے لئے قائم کی گئی ہو۔ واضح رہے کہ یہ مفہوم نہ میرا ایجاد کردہ ہے نہ دورِ حاضرہ کا وضع کردہ۔ ہمارے متقدمین کی تفسیروں میں اس سے یہی مفہوم لیا گیا ہے۔ وہ اس سنٹرل اتھارٹی کے لئے عام طور پر امام کا لفظ استعمال کرتے ہیں کیونکہ نظام کا لفظ ابھی ان کے زمانے میں بھی رائج نہیں ہوا تھا۔ ہمارے زمانے میں یہ اصطلاح رائج ہو چکی ہے اور عصرِ حاضر کی تفاسیر میں یہ الفاظ ملتے ہیں۔ اس ضمن میں دو ایک مثالیں پیشِ خدمت ہیں۔ سورۃ الانفال کی ابتداء ان الفاظ سے ہوتی ہے یَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ.... (۸/۱) لفظی ترجمہ ان الفاظ کا یہ ہے۔ "اے رسولؐ! لوگ تم سے مالِ غنیمت کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ کہہ دو! کہ مالِ غنیمت دراصل اللہ اور اس کے رسولؐ کا ہے"۔ اس کی تشریح کرتے ہوئے (مولانا) ابوالکلام آزاد لکھتے ہیں:-

> "مالِ غنیمت جو لڑائی میں ہاتھ آئے وہ اللہ اور اس کے رسولؐ کا ہے۔ یعنی یہ بات نہیں ہونی چاہیئے کہ جو جس کے ہاتھ میں پڑ گیا وہ اسی کا ہو گیا۔ بلکہ سب کچھ امام کے سامنے پیش کرنا چاہیئے۔ وہ اسے جماعت میں تقسیم کرے گا"۔

مولانا آزاد نے یہاں "اللہ اور رسولؐ" کے لئے متقدمین کے اتباع میں، امام کا لفظ استعمال کیا ہے۔ لیکن

اگلے ہی صفحے پر یہ کہہ کر اس کی وضاحت کر دی ہے کہ :-

"قرآن حکیم نے حکم دیا ہے کہ مالِ غنیمت جو کچھ بھی ہاتھ آئے، حکومت (یعنی اسٹیٹ) کا ہے۔"

(ترجمان القرآن۔ جلد دوم صفحہ ۵۴، ۵۳)

اب دوسری مثال لیجئے۔ سورۃ المائدہ میں ہے۔ اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِیْنَ یُحَارِبُوْنَ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ وَیَسْعَوْنَ فِی الْاَرْضِ فَسَادًا ... (۵/۳۳) ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے اس آیت کا ترجمہ یہ دیا ہے:-

"جو لوگ اللہ اور اس کے رسولؐ سے لڑتے ہیں اور زمین میں اس لئے تگ و دو کرتے پھرتے ہیں کہ فساد برپا کریں .... (ان کی سزا یہ ہے کہ .....)

اس ترجمے پر وہ حسب ذیل حاشیہ لکھتے ہیں۔

زمین سے مراد یہاں وہ ملک یا وہ علاقہ ہے جس میں امن و انتظام قائم کرنے کی ذمہ داری اسلامی حکومت نے لے رکھی ہو اور خدا اور رسول سے لڑنے کا مطلب اس نظامِ صالح کے خلاف جنگ کرنا ہے جو اسلام کی حکومت نے ملک میں قائم کر رکھا ہو...... ایسا نظام جب کسی سرزمین میں قائم ہو جائے تو اس کو خراب کرنے کی سعی کرنا.... دراصل خدا اور اس کے رسولؐ کے خلاف جنگ ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے تعزیرات ہند میں ہر اس شخص کو جو ہندوستان کی برطانوی حکومت کا تختہ اُلٹنے کی کوشش کرے "بادشاہ کے خلاف لڑائی" (WAG ING WAR AGAINST THE KING) کا مجرم قرار دیا گیا ہے۔"

(تفہیم القرآن۔ جلد اوّل۔ ایڈیشن ۱۹۵۱ء، ص۴۶۵)

اس کے بعد مختلف سزاؤں کے سلسلہ میں مودودی صاحب نے حسب ذیل حاشیہ لکھا ہے:-

"یہ مختلف سزائیں برسبیلِ اجمال بیان کر دی گئی ہیں تاکہ قاضی یا امامِ وقت اپنے اجتہاد سے ہر مجرم کو اس کے جرم کی نوعیت کے مطابق سزا دے۔ اصل مقصود یہ ظاہر کرنا ہے کہ کسی شخص کا اسلامی حکومت کے اندر رہتے ہوئے اسلامی نظام کو اُلٹنے کی کوشش کرنا بدترین جرم ہے۔" (ایضاً)

ان حوالوں سے آپ نے دیکھ لیا کہ یہ کہنا کہ "اللہ اور رسولؐ" سے مراد اسلامی نظام یا اسلامی حکومت ہے، ایجاد بندہ نہیں۔ اور تو اور خود مودودی صاحب بھی اس سے یہی مراد لیتے ہیں۔ میں نے مودودی صاحب

کا نام خاص طور پر اس لئے لیا ہے کہ یہ صاحب اور ان کی جماعت میرے خلاف سب سے بڑا الزام یہ عاید کرتی ہے کہ میں "اللہ اور رسول" سے مراد اسلامی نظام لیتا ہوں اور اسی بناء پر یہ حضرات میرے خلاف "منکرِ سنّت" ہونے کا پراپیگنڈا کرتے چلے آ رہے ہیں۔ اس کی غرض میں ذرا آگے چل کر عرض کروں گا۔

بہرحال بات یوں چلی آرہی تھی کہ قرآن کریم کی رُو سے دین سے مراد ایک اجتماعی نظام ہے، اور اللہ اور رسول کی اطاعت سے مقصود اس نظام کی اطاعت ہے۔ اور اس اطاعت کے لئے ایک زندہ اتھارٹی کی موجودگی لازمی ہے۔ اس نظام کی یہ سب سے پہلی سنٹرل اتھارٹی حضور نبی اکرمؐ کی ذاتِ اقدس تھی۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا یہ نظام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی تک قائم رہنا تھا یا اسے آگے بھی چلنا تھا؟ ظاہر ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب کو آخری کتاب اور اسلام کو تمام نوعِ انسان کے لئے قیامت تک کے لئے دین الحق قرار دیا تو اس سے واضح ہے کہ اس نظام کو حضورؐ کی زندگی تک محدود نہیں رہنا تھا، آگے بھی چلنا تھا۔ قرآن کریم نے اس حقیقت کی وضاحت ان الفاظ میں کر دی:-

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۭ اَفَا۟ئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ۭ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰي عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَـيْـــًٔـا ۭ (۳/۱۴۴)

"محمدؐ، بجز ایں نیست کہ، خدا کا ایک رسولؐ ہے۔ اس سے پہلے کئی رسولؑ دنیا میں آئے اور اپنے اپنے فرائض منصبی سرانجام دینے کے بعد رخصت ہو گئے۔ اگر یہ رسولؐ بھی کل کو وفات پا جائے یا قتل کر دیا جائے تو کیا تم یہ خیال کر کے کہ یہ نظام تو اس رسولؐ کی زندگی تک محدود تھا، پھر اپنی سابقہ روش کی طرف پلٹ جاؤ گے؟ یاد رکھو! جو ایسا کرے گا وہ اپنا ہی نقصان کرے گا۔ خدا کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔"

اس سے واضح ہے کہ اس نظام کو رسول اللہؐ کے بعد ختم نہیں ہو جانا تھا، آگے بھی چلنا تھا۔ اس نظام کو

خلافت علیٰ منہاج رسالت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جانشینوںؓ (خلفاء) نے برقرار رکھنا تھا۔ اس میں خلیفۃ الرسول کی اطاعت نے رسول اللہؐ کی اطاعت کی جگہ لے لینی تھی۔ اور "اللہ اور رسولؐ کی اطاعت" کی عملی شکل خلافت علیٰ منہاج رسالتؐ کی اطاعت تھی۔ اس نکتہ کی وضاحت کے لئے حضورؐ نے فرمایا تھا:-

عَلَيْكُمْ بِسُنَّتِي وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِينَ الْمَهْدِيِّينَ ۔
(مشکوٰۃ ۔ باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ)

"تم پر میرے طریقے اور میرے خلفائے راشدین ، مہدیین کے طریقے کی پیروی لازمی ہے"۔

اس نظام کی بنیادی شرط اُمّت کی وحدت تھی ۔ یا یوں کہیے کہ اس نظام کا لازمی نتیجہ اُمّت کی وحدت تھی ۔ اگر اُمّت میں تفرقہ پیدا ہو جائے تو یہ نظام باقی نہیں رہ سکتا تھا ۔ دوسرے الفاظ میں ، اس نظام کے باقی نہ رہنے سے اُمّت کی وحدت ختم ہو جاتی تھی ۔ یعنی پھر اسلام دین نہیں رہتا تھا ، مذہب بن جاتا تھا ۔ یہ وجہ ہے جو قرآن کریم نے اُمّتِ مسلمہ کو بڑی شدت کے ساتھ تاکید کی کہ تم تفرقہ نہ پیدا کر لینا ۔ سورۃ الروم میں ہے وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ (۳۰/۳۱-۳۲) "اے اُمّتِ واحدہ ! ایسا نہ ہو کہ تم مشرکین میں سے ہو جاؤ ۔ یعنی ان لوگوں میں سے جنہوں نے دین میں تفرقہ پیدا کر لیا ۔ فرقوں اور گروہوں میں بٹ گئے اور پھر ان کی حالت یہ ہو گئی کہ ہر فرقہ اس فریبِ نفس میں مبتلا ہو گیا کہ ہم حق پر ہیں ۔" یہاں دیکھیے ! اُمّت کی وحدت ٹوٹنے کو شرک قرار دیا گیا ہے ۔ بات بالکل واضح ہے جب

تفرقہ شرک ہے

اُمّت ایک اتھارٹی کے تابع رہے تو اس کی وحدت قائم رہتی ہے ۔ تفرقہ کے معنی یہ ہیں کہ مختلف گروہ ، مختلف اتھارٹیز کے تابع ہو جاتے ہیں ۔ اسی کا نام شرک ہے ۔ اس کی تفسیر میں دوسری جگہ کہا ۔ وَأَنَّ هَٰذَا صِرَاطِي مُسْتَقِيمًا فَاتَّبِعُوهُ ۖ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَن سَبِيلِهِ (۶/۱۵۴) "اے رسولؐ ! ان سے کہہ دو کہ یہ میرا راستہ ہے ۔ اسی کو صراطِ مستقیم کہا جاتا ہے ۔ تم سب نے اسی کا اتباع کرنا ۔ اگر تم نے مختلف راستے اختیار کر لئے تو پھر خدا کی طرف لے جانے والا راستہ کسی کے سامنے نہیں رہے گا" یعنی اس طرح دین ، مذہب میں تبدیل ہو جائے گا اور "مذہب میں خدا کی طرف لے جانے والا راستہ ہوتا ہی نہیں" دوسرے مقام پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فرمایا ۔ إِنَّ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ (۶/۱۶۰) "جو لوگ دین میں تفرقہ پیدا کر دیں اور خود گروہ بن کر بیٹھ جائیں ۔ اے رسولؐ ! تیرا ان سے کوئی واسطہ نہیں ۔" رسول تو اس نظام کی سنٹرل اتھارٹی تھا جس کے فیصلوں کا اطلاق تمام اُمّت پر یکساں ہوتا تھا ۔ جن لوگوں نے کسی اور اتھارٹی کو تسلیم کر لیا وہ اگر اس نظام کے اندر رہے تو ان کی حیثیت باغیوں کی ہو گی ۔ اور اگر نظام سے باہر چلے گئے تو اُمّتِ محمدیہ

کے افراد نہ رہے ۔ دونوں صورتوں میں رسولؐ کا ان کے ساتھ کوئی تعلق نہ رہا۔ قرآنی آیات کے علاوہ اس ضمن میں نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بہت سی احادیث بھی ہیں جن میں تصریح کہا گیا ہے کہ اُمّت سے علیحدگی کے معنے دائرہ اسلام سے خارج ہو جانا ہے ۔ مسند امام احمد بن حنبلؒ کی ایک روایت ہے جس کا تشریحی ترجمہ حسب ذیل ہے ۔

"حضورؐ نے فرمایا ۔ میں تمہیں پانچ باتوں کا حکم دیتا ہوں جن کا اللہ نے مجھے حکم دیا ہے ۔ الجماعۃ ۔ والسمع والطاعۃ ۔ والہجرۃ ۔ والجہاد ۔ یعنی جماعت (کے ساتھ رہو) ۔ (حکمِ امیر) سنو ۔ اور (اس کی) اطاعت کرو (ضرورت پڑے تو اپنی عزیز ترین چیزوں کو بھی) چھوڑ دو ۔ (اسے ہجرت کہتے ہیں) ۔ اور اللہ کے راستے میں جہاد کے لئے نکل کھڑے ہو ۔ یاد رکھو! جو شخص جماعت سے ایک بالشت بھر بھی الگ ہو گیا ۔ اسلام کا پٹہ اس کی گردن سے اُتر گیا ۔ عرض کیا کہ یا رسول اللہ! خواہ وہ روزے رکھتا ہو اور نمازیں پڑھتا ہو ۔ (کیا پھر بھی اسلام سے خارج ہو جائے گا) فرمایا ۔ ہاں! خواہ وہ نمازیں پڑھتا ہو اور روزے رکھتا ہو اور بزعمِ خویش اپنے آپ کو مسلمان ہی کیوں نہ سمجھتا ہو (دائرہ اسلام سے خارج ہو جائے گا) ۔"

اُمّت کو اس قسم کی واضح تاکیدات کے بعد حضورؐ دنیا سے تشریف لے گئے اور آپؐ کے بعد آپؐ کے خلفائے راشدینؓ نے اس نظام کو اسی طرح قائم رکھا ۔ فرق صرف یہ تھا کہ رسول اللہؐ خدا کے مامور تھے اور یہ خلفاء ۔ قرآن کریم کے مشاورت کے حکم کی رُو سے ، اُمّت کے منتخب کردہ (ختمِ نبوّت کے ساتھ مامورین من اللہ کا سلسلہ ختم ہو گیا ۔ مامور من اللہ صرف رسولؐ ہوتا تھا ۔ لہٰذا رسول اللہؐ کے بعد اسلامی نظام کی مرکزی اتھارٹی اُمّت کا منتخب کردہ امام ، یا خلیفہ ہوتا تھا) ۔ منصب اور فریضہ دونوں کا ایک تھا ۔ یعنی دین کے نظام کا قیام جس میں قوانینِ خداوندی (قرآنِ مجید) کی اطاعت کرائی جائے ۔ یہ نظام خلافتِ راشدہ تک قائم رہا ۔ اُس میں نہ کوئی مذہبی فرقہ پیدا ہوا نہ سیاسی پارٹی ۔ ہر متنازعہ فیہ معاملہ کے لئے ایک سنٹرل اتھارٹی موجود تھی اور اس طرح اُمّت کی وحدت قائم تھی ۔ انتظامی مقاصد کے لئے یہ وسیع و عریض مملکت بے شک مختلف ولایتوں (صوبوں) میں منقسم تھی لیکن ان سب کی سنٹرل اتھارٹی ایک ہی تھی ۔ اس قسم کے انتظام کا ذکر خود قرآن کریم نے ان الفاظ میں کیا ہے ۔ أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنكُمْ (۴/۵۹) ۔ "اے جماعتِ مومنین! تم اطاعت کرو اللہ کی اور اس کے رسولؐ کی اور ان حاکموں کی جنہیں اسلامی نظام نے کچھ اختیارات سونپے ہوں ۔"

فَإِن تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ إِن كُنتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ

الآخر... (۴/۵۹) " اگر تم میں اور ان حکام میں کسی معاملے میں اختلاف ہو جائے تو اس کے رفع کرنے کے لئے اللہ اور رسول یعنی اس نظام کی سنٹرل اتھارٹی کی طرف رجوع کرو۔ تم اس طریق پر قائم رہے تو پھر سمجھا جائے گا کہ تم صاحب ایمان ہو۔"

بنی اُمیہ کے زمانے میں اس نظام کی کیا کیفیت تھی اس کے متعلق تاریخ سے کوئی واضح نقشہ ہمارے سامنے نہیں آتا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہماری تاریخ بالکلیہ قابل اعتماد نہیں۔ اسے مختلف زوایائے نگاہ سے مرتب کیا گیا ہے۔ بایں ہمہ اتنی بات واضح ہے کہ اس زمانے میں بھی کم از کم اُمت کی سیاسی وحدت قائم تھی۔ بنو عباس کے زمانے میں نہ مملکت کی سیاسی وحدت قائم رہی نہ دین کا وہ نقشہ برقرار۔ مسلمانوں کی الگ الگ خود مختار سلطنتیں قائم ہوتی چلی گئیں۔ دوسری طرف سیکولر نظام رائج ہو گیا جس کی وجہ سے سلطنت نے پبلک امور تو اپنے اقتدار میں رکھ لئے اور مذہبی امور علماء کی تفویض میں دے دیئے۔ اس طرح دین مذہب میں تبدیل ہو گیا۔ مختلف فرقے پیدا ہونے شروع ہو گئے۔ ان میں سے ہر فرقہ کی اتھارٹی الگ الگ تھی۔ چونکہ دین کی سنٹرل اتھارٹی باقی نہ رہی اس لئے أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ " کا صحیح مفہوم بھی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ اس کے معنی ہو گئے۔ اللہ کی اطاعت اور اس کے رسولؐ کی اطاعت۔ اس سے یہ سوال ابھرا کہ اللہ کی اطاعت سے مراد تو اس کی کتاب کی اطاعت ہوئی۔ اس کے رسولؐ کی اطاعت کس طرح کی جائے؟ اس مشکل کا حل یہ سوچا گیا کہ رسولؐ کی اطاعت، حضورؐ کی طرف منسوب احادیث کی رُو سے کی جائے۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے احادیث کے مختلف مجموعے مرتب کئے گئے۔ لیکن ان احادیث میں باہمدگر اختلاف تھا۔ اس لئے ان کی رُو سے اطاعت میں بھی اختلاف ہو گیا۔ مختلف فرقوں کا وجود اس اختلاف کا فطری نتیجہ تھا۔ اُمت کی وحدت پارہ پارہ ہو گئی۔ آپ نے غور فرمایا کہ اس سنٹرل اتھارٹی کے نہ رہنے سے، کس طرح دین کا نظام بھی ختم ہو گیا اور اُمت کی وحدت بھی معدوم!

یہ ہے وہ کیفیت جو ہمارے ہاں صدیوں سے مسلسل چلی آرہی تھی۔ کروڑوں افراد پر مشتمل مسلمان افراد کا بے شک نام تو ایک ہے (یعنی مسلمان) لیکن اس نام کے سوا ان میں کوئی قدر مشترک نہیں۔ مذہب میں ہوتا ہی یہی ہے۔ آپ عیسائیوں کے ہاں دیکھئے۔ دنیا میں ان کی آبادی مسلمانوں سے بھی زیادہ ہے لیکن ان میں اشتراک صرف نام کا ہے۔ عیسائیت کا مذہب ان کی وجہ جامعیت نہیں ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ عیسائی سلطنتیں باہمدگر مصروف جنگ و قتال رہتی ہیں۔ ہمارے زمانے میں پہلی اور دوسری عالمگیر جنگیں بنیادی طور پر عیسائی مملکتوں کے مابین ہی تھیں۔ ان عیسائیوں میں مشترک قدر اتنی ہی ہے کہ وہ اتوار کے دن گرجوں میں چلے

ہماری حالت

جاتے ہیں یا کرسمس کے تہوار کا جشنِ مسرت منا لیتے ہیں۔ بعینہٖ یہی حالت ہم مسلمانوں کی ہے۔ ہم سب اپنا نام مسلمان رکھتے اور اسلام اپنا مذہب لکھتے اور بتاتے ہیں۔ لیکن یہ مذہب مختلف مسلم سلطنتوں میں تو ایک طرف، ایک ہی مقام پر بسنے والے مسلم افراد میں بھی کسی قسم کی یگانگت کا موجب نہیں بنتا۔ مثلاً قرآن کریم نے کہا تھا وَمَنْ يَقْتُلْ مُؤْمِنًا مُتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهُ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيهَا وَغَضِبَ اللَّهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهُ وَأَعَدَّ لَهُ عَذَابًا عَظِيمًا (۴/۹۳) "جس مسلمان نے کسی دوسرے مسلمان کو بالارادہ قتل کر دیا تو وہ ابدی طور پر جہنم میں رہے گا۔" یہ تھی قرآن کی رو سے مسلمانوں کے ہاتھوں کسی ایک مسلمان کے قتل کی پاداش۔ اب صورت یہ ہے کہ انفرادی طور پر ہر روز مسلمان مسلمانوں کے ہاتھوں قتل ہوتے ہیں اور اجتماعی طور پر مسلمان مملکتیں ایک دوسرے کے ساتھ مصروفِ جنگ و قتال رہتی ہیں۔ مذہب اسلام کا اشتراک انہیں اس سنگین جرم کے ارتکاب سے باز نہیں رکھتا۔ مختلف فرقوں کی یہ کیفیت ہے کہ ہر فرقے کی مسجد الگ الگ ہے اگرچہ ہر فرقہ اپنی مسجد کا رُخ ایک ہی سمت (قبلہ) کی طرف رکھتا ہے۔ باجماعت نماز ادا کر کے سمجھ لیا جاتا ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے جماعت کے ساتھ رہنے کا جو تاکیدی حکم دیا تھا اس کی تعمیل ہو گئی۔ امام کی آواز پر رکوع و سجود کی ادائیگی سے اس خود فریبی میں مبتلا رہا جاتا ہے کہ "سمع و طاعت" کا جو حکم دیا گیا تھا اس کی پوری پوری تعمیل ہو رہی ہے۔ حج کے موقع پر لاکھوں کے میکانکی اجتماع کو اتحادِ اسلامی کا رُوح پرور نظارہ کہہ کر تکبیر کے نعرے بلند کئے جاتے ہیں۔ اس سے آگے بڑھ کر رابطہ عالم اسلامی کی سی تحریکوں اور سربراہانِ مملکتِ اسلامیہ کی کانفرنسوں سے یہ اطمینان حاصل کر لیا جاتا ہے کہ ہم وحدتِ اُمّت کی طرف قدم بڑھا رہے ہیں۔ قرآن کریم نے ایک قسم کی اجتماعیت کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا تھا کہ تَحْسَبُهُمْ جَمِيعًا وَقُلُوبُهُمْ شَتَّىٰ (۵۹/۱۴) "تم انہیں یکجا دیکھ کر خیال کرو گے کہ یہ واقعی ایک جماعت ہے۔ لیکن ان کا یہ اتحاد محض ان کے جسموں کا یکجا ہونا ہے۔ ان کے دل ایک دوسرے سے الگ الگ ہیں۔" دو سال اُدھر جو خود ہمارے ہاں مسلم سربراہوں کی کانفرنس منعقد ہوئی تھی اسکے "اتحاد" کا بھانڈا ابھی حال ہی میں پھوٹا ہے۔ اس میں مصر کے صدر سادات اس اتحاد کی کوششوں میں پیش پیش نظر آتے تھے۔ وہ آگے بڑھ بڑھ کر ہر ایک سے گلے مل رہے تھے۔ حتیٰ کہ انہوں نے مجیب الرحمٰن کو کانفرنس میں شریک کرنے اور بنگلہ دیش کو تسلیم کرانے کے لئے بھی نمایاں "خدمات" سرانجام دی تھیں۔ نظر آتا تھا کہ اس شخص کا سینہ دردِ ملّت سے لبریز اور اس کا دل اتحادِ اُمّت کے جذبہ سے سرشار ہے۔ اب حال ہی میں

یہ بھید کھلا کہ ۱۹۷۱ء کی جنگ میں روسی اسلحہ کے لدے ہوئے جہاز قاہرہ ایئرپورٹ سے سیدھے بھارت بھیجے جاتے تھے تاکہ وہ ان کے ذریعہ بنگلہ دیش میں پاکستانی فوجوں کو شکست دے سکیں[1] اور اسی سے یہ راز بھی کھلا کہ صدر سادات سربراہی کانفرنس کے اختتام پر یہاں سے سیدھے بھارت کیوں تشریف لے گئے تھے۔ سوال، عزیزانِ من! کسی ایک مملکت یا کسی ایک سربراہ کا نہیں۔ اصل سوال یہ ہے کہ ہم اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ "مذہب" مختلف افراد میں وجۂ اخوت اور مختلف مملکتوں میں باعثِ یگانگت بن سکتا ہے۔ یہ فریبِ نفس ہے۔ مذہب (خواہ کوئی بھی ہو) نہ کبھی وجۂ یگانگت بنا ہے نہ اب بن سکتا ہے۔ یہ صورت تو دین سے پیدا ہوتی ہے۔

اقبالؒ کا پیغام

اور یہ وہ پیغام تھا جسے اقبالؒ عمر بھر عام کرتا رہا۔ سب سے پہلے اس نے اس حقیقت کو واشگاف کیا کہ دین کی رُو سے فرد کی ہستی ربطِ ملت کے ساتھ وابستہ ہوتی ہے۔ یعنی وہی چیز جسے حضور نبیٔ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے تمسک بالجماعت کہہ کر پکارا تھا۔ اسرار و رموز، علامہ اقبالؒ کا سب سے پہلا مجموعۂ کلام ہے۔ وہ اس میں لکھتے ہیں۔

فرد را ربطِ جماعت رحمت است — جوہرِ اُو را کمال از ملت است

فرد و قوم، آئینۂ یک دیگر اند — سلک و گوہر، کہکشاں و اختر اند

فرد می گیرد ز ملت احترام

ملت از افراد می یابد نظام

جاوید نامہ ان کے فلسفہ اور پیغام پر مشتمل بڑی اہم کتاب ہے۔ وہ اس میں ایک مقام پر اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہ اُمت کی تشکیل کس طرح سے ہوتی ہے ... کہتے ہیں کہ:-

قوتِ دیں از مقامِ وحدت است — وحدت از مشہود گردد، ملت است

یعنی افراد کی وحدت جب محسوس اور مشہود شکل اختیار کرے تو اسے ملت یا جماعت یا اُمت کہا جاتا ہے۔ اور یہی وہ وحدت ہے جس سے دین کو تقویت حاصل ہوتی ہے۔

ارمغانِ حجاز ان کا آخری مجموعۂ کلام ہے جو ان کی وفات کے بعد شائع ہوا۔ وہ اس میں اس طرح

---

[1] بعد میں ڈپلومیٹک طریق پر اس کی تردید کر دی گئی۔

متشکل شدہ اُمّت کے متعلق کہتے ہیں کہ :-

میانِ اُمّتاں والا مقام است　　　که آں اُمّت دو گیتی را امام است

نیاساید زکارِ آفرینش　　　که خواب و خستگی بر وے حرام است [1]

اسی سلسلہ میں آگے ایک قطعہ ہے جس کے متعلق میں سمجھتا ہوں کہ دین کا پورا نظام اور اُمّت اور اس کے نصب العین کا باہمی ربط اس کے اندر سمٹ کر آگیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس اُمّت کی کیفیت یہ ہے۔

بپرد در وسعتِ گردوں یگانہ　　　نگاہِ اُو بہ شاخِ آشیانہ

مہ و انجم گرفتارِ کمندش　　　بدستِ او ست تقدیرِ زمانہ

پرندے دن بھر فضا کی پہنائیوں میں محوِ پرواز رہتے ہیں۔ وہ سینکڑوں میل تک دور دور نکل جاتے ہیں لیکن اپنے آشیانے کا تصوّر ایک ثانیہ کے لئے بھی ان کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہوتا۔ اور وہ دن بھر کی تگ و تاز کے بعد شام کو پلٹ کر اُسی آشیانے میں آجاتے ہیں۔ اُمّتِ مسلمہ کی بھی یہی کیفیت ہے وہ رزمگاہِ حیات کے ہر گوشے میں مصروفِ تگ و تاز رہتی ہے۔ وہ زندگی کے ہر گوشے میں منہمکِ سعی و عمل رہتی ہے۔ لیکن اپنا نصب العینِ حیات اس کی نگاہوں سے کبھی اوجھل نہیں ہوتا۔ اور اسی وحدتِ نصب العین سے اس قوم میں ایسی قوّت پیدا ہو جاتی ہے کہ چاند اور ستاروں تک اس کی کمند میں گرفتار ہوتے ہیں۔ اور اقوامِ عالم کی تقدیر اس کے ہاتھ میں۔

وحدتِ نصب العین کی اسی بنیادی حقیقت کو انہوں نے جاوید نامہ میں ان حسین و بلیغ الفاظ میں مرکوز کر دیا ہے کہ :-

چیست ملّت اے کہ گوئی لا الٰہ؟　　　با ہزاراں چشم بودن یک نگاہ

جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہا ہے، ہم رسمی طور پر اُمّتِ محمّدیہ اور ملّتِ اسلامیہ جیسے الفاظ استعمال کرتے رہتے ہیں۔ لیکن اقبالؒ اس ملّت کو (یعنی ہم مسلمانوں کو) وہ ملّت ہی نہیں قرار دیتا جسے قرآن کی روشنی میں نبی اکرم صلّے اللہ علیہ وسلّم نے متشکّل فرمایا تھا۔ وہ ارمغانِ حجاز میں لکھتے ہیں :-

مسلماں فاقہ مست و ژندہ پوش است　　　زکارش جبرئیل اندر خروش است

---

[1] یعنی وہ لَا تَأْخُذُهُ سِنَةٌ وَلَا نَوْمٌ (۲/۲۵۵) کی خدائی صفت کی علیٰ قدرِ بشریت مظہر ہوتی ہے۔

بیا نقشِ دگر ملت بریزیم		کہ ایں ملت جہاں را بارِ دوش است

اس نشاۂ جدیدہ کی رُو سے متشکل ہونے والی ملّت کے متعلق اگلے قطعہ میں ہے:۔

دگر ملت کہ کارے پیش گیرد		دگر ملت کہ نوش از نیش گیرد
نگردد بایکے عالم رضا مند		دو عالم را بہ دوشِ خویش گیرد

اقبالؒ، نازی ازم، فاشزم یا کمیونزم کی طرح فرد کو ملت میں گم کر کے اس کے جداگانہ تشخص کو مٹا نہیں دیتا۔ وہ افراد کا تشخص قائم رکھتا ہے اور اسی کو ملت کی قوت کی بنیاد قرار دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ:۔

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر
ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارہ

بانگِ درا میں ہے:۔

یقیں افراد کا سرمایۂ تعمیرِ ملت ہے		یہی قوت ہے جو صورت گرِ تقدیرِ ملت ہے

جماعت کی اہمیت کے بعد اقبالؒ دین کے نقطۂ ماسکہ کی طرف آتا ہے۔ میں نے پہلے کہا ہے کہ اسلامی نظام کی سنٹرل اتھارٹی اس وحدت کے قائم رکھنے کا ذریعہ ہوتی ہے۔ اقبالؒ اسے مرکزِ ملت کہہ کر

مرکزِ ملت

پکارتا ہے۔ یہاں اتنا واضح کر دینا ضروری ہے کہ مرکزِ ملت سے مراد کوئی ایک فرد نہیں۔ اسلامی نظام میں سنٹرل اتھارٹی یا مرکزی حکومت کی جو شکل بھی قرآنی حدود کے اندر رہتے ہوئے اُمت کے باہمی مشورہ سے متعین کر لی جائے گی، اسے مرکزِ ملت سے تعبیر کیا جائے گا۔ اس مرکزی اتھارٹی کے متعلق اقبالؒ نے اپنی مختلف کتابوں میں بڑی شرح و بسط سے لکھا ہے۔ وہ اسرار و رموز میں کہتے ہیں:۔

قوم را ربط و نظام از مرکزے		روزگارش را دوام از مرکزے
حلقہ را مرکز چو جاں در پیکر است		خطِ اُو در نقطۂ او مضمر است

اس سلسلے میں وہ مسلمانوں کو یاد دلاتے ہیں کہ بنی اسرائیل کو دیکھو۔ جب ان کی مرکزیت باقی نہ رہی تو ان کا سارا شیرازہ بکھر گیا۔ وہ لکھتے ہیں:۔

عبرتے اے مسلمِ روشن ضمیر		از مآلِ اُمتِ موسیٰؑ بگیر

• داد چوں آں قوم مرکز را ز دست — رشتۂ جمعیتِ ملت شکست

وہ موجودہ مسلمانوں کی لامرکزیت پر خون کے آنسو بہاتے ہیں اور ان کے تمام امراض کی علت اسی کو قرار دیتے ہیں۔ ارمغانِ حجاز کے دو تین قطعات ملاحظہ فرمائیے۔ وہ کہتے ہیں :-

ہنوز ایں چرخ نیلی کج خرام است — ہنوز ایں کارواں دور از مقام است
ز کارِ بے نظامِ اُو چہ گویم — تو می دانی کہ ملت بے امام است

ذرا آگے چل کر لکھتے ہیں :-

شبے پیشِ خدا بگریستم زار — مسلماناں چرا زارند و خوارند
ندا آمد! نمی دانی کہ ایں قوم — دلے دارند و محبوبے ندارند

وہ لامرکز قوم کی تمام جدّوجُہد کو سعیٔ لاحاصل قرار دیتے ہیں۔ کہتے ہیں :-

ازاں فکرِ فلک پیما چہ حاصل — کہ گردِ ثابت و سیارہ گردد
مثالِ پارۂ ابرے کہ از باد — بہ پہنائے فضا آوارہ گردد

اسی کو وہ پرندے اور آشیانے کے غیر مرئی ربط کی تشبیہ سے زیادہ وضاحت سے بیان کرتے ہیں۔ ان کے ایک اور قطعہ کا پہلا شعر میں پہلے پیش کر چکا ہوں۔ پورا قطعہ اب ملاحظہ فرمائیے :-

چیست ملت؟ اے کہ گوئی لا الٰہ! — با ہزاراں چشم بودن یک نگاہ
مردۂ! از یک نگاہی زندہ شو — بگذر از بے مرکزی پایندہ شو

وہ ضربِ کلیم میں کہتے ہیں کہ :-

قوموں کے لئے موت ہے مرکز سے جدائی — ہو صاحبِ مرکز تو خودی کیا ہے؟ خدائی!

میں نے پہلے بتایا ہے کہ اُمتِ مسلمہ کا فکری، اعتقادی اور آئینی مرکز خدا کی کتاب قرآن مجید ہے اور ان کے عمل و کردار کا مرکز اسلامی نظام اور اس کی مرکزی اتھارٹی۔ لیکن محسوسات کا خوگر انسان کوئی محسوس مرکز بھی چاہتا ہے جو اس کے نصب العین کی علامت بن سکے۔ دورِ حاضرہ کی مثال میں یوں سمجھئے کہ جب ہم ماسکو کہتے ہیں تو اُس سے مراد ایک شہر نہیں ہوتا بلکہ کمیونزم کا محسوس مرکز یا علامت ہوتا ہے دنیا میں کمیونسٹ کہیں بھی ہوں، ان کی فکر و نظر اس محسوس مرکز کے ساتھ وابستہ ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان

کے اس تقاضا کا بھی احترام کیا اور ان کے لئے ایک محسوس مرکز متعین کر دیا۔ یہ مرکز کوئی شہر نہیں بلکہ کعبہ ہے جسے خدا نے اپنا گھر کہہ کر پکارا ہے۔ تعمیرِ کعبہ کا مقصد ہی یہ تھا کہ یہ دنیا کے توحید پرستوں کا محسوس مرکز بن سکے۔ حضور نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو اسلامی مملکت قائم کی مدینہ اس کا دارالحکومت تھا۔ عام دنیاوی مملکتوں کے منہاج کے مطابق اسی شہر کو اس ملت کا محسوس مرکز قرار پانا چاہیئے تھا۔ لیکن مدینہ تشریف رکھتے ہوئے بھی حضورؐ کے دل میں یہ مقدس آرزو مچلتی تھی کہ یہ مرکز محسوس کعبہ ہی ہونا چاہیئے، حالانکہ اس وقت کعبہ، اسلام کے مخالفین کے قبضے میں تھا۔ قرآن کریم نے حضورؐ کی اس آرزو کو ان حسین الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔ قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىهَا۔ (۲/۱۴۴) "ہم دیکھ رہے ہیں کہ تیری نگاہیں کس طرح بار بار آسمان کی طرف اٹھ رہی ہیں۔ تم اطمینان رکھو۔ ہم تمہارے پسندیدہ مرکز کو یقیناً تمہاری تولیت میں دے دیں گے"۔ چنانچہ آخر الامر کعبہ کی تولیت اس نظام کی تحویل میں آگئی اور اسے اُمتِ مسلمہ کے لیئے قبلہ قرار دے دیا گیا۔ قبلہ کے معنی ہوتے ہیں وہ شے جو ہر وقت کسی کے پیش نظر رہے۔ اسی کو نصب العین کہا جاتا ہے۔ چنانچہ اس اُمت سے کہا گیا۔ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ... (۲/۱۴۴) "تم جہاں کہیں بھی ہو اپنی نگاہیں اسی مرکز کی طرف مرکوز رکھو۔" اس کے مفہوم کو اور وضاحت سے سمجھنے کے لئے اقبالؒ کے اُس شعر کو پھر سے سامنے لائیے۔ جسے میں پہلے بھی پیش کر چکا ہوں کہ:-

پرد در وسعتِ گردوں یگانہ   نگاہِ اُو بشاخِ آشیانہ

اقبالؒ نے اسرار و رموز میں، اس مرکز کی اہمیت ان الفاظ میں بیان کی ہے:-

قوم را ربط و نظام از مرکزے   روزگارش را دوام از مرکزے
راز دار و رازِ ما بیت الحرام   سوزِ ما ہم سازِ ما بیت الحرام
تو ز پیوندِ حریمے زندۂ   تا طوافِ اُو کنی، پائندۂ

در جہاں جانِ اُمم جمعیت است
در نگر، سرِ حرم جمعیت است

اور ارمغانِ حجاز میں قبلہ کی غایت اور اُمت کے ساتھ اس کے قلبی روابط کو ایسے بلیغ انداز میں بیان کیا ہے

ہے کہ نگۂ بصیرت اس پر غور کرنے سے وجد میں آجاتی ہے۔ کہا :-

حرم، جز قبلۂ قلب و نظر نیست ۔۔۔ طواف او طواف بام و در نیست

میان ما و بیت اللہ، رمزے ست ۔۔۔ کہ جبریل امیں را ہم خبر نیست

جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہا ہے۔ آج دنیا کی مختلف مملکتوں کے اپنے اپنے محسوس مراکز ہیں۔ ماسکو، پیکنگ، واشنگٹن وغیرہ۔ لیکن یہ انسانوں کے وضع کردہ نظاموں کے قومی مراکز ہیں۔ اس کے برعکس کعبہ، نہ انسانوں کے وضع کردہ نظام کا نصب العین ہے اور نہ ہی (آجکل کی اصطلاح میں) کسی قوم کا مرکز۔ وہ ضابطۂ خداوندی کی اطاعت کا محسوس مرکز ہے جسے تمام نوع انسان کا مرکز بننے کے لئے تعمیر کیا گیا ہے۔ دنیا میں رائج سیکولر نظام اس قسم کے مرکز سے محروم ہے، اس لئے اس کی رو سے نوع انسان کی عالمگیر برادری متشکل نہیں ہو سکتی جو قرآن کی غایت الغایات ہے۔ اسی بنا پر اقبالؒ کہتا ہے کہ :-

عرب کے سوز میں سازِ عجم ہے ۔۔۔ حرم کا راز توحیدِ اُمم ہے

تہی وحدت سے ہے اندیشۂ غرب ۔۔۔ کہ تہذیب فرنگی بے حرم ہے

اقبالؒ کے زمانے میں "لیگ آف نیشنز" قائم ہوئی تھی جس کا ہیڈ کوارٹر جنیوا میں تھا۔ اس نظام اور قرآنی نظام کے فرق کو نمایاں کرنے کے لئے اقبالؒ نے کہا کہ :-

کعبے نے دیا خاکِ جنیوا کو یہ پیغام

جمعیتِ اقوام کہ جمعیتِ آدم ؟

ان تصریحات سے آپ نے سمجھ لیا ہوگا کہ قرآن کریم کی رو سے دین کا مفہوم کیا ہے؟ یعنی خدا کی کتاب کو ضابطۂ حیات تسلیم کرنے کی بنا پر اُمّتِ واحدہ کی تشکیل۔ اس اُمّت کی ایک مملکت، اُس مملکت کی ایک سنٹرل اتھارٹی جسے اقبالؒ نے مرکزِ ملّت کہہ کر پکارا ہے۔ اس پورے نظام کو قرآن کریم نے الاسلام کی جامع اصطلاح سے تعبیر کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر ان اجزاء میں سے کوئی ایک جزو بھی باقی یا اپنی اصل شکل پر قائم نہ رہے تو اسلام، اسلام نہیں رہتا۔ اس آئینہ میں دیکھئے تو قرآنی اسلام دنیا میں کہیں بھی موجود نہیں۔ اسلام، مذہب ہی کی شکل میں موجود ہے۔ اس حقیقت کو علامہ اقبالؒ نے بڑی شدت سے محسوس کیا جس کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ جب تک اسلام کا نظام قائم نہیں ہوتا، اُمّت میں وحدت پیدا نہیں ہو سکتی۔ ظاہر ہے کہ یہ مقصد اتنا عظیم اور وسیع تھا کہ وہ، بحالاتِ موجودہ ایک ہی

جست میں حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ اس منزل تک بتدریج ہی پہنچا جا سکتا تھا۔ اس کے لئے ضروری تھا کہ اس پروگرام کی ابتداء کسی ایک خطۂ زمین سے کی جائے۔ انہوں نے علامہ جمال الدین افغانیؒ کے ناکام تجربہ سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ اس وقت مختلف علاقوں میں مسلمانوں کی قومی مملکتیں قائم ہیں اور کوئی مملکت بھی اپنے اس جداگانہ تشخص کو ملّت کی وحدت میں گم کرنے کے لئے تیار نہیں۔ انہوں نے یہ سوچا کہ اس پروگرام کا آغاز کسی ایسے خطۂ زمین سے ہو سکتا ہے جہاں پہلے سے کوئی مملکت قائم نہ ہو۔ اس کے لئے انہوں نے مملکتِ پاکستان کا تصور دیا اور اس تصور کو قائداعظمؒ کی مجاہدانہ تگ و دو نے ایک محسوس مملکت کی شکل

مملکتِ پاکستان

میں متشکل کر دیا۔ یہ ایک ایسا عظیم انقلاب تھا جس کی مثال ہماری تاریخ میں کہیں نہیں ملتی۔ اس سے پھر اُسی دین کے احیاء کے امکانات تابندہ اور روشن ہو گئے جسے صدرِ اوّل میں محمدؐ رسول اللہ والذین معہٗ کے مقدس ہاتھوں نے قائم کیا تھا۔ اس سے آپ اس خطۂ زمین کی اہمیت کا اندازہ لگا لیجئے۔

لیکن وائے بر حالِ ما! کہ اقبالؒ کا یہ خواب، خوابِ پریشاں ہو کر رہ گیا۔ پاکستان، مسلمانوں کی ایک جداگانہ مملکت ہی نہ بن سکا۔ اور اس میں اسلام، مذہب کی حیثیت ہی سے رائج رہا۔ یہ دین کے نظام کی جولانگاہ نہ بن سکا۔ اس کی وجوہات متعدد قرار دی جا سکتی ہیں لیکن میرے نزدیک اس کی بنیادی وجہ اور اساسی سبب ایک ہی ہے۔ اور وہ ہے اس بدنصیب ملک میں جماعتِ اسلامی کا وجود۔ مجھے اس کا اچھی طرح سے احساس ہے کہ میرے اس کہنے پر بہت سی بھویں تنیں گی، بہت سی پیشانیوں پر بل پڑیں گے۔ بہت سے چہرے خشمگین اور بہت سے دہن کف آگیں ہوں گے۔ میرے خلاف پروپیگنڈے کے سمندر میں ایک نیا تلاطم برپا ہو گا۔ لیکن عزیزانِ من! میں جس بات کو حقیقت اور صداقت

جماعتِ اسلامی

سمجھتا ہوں، مخالفتوں کا ہجوم مجھے اس کے اظہار و اعلان سے باز نہیں رکھ سکتا۔ میں پچیس سال سے ان کے اس پروپیگنڈے کا ہدف بنتا چلا آ رہا ہوں۔ میں جب اس طویل عرصے میں اس حقیقت کے اظہار سے رُک نہیں سکا تو اب، عمر کے اس آخری حصے میں، جبکہ میں جانتا ہوں کہ خدا کی بازپُرس کا دن قریب آ رہا ہے، میں اظہارِ صداقت سے کیوں باز رہوں۔ مشکل یہ ہے کہ ہماری قوم بڑی جذباتی واقع ہوئی ہے۔ اس لئے وہ کسی تحریک پر اُس کے آغاز میں ٹھنڈے دل سے غور کرنے کی عادی نہیں رہی۔ اس کی یہی جذباتیت تھی جس سے تحریکِ احمدیت اس

طرح بڑھتی اور پھیلتی چلی گئی۔ مرزا غلام احمد نے اپنا تعارف ایک مناظر کی حیثیت سے کرایا اور بظاہر اسی مقصد کے لئے اپنی پہلی کتاب "براہین احمدیہ" شائع کی۔ قوم نے اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور اس کی مدح وستائش میں غلغلے بلند کر دیئے۔ اس نے بنظر غائر یہ دیکھنے کی ضرورت ہی محسوس نہ کی کہ اس تحریک کا رُخ کس منزل کی طرف ہے حالانکہ مرزا صاحب نے بعد میں خود اس امر کا اظہار کیا کہ اس کتاب میں ان کے بعد کے دعاوی بین السطور چھپے ہوئے تھے اور یہ کہ انہوں نے یہ انداز اس لئے اختیار کیا تھا کہ یہاں کے علماء اس "پیچ" میں پھنس جائیں (بحوالہ اربعین نمبر ۲۔ صفحہ ۲۱) مسلمانوں کو اس کا احساس اس وقت ہوا جب وہ تحریک اپنے برگ و بار لا چکی تھی۔ اس قوم (بالخصوص پنجابی مسلمانوں) کی یہی وہ جذباتیت اور عجلت پسندی ہے جس کے متعلق علامہ اقبالؒ نے کہا ہے کہ:

مذہب میں بہت تازہ پسند اس کی طبیعت ۔۔۔ کرلے کہیں منزل تو گزرتا ہے بہت جلد
تحقیق کی بازی ہو تو شرکت نہیں کرتا ۔۔۔ ہو کھیل مریدی کا تو ہرتا ہے بہت جلد
تاویل کا پھندا کوئی صیاد لگا دے
یہ شاخ نشیمن سے اترتا ہے بہت جلد

مودودی صاحب جب حیدر آباد (دکن) سے پنجاب آئے ہیں، تو انہوں نے پنجابی مسلمان کی اس طبیعت کا خوب اندازہ لگایا۔ میرے ان کے ساتھ اس سے بہت پہلے سے مراسم تھے۔ لیکن اس وقت تک میرا اُن سے تعارف صرف ان کی تحریروں کے ذریعے تھا۔ (میرے مضامین بھی ان کے رسالہ ترجمان القرآن، میں چھپا کرتے تھے) میں یہاں اتنا واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میں اس قسم کی بحثوں میں، ذاتیات کو درمیان میں نہیں لایا کرتا۔ لہٰذا اس مقام پر بھی صرف اتنا کہہ کر آگے بڑھ جانا چاہتا ہوں کہ حیدر آباد سے پنجاب جاتے وقت وہ اپنے مسکن دہلی میں کچھ دنوں کے لئے ٹھہرے تو ان کی اکثر نشستیں میرے مکان (واقعہ نئی دہلی) پر ہوتی رہیں۔ اس وقت مجھے انہیں قریب سے دیکھنے کا موقع ملا تو میں نے ان کی طبیعت میں اس قسم کے جراثیم محسوس کئے اور دبی زبان سے انہیں اس سے متنبہ بھی کیا۔ اُس وقت تک وہ ماڈرن ٹائپ کے نوجوان صحافی تھے۔ دارالاسلام جا کر انہوں نے مذہبی لبادہ اوڑھا۔ اور اس کے بعد پنجاب کے مرکزی مقام لاہور میں اپنی علیحدہ جماعت کی بنیاد رکھی۔ ان کی جماعت کے پہلے اجتماع کی روئیداد ان کے رسالہ۔ ترجمان القرآن کی جون جولائی اگست ۱۹۴۱ء کی مشترکہ اشاعت میں درج ہے، اور ہر صاحب

بصیرت کو آج بھی دعوت غور و فکر دیتی ہے۔ اس اجتماع کی افتتاحی تقریر میں مودودی صاحب نے اس کی اہمیت کے سلسلے میں فرمایا کہ :۔

"اسلام بغیر جماعت کے نہیں ہے اور جماعت بغیر امارت کے نہیں۔ اس قاعدہ کلیہ کے مطابق ضروری ہے کہ جماعت بننے کے ساتھ ہی آپ اپنے لئے ایک امیر منتخب کر لیں۔" (ترجمان القرآن ص۲۴)

جب حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم (یا بعض روایات کی رُو سے حضرت عمرؓ) نے فرمایا تھا کہ "جماعت کے بغیر اسلام نہیں" تو ظاہر ہے کہ جماعت سے مراد اُمّتِ واحدہ تھی۔ لیکن مودودی صاحب اس اُمّت کے اندر اپنی جماعت کی تشکیل کرتے ہیں۔ اور اس کی سند میں یہ ارشادِ نبویؐ (یا فاروقیؓ) پیش کرتے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ مودودی صاحب نے فرمایا کہ اس جماعت کے بغیر، جو اب متشکل کی جا رہی ہے، اسلام نہیں ہے۔ اسی لئے انہوں نے اس کا نام **اسلامی جماعت** رکھا۔ اب رہی اس کے امیر کی پوزیشن، سو انہوں نے اس کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ :۔

"اسلامی نقطۂ نظر سے اقامتِ دین کی سعی کرنے والی جماعت میں، جماعت کے اولی الامر کی اطاعت فی المعروف دراصل اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کا ایک جزو ہے۔ جو شخص اللہ کا کام سمجھ کر یہ کام کر رہا ہے اور اللہ ہی کے کام کی خاطر جس نے کسی کو امیر مانا ہے وہ اس کے جائز احکام کی اطاعت کر کے دراصل، اس کی نہیں بلکہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتا ہے۔

(ہدایات نمبر ۳۷)

مودودی صاحب کا مقام

آپ غور کیجئے کہ یہ دعاوی کس قدر خطرناک مستقبل کا پیش خیمہ تھے۔ اسلامی جماعت وہ جماعت جس کے بغیر اسلام نہیں اور اس کے امیر کی اطاعت "خدا اور اس کے رسول کی اطاعت" کے مرادف۔ یاللعجب!

رسولؐ کی اطاعت کے سلسلے میں مودودی صاحب نے کہا کہ یہ اطاعت احادیث کی رُو سے کی جا سکتی ہے لیکن اُنہی احادیث کی رُو سے، جسے "مزاج شناسِ رسول" صحیح احادیث قرار دیدے۔ اس

جماعت کے نزدیک "مزاج شناس رسول" خود مودودی صاحب ہیں۔ احادیث کے متعلق بعینہٖ یہی مسلک مرزا غلام احمد... کا تھا۔ انہوں نے اس ضمن میں کہا تھا کہ :-

"جو شخص حکم ہو کر آیا ہے اس کو اختیار ہے کہ حدیثوں کے ذخیرے میں جس انبار کو چاہے خدا سے علم پا کر قبول کرے اور جس ڈھیر کو چاہے، خدا سے علم پا کر رد کر دے۔"

(تحفۂ گولڑویہ۔ صفحہ ۱۰)

• مزاج شناس رسولؐ کے ساتھ ہی اس جماعت نے مودودی صاحب کے متعلق یہ عقیدہ عام کیا کہ :-

"مودودی صاحب کی شخصیت امام مالکؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کے سلسلے کی ایک کڑی ہے۔"

(ماہنامہ فاران۔ بابت جون ۱۹۵۳ء)

اس جماعت کے موجودہ امیر میاں طفیل محمد صاحب نے اس تمام تفصیل کو چند الفاظ میں سمٹا کر رکھ دیا۔ جب کہا کہ :-

"مولانا مودودی اُس زمانے میں اسلام کی ایک مانی ہوئی ہستی تھے اور اسلام کے ہر مسئلہ میں سند تھے اور سند ہیں"۔

(جریدہ قاصد۔ کشمیر نمبر۔ بحوالہ ماہنامہ الفرقان۔ مئی جون ۱۹۵۵ء، صفحہ ۹)

مودودی صاحب نے جس زمانے میں اپنی جماعت کی تشکیل کی ہے۔ انہی دنوں انہوں نے ترجمان القرآن (بابت دسمبر ۱۹۴۰ء و جنوری ۱۹۴۱ء) میں ایک مبسوط مقالہ شائع کیا تھا جس کا عنوان تھا۔ "تجدید و احیائے دین"۔ جسے بعد میں کتابی شکل میں بھی شائع کر دیا گیا تھا۔ اس میں انہوں نے "مجددین" میں سے ایک ایک کا نام لے کر یہ بتایا کہ یہ حضرات اپنے مشن میں کس طرح ناکام رہ گئے۔ اس کے بعد انہوں نے قوم سے کہا کہ اس میں مایوسی کی کوئی بات نہیں۔ ایک آنے والا آئے گا۔ اور جو کچھ ان اسلاف میں سے کسی سے نہیں ہو سکا وہ کچھ کر کے دکھائے گا۔ انہوں نے اس میں لکھا ہے کہ :-

مقامِ مہدویت

"میرا اندازہ یہ ہے کہ آنے والا اپنے زمانے میں بالکل جدید ترین طرز کا لیڈر ہوگا۔ وقت کے تمام علوم جدیدہ پر اس کو مجتہدانہ بصیرت حاصل ہو گی۔ زندگی کے سارے مسائل کو بخوبی سمجھتا ہو گا۔ عقلی و ذہنی سیاست، سیاسی تدبر، جنگی مہارت کے اعتبار سے وہ تمام دنیا پر اپنا سکہ جما دے گا۔ اور اپنے عہد کے تمام جدیدوں سے بڑھ کر جدید تر ہو گا۔

مجھے اندیشہ ہے کہ اس کی جدّتوں کے خلاف مولوی اور صوفی صاحبان ہی سب سے پہلے شورش برپا کریں گے۔ پھر مجھے یہ بھی اُمید نہیں کہ اپنی جسمانی ساخت میں وہ عام انسانوں سے کچھ بہت مختلف ہوگا۔ اس کی علامتوں سے اس کو تاڑ لیا جائے گا... وہ خالص اسلام کی بنیادوں پر ایک نیا مذہب فکر پیدا کرے گا۔ ذہنیتوں کو بدلے گا اور ایک زبردست تحریک اٹھائے گا۔ جو بیک وقت تہذیبی بھی ہوگی اور سیاسی بھی۔ جاہلیت اپنی تمام طاقتوں کے ساتھ اس کو کچلنے کی کوشش کرے گی۔ مگر بالآخر وہ جاہلی اقتدار کو اُلٹ کر پھینک دے گا اور ایک ایسا زبردست اسلامی اسٹیٹ قائم کرے گا جس میں ایک طرف اسلام کی پوری رُوح کارفرما ہوگی اور دوسری طرف سائینٹفک ترقی اوج کمال تک پہنچ جائے گی۔"

(ترجمان القرآن۔ صفحات ۴۵۔ ۴۴)

آپ نے دیکھا کہ مودودی صاحب کس طرح قدم بقدم میرزا غلام احمد کے پیچھے چلے آ رہے ہیں۔ لیکن ان دونوں میں ایک بیّن فرق ہے۔ مرزا صاحب نے سیاسی اقتدار حاصل کرنے کی خواہش نہیں کی تھی۔ لیکن مودودی صاحب کا مطمح نگاہ، حکمرانی کا اقتدار حاصل کرنا ہے۔ چنانچہ وہ اسلام کے صدرِ اوّل کی مثال پیش کرنے کے بعد "صالحین" سے کہتے ہیں کہ:-

"تم روئے زمین پر خدا کے سب سے زیادہ صالح بندے ہو۔ لہذا، آگے بڑھو۔ لڑ کر خدا کے باغیوں کو حکومت سے بے دخل کر دو۔ اور حکمرانی کے اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لو۔"   (خطبات، صفحات ص۲۳۱، ص۲۳۳، ص۲۳۵)

ان حضرات کے یہی عزائم تھے جن کے پیشِ نظر قائد اعظمؒ، تحریکِ پاکستان کے دوران اس کی وضاحت کرتے رہے کہ پاکستان میں تھیاکریسی قائم نہیں ہونے دی جائے گی۔ اور یہاں پہنچ کر بھی انہوں نے واشگاف الفاظ میں اعلان کر دیا کہ:-

"کچھ بھی ہو، یہ مسلّمہ بات ہے کہ پاکستان میں کسی صورت میں بھی تھیاکریسی رائج نہیں ہوگی جس میں حکومت مذہبی پیشواؤں کے ہاتھ میں دے دی جائی ہے کہ وہ (بزعم خویش) خدائی مشن پورا کریں۔"

(تقاریر بہ حیثیت گورنر جنرل۔ ص۶۵)

اس سے آپ نے اندازہ لگالیا ہوگا کہ مودودی صاحب، قائداعظمؒ کے اسقدر مخالف کیوں تھے اور ان کے متعلق اس قسم کا پروپیگنڈا کیوں کیا کرتے تھے کہ ان کی فکر و کردار میں اسلام کی ایک چھینٹ تک بھی نہیں۔ مودودی صاحب خدا اور رسولؐ کے نام پر اقتدار اپنے ہاتھ میں لینا چاہتے تھے اور قائداعظمؒ اسے بدترین قسم کی آمریت تصور کرتے تھے۔

بہرحال، میں کہہ رہا تھا کہ مودودی صاحب، مہدویت کے مقام تک پہنچنے کے لئے کس طرح زمین ہموار کرتے جا رہے تھے۔ اصل یہ ہے کہ انہوں نے اس مقام کے لئے بہت پہلے سے ردّا رکھ دیا تھا۔ مرزا غلام احمد صاحب نے اپنی خلافت کے مستقبل کو محفوظ کرنے کے لئے۔۔۔۔ پیشگوئی کی تھی کہ تین سال کے

اپنی پیدائش کے متعلق

بعد میرے ہاں ایک بیٹا پیدا ہوگا۔ جو اسلام کے استحکام اور فروغ کا باعث بنے گا۔ مودودی صاحب نے بھی اپنی پیدائش کے سلسلے میں کہا ہے۔

"میں ۳ رجب ۱۳۲۱ھ (۲۵ دسمبر ۱۹۰۳ء) کو اورنگ آباد میں پیدا ہوا۔
میری پیدائش سے ۳ سال پہلے ایک بزرگ، والدِ مرحوم کے پاس آئے تھے۔
انہوں نے میری پیدائش کی پیشگوئی کی تھی اور والد صاحب سے فرمایا تھا
کہ اس کا نام ابوالاعلیٰ رکھنا۔"

(کتاب تصوّف اور تعمیرِ سیرت۔ صفحہ ۱۵۔ مرتبہ عاصم نعمانی
شائع کردہ۔ اسلامک پبلیکیشنز۔ اکتوبر ۱۹۷۲ء)

مودودی صاحب ابھی ۷۔ ۱ئم کو لے کر پاکستان آئے تھے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ جب انہوں نے ۱۹۵۳ء کے ختم نبوت کے سلسلے کے ہنگاموں میں دیکھا کہ اس قسم کے کھلے ہوئے دعاوی کے خلاف مسلمانوں کا آخرالامر ردِّ عمل کیا ہوتا ہے تو انہوں نے اس کے متعین اعلان سے اپنے آپ کو روک لیا۔ لیکن اپنی کوششوں کو بدستور جاری رکھا۔ انہوں نے اس کی گنجائش بھی پہلے سے رکھ لی تھی۔ انہوں نے کہا تھا کہ یہ آنے والا مہدی خود اس کا اعلان نہیں کرے گا۔ لیکن :-

"اس کی موت کے بعد اس کے کارناموں سے دنیا کو معلوم ہوگا کہ یہی تھا وہ خلافت کو منہاج

النبوت پر قائم کرنے والا۔ جس کی آمد کا مژدہ سنایا گیا تھا۔"

(ترجمان القرآن۔ دسمبر ۱۹۴۰ء و جنوری ۱۹۴۱ء۔ صفحہ ۴۵-۴۴)

ظاہر ہے کہ یہ تدبیر اپنی جماعت کے دل میں شمع امید کو روشن رکھنے کے لئے بڑی کارگر ہے۔ اور اب جو کہا جاتا ہے کہ مودودی صاحب کی روزمرہ کی زندگی کی جزئیات تک کا تصویری سوانح تیار کیا جا رہا ہے۔ وہ غالباً اسی موعودہ ظہور کے سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ (ہفت روزہ سنگرام لاہور۔ بابت ۲۴ تا ۲۴ فروری ۱۹۷۶ء۔ صفحہ ۱۳)

یہ تھے عزیزانِ من! وہ عزائم جنہیں لے کر مودودی صاحب پاکستان تشریف لائے۔ جیسا کہ میں نے کہا تھا۔ یہاں کے سادہ لوح مسلمان نے اسے قطعاً نہیں بھانپا، اور تحریک احمدیت کے ابتدائی دور کی طرح اس تحریک کو بھی اسلامی نظام کے قیام اور دین کے احیاء کا ذریعہ سمجھا جاتا رہا ہے۔ جیسا کہ میں۔۔۔۔ کہہ چکا ہوں، میں نے ان جراثیم کو بہت پہلے بھانپ لیا تھا اور یہی وجہ ہے جو میں اس جماعت کے یوم تاسیس کے وقت سے بالعموم اور قیام پاکستان کے بعد بالخصوص اس کی التزاماً مخالفت کرتا چلا آ رہا ہوں۔ (میں نے تحریک احمدیت کی بھی بہت پہلے سے مخالفت شروع کی تھی۔ چنانچہ جب ۱۹۳۵ء میں بہاولپور کے مشہور مقدمہ کے فیصلے میں "احمدیوں" کو خارج از اسلام قرار دیا گیا تھا تو اس کی بنیاد میرے ہی ایک مقالہ پر تھی) اور یہی وجہ ہے کہ اس جماعت نے، اور سب کو چھوڑ کر مجھے اپنے پروپیگنڈے کا ہدف بنا رکھا ہے۔ اس سلسلے میں یہ کہیں مجھے منکر حدیث قرار دیتے ہیں کہیں منکر اتباع سنت! اور چونکہ اپنی مصلحتوں کے لئے جھوٹ بولنا ان کے نزدیک شرعاً واجب ہوتا ہے۔ اس لئے وہ میرے خلاف اس قسم کے افترا باندھنے میں کوئی باک نہیں سمجھتے، بلکہ اسے کار ثواب خیال کرتے ہیں۔

مودودی صاحب اپنے ان عزائم میں اس قدر آگے بڑھتے گئے کہ خود ان کی جماعت کے بعض سرآوردہ حضرات نے بھی انہیں بھانپ لیا اور انہیں اس پر متنبہ کیا۔ لیکن جب وہ اس پر بھی اپنی روش سے باز نہ آئے تو ان حضرات نے ان کی جماعت سے علیحدگی اختیار کر لی۔ ان علیحدگی اختیار کرنے والوں میں (مولانا) امین احسن اصلاحی کا نام سرفہرست تھا۔ جماعت اسلامی میں مولانا صاحب کا مقام، مودودی صاحب سے دوسرے درجہ پر تھا۔ وہ ان کی عدم موجودگی میں، جماعت کے امیر مقرر ہوتے تھے۔ ان کے علم و فضل کا تعارف ان الفاظ میں کرایا جاتا تھا:۔

"عالم، بلند نظر اور متبحر عالم، جس کی نگاہ خاک کے ذروں کا بھی جائزہ لیتی ہے، اور مہ و انجم کی گذرگاہوں کا بھی پتہ کرتی ہے۔ دس بیس نہیں، ہزاروں راتیں صرف قرآن کریم کے مطالعہ میں بسر کی ہیں۔ جن کی ذات قرآنی علوم کے لئے قابلِ وثوق سند ہے۔ قرآن کا مفسر اور حدیث و فقہ میں جس کی ژرف نگاہی مسلّم۔"

(ماہنامہ فاران، بابت جون ۱۹۵۳ء)

انہی اصلاحی صاحب نے جماعت سے علیحدہ ہونے کے وقت، مودودی صاحب کو ایک خط لکھا جس میں تحریر فرمایا کہ :-

"آپ اپنے آپ کو نہ صرف جماعتِ اسلامی کا قائم مقام سمجھتے ہیں بلکہ خود اسلام کا بھی قائم مقام سمجھنے لگے ہیں۔ آپ کے نزدیک اگر آپ کی کسی حرکت پر کسی کو اعتراض ہو تو وہ جماعت پر اعتراض ہے۔ اور جب یہ جماعت پر اعتراض ہے تو اسلام پر اعتراض ہے۔ اسی طرح آپ اپنا یہ ذہن بنا بیٹھے ہیں کہ آپ کی ذات اگر کبھی زیرِ بحث آتی ہے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ اس ملک میں اقامتِ دین کا سارا کام درہم برہم ہو جائے گا اور لادینی طاقتیں غالب ہو جائینگی۔ میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ سوچنے کے اس انداز کو بدلیں۔ خدا نے اسلام کو نہ آپ کے ساتھ باندھا ہے نہ جماعتِ اسلامی کے ساتھ اور نہ کسی اور کے ساتھ۔ اگر آپ اسلام کا کام کرنے اٹھے ہیں۔ تو خدارا اس کی یہ قیمت نہ مانگئے کہ اگر آپ اسلام پر بھی ہاتھ صاف کرنے لگ جائیں تو بھی لوگ اس کو جاننے کے باوجود چپ رہیں، کیونکہ اس سے اقامتِ دین کے جہاد کو نقصان پہنچ جائے گا۔"

لیکن مودودی صاحب (روپے کے بل بوتے پر) ایسی پوزیشن حاصل کر چکے تھے کہ ان حضرات کی جماعت سے علیحدگی انہیں کچھ نقصان نہ پہنچا سکی۔ اور وہ اپنے عزائم میں آگے ہی آگے بڑھتے گئے۔

علامہ اقبالؒ نے اسلامی نظام اور اس میں مرکزِ ملت کا تصور شعر کی زبان میں پیش کیا تھا، جو بہرحال، اشاراتی اور تلمیحاتی ہوتی ہے۔ میں نے ان اشارات کی تفصیل اپنے مقالات اور تصنیفات میں شرح و بسط سے پیش کی۔ اس نظام کے قیام سے اس جماعت کے حصولِ اقتدار اور مودودی صاحب

کے آمرِ مطلق ہونے کی سب اُمیدیں خاک میں مل جاتی تھیں۔ اس لئے انہوں نے اس تصور کا مذاق اڑانا شروع کر دیا۔ میں نے پہلے دن سے یہ التزام رکھا ہے کہ جہاں بھی مرکزِ ملت کی اصطلاح استعمال ہے اس کے ساتھ ہی اس کی بھی وضاحت کر دی ہے کہ اس سے مراد اس اسلامی مملکت کی سنٹرل اتھارٹی ہے جو علیٰ منہاجِ نبوت قائم کی جائیگی۔ میں نے اس نظام کی اطاعت کو خدا اور رسول کی اطاعت کے بمنزلہ قرار دیا تھا۔ نظامِ ربوبیت (قرآن کے معاشی نظام) کے سلسلہ میں بھی میں نے ہمیشہ یہ کہا ہے کہ افرادِ مملکت کی ضروریاتِ زندگی بہم پہنچانے کی ذمہ داری اس نظام (خلافت علیٰ المنہاج نبوت) کے سر پر ہوگی۔ اور اس کے اس عظیم ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لئے ضروری ہوگا کہ ذرائع پیداوار اس نظام کی تحویل میں رہیں میں شروع سے آخر تک، سیکولر نظام، اور اشتراکیت کے معاشی نظام کی شدت سے مخالفت کرتا چلا آرہا ہوں۔ میری ہزارہا صفحات پر مشتمل تحریریں اس حقیقت کی شاہد ہیں۔ لیکن ان لوگوں کی کیفیت یہ ہے کہ یہ ہمارے برسرِ اقتدار طبقہ کی عیاشیوں اور فحاشیوں کا چرچا کرتے ہیں اور اس کے بعد کہتے ہیں کہ اس شخص (یعنی پرویز) کو دیکھئے کہ وہ ایسے لوگوں کی اطاعت کو خدا اور رسولؐ کی اطاعت کے مرادف قرار دیتا ہے، اور ان کے سپرد ذرائع پیداوار کرنے کو اسلام کا معاشی نظام کہتا ہے۔ اس کی تازہ ترین مثال ملاحظہ فرمائیے۔ ماہنامہ ترجمان القرآن بابت فروری ۱۹۷۶ء کے اشارات میں تحریر ہے:-

> "اسی طرح آپ "نظامِ ربوبیت" پر غور کریں۔ یہ اصطلاح اپنے مزاج کے اعتبار سے ایک دینی اصطلاح ہے۔ اور اسے سن کر کسی سلیم الفطرت انسان کے ذہن میں اسلامی نظام کا نقش ہی اُجاگر ہوتا ہے۔ کیونکہ کائنات کے خالق نے انسان کی ساری احتیاجات کا بطریقِ احسن انتظام کر رکھا ہے۔ اس ذات نے ایک طرف اگر انسان کی مادی احتیاجات کی تسکین کے لئے ذرائع و وسائل مہیا کئے اور ضابطے مقرر فرمائے ہیں تو دوسری طرف انسان کی روحانی پیاس بجھانے اور اس کے اخلاقی احساسات کو زندہ رکھنے کا بھی پورا پورا التزام کیا ہے۔ لیکن مادی فلسفہ حیات خصوصاً اشتراکیت کے زیرِ اثر اس مقدس اصطلاح کو اس طرح بگاڑا گیا ہے کہ اُسے سنتے ہی انسان کے ذہن میں ایک ایسے نظام کا تصور آتا ہے جس میں انسانوں کا ایک محدود سا گروہ مرکزِ ملت کے نام پر نہ صرف کسی

ملک کے وسائلِ رزق پر قابض ہو، بلکہ اس کے سیاہ و سفید کا بھی پوری طرح مالک ہو۔ اور پھر وہ اپنی صوابدید کے مطابق عوام کو روٹی کے نوالے تقسیم کرے۔ کیا اس اصطلاح کے پردے میں اشتمالیت کا پرچار نہیں کیا جا رہا؟ یہ اصطلاح جب جدید مفہوم کے ساتھ سامنے آتی ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ اسے غالباً وضع ہی اس غرض کے لئے کیا گیا ہے کہ دنیا کو یہ باور کرایا جائے کہ کسی ملک کے وسائلِ معیشت پر حکومت کی مکمل اجارہ داری صرف اشتراکیت کا ہی طرۂ امتیاز نہیں بلکہ اسلام بھی اس قسم کے جابرانہ نظام کا علمبردار ہے۔"

اس سے ہمارے سادہ لوح عوام کے دلوں میں میرے خلاف جس قسم کے جذباتِ نفرت، اور خود مرکزِ ملت کی اصطلاح کے خلاف جس قسم کا باغیانہ تصور ابھرے گا وہ ظاہر ہے۔ یہ ہے وہ ٹیکنیک جس سے یہ حضرات ایک طرف علامہ اقبالؒ کے پیش کردہ اور میرے وضاحت کردہ اسلامی نظام کا اس قدر بھیانک اور نفرت انگیز تصور لوگوں کے سامنے پیش کرتے ہیں اور اس کے ساتھ مودودی صاحب کی شخصیت کو ابھارتے چلے جا رہے ہیں۔ حتیٰ کہ پچھلے سال انہوں نے ان کو "اللہ کے شاہکار" کے لقب سے بھی نوازا تھا۔

یہ ہے برادرانِ عزیز! مختصر سی تفصیل اس نکتہ کی، جسے میں نے پہلے پیش کیا کہ اگر مودودی صاحب کے عزائم کی علمبردار اسلامی جماعت یہاں نہ اٹھتی تو اس خطۂ زمین میں اسلامی نظام، یعنی مملکت علیٰ منہاج النبوت کے قیام کے امکانات بڑے روشن تھے۔ اگر علامہ اقبالؒ زندہ رہتے تو وہ اس جماعت کی بھی اسی طرح مخالفت کرتے جس طرح انہوں نے "احمدیوں" کی تحریک کی مخالفت کی تھی۔ اس لئے کہ وہ اس خطۂ زمین میں اسلامی نظام کے احیاء کی کوششوں کو ناکام ہوتے دیکھ ہی نہیں سکتے تھے۔ یہ ان کے ایمان کا تقاضا اور عشق کا منتہیٰ تھا۔ اور یہی کیفیت عزیزانِ من! اس ذرّہ ناچیز کی بھی ہے۔ صدیوں کے بعد یہ حسین اور تابناک تصور ہمارے سامنے آیا تھا۔ کوئی شخص جس کی نگاہوں میں قرآنی بصیرت اور سینے میں دردِ اسلام سے لبریز دل ہے، اس تصور کو یوں برباد ہوتے دیکھ نہیں سکتا۔

کے توانم دید زاہد جام صہبا بشکند
می پرد رنگم حبابے گر بدریا بشکند

آخر میں، میں پھر اس امر کی وضاحت کر دوں کہ اسلامی نظام کے احیاء اور قیام کے لئے جب بھی کہیں کوششیں شروع ہوں گی تو اس کا قیام ایک دن میں عمل میں نہیں آسکے گا۔ یہ بتدریج رفتہ رفتہ متشکل ہو سکے گا۔ علامہ اقبالؒ کے ذہن میں یہی نقشہ تھا اور میں بھی اسی کی وضاحت کرتا چلا آرہا ہوں کہ ابتداءً مسلمانوں کی مختلف موجودہ مملکتوں کے وجود اور تشخص کو برقرار رہنے دیا جائیگا لیکن ان میں ایک ایسا مرکزی وفاق قائم کیا جائیگا جس کی بنیادی شرط یہ ہو گی کہ یہ مملکتیں باہمدگر کبھی آمادہ بہ جنگ نہیں ہوں گی۔ ان کے اختلافی امور کے فیصلے اس آفاقی مرکز کی رُو سے ہوں گے، اور جہاں تک ان کی خارجہ پالیسی کا تعلق ہے، ان میں سے کسی ایک کا دشمن، ان سب کا دشمن قرار پائے گا۔ ان کے آئین اور قوانین کی سند اور حجت خدا کی کتاب قرآن کریم ہو گی۔ اسی کی حدود کے اندر رہتے ہوئے وہ اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق قوانین مرتب کریں گے۔ ایسا کرنے میں ظاہر ہے کہ اس وقت جتنے قوانین، شریعت کے نام سے رائج ہیں، تدوین قوانین کے سلسلہ میں وہ ان سے استفادہ کریں گے۔ ان کے اس طرح مدون اور نافذ کردہ قوانین کا اطلاق تمام مسلمانوں پر یکساں ہو گا۔ اس طرح مذہبی پیشوائیت کی اتھارٹی ختم ہو جائے گی۔ اور اگلی شرط یہ کہ ان مملکتوں کے ارباب اقتدار کی سیرت اسوۂ محمدیؐ کے رنگ میں رنگی ہو گی۔ اس طرح آغاز کار ہو گا تو پھر رفتہ رفتہ ایک دن یہ اُمت، اُمت واحدہ بن جائے گی۔ ان کا ایک ہی ضابطۂ قوانین ہو گا۔ ایک ہی مملکت اور اس مملکت کی ایک ہی سنٹرل اتھارٹی جس کی اطاعت، خدا اور رسولؐ کی اطاعت کے بمنزلہ قرار پائے گی اور یہی وہ وحدت ہو گی جو آخر الامر وحدت انسانیہ کے اجتماعی نظام پر منتج ہو گی۔

لیکن یہ ضروری ہے کہ جب تک ایسا نہ ہو، مذہبی ارکان کی ادائیگی (نماز، روزہ وغیرہ) کے سلسلہ میں اُمت جن طریقوں پر چلی آرہی ہے۔ ان میں کسی قسم کا ردوبدل یا حک و اضافہ نہ کیا جائے۔ البتہ ان میں جو اُمور قرآن کے خلاف ہوں، ان کی نشاندہی کی جائے۔ اور آخری بات یہ کہ یہ اُمت، بُری بھلی جیسی بھی ہے، اس کے ساتھ وابستہ رہا جائے۔ علامہ اقبالؒ نے اس حقیقت کو کہیں ان دلدوز الفاظ میں بیان کیا ہے کہ:-

کہن شاخے کہ زیرِ سایۂ اُو پَر برآوردی!
چو برگش ریخت از وے آشیاں برداشتن ننگ است

اور کہیں ان حسین اور سادہ الفاظ میں کہ:-

ڈالی گئی جو فصلِ خزاں میں شجر سے ٹوٹ　　ممکن نہیں ہری ہو سحابِ بہار سے
ہے لازوال عہدِ خزاں اس کے واسطے　　کچھ واسطہ نہیں ہے اُسے برگ و بار سے
ہے تیرے گلستاں میں بھی فصلِ خزاں کا دور　　خالی ہے جیبِ گُل زرِ کامل عیار سے
جو نغمہ زن تھے خلوتِ اوراق میں طیور　　رُخصت ہوئے ترے شجرِ سایہ دار سے
شاخِ بریدہ سے سبق اندوز ہو کہ تو　　ناآشنا ہے قاعدۂ روزگار سے

ملّت کے ساتھ رابطۂ استوار رکھ
پیوستہ رہ شجر سے امیدِ بہار رکھ

(بانگِ درا)

لیکن اس کے ساتھ، یہ بھی ضروری ہے کہ آپ اس پر مطمئن ہو کر نہ بیٹھ جائیں کہ یہ زندگی، اسلامی زندگی ہے۔ ایسا سمجھنا فریبِ نفس ہوگا۔ سمجھا یہی جانا چاہیئے کہ یہ ہماری اضطراری حالت ہے۔ جس سے نکل کر، دین کے نظام کے لئے ہر ممکن کوشش کرنا ہمارا فریضۂ حیات ہے۔ یاد رکھئے۔ جن کوششوں کو اس وقت "اسلامی خدمات" کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ یہ سب "مذہبِ اسلام" کی تقویت اور فروغ کی کوششیں ہیں نہ کہ دینِ اسلام کی۔ اور اس حقیقت کو کبھی نظر انداز نہ کیجئے کہ مذہب جس قدر آگے بڑھتا جائے گا، دین اُسی قدر پیچھے ہٹتا چلا جائے گا۔ اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے، خدا آپ کو توفیق دے تو آپ (ارمغانِ حجاز میں) اقبالؒ کی مایۂ ناز نظم "ابلیس کی مجلس شوریٰ" کا گہری نظر سے مطالعہ کریں۔ بات سمجھ میں آجائے گی۔ اس میں ابلیسؒ نے اپنے مشیروں سے کہا یہ ہے کہ :-

ہر نفس ڈرتا ہوں اس اُمّت کی بیداری سے میں
ہے حقیقت جس کے دیں کی احتسابِ کائنات

اس اُمّت کو بدستور سلائے رکھنے کی تدبیر یہ ہے کہ :-

مست رکھو ذکر و فکرِ صبحگاہی میں اسے
پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اسے

اس وقت، اسلام کے فروغ کے نام سے جو کچھ کیا جا رہا ہے، وہ اس اُمّت کو مزاجِ عجائب ہی میں پختہ تر کرنے کا ذریعہ ہے۔

یہ ہے عزیزانِ من! ذکرِ اقبالؒ کے سلسلہ میں میرا آج کا پیغام۔ والسّلام!

تتمّہ خطاب

اس خطاب کے سلسلے میں بعض حضرات نے کچھ سوالات دریافت کئے اور بعض نے اس کے چند ایک نکات کی وضاحت چاہی۔ میں نے مناسب سمجھا ہے کہ ان کا یہ مطالبہ پورا کر دیا جائے۔ لہٰذا اس وضاحت کو اس تتمّہ کی شکل میں شائع کیا جاتا ہے۔

سوال (۱) آپ نے کہا ہے کہ تھیاکریسی کی بدترین شکل انفرادی آمریت ہے۔ اس سلسلے میں آپ نے مرزا غلام احمد اور مودودی صاحب کو ایک ہی پلڑے میں رکھا ہے۔ اس کی مزید وضاحت کی ضرورت ہے۔

جواب: میں نے مرزا صاحب اور مودودی صاحب کو ایک ہی پلڑے میں نہیں رکھا۔ جہاں تک ان کے دعاوی کا تعلق ہے ان کا پلڑا بے شک ایک ہی ہے۔ لیکن جہاں تک ان کی تحریکوں کا تعلق ہے، مودودی صاحب کی تحریک، تحریکِ "احمدیت" سے کہیں زیادہ خطرناک ہے۔

آپ پہلے انفرادی آمریت کو لیجئے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے رشد و ہدایت کا سلسلہ اسطرح رہا ہے کہ ایک رسول آتا، لوگوں تک دینِ خداوندی پہنچاتا اور اپنے دائرے کے اندر اسے قائم بھی کر دیتا۔ ازاں بعد جب وہ دین، مذہب میں تبدیل ہو جاتا تو پھر ایک اور نبی آجاتا، اور وہ اپنی دعوت و تبلیغ کے ذریعے مذہب کو دین میں بدل دیتا۔ یہ سلسلہ انفرادی تھا۔ یعنی یہ فریضہ ایک فرد سرانجام دیتا تھا، جسے نبی یا رسول کہا جاتا تھا۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس پر پہنچنے کے بعد مشیّتِ خداوندی نے اپنے اس پروگرام میں تبدیلی کی۔ افراد کا سلسلہ ختم کر دیا اور اس کی جگہ نظام نے لے لی۔ یہی ختمِ نبوّت کی اصل و اساس اور علم اور غایت تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ تبدیلی خود نوعِ انسان کی تاریخ میں ایک بہت بڑے انقلاب کا آغاز تھی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دنیا سے تشریف براری کے بعد یہ نظام بدستور قائم رہا۔ حقیقت یہ ہے کہ خود اس کی بنیاد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ مبارک سے رکھوا دی گئی تھی۔ جہاں تک وحیٔ خداوندی کا تعلق تھا اس میں نہ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی فکر کا کوئی دخل تھا، اور نہ ہی کسی سے کوئی مشورہ لینے کا

سوال۔ لیکن جہاں تک وحیِ خداوندی کی رُو سے عملی نظام کا تعلق تھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی یہ حکم دیا گیا کہ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ (۳/۱۵۸) "تم، معاملات میں ان سے مشورہ کیا کرو۔" اسی حکم کی پابندی جانشینانِ رسولؐ کے لئے بھی لازم قرار دی گئی اور ان کے متعلق کہا گیا، وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ (۴۲/۳۸) "ان کے معاملات باہمی مشاورت سے طے ہوں گے۔" لہٰذا اس نظام میں، جہاں تک وحی کا تعلق تھا، وہ قرآنِ کریم کی شکل میں موجود تھی اور جہاں تک نظام کے عملی مسائل کا تعلق تھا اس کے لئے اُمت کے باہمی مشورہ کا حکم تھا۔ لہٰذا اس نظام میں، فرد کی دینی حیثیت کچھ نہیں تھی۔ خود خلیفۃ الرسولؐ کی طرف سے جو احکام و قوانین نافذ ہوتے تھے وہ بھی اس نظام کی سنٹرل اتھارٹی کی حیثیت سے ہوتے تھے۔ اس فرد کی ذاتی حیثیت کا اس میں کوئی دخل نہیں ہوتا تھا، نہ وہ مامور من اللہ ہوتا تھا اور نہ ہی دین میں سند قرار پاتا تھا۔

جب اس نظام کا سلسلہ منتشر ہوا تو دین کی جگہ مذہب نے لے لی۔ اس مذہب میں اگرچہ مختلف فرقوں کی نسبت مختلف ائمہ (افراد) کی طرف ہوتی ہے۔ لیکن ان ائمہ میں سے بھی کسی نے یہ نہیں کہا تھا کہ دین میں سند میری ذات ہے۔ یہ دعویٰ مرزا غلام احمد نے کیا۔ انہوں نے کہا کہ اسلام وہی اسلام ہے جسے میں اسلام قرار دے دوں۔ جو لوگ اس اسلام کو، اسلام مانیں، وہ مسلمان ہیں۔ جو ایسا نہ مانیں وہ مسلمان نہیں خواہ وہ اپنے آپ کو مسلمان ہی کیوں نہ کہتے رہیں۔ (ان امور کی تفصیل میری کتاب ۔ ختمِ نبوت اور تحریکِ احمدیت میں ملے گی) مرزا صاحب نے کہا کہ اتباعِ محمدیہ سے میں اس مقام پر پہنچ گیا ہوں جہاں روحِ محمدیؐ میرے اندر حلول کر چکی ہے۔ اس لئے میں رسول اللہ کا ظل اور بروز ہوں۔ چنانچہ (جیسا کہ میں نے خطاب میں کہا ہے) انہوں نے کہا کہ رسول اللہ کی احادیث میں سے جسے میں صحیح قرار دوں اُسے صحیح سمجھا جائے، جسے میں مسترد کر دوں اسے مسترد کر دیا جائے۔ بعینہٖ یہی پوزیشن مودودی صاحب نے اختیار کی اور احادیث کے سلسلے میں کہا:۔

مرزا غلام احمد اور مودودی صاحب

"جس شخص کو اللہ تعالیٰ تفقہ کی نعمت سے سرفراز فرماتا ہے۔ اس کے اندر قرآن اور سیرتِ رسولؐ کے غائر مطالعہ سے ایک خاص ذوق پیدا ہو جاتا ہے .... جو شخص اسلام کے مزاج کو سمجھتا ہے اور جس نے کثرت کے ساتھ کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ کا گہرا مطالعہ کیا ہوتا ہے۔ وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایسا مزاج شناس ہو جاتا ہے کہ روایات کو دیکھ کر خود بخود اس کی بصیرت بتا دیتی ہے کہ

ان میں کون سا قول یا کون سا فعل میرے سرکار کا ہو سکتا ہے اور کون سی چیز سُنّت نبویؐ سے اقرب ہے۔ یہی نہیں بلکہ جن مسائل میں اس کو قرآن و سنت سے کوئی چیز نہیں ملتی۔ ان میں بھی وہ کہہ سکتا ہے کہ اگر نبیؐ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے فلاں مسئلہ پیش آتا تو آپ اس کا فیصلہ یوں فرماتے۔ یہ اس لئے کہ اس کی رُوح، روحِ محمدیؐ میں گم، اور اُس کی بصیرت، بصیرتِ نبویؐ کے ساتھ متحد ہو جاتی ہے۔

(تفہیمات حصہ اوّل)

آپ غور کیجئے کہ کیا مرزا صاحب کے دعویٰ اور مودودی صاحب کی اس حیثیت میں کوئی فرق ہے؟ فرق اتنا ہی ہے کہ مرزا صاحب نے کھُلے الفاظ میں دعویٰ کہہ دیا اور مودودی صاحب نے اس کی احتیاط برتی۔ اور یہ اس لئے کہ انہوں نے دیکھ لیا تھا کہ کھلے طور پہ دعویٰ کا اعلان کرنے کے خلاف جمہور مسلمانوں کا ردِّ عمل کیا ہوتا ہے۔

جس طرح مرزا صاحب نے موجودہ مسلمانوں کو دو حصّوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ ایک وہ، جو ان کی اس حیثیت کو تسلیم کرلیں اور دوسرے وہ، جو اُن کے اس دعویٰ کا انکار کر دیں۔ انہیں وہ دائرۂ اسلام سے خارج قرار دیتے تھے۔ مودودی صاحب نے بھی مسلمانوں کو دو حصّوں میں تقسیم کر دیا۔ یعنی موجودہ مسلمانوں کو انہوں نے "پیدائشی مسلمان" قرار دیا اور کھلے بندوں کہہ دیا کہ :-

"ان کے اس طرح زندہ رہنے میں اور کسی غیر مسلم قومیت کے اندر فنا ہو جانے میں آخر فرق ہی کیا ہے؟"

(ترجمان القرآن۔ ذوالحج ۱۳۵۹ھ صفحہ ۲۱۵)

ان کے برعکس، کھرے، سچّے اور سکّہ بند مسلمان اُنہیں قرار دیا جو ان "پیدائشی مسلمانوں" میں سے تجدید ایمان کے بعد ان کی جماعت میں شامل ہو جائیں۔

جماعتِ اسلامی میں داخلہ کی شرط

جس نے اپنے خطاب میں بتایا ہے کہ انہوں نے اگست ۱۹۴۱ء میں اپنی جماعت کی بنیاد رکھی۔ وضاحت کے طور پہ یہ سُن لیجئے کہ انہوں نے اس جماعت میں داخل ہونے کے لئے شرط کیا قرار دی تھی۔ انہوں نے اپنی تقریر میں کہا تھا :-

"جماعتِ اسلامی میں کوئی شخص محض اس مفروضہ پر شامل نہیں ہو سکتا کہ جب وہ مسلمان گھر میں پیدا ہوا ہے اور اس کا نام مسلمانوں کا سا ہے تو ضرور مسلمان ہوگا......
اس دائرے میں آنے کے لئے شرطِ لازم یہ ہے کہ آدمی کو کلمہ طیبہ کے معنی و مفہوم کا علم ہو[1]...... اور اس کے بعد اشہد ان لا الٰہ الا اللہ و اشہد ان محمد رسول اللہ ؐ کہنے کی جرأت کرے۔ صرف وہی جماعتِ اسلامی میں داخل ہو سکتا ہے خواہ پیدائشی غیر مسلم ہو اور ابتداً یہ شہادت ادا کرے، یا پیدائشی مسلمان ہو اور از سرِ نو ایمان لائے۔"

(ترجمان القرآن۔ محرم ۱۳۶۰ھ۔ صفحہ ۸۴)

مرزا غلام احمد نے بھی کوئی نیا کلمہ وضع نہیں کیا تھا۔ نہ ہی انہوں نے نماز، روزہ یا پرسنل لاز میں کوئی تبدیلی کی تھی۔ لیکن مسلمان وہ انہی کو سمجھتے تھے جو ان کی جماعت میں داخل ہوں۔ بعینہٖ یہی پوزیشن مودودی صاحب نے اختیار کی اور اپنی جماعت کا نام "جماعتِ اسلامی" رکھا۔ اس جماعت میں داخل ہونے والوں کے متعلق اتنا ہی نہیں کہا کہ وہ صحیح معنوں میں مسلمان ہیں، یہ بھی کہا کہ ملک میں جتنے قابلِ اعتماد کیرکٹر رکھنے والے لوگ ہیں انہیں اس جماعت میں منظم کر لیا گیا ہے۔ (بحوالہ اعتصام بابت ۱۵ جولائی ۱۹۵۵ء) اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہا:۔

"اس وقت ہندوستان میں مسلمانوں کی جو مختلف جماعتیں اسلام کے نام سے کام کر رہی ہیں، اگر فی الواقع اسلام کے معیار پر ان کے نظریات، مقاصد اور کارناموں کو پرکھا جائے تو سب کی سب جنس کاسد نکلیں گی۔"

(سیاسی کشمکش حصہ سوم)

سوال (۲):۔ آپ نے کہا ہے کہ جب مودودی صاحب حیدر آباد (دکن) سے پنجاب کی طرف آئے ہیں تو آپ نے ان کے دماغ میں ان جراثیم کو بھانپ لیا تھا۔ کیا آپ بتائیں گے کہ انہوں نے ایسے

---

[1] واضح رہے کہ جو لوگ اس طرح اس جماعت میں داخل ہوئے تھے وہ پڑھے لکھے تھے اور کلمۂ شہادت کے معنی اچھی طرح سمجھتے تھے (ان میں بعض دین کے عالم بھی تھے)، ان سے بھی تجدیدِ ایمان کرائی گئی تھی۔

(طلوعِ اسلام)

عملی شکل کب دی تھی ؟

جواب :- وہ جب (۱۹۳۷ء کے اواخر یا شاید ۱۹۳۸ء کے شروع میں) پٹھانکوٹ گئے ہیں تو اس وقت حضرت علامہ اقبالؒ حیات تھے۔ اُن کی زندگی میں مودودی صاحب اس قسم کی جرأت نہیں کرسکتے تھے۔ اس کے برعکس

جماعت سازی ممنوع ہے

انہوں نے اُس وقت اعلان کیا تھا کہ اسلام کی رُو سے اُمّت کے اندر کوئی الگ جماعت بنانا جائز نہیں۔ انہوں نے فروری ۱۹۳۸ء میں، ماہنامہ "پیغامِ حق" میں اپنا ایک مقالہ شائع کیا تھا جس میں یہ لکھا تھا کہ :-

> "یہ قوم تو پہلے ہی ایک جمعیت ہے۔ اس جمعیت کے اندر کوئی الگ جمعیت، الگ نام سے بنانا اور مسلمان اور مسلمان کے درمیان کسی وردی یا کسی ظاہری علامت یا کسی خاص نام یا کسی خاص مسلک سے فرق پیدا کرنا اور مسلمانوں کو مختلف پارٹیوں میں تقسیم کرکے ان کے اندر جماعتوں اور فرقوں کی عصبیتیں پیدا کرنا، دراصل مسلمانوں کو مضبوط کرنا نہیں بلکہ ان کو اور کمزور کرنا ہے۔ یہ تنظیم نہیں، تفرقہ پردازی اور گروہ بندی ہے۔ لوگوں نے آنکھیں بند کرکے جمعیت سازی کے یہ طریقے اہلِ مغرب سے لئے ہیں۔ مگر ان کو معلوم نہیں کہ جو چیزیں دوسروں کے مزاج کو موافق آتی ہیں وہ مسلمانوں کے مزاج کو موافق نہیں آسکتیں۔"

ضمناً اس زمانے میں خاکساروں کی تنظیم ایک مؤثر جمعیت کی حیثیت رکھتی تھی۔ مودودی صاحب کے مقالہ میں "وردی" یا ظاہری علامت" سے خاکساروں کی طرف اشارہ تھا۔ علامہ مشرقی (مرحوم) کو آپ جانتے ہیں، وہ کسی کو بخشنے والے نہیں تھے۔ انہوں نے اپنے اخبار "الاصلاح" میں مودودی صاحب کو سخت ڈانٹ پلائی، جس کا عنوان تھا :-

"پٹھان کوٹ میں مذہبی بدمعاشی کا نیا اڈہ" !

بہرحال، مودودی صاحب نے اقبالؒ کی زندگی میں تو اس کی جرأت نہ کی، لیکن (ان کی خوش قسمتی اور قوم کی بدنصیبی کہ) حضرتِ علامہ کا انتقال دو ہی ماہ بعد (اپریل ۱۹۳۸ء میں) ہوگیا اور اس کے بعد انہوں نے اپنے پروگرام کی طرح ڈالنی شروع کردی۔ میں نے اپنے خطاب میں بتایا ہے کہ قائدِ اعظمؒ جہاں یہ کہتے تھے کہ مطالبۂ پاکستان کا مقصد ایک ایسے خطۂ زمین کا حصول ہے جس میں قرآنی نظام قائم کیا جائے، اس کے ساتھ ہی اس کی وضاحت

تھیاکریسی کے خلاف

بھی کیے جاتے تھے کہ اس مملکت میں تھیاکریسی کے لئے کوئی جگہ نہیں ہوگی۔ (مثلاً، جب وہ ۱۹۴۱ء میں) حیدرآباد (دکن) تشریف لے گئے تو انہوں نے عثمانیہ یونیورسٹی کے طلباء کے اس سوال کے جواب میں (کہ مذہب اور مذہبی حکومت کے لوازم کیا ہیں) فرمایا:۔

"جب میں انگریزی زبان میں مذہب کا لفظ سنتا ہوں تو اس زبان اور قوم کے محاورہ کے مطابق لامحالہ میرا ذہن خدا اور بندے کی باہمی نسبت اور رابطہ کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ لیکن میں بخوبی جانتا ہوں کہ اسلام اور مسلمانوں کے نزدیک مذہب کا یہ محدود اور مقیّد مفہوم یا تصوّر نہیں ہے۔ میں نہ کوئی مولوی ہوں نہ ملاّ۔ نہ مجھے دینیات میں مہارت کا دعویٰ ہے۔ البتہ میں نے قرآن مجید اور قوانینِ اسلامیہ کے مطالعہ کی اپنے طور پر کوشش کی ہے۔ اس عظیم الشان کتاب کی تعلیمات میں انسانی زندگی کے ہر باب کے متعلق ہدایات موجود ہیں۔ زندگی کا روحانی پہلو ہو یا معاشرتی، سیاسی ہو یا معاشی۔ غرضیکہ کوئی شعبہ ایسا نہیں جو قرآنی تعلیمات کے احاطہ سے باہر ہو۔ قرآن کریم کی اصولی ہدایات اور سیاسی طریق کار نہ صرف مسلمانوں کے لئے بہترین ہیں بلکہ اسلامی حکومت میں غیر مسلموں کے لئے حسن سلوک اور آئینی حقوق کا جو حصہ ہے اس سے بہتر تصور ناممکن ہے۔"

اس کے بعد طلباء کی طرف سے پوچھا گیا:۔

"جب آپ اسلامی اصول کے نصب العین اور طریق کار دونوں میں بہترین حکومت کا یقین رکھتے ہیں اور اجمالاً یہ بھی کہتے ہیں کہ مسلمانوں کو خود مختار علاقے اس لئے مطلوب ہیں کہ وہ وہاں اپنے ذہنی میلانات اور تصوراتِ زندگی کو بلا روک ٹوک بروئے کار اور روبہ ترقی لاسکیں تو پھر اس میں کون سا امر مانع ہے کہ مسلم لیگ زیادہ تفصیل اور توضیح کے ساتھ اپنی جدوجہد کی مذہبی تعبیر و تشریح کر دے۔"

سوال آپ نے سن لیا۔ اب قائداعظمؒ کا جواب ملاحظہ فرمایئے۔ انہوں نے کہا:۔

"وقت یہ ہے کہ جب اس جدوجہد کو مذہب سے تعبیر کیجئے تو ہمارے علماء کی ایک جماعت بلا اس بات کے سمجھنے کے کہ کام کی نوعیت، تقسیم عمل اور اس کے اصلی حدود کیا ہیں، ان امور کو چند مولویوں کا اجارہ خیال کرلیتی ہے اور اپنے حلقہ سے باہر اہلیت و استعداد کے

باوجود مجھ میں یا آپ میں (یعنی ان کے اپنے سوا کسی اور میں) اس خدمت کے سرانجام دینے کی کوئی صورت نہیں دیکھتی۔ حالانکہ اس منصب کی بجا آوری کے لیے جن اجتہادی صلاحیتوں کی ضرورت ہے۔ انہیں میں، ان مولوی صاحبان میں (الا ماشاء اللہ) نہیں پاتا (اور مشکل اندر مشکل یہ کہ) وہ اس مشن کی تکمیل میں دوسروں کی صلاحیتوں سے کام لینے کا سلیقہ بھی نہیں رکھتے"۔

اسی حقیقت کی انہوں نے، قیام پاکستان کے بعد، اہل امریکہ کے نام اپنے ایک براڈکاسٹ میں (فروری ۱۹۴۸ء میں)، ان الفاظ میں وضاحت کر دی کہ:۔

"کچھ بھی ہو۔ یہ مسلّمہ بات ہے کہ پاکستان میں کسی صورت میں بھی تھیاکریسی رائج نہیں ہو گی جس میں حکومت مذہبی پیشواؤں کے ہاتھ میں دے دی جاتی ہے کہ وہ (بزعم خویش) خدائی مشن کو پورا کریں۔ (تقاریر بحیثیت گورنر جنرل ص ۶۵)

یہی وہ وارننگ، جس سے مودودی صاحب نے سمجھ لیا کہ مجوزہ پاکستان میں، اقتدار میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہو سکتا۔ اس سے انہوں نے قائد اعظم اور تحریک پاکستان کی مخالفت شروع کر دی۔ اس سلسلے میں طلوعِ اسلام میں اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ میں سمجھتا ہوں کہ اس کے دہرانے کی یہاں ضرورت نہیں۔ دو ایک مثالوں پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ مودودی صاحب نے لکھا کہ:۔

"افسوس کہ لیگ کے قائد اعظم سے لے کر چھوٹے مقتدیوں تک ایک بھی ایسا نہیں جو اسلامی ذہنیت اور اسلامی طرزِ فکر رکھتا ہو اور معاملات کو اسلامی نقطۂ نظر سے پرکھتا ہو۔۔۔۔۔ ان کے خیالات، نظریات اور طرزِ سیاست اور رنگِ قیادت میں خوردبین لگا کر بھی اسلامیت کی کوئی چھینٹ نہیں دیکھی جا سکتی"۔

تحریک پاکستان کے متعلق کہا کہ:۔

"جو لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ اگر مسلم اکثریت کے علاقے ہندو اکثریت کے تسلط سے آزاد ہو جائیں اور یہاں جمہوری نظام قائم ہو جائے تو اس طرح حکومتِ الٰہی قائم ہو جائے گی، ان کا گمان غلط ہے۔ دراصل اس کے نتیجے میں جو کچھ حاصل ہو گا وہ مسلمانوں کی کافرانہ حکومت ہو گی"۔

یہ تمام عبارتیں ان کی کتاب۔ سیاسی کشمکش حصہ سوم۔ میں موجود ہیں۔

اس تحریک کے ماحصل کو کافرانہ اور اس کی قیادت کو فاسقانہ اور فاجرانہ کیوں قرار دیا جا رہا تھا؟

محض اس لئے کہ نہ یہ تحریک ان کی جماعت کی پیدا کردہ تھی اور نہ ہی اس کی قیادت ان کے ہاتھ میں تھی۔ اسی لئے وہ کہتے تھے کہ :-

"مسلمان ہونے کی حیثیت سے یہ سوال میرے نزدیک کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتا کہ ہندوستان کو انگریزی امپیریلزم سے آزاد کرایا جائے۔۔۔۔ مسلمان ہونے کی حیثیت سے میرے لئے اس مسئلے میں کوئی دلچسپی نہیں کہ ہندوستان میں جہاں مسلمان کثیر التعداد ہیں وہاں ان کی حکومت قائم ہو جائے۔۔۔۔ مسلمان ہونے کی حیثیت سے میری نگاہ میں اس سوال کی بھی کوئی اہمیت نہیں کہ ہندوستان ایک ملک رہے یا دس ٹکڑوں میں تقسیم ہو جائے۔" (ایضاً)

انہیں مجوزہ پاکستان میں دلچسپی اس لئے نہیں تھی کہ اس میں زمامِ اقتدار ان کے ہاتھ میں نہیں رہتی تھی۔

سوال (۳):- مودودی صاحب نے تحریکِ پاکستان کی مخالفت اس زمانے میں کی تھی جب یہ واضح نہیں تھا کہ پاکستان میں کس قسم کی حکومت قائم ہوگی۔ چنانچہ انہوں نے "سیاسی کش مکش، حصہ سوم میں کہا تھا کہ :-

"اس موقع پر یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ مسلم لیگ کے کسی ریزولیوشن اور لیگ کے ذمہ دار لیڈروں کی کسی تقریر میں آج تک یہ بات واضح نہیں کی گئی کہ اُن کا آخری مطمعِ نظر پاکستان میں اسلامی نظامِ حکومت قائم کرنا ہے۔"

مودودی صاحب کو سب کچھ معلوم تھا

اسی بنا پر انہوں نے کہا تھا کہ "میرے نزدیک جو سوال سب سے اہم اور اقدم ہے وہ یہ ہے کہ آپ کے اس "پاکستان" میں نظامِ حکومت کی اساس خدا کی حاکمیت پر رکھی جائے گی یا مغربی نظریہ جمہوریت کے مطابق، عوام کی حاکمیت پر"۔ اگر یہ بات واضح ہوتی تو وہ کبھی اس کی مخالفت نہ کرتے۔

جواب :- جماعتِ اسلامی کی طرف سے یہ بات اکثر دہرائی جاتی ہے اور یہ، کذب بافی اور مغالطہ انگیزی کی بدترین مثال ہے۔ یہ شوشہ بھی مودودی صاحب ہی کا چھوڑا ہوا ہے۔ جنوری ۱۹۷۰ء کی بات ہے کہ مسٹر بھٹو نے کراچی بار ایسوسی ایشن سے خطاب کے دوران، مودودی صاحب کی کتاب "مسلمان اور سیاسی کش مکش، حصہ سوم" سے وہ اقتباسات پڑھ کر سنائے جن میں پاکستان کی مخالفت اور قائدِ اعظمؒ کی شان میں گستاخیاں کی گئی تھیں۔ اس کے جواب میں مودودی صاحب نے

بیان دیا جس میں کہا کہ :-

"اس کتاب کے مضامین ۴۰-۱۹۳۹ء میں لکھے گئے تھے جب ہنوز قرار دادِ پاکستان منظور نہیں ہوئی تھی۔ مقصد اس سے یہ تھا کہ مسلمانوں کی قومی تحریک کو ایک قومی ریاست کی بجائے اسلامی ریاست کے نصب العین کی طرف موڑ دیا جائے۔"

(روزنامہ امروز و مشرق - مورخہ ۱۰ جنوری ۱۹۷۰ء)

آپ دیکھئے کہ اس میں کس چابکدستی سے مغالطہ آفرینی اور فریب دہی کی کوشش کی گئی ہے۔ "سیاسی کشمکش" کے موضوع پر مقالات کا یہ سلسلہ بے شک ۴۰-۱۹۳۹ء سے شروع ہوا ہوگا۔ لیکن تحریک پاکستان اور قائد اعظمؒ کے متعلق جو کچھ لکھا گیا تھا وہ ان کے رسالہ "ترجمان القرآن" کی فروری ۱۹۴۱ء و مارچ ۱۹۴۱ء کی اشاعتوں میں شائع ہوا تھا۔ یعنی قرار دادِ پاکستان کے منظور ہونے کے ایک سال بعد۔ بعد میں یہ مضامین کتابی شکل میں بھی شائع کئے گئے اور قائد اعظمؒ اور تحریک پاکستان کے خلاف مقالات اس کی تیسری جلد میں شائع کئے گئے..... اس جلد پر یہ تو نہیں لکھا گیا کہ وہ کب شائع ہوئی تھی لیکن اس میں جماعت اسلامی کے پہلے اجتماع کا ذکر موجود ہے۔ جو اگست ۱۹۴۱ء میں منعقد ہوا تھا۔ اس شہادت سے واضح ہے کہ یہ کتاب کم از کم اگست ۱۹۴۱ء کے بعد شائع ہوئی تھی۔ اس کے بعد بھی اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہوئے ہیں لیکن کسی میں ان باتوں کی تردید نہیں کی گئی جو تحریک پاکستان اور قائد اعظمؒ کی مخالفت میں کہی گئی تھیں۔

لیکن یہ بات (کہ مودودی صاحب کو اچھی طرح معلوم تھا کہ مطالبۂ پاکستان ایک ایسے خطۂ زمین کا حصول ہے جس میں اسلامی نظامِ حکومت قائم کیا جائے گا) اس سے بھی بہت پہلے کی بات ہے۔ ذرا غور سے سنیے۔ جماعت اسلامی کے ترجمان۔ ایشیا۔ کے ۲۵ اگست ۱۹۶۸ء کے اداریہ میں غیر منقسم ہندوستان میں مسلمانوں کی مختلف تحریکوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا گیا کہ :-

"۱۹۳۶ء تک یہی حالت رہی۔ لیکن فَفِرُّوٓا اِلَى اللّٰهِ کی پکار کا ایک نتیجہ یہ ہے کہ مسلمان ان سب نصب العینوں سے مایوس ہو کر یہ محسوس کرنے لگے کہ ان کی نجات اسلام میں ہے..
مسلم لیگ نے اس نصب العین کو اپنا لیا ہے۔ اس کے لیڈروں نے ایک خالص اسلامی سلطنت کے قیام کے خواب کی تصدیق کی اور دیکھتے دیکھتے پوری مسلمان قوم اس کے علم تلے جمع ہو گئی۔"

اس سے واضح ہے کہ ۱۹۳۶ء کے بعد سے مسلمانانِ ہند نے ایک اسلامی مملکت کا نصب العین اپنے سامنے

رکھ لیا تھا اور مسلم لیگ کے لیڈروں نے اسے اپنا کر ایک خالص اسلامی سلطنت کے قیام کے خواب کی تصدیق کر دی تھی۔"

یہ ۱۹۳۶ء کی بات ہے۔ اب ایک قدم آگے بڑھئے۔ مودودی صاحب نے ۱۹۷۰ء میں لاہور میں منعقد اقبال ڈے میں شرکت کی۔ (جہاں تک مجھے معلوم ہے انہوں نے تشکیلِ پاکستان کے بعد پہلی مرتبہ ایسا کیا تھا اور یہ شاید اس لئے کہ اس وقت الیکشن قریب آ رہے تھے) بہرحال، اس تقریب میں انہوں نے اپنی تقریر میں کہا:۔

"اقبالؒ نے ایک علیحدہ مملکت کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے یہ واضح طور پر کہا تھا کہ اس سے سیاسی آزادی مقصود نہیں بلکہ اسلام کی حفاظت مقصود ہے۔ اقبالؒ نے آپ کو نظریہ دیا۔ اور قائداعظمؒ نے اس نظریہ کی بنیاد پر ایک وطن حاصل کیا۔"

(ایشیا۔ مورخہ ۲۶، اپریل ۱۹۷۰ء)

علامہ اقبالؒ کی وفات اپریل ۱۹۳۸ء میں ہوئی تھی۔ لہٰذا ان کی مذکورہ بالا وضاحت بہرحال اس سے پہلے کی بات ہے۔ اس سے واضح ہے کہ مودودی صاحب کو کم از کم ابتداء ۱۹۳۸ء میں اس کا علم تھا کہ مطالبہ پاکستان سے کیا مقصود تھا۔ اور "سیاسی کش مکش" کا سلسلۂ مضامین (بقول مودودی صاحب) اس کے بعد شروع کیا گیا تھا۔ اور آگے بڑھئے۔ نوائے وقت کی گیارہ ستمبر ۱۹۶۹ء کی اشاعت میں، ایک رنگین چوکھٹے میں، مودودی صاحب کا ایک بیان شائع ہوا تھا جس میں انہوں نے کہا تھا کہ:۔

"قائداعظمؒ کو اس امر کا بخوبی اندازہ تھا کہ مسلمانوں کی قوت، بقاء اور نشو و نما کا اصل سرچشمہ اسلام ہے۔ اس لئے انہوں نے بار بار اس کا اعلان کیا کہ پاکستان میں، اسلامی جمہوری نظام قائم کیا جائے گا۔"

ایشیا کی ۱۰، اگست ۱۹۶۹ء کی اشاعت میں مودودی صاحب کا ایک بیان شائع ہوا، جس میں انہوں نے کہا کہ

"اگر تحریکِ پاکستان کے آغاز میں، یہ نہ کہا جاتا کہ پاکستان اسلامی شریعت کے نفاذ اور اسلامی نظامِ زندگی قائم کرنے کے لئے بنانا مطلوب ہے تو اس تحریک کو کبھی مسلمانوں کی تائید حاصل نہ ہوتی اور نہ ہی یہ ملک وجود میں آتا۔"

خود، مودودی صاحب کے رسالہ۔ ترجمان القرآن۔ کی جون ۱۹۶۵ء کی اشاعت کے "اشارات" ان الفاظ سے شروع ہوتے ہیں:۔

"برعظیم ہند کے سینکڑوں اور ہزاروں نہیں بلکہ کروڑوں باشندے اور پوری دنیا کا پریس اس حقیقت پر گواہ ہے کہ تحریک پاکستان کے پیچھے نہ کوئی سیاسی غرض کارفرما تھی اور نہ معاشی مصلحت۔ اس کا محرک صرف ایک ہی جذبہ تھا کہ مسلمانوں کو ایک ایسا الگ خطہ ارض مل جائے جس میں وہ بڑی آزادی کے ساتھ اسلامی نظام حیات نافذ کر سکیں۔"

ذرا آگے چل کر لکھا ہے۔

"یہ امر اپنی جگہ مسلّم ہے کہ نظریۂ پاکستان کے بانی اور تحریک پاکستان کے قائد ہر موقعہ پر مسلمانوں کو یہی کہتے رہے کہ اس ملک کے قیام کا مقصد بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ یہاں اسلام کی ایک ایسی تجربہ گاہ قائم کی جائے جس سے مادی تہذیب سے ستائی ہوئی انسانیت آرام اور سکون حاصل کر سکے۔"

آپ مودودی صاحب کے ان بیانات کو دیکھئے جن میں کہا گیا ہے کہ تحریک پاکستان کے آغاز سے آخر تک اس کے قائدین واضح الفاظ میں یہ کہتے رہے اور بار بار کہتے رہے کہ اس تحریک اور مطالبہ کا مقصد صرف یہ ہے کہ اس قطعۂ زمین میں اسلامی نظام قائم کیا جا سکے۔ اور اس کے مقابلے میں مودودی صاحب ہی کا ۱۹۴۱ء کا یہ بیان دیکھئے کہ "لیگ کے ذمہ دار لیڈروں کی کسی تقریر میں یہ بات آج تک واضح نہیں کی گئی کہ ان کا آخری مطمع نظر پاکستان میں اسلامی نظام حکومت قائم کرنا ہے۔" اس کے ساتھ ہی مودودی صاحب کا یہ بیان کہ انہوں نے تحریک پاکستان کی مخالفت اس زمانے میں کی تھی جب ہنوز لیگ کی ۱۹۴۰ء کی قرارداد منظور نہیں ہوئی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اس قرارداد کے پاس ہونے کے بعد انہوں نے اسے غیر اسلامی تحریک کہہ کر اس کی مخالفت نہیں کی تھی لیکن اس کا کیا جواب کہ ان کی مخالفت کا یہ سلسلہ تشکیل پاکستان تک جاری رہا۔ ۸؍ اپریل ۱۹۴۷ء کو (یعنی قیام پاکستان سے کوئی چار مہینے پہلے اور اعلان پاکستان سے صرف دو مہینے پہلے) ٹونک میں اسلامی جماعت کا ایک اہم جلسہ ہوا جس میں مودودی صاحب سے مسلم لیگ کے بارے میں سوالات پوچھے گئے۔ انہوں نے جواب میں کہا:-

"اسے تو سائل صاحب خود بھی تسلیم کرتے ہیں کہ یہ تحریک غیر اسلامی ہے۔ ۔ ۔ ۔ جب آپ ایک تحریک کو خود غیر اسلامی مان رہے ہیں تو پھر کس منہ سے ایک مسلمان سے یہ مطالبہ کرتے ہیں

کہ وہ اس کا ساتھ دے"۔

(ترجمان القرآن، جلد ۳۰، عدد ۶، بحوالہ جماعت اسلامی پر ایک نظر ص ۳۴)

سوال (۴):۔ جب مودودی صاحب تحریکِ پاکستان کے آغاز سے لے کر اس کے آخری مرحلے تک اُسے غیر اسلامی قرار دیتے رہے تو پاکستان آنے کے بعد وہ بار بار کیوں کہہ رہے ہیں کہ پاکستان اس کے لئے حاصل کیا گیا تھا کہ اس میں اسلامی نظام قائم ہو؟

اب اسلام، اسلام کیوں؟

جواب:۔ اس سوال کا جواب ظاہر ہے۔ مودودی صاحب کی اس زمانے میں ساری کوشش یہ تھی کہ لوگ قائدِ اعظمؒ سے منحرف ہو کر انہیں اپنا قائد تسلیم کر لیں اور مسلم لیگ کی بجائے ان کی جماعت کا ساتھ دیں۔ اس کے لئے یہ کہا گیا کہ مسلم لیگ کی تحریک غیر اسلامی ہے اور اس کی قیادت میں اسلامی ذہنیت کا چھینٹا تک نظر نہیں آتا۔ اس کے برعکس اسلام کے واحد اجارہ دار ہم ہیں۔ جب یہ اس مقصد میں ناکام رہے اور پاکستان بن گیا تو انہوں نے یہاں آتے ہی یہ کہنا شروع کر دیا کہ پاکستان اس لئے حاصل کیا گیا تھا کہ یہاں اسلامی نظام قائم ہو۔ اور تم میں کوئی بھی ایسا نہیں جو اسلامی نظام کی الف۔ ب سے بھی واقف ہو۔ اسلامی نظام کیا ہوتا ہے، یہ ہم جانتے ہیں۔ اس لئے زمامِ اقتدار ہمارے ہاتھ میں دو تاکہ ہم وہ مقصد پورا کر دکھائیں جس کے لئے یہ خطۂ زمین حاصل کیا گیا تھا۔ چنانچہ انہوں نے ۴۹۔۱۹۴۸ء سے یہ راگ الاپنا شروع کر دیا کہ:۔

"کسی قوم کی اور ملک کی انتہائی بدقسمتی یہی ہو سکتی ہے کہ نااہل اور اخلاق باختہ قیادت اس کے اقتدار پر قابض ہو جائے۔۔۔۔ ایسے حالات میں غیر صالح قیادت کو ایک منٹ کے لئے بھی گوارا کرنا خلافِ مصلحت ہے۔ ایک غلط قیادت کی بقا کے لئے اس طرح کی کوشش کرنا ملک اور قوم کے ساتھ، سب سے بڑی غداری، اور غلط قیادت سے نجات دلانے کی فکر کرنا، اس کی سب سے بڑی خیر خواہی ہے"۔

(ترجمان القرآن، جون، جولائی ۱۹۴۹ء)

یہ ہے مقصد مودودی صاحب کے سامنے پاکستان بننے کے بعد۔ اور یہی وہ مقصد ہے جس کے لئے انہوں نے اس بدنصیب ملک میں ایک دن بھی ایسا نہیں آنے دیا کہ لوگ اطمینان کا سانس لے سکیں۔ اور یہ یہی کچھ کرتے رہیں گے جب تک اقتدار ان کے ہاتھ میں نہ آ جائے۔ جب اقتدار ان کے ہاتھ میں آ جائے گا تو "پیدائشی

مسلمانوں" کا حشر کیا ہوگا ۔ اس کے لئے ان کا کتابچہ ۔ مرتد کی سزا ۔ ملاحظہ کیجئے جس میں واضح الفاظ میں کہہ دیا گیا ہے کہ انہیں ایک سال کا نوٹس دیا جائے گا اور اگر وہ اس دوران میں ان کا مقرر کردہ اسلام قبول نہیں کریں گے تو انہیں قتل کر دیا جائیگا ۔

سوال (۵): آپ نے کہا ہے کہ مولانا اصلاحی صاحب نے مودودی صاحب کو لکھا کہ وہ "خود مرکزیت" کے خناس کو اپنے دماغ سے نکال دیں ۔ مودودی صاحب کی طرف سے اس کا کوئی جواب دیا گیا ۔۔۔۔

گالیاں

جواب :۔ جی ہاں ! جواب دیا گیا ۔ یعنی حسبِ معمول گالیوں کی بوچھاڑ ۔ مودودی صاحب کی تکنیک یہ ہے کہ وہ اپنے مخالفین کو خود گالیاں نہیں دیتے [1] خود تو خاموش رہتے ہیں اور اپنے مصاحبوں سے انہیں گالیاں دلواتے رہتے ہیں ۔ اس سے (حقیقت سے بے خبر) لوگ یہ تاثر لیتے ہیں کہ دیکھئے ! مودودی صاحب کس قدر بلند ظرف کے انسان ہیں کہ مخالفین ہزار کچھ کہیں ، یہ کبھی زبان درازی نہیں کرتے ۔ ان کی جماعت سے جو حضرات ۱۹۵۶ء میں الگ ہوئے تھے اور جن کے سرخیل مولانا اصلاحی تھے ۔ ان کی شان میں ، اس جماعت کے لٹریچر میں جو کچھ کہا گیا وہ درکنار رہا ۔ (مولانا) عبدالرحیم اشرف نے اپنے جریدہ "المنبر" کی اشاعت بابت ۱۹ ستمبر ۱۹۵۸ء میں لکھا تھا کہ خود مودودی صاحب ان اختلاف کرنے والوں کو یہ کچھ ثابت کرتے رہے ۔

"نجویٰ کے مرتکب ، ضعفِ ارادہ و نفرت کے مریض ۔ یک رُخے ۔ تحریکِ اسلامی کے نادان دوست ۔ جماعت کے غدار ۔ اقامتِ دین کی جدوجہد کے روڑے ۔ خدا کے خوف سے عاری ۔ خائن ۔ انتشار پسند ۔"

سوال (۶): آپ نے کہا ہے کہ جماعتِ اسلامی والے ، مودودی صاحب کو اسلام میں سند سمجھتے ہیں ۔ اس کی کوئی عملی مثال دیں گے ۔

جواب :۔ اس کی عملی مثال تو اس جماعت کی ساری تاریخ ہے ۔ آپ اس کی ایک مثال بھی پیش نہیں کر سکتے کہ مودودی صاحب نے کسی مسئلہ کے متعلق یہ کہا ہو کہ وہ اسلام کے مطابق یا اس

---

[1] اگرچہ بعض اوقات یہ مغلوب الغضب ہو کر یہ کبھی الحلیم نہیں کرتے لیکن بالعموم یہ خود خاموش رہتے ہیں ۔

کے خلاف ہے اور ان کی جماعت کے کسی رکن نے اس سے اختلاف کیا ہو۔ مودودی صاحب نے کہا کہ انتخابات میں حصہ لینا اسلام کی رُو سے قطعاً جائز نہیں، تو ان کے متبعین نے کہا کہ آمنّا وصدّقنا۔ اس کے بعد انہوں نے کہا کہ انتخابات میں حصہ لینا عین مطابق اسلام ہے اور

دین میں سند

جماعت والوں نے کہا کہ بالکل بجا فرمایا آپ نے۔ مودودی صاحب نے کہا کہ اسلام کی رُو سے عورت کو ووٹ دینے تک کا بھی حق حاصل نہیں اور ان کے معتقدین نے کہا کہ بالکل درست۔ پھر انہوں نے کہا محترمہ فاطمہ جناح (مرحومہ) منصب صدارت کی اُمیدوار ہیں۔ ان کی مدد کرنا عین تقاضائے اسلام ہے۔ جماعت نے اس میں بھرپور حصہ لیا۔ مودودی صاحب نے کہا کہ زمین کی ملکیت پر کسی قسم کی حدبندی قطعاً اسلام کے خلاف ہے۔ جماعت نے کہا۔ بالکل بجا ارشاد ہوا۔ پھر انہوں نے کہا کہ ملکیت اراضی کی زیادہ سے زیادہ حد یہ ہونی چاہیئے اور جماعت نے ان کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا۔ انہوں نے کہا کہ "نیشنلائزیشن" کا نظریہ ابلیس کی ایجاد ہے۔ اسلام اس کی قطعاً اجازت نہیں دیتا۔ جماعت نے کہا، بالکل بجا۔ اس کے بعد انہوں نے کہا کہ کلیدی صنعتیں قومیائی جا سکتی ہیں۔ جماعت نے کہا بالکل درست۔

غرضیکہ کہاں تک مثالیں پیش کی جائیں۔ اس جماعت کے نزدیک اسلام ہے ہی وہی، جسے مودودی صاحب، اسلام قرار دے دیں۔

سوال (۲):- جب رسول صلی اللہ کی احادیث کے مجموعے مرتب کر لئے گئے تو پھر ان کی رُو سے اطاعت رسول اللہ کیوں نہیں کی جا سکتی۔ اس میں کیا حرج واقع ہوتا ہے۔

جواب:- حرج تو بالکل واضح ہے۔ اُمت میں جسقدر فرقے پائے جاتے ہیں وہ سب اپنے اپنے مسلک کی تائید میں احادیث رسول اللہ پیش کرتے ہیں اور کوئی اتھارٹی ایسی نہیں جو یہ فیصلہ کر سکے کہ کون سا مسلک سنت رسول اللہ کے مطابق ہے۔ خلفائے راشدین کے زمانے

احادیث کی اطاعت

میں ارشادات رسول اللہ موجود تھے۔ (اگرچہ وہ مرتب شکل میں نہیں تھے) اس وقت ان ارشادات (احادیث) کی بنا پر کوئی فرقہ وجود میں نہیں آیا تھا کیونکہ زندہ سنٹرل اتھارٹی موجود تھی۔ جب یہ نہ رہی تو مختلف گروہ اپنے اپنے طور پر فیصلے کرنے لگ گئے۔ اس طرح اُمت فرقوں

میں بٹ گئی۔ اُمت کا یہ تفرقہ مٹ نہیں سکتا جب تک اس سنٹرل اتھارٹی (خلافت علی منہاج نبوت کے نظام) کو پھر سے قائم نہ کر لیا جائے۔ آپ ذرا اس حقیقت پر غور کیجئے کہ خدا کی کتاب کے ساتھ رسولؐ کی بعثت کی ضرورت یہ تھی کہ تنہا کتاب کی اطاعت ممکن نہیں تھی۔ آپ سوچئے کہ جب زندہ اتھارٹی کے بغیر خدا کی کتاب پر عمل ممکن نہیں تھا تو اس اتھارٹی کے بغیر احادیث کی کتابوں پر عمل کس طرح ممکن ہے؟ اس اتھارٹی کے نہ ہونے سے کتاب اللہ اور احادیث رسول اللہ کے باوجود اُمت کی وحدت ختم ہو گئی اور جب اُمت کی وحدت ختم ہو گئی تو دین باقی نہ رہا۔

سوال (۸):- کیا آپ کے نزدیک خلافت راشدہ کے نہج کا اسلامی نظام پھر سے قائم ہو سکتا ہے؟

جواب:- اگر اس نظام یعنی دین کا قیام ممکن نہ ہوتا تو قرآن مجید کو قیامت تک محفوظ رکھنے کا فائدہ کیا تھا؟ علاوہ بریں خدا کا فیصلہ ہے کہ دینِ خداوندی تمام نظام ہائے عالم پر غالب آ کر رہے گا۔ (لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ (۹/۳۳)) اس نظام کا احیاء ممکن نہیں تو پھر خدا کا یہ وعدہ پورا کس طرح ہو گا؟ یہ نظام قائم ہو گا اور تمام نظام ہائے عالم پر غالب آ کر رہے گا کہ:- إِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيعَادَ (۳/۹) "خدا کا وعدہ کبھی جھوٹا نہیں ہو سکتا۔"

خلافت راشدہ کا احیاء

سوال (۹):- جب آپ بھی یہ کہتے ہیں کہ اس وقت اسلام دین نہیں، مذہب ہے اور مسلمان دین پر کاربند نہیں۔ اور مودودی صاحب بھی یہی کہتے ہیں تو پھر آپ دونوں میں فرق کیا ہے؟ اور آپ ان کی مخالفت کیوں کرتے ہیں؟

جواب:- مودودی صاحب یہ فرماتے ہیں کہ موجودہ اسلام دین نہیں مذہب ہے۔ دین اس اسلام کو سمجھا جائیگا۔ جسے وہ اسلام کہہ دیں۔ اور میں یہ کہتا ہوں کہ ختم نبوت کے بعد کسی فرد کو حق حاصل نہیں کہ وہ اسلام میں سند بن بیٹھے، میرا اپنا کوئی دعویٰ نہیں۔ نہ میری کوئی پارٹی، جماعت یا فرقہ ہے۔ نہ میں کسی جماعت کا امیر یا فرقے کا امام ہوں۔ میری حیثیت قرآن کریم کے ایک طالب علم اور مبلغ کی ہے۔ میرا مسلک یہ ہے کہ اس فکر کو عام کرتے جائیں کہ اسلام مذہب نہیں، دین ہے۔ نظامِ حیات ہے، جس کے لئے ایک مملکت کی ضرورت ہے۔ اس مملکت کا جملہ کاروبار، قوانین و احکام خداوندی کی چاردیواری میں رہتے ہوئے سرانجام پائے گا۔ اس میں اربابِ اقتدار وہ ہوں گے جن کی سیرت، سیرتِ محمدیہ کے قالب میں ڈھلی ہوئی ہوگی۔ قرآن، حدیث، فقہ، سب ان کے سامنے ہوں گے۔ اس

مملکت کی سنٹرل اتھارٹی یا مرکزِ ملت کی وساطت سے اس کے فیصلے قانونی حیثیت سے نافذ ہوں گے اور ان کا اطلاق تمام مسلمانوں پر یکساں ہوگا۔ یہ سارا نظام اُمت کے مشورے سے طے پائے گا اور اس میں کسی فرد کو یہ حق حاصل نہیں ہوگا کہ وہ اسلام میں سند بن بیٹھے اور اس کی اطاعت خدا اور رسولؐ کی اطاعت کے قائم مقام بن جائے۔ میں اس قسم کے نظام کو خلافت علیٰ منہاجِ رسالتؐ کی اصطلاح سے تعبیر کرتا ہوں۔ باقی رہے اس وقت کے مسلمان، تو جیسے کچھ وہ ہیں، ویسے ہی ہم ہیں۔ جو حالت ان کی، وہی ہماری۔ یہ حق تو ایک رسولؐ کو ہی پہنچتا ہے کہ وہ آکر کہے کہ تم سب دین سے منحرف ہو۔ دین لے کر میں آیا ہوں۔ جو میری بات مانے گا وہ دین کا پیرو کہلائے گا۔ جو اسے تسلیم نہیں کرے گا، اسے دین سے کوئی واسطہ نہیں ہوگا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ایسا کہنے والا ختمِ نبوت کی مہر کو توڑ دیتا ہے خواہ وہ "مرزا غلام احمد" ہو یا "سید ابوالاعلیٰ مودودی" جنہیں ان کے متبعین "اللہ کا شاہکار" قرار دیتے ہیں۔ میں تو اس کے تصور تک سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں۔ یہ بہت بڑا فتنہ ہے جسے سادہ لوح مسلمان پہچانتا نہیں۔

سوال (۱۰): جماعتِ اسلامی کے زیرِ اہتمام، حال ہی میں، ملک بھر کے ماہرینِ قانون و وکلا صاحبان کا ایک بہت بڑا کنونشن بدیں غرض منعقد ہوا ہے کہ ملک میں قانونِ شریعت کا نفاذ ہو۔ ان سے کہا گیا ہے کہ وہ قانونِ شریعت مدوّن کریں اور یہ بتائیں کہ اس کے نفاذ کی عملی شکل کیا ہونی چاہئے۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ جماعت (یعنی مودودی صاحب) قانونِ شریعت کی تدوین اور نفاذ کے خواہشمند بھی ہیں اور اس کے لئے کوشاں بھی۔

جواب: میں نے اس کنونشن کی کارروائی اخبارات میں پڑھی ہے اور اس سے مجھے بے حد افسوس ہوا ہے۔ افسوس جماعتِ اسلامی پر نہیں کیونکہ یہ تو ان کے پروپیگنڈہ کی ایک کڑی ہے۔ افسوس وکلا حضرات پر ہے جو کنونشن میں شریک ہوئے۔ ہماری قوم کے عوام سادہ لوح بھی ہیں اور جذباتی بھی۔ لیکن قوم کے دانشور طبقہ سے کم از کم یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ معاملات پر جذبات سے الگ ہٹ کر حقائق و لطائف کی روشنی میں غور و فکر کریں۔ ان میں وکلا حضرات کا نام سرِفہرست آتا ہے۔ کیونکہ ان کا اوڑھنا بچھونا قانون ہوتا ہے اور قانون میں جذبات کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ اگر یہ طبقہ بھی عوام کی سطح پر اُتر آئے تو اس سے بڑھ کر مقامِ تأسف اور کون سا ہو سکتا ہے؟

سب سے پہلے تو یہ دیکھئے کہ یہ کنونشن اس جماعت کی طرف سے منعقد کیا گیا جس کا بانی، وکالت کے پیشہ ہی کو حرام قرار دیتا ہے۔ مودودی صاحب نے ایک مستفسر کے سوال کے جواب میں کہا تھا :۔

"وکالت کو آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ یہ قانون الٰہی کے خلاف کھلی بغاوت ہے۔ اس کے مقابلہ میں اگر کسی دوسرے پیشے میں کچھ حرام کی آمیزش ہو بھی تو بہر حال وہ بغاوت سے تو کم درجہ ہی کا گناہ ہے۔ تجارت، زراعت، صنعت و حرفت، مزدوری، پرائیویٹ فرموں کی ملازمتیں اور اسی قسم کے دوسرے پیشوں میں ایسی صورتیں بہم پہنچ سکتی ہیں جن کے اندر کم سے کم ناگزیر معصیت کی حد پر آدمی قائم رہ سکتا ہے اور کم از کم اس درجہ میں تو حرام نہیں ہیں جس درجہ کی یہ وکیلانہ بغاوت حرام ہے۔۔۔۔۔ وکیل کے محرر کا کام بھی حرام ہے۔۔۔۔ وکلاء کے ہاں کے کھانا کھانے میں بھی پرہیز اولیٰ ہے"۔

(ترجمان القرآن۔ جنوری فروری ۱۹۴۴ء)

مجھے افسوس اس بات پر ہے کہ وکلاء حضرات کے اس جم غفیر میں سے کسی ایک کی حمیت نے بھی مودودی صاحب سے استفسار کرنے کی ضرورت نہ سمجھی کہ جن لوگوں کے پیشے کو آپ قانون خداوندی کے خلاف کھلی بغاوت اور جن کی روزی کو آپ حرام قرار دیتے ہیں انہیں آپ قانون شریعت کی تدوین و تنفیذ کے لئے دعوت کس طرح دے رہے ہیں؟ ان میں سے کسی نے بھی ان سے یہ نہیں پوچھا!

۲۔ اب آگے بڑھئے۔ کنونشن کے مقررین میں سے ہر ایک نے، اور خود مودودی صاحب نے، تدوین قوانین شریعت کے ضمن میں "کتاب وسنت" کے الفاظ دہرائے اور کہا کہ یہی قانون شریعت کی اساس و بنیاد ہیں۔ بہت اچھا! لیکن مودودی صاحب تو خود اعلان کر چکے ہیں کہ کتاب وسنت کی بنیادوں پر کوئی ایسا ضابطہ قوانین مرتب نہیں کیا جا سکتا، جو پاکستان میں بسنے والے تمام مسلمانوں کے لئے قابل قبول ہو اور ان پر اس کا اطلاق یکساں طور پر کیا جا سکے۔ ان وکلاء حضرات میں سے کسی نے مودودی صاحب سے یہ نہ پوچھا کہ جب "کتاب وسنت" کی رُو سے ایسا ضابطہ شریعت مرتب نہیں ہو سکتا تو جس ضابطہ کے مرتب کرنے کے لئے آپ نے ہمیں دعوت دی ہے، اس کی بنیاد کیا ہو گی۔ کتاب و سنت تو خود مودودی صاحب کے الفاظ میں، اس کی بنیاد ہو نہیں سکتی۔ پھر اس کی اور کون سی بنیاد ہو گی۔

ان میں سے کسی نے آنا نہ پوچھا اور کتاب و سنت کے الفاظ دہراتے چلے گئے۔ اسی سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ یہ حضرات اور انہیں دعوت دینے والی جماعت اسلامی، نظام شریعت کے مسئلہ میں کس قدر (SERIOUS) ہیں۔

۳۔ اب آیئے ٹیپ کے اس بند کی طرف، اور یہ دیکھئے کہ اس کنونشن کے انعقاد کی غرض و غایت کیا تھی اور مودودی صاحب کے نزدیک نفاذِ شریعت کا عملی طریق کیا۔ انہوں نے اپنی تقریر کے آخر میں کہا:

"اسلامی قانون کے نفاذ کا واحد طریقہ یہ ہے کہ جن لوگوں کے ہاتھ میں اقتدار ہے انہیں اقتدار سے ہٹا دیا جائے اور ان لوگوں کو اقتدار سونپا جائے جو اسلام جانتے اور مانتے ہوں اور اسے دل سے نافذ کرنا چاہتے ہوں۔"

(نوائے وقت، ۳ مئی ۱۹۷۶ء)

فرمایئے! جو کچھ میں کہتا چلا آ رہا ہوں، اس کے لئے اس سے بڑھ کر کسی اور مہر تصدیق کی ضرورت رہ جاتی ہے؟

سوال (۷): آپ کہتے ہیں کہ مودودی صاحب آج ایک بات کو مطابق اسلام قرار دیتے ہیں اور اس کے بعد اس کے خلاف بات کو اسلام کہہ کر پیش کر دیتے ہیں۔ ایک صاحب فکر انسان، مزید غور و فکر کے بعد اپنی سابقہ رائے بدل سکتا ہے۔ اس میں کیا ہرج ہے؟

جواب: ایسا کرنے میں کوئی ہرج کی بات نہیں۔ لیکن ایسے "صاحب فکر" کے لئے یہ تو ضروری ہے کہ وہ اپنی رائے بدلنے پر اعلان کرے کہ میری رائے غلط اور خلاف اسلام تھی۔ میں نے اب اس سے رجوع کر لیا ہے۔ (جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے) آپ مودودی صاحب کے ہاں اس قسم کے اعتراف کی ایک مثال بھی پیش نہیں کر سکتے حالانکہ بعض مقامات ایسے تھے جن میں ایسا کرنا نہایت ضروری تھا۔ مثلاً مودودی صاحب نے انتخابات (الیکشن) کے سلسلہ میں فیصلہ دیا کہ:-

"ہماری اجتماعی زندگی اور قومی سیاست کو جن چیزوں نے سب سے بڑھ کر گندا کیا ہے ان میں سے ایک اُمیدواری اور پارٹی ٹکٹ کا طریقہ ہے۔ اسی بنا پر جماعت اسلامی نے فیصلہ کیا ہے کہ اس ناپاک طریق انتخاب کی جڑ کاٹ دی جائے۔ (یاد رکھئے) اُمیدوار بن کر اٹھنا اور اپنے حق میں ووٹ مانگنا آدمی کے غیر صالح اور نا اہل ہونے کی پہلی اور کھلی علامت ہے۔ ایسا آدمی جب اور جہاں سامنے

آئے سمجھ لینا چاہئے کہ یہ ایک خطرناک شخص ہے۔" (ترجمان القرآن اکتوبر ۱۹۵۰ء)

اس پران کے خلاف یہ اعتراض ہؤا کہ اگر کسی منصب کے لئے اُمیدوار بن کر اُٹھنا خلافِ اسلام ہے، اور یہ اس شخص کے غیر صالح ہونے کی دلیل، تو حضرت علیؓ نے اپنے آپ کو منصبِ خلافت کے لئے بطور اُمیدوار کیوں پیش کیا تھا۔ اس کے جواب میں انہوں نے فرمایا کہ حضرت علیؓ کا یہ عمل خلافِ اسلام تھا:۔

"اور آخری فیصلہ کُن بات اس مسئلہ میں یہ ہے کہ اگر صحابۂ کرامؓ، بزرگانِ سلف میں سے کسی کا عمل ایک طرف ہو اور اللہ اور اس کے رسولؐ کے صاف صاف ارشادات دوسری طرف، تو ہمارے لئے یہ کسی طرح جائز نہیں کہ خدا اور رسولؐ کے فرمان کو چھوڑ کر کسی بزرگ کے عمل کو اپنے لئے قانونِ زندگی قرار دیں۔ جس کا جو عمل بھی فرمانِ خدا اور رسولؐ سے مختلف ہو، وہ ایک لغزش ہے نہ کہ حُجت۔"

(ترجمان القرآن۔ اکتوبر ۱۹۵۰ء)

اس کے چند ہی سال بعد، مودودی صاحب کی مصلحتوں کا تقاضا ہؤا کہ انتخاب میں حصہ لیا جائے تو انہوں نے فیصلہ فرمادیا کہ ایسا کرنا عین مطابقِ اسلام ہے۔ انہوں نے لکھا کہ:۔

"ہر معقول آدمی بیک نظر محسوس کرے گا کہ ہماری یہ نئی پالیسی ٹھیک ٹھیک دینی نظام کے مطابق ہے اور اس میں دراصل کوئی اصول شکنی نہیں کی گئی۔" (ترجمان القرآن۔ مئی ۱۹۵۸ء)

آپ دیکھئے کہ مودودی صاحب نے یہ نہیں کہا کہ ان کی پہلی رائے غلط اور خلافِ اسلام تھی، اور اب یہ رائے اسلام کے مطابق ہے، لیکن بات اس سے بھی آگے چلتی ہے۔ انہوں نے اپنی رائے کی بناء پر حضرت علیؓ کی شان میں جو گستاخی کی تھی، اس حقیقت کے انکشاف کے بعد کہ حضرت علیؓ کا وہ عمل، خدا اور رسولؐ کے ارشادات کے خلاف لغزش نہیں تھا، انہوں نے اس کی ضرورت بھی نہ سمجھی کہ خدا سے اپنی غلطی کی معافی مانگ لیتے۔ لیکن غلطی کی معافی تو وہ مانگے جو یہ سمجھے کہ اس سے غلطی کا امکان ہے۔ مودودی صاحب اپنے آپ کو اس سے بہت ارفع و اعلیٰ سمجھتے ہیں۔ (بقول ان کے برادرِ کلاں سید ابوالخیر مودودی صاحب) وہ اپنے آپ کو "بعد از خدا بزرگ" کے مقام پر قائز تصوّر کرتے ہیں۔ (معاذ اللہ، ثم معاذ اللہ)

سوال (۱۲):۔ مودودی صاحب جب اس قسم کا ہر آن بدلنے والا اسلام پیش کرتے ہیں تو علماء حضرات کی طرف سے اس کی مخالفت کیوں نہیں ہوتی؟

جواب:۔ آپ یہ سوال تو ان علماء حضرات سے پوچھئے۔ بظاہر یہی نظر آتا ہے کہ اس کی دو وجوہات ہیں۔ ہیں، جلبِ منفعت اور دفعِ مضرّت۔ مودودی صاحب جب دارالاسلام (پٹھانکوٹ) گئے ہیں تو آن

کے پاس کچھ نہیں تھا۔ چنانچہ انہوں نے علامہ اقبالؒ کی وفات پر لکھا تھا کہ ان کا وہی ایک مادی سہارا تھا جو نہ رہا۔۔۔۔۔ اور آج اس جماعت کی یہ حالت ہے کہ سیم وزر کا سیلاب اُمڈے چلا آرہا ہے۔ اس وقت پاکستان ہی میں نہیں، دنیا کے تمام بڑے بڑے ملکوں میں اس کی شاخیں اور مراکز ہیں جن پر ظاہر ہے کہ لاکھوں روپے صرف آرہے ہیں۔ مجھے انگلینڈ سے ایک دوست نے، وہاں سے شائع ہونے والے روزنامہ ملت کی ۲۳، فروری ۱۹۷۶ء کی اشاعت کا ایک تراشا بھیجا ہے جس میں ملتان روڈ لاہور پر مرکزی جماعت کے زیرِ تعمیر مرکز (منصورہ) کی تفاصیل درج ہیں۔ اس میں کہا گیا ہے کہ ۱۶۲ کنال اراضی پر زیرِ تعمیر، اس مرکز پر ابھی تک چالیس لاکھ روپیہ صرف آچکا ہے۔ اس ایک مثال سے ان کی دولت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس دولت کے بل بوتے پر بہت سی مخالفتوں کا منہ بند کیا جاسکتا ہے۔ (مولانا) عبدالرحیم اشرف نے لکھا تھا کہ ۱۹۵۶ء میں اس جماعت کے کل ارکان کی تعداد (۱۳۰۰) کے قریب تھی اور ان میں (۱۲۰) تنخواہ دار ملازم تھے۔ (المنبر، اکتوبر ۱۹۶۶ء) آج کا حال خدا جانے۔

ایک وجہ تو یہ ہو سکتی ہے۔ دوسری یہ کہ ان کی پراپیگنڈہ مشینری مخالفت کرنے والوں کا جو حشر کرتی ہے، اس سے ڈر کر بھی لوگ اپنی عافیت اسی میں سمجھتے ہیں کہ ان سے اُلجھا نہ جائے۔ حتیٰ کہ جو لوگ ۱۹۶۵ء میں ان سے الگ ہوئے تھے، انہیں بھی کھل کر ان کی مخالفت کرنے کی ہمت نہیں پڑی تھی۔

پرویز

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بتقریب یوم اقبال
اپریل ۱۹۷۷ء

اسلامی مملکت کا تصوّر

اقبالؒ کے نزدیک

بیا ساقی بگرداں ساتگیں را — بیفشاں بر دو گیتی آستیں را
حقیقت را بہ رندے فاش کردند — کہ مُلّا کم شناسد رمزِ دیں را

دین کی تاریخ کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے ایک عظیم، بصیرت افروز حقیقت بیان کی ہے۔ جب کہا کہ:-

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ ۚ فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ (۲۲/۵۲) "اے رسولؐ! تجھ سے پیشتر کوئی صاحبِ وحی ایسا نہیں ہوا جس کے ساتھ یہ ماجرا نہ گزرا ہو کہ (اس کی وفات کے بعد) دین کے مخالفین نے اس کی وحی میں آمیزش نہ کر دی ہو۔ اس کے بعد خدا ایک اور نبی بھیج دیتا اور اس کی طرف وحی کے ذریعے اس آمیزش کو زائل کر کے اپنے قوانین کو پھر سے محکم کر دیتا۔ اللہ سب کچھ جاننے والا صاحبِ حکمت ہے"۔ رسول... ...کی وحی میں آمیزش کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ خدا کا دین، مذہب میں تبدیل ہو جاتا تھا۔ دین نام تھا احکام و اقدارِ خداوندی کو معاشرہ میں قانونی حیثیت سے نافذ کرنے کا۔ اس کے برعکس، مذہب، خدا اور بندے کے درمیان ایک پرائیویٹ تعلق تھا۔ جو بندگی، پرستش، یا مختلف رسوم کی رُو سے انفرادی طور قائم ہو جاتا تھا۔ دنیا میں جتنے مذاہب پائے جاتے ہیں ان کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ وہ ابتدا میں دین ہی تھے۔ (قرآن کریم میں ہے کہ خدا نے ہر قوم میں رسولؐ بھیجے تھے) مفاد پرست گروہوں نے جن کے سرکردہ مذہبی پیشوا تھے، انہیں مذہب میں تبدیل کر دیا۔ ان مذہبی پیشواؤں کی کیفیت یہ تھی کہ،

يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ۙ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ .... (۲/۷۹)

"یہ خود شریعت وضع کرتے تھے اور لوگوں سے کہتے تھے کہ یہ شریعتِ خداوندی ہے اور ایسا کچھ پیسے کمانے کے لئے کرتے تھے۔ مذہب ان کا پیشہ بن جاتا تھا"۔ خدا نے رسول اللہ کی طرف جو دین بھیجا اس کے متعلق کہہ دیا کہ:

وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ؕ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ .... (۶/۱۱۶)

"خدا نے اس وحی کی رُو سے اپنے قوانین کو عدل و صداقت کی بنیادوں پر مکمل کر دیا ہے۔ ان میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکے گا"۔

اس لئے کہ:-

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (۱۵/۹)

"ہم نے اس قرآن کو نازل کیا ہے اور ہم خود اس کی حفاظت کریں گے"۔

ظاہر ہے کہ اس کے بعد وحی کی ضرورت نہ تھی، اس لئے یہ ختم نبوت کا اعلان تھا۔ کلام اللہ کے مکمل، غیر متبدل اور محفوظ ہو جانے کے معنی یہ تھے کہ انسانوں کے ساتھ خدا کے مزید کلام کرنے کی ضرورت نہیں رہی۔ اب خدا کے بندوں کے ساتھ کلام کرنے کا ذریعہ اُس کا یہی کلام (قرآنِ مجید) ہوگا۔

لیکن جو کچھ دین کے ساتھ اس سے پہلے ہوتا رہا وہی کچھ اس دین کے ساتھ بھی ہوا جو قرآن میں دیا گیا تھا۔ آپ حیران ہوں گے کہ یہ کیسے ہو گیا؟ کیا قرآن محفوظ نہ رہا؟ کیا اس میں بھی آمیزش ہو گئی؟ اگر ایسا ہو گیا تو خدا کی اس ذمہ داری کے متعلق کیا کہا جائے گا جو اس نے اسے محفوظ رکھنے کے لئے اپنے اوپر لی تھی؟ نہیں ایسا نہیں ہوا۔ قرآن کا متن تو بالکل محفوظ رہا۔ اس میں نہ ذرا سا تغیر و تبدل ہوا، نہ کسی قسم کی آمیزش ——— لیکن ہوا ...... یہ کہ خارج از قرآن متعدد عناصر کو وحی کا درجہ دے دیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قرآن تو محض تلاوت کے لئے رہ گیا اور خارج از قرآن عناصر نے اس کی جگہ لے لی اور اس طرح دین مذہب میں تبدیل ہو گیا۔

اسلام مذہب بن گیا

اب جو کچھ اسلام کے نام سے دنیا میں متعارف ہے وہ دین نہیں بلکہ یہی مذہب ہے۔ دین کے مذہب میں تبدیل ہو جانے کی سب سے پہلی محسوس علامت یہ ہوتی ہے کہ اُمت میں وحدت نہیں رہتی۔ وہ فرقوں میں بٹ جاتی ہے، اور ہر فرقہ کی شریعت کی آخری

سند (خدا کے بجائے) کوئی نہ کوئی شخصیت قرار پا جاتی ہے۔ اسی لئے قرآن کریم میں فرقہ بندی کو شرک قرار دیا گیا ہے۔ (۳۱/۳)

(جیسا کہ شروع میں کہا جا چکا ہے) جب دین، مذہب میں تبدیل ہو جاتا تھا تو خدا ایک اور نبی بھیج دیتا تھا جو وحی کو انسانی آمیزشوں سے پاک اور صاف کر دیتا تھا۔ لیکن ختمِ نبوت کے بعد، نبیوں کا سلسلہ بند ہو گیا۔ اسے جاری رکھنے کی ضرورت اس لئے بھی نہیں تھی کہ رسول اللہؐ کے بعد، خدا کی وحی (قرآن مجید) میں آمیزش نہیں ہو سکتی تھی جسے الگ کرنے کے لئے نبی کی ضرورت لاحق ہوتی تھی۔ خدا کی آیات (قرآنی قوانین) اپنی منزہ شکل میں موجود تھیں۔ ضرورت صرف اس امر کی تھی کہ ان آیات کو (قرآنی الفاظ میں) "محکم" کیا جائے۔ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ آيَاتِهٖ (۱/۱) آیاتِ قرآنی کو محکم کرنے کے معنی یہ ہیں کہ انہیں دین کی اساس قرار دیا جائے۔ انہیں حق و باطل، جائز و ناجائز۔ صحیح اور غلط کا معیار تسلیم کیا جائے۔ لیکن یہ فریضہ انفرادی طور پر سرانجام نہیں دیا جا سکتا تھا۔ یہ اُمت کا اجتماعی فریضہ تھا جس کے لئے ضروری تھا کہ ایک مملکت قائم کی جائے، جس کا کاروبار قرآن مجید کی حدود کے اندر رہتے ہوئے سرانجام پائے۔ کتبِ سماوی کے نزول کا مقصد یہی تھا۔ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ ط ... ٥ (۲/۲۱۳) کہ لوگوں کے اختلافی امور میں ان کے مطابق فیصلہ کیا جائے۔ رسولؐ

استحکامِ آیات اللہ کا عملی طریق

اللہ سے بھی یہی کہا گیا تھا کہ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ أَنْزَلَ اللّٰهُ... (۵/۴۸) تم لوگوں میں کتاب اللہ کے مطابق فیصلے کرو۔ اس اُمت سے بھی واضح الفاظ میں کہہ دیا گیا تھا کہ:

وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهُ إِلَى اللّٰهِ (۴۲/۱۰)

"اگر کسی معاملہ میں تم میں اختلاف ہو جائے تو اس کا فیصلہ خدا کی کتاب کی رو سے کر لیا کرو۔"

حتیٰ کہ حتمی طور پر یہ اعلان کر دیا کہ:

وَمَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَآ أَنْزَلَ اللّٰهُ فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ (۵/۴۴)

"اور جو لوگ کتاب اللہ کے مطابق فیصلے نہیں کرتے انہی کو کافر کہا جاتا ہے۔"

لہٰذا آیات اللہ کو محکم کرنے کے لئے خدا کی طرف سے کسی کے آنے کی ضرورت نہیں تھی۔ (خواہ اس کا نام کچھ ہی کیوں نہ رکھ لیا جائے)، اس فریضہ کو اُمت نے خود سرانجام دینا تھا۔ یعنی خارج از قرآن عناصر کو شریعتِ خداوندی قرار دینے کے بجائے، کتاب اللہ کو مملکت کا ضابطۂ نظام قرار دینا، اُمت کا فریضہ تھا۔ اس کے لئے کسی مامور من اللہ

کی ضرورت نہیں تھی۔ خدا کی طرف سے جس نے آنا تھا وہ آخری مرتبہ آکر اور خدا کی مکمل و محفوظ کتاب دے کر چلا گیا تھا۔ (علیہ التحیۃ والسلام)

جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں، اسلام، صدیوں سے دین کے بجائے مذہب بن چکا ہے۔ ضرورت اس امر کی تھی کہ اُمّت کو بتایا جائے کہ جس مذہب کی تم پیروی کر رہے ہو، وہ دینِ خداوندی نہیں۔ اسلام اسی صورت میں الدین کی شکل اختیار کر سکے گا جب اپنی ایک آزاد مملکت ہو اور اس میں قرآن کی حکمرانی ہو۔ ہمارا زمانہ اس اعتبار سے انتہائی خوش بخت ہے کہ اس میں ایک ایسا دیدہ ور پیدا ہوا جس نے اس فراموش کردہ عظیم حقیقت کو اُمّت کے سامنے پیش کیا۔ یہ تھے حکیم الاُمّت، علامہ اقبالؒ جن کی یاد منانے کے لئے ہم آج یہاں جمع ہوئے ہیں۔ اقبالؒ نے اس قسم کا کوئی دعویٰ نہیں کیا کہ وہ مامور من اللہ ہیں، یا انہیں خدا کی طرف سے الہام ہوتا ہے۔ ایسا دعویٰ ختمِ نبوّت کے منافی اور یکسر باطل تھا۔ انہوں نے واضح الفاظ میں بتایا کہ قرآن کریم پر غور و تدبّر اور اُسوۂ رسول اللہ کے گہرے مطالعہ سے انہوں نے اس حقیقت کو سمجھا ہے جسے وہ اپنی بصیرت کے مطابق قوم کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔ آپ ان کے کلام کو شروع سے اخیر تک دیکھ لیجئے، اس میں روشن روشن پر آپ کو عظمتِ قرآنی کے پھول کھلے دکھائی دیں گے۔ ان کا پیام، قرآنی حقائق ہی کی تشریح و توضیح ہے۔ قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ جب سابقہ انبیاء کرامؑ دین کو اس کی حقیقی شکل میں پیش کرتے تھے تو مذہبی پیشوائیت کی طرف سے اس کی سخت مخالفت ہوتی تھی۔ علامہ اقبالؒ نے دینی مملکت کا تصور پیش کیا اور قائد اعظمؒ نے اس تصور کی عملی تشکیل کے لئے تحریکِ پاکستان کا آغاز کیا۔ نیشنلسٹ علماء کی طرف سے اس تحریک کی مخالفت لازمی تھی کیونکہ ان کے پیشِ نظر تو اسلام کا وہی تصور تھا جس میں اعتقادات، عبادات اور شخصی قوانین کی آزادی ہو اور پبلک لاز، مغرب کے جمہوری انداز سے وضع کئے جائیں۔ ان کا اسلام کے متعلق یہی تصور تھا جس پر، جامع انداز میں تنقید کرتے ہوئے اقبالؒ نے کہا تھا کہ :

مُلّا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

اسلام تو اسی صورت میں آزاد ہو سکتا ہے کہ جملہ قوانینِ مملکت، کتاب اللہ کی حدود کے اندر رہتے ہوئے متعین کئے جائیں اور یہ، اپنی آزاد مملکت کے بغیر ممکن نہیں۔ اسلامی نظام کا یہ تصور، اُمّت کی نگاہوں سے صدیوں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ اسی حقیقت کو واضح کرنے کے لئے علامہ اقبالؒ نے کہا تھا کہ :

منزل و مقصودِ قرآں دیگر است — رسم و آئینِ مسلماں دیگر است

قرآن کا نصب العین۔ اس کی منزل۔ اس کا منتہیٰ۔ اس کا مقصود کچھ اور ہے اور مسلمانوں کا اسلام کا تصور، ان کے رسوم و مناسک، ان کا شعارِ زندگی، ان کا آئینِ حیات کچھ اور۔ یہ دونوں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ؎

بندۂ مومن ز قرآں بر نخورد — در ایاغ او نہ مے دیدم، نہ دُرد

اصل یہ ہے کہ اُمّتِ مسلمہ نے قرآن کریم کے نخلِ حیات کا پھل کھایا ہی نہیں۔ یہ وجہ ہے کہ اس کے ساغرِ زندگی میں، قرآن کی شرابِ طہور تو ایک طرف، اس کا تہ جرعہ تک بھی دکھائی نہیں دیتا۔ کیا یہ حقیقت انتہائی تعجب انگیز اور حیرت افزا نہیں کہ: ؎

خود طلسمِ قیصر و کسریٰ شکست — خود سرِ تختِ ملوکیت نشست

وہ قوم جس نے قیصر و کسریٰ کی ملوکیت کو نیست و نابود کر دیا۔ اس کے بعد، وہ خود تختِ ملوکیت پہ چھا کہ اس پر مسند نشین ہو گئی اور پھر: ؎

تا نہالِ سلطنت قوت گرفت — دینِ او نقش از ملوکیت گرفت

جب نظامِ ملوکیت محکم ہو گیا تو دین، تمام تر اسی کے رنگ میں رنگا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ——— آفرید شرع و آئینے دگر ——— اسلام کی جگہ ایک مذہب، ایک نئی شریعت وجود میں آ گئے۔ اب اس کا علاج یہ ہے کہ ——— اندکے با نورِ قرآں درنگر۔

یہی تھا وہ "نورِ قرآن" جس کی روشنی میں علامہ اقبالؒ نے اسلامی مملکت کے بنیادی تصورات نہایت واضح الفاظ میں پیش کئے۔ آج کی نشست میں۔ میں اس کے مختصر سے خط و خال آپ کے سامنے پیش کروں گا۔ اس ضمن میں۔ ان کے سات لیکچروں کے مجموعہ میں سے چھٹا خطبہ، اور ۱۹۳۰ء کے مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ الٰہ آباد کا خطبۂ صدارت، خاص طور پر قابلِ توجہ ہیں، میری یہ تصریحات بیشتر انہی کے اقتباسات پر مشتمل ہیں۔

آپ نے ۱۹۳۰ء کے خطبۂ صدارت کا آغاز ان الفاظ سے کیا:

الٰہ آباد کا خطبۂ صدارت

"آپ حضرات نے آل انڈیا مسلم لیگ کی صدارت کے لئے ایک ایسے شخص کو منتخب کیا ہے جو یہ عقیدہ رکھتا ہے

اور اپنے اس عقیدہ میں مایوسی کا کوئی شائبہ نہیں پاتا کہ اسلام ایک زندہ اور پائندہ قوت ہے جو انسانی نگاہ کو جغرافیائی حدود و قیود کے قفس سے آزاد کر کے اسے اس کی فطری وسعتوں میں اذن بال کشائی دے گا۔ جس کا عقیدہ یہ ہے کہ دین، انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں ایک اہم ترین قوت کا حامل ہے اور جسے اس کا محکم یقین ہے کہ اسلام خود تقدیر الٰہی ہے۔ زمانہ کی تقدیریں اس کے ہاتھ میں رہیں گی، اور اس کی تقدیر کسی کے ہاتھ میں نہیں ہوگی۔ ایسا شخص مجبور ہے کہ تمام مسائل کو اپنے خاص زاویۂ نگاہ سے دیکھے۔ یہ ہرگز نہ خیال فرمائیے کہ جس مسئلہ کی طرف میں اشارہ کر رہا ہوں وہ کوئی نظری مسئلہ ہے۔ نہیں۔ یہ تو ایک زندہ اور عملی مسئلہ ہے جو خود نفس اسلام پر بحیثیت ایک نظام حیات و عمل کے اثر انداز ہوگا۔ اس مسئلہ کے صحیح اور مناسب حل پر ہی اس امر کا انحصار ہے کہ آپ حضرات ہندوستان میں ایک ممتاز تہذیب کے علمبرداروں کی حیثیت سے زندہ رہ سکیں گے۔"

اس تمہید کے بعد انہوں نے، مذہب اور دین کے فرق کو ان الفاظ میں نمایاں کیا۔ فرمایا:-

"حقیقت یہ ہے کہ اسلام، خدا اور بندے کے درمیان ایک روحانی واسطہ کا نام نہیں۔ یہ ایک نظام حکومت ہے جس کی ہیئت ترکیبی میں یہ صلاحیت رکھی گئی ہے کہ وہ ہر عمل خیر کو اپنے اندر جذب کر لے۔ اس نظام کا تعین اس وقت ہو چکا تھا جب کسی روسو کے دماغ میں ایسے نظام کا خیال تک بھی نہیں آیا تھا۔ اس نظام کی بنیاد ایک ایسے اخلاقی نصب العین پر رکھی گئی ہے جس کی رو سے انسان جمادات اور نباتات کی طرح پابگل مخلوق نہیں سمجھا جاتا کہ اس کو کبھی اس خطۂ زمین سے منسوب کر دیا اور کبھی اس سے۔ بلکہ وہ ایک ایسی روحانی ہستی سمجھا جاتا ہے جس کی صحیح قدر و قیمت اس وقت معلوم ہوتی ہے جب وہ ایک خاص معاشرتی نظام کی مشینری میں اپنی جگہ فٹ ہو۔ وہ ایک فعال مشینری کا پرزہ ہوتا ہے اور اسے ٹھیک انداز میں چلانے کے لئے اس پر حقوق و فرائض کی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔"

اس نظری بحث کے بعد وہ اس عملی سوال کی طرف آئے جس کے لئے یہ تمہید اٹھائی گئی تھی۔ اس ضمن میں انہوں نے کہا:-

"ہندوستان دنیا بھر میں سب سے بڑا اسلامی ملک ہے۔ اس ملک میں اسلام بحیثیت ایک تمدنی قوت کے اسی صورت میں زندہ رہ سکتا ہے کہ اسے ایک مخصوص علاقہ میں مرکوز کر دیا جائے۔

مسلمانانِ ہند کے اس زندہ اور جاندار طبقہ میں، کہ جس کے بل بوتے پر یہاں برطانیہ کی حکومت قائم ہے، (باوجودیکہ برطانیہ نے ان سے کبھی منصفانہ برتاؤ نہیں کیا) اگر یوں ایک مرکزیت قائم کر دی جائے تو یہ آخر الامر نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام ایشیا کی گتھیاں سلجھا دے گا۔"

اس کی مزید وضاحت کرتے ہوئے انہوں نے کہا:۔

"تنہا ایک ملک میں سات کروڑ[1] فرزندانِ توحید کی جماعت کوئی معمولی چیز نہیں۔ تمام مسلم ایشیا کے ممالک مجموعی طور پر بھی اسلام کے لئے اتنی گراں بہا متاع نہیں جتنی اکیلے ہندوستان کی ملتِ اسلامیہ۔ اس لئے ہمیں ہندوستان کے مسئلہ کو صرف اس نقطۂ نگاہ سے نہیں دیکھنا چاہئے کہ ہندوستان میں اسلام کا کیا حشر ہوگا بلکہ اپنی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے اس نقطۂ خیال سے بھی کہ ہماری موت اور حیات کا عالمِ اسلام پر کیا اثر ہوگا۔"

اُن کی بصیرت نے یہاں تک کہہ دیا کہ :۔

"مجھے تو کچھ ایسا نظر آتا ہے کہ مستقبل قریب میں ہندوستان میں شاید ایسے خطرناک حالات پیدا ہو جائیں کہ مسلمانوں کو اپنا جداگانہ محاذ قائم کر کے ان کا مقابلہ کرنا پڑے۔"

سچ کہا تھا اس دیدہ ور نے کہ :۔

حادثہ وہ جو ابھی پردۂ افلاک میں ہے　　عکس اس کا میرے آئینۂ ادراک میں ہے

اس وقت کے حالات کے مطابق اس مسئلہ کا انہوں نے عملی حل یہ بتایا کہ :۔

پاکستان کا ہیولیٰ

"میری آرزو یہ ہے کہ پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک واحد ریاست قائم کی جائے..... مجھے تو یہ نظر آتا ہے کہ شمالی مغربی ہندوستان میں ایک متحدہ اسلامی ریاست کا قیام کم از کم اس علاقہ کے مسلمانوں کے مقدر میں لکھا جا چکا ہے۔"

اس مملکت کے قیام سے ہوگا کیا؟ فرمایا کہ :۔

"اس سے اسلام کو اس امر کا موقعہ ملے گا کہ وہ ان اثرات سے آزاد ہو کر جو عربی ملوکیت کی وجہ سے

---

[1] اس زمانے میں ہندوستان میں مسلمانوں کی اتنی ہی تعداد تھی۔

سے اب تک اس پہ قائم ہیں اس جمود کو توڑ ڈالے جو اس کی تہذیب و تمدن، شریعت اور تعلیم پر صدیوں سے طاری ہے۔ اس سے نہ صرف ان کی صحیح معنوں میں تجدید ہو سکے گی بلکہ وہ زمانہ حال کی رُوح سے بھی قریب تر ہو جائیں گے۔"

اسی حقیقت کو انہوں نے اپنے خطبات تشکیل جدید (کے چھٹے خطبہ) میں سعید حلیم پاشا (مرحوم) کی ہمنوائی میں، ان الفاظ میں بیان کیا تھا کہ :-

"اندریں حالات ہمارے لئے کشادکار کی ایک ہی راہ ہے۔ اور وہ یہ کہ آئینۂ اسلام پہ غیر اسلامی زنگ کی جو سختہ اور درشت تہیں جم گئی ہیں، اور جس کی وجہ سے اس کا حرکیاتی اور ارتقائی نظریہ یکسر جامد ہو کر رہ گیا ہے، انہیں طرح طرح کر الگ کیا جائے، اور حریت، سالمیت اور مساوات کی حقیقی اقدار کو از سر نو زندہ کر کے، ان کی بنیادوں پر اپنے اخلاقی، عمرانی اور سیاسی نظام کی تشکیل جدید کی جائے جو حقیقی اسلام کی سادگی اور آفاقیت کا آئینہ دار ہو۔"

آپ نے غور فرمایا کہ علامہ اقبال رح نے مملکت پاکستان کا جو نظریہ اور تصور پیش کیا تھا اس کی غرض و غایت اور منتہا و مقصود کیا تھا؟ انہوں نے یہ تصور ۱۹۳۰ء میں پیش کیا تھا۔ (اگرچہ خطبات تشکیل جدید اس سے بھی دو سال پہلے دیئے گئے تھے) حقیقت یہ ہے کہ علامہ اقبال رح کا سارا کلام اور پیام انہی تصورات کی توضیح و تشریح ہے۔

اسلامی مملکت کی بنیادی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ اس میں ایک، واحد اور غیر منقسم اُمّت ہوتی ہے جو دین کے اشتراک کی بناء پر وجود میں آتی ہے۔ اس میں نہ مذہبی فرقے ہوتے ہیں، نہ سیاسی پارٹیاں۔ اس مملکت یا اُمّت کا ایک ضابطۂ قوانین ہوتا ہے جس کا اطلاق تمام مسلمانوں پر یکساں ہوتا ہے۔ اس میں نہ پرسنل لاز اور پبلک لاز کی تمیز و تفریق ہوتی ہے اور نہ ہی کوئی گروہ اس کا مطالبہ کر سکتا ہے کہ وہ اپنی الگ فقہ کی پیروی کرے گا۔ ایک مملکت کے اندر الگ الگ ضوابط قانون کی پیروی تو مملکت کے خلاف بغاوت کے مترادف ہوتی ہے جسے کبھی برداشت نہیں کیا جا سکتا۔

واحد ضابطۂ قوانین

لیکن جب مملکت کی تشکیل کا نظریہ علامہ اقبال رح نے پیش کیا تھا، ظاہر ہے (اور انہیں اس کا علم تھا) کہ اس میں مسلمانوں کے متعدد

فرقے ہوں گے۔ سوال یہ تھا کہ اس مملکت میں ایسا ضابطۂ قوانین مرتّب کس طرح ہو سکے گا جس کا اتباع تمام مسلمان یکساں طور پر کریں۔ سیکولر حکومت میں تو یہ مسئلہ بڑا آسان ہوتا ہے اس میں مختلف مذاہب یا ایک ہی مذہب کے مختلف فرقوں کے پیروؤں کو، اپنے اپنے پرسنل لاز کی آزادی ہوتی ہے اور مملکت کے پبلک لاز کے وضع کرنے میں کسی مذہب کو دخل نہیں ہوتا۔ اس لئے ان کا اطلاق تمام باشندوں پر یکساں ہوتا ہے۔ لیکن اسلامی مملکت تو سیکولر نہیں ہوتی۔ اس میں اس قسم کی تفریق کا تصور ہی نہیں ہو سکتا۔ اگر آپ بنظرِ غائر دیکھیں تو یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ ہندوستان کے نیشنلسٹ علماء کے سرخیل (مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم) اور علامہ اقبالؒ کے درمیان مشہور معرکہ "مملکت کے اسی (دو) جداگانہ تصورات کا پیدا کردہ تھا۔ نیشنلسٹ علماء سیکولر حکومت کے مؤید تھے اور علامہ اقبالؒ اسے اسلام کے یکسر خلاف قرار دیتے تھے۔ ان کے نزدیک مسلمانوں کے لئے ایک الگ مملکت کے مطالبہ کی بنیاد ہی یہ تھی کہ وہ ہندوستان کی سیکولر حکومت کو خلافِ اسلام سمجھتے تھے۔ ان تصریحات سے آپ کے سامنے یہ حقیقت آگئی ہو گی کہ علامہ اقبالؒ نے جب اسلامی مملکت کا تصور پیش کیا تو ان کے سامنے بنیادی اور اہم ترین سوال یہ تھا کہ اس مملکت میں ایسا ضابطۂ قوانین کس طرح مرتب ہو گا جس میں پرسنل اور پبلک لاز کی تفریق نہیں ہو گی اور جس کا اطلاق تمام مسلمانوں پر یکساں ہو گا۔ انہوں نے اپنے خطبات تشکیلِ جدید کے چھٹے خطبہ میں اس نہایت اہم اور نازک ترین مسئلہ پر بڑی تفصیل سے بحث کی ہے۔ میں اس خطبہ کے ضروری اقتباسات پیشِ خدمتِ ناظرین کرنا چاہتا ہوں۔

—— ×· ——

نفسیاتی تغیر — شرطِ اوّل

لیکن کسی مملکت میں قرآنی قوانین و احکام کو میکانکی طور پر نافذ کر دینے سے وہ مملکت اسلامی نہیں بن جاتی۔ مملکت کے اسلامی بننے کی اوّلین شرط یہ ہے کہ اس کے افراد میں حکمتِ قرآنی کے مطابق نفسیاتی تبدیلی واقع ہو۔ ان کے قلب و دماغ میں قرآنی خطوط پر تغیر رونما ہو۔ یہ شرط خود قرآنِ مجید کی عاید کردہ ہے جب وہ کہتا ہے کہ: اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ‌ؕ (۱۳:۱۱) "کسی قوم کی حالت کو، کوئی اور تو ایک طرف، خود خدا بھی نہیں بدلتا جب تک وہ قوم اپنے اندر نفسیاتی تغیر نہ پیدا کر لے"۔ علامہ اقبالؒ کا سارا پیغام، اسی تغیرِ نفس کی شرح ہے جسے وہ تعمیر و استحکام خودی سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ وہ موضوع ہے جس پر ایک مستقل تصنیف کی ضرورت ہے۔ وہ (جاوید نامہ) میں کہتے ہیں کہ :-

فاش گویم آنچہ در دل مضمر است ۔۔۔ ایں کتابے نیست، چیزے دیگر است
چوں بجاں در رفت، جاں دیگر شود ۔۔۔ جاں چو دیگر شد، جہاں دیگر شود

"چوں بجاں در رفت" سے مراد، قرآنی حکمت کے مطابق نفسیاتی تبدیلی ہے۔ خارجی تبدیلی اسی داخلی تبدیلی کے مطابق رونما ہوتی ہے۔ اسی کو وہ فاش تر الفاظ میں یوں بیان کرتے ہیں کہ: ؎

تیرے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب ۔۔۔ گرہ کشا ہے نہ رازی، نہ صاحبِ کشاف

(بالِ جبریل)

انسانی ضمیر پہ "نزولِ کتاب" سے مراد بھی، قرآن کے مطابق تغیرِ نفس ہے۔ یہ مقصد، قرآنی حقائق کو اس طرح تعلیم و تربیت کی بنیاد بنا دینے سے حاصل ہو سکتا ہے کہ اس سے افرادِ ملت کا قلب و دماغ قرآنی سانچے میں ڈھل جائے۔ اسی لئے وہ قرآن کے متعلق کہتے ہیں کہ:

آنچہ حق می خواہد، آں سازد ترا

وہ تجھے ویسا انسان بنا دیتا ہے جیسا انسان خدا چاہتا ہے۔ اور یہ مقصد احکامِ قرآنیہ کو میکانکی طور پر نافذ کرنے سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ اسی لئے وہ کہتے ہیں کہ:

نیست ایں کارِ فقیہاں اے پسر

یہ بات قانون سازوں کے بس کی نہیں، جیسا کہ کہا جا چکا ہے، یہ مقصد قرآنی خطوط پہ تعلیم و تربیت ہی سے حاصل ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آغازِ نبوت ہی سے حضور نبی اکرم کا فریضہ ۔۔۔ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ (۲/۱۲۹) قرار دے دیا گیا تھا۔ یعنی آپؐ، کتاب و حکمت کی تعلیم سے ان کی تعمیرِ خودی کرتے تھے۔ تشکیلِ مملکت کا مرحلہ تو اس سے کہیں بعد جا کر آیا تھا۔ اور قرآنی مملکت قائم بھی انہی افراد کے ہاتھوں ہو سکتی تھی جن میں اس قسم کا نفسیاتی تغیر پیدا ہو چکا ہو۔ حضورؐ کی تیرہ سالہ مکی زندگی اسی پروگرام کی پہلی کڑی تھی۔

لیکن مملکت کا کاروبار تو بہر حال قوانین کی رُو ہی سے چلتا ہے۔ اس لئے اسلامی مملکت میں قانون سازی کا مسئلہ بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے، اور علامہ اقبالؒ نے بڑی شرح و بسط سے اس پر گفتگو کی ہے۔ اصولی طور پہ وہ باصرار و تکرار اس حقیقت کو دہرائے جاتے ہیں کہ اسلامی مملکت کے آئین و قوانین کی بنیاد قرآن کریم ہوگا۔ وہ اپنی پہلی مثنوی (اسرار و رموز) میں کہتے ہیں کہ: ؎

ہیچ می دانی کہ آئینِ تو چیست ۔۔۔ زیرِ گردوں سرِ تمکینِ تو چیست

آں کتابِ زندہ قرآنِ حکیم — حکمتِ او لایزال است و قدیم

قرآن کا انداز

لیکن قرآن کریم کا انداز یہ ہے کہ اس نے (بجز چند احکام) اصول اور حدود متعین کر دیئے ہیں اور جزوی اور تفصیلی قوانین خود ہی مقرر نہیں کر دیئے۔ اسے اس کتاب کی وارث اُمت (یعنی ان کی مملکت) پر چھوڑا ہے کہ وہ ان حدود کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے، تفصیلی قوانین خود وضع کرے۔ یہ حدود و اصول تو ہمیشہ غیر متبدل رہیں گے لیکن ان کے اندر وضع کردہ قوانین میں، زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے مطابق، تبدیلی کی جا سکے گی۔

جس کتاب کو تمام زمانوں اور تمام قوموں کے لئے ابدی اور غیر متبدل ضابطۂ راہ نمائی قرار پانا ہوا سے ایسا ہی ہونا چاہیئے تھا۔ اسلامی مملکت کے لئے قانون سازی کا یہ وہ بنیادی نکتہ ہے جسے علامہ اقبالؒ نے بڑی شد و مد سے دُہرایا ہے۔ وہ خطبات تشکیلِ جدید (کے چھٹے خطبے میں) کہتے ہیں:۔

ثبات و تغیّر کا امتزاج

"اسلام کا پیش کردہ تصوّر یہ ہے کہ حیاتِ کلّی کی روحانی اساس، ازلی اور ابدی ہے لیکن اس کی نمود تغیّر و تنوّع کے پیکروں میں ہوتی ہے۔ جو معاشرہ حقیقتِ مطلقہ کے متعلق اس قسم کے تصوّر پر متشکّل ہو، اس کے لئے ضروری ہو گا کہ وہ اپنی زندگی میں مستقل اور تغیّر پذیر (جیسے متضاد عناصر) میں تطابق و توافق پیدا کرے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ اُس کے پاس، اپنی اجتماعی زندگی کے نظم و ضبط کے لئے مستقل اور ابدی اصول ہوں۔ اس لئے کہ اس دنیا میں جہاں تغیّر کا دَور دَورہ ہے۔ ابدی اصول ہی وہ محکم سہارا بن سکتے ہیں جن پر انسان اپنا پاؤں ٹکا سکے۔ لیکن اگر ابدی اصولوں کے متعلق یہ سمجھ لیا جائے کہ ان کے دائرہ میں تغیّر کا امکان ہی نہیں۔ وہ تغیّر جسے قرآن نے عظیم آیات اللہ میں شمار کیا ہے — تو اس سے زندگی، جو اپنی فطرت میں متحرک واقع ہوئی ہے، یکسر جامد و متصلّب بن کر رہ جائے گی۔ یورپ کو عمرانی اور سیاسی علوم میں جو ناکامی ہوئی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے ہاں کوئی ابدی اور غیر متبدّل اصولِ حیات نہیں تھے۔ اس کے برعکس، گزشتہ پانچ سو سال میں اسلام جس قدر جامد اور غیر متحرک بن کر رہ گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے مستقل اقدار کے دائرے میں اصولِ تغیّر کو نظر انداز کر رکھا ہے۔ لہٰذا دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ اسلام کی وضع اور ترکیب میں کون سا اصولِ حرکت کارفرما ہے؟ یہ وہی اصول ہے جسے اجتہاد کہتے ہیں"۔

اس کے بعد وہ اس خطبہ میں مسئلہ اجتہاد پر بڑی تفصیل سے گفتگو کرتے ہیں۔ وہ اجتہادِ مطلق کو اسلام کا بنیادی

اصول قرار دیتے ہیں ۔ یعنی قرآنی حدود کے اندر رہتے ہوئے قانون سازی کا کُلّی اختیار ۔ وہ اس اجتہاد کے متعلق بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"سُنّی حضرات ، نظری طور پر تو اس کے قائل ہیں کہ اس قسم کا اجتہاد ممکن ہے ۔ لیکن آئمہ فقہ کے مذاہب کے قیام کے بعد عملاً اس کا دروازہ بند ہے ۔ اس لئے کہ اس قسم کے اجتہاد کے لئے جن شرائط کو ضروری قرار دیا جاتا ہے ، ان کا پورا کرنا کسی ایک فرد کے لئے قریب قریب ناممکن ہے ۔ ایک ایسے نظامِ شریعت میں ، جس کی بنیاد قرآن پر ہو جو زندگی کے متعلق حرکیاتی اور ارتقائی نصور کا علمبردار ہے ۔ اس قسم کی ذہنیت کچھ عجیب سی دکھائی دیتی ہے ۔ لہٰذا آگے بڑھنے سے پیشتر یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم ان اسباب و علل کا انکشاف کریں جن کی وجہ سے یہ ذہنیت پیدا ہوئی جس نے قانونِ شریعت کو یکسر منجمد بنا کر رکھ دیا ۔"

میں اس وقت ان اسباب و علل کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتا جنہیں علامہ اقبالؒ نے اس جمود و تعطل کا ذمہ دار گردانا ہے ۔ میں ان میں سے دو ایک اہم نکات پر اکتفا کروں گا ۔ وہ (اپنے اس خطبہ میں) لکھتے ہیں :-

قانون سازی کے لئے قرآنی اصول

" آیئے اب ایک نظر ان اصولوں پر ڈالیں جو قرآن نے قانون سازی کے سلسلہ میں دیئے ہیں ۔ ان پر غور کرنے سے یہ حقیقت واضح ہو جائیگی کہ ان اصولوں کی رُو سے یہ قطعاً نہیں ہوتا کہ انسانی فکر سلب ہو جائے اور قانون سازی کے لئے کوئی میدان ہی نہ رہے ۔ اس کے برعکس ، ان اصولوں میں جس قدر وسعت رکھی گئی ہے اس سے انسانی فکر بیدار ہوتی ہے ۔ یہی وہ اصول تھے جن کی راہ نمائی سے ہمارے قدیم فقہا نے ، قانونِ شرعی کے متعدد نظام (سسٹم) مرتب کئے ۔ اور تاریخ اسلام کا طالب علم اس حقیقت سے واقف ہے کہ سیاسی اور معاشرتی نظام زندگی کی حیثیت سے اسلام کو جو اس قدر کامیابی حاصل ہوئی تو اس کا کم از کم آدھا حصہ انہی فقہا کی بالغ نظری کا رہین منت تھا ۔ چنانچہ فان کریمر اس ضمن میں لکھتا ہے کہ :-

"رومیوں کو چھوڑ کر دنیا میں سوائے عربوں کے اور کوئی قوم ایسی نہیں جس کے پاس اس قدر احتیاط سے مرتب کردہ قانونی نظام ہو ۔"

لیکن اس تمام ہمہ گیری کے باوجود، یہ قانونی ضوابط بالآخر انفرادی تعبیرات کا مجموعہ ہیں۔ اس لئے انہیں حتمی اور قطعی سمجھ لینا غلط ہے۔ مجھے اس کا علم ہے کہ علمائے اسلام کا یہ عقیدہ ہے کہ ہمارے مذاہب اربعہ اپنی اپنی جگہ مکمل اور مختتم ہیں۔ لیکن نظری طور پر اجتہادِ مطلق کے امکان سے انہیں کبھی کبھی انکار نہیں ہوا۔ میں نے (پچھلے صفحات میں) ان اسباب وعلل سے بحث کی ہے جو علماء کی اس ذہنیت کا موجب بنے۔ لیکن چونکہ اب حالات بدل چکے ہیں، اور دنیائے اسلام ان تمام نئی نئی قوتوں سے دوچار اور متاثر ہے جو زندگی کے مختلف گوشوں میں فکرِ انسانی کی نشوو ارتقاء سے وجود میں آگئی ہیں، اس لئے مجھے کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ اس قدامت پرستانہ ذہنیت کو باقی رکھا جائے۔ میں پوچھتا ہوں کہ کیا ان مذاہب فقہ کے بانیوں میں سے کسی نے بھی اپنی تعبیرات وتاویلات کو کبھی قطعی، کامل، مختتم اور سہو وخطا سے مبرّیٰ سمجھا؟ کبھی نہیں۔ اس لئے اگر دورِ حاضر کے اعتدال پسند مسلمان، زمانے کے بدلے ہوئے حالات اور اپنے تجربہ کی روشنی میں، فقہ کے اصولِ اساسی کی نئی تعبیرات کرنا چاہتے ہیں تو ان کا یہ طرزِ عمل میرے خیال میں بالکل بجا اور درست ہے۔ خود قرآن کی یہ تعلیم کہ حیات ایک ترقی پذیر عمل ارتقاء ہے، اس کا مقتضی ہے کہ ہر نئی نسل کو اس کا حق ہونا چاہیئے کہ وہ اپنی مشکلات کا حل خود تلاش کرے۔ وہ ایسا کرنے میں سلف کے علمی سرمایہ سے راہ نمائی لے سکتے ہیں لیکن اسلاف کے فیصلے ان کے راستے میں روک نہیں بن سکتے۔"

وہ اس قسم کی ماضی پرستی کو تاریخ کا جھوٹا احترام قرار دیتے ہیں۔ اس ضمن میں وہ کہتے ہیں کہ:-

"قوموں کے زوال کا علاج ان کے ماضی کی تاریخ کے جھوٹے احترام اور اس کے مصنوعی احیاء سے نہیں ہوسکتا، جیسا کہ دورِ حاضر کے ایک مصنف نے لکھا ہے کہ:-

> "تاریخ کا فیصلہ یہ ہے کہ وہ خیالات اور نظریات جو اپنی توانائی کھو کر فرسودہ ہوچکے ہوں، ان لوگوں میں کبھی پھر سے توانائی حاصل نہیں کرسکتے، جنہوں نے انہیں فرسودہ بنا دیا ہو۔"

تیرہویں صدی اور اس کے بعد کے علماء کا یہ رجحان کہ ماضی کی جھوٹی تقدیس سے جماعتی نظم کو جامد اور متصلب طور پر قائم رکھا جائے، اسلام کی روح کے یکسر خلاف تھا۔"

اور اس نکتہ کی تشریح کرتے ہوئے کہتے ہیں:-

"اسلام میں اجتہاد کا دروازہ بند کر دینا، اسلام کے خلاف افتراء ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہوئی کہ مسلمانوں میں قانون کے تصور نے ایک خاص معین شکل اختیار کر لی اور ایک وجہ یہ کہ قوموں کے زوال کے زمانہ میں ذہنوں میں اس قدر جمود اور تساہل پیدا ہو جاتا ہے کہ بڑے بڑے مفکرین کو (انسان سمجھنے کے بجائے) معبود بنا دیا جاتا ہے۔ اگر علمائے متاخرین میں سے بھی بعض نے اس "افتراء" کو برقرار رکھا ہے تو وہ ان کا اپنا فعل ہے۔ دورِ حاضر کا مسلمان اس کا پابند نہیں کہ جس طرح انہوں نے برضا و رغبت اپنی فکری آزادی کو (اپنے خود ساختہ معبودوں کی) نذر کر دیا تھا۔ یہ بھی اپنی آزادی کو سلب ہو جانے دیں۔ علامہ سرخسیؒ (دسویں صدی میں) لکھتے ہیں :-

اگر اس افتراء کے حامی یہ سمجھتے ہیں کہ پہلے زمانے کے مفکرین و مصنفین کو زیادہ سہولتیں حاصل تھیں، اور ان کے مقابلہ میں متاخرین کے راستے میں بہت سی دشواریاں ہیں، تو ایسا سمجھنا سراسر حماقت ہے۔ اس لئے کہ اس معمولی سی بات کے سمجھنے کے لئے کسی افلاطون کی عقل کی ضرورت نہیں کہ متقدمین کے مقابلہ میں متاخرین کے لئے اجتہاد زیادہ آسان ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اب قرآن اور سنت کی اس قدر تفسیریں اور شرحیں لکھی جا چکی ہیں کہ ہمارے زمانے کے مجتہد کے پاس، تعبیرات کے لئے کافی سے زیادہ مسالہ موجود ہے (جو متقدمین کے پاس نہیں تھا۔)"

ان تصریحات سے واضح ہے کہ علامہ اقبالؒ کے نزدیک، مروجہ فقہ (خواہ وہ کسی فرقہ کی فقہ ہو) ناقابلِ تغیر نہیں۔ اس میں قرآن کی روشنی میں، موجودہ زمانے کے تقاضوں کے مطابق، تبدیلیاں ازبس ضروری اور ناگزیر ہیں۔ لیکن ایسا کہتے وقت وہ اس حقیقت سے بھی بے خبر نہیں تھے کہ :-

"بدقسمتی سے ہمارے ہاں کا قدامت پرست طبقہ فقہ کے متعلق کسی ناقدانہ گفتگو کے لئے تیار نہیں۔ اگر اس قسم کی بحث چھیڑی جائے تو بہت سے لوگوں کے لئے ناگواری کا باعث ہو جائے گی۔"

لیکن انہوں نے کہا کہ :-

"بایں ہمہ، میں مسئلہ زیرِ نظر کے متعلق چند معروضات پیش کرنے کی جسارت ضرور کروں گا۔

سب سے پہلے ہمیں اس حقیقت کو پیش نظر رکھنا چاہیے کہ قرن اوّل سے لے کر عباسیوں کے زمانے کے آغاز تک مسلمانوں میں قرآن کے سوا کوئی تحریری قانون موجود نہیں تھا۔"

علامہ اقبالؒ کی یہی عبارت تھی جس کی وجہ سے وہ ارباب دانش کی نگاہوں میں اس قدر واجب التکریم و تحریم بن گئے تھے۔ خود انہی کے الفاظ میں :-

آئینِ جواں مرداں، حق گوئی و بے باکی　　اللہ کے شیروں کو آتی نہیں رُوباہی

یہاں تک بحث فقہ کے متعلق تھی۔ لیکن اس سے کہیں نازک مقام وہ ہے جہاں احادیث کا سوال سامنے آتا ہے۔ فقہ کی نسبت تو پھر بھی غیر از انبیاء حضرات کی طرف ہوتی ہے۔ لیکن جب بات ان ارشادات و اعمال کے متعلق ہو جن کی نسبت رسول اللہ کی طرف جائے، تو ان کی بابت یہ کہنا کہ اسلامی مملکت ان میں بھی تبدیلی کر سکتی ہے، بہت بڑی جرأت کا متقاضی ہے۔ مبدارِ فیض کی یہ انتہائی کرم گستری تھی کہ اس نے علامہ اقبالؒ کو اس قسم کی جرأت و بسالت سے بھی نوازا تھا۔ چنانچہ انہوں نے اس سوال پر بھی (اپنے خطبہ میں) بڑی تفصیلی گفتگو کی ہے۔ اس باب میں وہ لکھتے ہیں :-

احادیث کی قانونی حیثیت

"احادیث کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جن کی حیثیت قانونی ہے اور دوسری وہ جو قانونی حیثیت نہیں رکھتیں۔ اوّل الذکر کے بارے میں ایک بڑا اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کس حد تک ان رسوم و رواج پر مشتمل ہیں جو اسلام سے پہلے عرب میں رائج تھے اور جن میں سے بعض کو رسول اللہ نے علیٰ حالہٖ رکھا اور بعض میں ترمیم فرما دی۔ آج یہ مشکل ہے کہ ان چیزوں کو پورے طور معلوم کیا جا سکے کیونکہ ہمارے متقدمین نے اپنی تصانیف میں زمانہ قبل از اسلام کے رسوم و رواج کا زیادہ ذکر نہیں کیا۔ نہ ہی یہ معلوم کرنا ممکن ہے کہ جن رسوم و رواج کو رسول اللہ نے علیٰ حالہٖ رکھا (خواہ اُن کے لئے واضح طور پر حکم دیا ہو یا ویسے ہی ان کا استصواب فرما دیا ہو)۔ انہیں ہمیشہ کے لئے نافذ العمل رکھنا مقصود تھا۔ اس موضوع پر شاہ ولی اللہؒ نے بڑی عمدہ بحث کی ہے جس کا خلاصہ میں یہاں بیان کرتا ہوں۔ شاہ صاحب نے کہا ہے کہ پیغمبرانہ طریق تعلیم یہ ہوتا ہے کہ رسولؐ کے احکام ان لوگوں کے عادات و اطوار اور رسوم و رواج کو خاص

طور پر ملحوظ رکھتے ہیں جو اس کے اوّلین مخاطب ہوتے ہیں۔ پیغمبر کی تعلیم کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ وہ عالمگیر اصول عطا کر دے لیکن نہ تو مختلف قوموں کے لئے مختلف اصول دیئے جا سکتے ہیں اور نہ ہی انہیں بغیر کسی اصول کے چھوڑا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے مسلکِ زندگی کے لئے جس قسم کے اصول چاہیں وضع کر لیں۔ لہٰذا پیغمبر کا طریق یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک خاص قوم کو تیار کرتا ہے اور انہیں ایک عالمگیر شریعت کے لئے بطور خمیر استعمال کرتا ہے۔ اس مقصد کے لئے وہ ان اصولوں پر زور دیتا ہے جو تمام نوعِ انسانی کی معاشرتی زندگی کو اپنے سامنے رکھتے ہیں لیکن ان صولوں کا نفاذ اس قوم کے عادات و خصائل کی روشنی میں کرتا ہے جو اس وقت اس کے سامنے ہوتی ہے۔ اس طریق کار کی رُو سے رسول کے احکام، اس قوم کے لئے خاص ہوتے ہیں اور چونکہ ان احکام کی ادائیگی بجائے خویش مقصود بالذّات نہیں ہوتی، انہیں آنے والی نسلوں پر من وعن نافذ نہیں کیا جا سکتا۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ امام اعظم ابو حنیفہؒ نے (جو اسلام کی عالمگیریت کی خاص بصیرت رکھتے تھے) اپنی فقہ کی تدوین میں حدیثوں سے کام نہیں لیا۔ انہوں نے تدوینِ فقہ میں استحسان کا اصول وضع کیا جس کا مفہوم یہ ہے کہ قانون وضع کرتے ہوئے اپنے زمانے کے تقاضوں کو سامنے رکھنا چاہیئے۔ اس سے احادیث کے متعلق ان کے نقطۂ نظر کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ امام ابو حنیفہؒ نے تدوینِ فقہ میں احادیث سے اس لئے کام نہیں لیا کہ ان کے زمانہ میں احادیث کے کوئی باضابطہ مجموعے مرتب نہیں ہوئے تھے۔ اوّل تو یہ کہنا ہی درست نہیں کہ ان کے زمانے میں احادیث کے مجموعے موجود نہیں تھے۔ امام مالکؒ اور زہریؒ کے مجموعے ان کی وفات سے قریب تیس سال پہلے مرتب ہو چکے تھے۔ لیکن اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ یہ مجموعے امام صاحب تک پہنچ نہیں پائے تھے یا ان میں قانونی حیثیت کی احادیث موجود نہیں تھیں، تو اگر امام صاحب اس کی ضرورت سمجھتے تو وہ احادیث کا اپنا مجموعہ مرتب فرما سکتے تھے۔ جیسا کہ امام مالکؒ اور ان کے بعد امام احمد بن حنبلؒ نے کیا تھا۔ ان حالات کی روشنی میں، میں بھی یہ سمجھتا ہوں کہ ان احادیث کے متعلق جن کی حیثیت قانونی ہے، امام ابو حنیفہؒ کا یہ طرزِ عمل بالکل معقول اور مناسب تھا اور اگر آج کوئی وسیع النظر مقنن یہ کہتا ہے کہ احادیث ہمارے لئے من وعن شریعت کے احکام نہیں بن سکتیں تو اس کا یہ طرزِ عمل امام ابو حنیفہؒ کے طرزِ عمل کے ہم آہنگ ہوگا۔

جن کا شمار فقہ اسلامی کے بلند ترین مقننین میں ہوتا ہے۔"

احادیث کے متعلق امام ابوحنیفہؒ کا یہ طرزِ عمل اور علامہ اقبالؒ کی طرف سے اس کی تائید، قرآن کریم کی تعلیم کے عین مطابق تھی۔ دین کے اصول حضور نبی اکرمؐ کو خدا کی طرف سے بذریعۂ وحی عطا ہوئے تھے۔ ان میں کسی قسم کے تغیر و تبدل کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ لیکن دین کے ان اصولوں پر عمل پیرا ہونے کے طور طریقے، بذریعہ وحی متعین نہیں ہوئے تھے۔ ان کے متعلق حضورؐ کو حکم خداوندی تھا کہ :-

شَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ (۳/۱۵۹) "ان کا تعین اپنے رفقاء کے ساتھ مشورہ سے کیا کرو۔"

اب ظاہر ہے کہ جو امور باہمی مشاورت سے طے ہوں، وہ وحی کی طرح ابدی اور غیر متبدل نہیں ہو سکتے۔ حضورؐ نے بھی ان جزئیات کو صحابہؓ کے ساتھ مشورہ سے طے فرمایا۔ اور حضورؐ کے بعد جماعت مومنین کے متعلق بھی کہا گیا کہ :-

وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ (۴۲/۳۸) "یہ اپنے معاملات باہمی مشاورت سے طے کریں گے۔"

یہ طریقِ عمل دورِ خلافتِ راشدہ میں جاری رہا۔ اس وقت تک یہ بات کسی کے حیطۂ خیال میں بھی نہیں تھی کہ یہ فیصلے ابدی طور پر غیر متبدل رکھے جائیں گے۔ یہ تصور خلافتِ راشدہ کے باقی نہ رہنے کے بعد پیدا ہوا۔

احادیث رسول اللہ ﷺ اور ان کے مطابق صحابہؓ کے عمل) کو ابدی طور پر غیر متبدل قرار دینے کا تصور امام مالکؒ اور ان سے کہیں بڑھ کر امام شافعیؒ نے پیش کیا تھا ——— اس مسلک پر امام ابوحنیفہؒ نے کڑی تنقید کی اور قیاس کو قانون کا ماخذ قرار دیا۔ قیاس سے مراد ہے کسی حکم یا فیصلہ کو عقل و بصیرت کی رُو سے اس سے ملتے جلتے حالات پر منطبق کرنا ——— علامہ اقبالؒ ان کی اس نزاع پر گفتگو کرتے ہوئے امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کے متعلق لکھتے ہیں :-

"انہوں نے اپنے آپ کو صرف ان نظائر کے دائرہ میں محدود کر لیا جو عہدِ رسالتمآبؐ اور عہدِ صحابہؓ میں وقوع میں آئے تھے۔ اس سے ان کی نگاہ کا دائرہ بہت تنگ ہو کر رہ گیا۔ انہوں نے بات تو یہاں سے شروع کی تھی کہ اہمیت ٹھوس واقعات کو حاصل ہے۔ لیکن انہوں نے (ایک خاص دور کے) ٹھوس واقعات کو ابدی اور غیر متبدل سمجھ لیا، اور خاص واقعات سے متعلق احکام کو اس قسم کے ملتے جلتے واقعات پر منطبق کرنے کے لئے قیاس سے شاذ و نادر کام لیا۔ ان کے برعکس، ان کی سخت تنقیدیں مذہبِ حنفیہ کے لیے (ایک اور رنگ میں) بڑی مفید ثابت ہوئیں۔

اس سے انہوں نے محسوس کر لیا کہ اصولِ قانون سازی کی تعبیر میں، زندگی کی حقیقی (واقعاتی) نقل و حرکت اور تنوع کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے۔ یہی وجہ ہے کہ امام ابو حنیفہؒ کا مکتبِ فقہ، جس نے ان مباحث کے نتائج کو اچھی طرح جذب کر لیا تھا، اپنے خاص الخاص اصولِ فقہ میں بالکل آزاد ہے اور دیگر مذاہبِ فقہ و تشریع کے مقابلہ میں، حالات سے مطابقت کی بڑی صلاحیت اپنے اندر رکھتا ہے۔"

اور اس کے بعد وہ کہتے ہیں :-

"لیکن جائے حیرت ہے کہ موجودہ حنفی علماء نے، خود اپنے مکتبِ فقہ کی روح کے خلاف، امام ابو حنیفہؒ اور ان کے رفقاء کے فیصلوں کو ابدی اور غیر متبدل قرار دے رکھا ہے، بعینہٖ اسی طرح جس طرح امام ابو حنیفہؒ پر تنقید کرنے والوں نے ان فیصلوں کو ابدی اور غیر متبدل قرار دے لیا تھا جو عہدِ رسالت مآبؐ اور صحابہؓ میں پیش آمدہ مقدمات کے سلسلہ میں نافذ ہوئے تھے۔"

ان تصریحات سے، عزیزانِ من! یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ علامہ اقبالؒ کے نزدیک اسلامی مملکت میں قانون سازی کا بنیادی اصول یہ تھا کہ ابدی اور غیر متبدل، قرآنی احکام و اصول و حدود ہیں۔ ان حدود کے اندر جو فیصلے ماضی میں کئے گئے تھے، یا جو بعد کی اسلامی مملکت کرے، ان میں تغیر و تبدل کیا جا سکتا ہے۔ لیکن انہیں اس کا بھی بخوبی احساس تھا کہ ایسا کرنے کے لئے بڑی جرأت و بسالت کی ضرورت ہو گی۔ اس باب میں وہ کہتے ہیں کہ:-

روحِ عمریؓ

"وہ سب سے بڑا سوال جو اس وقت اس کے (ترکی کے) اور جو زود یا بدیر دیگر مسلم اقوام کے سامنے آنے والا ہے، یہ ہے کہ اسلامی قوانینِ شریعت میں ارتقاء کی گنجائش ہے یا نہیں؟ یہ سوال بڑا اہم ہے اور بہت بڑی ذہنی جد و جہد کا متقاضی۔ اس سوال کا جواب یقیناً اثبات (ہاں) میں ہونا چاہیئے بشرطیکہ اسلامی دنیا اس کی طرف عمرؓ کی روح کو لے کر آگے بڑھے۔ وہ عمرؓ جو اسلام کا سب سے پہلا تنقیدی اور حریت پسند قلب ہے۔ وہ جسے رسول اللہؐ کی حیاتِ طیبہ کے آخری لمحات میں یہ کہنے کی جرأت نصیب ہوئی کہ:-

حَسْبُنَا کِتَابُ اللّٰہ

"ہمارے لئے خدا کی کتاب کافی ہے"

وہ اپنے اس خطبہ کا خاتمہ ان الفاظ پر کرتے ہیں:-

"اسلام کا بنیادی تخیل یہ ہے کہ اب وحی کا دروازہ بند ہو چکا ہے۔ اس بنا پر ہمیں دنیا کی سب سے زیادہ آزاد قوم ہونا چاہیئے۔ پہلے زمانے کے مسلمان جو ایشیائے قبل از اسلام کی روحانی غلامی سے نئے نئے آزاد ہوئے تھے، اس پوزیشن میں نہیں تھے کہ (ختم نبوت کے) اس بنیادی تخیل کی اہمیت کا صحیح صحیح اندازہ کر سکتے۔ لیکن دورِ حاضر کے مسلمان کو چاہیئے کہ وہ اپنی پوزیشن کو اچھی طرح سے سمجھے۔ (قرآن کے) غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں اپنے معاشرہ کی تشکیلِ جدید کرے۔ اور وہ عالمگیر جمہوریت قائم کر کے دکھا دے جو اسلام کی اصل وغایت ہے لیکن جو ابھی تک پورے طور پر بے نقاب ہو کر دنیا کے سامنے نہیں آئی"۔

ان کے نزدیک اس سوال کو اس قدر اہمیت حاصل تھی کہ انہوں نے اپنے خطبات سے بھی پہلے، امرتسر کے حلقۂ اہلِ قرآن کے متعلق ذکر کرتے ہوئے صوفی غلام مصطفےٰ تبسم کے نام اپنے ایک خط میں لکھا تھا کہ:-

"ضرورت اس امر کی ہے کہ قرآن کے کمال کو علمی طور پر ثابت کیا جائے کہ سیادتِ انسانی کے لئے تمام ضروری قواعد اس میں موجود ہیں اور اس میں فلاں فلاں آیات سے فلاں فلاں قواعد کا استخراج ہوتا ہے نیز جو جو قواعد عبادات یا معاملات کے متعلق (بالخصوص مؤخر الذکر کے متعلق) دیگر اقوام میں اس وقت تک مروج ہیں، ان پر قرآنی نقطۂ نگاہ سے تنقید کی جائے اور دکھایا جائے کہ وہ بالکل ناقص ہیں اور ان پر عمل کرنے سے نوعِ انسانی کبھی سیادت سے بہرہ اندوز نہیں ہو سکتی۔ میرا عقیدہ یہ ہے کہ جو شخص اس وقت قرآنی نقطۂ نگاہ سے زمانۂ حال کے "جورس پروڈنس" یعنی اصولِ فقہ پر ایک تنقیدی نگاہ ڈال کر احکامِ قرآنیہ کی ابدیت کو ثابت کرے گا۔ وہی اسلام کا مجدد ہو گا اور بنی نوعِ انسان کا سب سے بڑا خادم بھی وہی شخص ہو گا۔ قریباً تمام ممالک میں اس وقت مسلمان یا تو اپنی آزادی کے لئے لڑ رہے ہیں، یا قوانینِ اسلامیہ پر غور و فکر کر رہے ہیں (سوائے ایران و افغانستان کے) مگر ان ممالک میں بھی امروز و فردا یہ سوال پیدا ہونے والا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ زمانۂ حال کے اسلامی فقہاء یا تو زمانہ کے میلانِ طبیعت

سے بالکل بے خبر ہیں یا قدامت پرستی میں مبتلا ہیں۔ ایران میں مجتہدینِ شیعہ کی تنگ نظری اور قدامت نے بہاؤ اللہ کو پیدا کیا جو سرے سے احکامِ قرآنی کا ہی منکر ہے۔ ہندوستان میں عام حنفی اس بات کے قائل ہیں کہ اجتہاد کے تمام دروازے بند ہیں۔ میں نے ایک بڑے عالم کو یہ کہتے سنا کہ حضرت امام ابوحنیفہؒ کا نظیر ناممکن ہے۔ غرضیکہ یہ وقت عملی کام کا ہے کیونکہ میری ناقص رائے میں مذہبِ اسلام گویا زمانے کی کسوٹی پر کسا جا رہا ہے اور شاید تاریخِ اسلام میں ایسا وقت اس سے پہلے کبھی نہیں آیا۔"

انہوں نے سید سلیمان ندوی (مرحوم) کے نام اپنے ایک خط میں بھی اس اہمیت کو دہراتے ہوئے لکھا کہ :-

"قرآن کامل کتاب ہے اور خود اپنے کمال کا مدعی ہے لیکن ضرورت ہے کہ اس کے کمال کو عملی طور پر ثابت کیا جائے کہ سیاسیاتِ انسانیہ کے لئے تمام ضروری قواعد اس میں موجود ہیں اور اس میں فلاں فلاں آیت سے فلاں فلاں قواعد کا استخراج ہوتا ہے۔"

(طلوعِ اسلام - اپریل ۱۹۷۰ء، صفحہ ۵)

علامہ اقبالؒ عمر بھر اسی پیغام کو عام کرتے رہے۔ اور ان کی وفات کے بعد، اس پیغامِ خداوندی کی نشر و اشاعت کی سعادت اس ہیچ میرز کے حصہ میں آئی۔ اقبالؒ کی زندگی میں اس مسئلہ کی حیثیت ہنوز نظری تھی۔ یعنی انہوں نے اس مملکت کا یہ نظریہ تو پیش کر دیا تھا لیکن اس مملکت کے وجود میں آنے کا (بظاہر) کوئی امکان نظر نہیں آتا تھا، اس لئے مذہبی پیشوائیت کی طرف سے ان کے ان خیالات و تصورات کو نہ کوئی خاص اہمیت دی گئی اور نہ ہی ان کی خصوصیت سے مخالفت کی گئی۔ لیکن اب جب کہ یہ مملکت وجود میں آچکی ہے۔ مذہبی پیشوائیت کی طرف سے قانون سازی کے اس تصور کی بڑی شدت سے مخالفت ہو رہی ہے۔ میرے خلاف "ایک ہزار علماء" کا کفر کا فتویٰ اس مخالفت کی زندہ شہادت ہے۔ لیکن قرآنِ مجید تو ایک ابدی حقیقت ہے۔ اس کا سررشتہ نہ علامہ اقبالؒ کی طبعی عمر سے وابستہ تھا، جو ان کی وفات سے یہ ٹوٹ جاتا۔ نہ ہی یہ میری زندگی تک محدود ہے۔ اور نہ ہی اسے مخالفین کی کاوشیں اور کوششیں ناکام بنا سکتی ہیں۔ اسے دنیا کے ہر نظام پر غالب آکر رہنا ہے کہ : لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ ۔ اس خدا کا فیصلہ ہے جس نے اس کی حفاظت کا ذمہ لے رکھا ہے۔ لہٰذا ایسا بالآخر ہو کر رہے گا۔ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ (۹/۳۳) اور قوانینِ خداوندی کے ساتھ

دیگر قوانین ملانے والوں کی تمام کوششوں کے علی الرغم ایسا ہوگا۔

جو کچھ میں نے عرض کیا ہے، مناسب سمجھتا ہوں کہ آخر میں اُسے مختصر الفاظ میں سمٹا کر آپ کے سامنے پیش کر دیا جائے گا۔

۱۔ حضرات انبیاء کرامؑ کو خدا کی طرف سے ایک ضابطۂ قوانین و آئین عطا ہوتا تھا۔ جو قوم اس ضابطہ کی صداقت کو تسلیم کر لیتی تھی اس کا فریضہ ہوتا تھا کہ وہ اسے عملاً نافذ کرے۔ چونکہ یہ پوری قوم ایک ضابطہ کے تابع زندگی بسر کرتی تھی اس لئے اس میں کسی قسم کے اختلاف اور تفرقہ کا سوال پیدا نہیں ہوتا تھا۔

۲۔ رسولؐ کے چلے جانے کے بعد، وہ قوم اس ضابطہ میں آمیزشیں کر دیتی تھی اور اس طرح ان میں اختلافات نمودار ہو جاتے تھے۔ اس طرح وہ دین مذہب بن جاتا تھا۔ یہ جو دنیا میں مختلف مذاہب پائے جاتے ہیں، یوں سمجھئے کہ یہ دین میں پیدا شدہ مختلف فرقے ہیں کیونکہ دین تو شروع سے آخر تک ایک ہی تھا۔ دین کی اطاعت کرنے والوں میں فرقے پیدا ہو ہی نہیں سکتے۔

۳۔ یہ دین آخری مرتبہ، مکمل اور غیر متبدل شکل میں نبی اکرمؐ کی وساطت سے ملا۔ جن سعادت مند افراد نے اس کی صداقت کو تسلیم کر لیا وہ ایک قوم (یا اُمت) بن گئے۔ اس اُمت نے، اس دین کو عملاً نافذ کرنے کے لئے ایک مملکت کی تشکیل کی جس کا ضابطۂ آئین قرآن کریم تھا۔ اس مملکت کی مرکزی اتھارٹی اُمت کے مشورہ سے اس دین پر عمل پیرا ہونے کے طور طریق وضع کرتی اور انہیں قوانینِ مملکت کی حیثیت سے نافذ کرتی۔ ان کا اطلاق تمام اُمت پر یکساں طور پر ہوتا۔ ظاہر ہے کہ اس نظام میں، اُمت میں مختلف فرقوں کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔ مختلف فرقوں کے معنی تو یہ تھے کہ مختلف گروہ، مملکت کی طرف سے نافذ کردہ قوانین کے بجائے، اپنے اپنے وضع کردہ قوانین کی اطاعت کرتے۔ ایک مملکت کے اندر رہتے ہوئے اس قسم کا طرزِ عمل تو مملکت سے بغاوت کے مرادف ہوتا ہے یہ وجہ ہے جو قرآن کریم نے فرقہ بندی کو شرک قرار دیا ہے۔ (۳۲/۳۰) یعنی ایک اتھارٹی (حکومتِ قرآنی) کی اطاعت کرنے کے بجائے مختلف اتھارٹیز کی اطاعت کرنا۔ رسول اللہؐ سے فرمایا کہ جو لوگ فرقے پیدا کر لیں تیرا اُن سے کوئی واسطہ نہیں رہے گا۔ (۶/۱۵۹) یعنی جو مملکتِ اسلامیہ کی مرکزی حیثیت ہی کو تسلیم نہ کریں، ان کا اس مرکز سے تعلق کیا؟ وہ تو اس کے باغی قرار پاتے ہیں۔ چونکہ مرکزِ ملت کے فیصلے قرآن کے مطابق ہوتے تھے، اور

فرقوں میں فیصلے اپنی اپنی فقہ کے مطابق ہوتے ہیں، اسی لئے کہہ دیا کہ جو لوگ ـــــ مَا اَنْزَلَ اللّٰہُ ـــــ (قرآن مجید) کی رُو سے فیصلے نہیں کرتے انہیں مومن نہیں کہا جاسکتا۔ (۵/۴۴)

۴۔ ہمارے ساتھ ہوا یہ ہے کہ اُمت کی مرکزی اتھارٹی (حکومت خداوندی یا خلافت علیٰ منہاجِ رسالت) کے باقی نہ رہنے سے دین، مذہب میں تبدیل ہو چکا ہے، اس لئے اس میں مختلف فرقے پیدا ہو چکے ہیں۔ اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ ان فرقوں کو باقی رکھتے ہوئے اسلامی نظام (یعنی دینِ خداوندی) قائم ہو سکتا ہے تو وہ یا تو دین اور مذہب میں فرق کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا اور یا پھر اُمت کو فریب میں مبتلا رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ فرقوں کی موجودگی میں دین کا نظام قائم ہی نہیں ہوسکتا۔ دین کا نظام قائم کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے، اور وہ یہ کہ ایک ایسی مملکت کا قیام عمل میں آئے جو قرآنی اصولوں کو مملکت کا آئین قرار دے، اُمت کے مشورہ سے ان اصولوں پر عمل پیرا ہونے کے طور طریق وضع کرے۔ انہیں قوانین حکومت کی حیثیت سے تمام مسلمانوں پر یکساں نافذ کرے ـــــ اس میں نہ اِس فرقے یا اُس فرقے کی کوئی تمیز ہو اور نہ ہی پرسنل اور پبلک لاز کی تفریق ـــــ اس طرح ایک خدا ـــــ ایک ضابطۂ قوانین اور ایک اُمت کی تشکیل سے، دین کا نظام قائم ہوگا۔ اگر ایسا نہیں کیا جائے گا تو احیاءِ اسلام کی ہر کوشش رائیگاں جائے گی۔

یہ تھی خلافتِ راشدہ کے بعد اسلامی مملکت کے قیام کی وہ ممکن العمل شکل جسے علامہ اقبالؒ نے پیش کیا اور جس کے مطابق ایک خطۂ زمین کے حصول کے لئے قائد اعظمؒ، تحریک پاکستان کو وجود میں لائے۔ وہ علامہ اقبالؒ کے پیش کردہ بنیادی اصول کو کس طرح واضح طور پر سمجھ چکے تھے، اس کی تفاصیل میں اپنے اس خطاب میں پیش کر چکا ہوں جسے میں نے سابقہ یوم پاکستان (مارچ ۱۹۷۷ء) کی تقریب پر پیش کیا تھا۔ (وہ الگ شائع ہو چکا ہے) انہوں نے ان تمام تفاصیل کو ان چار لفظوں میں جامع طور پر سمیٹ کر رکھ دیا تھا کہ:۔

”قرآن کریم کے احکام ہی ہماری سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں“۔

یہ وہ حدود ہیں جو ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہتے ہیں، اور ان کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے، ملتِ اسلامیہ اپنی مملکت کے لئے قوانین و ضوابط وضع کرتی ہے۔ جن کا اطلاق تمام مسلمانوں پر یکساں طور پر ہوتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ کوئی مملکت وجود میں نہیں آسکتی، اور اگر وجود میں آجائے تو مستحکم نہیں رہ سکتی، جب تک اس میں ایک (واحد) ضابطۂ قوانین نافذ نہ ہو۔ جس مملکت میں مختلف گروہ اپنے لئے الگ الگ قوانین وضوابط وضع کر لیں، اس میں انارکی پھیل جاتی ہے۔ سیکولر سٹیٹ میں قانون سازی کا مسئلہ آسان ہوتا ہے اس میں مختلف مذہبی گروہوں کو ان کے اپنے شخصی قوانین پر عمل پیرا ہونے کی آزادی دے دی جاتی ہے اور پبلک لاز کا ضابطہ، بلاتمیز مذاہب، آزادانہ وضع کر لیا جاتا ہے جس کا اطلاق تمام باشندوں پر یکساں ہوتا ہے لیکن اسلام میں نہ تو پرسنل لاز اور پبلک لاز میں تفریق ہوتی ہے اور نہ ہی اس کے پبلک لاز بلا حدود و قیود جس طرح جی چاہے وضع کئے جا سکتے ہیں۔ یہ سب قرآنی حدود کے اندر رہتے ہوئے وضع کئے جاتے ہیں۔

لیکن اس وقت صورت یہ ہے کہ مسلمان مختلف فرقوں میں بٹے ہوئے ہیں اور ہر فرقہ اپنی اپنی فقہ پر شدت سے جما بیٹھا ہے۔ ان کی فقہ کا دائرہ، شخصی قوانین تک محدود ہے۔ انگریزوں کے عہدِ حکومت میں انہیں شخصی قوانین کی آزادی تھی اور پبلک لاز سیکولر انداز سے وضع ہوتے تھے۔ ہماری مذہبی پیشوائیت اس میں مطمئن تھی۔ جسے ہندوستان کی تحریکِ آزادی کہا جاتا ہے، اس سے مراد انگریزوں کی جگہ، اہلِ ہندوستان کی اپنی حکومت قائم کرنا تھا۔ اس تحریک میں، وہاں کی اکثریت، ہندوؤں نے، اس امر کی ضمانت دے دی تھی کہ حصولِ آزادی کے بعد، قوانینِ مملکت کی شکل وہی رہے گی جو انگریزی عملداری میں رائج تھی —— یعنی مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے شخصی قوانین اپنے اپنے ہوں گے، اور ملک کے پبلک لاز سیکولر انداز سے وضع ہوں گے۔

وہاں کے علماء کی اکثریت کا تعلق دارالعلوم دیوبند سے تھا۔ وہ جس طرح انگریزی عملداری میں اس نہجِ حکومت سے مطمئن تھے اور اسے قطعاً اسلام کے منافی نہیں سمجھتے تھے، اسی طرح وہ ہندوؤں کے پیش کردہ نہجِ حکومت کو اسلام کے منافی نہیں سمجھتے تھے اس لئے وہ اس تحریک میں بہ ہیئتِ مجموعی شامل تھے۔ اصل یہ ہے کہ فرقہ وارانہ گروہ بندی میں، ہر فرقہ کے نزدیک اس کے اپنے معتقدات، مسالک، رسوم، اور شخصی قوانین کا نام اسلام ہوتا ہے۔ اگر اسے ان کا تحفظ حاصل ہو جائے تو وہ مطمئن ہو جاتا ہے کہ اسلام محفوظ ہے۔ اور اگر ان پر کوئی زد پڑتی ہو تو وہ چلا اٹھتا ہے کہ اسلام خطرے میں ہے۔ اس سے زیادہ اسلام کا کوئی تصور ان کے سامنے نہیں ہوتا۔ یہ شکل سیکولر نظامِ حکومت ہی میں قائم رہ سکتی ہے۔ اس کے برعکس، اسلامی نظامِ مملکت میں فرقوں کا وجود باقی نہیں رہتا۔ اس میں (واحد) اُمتِ مسلمہ ہوتی ہے جو ایک ہی ضابطۂ قوانین کے تابع زندگی بسر کرتی ہے۔ اب ظاہر ہے کہ فرقہ بندی کو اسلام قرار دینے اور اس پر مطمئن ہو جانے والے علماء سیکولر اندازِ حکومت ہی کے مؤید ہو سکتے

ہیں۔ یہ بات کوئی ڈھکی چھپی نہیں۔ ہندوستان کے نیشنلسٹ اخبار مدینہ (بجنور) کی ۱۷ اپریل ۱۹۶۳ء کی اشاعت میں مولانا اسرار احمد آزاد (دیوبندی) کا ایک مضمون شائع ہوا تھا جس میں انہوں نے واضح الفاظ میں کہا تھا کہ:-

"یہ الزام بے بنیاد ہے کہ علمائے ہند اس ملک میں اسلامی حکومت کے لئے کوشاں رہے ہیں۔ دارالعلوم دیوبند سے تعلق رکھنے والے علماء نے کم از کم اس صدی کے آغاز سے ہندوستان میں جمہوری اور سیکولر حکومت کے قیام کو اپنا واضح نصب العین قرار دے لیا تھا۔"

انہی علماء کے سرخیل، مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم) تھے جن کا مسلک یہ تھا کہ:-

"ایسی جمہوری حکومت جس میں ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی سب شامل ہوں حاصل کرنے کے لئے سب کو متفقہ کوشش کرنی چاہیئے۔ ایسی مشترکہ آزادی اسلام کے اصولوں کے عین مطابق ہے اور اسلام اس آزادی کی اجازت دیتا ہے۔"

(زمزم۔ مورخہ ۷، جولائی ۱۹۳۸ء)

اس کے برعکس، قائداعظمؒ، علامہ اقبالؒ کے تصور کے مطابق اسلامی حکومت قائم کرنے کے لئے مصروف جدوجہد تھے۔ ظاہر ہے کہ علماء کی طرف سے اس تحریک کی مخالفت فطری امر تھی۔ یہ ان کے "تصورِ اسلام" کے خلاف تھی۔ یہ تھی ہندوستان میں، تحریک پاکستان اور علماء کے درمیان کھلی ہوئی جنگ کی حقیقی وجہ۔ پاکستان وجود میں آگیا اور علماء کا یہ گروہ ادھر آگیا۔

———— یہاں بھی ان کی انتہائی کوشش یہ ہے کہ اقبالؒ اور قائداعظمؒ کے تصور کی اسلامی حکومت قائم نہ ہونے پائے کیونکہ اس سے ان کے فرقہ وارانہ اسلام کی اجارہ داری باقی نہیں رہتی۔ چنانچہ آپ نے دیکھا ہوگا کہ یہ حضرات ہر فرقہ کے پرسنل لاز کی آزادی کا چرچا تو ہر جگہ کرتے ہیں لیکن پبلک لاز کے ضابطہ کا کوئی ذکر نہیں کرتے۔ یہ یہاں اسی انداز کی سیکولر حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں جس کے داعی (مولانا) حسین احمد مدنی (مرحوم) اور ان کے ہمنوا حضرات تھے۔ اس قسم کی حکومت میں اگر اقتدار ان کے ہاتھ میں ہو، تو یہ اسے اسلامی حکومت قرار دیں گے۔ اگر اقتدار کسی اور کے ہاتھ میں ہو تو وہ غیر اسلامی حکومت ہوگی۔

———*———

ان کے علاوہ تحریکِ پاکستان ———— کے خلاف ایک اور عنصر بھی کارفرما تھا۔

یعنی جماعتِ اسلامی۔

مطالبۂ پاکستان کی بنیاد دو اصولوں پر تھی۔ ایک یہ کہ مسلمان، ایمان کے اشتراک کی بنا پر، غیر مسلموں سے ایک الگ قوم ہیں۔ اور (۲) ہمارے دین کا تقاضا ہے کہ ایک ایسی مملکت قائم کی جائے جس میں اسلام ایک زندہ حقیقت بن سکے۔

اس جماعت کے بانی، ابوالاعلیٰ، مودودی صاحب کی کوشش تھی کہ یہ ثابت کر دیا جائے کہ یہ دونوں دعاوی باطل ہیں، انہوں نے کہا کہ ہندوستان میں بسنے والے مسلمان، محض پیدائشی مسلمان ہیں، حقیقی مسلمان نہیں۔ لہٰذا ان کا، اسلام کی بنیاد پر جداگانہ قومیت کا دعویٰ ہی باطل ہے۔ دوسرے مطالبہ کے متعلق انہوں نے کہا کہ یہ لوگ جس حکومت کے قیام کے لئے پاکستان کا مطالبہ کر رہے ہیں، وہ اسلامی حکومت نہیں بلکہ مسلمانوں کی کافرانہ حکومت ہو گی۔ بلکہ اس سے بھی بدتر، لہٰذا، اس بنا پر بھی ان کا دعویٰ باطل ہے اور یکسر غیر اسلامی۔

ان کی اس جدّوجہد کے باوجود پاکستان وجود میں آگیا تو یہاں انہوں نے یہ کوشش شروع کی کہ مسلمانوں کی نئی نسل کے دل میں یہ خیال راسخ کر دیا جائے کہ "اسلام ایک چلا ہوا کارتوس" ہے۔ اس زمانے میں اسلامی حکومت کا قیام ناممکنات میں سے ہے۔ ہم بتا چکے ہیں کہ اسلامی مملکت کے قیام کی شرطِ اوّلین یہ ہے کہ اس میں پبلک لاز کا ایسا ضابطہ وضع کیا جائے جس کا اطلاق تمام مسلمانوں پر یکساں طور پر ہو سکے۔ اسے ناممکن کرنے کے لئے مودودی صاحب نے ایک خاص انداز اختیار کیا۔ بیس پچیس سال تک وہ یہ کہتے رہے کہ اسلامی حکومت کی بنیاد "کتاب و سنت" پر ہے۔ یہ بڑا معصوم اور مقدس نعرہ تھا جس کی تہ کو سادہ لوح مسلمان سمجھ نہ سکا۔ جب وہ کتاب و سنت" کی اہمیت اس طرح ثبت کر چکے تو اس کے بعد فرمایا کہ "کتاب و سنت" کی رُو سے پبلک لاز کا کوئی ایسا ضابطۂ قوانین مرتب نہیں کیا جا سکتا جسے تمام فرقے اسلامی تسلیم کر لیں۔ کھلے الفاظ میں اس کا مفہوم اس کے سوا کیا ہے کہ اب دنیا میں اسلامی حکومت قائم ہو ہی نہیں سکتی۔ چنانچہ ان کے پیش کردہ اس نظریہ کا نتیجہ یہ ہے کہ ہماری نئی نسل، اسلام کے مستقبل کی طرف سے مایوس ہو چکی ہے۔ ان نوجوانوں نے کہنا شروع کر دیا ہے کہ جب اسلامی حکومت قائم ہی نہیں ہو سکتی تو پھر پاکستان کی جداگانہ مملکت کی ضرورت کیا تھی! ہماری نئی نسل کے دلوں میں ان خیالات نے پرورش پانا شروع کر دیا ہے۔ یہ خیالات ذرا پروان چڑھے تو یہاں یہ تحریک اُبھرے گی کہ ہمیں ہندوستان کے ساتھ مل جانا چاہئے تاکہ روز روز کے دردِ سر سے چھٹکارا حاصل ہو۔ مودودی صاحب ہندوستان کو دو حصوں میں تقسیم کر کے اس کے ایک حصہ میں مملکتِ پاکستان قائم کرنے کے خلاف تھے اور اپنے اس نظریہ کی تائید میں کہا کرتے تھے کہ:-

"یہ لوگ ہندوستان کے ایک قطعے کو نئے میں پاکستان بنانے کو اپنا انتہائی مقصد بنائے ہوئے ہیں۔ لیکن اگر یہ فی الواقع خلوص قلب سے اسلام کی نمائندگی کے لئے کھڑے ہو جائیں تو سارا ہندوستان پاکستان بن سکتا ہے۔"

(روئداد جماعت اسلامی۔ حصہ پنجم۔ صہ ۶۵)

صرف ایک سوال

آپ ان حضرات سے صرف ایک سوال پوچھئے۔ اور وہ یہ کہ :۔
"کیا کتاب وسنت کی رُو سے پبلک لاز کا کوئی ایسا ضابطہ قوانین مرتب کیا جا سکتا ہے جسے یہاں کے تمام فرقے متفقہ طور پر اسلامی تسلیم کر لیں؟"

مودودی صاحب تو واضح الفاظ میں کہہ چکے ہیں کہ ایسا کیا جانا ناممکن ہے۔ لیکن اگر دیگر علماء حضرات اسے ممکن سمجھتے ہوں تو ان سے کہئے کہ ان کا اوّلین دینی فریضہ یہ ہے کہ وہ ایسا ضابطہ قوانین مرتب کر دیں۔ اس سے وہ تمام مسائل حل ہو جائیں گے جو گذشتہ تیس برس سے ساری قوم کے لئے سوہانِ روح بن رہے ہیں۔

مرغدین
(ملک خداداد)

میں نے اس خطاب کو قانون سازی کے اصولوں تک محدود رکھا ہے۔ یہ نہیں بتایا کہ جس خطۂ ارض میں اسلامی مملکت قائم ہو گی وہاں کے معاشرہ کا نقشہ کیا ہو گا۔ یہ الگ موضوع ہے جس کے متعلق میں بہت کچھ لکھ چکا ہوں۔ علامہ اقبالؒ نے بھی اس موضوع پر بہت کچھ کہا ہے۔ لیکن ان تمام تفاصیل کو انہوں نے جاوید نامہ میں، فلکِ مریخ پہ مرغدین کے نام کے مثالی خطہ میں سمٹا کر رکھ دیا ہے اور وہ یہ ہیں : ؎

ساکنانش در سخن شیریں چو نوش   خوب روئے و نرم خوئے و سادہ پوش

خوش کلام، خوش گل، نرم طبع، سادہ پوش۔ تسخیر قوائے فطرت میں اتنی بلندیوں پہ پہنچے ہوئے کہ اپنے کاروبار کے لئے تمام توانائی (ENERGY) سرچشمہ حرارت (آفتاب) سے براہِ راست حاصل کرنے والے

نکتہ شاں، بے درد و سوزِ اکتساب　　راز دان کیمیائے آفتاب
ہر کہ خواہد سیم و زر گیرد ز نور　　چوں نمک گیریم ما از آبِ شور

وہاں علم و ہنر کا مقصد، نوعِ انسانی کی خدمت ہوگا نہ کہ حصولِ زر و سیم۔ سکوں کا اس میں رواج ہی نہ ہوگا ؎

خدمت آمد مقصدِ علم و ہنر　　کارہا را کس نمی سنجد بزر
کس ز دینار و درم آگاہ نیست　　ایں بتاں را در حرم ہا راہ نیست

نہ وہاں ایسی مشینیں ہوں گی جو بھوتوں کی طرح انسان کے سر پہ سوار ہوں گی۔ نہ فیکٹریوں کی چمنیاں فضائے آسمانی کو دھواں دھار بنا رہی ہوں گی۔ مشینیں خدمتگار۔ دھوئیں کی جگہ آفتابی حرارت ؎

بر طبیعت دیو ماشیں چیرہ نیست　　آسمانہا از دخانہا تیرہ نیست

وہاں کا کسان نہایت مرفہ الحال اور خوش و خرم ہوگا۔ نہ زمیندار کی سلب و نہب (EXPLOITATION) اس کا خون چوسے گی نہ اس کی محنت کا ماحصل کوئی اور چھین کر لے جائے گا ؎

سخت کش دہقاں، چراغش روشن است　　از نہابِ دہ خدایا ایمن است
کشت و کاوش بے نزاع ایں جا است　　حاصلش بے شرکتِ غیر از دست

چونکہ وہاں سلب و نہب (EXPLOITATION) کا تصور ہی نہ ہوگا اس لئے باہمی مفاد کے تصادم (CLASH OF INTERESTS) کا بھی سوال پیدا نہ ہوگا اور جب مفاد کا تصادم نہ ہوگا تو پھر کشت و خون بھی نہ ہوگا۔

ہر طرف امن ہی امن ہوگا اس لئے وہاں بے کار فوجیں (STANDING ARMIES) رکھنے کی بھی ضرورت نہ ہوگی ؎

اندراں عالم نہ لشکر نے قشوں　　نے کسے روزی خورد از کشت و خون

وہاں کے اہلِ قلم بھی پروپیگنڈے کی دروغ بافیوں میں مصروف نہ ہوں گے۔ ؎

نے قلم در مرغدیں گیرد فروغ　　از فنِ تحریر و تشہیرِ دروغ

نہ وہاں کوئی بیکار ہوگا نہ گداگر ؎

نے بہ بازاراں ز بے کاراں خروش　　نے صداہائے گدایاں دردِ گوش

دو لفظوں میں یہ سمجھئے کہ نہ وہاں کوئی سائل ہوگا نہ محروم۔ نہ کوئی کسی کا آقا نہ کوئی غلام۔ نہ کوئی کسی کا حاکم نہ کوئی کسی کا محکوم ؎

کس دریں جا سائل و محروم نیست　　عبد و مولا حاکم و محکوم نیست

اس کے بعد حکیم مریخی نے بتایا کہ تمہارے ہاں معاشرہ میں جو اس قدر ناہمواریاں اور فساد انگیزیاں ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ تم نے اشیاء کو افراد کی ملکیت تصور کر رکھا ہے۔ ملکیت کا تصور، تمام فسادات کی جڑ ہے۔ یہاں ہر شے خدا کی ملکیت ہے اور انسانوں کے سپرد بطور امانت کی جاتی ہے ؎

اے کہ می گوئی متاعِ ما ز ماست   مرد ناداں ایں ہمہ ملکِ خداست

زمین خدا کی ہے اور افراد اس کے مالک بن بیٹھے ہیں۔ یہ قرآن کے حکم کی صریح مخالفت ہے ؎

ارضِ حق را ارضِ خود دانی بگو!   چیست شرحِ آیۂ لا تفسدوا

لہٰذا صحیح نظام یہ ہے کہ ہر شے "خدا کی ملکیت" میں دے دی جائے ؎

کس امانت را بکارِ خود ... نبرد   اے خوش آں کو ملکِ حق با حق سپرد

ملکِ یزداں را بہ یزداں باز دہ   تا ز کارِ خویش بکشائی گرہ!

یہ تمام محتاجی اور غریبی، افلاس اور زبوں حالی اس لئے ہے کہ خدا کی ملکیت کو انسانوں نے اپنی ملکیت سمجھ رکھا ہے ؎

زیرِ گردوں فقر و مسکینی چراست   آنچہ از مولاست می گوئی ز ماست

جب تم اپنی نگاہ میں یہ تبدیلی پیدا کر لوگے تو تمہاری خارجی دنیا خود بخود بدل جائے گی ؎

نوعِ دیگر بیں، جہاں دیگر شود   ایں زمین و آسماں دیگر شود

یہ تھا اقبالؒ کے نزدیک اسلامی مملکت میں معاشرہ کا نقشہ اور اسلامی نظام کا ما حصل۔ یعنی ؎

کس نباشد در جہاں محتاجِ کس   نکتۂ شرعِ مبیں، این است و بس

والسلام

پرویز

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فکرِ اقبالؒ کا سرچشمہ
قرآن

(بتقریب یومِ اقبالؒ ۲۱ اپریل ۱۹۷۸ء)

علامہ اقبالؒ کو ان کی زندگی ہی میں جس قدر شہرت اور مقبولیت حاصل ہو گئی تھی، شاید ہی کسی اور مفکر یا شاعر کو نصیب ہوئی ہو۔ لیکن اس کے باوجود انہوں نے (یوں کہیے گویا اپنی زندگی کے آخری سانس میں) کہا کہ:

پو رخت خویش بربستم ازیں خاک — ہمہ گفتند با ما آشنا بود
ولیکن کس ندانست ایں مسافر — چہ گفت و، با کہ گفت و، از کجا بود (ارمغانِ حجاز ص ۱۹۹)

اس وقت تو اسے عام طور پر شاعرانہ گلہ طرازی پر محمول کیا گیا لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا اور گزرتا جا رہا ہے، یہ بات سامنے آ رہی ہے کہ جو کچھ انہوں نے کہا تھا، شاعری نہیں تھی ایک حقیقت تھی جس کا انہوں نے بصد درد و سوز اظہار کیا تھا۔ ان کی وفات کے بعد، ان کی فکر اور شعر، ان کے کلام اور پیام کے متعلق ہزاروں مقالات لکھے گئے اور سینکڑوں کتابیں شائع ہوئیں ——— گذشتہ قریب چالیس برس کے طول طویل عرصہ کو تو چھوڑیئے، ۱۹۷۶ء کے ایک سال میں، جسے ان کی پیدائش کے صدسالہ جشن کے طور پر منایا گیا۔ ان موضوعات پر جس قدر کہا، لکھا اور شائع کیا گیا وہ اعداد و شمار کے احاطہ میں بمشکل سما سکے گا لیکن اربابِ فکر و نظر اس کی تصدیق کریں گے کہ اس کے باوجود، اقبالؒ نے اپنے آخری وقت میں جو کہا تھا وہ آج بھی اسی قدر مبنی بر حقیقت ہے جس قدر ان کی وفات کے وقت تھا۔ مطالعۂ اقبالؒ کے سلسلہ میں بنیادی طور پر یہ متعین کیا جانا ضروری تھا کہ ان کی فکر کا سرچشمہ کیا تھا۔ اس موضوع پر بھی آپ دیکھیں گے کہ کچھ کم نہیں لکھا گیا ——— اس کے ڈانڈے کہیں "مغرب کے سیاروں سے" ملائے گئے، کہیں "مشرق کے ثوابت" سے ——— لیکن اصل حقیقت کی طرف کسی کی نگاہ نہ اٹھی۔ حالانکہ اسے حضرت علامہؒ نے اپنی سب سے پہلی تصنیف ———

مثنوی اسرار و رموز ——— میں واضح الفاظ میں بتا دیا تھا۔ انہوں نے کتاب کے آخر میں "عرض حالِ مصنّف بحضور رحمۃ اللعٰلمین" کے زیرِ عنوان کہا تھا: ؎

گر دلم آئینۂ بے جوہر است　　　ور بحرفم غیرِ قرآں مضمر است
پردۂ ناموسِ فکرم چاک کن　　　ایں خیاباں را زخارم پاک کن
تنگ کن رختِ حیات اندر برم　　　اہلِ ملت را نگہدار از شرم
سبز کشتِ نابسامانم مکن　　　بہرہ گیر از ابرِ نیسانم مکن
خشک گرداں بادہ در انگورِ من　　　زہر ریز اندر مئے کافورِ من

اور اس کے بعد اپنے لئے وہ بددعا کہ جس سے زیادہ جگر پاش اور قلب سوز بددعا، اقبالؒ اپنے حق میں کر نہیں سکتا تھا (اور میں تو اکثر سوچا کرتا ہوں کہ اس بددعا کی ان میں ہمت کیسے پیدا ہو گئی" اور ان الفاظ کو وہ زبان تک کیسے لے آئے!) کہ: ؎

روزِ محشر خوار و رسوا کن مرا　　　بے نصیب از بوسۂ پا کن مرا

"بے نصیب از بوسۂ پا کن مرا" کی درد انگیزی اور جگر دوزی کا اندازہ وہ حضرات بخوبی لگا سکیں گے جنہیں اس کا علم ہے کہ حضورؐ نبیؐ اکرم کی ذاتِ اقدس و اعظم کے ساتھ اقبالؒ کے عشق کی کیفیت کیا تھی۔ اقبالؒ کا بحضور رحمۃ اللعٰلمینؐ یہ عرضداشت پیش کرنا کہ، جو کچھ میں نے کہا ہے اور جو کچھ میں کہوں، اگر اس میں غیر قرآن کچھ بھی مضمر ہو تو ——— بے نصیب از بوسۂ پا کن مرا، اس موضوع پر حرفِ آخر کی حیثیت رکھتا ہے۔

اس منفیانہ انداز کے بعد، انہوں نے مثبت طور پر کہا کہ: ؎

گر دُرِ اسرارِ قرآں سفتہ ام　　　با مسلماناں اگر حق گفتہ ام
ایکہ از احسانِ تو ناکس، کس است　　　یک دعایت مزدِ گفتارم بس است
عرض کن پیشِ خدائے عزّ و جل　　　عشقِ من گردد ہم آغوشِ عمل
دولتِ جانِ حزیں بخشیدۂ　　　بہرۂ از علمِ دیں بخشیدۂ

در عمل پائندہ تر گرداں مرا
آبِ نیسانم، گہر گرداں مرا

(رموز و اسرار۔ صہ ۱۹۵-۱۹۶)

اسی حقیقت کو وہ دوسرے مقام پر ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں کہ :-

برخور از قرآں اگر خواہی ثبات　　در ضمیرش دیدہ ام آب حیات

از تب و تابم نصیب خود بگیر　　بعد ازیں ناید چو من مرد فقیر

گوہر دریائے قرآں سفتہ ام　　شرح رمز صبغۃ اللہ گفتہ ام (مسافر ص۴۳)

وہ، ارمغان حجاز میں، شعرائے عرب کو ایک پیغام دیتے ہیں کہ :-

بگو از من نوا خوان عرب را　　بہائے کم نہادم لعل لب را

ازاں نورے کہ از قرآں گرفتم　　سحر کردم صد و سی سالہ شب را (ص۱۱۴)

جاوید نامہ میں "نوائے سروش" کے زیر عنوان کہتے ہیں۔

چوں سر مہ رازی را از دیدہ فرو شستم　　تقدیر امم دیدم۔ پنہاں بکتاب اندر (ص۴۳)

اقبالؒ کے ہاں، کتاب سے مراد، کتاب خداوندی' قرآن مجید ہی ہوتی ہے۔ بال جبریل میں کہتے ہیں :-

تھا ضبط بہت مشکل اس سیل معانی کا　　کہہ ڈالے قلندر نے اسرار کتاب آخر (ص۴۸)

وہ بصد حسرت کہتے ہیں کہ :-

کس نمی داند ز اسرار کتاب　　شرقیاں ہم غربیاں در پیچ و تاب (جاوید نامہ ص۸۶)

وہ انقلاب روس کے بانیوں سے پہلے پوچھتے ہیں کہ :-

اے کہ می خواہی نظام عالمے　　جستہ اورا اساس محکمے

اور اس کے بعد انہیں کہتے ہیں کہ :-

داستان کہنہ شستی باب باب　　فکر را روشن کن از ام الکتاب (جاوید نامہ ص۸۸)

عظیم تحفہ

ان کی نگاہوں میں قرآن کریم کی عظمت کس قدر تھی۔ اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ جب وہ شاہ افغانستان۔ نادر شاہ (مرحوم) کی دعوت پر کابل تشریف لے گئے تو ان کے لئے ایک ہی تحفہ اپنے ساتھ لے کر گئے۔ وہ تحفہ کیا تھا، فرماتے ہیں :-

در حضور آں مسلمان کریم !　　ہدیہ آوردم ز قرآن عظیم

گفتم ایں سرمایۂ اہل حق است　　در ضمیر او حیات مطلق است

اس کے جواب میں شاہ مرحوم نے کہا :-

گفت " نادر در جہاں بے چارہ بود | از غمِ دین و وطن آوارہ بود
کوہ و دشت از اضطرابم بے خبر | از غمانِ بے حسابم بے خبر

غیر قرآں غمگسارِ من نہ بود!
قوتش ہر باب را بر من کشود"

(مسافر صفحہ ۱۵-۱۴۰)

وہ جب ستمبر ۱۹۳۱ء میں، راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں شرکت کے لئے عازمِ لندن ہوئے تو راستے میں کچھ وقت کے لئے دہلی رُکے۔ اہلِ دہلی نے ان کی خدمت میں بہت سے سپاسنامے پیش کئے۔ آپ نے جامع مسجد دہلی کے امام شمس العلماء مولانا سیّد احمد (مرحوم) کے سپاسنامہ کے جواب میں فرمایا:۔

" جہاں تک سیاسی مسائل کا تعلق ہے میں آپ کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ نہ میرے ساتھ کوئی پرائیویٹ سیکرٹری ہے جو میرے لئے ضروری مواد فراہم کرے، نہ میرے پاس سیاسی لٹریچر کا کوئی پلندہ ہے جس پر میں اپنی بحثوں کی اساس قائم کروں۔ میرے پاس حق و صداقت کی ایک جامع کتاب (قرآن پاک) ہے جس کی روشنی میں، میں مسلمانانِ ہند کے حقوق کی ترجمانی کرنے کی کوشش کروں گا"۔

(گفتارِ اقبالؒ، از محمد رفیق افضل۔ صفحہ ۱۳۶)

اپنے مسلک کے متعلق علامہ سیّد سلیمان ندوی (مرحوم) کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔

" اگرچہ یورپ نے مجھے بدعت کا چسکا ڈال دیا ہے تاہم مسلک میرا وہی ہے جو قرآن کا ہے۔ اور جس کو آپ نے آیت شریفہ کے حوالے سے بتایا ہے"۔ (اقبال نامہ۔ حصہ اوّل صفحہ ۱۳۱)

ان چند تصریحات سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ اقبالؒ اپنی فکر اور پیغام کا سرچشمہ قرآن کریم بتاتے ہیں۔ اس کے بعد آپ سوچئے کہ ہمیں ان کی فکر کی اساس کی تلاش میں مارے مارے پھرنے کی کیا ضرورت ہے انہوں نے اس حقیقت کو ایسے واضح انداز سے واشگاف کیا ہے کہ اس میں نہ کوئی ابہام ہے نہ التباس۔ نہ شک ہو سکتا ہے نہ ریب۔ یہ صحیح ہے کہ اقبالؒ بالآخر ایک انسان تھے اور اس جہت سے، قرآن کریم کے سمجھنے میں بعض اوقات ان سے غلطی بھی ہو سکتی ہے اور سہو بھی۔ انہوں نے اس سے کبھی انکار نہیں کیا۔ میں نے قرآن مجید کے صحیح طور پر سمجھنے کا طریق خود حضرتِ علامہ سے سیکھا ہے۔ میرے دل میں ان کی جس قدر عظمت اور احترام ہے اس سے ایک زمانہ واقف ہے لیکن اس کے باوجود بعض مقامات پر ان کی فکرِ قرآن سے میں بھی اختلاف رکھتا ہوں۔ اور، اسی طرح ہو سکتا ہے کہ دیگر قرآنی ذوق رکھنے والے حضرات بھی ان سے اختلاف

کریں - لیکن اس کے باوجود، بہ حقیقت اپنے مقام پر محکم ہے کہ انہوں نے اپنی فکر کا سرچشمہ قرآن کریم ہی قرار دیا ہے، اور وہ ساری عمر قرآن ہی کے حقائق اور پیغام عام کرنے کی کوشش کرتے رہے - یہ ہماری بد نصیبی ہے کہ وہ قرآن مجید کے حقائق سے متعلق نثر میں کوئی کتاب نہ لکھ سکے - وہ مقدمۃ القرآن کے عنوان سے ایک کتاب لکھنا چاہتے تھے لیکن افسوس کہ ان کی یہ آرزو کبھی پوری نہ ہو سکی - وہ جب علاج کی غرض سے بھوپال تشریف لے گئے ہیں تو انہوں نے (۲۲، جولائی ۱۹۳۰ء کو) تاثیرؔ (مرحوم) کے نام اپنے ایک خط میں لکھا تھا کہ :-

"اعلیٰ حضرت نواب صاحب بھوپال نے نہایت دردمندی سے میرا علاج کرایا ہے - اس کے علاوہ جب ان کو سر راس مسعود سے معلوم ہوا کہ میں ایک کتاب مقدمۃ القرآن لکھنا چاہتا ہوں تو اس ارادے کی تکمیل کے لئے مجھے انہوں نے تاحیات پانچ سو روپیہ ماہوار کی لٹریری پنشن عطا فرمائی ہے - آپ کو شاید اس کا علم اخباروں سے ہو گیا ہوگا - اب ذرا صحت اچھی ہولے تو انشاء اللہ اس کتاب کو لکھنا شروع کروں گا"

(انوارِ اقبالؒ - بشیر احمد ڈار - ص ۲۰۵)

قوم کی بدقسمتی کہ ان کی صحت نے اجازت نہ دی کہ وہ اپنی اس آرزو کو پورا کر سکتے - اگر وہ اس کتاب کو لکھ جاتے تو وہ قرآن فہمی کے سلسلہ میں ایسی متاعِ گراں بہا ہوتی جس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا - انہوں نے زبانِ شعر میں بہت کچھ کہا ہے لیکن اس سے قرآنی حقائق مربوط شکل میں سامنے نہیں آسکتے - دوسرے شاعری میں تضاد بھی واقع ہو جاتا ہے - لطائف میں تو اس سے چنداں ہرج نہیں ہوتا لیکن حقائق کی صورت میں تضاد بہت بڑا نقص ہوتا ہے - قرآنی حقائق - مربوط شکل میں - بلا تضاد - نثری تخلیق ہی میں بیان کئے جا سکتے تھے لیکن افسوس ہے کہ ایسا نہ ہو سکا اور یہ ایک ایسا خلا ہے جو کبھی پر نہیں ہو سکے گا - اس کے لئے ہم اس سے زیادہ کیا کہہ سکتے ہیں کہ :- ؎

آئے عشاق، گئے وعدۂ فردا لے کر اب انہیں ڈھونڈھ چراغِ رخِ زیبا لے کر (بانگِ درا)

اس مقام پر اس جرأتِ عرض کی اجازت چاہتا ہوں کہ اس مردہ پرست قوم نے جس قدر اقبالؒ کے مزار کی تعمیر اور ان کے جشنِ پیدائش منانے پر صرف کیا ہے - اگر اس کا عشرِ عشیر بھی ان کے علاج اور سفر یورپ کے لئے مہیا کر دیتی تو نامعلوم وہ کس قدر گہر ہائے نایاب سے اس کی جھولیاں بھر دیتے - انہوں نے سچ

کہا تھا کہ :-

مرا سبوچہ غنیمت ہے اس زمانے میں کہ خانقاہ میں خالی ہیں صوفیوں کے کدو

(بالِ جبریل - صـ۹۱)

بہرحال، اس سے واضح ہے کہ فکرِ اقبالؒ کما حقہٗ سمجھ میں نہیں آسکتا تاوقتیکہ اس فکر کے سرچشمہ (قرآن مجید) پر گہری نظر نہ ہو۔

تلاوتِ قرآنِ پاک

حضرت علامہؒ، قرآنی حقائق پر غور و فکر میں تو ہر وقت مستغرق رہتے ہی تھے لیکن اس کے ساتھ انہوں نے تلاوتِ قرآنِ پاک کا بھی عمر بھر التزام رکھا۔ فطرت نے انہیں لحنِ داؤدی عطا فرمایا تھا اس لئے ان کی قرأت میں بڑا سوز و گداز ہوتا تھا اور اس سے وہ خود بھی کیف یاب و سرشار ہوتے تھے۔ عمر کے آخری دور میں، ان کا گلا (قریب قریب) بند ہوگیا۔ اس کا انہیں ایک ہی صدمہ تھا اور وہ یہ کہ

در نفس سوزِ جگر باقی نماند لطفِ قرآنِ سحر باقی نماند

(پس چہ باید کرد ۔۔۔۔ صـ۶۸)

لیکن ان کی یہ تلاوت، لفظی نواخوانی نہیں ہوتی تھی۔ وہ رموز و غوامضِ قرآن کی گہرائیوں میں اترتے تھے۔ اس ضمن میں انہوں نے اپنی زندگی کا ایک اہم واقعہ بیان کیا جو انتہائی غور و فکر کا متقاضی ہے۔ ہوا یوں کہ انٹر کالجیئٹ مسلم برادرہڈ کے زیرِ اہتمام (۹ جنوری ۱۹۳۸ء کو) منعقد ہونے والے، اقبال ڈے کی تقریب میں شرکت کے لئے "اجابلین" دہلی کا ایک قافلہ، زیرِ قیادت، علامہ حافظ اسلم جیراج پوریؒ لاہور آیا۔ اس میں میرے علاوہ شیخ سراج الحق صاحب۔ اسد ملتانی (مرحوم) اور قاضی محمد اشرف (مرحوم) شامل تھے۔ ۱۰ جنوری کی صبح حضرت علامہؒ نے ہمیں شرفِ باریابی عطا فرمایا۔ اس محفل کی یاد میرے لئے سرمایۂ حیات ہے۔ محترمی سید نذیر نیازی نے اس کی روئداد، اپنی کتاب "اقبالؒ کے حضور" میں بڑی تفصیل سے بیان کی ہے۔ واقعہ زیرِ نظر کے سلسلہ میں انہوں نے لکھا ہے :-

" (حضرت علامہ نے فرمایا) میرا معمول تھا کہ ہر روز نمازِ فجر کے بعد قرآنِ مجید کی تلاوت کرتا۔ اس دوران

میں والد ماجد بھی مسجد سے تشریف لے آتے اور مجھے تلاوت کرتے دیکھ کر اپنے کمرے میں چلے جاتے۔ میں کبھی ایک منزل ختم کر چکا ہوتا کبھی کم۔ ایک روز کا ذکر ہے۔ والد ماجد حسب معمول مسجد سے واپس آئے۔ میں تلاوت میں مصروف تھا۔ مگر وہ، جیسے کسی خیال میں میرے پاس بیٹھ گئے۔ میں تلاوت کرتے کرتے رک گیا اور منتظر تھا کہ مجھ سے کیا اشارہ فرماتے ہیں۔ کہنے لگے، تم کیا پڑھا کرتے ہو۔ مجھے ان کے اس سوال پر بہت تعجب ہوا۔ بلکہ ملال بھی۔ انہیں معلوم تھا کہ میں قرآن پاک کی تلاوت کر رہا ہوں۔ بہر حال میں نے مؤدبانہ عرض کیا۔ قرآن پاک۔۔۔۔ کہنے لگے تم جو کچھ پڑھتے ہو، سمجھتے بھی ہو۔ میں نے کہا۔ کیوں نہیں۔ تھوڑی بہت عربی جانتا ہوں کچھ نہ کچھ سمجھ لیتا ہوں۔ انہوں نے میرا جواب خاموشی سے سنا اور اٹھ کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔ میں حیران تھا کہ آخر اس سوال سے ان کا مطلب کیا ہے۔ کچھ دن گذر گئے اور یہ بات جیسے آئی گئی ہو گئی۔ لیکن اس واقعہ کا چھٹا روز تھا کہ میں صبح سویرے حسب معمول قرآن پاک کی تلاوت کر رہا تھا والد ماجد مسجد سے واپس آئے اور میں نے تلاوت ختم کی تو انہوں نے مجھے بلایا اور اپنے پاس بٹھا کر بڑی نرمی سے کہنے لگے۔ بیٹا! قرآن مجید وہی شخص سمجھ سکتا ہے۔ جس پر اس کا نزول ہو۔ مجھے تعجب ہوا کہ حضور رسالتمآبؐ کے بعد قرآن پاک کیسے کسی پر نازل ہو سکتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے۔ وہ میرے دل کی بات سمجھ گئے۔ کہنے لگے۔ تمہیں کیسے یہ خیال گذرا کہ اب قرآن مجید کسی پر نازل نہیں ہوگا۔ کیوں نہ تم اس کی تلاوت اس طرح کرو جیسے وہ تم پر نازل ہو رہا ہے۔ ایسا کرو گے تو یہ تمہارے رگ و پے میں سرایت کر جائے گا۔ (اس کے بعد اس نکتہ کی مزید وضاحت کرتے ہوئے، حضرت علامہؒ کے والد ماجد نے فرمایا) حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا اسوۂ حسنہ کاملہ ہی ہر اعتبار سے ہمارے لئے حجت، مثال اور نمونہ ٹھہرا۔ اب جتنا بھی کوئی اس رنگ میں رنگتا چلا جائے گا۔ اتنا ہی قرآن مجید اس پر نازل ہوتا رہے گا۔ یہ مطلب تھا میرے اس کہنے کا کہ قرآن مجید اس کی سمجھ میں آ سکتا ہے جس پر اس کا نزول ہو۔" (ص ۶۱-۶۰)

مطلب یہ تھا کہ قرآن مجید کو محض ذہنی طور پر نہ سمجھا جائے بلکہ اس کے مقصود و منتہیٰ کو دل کی گہرائیوں میں پیوست کیا جائے۔ اس سے انسانی ذات میں عجیب تغیر واقع ہوگا۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ یہ تغیر کس حد تک پیدا ہو چکا ہے اور اس کی سمت کس طرف کو ہے۔ یہ دیکھنا چاہیئے کہ وہ حضور نبی اکرمؐ کے اسوۂ حسنہ کے کس حد تک مطابق

ہے۔ قرآن فہمی کے اسی مقصود کے متعلق حضرت علامہ نے کہا ہے کہ قرآن کی کیفیت یہ ہے کہ :۔

چوں بجاں در رفت، جاں دیگر شود　　جاں چو دیگر شد، جہاں دیگر شود　　(جاوید نامہ صفحہ ۹)

نزولِ کتاب

اسی کو آپ نے "نزولِ کتاب" سے تعبیر کیا ہے۔ جہاں فرمایا کہ :۔

تیرے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحبِ کشاف　　(بالِ جبریل ص ۱۱۲)

دوسری جگہ کہا کہ : ؎

خرد نے کہہ بھی دیا لاالٰہ تو کیا حاصل　　دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

اس میں ایک یہ نکتہ بھی پنہاں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے، نزولِ قرآن کے سلسلہ میں، قرآن کا مہبط، قلب نبویؐ قرار دیا ہے۔ جہاں فرمایا کہ : فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰی قَلْبِكَ (۲/۹۷) "جبریل نے اسے تیرے قلب پر نازل کیا" لہٰذا جب قرآنی حقائق انسان کے قلب کی گہرائیوں میں اتر جائیں تو اس وقت کہا جا سکے گا کہ قرآن گویا اس پر نازل ہو رہا ہے ــــــــ یعنی اس کے ذہن سے اس کے قلب پر اُتر رہا ہے اس وقت انسان کے افکار و کردار، قرآن کے سانچے میں ڈھل جاتے ہیں۔ یہ وہ "مردِ مسلمان ہے" جس کے متعلق اقبالؒ نے کہا ہے کہ : ؎

یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن　　قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن
(ضربِ کلیم۔ ص ۵۷)

پھر یہ بھی ایک عظیم حقیقت ہے کہ قرآنِ کریم کے ذریعے، خدا اور بندے کے درمیان، عجیب و غریب تعلق پیدا ہوتا ہے۔ خدا کی طرف سے براہِ راست علم ملنے کو وحی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ وحی حضراتِ انبیاء کرامؑ کے لئے مختص تھی اور اس کا سلسلہ حضورؐ کی ذاتِ گرامی پر ختم ہوگیا۔ وحی کو خدا کی طرف سے ہمکلامی کہہ کر بھی پکارا گیا ہے۔ جہاں کہا ہے :۔ وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا (۴/۱۶۴) اور اس نے قرآن مجید کو بھی كَلَامَ اللّٰهِ (۹/۶) کہا ہے۔

خدا سے ہمکلامی

اب ظاہر ہے کہ جب اللہ تعالیٰ (قرآن مجید میں) يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بلکہ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ کہتا ہے تو اس کا مطلب یہی ہے کہ خدا بندے سے ہمکلام ہوتا ہے۔ دوسری طرف انسان جب خدا سے کوئی سوال کرتا ہے تو وہ (قرآن مجید کے ذریعے) اسے اس سوال کا جواب دیتا ہے۔ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ (۲/۱۸۶) کا یہی مطلب ہے۔ لہٰذا قرآن کے ذریعے

انسان کو خدا سے ہم کلامی کا شرف حاصل ہو جاتا ہے اور یہ شرف بڑا عظیم ہے۔

واضح رہے کہ ختمِ نبوت کے بعد، خدا، انسان سے صرف قرآنِ کریم کے ذریعے ہم کلام ہوتا ہے اس کے سوا، خدا سے ہم کلامی کا کوئی طریق نہیں۔ کشف اور الہام وغیرہ کی کوئی سند قرآن سے نہیں ملتی۔

بہرحال، علامہ اقبالؒ قرآن کی تلاوت اس انداز سے کرتے تھے کہ وہ شعور کے راستے قلب کی گہرائیوں میں اتر جائے۔ بایں ہمہ انہیں کشف والہام کا کوئی دعویٰ نہیں تھا۔ چونکہ کائناتی حوادث قوانینِ خداوندی کے مطابق ظہور پذیر ہوتے ہیں اور قرآنِ کریم میں غور و تدبر سے انسان ان قوانین کی کارفرمائی کو سمجھنے لگ جاتا ہے۔ اس لئے اسے قرائن و شواہد سے آنے والے واقعات کا کچھ کچھ اندازہ ہو سکتا ہے۔ علامہ اقبالؒ کو تدبر فی القرآن سے اسی قسم کی بصیرت حاصل تھی۔ اسے وہ ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔ ؎

حادثہ وہ جو ابھی پردۂ افلاک میں ہے　　عکس اس کا میرے آئینۂ ادراک میں ہے

یہاں انہوں نے "آئینۂ ادراک" کہا ہے۔ (یعنی فکر و شعور) کشف والہام یا علمِ باطنی نہیں کہا۔

اب یہ دیکھئے کہ حضرت علامہ، قرآنِ مجید کا تعارف کس کس انداز سے کراتے ہیں۔ اس باب میں انہوں نے جو کچھ کہا ہے اس سے بادنیٰ التفات یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ وہ کارگہِ فکر میں ڈھلے ہوئے الفاظ نہیں جن کی نمود میکانکی طور پر ہو جاتی ہے۔ وہ دل کی گہرائیوں سے ابھرنے والے گہر تابدار ہیں جو جذب و کیف کی ایک دنیا اپنے جلو میں لئے، وجہِ تابانیٔ قلوب و اذہان ہوتے ہیں۔ وہ اپنی پہلی تصنیف "اسرار و رموز" میں کہتے ہیں:-

تو ہمی دانی کہ آئینِ تو چیست؟　　زیرِ گردوں، سرِ تمکینِ تو چیست؟

آں کتابِ زندہ قرآنِ حکیم　　حکمتِ اُو لایزال است و قدیم

نسخۂ اسرارِ تکوینِ حیات　　بے ثبات از قوتش گیرد ثبات

حرفِ او را ریب نے، تبدیل نے　　آیہ اش شرمندۂ تاویل نے

پختہ تر سودائے خام از زورِ او　　در فتد با سنگ جام از زورِ او

نوعِ انساں را پیامِ آخریں　　حاملِ او رحمۃ للعالمین (صفحہ ۱۲۴)

قرآنی آئین ونظام کے اتباع سے انسان کے اندر جو تبدیلی واقع ہوتی ہے اس کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں :-

خستہ باشی! استوارت می کند | پختہ مثل کوہسارت می کند
گر زمینی! آسماں سازد ترا | آنچہ حق می خواہد آں سازد ترا

" آنچہ حق می خواہد آں سازد ترا " ——— اس ایجاز میں جس قدر اطناب پوشیدہ ہیں، ان کا اندازہ اربابِ نظر ہی لگا سکتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ قرآنی تعلیم کے اثمار ونتائج کے متعلق اس سے بہتر اور برجستہ شاید ہی کچھ اور کہا جا سکے۔ اس میں، مشیتِ خداوندی کے مقصود ومطلوب کی پوری دنیا سمٹ کر آگئی ہے (آنچہ حق می خواہد آں سازد ترا) ۔

گفتار میں، کردار میں ، اللہ کی برہان

" اسرار ورموز " ہی میں دوسری جگہ کہتے ہیں :-

قلبِ مومن را کتابش قوت است | حکمتش حبل الورید ملت است (ص۱۱۷)

قرآن، انفرادی طور پر کس قسم کی قلبی ماہیت پیدا کرتا ہے اور اُمت کی اجتماعی زندگی میں کس قدر محکمیت کا ضامن بنتا ہے۔ اس ایک شعر میں دونوں خصوصیات سمو کر رکھ دی گئی ہیں۔

(۵) مثنوی مسافر میں رقمطراز ہیں :-

برخور از قرآں اگر خواہی ثبات | در ضمیرش دیدہ ام آبِ حیات
می دہد مارا پیامِ لاتخف | می رساند بر مقامِ لاتخف (ص۴۳)

حضرات انبیاء کرام، عظیم آسمانی انقلاب کے داعی ہوتے تھے۔ ان کی انقلابی دعوت کے خلاف، مفاد پرست قوتیں، ہجوم کر کے اُمڈ آتی تھیں۔ ان کے ساتھ تزاحم وتخاصم کی ہنگامہ آرائیاں بڑی ہمت طلب اور صبر آزما ہوتی تھیں۔ ان مقامات پر اُنہیں خدا کی طرف سے سکینت وطمانیت کے اس قسم کے پیغامات موجبِ حوصلہ افزائی ہوتے تھے کہ : لَا تَخَفْ إِنَّكَ أَنْتَ الْأَعْلَىٰ (۲۰/۶۸) " تم خوف زدہ مت ہو، آخر الامر تم ہی غالب آؤ گے۔" کم وبیش یہی الفاظ قرآن کریم نے جماعتِ مومنین کے لئے کہے ہیں۔ ان سے کہا ہے کہ ہجوم مشکلات سے گھبراؤ نہیں۔ لَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنْتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ (۳/۱۳۹) جب تمہارا قرآن کی صداقتوں پر ایمان ہے تو پھر گھبرانے اور خوف کھانے کی کون سی بات ہے۔ تم ثابت قدم

رہو۔ آخرالامر تمہیں غالب آؤ گے۔

قرآن کی عظمت

انہوں نے جاوید نامہ میں، قرآنِ کریم کی حقیقت وعظمت کو بڑے وجد آفریں انداز میں بیان کیا ہے:۔

فاش گویم آنچہ در دل مضمر است — ایں کتابے نیست، چیزے دیگر است

قرآنِ مجید کے تفصیلی تذکرہ کے لئے اگر ضخیم تصنیفات بھی قلمبند کی جائیں تو جو بات "چیزے دیگر است" میں کہی گئی وہ ان ضخیم مجلّدات میں بھی سما نہ سکے۔ اس جامعیت میں تو حقائق ورموز کی ایک دنیا جھلمل جھلمل کر رہی ہے یہ وہ آنکھ کی پتلی (مردم دیدہ) ہے جس میں آسمان سمٹ کر آجاتا ہے۔ امیر خسروؒ نے اپنے محبوب کے متعلق کہا تھا کہ:۔

آفاقہا گردیدہ ام، مہر بتاں، ورزیدہ ام — بسیار خوبان دیدہ ام، اما تو چیزے دیگری

اقبالؒ نے یہی الفاظ قرآن کے متعلق کہہ کر، بتا دیا کہ اس کا محبوب کون ہے اور کیا ہے؟ اس شعر کو پڑھئے کیونکہ اس کا مفہوم اس شعر کو ساتھ ملانے سے نمایاں ہو سکے گا جو اس کے بعد آیا ہے:۔

فاش گویم آنچہ در دل مضمر است — ایں کتابے نیست، چیزے دیگر است (ص۹۰)

چوں بجاں در رفت، جاں دیگر شود — جاں چو دیگر شد، جہاں دیگر شود

"جاں چو دیگر شد، جہاں دیگر شود" قرآنِ کریم کے ایک عظیم فلسفۂ حیات ولائحہ انقلاب کی تفسیر ہے۔ اس نے قوموں کی زندگی میں انقلاب آفرینی کا راز یہ بتایا ہے کہ: إِنَّ اللَّهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّىٰ يُغَيِّرُوا مَا بِأَنفُسِهِمْ (۱۳/۱۱) یاد رکھو! (تم خود تو کیا) خدا بھی کسی قوم کے احوال وظروف میں تبدیلی پیدا نہیں کرتا جب تک وہ قوم اپنے اندر نفسیاتی تبدیلی پیدا نہیں کرتی۔ قوم کی خارجی دنیا میں انقلاب آ نہیں سکتا جب تک وہ اپنی داخلی دنیا میں ———— انقلاب نہ پیدا کر لے۔ جب تک کسی قوم کے قلب و دماغ، اس کی فکر ونظر، اس کے تصوّرات وتخیلات، اس کی اقدارِ حیات، اس کے نصب العین زندگی میں تبدیلی نہیں پیدا ہو جاتی، اس کی خارجی دنیا میں تبدیلی نہیں آسکتی۔ قوموں کی خارجی دنیا، ان کی داخلی دنیا کے سانچے میں ڈھلتی ہے۔ جس قسم کی ان کی داخلی دنیا، اسی قسم کی ان کی خارجی دنیا۔ علامہ اقبالؒ پیامِ مشرق کے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ "زندگی اپنے حوالی میں کسی قسم کا انقلاب پیدا نہیں کر سکتی جب تک کہ پہلے اس کی اندرونی گہرائیوں میں انقلاب نہ ہو۔ اور کوئی نئی دنیا خارجی وجود اختیار نہیں کر سکتی جب تک کہ اس کا وجود پہلے انسانوں کے ضمیر

میں مشکل نہ ہو"۔ بنابریں جب قرآنی اقدار کسی قوم کے قلب کی گہرائیوں میں اتر جائیں، تو اس کی خارجی دنیا میں انقلاب آجاتا ہے ؎

چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود — جاں چو دیگر شد، جہاں دیگر شود
اندرو تقدیر ہائے غرب و شرق — سرعتِ اندیشہ پیدا کن چو برق (صہ ۹۱)

قرآن کی بیان کردہ "تقدیرات" کے سمجھنے کے لئے سرعتِ اندیشہ کی ضرورت ہے۔ اس لئے کہ ؎

جہانِ تازہ کی، افکارِ تازہ سے ہے نمود — کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا

جاوید نامہ ہی میں دوسری جگہ کہتے ہیں: ؎

چوں مسلماناں اگر داری جگر — در ضمیرِ خویش و در قرآں نگر
صد جہانِ تازہ در آیاتِ اوست — عصرہا پیچیدہ در آناتِ اوست
یک جہانش عصرِ حاضر را بس است — گیر اگر در سینہ دل معنی رس است
بندۂ مومن ز آیاتِ خداست — ہر جہاں اندر برِ او چوں قباست
چوں کہن گردد جہانے در برش
می دہد قرآں جہانے دیگرش (صہ ۷۳-۷۲)

ان آیات میں جس حسنِ کارانہ اور معجزانہ انداز سے قرآن کی ابدیت کی وضاحت کی گئی ہے۔ جوں جوں انسان اس پر غور کرتا ہے، اس کی روح وجد میں آجاتی ہے۔ یہ نکتہ ذرا تشریح کا محتاج ہے۔ اللہ تعالیٰ نے نوعِ انسان کو منزلِ انسانیت تک لے جانے والے راستے کی طرف راہ نمائی اپنے ذمہ لی اور اس کے لئے حضرات انبیائے کرامؑ کی وساطت سے سلسلۂ رشد و ہدایت جاری کیا۔ جب نوعِ انسان عالمِ طفولیت میں تھی تو اس پروگرام کی صورت یہ تھی کہ اس میں اصولی ہدایات کم ہوتی تھیں اور عملی جزئیات زیادہ ——— اس

آسمانی ہدایت کی ابدیت

زمانے میں تو حالت یہ تھی کہ حضرت نوحؑ کو کشتی بنانے کا طریق بھی بذریعہ وحی بتانا پڑا۔ جوں جوں نوعِ انسان عمر میں بڑھتی گئی اور اس کا شعور پختہ ہونا شروع ...... ہوا تو اس پروگرام کی جزئیات میں کمی اور اصولوں میں اضافہ ہوتا گیا۔ تا آنکہ جب وہ عالمِ شباب تک پہنچ گئی اور مشیت نے دیکھ لیا کہ اب انسان اصولوں کی روشنی میں اپنے وقت کے تقاضوں کے مطابق جزئیات خود مرتب کرنے کے قابل ہو گیا ہے۔ تو اس نے ان تمام اصولوں کو جن کی انسانی راہ نمائی کے

لئے ضرورت تھی مکمل شکل میں، وحی کے آخری ضابطہ، قرآن کریم میں محفوظ کر دیا اور سلسلۂ وحی اختتام تک پہنچ گیا۔ (ختم نبوّت کے یہی معنی ہیں)۔ اب انسانوں کے کرنے کا کام یہ تھا کہ وہ اپنے زمانے کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر قرآن میں غور کریں کہ اس نے، ان کے حل کے لئے کیا اصول دیا ہے اور اس اصول پر عمل پیرا ہونے کے طور طریقے خود وضع کریں۔ اس طرح یہ کتاب، پوری قیامت تک انسانی راہ نمائی کا فریضہ ادا کرتی رہے گی۔ یہ کہیں نہیں کہے گی کہ مجھ میں راہ نمائی دینے کی صلاحیت ختم ہو گئی ہے۔ قرآن سے راہ نمائی حاصل کرنے کے لئے اس طریق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ:۔ سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ۔ (۴۱/۵۳) "ہم انہیں (نوعِ انسان کو) خارجی کائنات اور خود ان کی داخلی زندگی میں اپنی "نشانیاں" دکھاتے جائیں گے۔ تاآنکہ ان پر یہ حقیقت واشگاف ہو جائے کہ قرآن کا ہر دعویٰ صداقت پر مبنی ہے۔" یعنی جوں جوں علمِ انسانی آگے بڑھتا جائے گا۔ قرآنی حقائق بے نقاب ہوتے جائیں گے۔ ایسا ہو سکتا ہے (اور ہوتا ہے) کہ عقل و فکر اور تجربہ اور مشاہدہ کی رُو سے جن حقائق کا ادراک ہو۔ انسان انہیں قرآن کے حوالے سے پیش نہ کرے۔ لیکن اس کے باوجود وہ ہوں گے قرآنی حقائق ہی۔ اس لئے کہ یہ ہو نہیں سکتا کہ علم النفس و آفاق سے کوئی حقیقت بے نقاب ہو اور وہ قرآن کے خلاف جائے۔ ہماری اس ملاقات میں جس کا میں پہلے ذکر کر چکا ہوں۔ حضرت علّامہؒ نے اس حقیقت کو بڑے لطیف اور دقیق انداز سے ارشاد فرمایا۔ ارشاد ہوا کہ:۔

> "قرآنی حقائق کے دماغ کی راہ سے سمجھ میں آنے کا مطلب ہے حقائق کا ادراک، علم اور فکر، تجربے اور مشاہدے کی روشنی میں۔ حقائق کا ادراک ہمیشہ سے جاری تھا۔ کبھی ایک حقیقت سمجھ میں آئی کبھی دوسری، کبھی جزءً کبھی تماماً۔ اب اگر انسان وہ سب حقائق جو اس نے اپنے علم اور تجربے کی روشنی میں حاصل کئے ہیں۔ یا جن تک عقل اور فکر کے ذریعے اس کی رسائی ہوئی باہم فراہم کر لے اور ایک مربوط و منظم شکل میں پیش کرے تو ان سے قرآن پاک ہی کے ارشادات کی تصدیق اور ترجمانی ہو گی۔"

اس کے بعد قدرے توقف سے فرمایا:۔

حقائق کا ادراک ہوتا رہا اور ہوتا رہے گا۔ قرآنِ مجید ان سب حقائق کا جامع ہے جو ہمارے ادراک میں آ چکے ہیں اور ان کا بھی جن کا ادراک باقی ہے، خواہ یہ حقائق سنّوسی کی زبان سے ادا ہوں، خواہ لینن

کی، حقائق بہرحال حقائق ہیں۔ ان کو سمجھنے کی جسطرح بھی کوشش کی جائے اپنی جگہ پر ٹھیک ہے۔ مقصد ان کا سمجھنا ہے اور قبول کرنا ہے۔ لہٰذا، انہیں جس طرح بھی سمجھیں یہ قرآنِ پاک ہی کا سمجھنا ہوگا۔ اس کی تعلیم سے بہرہ ور ہونا ہوگا۔" (اقبالؒ کے حضور۔ صہ ۵۸-۵۷)

اسی حقیقت کو انہوں نے جاوید نامہ میں ان عمیق الفاظ میں بیان کیا ہے کہ :-

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بو   آنکہ از خاکش بروید آرزو !

یا ز نورِ مصطفےٰ اُو را بہاست   یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفےٰ است

یہ نورِ مصطفےٰ وہی ہے جو حضور نبی اکرمؐ کی وساطت سے دنیا کو ملا اور اب قندیلِ قرآنی میں محفوظ ہے۔

یَهْدِي اللَّهُ لِنُورِهِ مَنْ يَشَاءُ... (۲۴/۳۵)

ان تشریحات کی روشنی میں، جاوید نامہ کے ان اشعار کا مطلب سمجھ میں آجائے گا۔ جنہیں میں نے ابھی ابھی پیش کیا ہے کہ :-

صد جہانِ تازہ در آیاتِ اوست   عصرہا پیچیدہ در آناتِ اوست

چو کہن گردد جہانے در برش   می دھد قرآں جہانے دیگرش

اس طرح قرآن کے اصول وحقائق، ہر زمانے کے تقاضوں کی تسکین کا سامان فراہم کرتے اور انسانی زندگی کے ہر مشکل مسئلہ کا حل بتاتے، کاروانِ انسانیت کے راہ نمائی کے چلے جاتے ہیں۔ یہ کسی مقام پر اس کی راہنمائی سے عاجز نہیں آتے۔ یہی وہ حقیقت تھی جسے، گوئٹے نے ایکرمن کو ان الفاظ میں سمجھایا تھا کہ :-

"اسلام کی تعلیم کسی مقام پر بھی ناکام نہیں رہتی۔ ہم اپنے تمام نظامہائے حیات کے ساتھ، اس سے آگے نہیں جاسکتے۔ اور اصل تو یہ ہے کہ کوئی انسان بھی اس سے آگے نہیں جاسکتا۔"

(خطباتِ اقبال - صہ ۸)

یہ ہے قرآن کی ابدیت !

یہاں تک تو قرآنی حقائق سے بحث تھی۔ اب یہ سوال ہے کہ ان حقائق، یا قرآنی اصولِ حیات سے نوعِ انسان کو حاصل کیا ہوا؟ ان کے اتباع سے نتیجہ کیا مرتب ہوا، اور کیا مرتب ہوگا؟ اس اہم سوال کا جواب، علامہ اقبالؒ نے دو لفظوں میں نہایت جامعیت سے دیا ہے جہاں کہا کہ :-

قرآنی انقلاب

چیست قرآں، خواجہ را پیغامِ مرگ ۔۔۔۔۔ دستگیرِ بندۂ بے ساز و برگ (جاوید نامہ صد ۸۹)

"خواجہ را پیغامِ مرگ" کا مطلب یہ ہے کہ قرآن نے، انسانوں پر دوسرے انسانوں کی ہر قسم کی بالادستی کا خاتمہ کر دیا۔ اسی حقیقت کو انہوں نے، "ابلیس کی مجلسِ شوریٰ" میں ابلیس کی زبان سے ان الفاظ میں دہرایا ہے کہ :-

موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لئے ۔۔۔۔۔ نے کوئی فغفور و خاقاں نے فقیرِ رہ نشیں

کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک صاف ۔۔۔۔۔ منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں

اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب ۔۔۔۔۔ پادشاہوں کی نہیں، اللہ کی ہے یہ زمیں

(ارمغانِ حجاز ۔ صد ۲۲۵)

اب آگے بڑھئے۔ حضرت علامہ اس حقیقت کو شرح و بسط سے واضح کرتے ہیں کہ صدرِ اوّل کے مسلمانوں نے جس قدر قوت و حشمت، دولت و ثروت، شوکت و مملکت، رفعت و عظمت اور ان سب کے ساتھ شرف و مجدِ انسانیت کے مقاماتِ بلند حاصل کئے تو وہ سب اتباعِ قرآن کا نتیجہ تھا۔ اس کے بعد اس قوم نے قرآن کا دامن ہاتھ سے چھوڑ کر "عجمی اسلام" اختیار کر لیا تو اس کی وہ حالت ہو گئی جس کا ہم سب رونا روتے ہیں۔ اقبالؒ کو اُمتِ مرحومہ کے ساتھ والہانہ محبت تھی۔ اس محبت کا نتیجہ تھا کہ وہ اس کی نکبت و زبوں حالی پر خون کے آنسو بہاتے تھے۔ انہوں نے اس موضوع پر اس قدر شدت و تکرار سے لکھا ہے کہ اس سے ایک مستقل تصنیف وجود میں آ سکتی ہے۔ لیکن میں اس وقت ان میں سے صرف وہ مقامات پیش کروں گا جن میں انہوں نے براہِ راست قرآن کے حوالے سے بات کی ہے۔ وہ پہلے کہتے ہیں کہ :-

اُمت کی تاریخ

نقشِ قرآں تا دریں عالم نشست ۔۔۔۔۔ نقش ہائے کاہن و پاپا شکست (جاوید نامہ صد ۹)

اس کے بعد کیا ہوا، غور سے سنئے۔ پہلے اس حقیقت کو باحسرت پیش کرتے ہیں کہ :- ؎

منزل و مقصودِ قرآں دیگر است ۔۔۔۔۔ رسم و آئینِ مسلماں دیگر است

در دلِ اُو آتشِ سوزندہ نیست ۔۔۔۔۔ مصطفیٰؐ در سینۂ اُو زندہ نیست

بندۂ مومن ز قرآں برنخورد ۔۔۔۔۔ در ایاغِ اُو نہ مے دیدم نہ دُرد

اس کے بعد کہتے ہیں کہ کس قدر مقامِ حیرت و تأسف ہے کہ :- ؎

خود طلسمِ قیصر و کسریٰ شکست ۔۔۔۔۔ خود سرِ تختِ ملوکیت نشست

تا نہالِ سلطنت قوت گرفت — دینِ او نقشِ از ملوکیت گرفت

از ملوکیت نگہ گردد دگر

عقل و ہوش و رسم و راہ گردد دگر (جاوید نامہ صفحہ ۸۷)

اس قوم میں اس تحیرّ العقول تبدیلی کا راز، اس نکتہ میں پنہاں ہے کہ ان کی خلافت ملوکیت میں بدل گئی۔ خلافت نے انہیں، ہر نوعِ غلامی سے رستگاری عطا کر دی تھی۔ ملوکیت نے ان کی آزادی کو سلب کر لیا۔

چوں خلافت رشتہ از قرآں گسیخت — حریت را زہر اندر کام ریخت (اسرار و رموز صفحہ ۱۴)

اس کا نتیجہ کیا ہوا؟

مومن و پیشِ کساں بستن نطاق — مومن و غداری و فکر و نفاق!

با پشیزے دین و ملت را فروخت — ہم متاعِ خانہ و ہم خانہ سوخت

لا الٰہ اندر نمازش بود و نیست — نازہا اندر نیازش بود و نیست

نور در صوم و صلوٰتِ او نماند — جلوہ در کائناتِ او نماند

روح چوں رفت از صلوٰۃ و از صیام — فرد ناہموار و ملت بے نظام

سینہ ہا از گرمیٔ قرآں تہی — از چنیں مرداں چہ امیدِ بہی

ہر کسے بر جادۂ خود تند رو — ناقۂ ما بے زمام و ہرزہ رو

واحسرتا کہ ؎

صاحبِ قرآں و بے ذوقِ طلب — العجب ثم العجب ثم العجب!

(جاوید نامہ صفحہ ۲۳۵-۳۶)

وہ کہتے ہیں کہ یہ بات کس قدر ناقابلِ فہم ہے کہ جس قوم کے پاس ایسی کتابِ زندہ موجود ہو، وہ قوم مُردہ ہو! وہ بصد حیرت کہتے ہیں کہ ؎

رفت سوزِ سینۂ تاتار و کرد — یا مسلماں مرد یا قرآں بمرد؟ (جاوید نامہ صفحہ ۸۴)

وہ مسلمان سے کہتے ہیں۔

ز قرآں پیشِ خود آئینہ آویز — دگرگوں گشتۂ! از خویش بگریز

ترازوئے بنہ کردارِ خود را — قیامت ہائے پیشیں را برانگیز! (ارمغانِ حجاز صفحہ ۱۰۲)

تحریکِ پاکستان کے دوران ایک عجیب حیرت افزا، اور دل خراش حقیقت سامنے آئی۔ ہندوؤں کا سب سے بڑا لیڈر (مہاتما) گاندھی تھا جس کی تمام تگ و تاز کا مقصد قدیم ہندو دھرم کا احیاء تھا۔ اس کے مقابلے میں قومیت پرست مسلمان لیڈروں کی حالت یہ تھی کہ وہ اسلام کے ایک ایک بنیادی عنصر کو خیر باد کہتے چلے جاتے تھے۔ کہیں ڈاکٹر سید محمود اور آصف علی نما لیڈر تھے جو مذہب کو داستانِ پارینہ قرار دیتے تھے کہیں ڈاکٹر ذاکر حسین خاں جیسے ماہرین تعلیم تھے جو مہاتما گاندھی کے تجویز کردہ خطوط پر "واردھا کی تعلیمی اسکیم" مرتب فرما رہے تھے۔ کہیں امام الہند، مولانا ابوالکلام آزاد تھے جو اسلام کا برہمو سماجی ایڈیشن پیش کر رہے تھے۔ کہیں (شیخ الحدیث، مولانا) حسین احمد مدنی جیسے علمائے کرام تھے جو متحدہ قومیت اور سیکولرازم کو عین مطابقِ اسلام قرار دے رہے تھے۔ یہ تھی وہ سینہ سوز حقیقت جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضرت علامہ نے باصد نالہ و فغاں کہا تھا کہ :-

در صد فتنہ را بر خود کشادی — دو گامے رفتی و از پا فتادی
برہمن از بتاں طاقِ خود آراست — تو قرآں را سرِ طاقے نہادی — (ارمغانِ حجاز) ص ۱۳۶

اور یہ کہ :-

نگہ دارد برہمن کارِ خود را — نمی گوید بکس اسرارِ خود را
بمن گوید کہ از تسبیح بگذر — بدوشِ خود برد زنارِ خود را — (ارمغانِ حجاز) ص ۱۳۷

مُلّا اور قرآن

میرے نزدیک، حضرت علامہ کا سب سے بڑا اور معرکہ آرا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے بکمالِ جرأت و جسارت اس حقیقت کو طشت از بام کیا کہ اُمت کو قرآن سے برگشتہ کرنے کی بنیادی ذمہ داری ہماری مذہبی پیشوائیت پر عائد ہوتی ہے جسے وہ ملّا کی اصطلاح سے تعبیر کرتے ہیں۔ انہوں نے ملّا کے خلاف جو کچھ کہا ہے وہ کسی خاص ملّا یا طبقۂ علماء کے خلاف نہیں۔ وہ مذہبی پیشوائیت کی INSTITUTION کے خلاف ہے۔ جس نے اسلام کو کچھ کا کچھ بنا دیا اور اُمت کو تباہ کر دیا ہے۔ یہ عنوان، ایک مستقل موضوع ہے جسے میں کسی دوسری نشست پر اُٹھا رکھنا چاہتا ہوں۔ اس وقت میں اس کے اُن دو ایک ضمنی گوشوں کو سامنے لاؤں گا۔ جن کا تعلق براہِ راست قرآن سے ہے۔ وہ جاوید نامہ میں سعید حلیم پاشا کی زبان سے کہتے ہیں :-

دینِ حق از کافری رسوا تر است | زانکہ مُلّا مومنِ کافر گر است!
شبنمِ ما در نگاہِ ما یم است | از نگاہِ او یمِ ما شبنم است!
از شگرفیہائے آں قرآں فروش | دیدہ ام رُوح الامیں را در خروش
زانسوئے گردوں دلش بیگانۂ | نزدِ اُو اُمّ الکتاب افسانۂ
بے نصیب از حکمتِ دینِ نبیؐ | آسمانش تیرہ از بے کوکبی!
کم نگاہ و کور ذوق و ہرزہ گرد | ملّت از قال و اقولش فرد فرد

جدید کر ا :۔

مکتب و مُلّا و اسرارِ کتاب | کورِ مادر زاد و نورِ آفتاب!

دینِ کافر، فکر و تدبیرِ جہاد
دینِ ملّا فی سبیل اللہ فساد (جاوید نامہ ص۸۴)

وہ، مثنوی "پس چہ باید کرد" میں کہتے ہیں :۔

مکتب و مُلّا سخنہا ساختند | مومناں ایں نکتہ را نشناختند
زندہ قومے بود، از تاویل مُرد | آتشِ اُو در ضمیرِ اُو فسرد
ہر یکے دانائے قرآں و خبر | در شریعت کم سواد و کم نظر
عقل و نقل افتادہ در بندِ ہوس | منبرِ شاں، منبرِ کاک است و بس
ایں کلیماں نیست اُمید کشود | آستیں ہا بے یدِ بیضا چہ سود (ص۴۲-۴۱)

ان کی تاویل کے متعلق کہتے ہیں :۔

زمن بر صوفی و ملّا سلامے | کہ پیغامِ خدا گفتند مارا
ولے تاویلِ شاں در حیرت انداخت | خدا و جبرئیل و مصطفےؐ را (ارمغانِ حجاز ص۱۰۲)

اس کی تشریح ضربِ کلیم میں ان الفاظ میں کی گئی ہے :۔

خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں | ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق (ص۱۳)

ان کی ان تاویلات و تغیرّات کا نتیجہ ہے کہ :۔

اسی قرآں میں ہے اب ترکِ جہاں کی تعلیم — جس نے مومن کو بنایا مہ و پرویں کا امیر
"تن بہ تقدیر" ہے آج ان کے عمل کا انداز — تھی نہاں جن کے ارادوں میں خدا کی تقدیر
تھا جو "ناخوب" بتدریج وہی "خوب" ہوا — کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر (ضربِ کلیم ص ۸)

پیغام بہ ملت

ملوکیت اور مذہبی پیشوائیت کی قرآن کے خلاف سازش کا تار پود بکھیرنے کے بعد، وہ مسلمان سے براہِ راست مخاطب ہوتے ہیں اور اسے دو ٹوک الفاظ میں کہتے ہیں کہ :-

اے گرفتارِ رسومِ ایماں تو — شیوہ ہائے کافری زندانِ تو
گر تو می خواہی مسلماں زیستن — نیست ممکن جز بقرآں زیستن

قرآنِ کریم نے، کتاب و حکمت۔ یعنی قوانینِ خداوندی اور ان کی غرض و غایت کو منزل من اللہ بتایا ہے۔ جو علم و عقل کی رُو سے سمجھ میں آسکتے ہیں۔ یعنی قرآن، مجموعہ ہے کتاب و حکمت کا۔ اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے علامہ اقبالؒ نے مسافر میں کہا ہے :-

برگ و سازِ ما کتاب و حکمت است — ایں دو قوت اعتبارِ ملت است
آں فتوحاتِ جہانِ ذوق و شوق — ایں فتوحاتِ جہانِ تحت و فوق
ہر دو انعامِ خدائے لایزال — مومناں را آں جمال است ایں جلال

اس کے بعد وہ مسلمانوں سے کہتے ہیں :-

برخور از قرآں اگر خواہی ثبات — در ضمیرش دیدہ ام آبِ حیات
می دہد ما را پیامِ لاتخف — می رساند بر مقامِ لاتخف (مسافر ص ۴۲)

وہ خصوصیت سے مغرب[1] زدہ مسلمانوں کو مخاطب کر کے کہتے ہیں :-

اے بہ تقلیدش اسیر آزاد شو — دامنِ قرآں بگیر آزاد شو

---

[1] "اقبالؒ اور تہذیبِ مغرب" الگ موضوع ہے۔ جس پر میں بہت کچھ لکھ چکا ہوں۔

اب ہم اس موضوع کی طرف آتے ہیں جو فکرِ اقبالؒ میں اساسی حیثیت رکھتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ جب خلافت ملوکیت میں بدل گئی تو اس سے اسلام پر کیا اثر پڑا؟ بظاہر یہ محض سیاسی نظام کی تبدیلی تھی۔ لیکن یہ محض سیاسی نظام کی تبدیلی نہیں تھی۔ اس سے اسلام ہی باقی نہیں رہا۔ اسلام ایک دین ہے (اور دین بھی دین اللہ) ملوکیت سے، یہ دین، مذہب میں تبدیل ہو گیا۔ مذہب نام ہے، خدا اور بندے کے درمیان پرائیویٹ تعلق کا جو (مذہب پرست طبقہ کے عقیدہ کے مطابق) پوجا پاٹ، گیان دھیان، بھگتی اور پرستش کی رُو سے قائم ہو سکتا ہے۔ اس کے پہچاننے اور ماپنے کا کوئی خارجی اور مخصوص معیار نہیں۔ یہ خالص انفرادی احساس کا نام ہے۔ اس کے برعکس، دین اس نظامِ حیات کا نام ہے جس میں انسانوں کے انفرادی اور اجتماعی امور کے فیصلے قوانینِ خداوندی کی رُو سے ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس دین کا قیام اسی صورت میں ممکن ہے کہ اُمتِ مسلمہ کی اپنی آزاد مملکت ہو۔ جس میں احکام و اصول و اقدارِ قرآنی کو قوانینِ مملکت کی حیثیت سے نافذ کیا جا سکے۔ اس مملکت کو قرآنی اصطلاح میں "استخلاف فی الارض" کہا جاتا ہے (۵۵/۲۴) جس کا مخفف "خلافت" ہے۔ قانون محض الفاظ کا مجموعہ ہوتا ہے۔ اسے ایک مؤثر حقیقت اور زندہ نظام بنانے کے لئے قوتِ نافذہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر قانون

دین و مذہب

کے پیچھے قوتِ نافذہ نہ ہو تو وہ وعظ بن کر رہ جاتا ہے۔ قرآنِ کریم نے اسی لئے کتاب کے ساتھ حدید (فولاد یعنی شمشیر) کو بھی منزل من اللہ کہا ہے۔ سورۃ حدید کی آیت ۲۵ بڑی معنی خیز ہے۔ فرمایا، لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ۔ "ہم نے رسولوں کو واضح دلائل و براہین کے ساتھ بھیجا"۔ یعنی ہدایتِ خداوندی کے نافذ العمل کرنے کی پہلی منزل یہ ہے کہ اسے دلیل و برہان کی رُو سے پیش کیا جائے۔ جو لوگ، علم و عقل اور غور و تدبر کے بعد اس کی صداقت کو تسلیم کر لیں۔ انہیں ضابطۂ قوانین کے تابع لایا جائے۔ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ۔ "اور ان رسولوں کے ساتھ ہم نے کتاب (ضابطۂ قوانین) بھی نازل کی۔" اس سے مقصد کیا تھا؟ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ۔ مقصد یہ تھا کہ ان کے معاملات کو از رُوئے عدل و انصاف طے کیا جائے۔ لیکن عدل کا قیام اسی صورت میں ممکن ہو گا جب اس کے فیصلوں کو نافذ کرنے کے لئے قوت بھی موجود ہو۔ اس کے لئے فرمایا: وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ۔۔۔ (۵۷/۲۵) اور اس مقصد کے لئے ہم نے فولاد (شمشیر)

قرآن اور شمشیر

بھی نازل کی۔ اس میں سختی بھی ہوتی ہے اور لوگوں کے لئے منفعت بھی۔ اس کی سختی سے ظالم کو ظلم سے روکا جاتا ہے اور مظلوم کی دادرسی ہوتی ہے۔

جو اس کے لئے منفعت بخش ہوتی ہے۔

علّامہ اقبالؒ کا عظیم کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے اُمّتِ مسلمہ کو اس فراموش کردہ حقیقت کی یاد دلائی کہ:۔ اسلام مذہب نہیں دین ہے اور دین کے معنی ہیں ایسی آزاد مملکت جو قوانین خداوندی کی تنفیذ کے لئے وجود میں لائی جائے۔ انہوں نے پاکستان کا تصوّر اور مطالبہ اسی مقصد کے لئے پیش کیا تھا۔

مملکت کے لئے دو بنیادی عناصر لاینفک ہیں۔ قوانین اور قوّتِ نافذہ۔ جہاں تک قوّت کا تعلق ہے اقبالؒ نے اس سلسلہ میں ایسا پیغام دیا ہے جس میں اسلام کی پوری غرض و غایت سمٹ کر آجاتی ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ قرآن اور تلوار ایک دوسرے کے ساتھ لازم و ملزوم ہیں۔ تیغ کی اس لئے ضرورت ہے کہ قرآن کے قوانین کو عملاً نافذ کیا جاسکے۔ اور قرآن کی اس لئے کہ وہ (تیغ) قوّت کو بےباک نہ ہونے دے۔ اسے حدودِ خداوندی کے اندر رکھ کر استعمال کیا جائے۔ ضربِ کلیم کی وہ مشہور نظم، جس کا عنوان ہی "قوّت اور دین" ہے، ان کے اس پیام کی مظہر ہے:۔

اسکندر و چنگیز کے ہاتھوں سے جہاں میں ‏ سَو بار ہوئی حضرتِ انساں کی قبا چاک
تاریخِ اُمم کا یہ پیامِ ازلی ہے ‏ صاحب نظراں! نشۂ قوّت ہے خطرناک
اس سیلِ سبک سیر و زمیں گیر کے آگے ‏ عقل و نظر و علم و ہنر ہیں خس و خاشاک
لادیں ہو تو ہے زہرِ ہلاہل سے بھی بڑھ کر
ہو دیں کی حفاظت میں تو ہر زہر کا تریاک (ص۲۳)

دوسرے مقام پر اس شمشیر کے متعلق، جو دین کی حفاظت کے لئے استعمال کی جائے۔ کہتے ہیں کہ ؎

اُس بیت کا یہ مصرعِ اوّل ہے کہ جس میں ‏ پوشیدہ چلے آتے ہیں توحید کے اسرار (ص۲۱)

ان کے اس مشہور شعر:۔ ؎

جلالِ پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو ‏ جُدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی
(بالِ جبریل ص۶۲)

میں، سیاست سے مراد، اقتدارِ مملکت ہے اور دین سے مراد، حدودِ خداوندی یا اقدار و اصول۔

لیکن اس قسم کے اشعار کے علاوہ، انہوں نے قرآن اور تیغ کے باہمی رشتے کو جاوید نامہ میں (محترمہ خاتون)۔۔ شرف النساء کی زبان سے، جس حسین اور لطیف انداز میں بیان کیا ہے اس کی مثال کہیں اور نہیں ملتی۔ انہوں نے

لکھا ہے کہ شرف النساء قرآن پاک کی تلاوت کرتیں تو تلوار کو اپنی کمر کے ساتھ پیوست رکھتیں۔ یہ اس کا زندگی بھر کا شعار تھا۔ جب اس کی وفات کا وقت قریب آیا تو:-

برلبِ او چوں دمِ آخر رسید | سوئے مادر دید و مشتاقانہ دید
گفت اگر از رازِ من داری خبر | سوئے ایں شمشیر و ایں قرآں نگر
ایں دو قوّت حافظِ یک دیگر اند | کائناتِ زندگی را محور اند!
وقتِ رخصت با تو دارم ایں سخن | تیغ و قرآں را جدا از من مکن

مومناں را تیغ با قرآں بس است
تربتِ ما را ہمیں ساماں بس است (جاوید نامہ صفحہ ۸۳-۱۸۲)

انہوں نے پیامِ مشرق کے دیباچہ میں، مومن حکمران کے متعلق کہا ہے کہ:-

حکمرانے بود و سامانے نداشت | دستِ او جز تیغ و قرآنے نداشت (صفحہ ۸)

جاوید نامہ میں انہوں نے ملک مظفر کے قصّہ کے ضمن میں کہا ہے کہ:-

مردِ مومن را عزیز اے نکتہ رس | چیست جز قرآن و شمشیر و فرس؟ (صفحہ ۲۴)

میں اسے دُہرا دوں کہ قرآن و شمشیر کے باہمی رشتہ کے متعلق یہ کہہ کر کہ "ایں دو قوّت حافظِ یک دیگر اند" اسلام کی جامع تفسیر بیان کر دی گئی ہے۔ اسلام اسی کا نام ہے! تلوار، قرآن کی حفاظت کرے اور قرآن، تلوار کی۔

اور اب ہم سورۃ حدید کی متعلقہ آیت (۵۷/۲۵) کے پہلے حصّے کی طرف آتے ہیں۔ یعنی کتاب (ضابطہ قوانین)۔ علامہ اقبالؒ نے جب پاکستان کا تصوّر پیش کیا تھا تو یہ حقیقت ان کے پیشِ نظر تھی کہ اس مملکت میں

قانون سازی

سب سے اہم سوال قانون سازی کا ہوگا۔ بظاہر یہ بات بڑی عجیب سی لگتی ہے کہ اسلامی مملکت میں قانون سازی کا مسئلہ اس قدر مشکل ہو! جس اُمّت کے پاس خدا کی کتاب اپنی حقیقی اور غیر محرّف شکل میں موجود ہو۔ اس کے لئے اپنی (اسلامی) مملکت میں قوانین مرتّب کرنے میں کون سی دشواری پیش آسکتی ہے؟ لیکن جاننے والے جانتے ہیں اور پاکستان کی تیس سالہ تاریخ نے اس حقیقت کو واضح کر دیا ہے کہ بحالاتِ موجودہ، اسلامی مملکت کے لئے قانون سازی کا مسئلہ دشوار ترین بلکہ لاینحل ہے۔ یہ اس لئے کہ اُمّت مختلف فرقوں میں بٹی ہوئی ہے اور ہر فرقہ کا ضابطہ قوانینِ شریعت اپنا اپنا

اور الگ الگ ہے۔ اور کوئی فرقہ، اپنی فقہ کو چھوڑنا تو ایک طرف اس میں ذرا سے ردّ و بدل کے لئے بھی تیار نہیں۔ دوسری طرف یہ حقیقت بھی واضح اور مسلّمہ ہے کہ ایک مملکت اسی صورت میں مملکت بن سکتی اور قائم رہ سکتی ہے جب اس میں ایک ضابطہ قوانین نافذ ہو جس کا اطلاق تمام افرادِ مملکت پر یکساں ہو۔ سیکولر حکومتوں نے اس کا حل یہ تجویز اور اختیار کیا کہ مختلف فرقوں کو اس کی اجازت دے دی کہ وہ شخصی معاملات کے لئے اپنی اپنی فقہ پر عمل کریں اور پبلک لاز (مذہب کی دخل اندازی کے بغیر) حکومت مرتب کرے۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس قسم کے نظام کو کبھی اسلامی نہیں کہا جا سکتا۔ اوّل اس لئے کہ قرآن کی رُو سے، پرسنل اور پبلک لاز میں کسی قسم کی تفریق اور تخصیص نہیں کی جا سکتی۔ اس کے نزدیک انسانی زندگی ایک غیر منقسم وحدت ہے۔ جسے پرائیویٹ اور پبلک سیکٹروں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ دوسرے اس لئے کہ پرائیویٹ سیکٹر ہو یا پبلک۔ اسلامی حکومت اس کی مجاز نہیں کہ وہ بلاحدود و قیود (عام اصطلاح میں، مذہب کی دخل اندازی کے بغیر) قوانین مرتب کر سکے۔ وہ حدود اللہ کے اندر رہتے ہوئے ہی قوانین مرتب کر سکتی ہے۔

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے اس اہم ترین (اور بظاہر مشکل ترین مسئلہ کا حل یہ بتایا کہ اسلامی مملکت میں قوانین کی بنیاد خدا کی کتاب، قرآن مجید قرار پاتی ہے۔ جو قوانین اس بنیاد پر مرتب ہوں گے ان میں کوئی اختلاف نہیں ہو گا۔ ان میں نہ پرسنل اور پبلک لاز کی تفریق ہو گی، نہ فرقوں کی تخصیص۔ ان کا اطلاق تمام مسلمانوں پر یکساں ہو گا۔ انہوں نے اس سوال پر، تصورِ پاکستان پیش کرنے کے بعد ہی غور نہیں فرمایا۔ یہ بہت پہلے سے ان کی فکر و تدبر کا مرکز تھا۔ (مثلاً) امرتسر میں اہلِ قرآن کی ایک جماعت تھی جس کے سربراہ، خواجہ احمد دین (مرحوم) تھے۔ ۱۹۲۵ء کا ذکر ہے کہ صوفی غلام مصطفےٰ تبسم نے (جو اب مرحوم ہو چکے ہیں) حضرت علامہ کی خدمت میں یہ تجویز پیش کی کہ قرآنی قوانین مرتب کرنے کے سلسلہ میں خواجہ صاحب کے ساتھ تبادلۂ خیالات مفید ہو سکتا ہے۔ اس کے جواب میں علامہؒ نے صوفی صاحب کو ایک مفصّل خط لکھا، جو (تمہید حذف کرنے کے بعد) درج ذیل کیا جاتا ہے۔ فرمایا:-

"مجھ کو ان کے خیالات سے کسی حد تک پہلے بھی آگاہی ہے۔ کیا اچھا ہو کہ وہ شریعتِ محمدیہ پر ایک مبسوط کتاب تحریر فرمائیں۔ جس میں عبادات و معاملات کے متعلق صرف قرآن سے استدلال کیا گیا ہو۔ "معاملات" کے متعلق خاص طور پر اس قسم کی کتاب کی آجکل شدید ضرورت ہے۔ ہندوستان میں تو شاید اس کے مقبول ہونے کے لئے مدّت درکار ہے۔ ہاں دوسرے اسلامی ممالک میں اس کی ضرورت

کا احساس ہر روز بڑھ رہا ہے۔ شیخ علی رزاق اور دوسرے علمائے مصر کے مباحث سے مولوی
صاحب آگاہ ہوں گے۔ علیٰ ہذا القیاس ترکی میں بھی یہی مسائل زیرِ غور ہیں۔ اس پر ایک آدھ
کتاب بھی تصنیف ہو چکی ہے، اس میں زیادہ تر زمانۂ حال کے مغربی اصولِ فقہ کو ملحوظ رکھ کر فقہ
اسلامی پر بحث کی گئی ہے۔ ترکوں نے جو "چرچ" اور "سٹیٹ" میں امتیاز کر کے ان کو الگ الگ
کر دیا ہے اس کے نتائج نہایت دوررس ہیں اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ افتراق اقوامِ اسلامیہ کے
لئے باعثِ برکت ہوگا، یا شقاوت۔ غرض کہ مولوی صاحب موصوف یا ان کے رفقا کو جو اسلامی
اور مسلمانوں کے دیگر مذہبی لٹریچر پر عبور رکھتے ہیں، اس طرف توجہ کرنی چاہئے۔ میں اور مجھ جیسے اور
لوگ صرف ایک آنکھ رکھتے ہیں۔ ایک مدت سے ہم یہ سن رہے ہیں کہ قرآن کامل کتاب ہے اور
خود اپنے کمال کا مدعی ہے۔ رسالہ "بلاغ" امرتسر کے ہر نمبر میں اور مولوی حشمت صاحب کے
رسالہ۔ "اشاعت القرآن" کے ہر نمبر میں اسی پر بحث ہوتی ہے۔ لیکن ضرورت اس امر کی
ہے کہ اس کے کمال کو علمی طور پر ثابت کیا جائے کہ سیادتِ انسانی کے لئے تمام ضروری قواعد اس
میں موجود ہیں اور اس میں فلاں فلاں آیات سے فلاں فلاں قواعد کا استخراج ہوتا ہے۔ نیز جو
جو قواعد عبادات یا معاملات کے متعلق (بالخصوص مؤخر الذکر کے متعلق) دیگر اقوام میں اس وقت
مروج ہیں، ان پر قرآنی نقطۂ نگاہ سے تنقید کی جائے اور دکھایا جائے کہ وہ بالکل ناقص ہیں اور ان
پر عمل کرنے سے نوعِ انسانی کبھی سیادت سے بہرہ اندوز نہیں ہو سکتی۔ میرا عقیدہ یہ ہے کہ جو
شخص اس وقت قرآنی نقطۂ نگاہ سے زمانۂ حال کے "جورس پروڈنس" پر ایک تنقیدی نگاہ ڈال
کر احکامِ قرآنیہ کی ابدیت کو ثابت کرے گا۔ وہی اسلام کا مجدد ہوگا اور بنی نوعِ انسان کا سب سے بڑا خادم
بھی وہی شخص ہوگا۔ قریباً تمام ممالک میں اس وقت مسلمان یا تو اپنی آزادی کے لئے لڑ رہے ہیں یا
قوانینِ اسلامیہ پر غور و فکر کر رہے ہیں۔ (سوائے ایران و افغانستان کے) مگر ان ممالک میں بھی امروز
فردا یہ سوال پیدا ہونے والا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ زمانۂ حال کے اسلامی فقہا یا تو زمانہ کے میلانِ طبیعت
سے بالکل بے خبر ہیں یا قدامت پرستی میں مبتلا ہیں۔ ایران میں مجتہدینِ شیعہ کی تنگ نظری اور قدامت
پرستی نے بہاء اللہ کو پیدا کیا جو سرے سے احکامِ قرآنی کا ہی منکر ہے۔ ہندوستان میں عام حنفی اس بات
کے قائل ہیں کہ اجتہاد کے تمام دروازے بند ہیں۔ میں نے ایک بہت بڑے عالم کو یہ کہتے سنا کہ حضرت

امام ابوحنیفہؒ کا نظیر ناممکن ہے۔ غرض کہ یہ وقت عملی کام کا ہے۔ کیونکہ میری ناقص رائے میں مذہب اسلام اس وقت گویا زمانے کی کسوٹی پر کسا جا رہا ہے اور شاید تاریخ اسلام میں ایسا وقت اس سے پہلے کبھی نہیں آیا۔"

(اقبالؒ نامہ۔ حصہ اول۔ صا۵-۴۸)

اس خط میں، علاوہ دیگر امور، یہ الفاظ کہ "جس میں صرف قرآن سے استدلال کیا گیا ہو"۔ حضرت علامہؒ کے مرکزی فکر کی بین شہادت پیش کرتے ہیں۔ وہ قرآنِ خالص کو قانون سازی کی اساس قرار دیتے تھے۔ محترم محمد حسین عرشیؔ صاحب نے علامہ سے اپنی ایک ملاقات کے سلسلہ میں کہا ہے:۔

میں نے پوچھا: اسلام بتمامہ قرآن میں محصور ہے یا نہیں؟ فرمایا　مفصّل کہو۔" میں نے کہا: خارج از قرآن ذخیرہ، احادیث و روایات اور کتبِ فقہ وغیرہ کو شامل کر کے اسلام مکمل ہوتا ہے یا صرف قرآن اس باب میں کفایت کرتا ہے؟ آپ نے فرمایا: یہ چیزیں تاریخ و معاملات پر مشتمل ہیں۔ ان کی بھی ضرورت ہے ان سے پتہ چلتا ہے کہ یہ کن ضروریات کے ماتحت وضع کی گئیں لیکن نفسِ اسلام قرآن مجید میں بکمال و تمام آچکا ہے۔ خدائے تعالیٰ کا منشا دریافت کرنے کے لئے ہمیں قرآن سے باہر جانے کی ضرورت نہیں ہے۔　(ملفوظات۔ مرتبہ محمود نظامی۔ ص۴۶-۴۵)

اسی طرح ایک اور نشست میں، گفتگو کے سلسلہ میں (عرشیؔ صاحب نے) فرمایا ہے کہ ایک صاحب نے آمدِ حضرت مسیحؑ کے ضمن میں حضرت علامہ سے کہا کہ آپ لکھ دیجئے کہ آپ حدیث شریف کے مطابق مسیحؑ کی آمدِ ثانی پر اعتقاد رکھتے ہیں۔ علامہ نے فرمایا "میرا یہ اعتقاد نہیں ہے" انہوں نے کہا۔" کیا آپ کو حدیث کی صحت سے انکار ہے۔"؟

آپ نے فرمایا "میں اعتقادی امور میں صرف قرآن پر انحصار رکھتا ہوں اور حدیث کے متعلق مجھے اور آپ سب کو معلوم ہے کہ یہ کن ذریعوں سے ہم تک پہنچی ہے۔"　(ملفوظات ص۵۲-۵۱)

اسی طرح انہوں نے سید سلیمان ندوی (مرحوم) کے نام اپنے ایک خط میں لکھا ہے کہ "مجھے اس سے انکار ہے کہ حدیث قرآن کی ناسخ ہو سکتی ہے۔"　(اقبالؒ نامہ۔ جلد اوّل۔ ص۱۳۵)

صا: واضح رہے کہ یہ ۱۹۳۵ء کی بات ہے۔

اس قسم کی تصریحات، حضرت علامہ کے مکتوبات اور ملفوظات میں جستہ جستہ مقامات پر بکثرت ملتی ہیں لیکن انہوں نے قانون سازی کے موضوع پر، خطباتِ تشکیل جدید کے چھٹے خطبہ میں تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔ چونکہ یہ موضوع بڑا اہم اور بنیادی ہے اس لئے میں چاہتا ہوں کہ یہ بحث بکمال و تمام آپ حضرات کے سامنے آجائے۔ بنابریں، میں اس خطبہ کے متعلقہ مقامات تفصیلاً پیش کر دینا ضروری سمجھتا ہوں۔

جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں، قرآن کریم نے انسانی زندگی سے متعلق اصول و اقدار عطا کئے ہیں اور اسے اُمّتِ مسلمہ پر چھوڑا ہے کہ وہ اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق ان اصولوں کی جزئیات اور ان پر عمل پیرا ہونے کے طور طریقے، باہمی مشاورت سے خود مرتب کرے۔ حضرت علامہؒ اس باب میں تحریر فرماتے ہیں کہ:۔

ثبات و تغیّر کا امتزاج

"اسلام کا پیش کردہ تصوّر یہ ہے کہ حیاتِ کلّی کی روحانی اساس، ازلی و ابدی ہے۔ لیکن اس کی نمود تغیّر اور تنوّع کے پیکروں میں ہوتی ہے۔ جو معاشرہ حقیقتِ مطلقہ کے متعلق اس قسم کے تصور پر متشکل ہو، اس کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ اپنی زندگی میں مستقل اور تغیّر پذیر (جیسے متضاد عناصر) میں تطابق و توافق پیدا کرے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ اس کے پاس، اپنی اجتماعی زندگی کے نظم و ضبط کے لئے مستقل اور ابدی اصول ہوں۔ اس لئے کہ اس دنیا میں جہاں تغیّر کا دور دورہ ہے۔ ابدی اصول ہی وہ محکم سہارا بن سکتے ہیں جن پر انسان اپنا پاؤں ٹکا سکے۔ لیکن اگر ابدی اصولوں کے متعلق یہ سمجھ لیا جائے کہ ان کے دائرہ میں تغیّر کا امکان ہی نہیں۔ وہ تغیّر جسے قرآن نے عظیم آیات اللہ میں شمار کیا ہے، تو اس سے زندگی، جو اپنی فطرت میں متحرک واقع ہوئی ہے۔ یکسر جامد و متصلّب بن کر رہ جائے گی۔ یورپ کو عمرانی اور سیاسی علوم میں جو ناکامی ہوئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے ہاں کوئی ابدی اور غیر متبدّل اصولِ حیات نہیں تھے۔ اس کے برعکس، گزشتہ پانچ سو سال میں اسلام جس قدر جامد اور غیر متحرک بن کر رہ گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے مستقل اقدار کے دائرے میں اصولِ تغیّر کو نظرانداز کر رکھا ہے۔ لہٰذا دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ اسلام کی وضع اور ترکیب میں کون سا اصولِ حرکت کار فرما ہے؟ یہ وہی اصول ہے جسے اجتہاد کہتے ہیں"۔

اس کے بعد وہ اس خطبہ میں مسئلہ اجتہاد پر بڑی تفصیل سے گفتگو کرتے ہیں۔ وہ اجتہادِ مطلق کو اسلام کا بنیادی اصول قرار دیتے ہیں۔ یعنی قرآنی حدود کے اندر رہتے ہوئے قانون سازی کا کلّی اختیار۔ وہ اس اجتہاد

کے متعلق بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"سُنی حضرات ، نظری طور پر تو اس کے قائل ہیں کہ اس قسم کا اجتہاد ممکن ہے ۔ لیکن آئمہ فقہ کے مذاہب کے قیام کے بعد عملاً اس کا دروازہ بند ہے ۔ اس لئے کہ اس قسم کے اجتہاد کے لئے جن شرائط کو ضروری قرار دیا جاتا ہے ۔ ان کا پورا کرنا کسی ایک فرد کے لئے قریب قریب ناممکن ہے ۔ ایک ایسے نظامِ شریعت میں ، جس کی بنیاد قرآن پر ہو جو زندگی کے متعلق حرکیاتی اور ارتقائی تصور کا علمبردار ہے ۔ اس قسم کی ذہنیت کچھ عجیب سی دکھائی دیتی ہے ۔ لہٰذا آگے بڑھنے سے پیشتر یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم ان اسباب و علل کا انکشاف کریں جن کی وجہ سے یہ ذہنیت پیدا ہوئی جس نے قانونِ شریعت کو بجبر منجمد بنا کر رکھ دیا۔"

میں اس وقت ان اسباب و علل کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتا جنہیں علامہ اقبالؒ نے اس جمود و تعطل کا ذمہ دار گردانا ہے ۔ میں ان سے دو ایک اہم نکات پر اکتفا کروں گا ۔ وہ (اپنے اس خطبہ میں) لکھتے ہیں :-

قانون سازی کے لئے قرآنی اصول

"آیئے اب ایک نظر ان اصولوں پر ڈالیں جو قرآن نے قانون سازی کے سلسلہ میں دیئے ہیں ۔ ان پر غور کرنے سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ ان اصولوں کی رُو سے یہ قطعاً نہیں ہوتا کہ انسانی فکر سلب ہو جائے ۔ اور قانون سازی کے لئے کوئی میدان ہی نہ رہے ۔ اس کے برعکس ان اصولوں میں جس قدر وسعت رکھی گئی ہے اس سے انسانی فکر بیدار ہوتی ہے ۔ یہی وہ اصول تھے جن کی راہنمائی سے ہمارے قدیم فقہائے ، قانونِ شرعی کے متعدد نظام (سسٹم) مرتب کئے اور تاریخِ اسلام کا طالب علم اس حقیقت سے واقف ہے کہ سیاسی اور معاشرتی نظامِ زندگی کی حیثیت سے اسلام کو جو اس قدر کامیابی حاصل ہوئی تو اس کا کم از کم آدھا حصہ انہی فقہاء کی بالغ نظری کا رہینِ منت تھا ۔ چنانچہ فان کریمر اس ضمن میں لکھتا ہے کہ :

رومیوں کو چھوڑ کر دنیا میں سوائے عربوں کے اور کوئی قوم
ایسی نہیں جس کے پاس اس قدر احتیاط سے مرتب کردہ
قانونی نظام ہو ۔

لیکن اس تمام ہمہ گیری کے باوجود ، یہ قانونی ضوابط بالآخر انفرادی تعبیرات کا مجموعہ ہیں ۔ اس لئے انہیں

حتمی اور قطعی سمجھ لینا غلط ہے۔ مجھے اس کا علم ہے کہ علمائے اسلام کا یہ عقیدہ ہے کہ ہمارے مشہور مذاہب (اربعہ) اپنی اپنی جگہ مکمل اور مختتم ہیں۔ لیکن نظری طور پر اجتہادِ مطلق کے امکان سے انہیں بھی کبھی انکار نہیں ہؤا۔ میں نے (پچھلے صفحات میں) ان اسباب و علل سے بحث کی ہے جو علماء کی اس ذہنیت کا موجب بنے۔ لیکن چونکہ اب حالات بدل چکے ہیں اور دنیائے اسلام اُن تمام نئی نئی قوتوں سے دوچار اور متاثر ہے جو زندگی کے مختلف گوشوں میں فکرِ انسانی کی نشو و ارتقا سے وجود میں۔۔۔۔ آگئی ہیں، اس لئے مجھے کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ اس قدامت پرستانہ ذہنیت کو باقی رکھا جائے۔ میں پوچھتا ہوں کہ کیا ان مذاہبِ فقہ کے بانیوں میں سے کسی نے بھی اپنی تعبیرات و تاویلات کو کبھی قطعی، کامل، مختتم اور سہو و خطا سے مبرا سمجھا؟ کبھی نہیں۔ اس لئے اگر دورِ حاضر کے اعتدال پسند مسلمان، زمانے کے بدلے ہوئے حالات اور اپنے تجربہ کی روشنی میں فقہ کے اصول اساسی کی نئی تعبیرات کرنا چاہتے ہیں تو ان کا یہ طرزِ عمل میرے خیال میں بالکل بجا اور درست ہے۔ خود قرآن کی یہ تعلیم کہ حیات، ایک ترقی پذیر عملِ ارتقا ہے۔ اس کی مقتضی ہے کہ ہر نئی نسل کو اس کا حق ہونا چاہئیے۔ کہ وہ اپنی مشکلات کا حل خود تلاش کرے۔ وہ ایسا کرنے میں سلف کے علمی سرمایہ سے راہ نمائی لے سکتی ہیں لیکن اسلاف کے فیصلے ان کے راستے میں روک نہیں بن سکتے۔"

وہ اس قسم کی ماضی پرستی کو تاریخ کا جھوٹا احترام قرار دیتے ہیں۔ اس ضمن میں وہ کہتے ہیں کہ:۔

"قوموں کے زوال کا علاج ان کے ماضی کی تاریخ کے جھوٹے احترام اور اس کے مصنوعی احیاء سے نہیں ہو سکتا۔ جیسا کہ دورِ حاضر کے ایک مصنف نے لکھا کہ:۔

> "تاریخ کا فیصلہ یہ ہے کہ وہ خیالات اور نظریات جو اپنی توانائی کھو کر فرسودہ ہو چکے ہوں، ان لوگوں میں کبھی پھر سے توانائی حاصل نہیں کر سکتے جنہوں نے انہیں فرسودہ بنا دیا ہو۔

تیرھویں صدی اور اس کے بعد کے علماء کا رجحان کہ ماضی کی جھوٹی تقدیس سے جماعتی نظم کو جامد اور متصلب طور پر قائم رکھا جائے، اسلام کی روح کے یکسر خلاف تھا"

اور اس نکتہ کی تشریح کرتے ہوئے کہتے ہیں:۔

"اسلام میں اجتہاد کا دروازہ بند کر دینا، اسلام کے خلاف افتراء ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہوئی کہ مسلمانوں میں قانون کے تصور نے ایک خاص معین شکل اختیار کر لی اور ایک وجہ یہ کہ قوموں کے زوال کے زمانہ میں ذہنوں میں اسقدر جمود اور تساہل پیدا ہو جاتا ہے کہ بڑے بڑے مفکرین کو انسان سمجھنے کے بجائے، معبود بنا دیا جاتا ہے۔ اگر علمائے متاخرین میں سے بھی بعض نے اس "افترا" کو برقرار رکھا ہے تو وہ ان کا اپنا فعل ہے۔ دورِ حاضر کا مسلمان اس کا پابند نہیں کہ جس طرح انہوں نے برضا و رغبت اپنی فکری آزادی کو (اپنے خود ساختہ معبودوں کی) نذر کر دیا تھا۔ یہ بھی اپنی آزادی کو سلب ہو جانے دیں۔ علامہ سرخسیؒ (دسویں صدی میں) لکھتے ہیں:۔

اگر اس افترار کے حامی یہ سمجھتے ہیں کہ پہلے زمانے کے مفکرین و مصنفین کو زیادہ سہولتیں حاصل تھیں اور ان کے مقابلہ میں متاخرین کے راستے میں بہت دشواریاں ہیں تو ایسا سمجھنا سراسر حماقت ہے۔ اس لئے کہ اس معمولی سی بات کے سمجھنے کے لئے کسی افلاطون کی عقل کی ضرورت نہیں کہ متقدمین کے مقابلہ میں متاخرین کے لئے اجتہاد زیادہ آسان ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اب قرآن اور سنت کی اس قدر تفسیریں اور شرحیں لکھی جا چکی ہیں کہ ہمارے زمانے کے مجتہد کے پاس، تعبیرات کے لئے کافی سے زیادہ مسالہ موجود ہے (جو متقدمین کے پاس نہیں تھا)۔"

ان تصریحات سے واضح ہے کہ علامہ اقبالؒ کے نزدیک، مروّجہ فقہ (خواہ وہ کسی فرقہ کی فقہ ہو) ناقابلِ تغیر نہیں۔ اس میں قرآن کی روشنی میں، موجودہ زمانے کے تقاضوں کے مطابق، تبدیلیاں از بس ضروری اور ناگزیر ہیں۔ لیکن ایسا کہتے وقت وہ اس حقیقت سے بھی بے خبر نہیں تھے کہ:۔

"بدقسمتی سے ہمارے ہاں کا قدامت پرست طبقہ فقہ کے متعلق کسی ناقدانہ گفتگو کے لئے تیار نہیں۔ اگر اس قسم کی بحث چھڑ دی جائے تو بہت سے لوگوں کے لئے ناگواری کا باعث ہو جائے گی۔"

لیکن انہوں نے کہا کہ:۔

"بااین ہمہ، میں مسئلہ زیرِ نظر کے متعلق چند معروضات پیش کرنے کی جسارت ضرور کروں گا۔ سب سے پہلے ہمیں اس حقیقت کو پیشِ نظر رکھنا چاہیئے کہ قرنِ اوّل سے لے کر عباسیوں کے زمانے کے آغاز تک مسلمانوں میں قرآن کے سوا، کوئی تحریری قانون موجود نہیں تھا۔"

علامہ اقبالؒ کی یہی جسارت تھی جس کی وجہ سے وہ اربابِ دانش کی نگاہوں میں اس قدر واجب التکریم و تحریم بن گئے تھے۔ خود انہی کے الفاظ میں :-

آئینِ جواں مرداں، حق گوئی و بیباکی اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

یہاں تک بحث فقہ کے متعلق تھی۔ لیکن اس سے کہیں نازک مقام وہ ہے جہاں احادیث کا سوال سامنے آتا ہے۔ فقہ کی نسبت تو پھر بھی غیر از انبیاءؑ حضرات کی طرف ہوتی ہے۔ لیکن جب بات اُن ارشادات و اعمال کے متعلق ہو جن کی نسبت رسول اللہؐ کی طرف کی جائے تو ان کی بابت یہ کہنا کہ اسلامی مملکت ان میں بھی تبدیلی کر سکتی ہے۔ بہت بڑی جرأت کا متقاضی ہے۔ مبداءِ فیض کی یہ انتہائی گرم گستری تھی کہ اس نے علامہؒ اقبال کو اس قسم کی جرأت و بسالت سے بھی نوازا تھا۔ چنانچہ انہوں نے اس سوال پر بھی (اپنے خطبہ میں) بڑی تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ اس باب میں وہ لکھتے ہیں:-

احادیث کی قانونی حیثیت

"احادیث کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جن کی حیثیت قانونی ہے اور دوسری وہ جو قانونی حیثیت نہیں رکھتیں۔ اوّل الذکر کے بارے میں ایک بڑا اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے۔ کہ وہ کس حد تک ان رسوم و رواج پر مشتمل ہیں جو اسلام سے پہلے عرب میں رائج تھے اور جن میں سے بعض کو رسول اللہ صلعم نے علیٰ حالہ رکھا اور بعض میں ترمیم فرما دی۔ آجکل یہ مشکل ہے کہ ان چیزوں کو پورے طور پر معلوم کیا جاسکے کیونکہ ہمارے متقدمین نے اپنی تصانیف میں زمانہ قبل از اسلام کے رسوم و رواج کا زیادہ ذکر نہیں کیا۔ نہ ہی یہ معلوم کرنا ممکن ہے کہ جن رسوم و رواج کو رسول اللہ صلعم نے علیٰ حالہ رکھا (خواہ اُن کے لئے واضح طور پر حکم دیا ہو یا ویسے ہی ان کا استصواب فرما دیا ہو) انہیں ہمیشہ کے لئے نافذ العمل رکھنا مقصود تھا۔ اس موضوع پر شاہ ولی اللہؒ نے بڑی عمدہ بحث کی ہے جس کا خلاصہ میں یہاں بیان کرتا ہوں۔ شاہ صاحبؒ نے کہا ہے کہ پیغمبرانہ طریقِ تعلیم یہ ہوتا ہے کہ رسول اللہؐ کے احکام ان لوگوں کے عادات و اطوار اور

رسوم ورواج کو خاص طور پر ملحوظ رکھتے ہیں۔ جو اس کے اوّلین مخاطب ہوتے ہیں۔ پیغمبرؐ کی تعلیم کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ وہ عالمگیر اصول عطا کر دے۔ لیکن نہ تو مختلف قوموں کے لئے مختلف اصول دیئے جا سکتے ہیں اور نہ ہی انہیں بغیر کسی اصول کے چھوڑا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے مسلک زندگی کے لئے جس قسم کے اصول چاہیں وضع کر لیں۔ لہٰذا پیغمبر کا طریق یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک خاص قوم کو تیار کرتا ہے اور انہیں ایک عالمگیر شریعت کے لئے بطور خمیر استعمال کرتا ہے۔ اس مقصد کے لئے وہ اُن اصولوں پر زور دیتا ہے۔ جو تمام نوعِ انسانی کی معاشرتی زندگی کو اپنے سامنے رکھتے ہیں لیکن ان اصولوں کا نفاذ اس قوم کے عادات وخصائل کی روشنی میں کرتا ہے جو اس وقت اس کے سامنے ہوتی ہے۔ اس طریقِ کار کی رُو سے رسولؐ کے احکام، اس قوم کے لئے خاص ہوتے ہیں اور چونکہ ان احکام کی ادائیگی بجائے خویش مقصود بالذات نہیں ہوتی، انہیں آنے والی نسلوں پر من وعَن نافذ نہیں کیا جا سکتا۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ امام اعظم ابوحنیفہؒ نے (جو اسلام کی عالمگیریت کی خاص بصیرت رکھتے تھے) اپنی فقہ کی تدوین میں حدیثوں سے کام نہیں لیا۔ انہوں نے تدوینِ فقہ میں استحسان کا اصول وضع کیا جس کا مفہوم یہ ہے کہ قانون وضع کرتے ہوئے اپنے زمانے کے تقاضوں کو سامنے رکھنا چاہئے۔ اس سے احادیث کے متعلق ان کے نقطۂ نظر کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ نے تدوینِ فقہ میں احادیث سے اس لئے کام نہیں لیا کہ ان کے زمانہ میں احادیث کے کوئی باضابطہ مجموعے مرتب نہیں ہوئے تھے۔ اوّل تو یہ کہنا ہی درست نہیں کہ ان کے زمانے میں احادیث کے مجموعے موجود نہیں تھے۔ امام مالکؒ اور زہری کے مجموعے ان کی وفات سے قریب تیس سال پہلے مرتب ہو چکے تھے۔ لیکن اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ یہ مجموعے امام صاحبؒ تک پہنچ نہیں پائے تھے یا ان میں قانونی حیثیت کی احادیث موجود نہیں تھیں، تو اگر امام صاحبؒ اس کی ضرورت سمجھتے تو وہ احادیث کا اپنا مجموعہ مرتب فرما سکتے تھے۔ جیسا کہ امام مالکؒ اور ان کے بعد امام احمد بن حنبلؒ نے کیا تھا۔ ان حالات کی روشنی میں، میں بھی یہ سمجھتا ہوں کہ ان احادیث کے متعلق جن کی حیثیت قانونی ہے۔ امام ابوحنیفہؒ کا یہ طرزِ عمل بالکل معقول اور مناسب تھا اور اگر آج کوئی وسیع النظر مقنّن یہ کہتا ہے کہ احادیث ہمارے لئے من وعَن شریعت کے احکام نہیں بن سکتیں تو اس کا طرزِ عمل امام ابوحنیفہؒ کے طرزِ عمل

کے ہم آہنگ ہو گا۔ جن کا شمار فقہ اسلامی کے بلند ترین مقننین میں ہوتا ہے۔"

احادیث کے متعلق امام ابو حنیفہؒ کا یہ طرزِ عمل اور علامہ اقبالؒ کی طرف سے اس کی تائید، قرآن کریم کی تعلیم کے عین مطابق تھی۔ دین کے اصول حضورؐ نبی اکرم کو خدا کی طرف سے بذریعہ وحی عطا ہوئے تھے۔ ان میں کسی قسم کے تغیر و تبدل کا سوال پیدا نہیں ہوتا تھا۔ لیکن دین کے ان اصولوں پر عمل پیرا ہونے کے طور طریقے بذریعہ وحی متعین نہیں ہوتے تھے۔ ان کے متعلق حضورؐ کو حکم خداوندی تھا کہ :-

شَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ (۳/۱۵۷) "ان کا تعین اپنے رفقاء کے ساتھ مشورہ سے کیا کرو"۔

اب ظاہر ہے کہ جو امور باہمی مشاورت سے طے ہوں، وہ وحی کی طرح ابدی اور غیر متبدل نہیں ہو سکتے۔ حضورؐ نے بھی ان جزئیات کو صحابہؓ کے ساتھ مشورہ سے طے فرمایا۔ اور حضورؐ کے بعد جماعت مومنین کے متعلق بھی کہا گیا کہ :-

وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ (۴۲/۳۸) "یہ اپنے معاملات باہمی مشاورت سے طے کریں"۔

یہ طریق عمل دورِ خلافتِ راشدہ میں جاری رہا۔ اس وقت تک یہ بات کسی کے حیطۂ خیال میں بھی نہیں تھی کہ یہ فیصلے ابدی طور پر غیر متبدل رکھے جائیں گے۔ یہ تصور خلافتِ راشدہ کے باقی نہ رہنے کے بعد پیدا ہوا۔ احادیث رسول اللہؐ (اور ان کے مطابق صحابہؓ کے عمل) کو ابدی طور پر غیر متبدل قرار دینے کا تصور امام مالکؒ اور ان سے کہیں بڑھ کر امام شافعیؒ نے پیش کیا تھا۔ اس مسلک پر امام ابو حنیفہؓ نے کڑی تنقید کی۔ اور قیاس کو قانون کا ماخذ قرار دیا۔ قیاس سے مراد ہے کسی حکم یا فیصلہ کو عقل و بصیرت کی رو سے اس سے ملتے جلتے حالات پر منطبق کرنا۔ علامہ اقبالؒ ان کی اس نزاع پر گفتگو کرتے ہوئے امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کے متعلق لکھتے ہیں :-

"انہوں نے اپنے آپ کو ان نظائر کے دائرہ میں محدود کر لیا جو عہدِ رسالت مآبؐ اور عہد صحابہؓ میں وقوع میں آئے تھے۔ ان سے اُن کی نگاہ کا دائرہ بہت تنگ ہو کر رہ گیا۔ انہوں نے بات تو یہاں سے شروع کی تھی کہ اہمیت ٹھوس واقعات کو حاصل ہے۔ لیکن انہوں نے ایک خاص دَور کے ٹھوس واقعات کو ابدی اور غیر متبدل سمجھ لیا اور خاص واقعات سے متعلق احکام کو اس قسم کے ملتے جلتے واقعات پر منطبق کرنے کے لئے قیاس سے شاذونادر کام لیا۔ ان کے برعکس، ان کی سخت تنقید میں مذہبِ حنفیہ کے لئے (ایک رنگ میں) بڑی مفید

"ثابت ہوئیں۔ اس سے انہوں نے محسوس کر لیا کہ اصولِ قانون سازی کی تعبیر میں، زندگی کی حقیقی واقعاتی نقل و حرکت اور تنوّع کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے۔ یہی وجہ ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کا مکتبِ فقہ، جس نے ان مباحث کے نتائج کو اچھی طرح جذب کر لیا تھا اپنے خاص الخاص اصولِ فقہ میں بالکل آزاد ہے اور دیگر مذاہبِ فقہ و تشریح کے مقابلہ میں، حالات سے مطابقت کی بڑی صلاحیت اپنے اندر رکھتا ہے"۔

اور اس کے بعد وہ کہتے ہیں:-

"لیکن جائے حیرت ہے کہ موجودہ حنفی علماء نے، خود اپنے مکتبِ فقہ کی روح کے خلاف، امام ابوحنیفہؒ اور ان کے رفقاء کے فیصلوں کو ابدی اور غیر متبدّل قرار دے رکھا ہے۔ بعینہٖ اسی طرح جس طرح امام ابوحنیفہؒ پر تنقید کرنے والوں نے ان فیصلوں کو ابدی اور غیر متبدّل قرار دے لیا تھا جو عہدِ رسالت مآبؐ اور صحابہؓ میں پیش آمدہ مقدمات کے سلسلہ میں نافذ ہوتے تھے"۔

ان تصریحات سے ——— یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ علامہ اقبالؒ کے نزدیک اسلامی مملکت میں قانون سازی کا بنیادی اصول یہ تھا کہ ابدی اور غیر متبدّل قرآنی احکام و اصول وحدود ہیں۔ ان حدود کے اندر جو فیصلے ماضی میں کئے گئے تھے یا جو بعد کی اسلامی مملکت کرے۔ ان میں تغیر و تبدّل کیا جا سکتا ہے۔ لیکن انہیں اس کا بھی بخوبی احساس تھا کہ ایسا کرنے کے لئے بڑی جرأت و بسالت کی ضرورت ہوگی۔ اس باب میں وہ کہتے ہیں کہ

"وہ سب سے بڑا سوال جو اس وقت اس کے (ترکی کے) اور جو زُود یا بدیر دیگر مسلم اقوام کے سامنے آنے والا ہے، یہ ہے کہ اسلامی قوانینِ شریعت میں ارتقاء کی گنجائش ہے یا نہیں؟ یہ سوال بڑا اہم ہے اور بہت بڑی ذہنی جدوجہد کا متقاضی۔ اس سوال کا جواب یقیناً اثبات (ہاں) میں ہونا چاہئے بشرطیکہ اسلامی دنیا اُس کی طرف عمرؓ کی روح کو لے کر آگے بڑھے وہ عمرؓ جو اسلام کا سب سے پہلا تنقیدی اور حریّت پسند قلب ہے جسے رسول اللہؐ کی حیاتِ طیبہ کے آخری لمحات میں یہ کہنے کی جرأت نصیب ہوئی کہ:-

رُوحِ عمری

حسبنا کتاب اللہ
"ہمارے لئے خدا کی کتاب کافی ہے"

وہ اپنے اس خطبہ کا خاتمہ ان الفاظ پر کرتے ہیں :-

"اسلام کا بنیادی تخیل یہ ہے کہ اب وحی کا دروازہ بند ہو چکا ہے۔ اس بنا پر ہمیں دنیا کی سب سے زیادہ آزاد قوم ہونا چاہیئے۔ پہلے زمانے کے مسلمان جو ایشیائے قبل از اسلام کی روحانی غلامی سے ابھی نئے نئے آزاد ہوئے تھے، اس پوزیشن میں نہیں تھے کہ (ختمِ نبوت کے) اس بنیادی تخیل کی اہمیت کا صحیح صحیح اندازہ کر سکتے۔ لیکن دورِ حاضر کے مسلمان کو چاہیئے کہ وہ اپنی پوزیشن کو اچھی طرح سے سمجھے۔ (قرآن کے) غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں اپنے معاشرہ کی تشکیلِ جدید کرے اور وہ عالمگیر جمہوریت قائم کر کے دکھا دے جو اسلام کی اصل وغایت ہے لیکن جو ابھی تک پورے طور پر بے نقاب ہو کر دنیا کے سامنے نہیں آئی۔"

یہ ۱۹۲۸ء کی بات تھی۔ انہوں نے ۱۹۳۲ء میں اپنے ایک بیان میں، جو روزنامہ انقلاب (لاہور) کی ۲۳ مارچ کی اشاعت میں شائع ہوا تھا، فرمایا :-

"ہمارے دین کی یہ عظیم الشان بلند نظری، ملّاؤں اور فقیہوں کے فرسودہ اوہام میں جکڑی ہوئی ہے اور آزادی چاہتی ہے۔ روحانی اعتبار سے ہم حالات و جذبات کے ایک قید خانے میں محبوس ہیں جو صدیوں کی مدت میں ہم نے اپنے گرد خود تعمیر کر لیا ہے اور ہم بوڑھوں کے لئے شرم کا مقام ہے کہ ہم نوجوانوں کو ان کی اقتصادی، سیاسی، بلکہ مذہبی بحرانوں کا مقابلہ کرنے کے قابل نہ بنا سکے جو زمانۂ حاضر میں آنے والے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ساری قوم کی موجودہ ذہنیت کو یکسر تبدیل کر دیا جائے تاکہ وہ پھر نئی آرزوؤں، نئی تمناؤں اور نئے نصب العین کی اُمنگ کو محسوس کرنے لگے۔" (بحوالہ ماہنامہ فکر و نظر بابت جنوری - فروری ۱۹۷۸ء)

میں سمجھتا ہوں کہ اس باب میں کچھ اور کہنے کی ضرورت نہیں۔ اگر تشکیلِ پاکستان کے بعد حضرت علامہؒ ہم میں موجود ہوتے تو وہ انہی اصولوں کے مطابق مملکتِ اسلامیہ پاکستانیہ کے لئے آئین و ضوابط مرتب کر دیتے یا کرا دیتے اور وہ ضابطہ پھر مسلمانوں کی ہر اس مملکت کے لئے جو حقیقی معنوں میں "اسلامی" بننا چاہتی، خضرِ راہ ثابت ہوتا۔ اس طرح یہ اُمت ان جکڑبندیوں سے، آزادی حاصل کر لیتی جن میں یہ صدیوں سے محبوس چلی آ رہی ہے۔

اب میں ایک اعتراض کی طرف آرہا ہوں۔ ظاہر ہے علامہ اقبالؒ نے پاکستان کا تصور اس لئے دیا تھا کہ اس وقت مسلمانوں کی کسی مملکت میں قرآنی نظام رائج نہیں تھا اور وہ چاہتے تھے کہ ایک ایسا خطۂ زمین حاصل کیا جائے جسے قرآنی نظام کی تجربہ گاہ بنایا جائے۔ جب اس خطۂ زمین میں قرآنی نظام برگ و بار لائے گا تو اس کے قابلِ صد رشک و موجبِ ہزار افتخار نتائج کو دیکھ کر مسلمانوں کی دیگر مملکتیں بھی اس نظام کو اپنے ہاں رائج

کیا یہ ممکن العمل بھی ہے؟

کرنے پر آمادہ ہو جائیں گی اور اس کے بعد اس کا بھی امکان ہے کہ اس نظام کے انسانیت ساز اثمار کو دیکھ کر غیر مسلم ممالک بھی اس کی طرف چلے آئیں۔ یہ تھی علامہ اقبالؒ کی آرزو اور مطالبۂ پاکستان کا جذبۂ محرکہ۔ لیکن اس تمیں سال کے عرصہ میں، نہ تو پاکستان میں قرآنی نظام رائج ہوا اور نہ ہی مسلمانوں کی کسی اور مملکت نے اس کی طرف توجہ کی۔ اس سے معترضین یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ حضرت علامہ کی یہ آرزو محض شاعرانہ تخیل پر مبنی تھی۔ قرآن میں کسی زمانہ میں تو اس کی صلاحیت تھی کہ اس کی بنیادوں پر ایک قابلِ عمل نظامِ حکومت وجود میں آیا۔ لیکن اب وہ زمانہ لد گیا۔ اب اس میں اس کی صلاحیت نہیں رہی۔ میں نے اس قسم کے اعتراضات کا تفصیلی جواب اپنے اس خطاب میں دیا ہے۔ جس کا عنوان ہے۔ "کیا اسلام ایک چلا ہوا کارتوس ہے"؟ ۔ اس مقام پر میں صرف حضرت علامہؒ کی تصریحات پیش کرنے پر اکتفا کروں گا۔

جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے، قرآن، سلسلۂ رشد و ہدایتِ خداوندی کی آخری کڑی ہے جس میں تمام نوعِ انسان کے لئے ابدی حقائق محفوظ کر دیئے گئے ہیں۔ "تمام نوعِ انسان کے لئے" اور "ابدی طور پر" کے معنی یہ ہیں کہ قرآنی راہ نمائی نہ کسی خاص قوم کے لئے مختص ہے اور نہ ہی کسی خاص زمانے تک محدود۔ اللہ تعالیٰ نے اسے ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ (۳۸/۸۷) کہا ہے۔ یعنی تمام اقوام کے لئے ضابطۂ حیات۔ دوسرے مقام پر اس کی تشریح ان الفاظ سے کر دی کہ "اس کی مثال ایک ایسے درخت کی ہے۔ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّ فَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ ۝ جس کی جڑیں پاتال میں ہوں اور شاخیں آسمان کو چھو رہی ہوں۔ تُؤْتِيْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍۢ بِاِذْنِ رَبِّهَا (۱۴/۲۴-۲۵) اور وہ قانونِ خداوندی کے مطابق۔ ہر زمانے میں اپنے پھل دیتا جائے۔ حضرت علامہؒ کے الفاظ میں :- ؎

یہ نغمہ فصلِ گل و لالہ کا نہیں پابند ۔۔۔ بہار ہو کہ خزاں لا الٰہ الا اللہ (ضربِ کلیم)

اس لئے قرآن کی یہ صورت نہیں کہ کوئی خاص قوم اس پر عمل پیرا نہ ہو یا اسے ترک کر دے تو یہ اپنے نتائج پیدا

کرنا چھوڑ دے۔ اگر دنیا میں کوئی شخص بھی ایسا نہ رہے جو پانی کی دیگچی کو آگ پر رکھے تو اس سے پانی اپنی اس خاصیت کو کھو نہیں دے گا کہ وہ ایک خاص درجۂ حرارت پر پہنچ کر بھاپ بن جاتا ہے۔ جب بھی کوئی شخص اسے آگ پر رکھے گا اس کی مضمر خاصیت مشہود ہو جائے گی۔ قرآنِ مجید ایک عالمگیر ضابطۂ حیات ہے۔ دنیا کی جو قوم جس زمانے میں بھی اسے اپنا ضابطۂ زندگی قرار دے گی اس کے خوشگوار نتائج سے بہرہ یاب ہو جائے گی۔ علامہ اقبالؒ نے قرآنی نظام کے قیام کے لئے ہندی مسلمانوں کے لئے آزاد مملکت کا مطالبہ اس لئے کیا تھا کہ انہیں اپنی ملت سے بے پناہ محبت تھی اور وہ ہزار جان سے چاہتے تھے کہ اس شجرِ طیّب کے حیات آور پھل سب سے پہلے اس کی جھولی میں گریں۔ مسلمانوں سے ان کی عمر بھر یہی تاکید رہی کہ ہرچند یہ اُمّت بکیفیتِ دزدوں حالی کا شکار ہے، اس میں بظاہر زندگی کا کوئی نشان دکھائی نہیں دیتا، اس میں کوئی کشش اور جاذبیت باقی نہیں رہی، اس کے باوجود، اس کے ساتھ پیوستہ رہنا ضروری ہے۔ بانگِ درا کی وہ نظم بڑی مشہور ہے جس میں انہوں نے کہا ہے کہ:-

ڈالی گئی جو فصلِ خزاں میں شجر سے ٹوٹ | ممکن نہیں ہری ہو سحابِ بہار سے
ہے لازوال عہدِ خزاں اس کے واسطے | کچھ واسطہ نہیں ہے اسے برگ و بار سے
ہے تیرے گلستاں میں بھی فصلِ خزاں کا دور | خالی ہے جیبِ گل زرِ کامل عیار سے
جو نغمہ زن تھے خلوتِ اوراق میں طیور | رخصت ہوئے ترے شجرِ سایہ دار سے
شاخِ بریدہ سے سبق اندوز ہو کہ تو | ناآشنا ہے قاعدۂ روزگار سے

ملت کے ساتھ رابطۂ استوار رکھ
پیوستہ رہ شجر سے اُمیدِ بہار رکھ

(بانگِ درا صفحہ ۲۸۰)

دوسری جگہ بڑی دلسوزی کے ساتھ کہتے ہیں کہ :-

کہن شاخے کہ زیرِ سایۂ او پر برآوردی | چوں برگش ریخت از وے آشیاں برداشتن ننگ است

اس زوال پذیر اُمّت کے ساتھ ان کی یہ محبت تھی جس کی بنا پر وہ چاہتے تھے کہ قرآنی نظام کی نشأۃِ ثانیہ کی آماجگاہ اسی قوم کا صحن ہو لیکن اس کے ساتھ، اللہ تعالیٰ کی یہ تنذیر بھی ان کے سامنے تھی۔ جس میں کہا گیا کہ، وَاِنْ تَتَوَلَّوْا یَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَیْرَکُمْ ثُمَّ لَا یَکُوْنُوْٓا اَمْثَالَکُمْ (۴۷/۳۸) " اگر تم نے اس قرآن سے اعراض برتا تو خدا تمہاری جگہ کوئی دوسری قوم لے آئے گا جو تمہارے جیسی نہیں ہو گی" وہ، اپنی قوم کے لئے

دل کے نازک ترین گوشوں میں انتہائی جذباتِ محبّت اور دوسری طرف خدا کے اس اٹل قانونِ استبدالِ قومی کو جس انداز سے یک جا پیش کرتے ہیں اس کی مثال کم ملے گی۔ میں اسے بادیدۂ پُرنم پیش کرتا ہوں۔ آپ اسے گوشِ نصیحت نیوش کے ساتھ سنیئے۔ فرماتے ہیں:۔ ؎

محفلِ ما، بے مے و بے ساقی است — سازِ قرآں را نواہا باقی است

زخمۂ ما بے اثر افتد اگر — آسماں دارد ہزاراں زخمہ در

ذکرِ حق از اُمّتاں آمد غنی — از زمان و از مکاں آمد غنی

ذکرِ حق از ذکرِ ہر ذاکر جداست — احتیاجِ روم و شام اُو را کجاست

حق اگر از پیشِ ما بردارد ش — پیشِ قومے دیگرے بگذارد ش

از مسلماں دیدہ ام تقلید و ظن — ہر زماں جانم بلرزد در بدن

ترسم از روزے کہ محرومش کنند

آتشِ خود بر دلِ دیگر زنند (جاوید نامہ صـ۹۲-۹۱)

پیامِ اقبالؒ

عزیزانِ من! میں اس موضوع پر بہت کچھ اور بھی کہہ سکتا تھا لیکن قلّتِ وقت کی بنا پر اتنے ہی پہ اکتفا کرتا ہوں۔ اس سے آپ نے دیکھ لیا ہو گا کہ کلام و پیامِ اقبالؒ کا مرکز بھی قرآن ہے اور محور بھی قرآن۔ اس کی تعلیم کا عام کرنا ان کی زندگی کا مشن اور ان کا نصب العین حیات تھا اور اس کو ایک عملی نظام کی شکل میں متشکّل کرنے کے لئے انہوں نے پاکستان کا تصوّر دیا تھا۔ بلا شائبۂ تردید کہا جا سکتا ہے کہ ہماری ہزار سالہ تاریخ میں قرآنی پیغام اور حقائق کو حسن کارانہ انداز سے اس جامعیت کے ساتھ پیش کرنے کی مثال کہیں نہیں ملتی۔ اسی لئے انہوں نے کہا تھا کہ:۔ ؎

از تب و تابم نصیبِ خود بگیر — بعد ازیں ناید چو من مردِ فقیر

اس لئے کہ:۔

گوہرِ دریائے قرآں سفتہ ام — شرحِ رمزِ صبغۃ اللہ گفتہ ام

با مسلماناں غمے بخشیدہ ام — کہنہ شاخے را نمے بخشیدہ ام

عشقِ من از زندگی دارد سراغ — عقل از صہبائے من روشن ایاغ

نکتہ ہائے خاطر افروزے کہ گفت؟ — با مسلماں حرفِ پُرسوزے کہ گفت؟

ہمچو نے نالیدم اندر کوہ و دشت — تا مقامِ خویش بر من فاش گشت
حرفِ شوق آموختم و اسوختم — آتش افسردہ باز افروختم
با من آہ صبح گاہے دادہ اند — سطوت کوہے، بکاہے دادہ اند
دارم اندر سینہ نورِ لا الٰہ — در شرابِ من سرورِ لا الٰہ
فکرِ من گردوں مسیر از فیضِ اوست — جوئے، ساحل ناپذیر از فیضِ اوست

پس بگیر از بادۂ من یک دو جام
تا درخشی مثلِ تیغِ بے نیام
(مسافر صفحہ ۴۴-۴۴)

انہیں خود اس کا احساس تھا کہ انہوں نے کس قدر پیامِ حیات بخش قوم کو دیا ہے اسی لئے انہوں نے کہا تھا کہ ——— اے خنک مردے کہ در عصرِ من است ——— (مسافر صفحہ ۴۳) ——— اس کے بعد سوچئے کہ ہماری شوریدہ بختی کس انتہا تک پہنچ چکی ہے کہ ہم نے اس نوائے حیات آور کی بھی کوئی قدر نہ کی اور اسے قوالوں کے حوالے کر دیا کہ وہ اسے ڈھولک کی تھاپ پر گائیں اور اس خوابیدہ قوم پر سکوتِ مرگ طاری کر دیں۔

"ڈھولک والوں" سے آگے بڑھ کر ہم، (نام نہاد) دانشوروں کے کوچے میں آتے ہیں تو وہاں ہمیں اس سے بھی زیادہ تاسف انگیز صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ان حضرات کی بارگاہ سے حضرت علامہؒ کو جو سب سے بڑا خطاب عطا ہوا وہ شاعرِ مشرق کا تھا۔ اس خطاب کا اس شدومد سے چرچا کیا گیا کہ وہ اب ساری دنیا میں اسی حیثیت سے متعارف ہیں۔ آپ ذرا سوچئے کہ اگر کوئی مفکر اپنی حاصل فکر کا اظہار نثر میں کرے تو ہم اسے نثر نگاروں کی صف میں نہیں کھڑا کر سکتے۔ اسے مفکر ہی کہتے ہیں۔ لیکن اگر وہی مفکر، اپنی فکر کو زبانِ شعر میں پیش کرتا ہے تو ہم اسے مفکر نہیں کہتے شاعر کہتے ہیں۔ علامہ اقبالؒ اسی ستم ظریفی کا شکار ہیں۔ وہ عمر بھر کانوں پر ہاتھ رکھ رکھ کر پکارتے (بلکہ چلاتے) رہے کہ بابا! میں شاعر نہیں۔ مجھے شاعری سے کوئی سروکار نہیں۔ لیکن ان کے

میں شاعر نہیں

ستائش گر انہیں جھٹلاتے چلے جاتے ہیں اور بڑے فخر سے کہتے ہیں کہ تمہیں کچھ علم نہیں۔ تم شاعر ہو۔ اور بہت بڑے شاعر۔ علامہؒ نے اپنے پہلے مجموعۂ نظم (پیامِ مشرق) کے ابتدائیہ میں کہا تھا کہ :-

آشنائے من ز من بیگانہ رفت — از خمستانم تہی پیمانہ رفت
من شکوہِ خسروی او را دہم — تختِ کسریٰ زیرِ پائے او نہم

او حدیثِ دلبری خواہد زمن   رنگ و آبِ شاعری خواہد زمن

کم نظر بے تابیٔ جانم ندید

آشکارم دید و پنہانم ندید   (پیامِ مشرق ص۳)

اقبالؒ کے نام لیوا، بالعموم اس کے "آشکار" کے گرد دیدہ رہے۔ اس کے "پنہاں" تک کسی کی نگاہ نہ گئی۔ جن کی نگاہ اس کے "پنہاں" تک پہنچی تھی انہوں نے برملا کہا تھا کہ:۔

پردۂ تواز نوائے شاعری است   آنچہ گوئی ماورائے شاعری است

(غنی کاشمیری۔ در۔ جاوید نامہ ص۱۹۵)

حضرت علامہؒ نے خود، سید سلیمان ندوی (مرحوم) کو ایک خط میں لکھا تھا:۔

"میں نے کبھی اپنے آپ کو شاعر نہیں سمجھا۔ اس واسطے کوئی میرا رقیب نہیں اور نہ میں کسی کو اپنا رقیب تصور کرتا ہوں۔ فنِ شاعری سے مجھے کبھی دلچسپی نہیں رہی ـــــ ہاں ـــــ بعض مقاصدِ خاص رکھتا ہوں جن کے بیان کے لئے اس ملک کے حالات و روایات کی رُو سے میں نے نظم کا طریقہ اختیار کر لیا ہے"۔   (مکتوبات۔ حصہ اوّل، ص۱۹۵)

دیکھئے! وہ اُنہیں شاعر سمجھنے اور کہنے والوں کو کن الفاظ سے یاد کرتے ہیں۔ زبورِ عجم میں ہے ؎

نہ پنداری کہ من بے بادہ مستم   مثالِ شاعراں افسانہ بستم

نہ بینی خیر ازاں مردِ فرودست   کہ بر من تہمتِ شعر و سخن بست   (ص۲۰۴)

اور جب یہ حضرات اس پر بھی باز نہیں آتے، تو وہ اس بارگاہ میں فریاد لے کر پہنچتے ہیں جس سے بلند بارگاہ ان کے نزدیک کوئی نہیں۔ دیکھئے وہ کس درد و سوز سے فریاد کرتے ہیں کہ ؎

بآں رازے کہ گفتم، پے نبردند   ز شاخِ نخلِ من خرما نخوردند

من اے میرِ اُممؐ داد از تو خواہم   مرا یاراں غزل خوانے شمردند   (ارمغانِ حجاز ص۵۷)

اور اس کے بعد کہتے ہیں: ؎

نہ شعر است اینکہ بر وے دل نہادم   گرہ از رشتۂ معنی کشادم

بامیدے کہ اکسیرے زند عشق   مسِ ایں مفلساں را تاب دادم

(ص۵۸)

اور پھر یہ فریاد کہ: ؎

تو گفتی از حیاتِ جاوداں گوے | بگوشِ مُردہ پیغامِ جاں گوے
ولے گویند ایں حق ناشناساں | کہ تاریخِ وفاتِ ایں واں گوے (ص۵۸)

وہ گفتۂ اقبالؒ کے متعلق کہتے ہیں کہ: ؎

آنچہ گفتم از جہانے دیگراست | ایں کتاب از آسمانے دیگراست (جاوید نامہ ص۶)

اس میں شبہ نہیں کہ اقبالؒ نے جو کچھ کہا وہ "از جہانِ دیگر" تھا۔ شاعری نہیں تھا۔ لیکن یہ تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں کہ (جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہا ہے) انہوں نے شاعری کو بطور ذریعۂ ابلاغ اختیار کیا (خواہ اس کا مقصد کچھ ہی کیوں نہ تھا) اس سے ان کا پیغام وہ نتائج مرتب نہ کر سکا جو ان کا مدعا تھا۔ اس کے برعکس قوم نے اس کا غلط استعمال بھی کیا اور الٹا اثر بھی لیا۔ یہ اس لئے کہ آپ لاکھ کوشش کیجئے، شاعری "ڈھولک" سے الگ نہیں رہ سکتی اور ان دونوں کا آمیزہ اور عصارہ، افیون بن جاتا ہے۔ یہ وہ آمیزہ ہے جس کے متعلق خود علامہؒ نے (ابلیس کی زبان سے کہلوایا ہے کہ: ؎

طبعِ مشرق کے لئے موزوں یہی افیون تھی | ورنہ قوالی سے کچھ کم تر نہیں علمِ کلام (ارمغانِ حجاز ص۲۱۶)

اس کے باوجود، پیغامِ اقبالؒ کو اگر اس کی فکر کے سرچشمہ، قرآن مجید کی روشنی میں سمجھا جاتا تو اس سے ہماری قوم حیاتِ تازہ سے ہمکنار ہو سکتی تھی لیکن قوم نے ایسا نہ کیا اور اس پر سکوتِ مرگ طاری رہا۔ اسے بھی سمجھ لیجئے کہ اگر قوم نے ایسا نہیں کیا تو یہ کوئی اتفاقی بات نہیں تھی یہ ایک گہری سازش کا نتیجہ تھا جس کا تانا بانا کہیں اور بُنا گیا تھا۔ (جیسا کہ حضرت علامہؒ نے اپنی مشہور نظم "ابلیس کی مجلس شوریٰ" میں کہا ہے) جہانِ ابلیس یعنی مغرب کی استعماری قوتیں خوب سمجھتی تھیں کہ اگر دنیا کے کسی خطہ میں بھی قرآنی نظام قائم ہو گیا تو وہ ان کے لئے پیغامِ موت ہو گا۔ اس لئے ان کی انتہائی کوشش ہوتی ہے کہ۔ ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبر کہیں۔ پاکستان ان قوتوں کو اس نظام کی اوّلیں آماجگاہ بنتا نظر آتا تھا کیونکہ یہی علامہ اقبالؒ کے پیغام کا اوّلین مخاطب تھا۔ اور تجربہ گاہ تھا چنانچہ ان قوتوں نے اپنی انتہائی لطیف فریب کاری سے کام لیتے ہوئے ایسا انتظام کیا کہ یہاں قرآن کا نام تو بے شک لیا جائے لیکن اس کا پیغام، عام نہ ہونے پائے اور چونکہ اقبالؒ بھی قرآن کا پیامبر تھا اس لئے یہ اہتمام بھی کیا گیا کہ اقبالؒ کو بھی اس کا صحیح مقام نہ مل سکے۔ ان کی یہ سازش بڑی کامیاب رہی ہے۔ اقبالؒ یہاں محض ایک شاعر بن کر رہ گیا ہے۔

قرآنی آواز طلوعِ اسلام کے مرکز سے اٹھی تھی۔ اس کے خلاف اس قسم کا منظّم پراپیگنڈہ کیا گیا ہے کہ وہ الحاد اور بے دینی کے مرادف قرار پا گئی ہے۔ لیکن اس کے باوجود میں مایوس نہیں اور قرآن کے پیغام اور اس کی روشنی میں، فکرِ اقبالؒ کو عام کئے جا رہا ہوں۔ میں محض اپنے قیاس کی بناء پر فیصلہ کیوں کر لوں کہ قوم اب زندہ ہو ہی نہیں سکتی اور پھر مایوس ہو کر بیٹھ جاؤں۔ یہ بھی تو قرآن کی روشنی میں، اقبالؒ ہی نے کہا تھا کہ :-

مرگ را ساماں ز قطعِ آرزو است　　زندگانی محکم از لاتقنطوا است
تا امید از آرزوئے پیہم است　　ناامیدی زندگانی را سم است
زندگی را یاس خواب آور بود　　ایں دلیلِ سستیٔ عنصر بود
از دمش میرد قوائے زندگی　　خشک گردد چشمہ ہائے زندگی

(اسرار و رموز ص ۱۰۸)

قرآن کی یہی نشیدِ جانفزا ہے جو اس طول طویل سفرِ زندگی میں مجھے تھکنے نہیں دیتی اور قدم قدم پہ یہ کہہ کر میرا حوصلہ جوان کر دیتی ہے کہ :-

مسلم استی سینہ را از آرزو آباد دار　　ہر زماں پیشِ نظر لایخلف المیعاد دار

والسلام

پرویز

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مئی ۱۹۷۹ء

روٹی کا مسئلہ

(اقبالؒ کی نظر میں)

ہمارے نزدیک اقبالؒ کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ اقبالؒ نے قوم کو پھر سے قرآن سے آشنا کرانے میں مسلسل جدوجہد کی۔ اس میں شبہ نہیں کہ مملکتِ پاکستان، جس کا اس نے تصور دیا تھا، بھی ایک گراں بہا نعمت ہے۔ لیکن اقبالؒ کے الفاظ میں، مملکت ایک کوشش ہوتی ہے (قرآنی) نصب العینی اصولوں کو زمان و مکان میں صورت پذیر کرنے کی۔ یہ آرزو ہوتی ہے ان اصولوں کو کسی خاص انسانی ادارہ میں رُوبہ عمل لانے کی یعنی اسلامی نقطۂ نگاہ سے مملکت کی اہمیت اس لئے ہوتی ہے کہ وہ انسانیت کے ان بلند مقاصد کو جنہیں قرآن نے عطا کیا ہے عملی پیکروں میں ڈھالنے کا ذریعہ بنتی ہے۔ اقبالؒ نے قرآن کے ان بلند مقاصد کو قوم کے سامنے بے نقاب کیا اور انہیں بتایا کہ ان کی زندگی اور سرفرازی کا راز انہی مقاصد کی عملی تشکیل میں ہے۔

قرآن کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ زندگی کے بلند مقاصد کو اصولی طور پر بیان کرتا ہے اور ان کی جزئیات کو بالعموم غیر متعین چھوڑ دیتا ہے۔ تاکہ قرآن پر عمل کرنے والی قوم ان جزئیات کو اپنے اپنے زمانے کے تقاضوں کی روشنی میں خود متعین کرتی جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جس دور میں زندگی کا کوئی تقاضہ نمایاں حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ اس تقاضے سے متعلق قرآن کے اصول بھی نمایاں طور پر سامنے آجاتے ہیں۔ ہمارے دور میں انسانی زندگی کے جس تقاضے نے سب سے زیادہ نمایاں حیثیت اختیار کی ہے، وہ روٹی کا مسئلہ ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ جب سے انسان نے تمدنی زندگی شروع کی ہے روٹی کا مسئلہ اس کے ساتھ رہا ہے۔ لیکن اس مسئلہ نے ایک عالمگیر تقاضے کی حیثیت ہمارے ہی دور میں اختیار کی ہے۔ یہ غیر ممکن تھا کہ اقبالؒ جو زندگی کے تقاضوں پر قرآن کی روشنی میں غور کرتا تھا، اپنے دور کے اس اہم تقاضے سے غیر متاثر رہتا اور قرآن نے اس باب میں جو راہنمائی دی ہے اسے پیش نہ کرتا۔ اقبالؒ کا پہلا دوران بڑھتے ہوئے تقاضوں سے متاثر ہونے کا

ہے۔ دوسرا دَور اُس حل پر غور و فکر کرنے اور اُسے قرآنی روشنی میں پرکھنے کا ہے جو تنہا عقلِ انسانی نے اس مشکل کے لئے دریافت کیا۔ اور تیسرا دَور وہ ہے جس میں اس نے اس مشکل کا قرآنی حل پیش کیا ہے۔ اس دورِ اوّل کی ابتداء اس وقت ہوتی ہے جب ان کی اثر میں سب سے پہلی کتاب "علم الاقتصاد" کے عنوان سے ۱۹۰۳ء میں شائع ہوئی۔ اس کے دیباچہ میں انہوں نے لکھا تھا:-

"اس میں کچھ شک نہیں کہ تاریخ انسانی کے سیلِ رواں میں، اصولِ مذہب بھی بے انتہا مؤثر ثابت ہوئے ہیں، مگر یہ بات بھی روز مرہ کے تجربہ اور مشاہدہ سے ثابت ہوتی ہے کہ روزی کمانے کا دھندا ہر وقت انسان کے ساتھ ساتھ ہے اور چپکے سے اس کے ظاہری اور باطنی قویٰ کو اپنے سانچے میں ڈھالتا رہتا ہے۔ ذرا خیال کرو کہ غریبی، یا یوں کہو کہ ضروریاتِ زندگی کے کامل طور پر پورا نہ ہونے سے انسانی طرزِ عمل کہاں تک متاثر ہوتا ہے۔ غریبی، قوائے انسانی پر بہت بُرا اثر ڈالتی ہے۔ بلکہ بسا اوقات انسانی رُوح کے مجلّا آئینہ کو اس قدر زنگ آلود کر دیتی ہے کہ اخلاقی اور تمدّنی لحاظ سے اس کا وجود و عدم برابر ہو جاتا ہے۔ معلّمِ اوّل یعنی حکیم ارسطو سمجھتا تھا کہ غلامی تمدّنِ انسانی کے قیام کے لئے ایک ضروری جزو ہے مگر مذہب اور زمانۂ حال کی تعلیم نے انسان کی جبلّی آزادی پر زور دیا اور رفتہ رفتہ مہذّب قومیں محسوس کرنے لگیں کہ یہ وحشیانہ تفاوتِ مدارج، بجائے اس کے کہ قیامِ تمدّن کے لئے ایک ضروری جزو ہو، اس کی تخریب کرتا ہے اور انسانی زندگی کے ہر پہلو پر نہایت مذموم اثر ڈالتا ہے۔ اسی طرح اس زمانے میں یہ سوال پیدا ہوا ہے کہ آیا مفلسی بھی نظمِ عالم میں ایک ضروری جزو ہے؟ کیا یہ ممکن نہیں کہ ہر فرد مفلسی کے دکھ سے آزاد ہو؟ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ گلی کوچوں میں چپکے چپکے کراہنے والوں کی دلخراش صدائیں ہمیشہ کے لئے خاموش ہو جائیں اور ایک دردمند دل کو ہلا دینے والے افلاس کا دردناک نظارہ ہمیشہ کے لئے صفحۂ عالم سے حرفِ غلط کی طرح مٹ جائے۔"

یہ ۱۹۰۳ء کی بات ہے۔ اس کے بعد وہ اپنی مشہور نظم "خضرِ راہ" میں خضر سے پوچھتے ہیں:-

زندگی کا راز کیا ہے؟ سلطنت کیا چیز ہے؟ اور یہ سرمایہ و محنت میں ہے کیسا خروش؟

اس کے جواب میں خضر کہتا ہے ؎

بندۂ مزدور کو جا کر مرا پیغام دے — خضر کا پیغام کیا، ہے یہ پیامِ کائنات
اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دارِ حیلہ گر — شاخِ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات
مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار — انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات
اٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے — مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے!

اس کے بعد پیامِ مشرق میں دیکھیے۔ وہ "صحبتِ رفتگاں" کے عنوان میں ٹالسٹائی، کارل مارکس، ہیگل، مزدک کوہکن وغیرہ سب کو جمع کرتے ہیں اور ان کی زبان سے اس اہم تقاضے کی ترجمانی مختلف زاویہ ہائے نگاہ سے کرتے ہیں۔

ٹالسٹائی کہتا ہے ؎

بارکشِ اہرمن لشکریِ شہریار — از پئے نانِ جویں تیغِ ستم برکشید
دارُوئے بیہوشی است تاج، کلیسا، وطن — جانِ خداداد را خواجہ بجامے خرید

کارل مارکس کہتا ہے ؎

رازدانِ جزو و کل از خویش نامحرم شدست — آدم از سرمایہ داری قاتلِ آدم شدست

ہیگل اپنا فلسفۂ اضداد پیش کرتا ہے، اور ٹالسٹائی اسے "عقلِ دورُو" کی چابک دستی قرار دے کر اس کی تردید کرتا ہے۔

مزدک اعلان کرتا ہے کہ ؎

دورِ پرویزی گذشت اے کشتۂ پرویز خیز — نعمتِ گم کردۂ خود را ز خسرو باز گیر

فرانسیسی فلاسفر کومٹ مزدور کو یہ سبق دیتا ہے کہ

نیاید ز محمود کارِ ایاز

اور مزدور ایک پُرمعنی تبسم سے جواب دیتا ہے کہ ؎

حقِ کوہکن دادی اے نکتہ سنج — بہ پرویزِ پرکار نابردہ رنج

آخر میں "قسمت نامہ سرمایہ دار و مزدور" ہیں وہ ان دونوں کا تقابل نہایت وضاحت اور خوبصورتی سے کرتا ہے۔ جہاں سرمایہ دار مزدور سے کہتا ہے کہ ؎

غوغائے کارخانۂ آہن گری ز من — گلبانگِ ارغنونِ کلیسا از آنِ تو

نخلے کہ شہ خراج بروی نہد زمن ‏ ‏ باغ بہشت و سدرہ و طوبیٰ از آنِ تو
ایں خاک و آنچہ در شکمِ او از آنِ من ‏ ‏ وز خاک تا بعرشِ معلیٰ از آنِ تو

اور اس کے بعد "نوائے مزدور" میں کہتا ہے کہ ؎

بیا کہ تازہ نوا می تراود از رگِ ساز ‏ ‏ مئے کہ شیشہ گداز د بہ ساغر اندازیم
مغان و دیرِ مغاں را نظامِ تازہ دہیم ‏ ‏ بنائے میکدہ ہائے کہن بر اندازیم
ز رہزنانِ چمن انتقامِ لالہ کشیم ‏ ‏ بہ بزمِ غنچہ و گل طرحِ دیگر اندازیم

یہی دعوتِ انقلاب ہے جسے ہم "زبورِ عجم" میں اس سے تیز انداز میں دیکھتے ہیں، جہاں اقبالؒ کہتا ہے کہ

خواجہ از خونِ رگِ مزدور سازد لعلِ ناب ‏ ‏ از جفائے دہ خدایاں کشتِ دہقاناں خراب

انقلاب

انقلاب، اے انقلاب

من درونِ شیشہ ہائے عصرِ حاضر دیدہ ام ‏ ‏ آنچناں زہرے کہ از وے مارہا در پیچ و تاب

انقلاب

انقلاب، اے انقلاب

بالِ جبریل میں "فرشتوں کا گیت" اسی نظامِ سرمایہ داری کی تباہ انگیزیوں کے خلاف صدائے احتجاج ہے، جس میں کہا گیا ہے:-

خلقِ خدا کی گھات میں رند و فقیہ و میر و پیر ‏ ‏ تیرے جہاں میں ہے وہی گردشِ صبح و شام ابھی
تیرے امیر مال مست، تیرے فقیر حال مست ‏ ‏ بندہ ہے کوچہ گرد ابھی، خواجہ بلند بام ابھی

یہی وہ احتجاج ہے جس کے جواب میں خدا کی طرف سے فرشتوں کو حکم ملتا ہے کہ ؎

اُٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو ‏ ‏ کاخِ اُمراء کے در و دیوار ہلا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی ‏ ‏ اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

اسی کتاب میں لینن کی وہ مشہور درخواست بھی ہے جس میں وہ خدا سے کہتا ہے کہ ؎

تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں ‏ ‏ ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات

کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ دُنیا ہے تیری منتظر یوم مکافات

یہ ہیں نظامِ سرمایہ پرستی کے انسانیت سوز نتائج، جنہیں اقبالؒ کی نگہ بصیرت نے بھانپا اور جو اس کے قلب حساس کی گہرائیوں سے نشتروں کی شکل میں سطح سے اُوپر اُبھرے۔ یہی وہ اشعار ہیں جنہیں کمیونسٹ اپنے جلسوں اور جلوسوں میں گاتے ہیں اور ان سے یہ ثابت کرتے ہیں کہ اقبالؒ بھی کمیونسٹ تھا۔ لیکن اقبالؒ کمیونسٹ نہیں تھا، نہ کوئی مسلمان کمیونسٹ ہو سکتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ کمیونزم کے دو حصے ہیں۔ ایک تو ان کا یہ دعویٰ کہ کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ رزق کو سمیٹ کر اپنے قبضہ میں لے لے جبکہ غریب اور اس کے بچے بھوکوں مر رہے ہوں۔ جہاں تک اس دعویٰ کا تعلق ہے۔ اس کا ہر وہ مسلمان ہمنوا ہے جو قرآن سے راہنمائی حاصل کرتا ہے۔ اس لئے اقبالؒ بھی اس کا ہمنوا تھا۔ اسے اس کا ہمنوا ہونا چاہیئے تھا۔ لیکن دوسری چیز ہے کمیونزم کا وہ فلسفہ جس پر وہ اس دعوے کی بنیاد رکھتے ہیں۔ یعنی ہیگل کی جدلیت اور کارل مارکس کی تاریخ کی معاشی تعبیر جس کی رُو سے، خدا۔ وحی۔ رسالت۔ آخرت سب کا انکار ہوتا ہے۔ یہ وہ فلسفہ ہے جس کی تائید کوئی مسلمان نہیں کر سکتا اور چونکہ اقبالؒ مسلمان تھا اس لئے وہ اس فلسفہ کا سخت مخالف تھا۔

۱۹۲۳ء کا ذکر ہے، شمس الدین حسن نامی ایک صاحب نے (جو کمیونزم کے پُرجوش حامی تھے) اخبار زمیندار (مورخہ ۲۳، جون) میں ایک مضمون میں لکھا:۔

"بالشویک خیالات کا حامی ہونا جرم ہے تو پھر ہمارے ملک کا سب سے بڑا شاعر، اقبالؒ قانون کی زد سے کس طرح بچ سکتا ہے۔ بالشوزم، کارل مارکس کے فلسفۂ سیاسیات کا لُبّ لباب ہے اور اسی کو عام فہم زبان میں سوشلزم اور کمیونزم کہا جاتا ہے۔ اقبالؒ کی نظم۔ خضر راہ۔ اور ان کے مجموعۂ کلام، پیامِ مشرق، کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک اشتراکی ہی نہیں بلکہ اشتراکیت کے مبلغ اعلیٰ ہیں۔

اس کے جواب میں حضرت علامہؒ کا، ۲۴، جون ۱۹۲۳ء کے زمیندار میں، خط شائع ہوا جس میں انہوں نے تحریر فرمایا کہ:۔

(۱) میرے افکار کو بالشوزم سے منسوب کرنا غلط ہے۔ بالشویک خیالات رکھنا میرے نزدیک دائرہ اسلام سے خارج ہو جانے کے مترادف ہے۔

(۲) میں مسلمان ہوں اور میرا عقیدہ ہے کہ انسانی جماعتوں کے اقتصادی امراض کا بہترین حل

قرآن مجید نے تجویز کیا ہے۔

(۳) روسی بالشوزم یورپ کی ناعاقبت اندیش اور خود غرض سرمایہ داری کے خلاف ایک زبردست ردّعمل ہے لیکن مغرب کی سرمایہ داری اور روس کا بالشوزم دونوں افراط و تفریط کا نتیجہ ہیں۔ اعتدال کی راہ وہی ہے جو قرآن نے ہم کو بتائی ہے۔[۱]

اس کے بعد انہوں نے، ۱۹۳۶ء میں، خواجہ غلام السیدین کے نام ایک خط میں لکھا۔

"سوشلزم کے معترف ہر جگہ روحانیت اور مذہب کے مخالف ہیں، اور اسے افیون تصور کرتے ہیں۔ لفظ افیون اس ضمن میں سب سے پہلے کارل مارکس نے استعمال کیا تھا۔ میں مسلمان ہوں اور انشاء اللہ مسلمان مروں گا۔ میرے نزدیک تاریخ انسانی کی مادّی تعبیر سراسر غلط ہے۔ روحانیت کا میں قائل ہوں مگر روحانیت کے قرآنی مفہوم کا.... جو روحانیت میرے نزدیک معضب ہے، یعنی افیونی خواص رکھتی ہے، اس کی تردید میں نے جابجا کی ہے۔ باقی رہا سوشلزم، سو اسلام خود ایک قسم کا سوشلزم ہے، جس سے مسلمان سوسائٹی نے آج تک بہت کم فائدہ اُٹھایا ہے۔" (اقبالؒ نامہ۔ حصہ اوّل ص ۲۱۸)

یہی وجہ ہے کہ اقبال کارل مارکس کو "کلیم" تو کہتا ہے لیکن بے تجلی اور "مسیح" قرار دیتا ہے۔ لیکن بے صلیب حتّٰی کہ وہ جاوید نامہ میں افغانیؒ کی زبان سے یہ کہلاتا ہے۔

صاحبِ سرمایہ از نسلِ خلیل یعنی آں پیغمبرِ بے جبرئیل
زانکہ حق در باطلِ اُو مضمر است قلبِ اُو مومن دماغش کافر است
غربیاں گم کردہ اند افلاک را در شکم جویند جانِ پاک را
دینِ آں پیغمبرِ ناحق شناس بر مساواتِ شکم دارد اساس

وہ کہتا ہے کہ جب روٹی کے مسئلہ کو خالص مادّی بنیادوں پر حل کرنے کی کوشش کی جائے تو اس سے انسان حیوانی سطح پر تو زندہ رہ سکتا ہے لیکن اس کی انسانیت مُردہ ہو جاتی ہے۔ لہٰذا اس قسم کی اشتراکیت ہو، یا مغرب کی ملوکیت، انسانیت کے حق میں دونوں کا نتیجہ ایک ہے۔

---

[۱] بحوالہ ہفت وار چٹان لاہور۔ بابت ۱۸ مارچ ۱۹۶۲ء

ہر دو را جاں ناصبور و ناشکیب / ہر دو یزداں ناشناس آدم فریب
زندگی ایں را خروج آں را خراج / درمیانِ ایں دو سنگ آدم زجاج
غرق دیدم ہر دو را در آب و گل / ہر دو را تن روشن و تاریک دل
زندگانی سوختن با ساختن
در گِلے تخمِ دِلے انداختن

یہی "سوختن با ساختن" ہے جسے اقبال لَا اور اِلَّا سے تعبیر کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ روس کا اشتراکی نظام درحقیقت لَا کے گرداب میں پھنسا ہوا ہے۔ اس کی تمام کوششیں تخریبی ہی تخریبی ہیں۔ وہ "ساختن" یعنی اِلَّا (تعمیر) کی طرف نہیں بڑھ سکتا۔ چنانچہ وہ "پس چہ باید کرد" میں روس کی اسی کشمکش کے بارے میں کہتا ہے:

روس را قلب و جگر گردیدہ خون / از ضمیرش حرفِ لَا آمد برون
آں نظامِ کہنہ را برہم زدست / تیز نیشے بر رگِ عالم زدست
کردہ ام اندر مقاماتش نگاہ ! / لَا سلاطین لَا کلیسا لَا الٰہ
فکرِ او در تندبادِ لَا بماند / مرکبِ خود را سوئے اِلَّا نراند

یہاں سے وہ تیسرا دائرہ شروع ہوتا ہے، جہاں اقبالؒ اس اہم تقاضے کے متعلق قرآنی حل پیش کرتا ہے۔ وہ سب سے پہلے "سوختن اور ساختن" کے اصول کو لیتا ہے اور کہتا ہے کہ:

نکتہ می گویم از مردانِ حال / اُمتاں را لَا جلال اِلَّا جمال
لَا و اِلَّا احتسابِ کائنات / لَا و اِلَّا فتحِ بابِ کائنات
ہر دو تقدیرِ جہانِ کاف و نون / حرکت از لَا زاید از اِلَّا سکون
در مقامِ لَا نیاساید حیات / سوئے اِلَّا می خرامد کائنات
لَا و اِلَّا ساز و برگِ اُمتاں / نفی بے اثبات مرگِ اُمتاں

لَا کے معنی ہیں ہر غلط نظام کو تباہ کر دینا۔ اور اِلَّا کے معنی ہیں اس کی جگہ ایک صحیح نظام قائم کرنا۔ یہ صحیح نظام صرف مستقل اقدار کی بنیادوں پر قائم کیا جا سکتا ہے، اور مستقل اقدار عقل کی رُو سے کبھی نہیں مل سکتیں یہ اقدار صرف وحی کی رُو سے مل سکتی ہیں اس لئے کہ:

عقلِ خود بیں غافل از بہبودِ غیر / سودِ خود بیند، نہ بیند سودِ غیر

وحیٔ حق بینندۂ سودِ ہمہ　　در نگاہش سود و بہبودِ ہمہ

اسی لئے اقبالؒ نے افغانی کی زبانی (جاوید نامہ میں) روس کو یہ پیغام دیا تھا کہ ؎

تو کہ طرحِ دیگرے انداختی　　دل ز دستورِ کہن پرداختی
کردۂ کارِ خداوندان تمام　　بگذر از لا جانبِ اِلّا خرام
در گذر از لا اگر جوئندۂ　　تا رہِ اثبات گیری زندۂ
اے کہ می خواہی نظامِ عالمے　　جستۂ او را اساسِ محکمے؟

اقبالؒ کے نزدیک نظامِ عالم کے لئے اس قسم کی محکم اساس قرآن کے سوا کوئی نہیں ہو سکتی۔ اسی لئے اس نے روس سے کہا کہ ؎

داستانِ کہنہ شستی باب باب　　فکر را روشن کن از اُمّ الکتاب[۱]

اس کے بعد وہ کہتا ہے کہ ؎

چیست قرآں؟ خواجہ را پیغامِ مرگ　　دستگیرِ بندۂ بے ساز و برگ
ہیچ خیر از مردکِ زرکش مجو　　لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا
با مسلماں گفت جاں برکف بنہ　　ہر چہ از حاجت فزوں داری بدہ

اقبالؒ کو تخریبی قوت یا تخریبی پروگرام کی ناکامی پر اس قدر یقین تھا کہ وہ سمجھتا تھا کہ روس زیادہ دیر تک تخریب کے گرداب میں رہ نہیں سکتا۔ چنانچہ اس نے اپنی مثنوی "پس چہ باید کرد" میں یہاں تک کہہ دیا کہ :-

آید آں روزے کہ از زورِ جنوں　　خویش را زیں تند باد آرد بروں

چنانچہ اقبالؒ اپنے ایک خط میں جو انہوں نے سر فرانسس ینگ ہزبنڈ کو ۱۹۳۱ء میں لکھا تھا (اور جو ۳۱ جولائی کے 'سول اینڈ ملٹری گزٹ' میں شائع ہوا تھا) لکھتے ہیں :-

"ذاتی طور پر میں نہیں سمجھتا کہ روسی فطرۃً لا مذہب ہیں۔ اس کے برعکس میرا خیال ہے کہ روسی عورتیں اور مرد بڑے مذہبی رجحانات رکھتے ہیں، اور روسی ذہن کا موجودہ منفی رجحان ہمیشہ

---

[۱] اس نے ایسا نہ کیا اور اس کا نظام ناکام رہ گیا۔ یہی شکل چین میں رونما ہو رہی ہے۔

باقی نہیں رہے گا کیونکہ کوئی عمرانی نظام دہریت کی اساس پر باقی نہیں رہ سکتا۔ جونہی اس ملک میں حالات ٹھیک ہو جائیں گے اور اس کے باشندوں کو اطمینان سے غور کرنے کا وقت ملے گا وہ مجبوراً اپنے نظام کی کوئی مثبت بنیاد تلاش کریں گے چونکہ بالشویت کے ساتھ خدا پر ایمان اور اسلام قریب قریب ایک ہی چیز ہیں اس لئے مجھے ذرا بھی تعجب نہ ہوگا، اگر کچھ زمانے کے بعد روس اسلام کو ہضم کر لے یا اسلام روس کو۔

لیکن اقبالؒ ان لوگوں میں سے نہیں تھا جو ہمیشہ اسی انتظار میں بیٹھے رہتے ہیں کہ یورپ کا فلاں ملک مسلمان ہو جائے تو اسلام کا بول بالا ہو جائے اور ہماری بھی قسمت جاگ اُٹھے۔ وہ مسلمانوں سے ہمیشہ یہی کہتا تھا کہ تمہاری قسمت تمہارے اپنے ہاتھوں ہی سے بیدار ہوگی۔ لہٰذا اس نے مسلمانوں سے کہا کہ اس وقت زمانہ کے تقاضوں سے جو معاشی کشمکش پیدا ہو رہی ہے تم اس کی روشنی میں قرآن پر غور کرو۔ اس سے قرآن تمہیں ایسی راہنمائی دے دے گا جس سے نہ صرف یہ کہ تمہاری قسمت بیدار ہو جائے گی بلکہ تمام اقوامِ عالم کی قیادت تمہارے حصہ میں آ جائے گی۔ چنانچہ وہ "ضربِ کلیم" میں کہتے ہیں کہ ؎

قوموں کی روش سے مجھے ہوتا ہے یہ معلوم — بے سود نہیں روس کی یہ گرمیِ گفتار
اندیشہ ہوا شوخیِ افکار پہ مجبور — فرسودہ طریقوں سے زمانہ ہوا بیزار
انساں کی ہوس نے جنہیں رکھا تھا چھپا کر — کھلتے نظر آتے ہیں بتدریج وہ اسرار
قرآں میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلماں — اللہ کرے تجھ کو عطا جدّتِ کردار
جو حرفِ "قُل العفو" میں پوشیدہ ہے اب تک — اس دور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار

چنانچہ جب خود اقبالؒ نے زمانہ کے ان تقاضوں کی روشنی میں قرآنِ کریم پر غور کیا تو اس کے سامنے یہ حقیقت آ گئی کہ قرآن کی رُو سے رزق کے فطری سرچشموں پر انفرادی ملکیت کا تصور یکسر باطل ہے۔ خدائے رب العزت نے سامانِ رزق کو تمام نوعِ انسانی کی پرورش کے لئے عام کر رکھا ہے۔ اس لئے اسے اس مقصد کے لئے عام ہی رہنا چاہئے۔ رزق کے چشمے زمین سے پھوٹتے ہیں اس لئے زمین کے متعلق اقبالؒ صاف الفاظ میں کہتا ہے کہ ؎

حق زمین را جز متاعِ ما نہ گفت — ایں متاعِ بے بہا مفت است مفت
دہ خدایا نکتۂ از من پذیر — رزق و گور از وے بگیر او را مگیر

رزقِ خود را از زمین بردن رواست | ایں "متاع" بندہ و ملک خداست
باطنِ "الارض للہ" ظاہر است | ہر کہ ایں ظاہر نہ بیند کافر است۔
آب و نانِ ماست از یک مائدہ | دودۂ آدم کنفسٍ واحدہ

بالِ جبریل، میں قرآن کی اس حقیقت کو اور بھی واضح الفاظ میں بیان کیا گیا ہے، جہاں لکھا ہے ہے

پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون؟ | کون دریاؤں کی موجوں سے اٹھاتا ہے سحاب؟
کون لایا کھینچ کر پچھم سے بادِ سازگار؟ | خاک یہ کس کی ہے، کس کا ہے یہ نورِ آفتاب؟
کس نے بھر دی موتیوں سے خوشۂ گندم کی جیب؟ | موسموں کو کس نے سکھلائی ہے خوئے انقلاب؟
دہ خدایا یہ زمیں تیری نہیں، تیری نہیں | تیرے آبا کی نہیں، تیری نہیں، میری نہیں

علامہ اقبالؒ، پاکستان کا حصول بھی اسی مقصد کے لئے چاہتے تھے کہ یہاں خدا کے اس نظام کو رائج کیا جا سکے۔ چنانچہ انہوں نے اپنی وفات سے ایک سال پہلے قائداعظمؒ کے نام ایک خط میں لکھا کہ:۔

"روٹی کا مسئلہ روز بروز شدید تر ہوتا چلا جا رہا ہے۔ مسلمان محسوس کر رہے ہیں کہ گزشتہ دو سو سال سے ان کی حالت مسلسل گرتی چلی جا رہی ہے۔۔۔ لیگ کا مستقبل اس امر پر موقوف ہے کہ وہ مسلمانوں کو افلاس سے نجات دلانے کے لئے کیا کوشش کرتی ہے۔ اگر لیگ کی طرف سے مسلمانوں کو افلاس کی مصیبت سے نجات دلانے کی کوشش نہ کی گئی تو مسلمان پہلے کی طرح اب بھی لیگ سے بے تعلق ہی رہیں گے۔ ۔۔۔۔ شریعتِ اسلامیہ کے طویل و عمیق مطالعہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اسلامی قانون کو معقول طریق پر سمجھا اور نافذ کیا جائے تو ہر شخص کو کم از کم عام معاش کی طرف سے اطمینان ہو سکتا ہے۔۔۔۔ اسلام کے لئے سوشل ڈیموکریسی کی کسی موزوں شکل میں ترویج، جب اسے شریعت کی تائید و موافقت حاصل ہو، حقیقت میں کوئی انقلاب نہیں بلکہ اسلام کی حقیقی پاکیزگی کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔۔۔۔ ان مسائل کے

حل کے لئے ملک کی تقسیم کے ذریعہ ایک باقاعدہ اسلامی ریاستوں کا قیام اشد لازمی ہے ۔"

یعنی اقبالؒ کے نزدیک ایک الگ اسلامی مملکت کی ضرورت اس لئے تھی کہ یہاں قرآن کے معاشی نظام کا نفاذ کیا جاسکے جیسا کہ خود اقبالؒ کو اندیشہ تھا لیگ نے اس باب میں کچھ نہ کیا، جس کا خمیازہ لیگ اور اس کے ساتھ سارا ملک بھگت رہا ہے ۔

طلوعِ اسلام، قرآن کی اس انقلابی دعوت کو جسے اقبالؒ نے اپنے مخصوص انداز میں پیش کیا تھا، آگے بڑھاتا چلا جارہا ہے ۔ مفاد پرستانہ مذہبیت کی طرف سے قرآن کی اس آواز کو دبانے کے لئے جو کچھ کیا جارہا ہے، اس سے کون واقف نہیں ۔

پرویز

مئی ۱۹۷۹ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قانونِ شریعت میں اصولِ ارتقاء

ہمیں یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ پاکستان میں، اسلامی قانون کی تدوین کے مسئلہ میں دلچسپی بڑی تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ اور اس سلسلہ میں طلوعِ اسلام کی کوششوں کو سراہا جا رہا ہے۔ اس موضوع پر ہم اکثر و بیشتر علامہ اقبالؒ کے ایک خطبہ کے اقتباسات پیش کرتے ہیں۔ علامہ کے ان خیالات کی اہمیت کے پیشِ نظر اکثر قارئین کی طرف سے تقاضے موصول ہوئے ہیں کہ ان کا یہ خطبہ پورے کا پورا چھاپ کر دیا جائے تاکہ علامہؒ کے خیالات مربوط شکل میں سامنے آجائیں۔ علامہ اقبالؒ کے خطبات کے مجموعہ کا نام ہے:۔

(THE RECONSTRUCTION OF RELIGIOUS THOUGHT IN ISLAM)

ان میں چھٹا خطبہ اسلام میں قانون سازی کے اصول سے متعلق ہے۔ اس کا عنوان ہے:۔

(THE PRINCIPLE OF MOVEMENT IN THE STRUCTURE OF ISLAM)

اس کا رواں ترجمہ، "قانونِ شریعت میں اصولِ ارتقاء" کے عنوان سے کوئی بیس برس پہلے طلوعِ اسلام میں شائع ہوا تھا۔ جن حضرات نے علامہ اقبالؒ کے ان خطبات کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ ان کی زبان کس قدر فلسفیانہ، ادق اور ایجاز و ارتکاز کی حامل ہے۔ ایسے مضامین کے ترجمہ میں جو دشواریاں پیش آسکتی ہیں وہ ظاہر ہیں۔ ہم نے یہ رواں ترجمہ ایسے انداز میں کیا ہے جس سے بات بآسانی سمجھ میں آجائے اس کے لئے بعض مشکل مقامات کی وضاحت قوسین اور بعض کی حواشی میں کی گئی ہے۔ اس کے باوجود یہ ضروری ہے کہ اس خطبہ کو سرسری نظر سے نہ دیکھا جائے بلکہ اس کے ایک ایک فقرہ کو غور سے پڑھا جائے اس طرح آپ کے سامنے یہ حقیقت آجائے گی کہ قوانینِ شریعت کی تدوین و تجدید کے متعلق علامہؒ کا نقطۂ نظر کیا تھا۔ اس کے ساتھ، اس بات کو بھی مدِنظر رکھئے کہ یہ خطبات آج سے قریب پچاس سال پہلے لکھے گئے تھے۔ ظاہر ہے کہ اگر علامہ آج زندہ ہوتے تو بعض ایسے مقامات جن میں کچھ ابہام سا محسوس ہوتا ہے، زیادہ واضح ہو جاتے۔ اور پاکستان کے موجودہ حالات کی روشنی میں، وہ اپنے خیالات کے مطابق، ایک جامع قانونِ شریعت مرتب کر دیتے۔ بایں ہمہ، علامہؒ کے خیالات اس باب میں ایسے

واضح ہیں کہ ان کی روشنی میں، قرآنِ کریم کی بنیادوں پر ضابطۂ قوانین مرتّب کرنا مشکل نہیں۔

یہ بھی واضح رہے کہ ہمارے نزدیک، دین میں سند خدا کی کتاب ہے۔ ہم اگر کسی باب میں کسی انسان کا قول پیش کرتے ہیں تو وہ محض تائیداً ہوتا ہے۔ علّامہ اقبالؒ کے اس خطبہ کو بھی ہم اس لئے پیش کر رہے ہیں کہ جزئیات سے قطع نظر، اس میں اصولی طور پر جو بات کہی گئی ہے، وہ قرآنِ کریم کی تعلیم کے مطابق ہے۔

علّامہ اقبالؒ کا خطبہ

ایک ثقافتی تحریک کی حیثیت سے، اسلام نے کائنات کے متعلق قدیم سکونی تصوّر کو رد کر کے اس کی جگہ حرکیاتی تصوّر اختیار کیا ہے۔ دوسری طرف، ایک جذباتی نظامِ وحدت کی حیثیت سے وہ فرد کی قدر و منزلت کا پورا پورا اعتراف کرتا ہے اور نوعِ انسانی کی وحدت کی بنیاد خون کے رشتوں پر نہیں رکھتا۔ اس لئے کہ خون کے رشتے کو انسانی وحدت کی بنیاد قرار دینے کے معنی یہ ہیں کہ ہم مادّی علائق کی زمین گیری سے بلند نہیں ہونا چاہتے۔ وحدتِ انسانی کے لئے (مادّی علائق سے بلند ہو کر) ایک نفسیاتی بنیاد کی تلاش و جستجو اسی صورت میں ممکن ہے جب ہمیں اس کا احساس ہو جائے کہ زندگی کی اصل و بنیاد (مادّی نہیں بلکہ) روحانی[۱] ہے۔ اس احساس و تصوّر سے انسانی وفاشعاری و اطاعت پذیری کے نئے مراکز سامنے آتے ہیں جنہیں زندہ و پائندہ رکھنے کے لئے مادّی قسم کی رسوم پرستی کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ یہی وہ احساس و تصوّر ہے جس سے انسان کے لئے مادّی زمین گیری سے رستگاری ممکن ہے[۲]۔ شہنشاہ قسطنطین نے عیسائیت کو، جو ابتداءً ایک خانقاہی نظام کی حیثیت سے منصّۂ شہود پر آئی تھی، وحدتِ انسانی کی بنیاد قرار دینے کی کوشش کی۔ لیکن وہ اس میں ناکام رہا۔ عیسائیت کی یہی وہ

۱: اس خطبہ میں متعدّد مقامات پر روحانی (SPIRITUAL) کا لفظ آئے گا۔ ان مقامات میں SPIRIT کا لفظ مادہ (MATTER) کے مقابلہ میں استعمال ہوا ہے۔ خانقاہی روحانیت کے معنوں میں نہیں۔

۲: مادّہ سے رستگاری سے مراد یہ نہیں کہ مادّی کائنات ایک جیل خانہ ہے جس سے نجات حاصل کرنا مقصودِ زندگی ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ انسان اپنے سامنے صرف طبیعیاتی زندگی کو نہ رکھے بلکہ انسانی زندگی کو رکھے جو مادّی علائق سے بلند ہو کر (حیاتِ اُخروی) اپنی شکل میں آگے چلتی ہے۔

ناکامی تھی جس سے مجبور ہو کر شاہنشاہ جولین کو پھر سے قدیم رومی اصنامیات کی طرف رجوع کرنا پڑا۔ اس فرق کے ساتھ کہ اس نے اسے فلسفیانہ تعبیرات کا لبادہ اوڑھا دیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اسلام کا ظہور ہوا ہے۔ اس زمانے میں مہذب دنیا کی حالت کیا ہو چکی تھی، اس کا نقشہ ایک مغربی مؤرخ تہذیب نے ان الفاظ میں کھینچا ہے :-

ظہورِ اسلام کے وقت دنیا کی حالت

"اس وقت ایسا دکھائی دیتا تھا کہ تہذیب کا وہ قصرِ شید جو چار ہزار سال میں جا کر تعمیر ہوا تھا۔ منہدم ہونے کے قریب پہنچ چکا ہے اور نوعِ انسانی پھر اسی بربریت کی طرف لوٹ جانے والی ہے جہاں ہر قبیلہ دوسرے قبیلے کے خون کا پیاسا تھا اور آئین و ضوابط کو کوئی جانتا تک نہ تھا۔ قدیم قبائلی آئین اپنی قوت و احترام کھو چکے تھے۔ اس لئے اب ملوکیت کے اندازِ کہن کا سکہ دنیا میں نہیں چل سکتا تھا۔ عیسائیت نے جن آئین و دساتیر کو رائج کیا تھا، وہ نظم و ضبط اور وحدت و یکجہتی کے بجائے تشتت و افتراق اور ہلاکت و بربادی کا موجب بن رہے تھے۔ غرضیکہ وہ وقت آچکا تھا۔ جب ہر طرف فساد ہی فساد نظر آتا تھا۔ تہذیب کا وہ بلند و بالا درخت جس کی سرسبز و شاداب شاخیں کبھی ساری دنیا پر سایہ فگن تھیں اور آرٹ، سائنس اور لٹریچر کے زرّیں ثمرات سے بہرہ یاب ہو چکی تھیں، اب لڑکھڑا رہا تھا۔ عقیدت و احترام کی زندگی بخش نمی اس کے تنے سے خشک ہو چکی تھی۔ اور وہ اندر تک سے بوسیدہ اور کھوکھلا ہو چکا تھا۔ سلسلہ حرب و ضرب کے طوفانوں نے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے تھے، اور یہ ٹکڑے صرف رسوماتِ پارینہ کے بندھن سے ایک جگہ قائم تھے لیکن ان کے متعلق ہر وقت خطرہ تھا کہ نہ معلوم کب گر پڑیں۔"

ظہورِ اسلام کے وقت دنیائے تہذیب و تمدن کا یہ نقشہ کھینچنے کے بعد یہ مؤرخ سوال اٹھاتا ہے کہ :-

"کیا ان حالات میں کوئی ایسا جذباتی کلچر کہیں سے پیدا کیا جا سکتا تھا جو نوعِ انسانی کو ایک مرتبہ پھر ایک نقطہ پر جمع کر دیتا اور اس طرح تہذیب کو مٹنے سے بچا لیتا؟ اس کلچر کو بالکل نئے انداز کا ہونا چاہیے تھے۔ اس لئے کہ پرانی رسومات اور آئین و ضوابط سب مردہ ہو چکے تھے اور ان ہی جیسے اور آئین کا مرتب کرنا صدیوں کا کام تھا۔"

اس کے بعد یہ مؤرخ لکھتا ہے کہ اس وقت دنیا کو ایک ایسے کلچر کی ضرورت تھی جو "تخت و تاج کے کلچر" اور وحدتِ انسانی کے ان تمام نظامہائے کہن کی جگہ لے لیتا جن کا مدار خون کے رشتوں پر تھا۔ وہ کہتا ہے کہ یہ امر موجبِ حیرت

استعجاب ہے کہ اس قسم کا نیا کلچر سرزمینِ عرب سے پیدا ہوا۔ اور عین اس وقت پیدا ہوا جب دنیا کو اس کی اشد ضرورت تھی۔

لیکن اس میں حیرت و استعجاب کی کوئی بات نہیں۔ حیاتِ کائنات وجدانی طور پر اپنے تقاضوں کا احساس کر لیتی ہے اور نازک ساعتوں میں وہ اپنا رُخ آپ متعیّن کر لیتی ہے۔ یہی وہ چیز ہے جسے مذہب کی زبان میں وحیٔ نبوت کہا جاتا ہے۔ یہ بالکل قدرتی امر تھا کہ اسلام کا خورشیدِ جہانتاب، ایک ایسی سادہ قوم کے اُفقِ شعور سے طلوع ہوتا جسے کسی قدیم ثقافت کی ہوا تک نہ لگی تھی اور جو ایک ایسی سرزمین میں بستی تھی جہاں تین بڑے بڑے اعظم ملتے ہوتے تھے۔ اس جدید ثقافت نے دنیا کو بتایا کہ وحدتِ انسانیت کی بنیاد صرف اصول "توحید" پر رکھی جا سکتی ہے۔ نظامِ سیاست کی حیثیت سے اسلام، اس اصولِ توحید کو، نوعِ انسانی کی جذباتی اور فکری زندگی میں ایک جیتا جاگتا عنصر بنانے کا عملی ذریعہ ہے۔ اس کا مطالبہ تخت و تاج کی اطاعت نہیں۔ صرف خدا کی اطاعت ہے اور چونکہ ذاتِ خداوندی، حیاتِ کلّی کی روحانی اساس و بنیاد ہے، اس لئے خدا کی اطاعت سے مفہوم، انسان کا خود اپنی مثالی فطرت کی اطاعت ہے۔ نہ کسی غیر کی محکومیّت۔

اسلام کا پیش کردہ تصوّر یہ ہے کہ حیاتِ کلّی کی یہ روحانی اساس، ازلی اور ابدی ہے لیکن اس کی نمود تغیّر و تنوّع کے پیکروں میں ہوتی ہے۔ جو معاشرہ حقیقتِ مطلقہ کے متعلّق اس قسم کے تصوّر پہ متشکّل ہو، اس کے لئے ضروری

ثبات و تغیّر کا امتزاج

ہوگا کہ وہ اپنی ذات میں مستقل اور تغیّر پذیر (جیسے متضاد عناصر) میں تطابق و توافق پیدا کرے، اس کے لئے ضروری ہے کہ اس کے پاس، اپنی اجتماعی زندگی کے نظم و ضبط کے لئے مستقل اور ابدی اصول ہوں۔ اس لئے کہ اس دنیا میں جہاں تغیّر کا دور دَورہ ہے، ابدی اصول ہی وہ محکم سہارا بن سکتے ہیں جن پہ انسان اپنا پاؤں ٹکا سکے۔ لیکن اگر ابدی اصولوں کے متعلّق یہ سمجھ لیا جائے کہ ان کے دائرہ میں تغیّر کا امکان ہی نہیں — وہ تغیّر جسے قرآن نے عظیم آیات اللہ میں شمار کیا ہے۔[۱] — تو اس سے زندگی جو اپنی فطرت میں متحرک واقع ہوئی ہے۔ یکسر جامد و متصلّب بن کر رہ جائے گی۔ یورپ کے عمرانی اور سیاسی علوم میں جو ناکامی ہوئی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے ہاں کوئی ابدی اور غیر متبدّل اصولِ حیات نہیں تھے۔

۱۔ اِنَّ فِی اخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَ النَّهَارِ ..... لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّتَّقُوۡنَ (۱۰/۶)

اس کے برعکس، گذشتہ پانچ سو سال میں اسلام جس قدر جامد اور غیر متحرک بن کر رہ گیا ہے اس کی یہ وجہ ہے کہ مسلمانوں نے مستقل اقدار کے دائرے میں اصولِ تغیر کو نظر انداز کر رکھا ہے۔ لہٰذا دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ اسلام کی وضع اور ترکیب میں کون سا اصولِ حیات کارفرما ہے؟ یہ اصول وہی ہے جسے اجتہاد کہتے ہیں۔

اجتہاد

اجتہاد کے لغوی معنی جدّوجہد اور پوری پوری کوشش کے ہیں۔ اور اسلامی قانون کی اصطلاح میں، کسی مسئلہ پر آزادانہ رائے قائم کرنے کے لئے جدّوجہد کا نام اجتہاد ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ تصوّر قرآن کریم کی اس آیۂ جلیلہ سے مستنبط ہے۔ جس میں کہا گیا ہے کہ وَالَّذِینَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا (۲۹/۶۹) جو لوگ ہماری متعین کردہ منزل تک پہنچنے کے لئے پوری پوری کوشش کرتے ہیں، ہم انہیں اس منزل تک پہنچنے کے راستے دکھا دیتے ہیں، اس کی تشریح نبی اکرمؐ کی ایک حدیث میں ملتی ہے۔ روایت ہے کہ جب حضرت معاذ کو یمن کا گورنر مقرر کیا گیا تو رسول اللہؐ نے ان سے پوچھا کہ وہ معاملات کے فیصلے کس طرح کریں گے۔ انہوں نے جواب میں کہا کہ میں تمام امور کے فیصلے کتاب اللہ کے مطابق کروں گا۔ اس پر رسول اللہؐ نے فرمایا کہ اگر کسی معاملہ میں کتاب اللہ سے راہ نمائی نہ ملے[لہ] تو پھر؟ اس کے جواب میں حضرت معاذ نے کہا کہ ایسی صورت میں، میں رسول اللہؐ کے نظائر کی طرف رجوع کروں گا۔ مکرر ارشاد ہوا کہ اگر اس باب میں یہ نظائر بھی خاموش ہوں تو؟ تو میں اپنے اجتہاد سے فیصلہ دوں گا"۔ یہ تھا حضرت معاذ کا جواب۔

(یہ تھی اس تصوّر کی ابتداء۔ لیکن) تاریخ اسلام کے طالب العلم کی نگاہ سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں کہ اسلامی مملکت کی توسیع کے ساتھ، ایک منظم اور باضابطہ قانونی فکر کی ضرورت لاینفک ہوگئی۔ یہی وہ ضرورت تھی جس کے ماتحت، ہمارے قدیم فقہا۔ عرب اور غیر عرب دونوں۔ اس باب میں برابر محنت کرتے رہے تاآنکہ ان کی اجتماعی فکر، ہماری فقہ کے مسلّمہ مذاہب کے پیکروں میں جلوہ پیرا ہوگئی۔ یہ فقہی مذاہب، اجتہاد کے تین مدارج تسلیم کرتے ہیں۔

اجتہاد کے تین مدارج

(۱) اجتہادِ مطلق۔ یعنی قانون سازی کا اختیارِ کلّی۔ جو ان مذاہب کے آئمہ کی ذات تک محدود ہے۔

لہ یعنی اس میں اس کے لئے متعین قانون نہ ہو۔

(۲) اضافی اجتہاد - یعنی کسی ایک مذہب فقہ کے اندر رہتے ہوئے، اجتہاد کی ضرورت

(۳) خصوصی اجتہاد - یعنی ان مسائل میں اجتہاد جنہیں ائمہ فقہ نے غیر معیّن چھوڑ دیا ہو۔

میں اس خطبہ میں صرف شِق اوّل (اجتہادِ مطلق) کے متعلق، گفتگو کروں گا۔

سُنّی حضرات، نظری طور پر تو اس کے قائل ہیں کہ اس قسم کا اجتہاد ممکن ہے۔ لیکن ائمہ فقہ کے مذاہب کے قیام کے بعد عملاً اس کا دروازہ بند ہے۔ اس لئے کہ اس قسم کے اجتہاد کے لئے جن شرائط کو ضروری قرار دیا جاتا ہے، اُن کا پورا کرنا کسی ایک فرد کے لئے قریب قریب ناممکن ہے۔ ایک ایسے نظامِ شریعت میں، جس کی بنیاد قرآن پر ہو جو زندگی کے متعلق حرکیاتی اور ارتقائی تصوّر کا علمبردار ہے، اس قسم کی ذہنیت کچھ عجیب سی دکھائی دیتی ہے۔ لہٰذا آگے بڑھنے سے پیشتر یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم ان اسباب وعلل کا انکشاف کریں جن کی وجہ سے یہ ذہنیت پیدا ہوئی۔ جس نے قانونِ شریعت کو محض منجمد بنا کر رکھ دیا۔ بعض مغربی مصنفین کا خیال ہے کہ اس جمود کا باعث تُرکوں کا اثر ہے۔ لیکن میرے نزدیک یہ خیال سطحی سا ہے۔ اس لئے کہ ہمارے مذاہبِ فقہ، ترکوں کے اثرات کی آمد سے بہت پہلے اپنی آخری شکل میں مرتّب و متشکّل ہو چکے تھے۔ میرے خیال میں اس کے حقیقی اسباب حسب ذیل ہیں۔

جمود کے اسباب

(۱) اس حقیقت سے سب واقف ہیں کہ عبّاسیوں کے ابتدائی دور میں، اسلام میں معقولیین (معتزلہ) کی ایک تحریک پیدا ہوئی تھی جس کی وجہ سے کئی تند و تلخ بحثیں چھڑ گئی تھیں۔ مثلاً ان دو گروہوں (منقولیین اور معقولیین) کے درمیان ایک مابہ النزاع مسئلہ یہ بھی تھا کہ قرآن مخلوق ہے یا غیر مخلوق۔ معقولیین (معتزلہ) نے اسکے غیر مخلوق ہونے سے اس بنا پر انکار کیا کہ ان کے نزدیک یہ عیسائیت کے اس عقیدے کی ایک دوسری شکل تھی جس کی رُو سے وہ "کلمہ" کو قدیم مانتے ہیں۔ اس کے برعکس، قدامت پرست گروہ (محدّثین) نے جنہیں بعد میں عباسی خلفاء کی تائید اس بنا پر حاصل ہو گئی کہ وہ معتزلہ کے سیاسی اثرات سے خائف تھے۔ معتزلہ کی اس وجہ سے مخالفت کی کہ ان کا خیال تھا کہ قرآن کو مخلوق مان کر وہ اسلامی معاشرہ کی بنیادیں کمزور کر رہے ہیں۔ مثلاً نظّام معتزلی کو لیجئے۔ اس نے احادیث کا قریب قریب انکار کر دیا اور حضرت ابوہریرہؓ کے متعلق علانیہ کہہ دیا کہ وہ قابلِ اعتماد راوی نہ تھے۔ چنانچہ کچھ تو اس لئے کہ ان معقولیین کے حقیقی مسلک کے متعلق لوگوں کو غلط فہمی ہوئی اور کچھ اس لئے کہ ان میں سے بعض کے افکار بے باک سے ہو گئے، قدامت پسند گروہ نے اس تحریک کو اُمّت میں انتشار

محدّثین کا گروہ

پیدا کرنے کا موجب سمجھا اور اسلام کے نظامِ تمدن و سیاست کے استحکام کے لیے خطرہ تصور کیا۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ کسی نہ کسی طرح اسلامی معاشرہ کو انتشار سے بچایا جائے، اس مقصد کے حصول کے لیے، ان کے سامنے ایک ہی طریق کار تھا۔ اور وہ یہ کہ اس کے لئے شریعت کے ڈھڈسے کو استعمال کیا جائے اور اپنے ضابطۂ قانون کو شدت کے ساتھ سخت گیر بنا دیا جائے (یعنی اس میں نہ کوئی لچک رکھی جائے نہ کسی تغیر و تبدل کی گنجائش)۔

تصوف

(۲) اسلامی قانونِ شریعت کے جامد اور متصلب بن جانے کا یہ پہلا سبب تھا۔ اس کا دوسرا سبب، مسلمانوں میں خانقاہیت کے تصوف کی نمود اور فروغ تھا۔ اس نے، یکسر غیر اسلامی اثرات کے ماتحت، آہستہ آہستہ، ملت کو زندگی کے عملی مسائل سے بیگانہ بنا کر، قیاسی اور نظری تصورات میں اُلجھا دیا۔ خالص مذہبی نقطۂ نگاہ سے، تصوف نے فقہا اور متکلمین کی لفظی موشگافیوں اور نکات آفرینیوں کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ مثال کے طور پر حضرت سفیان ثوریؒ کو لیجئے۔ یہ اپنے دور کے بڑے غائر بیں، مقننین میں سے تھے۔ بلکہ یوں سمجھئے کہ ایک خاص فقہی مذہب کے بانی، لیکن چونکہ ان کا رجحان شدت سے روحانیت[1] کی طرف تھا۔ اس لیے انہوں نے فقہا کی خشک بحثوں سے تنگ آ کر تصوف کی آغوش میں پناہ لے لی۔ جہاں تک تصوف کے تصوراتی پہلو کا تعلق ہے (جس نے بعد میں ایک فلسفہ کی شکل اختیار کر لی) یہ آزاد خیالی کا مظہر اور معقولیین کا ہم رنگ ہے۔ لیکن اس نے ظاہر اور باطن کے امتیاز پر جس قدر زور دیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ باطن کی اہمیت بڑھتی گئی اور زندگی کے ظاہری پہلو سے بے اعتنائی اور بے التفاتی کا رجحان راسخ ہو گیا۔ ترکِ دنیا کے اس مسلک نے آگے چل کر مسلمانوں کی نگاہوں سے اسلام کے سیاسی اور تمدنی گوشے کو، جو اپنے اندر بڑی اہمیت رکھتا ہے، یکسر اوجھل کر دیا۔ دوسری طرف، اس نے عقائد و افکار کی دنیا میں جس قدر آزادی دے رکھی تھی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے ملت کے بہترین دماغوں کو اپنی طرف کھینچ لیا اور وہ اس طرح کانِ نمک میں جا کر نمک بن گئے۔ جب بہترین دماغ اس طرف چلے گئے تو سیاست لامحالہ کم مایہ اور ادنیٰ اصلاحیتیں رکھنے والے افراد کے ہاتھوں میں آ گئی۔ باقی رہے عوام۔ سو چونکہ قوم میں بلند پایہ مفکرین کا فقدان ہو گیا جو ان کی صحیح فکری راہ نمائی کر سکتے، اس لئے انہوں نے اپنی عافیت اسی میں سمجھی کہ وہ مختلف فقہی مذاہب کی اندھی تقلید کرتے رہیں۔

---

[1] اس سے مراد تصوف کی روحانیت ہے۔

زوالِ بغداد

(۳) ان سب پر طرّہ یہ کہ تیرہویں صدی عیسوی کے وسط میں بغداد پر تباہی آگئی جو مسلمانوں کی حیاتِ عقلی کا مرکز بن چکا تھا۔ یہ حادثہ فی الحقیقت مسلمانوں کے لئے طامۃ الکبریٰ اور ایسا جانکاہ صدمہ تھا کہ اس زمانے کے کم و بیش تمام ہمعصر مؤرخین جب تاتاری حملوں کی ہولناکیوں اور تباہ کاریوں کا ذکر کرتے ہیں تو دبی زبان سے خود اسلام کے مستقبل کے متعلق مایوسی کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ جب اس تباہی نے ملت کا شیرازہ اس طرح بکھیر دیا تو قدامت پرست مفکرین نے، قوم کو مزید انتشار سے بچانے کی خاطر اپنی تمام تر توجہات کو اس ایک نقطہ پر مرکوز کر دیا کہ کسی نہ کسی طرح معاشرتی زندگی کی یکسانیت کو محفوظ رکھ لیا جائے۔ اس کے لئے انہوں نے فتویٰ دے دیا کہ فقہائے سلف نے جو قوانینِ شریعت مرتب کر دیئے ہیں، ان میں کسی قسم کا ردّ و بدل نہیں کیا جا سکتا۔ (اس طرح ہر قسم کی ندرتِ فکر، بدعت یعنی ضلالت قرار پا گئی) ان حضرات کے پیشِ نظر صرف ملت کا معاشرتی نظم تھا اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ اس باب میں کسی حد تک حق بجانب بھی تھے۔ اس لئے کہ جماعتی نظم زوال اور عناصر کی کچھ نہ کچھ روک تھام تو کر ہی دیتا ہے۔ لیکن انہوں نے اس اہم حقیقت کو نہ سمجھا۔ اور نہ ہی اسے ہمارے دور کے علماء سمجھتے ہیں کہ کسی قوم کے مستقبل کا انحصار اس کے جماعتی نظم پر اتنا نہیں ہوتا جتنا افراد کی قوت اور صلاحیت پر ہوتا ہے۔ ایک ایسے معاشرہ میں جس میں جماعتی نظم پر ضرورت سے زیادہ زور دیا جائے، فرد کی انفرادیت کچل کر رہ جاتی ہے۔ وہ اپنے گرد و پیش کے معاشرتی فکر کے سرمایہ کا تو مالک بن جاتا ہے لیکن اس کی اپنی روح مُردہ ہو جاتی ہے۔

ماضی کا جھوٹا احترام

لہٰذا قوموں کے زوال کا علاج ان کے ماضی کی تاریخ کے جھوٹے احترام اور اس کے مصنوعی احیاء سے نہیں ہو سکتا جیسا کہ دورِ حاضر کے ایک مصنّف نے کہا ہے:-

"تاریخ کا فیصلہ یہ ہے کہ وہ خیالات اور نظریات جو اپنی توانائی کھو کر فرسودہ ہو چکے ہوں، ان لوگوں میں کبھی پھر سے توانائی حاصل نہیں کر سکتے۔ جنہوں نے انہیں فرسودہ بنا دیا ہو۔"

لہٰذا زوال اور عناصر کی روک تھام کا مؤثر طریقہ صرف ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ قوم میں خود خریدہ افراد کو پیدا کیا جائے۔ یہی وہ افراد ہیں جو زندگی کی گہرائیوں کے سربستہ راز کھولتے ہیں۔ وہ ایسے نئے معیارِ زیست سامنے لاتے ہیں جن کی روشنی میں ہم یہ دیکھنا شروع کر دیتے ہیں کہ ہمارا ماحول ایسا غیر متبدل نہیں کہ اسے چھوا تک نہ جائے۔ ہم اس میں تبدیلیوں کی ضرورت محسوس کرنے لگتے ہیں۔ تیرہویں صدی اور اس کے بعد کے علماء کا یہ رجحان کہ ماضی کی جھوٹی تقدیس سے جماعتی نظم کو جامد اور متصلّب طور پر قائم رکھا جائے، اسلام کی روح کے یکسر خلاف تھا۔ قدامت پرست

علماء کا یہی وہ رجحان تھا جس کا ردِ عمل امام ابن تیمیہؒ کی صورت میں نمودار ہوا۔

امام ابن تیمیہؒ

ابن تیمیہؒ بغداد کی تباہی کے پانچ سال بعد، ۱۲۶۳ء میں، پیدا ہوئے۔ ان کی تربیت، حنبلی مذہب کی روایات کے زیرِ سایہ ہوئی تھی وہ ایک زبردست اہلِ قلم اور نہایت سرگرم مبلغِ اسلام تھے۔ انہوں نے خود مجتہد ہونے کا دعویٰ کیا اور اس عقیدہ کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا کہ اجتہاد کا دروازہ بند ہو چکا ہے اور جو کچھ مذاہبِ فقہ نے مرتب کر دیا ہے وہ شریعت میں حرفِ آخر ہے۔ انہوں نے کہا کہ جس طرح ابتداءً فقہ مرتب ہوئی تھی، ہم بھی انہی اصولوں کے ماتحت اسے ازسرِ نو مرتب کر سکتے ہیں۔ قرینِ ظاہر یہ کہ امام ابن حزمؒ کی طرح انہوں نے بھی حنفی مذہب کے قیاس اور اجماع کے اس تصور کی تردید کی جو ان کے ہاں شروع سے چلا آرہا تھا۔ اس لئے کہ ان کی یہ رائے تھی کہ اس طرح کا اجماع درحقیقت توہم پرستیوں کی بنیاد ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ امام ابن تیمیہؒ کے زمانے میں جس قسم کی ذہنی ابتری اور اخلاقی کمزوری عام ہو رہی تھی، اس کے پیشِ نظر ان کا یہ مسلک بالکل درست تھا۔

سولہویں صدی میں امام سیوطیؒ نے بھی مجتہد ہونے کا دعویٰ کیا اور اس کے ساتھ ہی اس عقیدہ کا بھی اضافہ کیا کہ ہر صدی کے آخر پر ایک مجدد پیدا ہوتا ہے۔ لیکن ابن تیمیہؒ کی تعلیم کی روح کا مکمل مظاہرہ اس تحریک میں جا کر ہوا جو اٹھارہویں صدی میں، ریگ زارِ نجد سے اٹھی۔ اس خطہ سے جسے میکڈانلڈ نے "زوال پذیر اسلامی دنیا کا پاکیزہ ترین خطہ" قرار دیا ہے۔

نجدی تحریک

یہ تحریک عظیم مضمرات و ممکنات کی حامل تھی۔ اس سے اسلام کی حیاتِ تازہ کا آغاز ہوتا ہے۔ چنانچہ اسلامی ایشیا اور افریقہ کی قریب قریب تمام جدید تحریکوں کا سرچشمۂ زندگی، بالواسطہ یا بلاواسطہ، یہی تحریک نجد ہے۔ مثلاً سنوسی کی تحریک، بین الاسلامی (پان اسلامک) تحریک یا ایران کی بابی تحریک، جو درحقیقت عربی پراٹسٹنٹ تحریک کا ایرانی عکس ہے۔ ان سب میں وہی روح کارفرما نظر آتی ہے۔ اس نجدی تحریک کا بانی، محمد بن عبدالوہابؒ ۱۷۰۰ء میں پیدا ہوا۔ ان کی ابتدائی تعلیم مدینہ میں ہوئی۔ اس کے بعد انہوں نے ایران کا سفر کیا اور پھر (اپنی مسلسل سعی و عمل سے) انہوں نے اپنی روحِ بے قرار کی حرارت کو تمام عالمِ اسلامی کے رگ و پے میں دوڑا دیا۔ ان کا جوشِ عمل، امام غزالیؒ کے شاگرد، ابن تومرت کے جوش و ولولہ کے مشابہ تھا جو اندلس کی تباہی کے بعد پیدا ہوا اور جس نے اس میں ایک نئی روح پھونک دی۔ اس وقت ہم اس (نجدی) تحریک کی سیاسی سرگرمیوں سے بحث نہیں کرنا چاہتے۔ جنہیں محمد علی پاشا نے ختم کر دیا۔ اس تحریک

کے اس اجمالی سے تذکرہ سے مقصود صرف اُس روحِ آزادی کو سامنے لانا ہے جس کی یہ مظہر تھی، اگرچہ اپنی داخلی سرشت میں یہ تحریک بھی قدامت پرستی ہی پر مبنی تھی۔ یعنی یہ ایک تحریک[۱] ایک طرف اس عقیدہ کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرتی تھی کہ اجتہاد کے تمام دروازے بند ہیں اور اپنے لئے حقِ اجتہاد کی زبردست مدعی تھی لیکن دوسری طرف، ماضی کے متعلق اس کا طرزِ عمل بحیثیت مجموعی غیر تاقدانہ تھا اور قوانینِ شریعت کے لئے وہ صرف احادیثِ نبوی پر دارومدار رکھتی تھی۔[۲]

ترکی

اب ترکی کی طرف آیئے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اجتہاد کا نظریہ، جسے عصرِ حاضر کے فلسفیانہ تصورات نے بڑی تقویت اور وسعت دے دی ہے، ترکوں کی مذہبی اور سیاسی فکر میں ایک عرصے سے کارفرما ہے۔ یہ حقیقت قانونِ شریعت کے متعلق حلیم ثابت کے جدید نظریہ سے بالکل ظاہر ہے کہ جس کی بنیاد جدید عمرانی تصورات پر رکھی گئی ہے۔ اگر اسلام کی نشاۃِ ثانیہ ایک حقیقت ہے اور میرا ایمان ہے کہ یہ ایک حقیقت ہے تو ترکوں کی طرح ایک دن ہمیں بھی اپنی علمی میراث کا از سرِنو جائزہ لے کر اس کی صحیح صحیح قیمت متعین کرنی ہوگی۔ اس سے اگر ہم نے عام فکرِ اسلامی میں کوئی قابلِ قدر اضافہ نہ بھی کیا، تو ہم کم از کم اتنا تو کر سکیں گے کہ اپنے ماضی پر صحیح تنقید سے، بے راہ روی اور مذہب سے برگشتگی کی اس رَو کو تھام سکیں جو اس وقت عالمِ اسلام میں بڑھتی چلی جا رہی ہیں۔

میں اب ترکی کے مذہبی اور سیاسی افکار و رجحانات کا ایک اجمالی سا خاکہ آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں جس سے آپ اندازہ لگا سکیں گے کہ اس ملک کے فکر و عمل کے دوائر میں اجتہاد کی قوت کس درجہ نمایاں ہو رہی ہے۔ اب سے کچھ وقت پہلے، ترکی میں دو مکاتبِ فکر تھے۔ ایک وہ جس کی نمائندگی وہاں کی نیشنلسٹ پارٹی کرتی تھی اور دوسرا وہ جس کی ترجمان مذہبی اصلاح کی علمبردار جماعت تھی۔ نیشنلسٹ پارٹی کے پیشِ نظر سب سے اہم سوال مذہب نہیں بلکہ مملکت کا مفاد ہے۔ ان کے نزدیک مذہب کا کوئی آزادانہ منصب ہی نہیں۔ قومی زندگی میں مملکت ہی وہ ضروری عنصر ہے جس سے دیگر عناصر کے فرائض و مناسب معین ہوتے ہیں۔

۱۔ یہی تحریک ہے جو عام میں وہابی تحریک کے نام سے مشہور ہوئی اور جو اب مسلک اہلِ حدیث کی شکل میں متعارف ہے۔ یہ حضرات ماضی پرستی میں اہلِ فقہ سے بھی زیادہ متشدد ہیں۔

۲۔ اسے پیشِ نظر رکھئے کہ یہ بات ۱۹۲۸ء میں کہی گئی تھی۔

انہوں نے چنانچہ، مذہب اور سیاست کے فرائض کے متعلق قدیم خیالات کو یکسر مسترد کر دیا ہے اور اس امر پر زور دیا ہے کہ مذہب کو ریاست سے الگ کر دینا چاہیئے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ایک مذہبی اور سیاسی نظام کی حیثیت سے اسلام کی ہیئت ترکیبی اس قسم کے تصوّر کی اجازت دیتی ہے[۱]۔ اگرچہ میرا ذاتی خیال ہے کہ یہ سمجھنا غلط ہے کہ مملکت کے تصوّر کو اس قدر اہمیت حاصل ہے کہ یہ تمام دیگر اسلامی تصوّرات پر غالب اور حاکم ہے۔ (حقیقت یہ ہے کہ) اسلام میں روح اور مادہ، (دین اور دنیا) دو الگ الگ دوائر حیات نہیں اور اس کا فیصلہ کہ فلاں کام دنیاوی ہے یا دینی، اس کام کے کرنے والے کی نیّت سے ہوتا ہے، خواہ

دین اور سیاست کی ثنویت

اس کام کا مقصود، کیسا ہی دنیاوی کیوں نہ ہو۔ (بالفاظ دیگر) کسی کام کے دنیاوی یا دینی ہونے کا فیصلہ اس کام کی نوعیت نہیں کرتی، بلکہ وہ ذہنی پس منظر کرتا ہے جو بالکل غیر مرئی (INVISIBLE) ہوتا ہے۔ مثلاً ایک کام "دنیاوی" اس وقت کہلائے گا جب اسے زندگی کے گوناگوں علائق سے یکسر بے تعلّق ہو کر کیا جائے۔ لیکن وہی کام "روحانی" ہو جائے گا۔ اگر اس کا جذبۂ محرکہ حیات کے وہ علائق ہوں، اسلام میں، ایک ہی حقیقت کو اگر ایک زاویۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو وہ مذہب (کلیسا) بن کر دکھائی دیتی ہے اور اسے دوسرے نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو وہ مملکت ہو جاتی ہے (یعنی اسلام میں مذہب اور سیاست ایک ہی حقیقت ہے)۔ حتّٰی کہ یہ کہنا بھی غلط ہے کہ مذہب اور مملکت ایک شے کے دو رُخ یا دو گوشے ہیں۔ (دو رُخ یا دو گوشے نہیں بلکہ یہ دونوں ایک ہی چیز ہیں) اسلام ایک ناقابلِ تقسیم اور واحد حقیقت ہے۔ اس حقیقت کو جس زاویۂ نگاہ سے دیکھا جائے یہ وہی بن جائے گی۔ یہ نقطہ بڑا دُور رس ہے اور اگر اس کی وضاحت شرح و بسط سے کی جائے تو ہم بہت بلند اور دقیق فلسفیانہ بحث میں اُلجھ جائیں گے۔ اس لئے میں اس مقام پر صرف اتنا کہنے پر اکتفا کروں گا کہ مذہب اور سیاست کی ثنویت، اس قدیم غلط تصوّر کی پیدا کردہ ہے جس کی رُو سے انسان کی وحدت کو ان دو جداگانہ حقیقتوں میں تقسیم کر دیا گیا جن کے متعلّق یہ سمجھا گیا کہ ان کا نقطۂ اتّصال تو ضرور ہے لیکن یہ (حقیقت) ایک دوسرے سے یکسر متغائر اور متضاد ہیں۔ (یعنی روح اور مادہ کی مغائرت

---

(۱) ہم اس فقرے کا مطلب نہیں سمجھ سکے۔ اس لئے کہ اس کے بعد حضرت علامہؒ نے شرح و بسط سے واضح کیا ہے کہ اسلام میں مذہب اور سیاست کی ثنویت کی قطعاً گنجائش نہیں۔

کا تصوّر، لیکن حقیقت یہ ہے کہ جب روح (SPIRIT) کو زمان و مکان کی نسبتوں سے دیکھا جاتے

روح اور مادہ

تو اسے مادہ کہتے ہیں (اس لئے روح اور مادہ الگ الگ حقیقتیں نہیں ہیں) وہ وحدت جسے انسان کہا جاتا ہے، جسم دکھائی دے گی جب ہم اسے خارجی دنیا میں کام کرتا دیکھیں۔ لیکن جب ہم اس مقصد اور غایت پر نگاہ رکھیں جس کے لئے وہ کام کیا جارہا ہے تو یہی وحدت روح (SOUL) یا (MIND) بن جائے گی۔ "توحید" کو جب ایک عملی تصوّر کی حیثیت سے دیکھا جائے تو مساوات، سالمیت SOLIDARITY اور حرّیت اس کے بنیادی خصائص نظر آئیں گے۔ جس ادارہ کو مملکت کہا جاتا ہے، اسلامی نقطۂ نگاہ سے وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ "توحید" کے انہی بنیادی خصائص کو مادّی پیکروں میں متشکّل اور کارفرما کرنے کا ذریعہ ہے۔ یا بالفاظِ دیگر، اس نصب العین کو انسانی معاشرہ کے قالب میں ڈھالنے کی آواز۔ اسلام میں مملکت کے "خدائی حکومت" ہونے سے مفہوم صرف اتنا ہی ہے۔ اس سے یہ مفہوم نہیں کہ اس کا رئیس یا صدر، خدا کا نائب ہے جو اپنے مستبد ارادوں اور جابرانہ فیصلوں کو مزعوم معصومیت کے نقاب میں چھپا کر، خدا کے بندوں پر اپنا حکم چلاتا ہے۔ جو لوگ اسلامی نظامِ حکومت پر تنقید کرتے ہیں ان کی نگاہوں سے یہ اہم حقیقت اوجھل ہوتی ہے۔ عصرِ حاضر کی سائنس نے اس حقیقت کو منکشف کر دیا ہے کہ مادہ اپنا ایک الگ وجود نہیں رکھتا۔ اس کی اصل روح (SPIRIT) کے اندر ہے۔ اس انکشاف نے اسلام، بلکہ دنیائے مذاہب کی ایک بہت بڑی خدمت انجام دی ہے۔ اس نے بتایا ہے کہ مادی دنیا یا محسوس کائنات کوئی نجس اور قابلِ نفرت شے نہیں ہے۔ مادّہ کا یہ عظیم ذخیرہ محض اس لئے وجود میں لایا گیا ہے کہ اس کے ذریعہ انسانی ذات' PERSONALITY' اپنے اندر استحکام پیدا کر کے اپنے مقام کو پالے۔ لہٰذا مادّی کائنات مقدّس اور پاکیزہ ہے۔ نجس اور خبیث نہیں۔ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے حسین الفاظ میں "یہ تمام دنیا مسجد ہے" لہٰذا اسلامی نقطۂ نگاہ سے، مملکت اس کارگاہ کا نام ہے جس کے اندر انسانی ذات، معاشرہ کی وساطت سے پیدا اور مستحکم ہو کر اپنے مقام کو پالیتی ہے۔ اس لحاظ سے ہر وہ مملکت جو تغلّب و تسلّط پر مبنی نہ ہو، اور جس کا مقصد ان مثالی اصولوں کا حصول ہو، "حکومتِ خداوندی" ہوتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ترک قومیّت پرستوں کے ذہن میں مذہب اور ریاست کی تفریق کا خیال، یورپ کے سیاسی افکار کی تاریخ کے مطالعہ سے پیدا ہوا۔ قدیم عیسائیت ایک سیاسی یا معاشرتی نظام کی صورت میں وجود میں نہیں آئی تھی۔ وہ ایک "نجس اور خبیث دنیا" میں نظامِ خانقاہیّت کی حیثیت سے وارد

ہوئی تھی۔ جس کا انسان کے عمرانی معاملات سے کوئی سروکار نہ تھا۔ ان معاملات میں وہ رومی اقتدار کے تابع تھی۔

چرچ اینڈ سٹیٹ

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب مملکت نے مذہب عیسائیت اختیار کیا تو سٹیٹ اور چرچ (کلیسا) ایک دوسرے کے حریف بن کر سامنے آئے اور ان میں یہ لامتناہی نزاع پیدا ہو گئی کہ ایک کا دائرۂ اثر و نفوذ کیا ہے اور دوسرے کے حدودِ اقتدار کون سے ؟ اسلام میں ایسی صورتِ حالات کبھی پیدا نہیں ہو سکتی تھی۔ اس لئے کہ اسلام شروع ہی سے ایک دوسرے نظام کی حیثیت سے منصۂ شہود پر آیا تھا جسے قرآن کریم نے لیے سیدھے سادے قانونی اصولوں کا ضابطہ عطا کر دیا تھا جس میں رومیوں کے مشہور بارہ جدولوں کی طرح، اس امر کی صلاحیت تھی کہ وہ (ہر زمانے کے تقاضے کے مطابق) نئی نئی تعبیرات کی رُو سے پھیلتا چلا جائے۔ چنانچہ بعد کے تجربہ نے ثابت کر دیا کہ قرآن نے جو قانونی اصول دیئے ہیں ان میں فی الحقیقت ان وسعتوں کے امکانات موجود ہیں۔ لہٰذا ترکوں کی نیشنلسٹ پارٹی نے مملکت کے متعلق

قرآن کے قانونی اصول

جو نظریہ قائم کیا ہے وہ یکسر گمراہ کن ہے۔ اس لئے کہ وہ مذہب اور سیاست میں اس ثنویت کے تصور پر مبنی ہے جس کا اسلام میں کوئی وجود نہیں۔

اس کے برعکس، مذہبی اصلاحات کی پارٹی جس کے سرکردہ، سعید حلیم پاشا تھے۔ اس اصل الاصول پہ مُصر تھی کہ اسلام، تصوریت (IDEALISM) اور مرئیت (POSITIVISM) روح اور مادہ) کا حسین مرکب ہے۔ یعنی اس میں بلند آفاقی اصولِ حیات، مادی پیکروں میں عملاً متشکل ہو جاتے ہیں۔ یہ حریت، مساوات اور سالمیت کی مستقل اقدار اور ابدی صداقتوں کا مجموعہ ہے جسے وطنیت کی چار دیواری میں محدود نہیں کیا جا سکتا، سعید حلیم پاشا، کے الفاظ میں "جس طرح برطانوی ریاضیات، جرمن فلکیات

وطنیت

اور فرانسیسی کیمسٹری (کیمیا) کا تصور غلط ہے۔ اسی طرح ترکی، عربی، ایرانی یا ہندی اسلام کا تصور بھی باطل ہے۔ (یعنی جو حقائق عالمگیر ہوں، وہ وطنی اضافتوں سے ایک دوسرے سے الگ نہیں کئے جا سکتے) جس طرح سائنس کے حقائق کی عالمگیریت مختلف قوموں میں مختلف سائینٹیفک کلچر پیدا کر دیتی ہے اور ان تمام کلچرز کا مجموعہ انسانی علم کہلاتا ہے۔ اسی طرح اسلام کی عالمگیر اقدار، مختلف قوموں میں مختلف ملی، اخلاقی اور معاشرتی نصب العین پیدا کر دیتی ہیں (خود غیر متبدل رہتی ہیں)"۔ سعید حلیم پاشا نے یہ بھی کہا ہے کہ موجودہ کلچر جس کی بنیاد قومی انانیت پر ہے، وحشت و بربریت ہی کی دوسری شکل ہے۔

قومیت پرستی

یہ عہد سے بڑھتے ہوئے نظامِ کارخانہ داری (INDUSTRIALISM) کی پیداوار ہے۔ جس کے ذریعے انسان اپنے جبلّی اور حیوانی تقاضوں اور رجحانات کی تسکین کر لیتا ہے۔ وہ (سعید حلیم پاشا) متأسّف ہیں کہ، ہماری تاریخ میں، اسلام کے اخلاقی اور معاشرتی اصول، مقامی اثرات اور (جو قومیں مسلمان ہوئیں ان کے) زمانۂ قبل از اسلام کے توہم پرستانہ عقائد و مسالک کی وجہ سے، آہستہ آہستہ غیر اسلامی ہوتے چلے گئے۔ چنانچہ آج حالت یہ ہو چکی ہے کہ اسلام کے یہ اصول، اسلامی کم اور ایرانی، ترکی اور عربی زیادہ ہیں۔ اسلام کے عالمگیر اور غیر شخصی اخلاقی اصولوں پر مقامی اثرات کا کچھ ایسا رنگ چڑھ گیا ہے کہ اس کی اصلی شکل و صورت اب پہچانی ہی نہیں جاتی۔ حتیٰ کہ اصولِ توحید کی مقدّس جبیں پر اصنام پرستی تک کے دھبّے دکھائی دیتے ہیں۔ اندریں حالات، ہمارے لئے کشادکاری کی ایک ہی راہ ہے۔ اور وہ یہ کہ آئینۂ اسلام

کشادکاری کی راہ

پر غیر اسلامی زنگ کی جو سخت اور درشت تہیں جم گئی ہیں، اور جس کی وجہ سے اس کا حرکیاتی اور ارتقائی نظریہ یکسر جامد ہو کر رہ گیا ہے۔ انہیں کھرچ کھرچ کر الگ کیا جائے۔ اور حرّیت، سالمیّت اور مساوات کی حقیقی اقدار کو از سرِ نو زندہ کر کے، ان کی بنیادوں پر اپنے اخلاقی عمرانی اور سیاسی نظام کی تشکیلِ جدید کی جائے جو حقیقی اسلام کی سادگی اور آفاقیت کا آئینہ دار ہو۔

غرض، یہ ہیں ترکی کے جلیل القدر وزیر، سعید حلیم پاشا کے خیالات۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ ایک ایسے راستے پر چلتے ہوئے جو روحِ اسلامی سے زیادہ قریب اور ہم آہنگ ہے، یہ مفکّر قریب قریب اسی نتیجہ پر پہنچتا ہے جو وہاں کی نیشلسٹ پارٹی کا موقف ہے۔ یعنی اجتہاد کی آزادی تاکہ جدید فکر اور زمانہ کے تجربات کی روشنی میں قانونِ شریعت کو از سرِ نو مرتّب کیا جائے۔

اس کے بعد علامہ اقبالؒ نے بتایا ہے کہ (مثلاً) الغائے خلافت کے مسئلہ پر ترکوں نے کس طرح اُن خطوط پر اجتہاد سے کام لیا ہے جن کی طرح ابنِ خلدون اور قاضی ابوبکر باقلانی جیسے مفکّر بہت پہلے ڈال چکے تھے۔ پھر انہوں نے ترکی کے مشہور انقلابی شاعر ضیا، کی بعض نظموں کے اقتباسات سے اس نقطہ کی وضاحت کی ہے کہ ترکی فکر کس طرح اپنے لئے نئی نئی راہیں تراش رہی ہے۔ اس شاعر نے اپنے جوشِ تجدّد پسندی میں یہ بھی کہا ہے کہ اسلامی قانونِ وراثت کی رُو سے عورت کو جو مرد سے نصف حصّہ ملتا ہے، یہ اصولِ مساوات کے خلاف ہے۔ علامہ اقبالؒ نے اس کے اس خیال کی تردید آگے چل کر کی ہے اور یہ بتایا ہے کہ اس کا یہ اعتراض قرآن کے

قوانینِ وراثت سے بے خبری کی بناء پر ہے۔ ان تصریحات کے بعد، علامہ اقبالؒ لکھتے ہیں :۔

"حقیقت یہ ہے کہ آج مسلمانوں میں ترکی ہی وہ قوم ہے جس نے ملّائیت کے خوابِ گراں سے بیدار ہو کر شعورِ ذات حاصل کیا ہے۔ یہی وہ قوم ہے جو بجا طور پر فکری آزادی کا دعویٰ کر سکتی ہے۔ یہی ہے جو تصوّرات کی دنیا سے آگے بڑھ کر حقائق کی دنیا کی طرف آ رہی ہے‽۔ اس عبوری دور سے گزرنے کے لئے ایک شدید ذہنی اور اخلاقی کشمکش ناگزیر تھی۔ اب، وسعتِ طلب اور حرکت پسند زندگی کی پیچیدگیاں اس کے سامنے نئے نئے مواقع پیش کریں گی۔ جن کے لئے نئے زاویوں سے سوچنے کی ضرورت ہوگی۔ اس کے لئے (اسلام کے غیر متبدل) اصولوں کی جدید تعبیرات ہوں گی —— یعنی ان اصولوں کی جدید تعبیرات جو ان لوگوں کے لئے جو روحانی کشادگی کی مسرتوں سے ناآشنا ہوں محض نظری حیثیت رکھتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ قول برطانوی مفکر ہابز کا ہے کہ اگر مسلسل اور متواتر ایک ہی قسم کے خیالات اور احساسات پیدا ہوں، تو سمجھ لیجئے کہ خیالات اور احساسات سرے سے پیدا ہی نہیں ہو رہے (یعنی اگر جدّتِ فکر و احساس نہ رہے تو انسانی قلب و دماغ مردہ ہو جاتے ہیں)۔

مسلم اقوام کی حالت

آج مسلم قوم کی اکثریت کی حالت ایسی ہو چکی ہے۔ وہ لکیر کے فقیر ہیں، جو محض ایک مشین کی طرح پرانی اقدار کی رٹ لگائے چلے جا رہے ہیں۔ اس کے برعکس، ترک اس راستہ پر گامزن ہو گئے ہیں جس میں نئی نئی قدروں کی تخلیق ہوگی۔ یہ قوم ایسے تلخ تجارب سے گزر رہی ہے کہ اب اس کی عمیق خودی اس پر منکشف ہو رہی ہے۔ اس کی ذات میں روحِ حیات مضطرب و بے قرار نظر آ رہی ہے۔ نئی امنگیں پیدا ہو رہی ہیں۔ وہ سب سے بڑا سوال جو اس وقت اس کے —— اور جو زود یا بدیر دیگر مسلم اقوام کے —— سامنے آنے والا ہے۔ یہ ہے کہ اسلامی قوانینِ شریعت میں ارتقاء کی گنجائش ہے یا نہیں؟ یہ سوال بڑا اہم ہے اور بہت بڑی ذہنی جدوجہد کا متقاضی۔ اس سوال کا جواب یقیناً اثبات (ہاں) میں ہونا چاہیئے۔ بشرطیکہ اسلامی دنیا اس کی طرف عمرؓ کی روح کو لے کر آگے

روحِ عمریؓ

بڑھے۔ وہ عمرؓ جو اسلام کا سب سے پہلا تنقیدی اور حریّت پسند قلب ہے۔ وہ جسے

‽ واضح رہے کہ اس جوشِ تجدد پسندی میں جہاں جہاں ترکوں کا دامن قرآن سے چھوٹا ہے، نہ علامہ اقبالؒ اس کی تائید کرتے ہیں نہ طلوعِ اسلام۔ جیسا کہ ہم مختلف مقامات پر کہہ چکے ہیں، یہ امر موجبِ بدقسمتی تھا کہ اس ذہنی انقلاب کے وقت ترکوں میں کوئی ایسا صاحبِ بصیرت نہ تھا جو قرآن کی روشنی میں ان کی راہ نمائی کر کے انہیں اعتدال کے راستے پر لے چلتا۔ چنانچہ علامہ اقبالؒ نے اپنی بعد کی تحریروں میں اس پر تنقید بھی کی ہے اور اظہارِ تأسف بھی۔

رسول اللہ کی حیاتِ طیبہ کے آخری لمحات میں یہ کہنے کی جرأت نصیب ہوئی کہ :-

" حَسْبُنَا كِتَابُ اللهِ "

ہمارے لئے خدا کی کتاب کافی ہے۔

آزاد خیالی کا خطرہ

ہم دنیائے اسلام میں اس قسم کی تحریک آزادی کا دل سے خیر مقدم کرتے ہیں۔ لیکن اس حقیقت کو کبھی فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ آزاد خیالی کا یہ رجحان، اسلام کی تاریخ میں بڑا نازک لمحہ ہے۔ آزادیٔ افکار، ملت میں تشتت وانتشار پیدا کرنے کا موجب بھی بن سکتی ہے۔ (اس کے ساتھ ہی، عالمِ اسلام میں نسلی امتیاز کا جو تخیل آجکل اس زور شور سے ابھر رہا ہے اس سے یہ خدشہ ہے کہ کہیں عالمگیر انسانیت کا وہ گراں مایہ تصور جسے مسلمانوں نے اپنے دین سے حاصل کیا تھا۔ ان کے افقِ ذہنی سے ناپید ہی نہ ہو جائے۔ نیز یہ خطرہ بھی ہے کہ اگر ان کی مناسب روک تھام نہ کی گئی تو ہمارے مذہبی اور سیاسی مصلحین وسیع الخیالی کے جوش میں اصلاح کی حدود سے تجاوز نہ کر جائیں [1] ہم آجکل اسی قسم کے دور سے گزر رہے ہیں۔ جس سے یورپ، پراٹسٹنٹ تحریک کے زمانے میں گزرا تھا۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ لوتھر کی تحریک کے آغاز و نتائج سے جو سبق ہمیں سیکھنا چاہیے وہ ہماری نگاہوں سے اوجھل نہ ہو جائے۔ تاریخ کے عمیق مطالعہ سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ پروٹسٹنٹ تحریک، دراصل ایک سیاسی تحریک تھی جس کا یورپ پر یہ اثر ہوا کہ رفتہ رفتہ عیسائیت کے عالمگیر اخلاق کی جگہ، قومی نظامِ اخلاق نے لے لی۔ اس رجحان کے اثرات ہم نے گزشتہ جنگ عظیم (پہلی عالمگیر جنگ) میں اپنی آنکھوں سے دیکھ لئے ہیں۔ اس جنگ نے بجائے اس کے کہ یہ دو متضاد نظام ہائے اخلاق میں ہم آہنگی پیدا کرتی، یورپ کے حالات کو اور بھی ناقابلِ برداشت بنا دیا۔ لہٰذا دنیائے اسلام کے رہنماؤں کا فریضہ ہے کہ یورپ میں جو کچھ ہوا ہے وہ اس کا گہری نظر سے مطالعہ کریں اور اسلام اپنے معاشرتی اور سیاسی نظام کی رُو سے جس نصب العین کی طرف لے جاتا ہے، اسے نگاہوں کے سامنے رکھتے ہوئے، اصلاحِ حالات کے لئے قدم اٹھائیں۔

میں نے اجتہاد کی تاریخ اور جس طریق سے وہ آجکل عالمِ اسلام میں عمل پیرا ہو رہا ہے، اس کا ایک اجمالی سا خاکہ آپ کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ اب میں یہ بتاؤں گا کہ اسلامی قوانینِ شریعت کی تاریخ اور ہیئت

---

[1] اصلاح کی صحیح حد دیہیں کہ قرآن کریم کی پابندیوں کے اندر رہتے ہوئے اصلاح کی جائے۔ نہ کہ SECULAR بن کر۔

ہمیں اس نتیجہ تک پہنچاتی ہے کہ اسلام کے اصولوں کی جدید تعبیر ممکن ہے یا اس نتیجہ پر کہ ان میں جدید تعبیرات

جدید تعبیرات کا امکان

کا امکان نہیں؟ بالفاظِ دیگر، سوال یہ ہے کہ آیا ہمارے قوانین شریعت میں ارتقا کی صلاحیت ہے یا نہیں؟ یہی سوال، لندن یونیورسٹی کے السنۂ سامیہ کے پروفیسر، ہارٹن نے، اسلامی فلسفہ اور الٰہیات کے ضمن میں اٹھایا ہے۔ چنانچہ یہ پروفیسر، مسلم متکلمین کی ان کوششوں پر تبصرہ کرتے ہوئے جو انہوں نے خالص مذہبی فکر کے سلسلہ میں کی ہیں، لکھتا ہے کہ تاریخ اسلام، آرین علم و ثقافت اور سامی مذہب کے متغائر قوتوں میں تدریجی تعامل، ہم آہنگی اور عمیق ربط پیدا کرنے سے عبارت ہے۔ مسلمان ہمیشہ اپنے مذہبی نقطۂ نگاہ کو ان ثقافتی عناصر سے تطبیق دیتے رہے ہیں جو ان کے گرد و پیش کی اقوام سے ان کی طرف آتے رہے۔ چنانچہ ۸۰۰ء سے لے کر ۱۱۰۰ء تک مسلمانوں میں کم از کم ایک سو فقہی مکاتب پیدا ہوئے۔ یہ اس امر کی زندہ شہادت ہے کہ اسلامی فکر میں کس قدر لچک ہے اور قدیم متکلمین نے اس باب میں کس قدر انتھک کوششیں کی ہیں۔ اس طرح اسلامی فکر اور مسلمانوں کے لٹریچر کے گہرے مطالعہ کے بعد، یہ مغربی مستشرق اس نتیجہ پر پہنچنے پر مجبور ہو گیا ہے کہ:۔

> "اسلام کی روح (سپرٹ) وسیع ہی نہیں بلکہ قریب قریب لامحدود ہے۔ اس نے دہریت کو چھوڑ کر، اپنے گرد و پیش کی اقوام کے باقی تمام تصورات کو نہ صرف اپنایا بلکہ انہیں اپنی مخصوص راہ نمائی میں شاہراہِ ترقی پر بھی ڈال دیا ہے۔"

اسلام کی یہ "خذ ما صفا" کی سپرٹ قانون کے دائرہ میں خاص طور پر نمایاں ہے۔ چنانچہ مشہور ولندیزی ناقدِ اسلام، پروفیسر ہرگرونج، اس باب میں لکھتا ہے کہ:۔

> "جب ہم اسلامی فقہ کی نشو و ارتقاء کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ دیکھ کر ہمیں حیرت ہوتی ہے کہ ایک طرف، ہر دور کے علماء چھوٹی چھوٹی جزئیات کے اختلاف سے مشتعل ہو کر ایک دوسرے پر کفر کے فتوے لگاتے ہیں اور دوسری طرف، وہی علماء اپنے متقدمین کے انہی اختلافات میں موافقت اور مطابقت پیدا کرنے کے لئے باہمدگر متحد و ہم مقصد ہو کر کوشاں رہتے ہیں۔"

روحِ اسلام کی عالمگیریت

عصرِ حاضر کے ان مغربی ناقدین کے ان خیالات کی رو سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ مسلمانوں کی نشاۃِ ثانیہ کے

وقت روحِ اسلام کی اندرونی عالمگیریت، علماء کی شدید قدامت پرستی کے علی الرغم، کارفرما ہو کر رہے گی اور مجھے اس کا بھی یقین ہے کہ اگر دورِ حاضر کے ناقدین، فقہِ اسلامی سے متعلق کثیر لٹریچر کا گہری نظر سے مطالعہ کریں تو انہیں اپنا یہ سطحی خیال بدلنا پڑے گا کہ اسلامی قانونِ شریعت جامد اور ناقابل ارتقاء ہے۔ بدقسمتی سے۔ ہمارے ہاں کا قدامت پرست طبقہ فقہ کے متعلق کسی ناقدانہ گفتگو کے لئے تیار نہیں۔ اگر اس قسم کی بحث چھیڑی جائے تو وہ بہت سے لوگوں کے لئے ناگواری کا باعث ہو جائے گی اور فرقہ وارانہ نزاعات چھڑ جائیں گے۔ بایں ہمہ، میں مسئلہ زیرِ نظر کے متعلق چند معروضات پیش کرنے کی جسارت ضرور کروں گا۔

(۱) سب سے پہلے ہمیں اس حقیقت کو پیشِ نظر رکھنا چاہئے کہ قرنِ اوّل سے لے کر عباسیوں کے زمانے کے آغاز تک، مسلمانوں میں، قرآن کے سوا کوئی تحریری قانون موجود نہ تھا۔

(۲) یہ ذہن نشین رہنا چاہئے کہ پہلی صدی ہجری کے وسط سے لے کر چوتھی صدی کے آغاز تک، مسلمانوں میں قریب انّیس مکاتبِ فقہ پیدا ہو چکے تھے۔ صرف اس ایک بات سے پتہ چل سکتا ہے کہ ایک بڑھتی ہوئی تہذیب کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیئے، ہمارے فقہائے کس قدر جدّوجہد سے کام لیا تھا۔ جوں جوں اسلامی فتوحات کا سلسلہ پھیلتا گیا اور مسلمانوں کا دائرۂ نظر وسیع ہوتا گیا۔ ہمارے ان قدیم فقہائے کے لئے ضروری ہو گیا کہ وہ ان اقوام کے احوال و ظروف اور عادات و اطوار کا مطالعہ کریں۔ جو حلقہ بگوشِ اسلام ہوئی تھیں اور اس طرح اپنے ماحول اور اس کے تقاضوں کا وسعتِ نظر سے جائزہ لیں۔ چنانچہ اگر اس زمانہ کی تمدّنی اور سیاسی تاریخ کی روشنی میں مختلف مذاہبِ فقہ کا دقّتِ نظر سے مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت ابھر کر سامنے آجاتی ہے کہ ہمارے فقہا تعبیرِ احکام کے سلسلہ میں رفتہ رفتہ استخراجی طریق (DEDUCTIVE) سے استقرائی طریق (INDUCTIVE) کی طرف آتے گئے۔

قانونِ شریعت کے مآخذ اربعہ

(۳) جب ہم شریعتِ اسلامی کے چار مسلّمہ مآخذ (قرآن حدیث۔ اجماع اور قیاس) اور ان سے پیدا شدہ نزاعات پر غور کرتے ہیں تو ہمارے مذاہبِ فقہ کے جامد ہونے کا مفروضہ بالکل بے اصل و بے بنیاد ثابت ہو جاتا ہے اور فقہ میں مزید ارتقاء اور نشوونما کا امکان واضح طور پر سامنے آجاتا ہے۔

آیئے۔ اب ان چار مآخذِ شریعت کے متعلق مختصر طور پر غور کریں۔

۱۔ قرآن

قرآن اسلام میں قانون کا اصلی سرچشمہ قرآن ہے۔ لیکن قرآن، کوئی تفصیلی ضابطۂ قانون نہیں۔ جیسا کہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں، اس کا بنیادی مقصد، انسان کے دل میں، خدا اور کائنات کے ساتھ اس کے تعلق کے بلند شعور کو بیدار کرنا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ قرآن میں بعض اصول و ضوابط قانونی نوعیت کے بھی موجود ہیں۔ بالخصوص انسان کی عائلی زندگی کے متعلق قواعد و ضوابط، جس پر اس کی معاشرتی زندگی کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ اگر یہ پوچھا جائے کہ جس وحی کے پیشِ نظر انسان کی بلند ترین زندگی ہے، اس میں یہ معاشرتی قواعد و ضوابط وحی کا جزو کیوں بنا دیئے گئے، تو اس سوال کا جواب عیسائیت کی تاریخ میں ملے گا۔ یہ تو آپ کو معلوم ہے کہ عیسائیت درحقیقت یہودیت کی آئین و رسوم کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی زندگی کے خلاف ردِ عمل تھی۔ اس کے لئے اس نے انسان کے سامنے دنیا چھوڑ عاقبت سنوارنے کا نصب العین رکھا۔ اور اس میں اسے کچھ کامیابی بھی ہوئی۔ لیکن اس نے اس طرح انفرادی زندگی کا جو تصور پیدا کر دیا اس سے اس نے سمجھ لیا کہ انسان کی معاشرتی اور اجتماعی زندگی کو روحانیت سے کوئی تعلق نہیں۔ چنانچہ (جرمن فلاسفر) نومن اپنی کتاب BRIEFF UBER RELIGION میں لکھتا ہے کہ:۔

> "ابتدائی مسیحیت نے مملکت، قانون، معاشرہ اور پیداوار کے تحفظ کے مسائل کو کوئی اہمیت نہ دی۔ اس نے معاشرتی مسائل کو درخورِ اعتنا ہی نہیں سمجھا۔"

ان تصریحات کے بعد وہ آخر میں لکھتا ہے:۔

> "اب ہمارے لئے دو ہی صورتیں رہ گئی ہیں۔ یا تو ہم اس کا فیصلہ کر لیں کہ ہم بغیر کسی مملکت کے زندگی بسر کریں گے اور اس طرح اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں فوضویت اور لاقانونیت کے گرداب میں ڈال دیں گے۔ اور یا ہم، اپنے مذہبی مسلک کے ساتھ ساتھ ایک سیاسی مسلک کو بھی مقصدِ حیات بنا لیں۔"

یہی وجہ ہے کہ قرآن نے ضروری سمجھا ہے کہ مذہب و مملکت اور اخلاقیات و سیاسیات کو ایک ہی وحی کی لڑی میں پرو دیا جائے۔ جس طرح افلاطون نے اپنی کتاب ری پبلک (جمہوریت) میں انہیں یکجا رکھنے کی کوشش کی تھی۔

لیکن اس سلسلہ میں خاص طور پر یاد رکھنے کے قابل، قرآن کا حرکیاتی نقطۂ نظر ہے۔ میں (اس سے پہلے) اس کے آغاز اور تاریخ کے متعلق تفصیلی طور پر کہہ چکا ہوں۔ اس سے ظاہر ہے کہ جو کتاب اس نقطۂ نگاہ کی حامل ہو، وہ ارتقاء کے تصور کے مخالف کبھی نہیں ہو سکتی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ہمیں یہ بھی نہیں بھولنا چاہیئے کہ زندگی صرف تغیر و تبدل ہی کا نام نہیں۔ اس کے اندر ایسے عناصر .... (ELEMENTS OF CONSERVATION) بھی ہیں جو اپنی حالت پر قائم رہنا چاہتے ہیں۔ انسان کی حالت یہ ہے کہ یہ اپنے تخلیقی کارناموں سے لذت اندوز ہوتا ہے اور اپنی توانائیوں کو زندگی کی نئی نئی شاہراہوں کے انکشاف پر مرکوز رکھتا ہے۔ لیکن ان تمام کامرانیوں کے باوجود، اسے اپنی ذات کے انکشاف کے وقت کچھ تردد اور گھبراہٹ ہوتی ہے۔ وہ اپنی ترقی اور پیش قدمی میں اپنے ماضی کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ اور اپنی ذات کی داخلی کشادے سے اسے کچھ ڈر سا محسوس ہوتا ہے[1]۔ وہ جب آگے بڑھتا ہے تو ایسی قوتیں جو اس سے مخالف سمت کی طرف جاتی دکھائی دیتی ہیں، اس کی روح کے سامنے روک بن کر حائل ہو جاتی ہیں۔ یا یوں کہئے کہ زندگی، اپنے ماضی کے پشتارے کو اپنی کمر پر لادے ہوئے آگے بڑھتی ہے اس لئے جب کبھی معاشرہ میں کسی تبدیلی کا سوال سامنے آئے تو قدامت پسندی کی قوتوں کی قیمت اور جس انداز سے وہ عمل پیرا ہوتی ہیں اس کی اہمیت کو کبھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے۔ لہٰذا ہمارے ہاں کے معقولیت پسند طبقہ کو چاہیئے کہ وہ جب معاشرہ کے مروجہ رسوم و مناسک (INSTITUTIONS) میں اصلاح و تغیر کا خیال کرے تو قرآن کے اس اہم اصول کو ہمیشہ اپنے سامنے رکھے۔ دنیا کی کوئی قوم اپنے ماضی کو یکسر مسترد نہیں کر سکتی۔ اس لئے کہ ان کی ذات کا تشخص ان کے ماضی کی بناء پر ہوتا ہے[2]۔

---

[1] اپنی ذات کے انکشاف و کشود کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنی انفرادیت (INDIVIDUALITY) سے باخبر ہو جاتا ہے اور اس طرح اس پر یہ حقیقت منکشف ہو جاتی ہے کہ وہ کسی بڑے کل (معاشرہ) کا جزو نہیں بلکہ اپنی ایک مستقل حیثیت رکھتا ہے جس کی نشو و نما معاشرہ کے اندر ہوتی ہے وہ اپنے اس احساسِ انفرادیت سے گھبراتا ہے حالانکہ وہ اسے بنظرِ غائر دیکھے تو یہ چیز اطمینان کا موجب ہونی چاہیئے نہ کہ گھبراہٹ کا سبب۔ وہ اپنی انفرادیت میں معاشرہ سے کٹ نہیں جاتا بلکہ اس کا اہم رفیق بن جاتا ہے۔ لہٰذا اس کی یہ گھبراہٹ اس کی کوتاہ نگہی کی دلیل ہے۔

[2] ماضی سے وابستگی اور شے ہے اور ماضی کی پرستش اور چیز۔ ماضی سے وابستگی کے معنی یہ ہیں کہ ہمارے پاس اسلاف کا جو سرمایہ منتقل ہو کر آئے ہم اس سے مستفید ہوں۔ لیکن ماضی پرستی کے معنی یہ ہیں کہ ہم اس سرمایہ پر کبھی تنقیدی نگاہ نہ ڈالیں۔

پس اسلام جیسے معاشرہ میں، مروجہ شعائر و مناسک (INSTITUTIONS) میں تبدیلی کا سوال بہت نازک اور دشوار بن جاتا ہے جس سے ایک مصلح کی ذمہ داری بہت بڑھ جاتی ہے [۱]۔ اپنی فطرت کے لحاظ سے اسلام، کسی خاص خطۂ زمین سے پابستہ نہیں۔ اس کا نصب العین یہ ہے کہ وہ مختلف نسلوں کے افراد کو (ایمان کے ذریعے) ایک مرکز پر اکٹھا کرے اور پھر ان ذرات کو ایک ایسی مملکت میں متشکل کر دے جسے شعورِ ذات کی نعمت حاصل ہو۔ اس طرح یہ ملت، تمام دنیا کے لئے ایک نمونہ بنے گی یہ بتانے کے لئے کہ تمام نوعِ انسانی کس طرح ایک اُمتِ واحدہ بن سکتی ہے۔ یہ کام کچھ ایسا آسان اور سہل الحصول نہ تھا۔ لیکن اس کے باوجود اسلام اپنے عدیم النظیر شعائر و ارکان کے ذریعے، تضاد و تخالف کے اس ہجوم (نوعِ انسانی) میں ایک اجتماعی عزم اور مجموعی ضمیر پیدا کرنے میں بڑی حد تک کامیاب ہوا ہے۔ اس قسم کے معاشرہ کے ارتقاء میں (اور تو اور خور و نوش اور پاک پلید جیسے عام معاملاتِ زندگی کے متعلق قوانین و ضوابط کا غیر متبدل ہونا بھی ۔ ۔ ۔ ۔) ایک خاص معنی اور قدر و قیمت رکھتا ہے۔ اس لئے کہ اجب مختلف طبائع اور متضاد اطوار کے افراد ان احکام کی پابندی سے اپنے اندر یکسانیت پیدا کر لیتے ہیں تو) اس سے معاشرہ میں ایک خاص اندرونی یگانگت پیدا ہو جاتی ہے۔ نیز اس سے وہ داخلی اور خارجی وحدت اور ہم آہنگی قائم رہتی ہے جو ان قوتوں کا مقابلہ کرتی ہے جو اس قسم کے مختلف الاوضاع معاشرہ میں تشتت و انتشار پیدا کرنے کے لئے اندر ہی اندر سرگرمِ عمل رہتی ہیں۔ لہٰذا ان شعائر و مناسک پر تنقیدی نگاہ [۲] ڈالنے والے کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس معاشرتی تجربہ کی اہمیت کا صحیح صحیح اندازہ کر لے جس کی تشکیل اسلام کرتا ہے۔ وہ ان شعائر و مناسک پر غور و فکر کرتے ہوئے یہ نہ دیکھے کہ ان سے فلاں ملک کو کیا کیا معاشرتی فوائد حاصل ہوں گے یا نقصانات پہنچیں گے، وہ ان کا جائزہ اس عظیم مقصد کی روشنی میں لے جو پوری کی پوری انسانیت میں رُوبکار ہوتا جا رہا ہے۔

قانون سازی کے لئے قرآنی اصول

آیئے اب ایک نظر ان اصولوں پر ڈالیں جو قرآن نے قانون سازی کے سلسلہ میں دیئے ہیں۔ ان پر غور کرنے

[۱] کسی فرد کو ان تبدیلیوں کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ یہ تبدیلیاں عند الضرورت صرف اسلامی نظام ہی کر سکتا ہے۔

[۲] جن شعائر و مناسک کا تعین خود قرآن نے کر دیا ہے ان پر تنقیدی نگاہ ڈالنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس تنقید سے مراد ان رسوم و مناسک پر تنقید ہے جو خارج از قرآن ہیں۔

سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ ان اصولوں کی رُو سے یہ قطعاً نہیں ہوتا کہ انسانی فکر سلب ہو جائے اور قانون سازی کے لئے کوئی میدان ہی نہ رہے۔ اس کے برعکس، ان اصولوں میں جس قدر وسعت رکھی گئی ہے اس سے انسانی فکر بیدار ہوتی ہے۔ یہی وہ اصول تھے جن کی راہ نمائی سے ہمارے قدیم فقہا نے، قانونِ شرعی کے متعدد نظام (سسٹم) مرتب کئے۔ اور تاریخ اسلام کا طالب علم اس حقیقت سے واقف ہے کہ سیاسی اور معاشرتی نظامِ زندگی کی حیثیت سے اسلام کو جو اس قدر کامیابی حاصل ہوئی تو اس کا کم از کم آدھا حصہ انہی فقہا کی بالغ نظری کا رہینِ منت تھا۔ چنانچہ فان کریمر اس ضمن میں لکھتا ہے کہ:-

"رومیوں کو چھوڑ کر دنیا میں سوائے عربوں کے اور کوئی قوم ایسی نہیں جس کے پاس اس قدر احتیاط سے مرتب کردہ قانونی نظام ہو۔"

لیکن اس تمام ہمہ گیری کے باوجود، یہ قانونی ضوابط بالآخر انفرادی تعبیرات کا مجموعہ ہیں۔ اس لئے انہیں حتمی اور قطعی سمجھ لینا غلط ہے۔ مجھے اس کا علم ہے کہ علمائے اسلام کا یہ عقیدہ ہے کہ ہمارے مشہور مذاہب (اربعہ) اپنی اپنی جگہ مکمل اور مختتم ہیں۔ لیکن نظری طور پر اجتہادِ مطلق کے امکان سے انہیں بھی کبھی انکار نہیں ہوا۔ میں نے پچھلے صفحات میں، ان اسباب و علل سے بحث کی ہے جو علماء کی اس ذہنیت کا موجب بنے۔ لیکن چونکہ اب حالات بدل چکے ہیں اور دنیائے اسلام ان تمام نئی نئی قوتوں سے دوچار اور متأثر ہے جو زندگی کے مختلف شعبوں میں فکرِ انسانی کی نشو و ارتقاء سے وجود میں آگئی ہیں، اس لئے مجھے کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ اس قدامت پرستانہ ذہنیت کو باقی رکھا جائے۔ میں پوچھتا ہوں کہ کیا ان مذاہب فقہ کے بانیوں میں سے کسی نے بھی اپنی تعبیرات و تاویلات کو کبھی قطعی کامل۔ مختتم اور سہو و خطا سے مبرّا سمجھا؟ کبھی نہیں۔ اس لئے اگر دورِ حاضر کے اعتدال پسند مسلمان، زمانے کے بدلے ہوئے حالات اور اپنے تجربہ کی روشنی میں، فقہ کے اصولِ اساسی کی نئی تعبیرات کرنا چاہتے ہیں تو ان کا یہ طرزِ عمل میرے خیال میں بالکل بجا اور درست ہے خود قرآن کی یہ تعلیم کہ حیات ایک ترقی پذیر عمل ارتقاء ہے، اس کی مقتضی ہے کہ ہر نئی نسل کو اس کا حق حاصل ہونا چاہیئے کہ وہ اپنی مشکلات کا حل خود تلاش کرے۔ وہ ایسا کرنے میں سلف کے علمی سرمایہ سے راہنمائی لے سکتے ہیں لیکن اسلاف کے فیصلے ان کے راستے میں روک نہیں بن سکتے۔

(اس کے بعد علامہ اقبالؒ نے ترکی کے انقلاب پسند شاعر ضیاء کے ان سوالات کو لیا ہے کہ

طلاق و وراثت وغیرہ کے معاملات میں مردوں اور عورتوں کو مساوات حاصل ہونا چاہیئے اور ان پر مدلل بحث کی ہے۔ اس کے بعد وہ قانونِ شریعت کے دوسرے سرچشمہ۔ یعنی حدیث کی طرف آتے ہیں۔

۲۔ حدیث

اسلامی قانونِ شریعت کا دوسرا سرچشمہ حدیث نبوی ہے۔ احادیث، سابقہ زمانے میں بھی اور دورِ حاضر میں بھی کافی بحث و نزاع کا موضوع رہی ہیں۔ زمانہ حال کے نقادوں میں، گولڈ زیہر نے، جدید اصولِ تنقید کی روشنی میں ان کی کافی جانچ پڑتال کی ہے جس سے وہ اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ یہ ذخیرہ بہ ہیئت مجموعی قابلِ اعتماد نہیں۔ ایک، دوسرا مغربی مصنف ان اصولوں کا جائزہ لینے کے بعد جن کے مطابق مسلمان ائمہ جرح وتعدیل نے احادیث کو پرکھا ہے کہتا ہے کہ نظریاتی طور پر ان میں غلطی کا امکان ہے۔ لیکن اس کے بعد لکھتا ہے کہ :-

> "آخر میں میں کہوں گا کہ جن خیالات کا اظہار اُوپر کیا گیا ہے۔ ان سے صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان اصولوں میں غلطی کا امکان نظری طور پر موجود ہے۔ لیکن اس سوال کا جواب کہ حدیث کو اس طرح پرکھنے میں فی الواقعہ کس حد تک غلطیاں سرزد ہوئیں، اس بات پر منحصر ہے کہ جن حالات میں احادیث کی جانچ پڑتال ہوئی وہ کہاں تک اس کی ترغیب دلاتے تھے کہ غلطی کے امکان سے فائدہ اٹھا لیا جائے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس قسم کے حالات بہت کم تھے اور سنن کے ذخیرہ کا بہت کم حصہ ان سے متاثر ہوا ہے۔ لہٰذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ جن احادیث کے مجموعوں کو مسلمان قانونی حیثیت دیتے ہیں، ان کا بڑا حصہ، اسلام کے آغاز اور ارتقاء کا صحیح ریکارڈ ہے۔"

احادیث کی قانونی حیثیت

لیکن مقصدِ زیرِ نظر کے لئے ضروری ہے کہ ہم ان احادیث کو جن کی حیثیت قانونی ہے، ان احادیث سے جن کی قانونی حیثیت نہیں، الگ کر لیں۔ احادیث کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جن کی حیثیت قانونی ہے اور دوسری وہ جو قانونی حیثیت نہیں رکھتیں۔ اوّل الذکر کے

بارے میں ایک بڑا اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کس حد تک ان رسوم و رواج پر مشتمل ہیں جو اسلام سے پہلے عرب میں رائج تھے اور جن میں سے بعض کو رسول اللہؐ نے علیٰ حالہٖ رکھا۔ اور بعض میں ترمیم فرما دی۔ آج یہ مشکل ہے کہ ان چیزوں کو پورے طور پر معلوم کیا جا سکے کیونکہ ہمارے متقدمین نے اپنی تصانیف میں زمانۂ قبل از اسلام کے رسوم و رواج کا زیادہ ذکر نہیں کیا۔ نہ ہی یہ معلوم کرنا ممکن ہے کہ جن رسوم و رواج کو رسول اللہؐ نے علیٰ حالہٖ رکھا (خواہ ان کے لئے واضح طور پر حکم دیا ہو یا ویسے ہی ان کا استصواب فرما دیا ہو) انہیں ہمیشہ کے لئے نافذ العمل رکھنا مقصود تھا۔ اس موضوع پر حضرت شاہ ولی اللہؒ نے بڑی عمدہ بحث کی ہے۔ جس کا خلاصہ میں یہاں بیان کرتا ہوں۔ شاہ صاحبؒ نے کہا ہے کہ پیغمبرانہ طریقِ تعلیم یہ ہوتا ہے کہ رسول کے احکام ان لوگوں کے عادات و اطوار اور رسوم و رواج کو خاص طور پر ملحوظ رکھتے ہیں جو اس کے اولین مخاطب ہوتے ہیں پیغمبرؐ کی تعلیم کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ وہ عالمگیر اصول عطا کر دے۔ لیکن نہ تو مختلف قوموں کے لئے مختلف اصول دیئے جا سکتے ہیں اور نہ ہی انہیں بغیر کسی اصول کے چھوڑا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے مسلکِ زندگی کے لئے جس قسم کے اصول چاہیں وضع کر لیں۔ لہٰذا پیغمبرؐ کا طریق یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک خاص قوم کو تیار کرتا ہے اور انہیں ایک عالمگیر شریعت کے لئے بطور خمیر استعمال کرتا ہے۔ اس مقصد کے لئے وہ ان اصولوں پر زور دیتا ہے جو تمام نوعِ انسانی کی معاشرتی زندگی کو اپنے سامنے رکھتے ہیں۔ لیکن ان اصولوں کا نفاذ اس قوم کے عادات و خصائص کی روشنی میں کرتا ہے جو اس وقت اس کے سامنے ہوتی ہے۔ اس طریق کار کی رو سے رسولؐ کے احکام اس قوم کے لئے خاص ہوتے ہیں اور چونکہ ان احکام کی ادائیگی بجائے خویش مقصود بالذات نہیں ہوتی۔ انہیں آنے والی نسلوں پر من و عن نافذ نہیں کیا جا سکتا۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ امام اعظم ابو حنیفہؒ نے (جو اسلام کی عالمگیریت کی خاص بصیرت رکھتے تھے) اپنے فقہ کی تدوین میں حدیثوں سے کام نہیں لیا۔ انہوں نے تدوینِ فقہ میں استحسان کا اصول وضع کیا، جس کا مفہوم یہ ہے کہ قانون وضع کرتے ہوئے اپنے زمانے کے تقاضوں کو سامنے رکھنا چاہئے۔ اس سے احادیث کے متعلق ان کے نقطۂ نظر کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ امام ابو حنیفہؒ نے تدوینِ فقہ میں احادیث سے اس لئے کام نہیں لیا کہ ان کے زمانے میں احادیث کے کوئی باضابطہ مجموعے مرتب نہیں ہوئے تھے۔ اوّل تو یہ کہنا ہی درست نہیں کہ ان کے زمانے میں احادیث کے مجموعے موجود نہیں تھے۔ امام مالکؒ اور زہریؒ کے مجموعے ان کی وفات سے قریب تیس سال پہلے مرتب ہو چکے تھے۔ لیکن اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ یہ مجموعے امام صاحبؒ تک نہیں پہنچ پائے تھے یا ان میں قانونی حیثیت کی احادیث موجود نہیں تھیں تو اگر امام صاحبؒ

اس کی ضرورت سمجھتے تو وہ احادیث کا اپنا مجموعہ مرتب فرما سکتے تھے، جیسا کہ امام مالکؒ اور ان کے بعد امام احمد بن حنبلؒ نے کیا تھا۔ ان حالات کی روشنی میں، میں بھی یہ سمجھتا ہوں کہ ان احادیث کے متعلق جن کی حیثیت قانونی ہے، امام ابو حنیفہؒ کا یہ طرزِ عمل بالکل معقول اور مناسب تھا اور اگر آج کوئی وسیع النظر مقنن یہ کہتا ہے کہ احادیث ہمارے لئے من وعن شریعت کے احکام نہیں بن سکتیں تو ان کا یہ طرزِ عمل امام ابو حنیفہؒ کے طرزِ عمل کے ہم آہنگ ہوگا، جن کا شمار فقہ اسلامی کے بلند ترین مقننین میں ہوتا ہے۔

لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ محدثین نے قانون کے متعلق مجرد فکر و قیاس کے مقابلہ میں ٹھوس واقعات (CONCRETE CASES) کو زیادہ اہمیت دینے سے شرعی قانون کی بڑی خدمت سرانجام دی ہے۔ علاوہ بریں، اگر احادیث کے لٹریچر کے غائر مطالعہ سے اس روح (سپرٹ) کے سمجھنے کا کام لیا جائے۔ جن کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی وحی کی تعبیر فرمائی تھی تو اس سے یہ بھی سمجھ میں آ جائیگا کہ قرآن نے قانون سازی کے لئے جو اصول دیئے ہیں، زندگی کے عملی میدان میں ان کی صحیح قدر و قیمت کیا ہے۔ اگر ان اصولوں کی حیاتی قدر (LIFE - VALUE) کو صحیح طور پر سمجھ لیا جائے تو اس سے، شرعی قانون سازی کے بنیادی اصولوں کی تعبیر نو میں بڑی مدد ملے گی۔ یہی ایک چیز ہے جو اس باب میں ممد و معاون ثابت ہو سکتی ہے۔

۳۔ اجماع

قانونِ شریعت کا تیسرا سرچشمہ اجماع [ا] ہے جو میرے نزدیک اسلام میں سب سے اہم قانونی تصور ہے۔ لیکن یہ بات کس قدر حیرت انگیز ہے کہ ابتدائے اسلام میں اس اہم قانونی تصور کے متعلق نظری بحثیں تو اس قدر رہی ہیں۔ لیکن یہ صرف خیال ہی خیال رہا اور مسلمانوں کی کسی مملکت میں بھی ایک مستقل عملی شکل اختیار نہ کر سکا۔ اغلباً اس کی وجہ یہ تھی کہ خلیفہ چہارم کے بعد مسلمانوں میں جو ملوکیت آگئی تو اس نے سمجھ لیا کہ اجماع کو ایک قانونی حیثیت دینے سے اس کے سیاسی مفاد پر زد پڑے گی۔ میرا خیال

[ا] علامہ اقبالؒ نے اس پوری بحث میں اجماع سے مراد اسلام کا مشاورتی نظام لیا ہے نہ کہ فقہا کا مصطلحہ "اجماع" اس حقیقت کو سامنے رکھ کر اس بحث کو دیکھنا چاہیئے۔

ہے کہ بنی اُمیہ اور عباسی خلفاء نے اپنا مفاد اسی میں سمجھا کہ بجائے اس کے کہ افرادِ ملت کے نمائندگان) کی ایک مستقل مجلسِ مشاورت (اسمبلی) متشکل کی جائے، جس سے وہ اتنا اقتدار حاصل کر لے کہ اُن (سلاطین کے لئے) دردِ سر بن جائے، مجتہدین کو انفرادی اجتہاد کا حق دے دیا جائے۔ لیکن اب یہ دیکھ کر بڑی ڈھارس بندھتی ہے کہ زمانہ کے جدید تقاضوں اور اقوامِ مغرب کے سیاسی تجربے سے دورِ حاضر کے مسلمانوں کو اجماع کی قدر و قیمت اور امکان کا احساس پیدا ہوتا جا رہا ہے۔ مسلمان ممالک میں روحِ جمہوریت کی بیداری اور رفتہ رفتہ مجالسِ قانون ساز کی تشکیل ایک نیک فال اور ترقی کی جانب صحیح اقدام ہے۔ دورِ حاضر میں جبکہ اُمت میں متعدد جماعتیں اور پارٹیاں پیدا ہو چکی ہیں، اجماع کی ممکن شکل یہی ہے کہ مذاہبِ فقہ کے انفرادی نمائندگان سے حقِ اجتہاد چھین کر، اُسے مسلمانوں کی مجلسِ قانون ساز کو تفویض کر دیا جائے۔ اس سے، دیگر مفاد کے علاوہ، ایک فائدہ یہ بھی ہوگا کہ (قانونی مباحث میں وہ غیر فنی اربابِ بصیرت

اجماع کی صحیح شکل

بھی حصہ لے سکیں گے جنہیں فنی نکات آفرینیوں کے مقابلہ میں) معاملات کی (عملی) سمجھ بوجھ کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ یہی ایک طریقہ ہے جس سے ہم اپنے نظامِ قانون کو جمود و تعطل کے پنجہ سے نجات دلا کر اس میں خونِ زندگی دوڑا سکتے اور اسے پھر سے ایک ارتقائی اندازِ نظر عطا کر سکتے ہیں۔ لیکن اس طریقِ کار کے اختیار کرنے میں، ہندوستان میں دشواریاں پیدا ہونگی۔ اس لئے کہ یہ امر مشتبہ ہے کہ ایک غیر مسلم اسمبلی کو اجتہاد کا اختیار دیا جا سکتا ہے[1]

قرآن اور اجماع

اجماع کے ضمن میں ایک دو سوال اور بھی پیدا ہوتے ہیں جن کا جواب دیا جانا ضروری ہے۔ مثلاً یہ کہ کیا اجماعِ اُمت (جمہور کا فیصلہ) قرآنی احکام کو منسوخ کر سکتا ہے؟ مسلمانوں کے مجمع میں اس سوال کا اُٹھانا یکسر غیر ضروری ہے۔ کیونکہ ان میں سے ہر ایک اس حقیقت سے باخبر ہے کہ قرآنی احکام کو کوئی بھی منسوخ نہیں کر سکتا۔ لیکن مجھے اس سوال کو اس لئے سامنے لانا پڑا ہے کہ (MOHAMMEDAN THEORIES OF FINANCE) کے مغربی مصنف نے اپنی اس کتاب میں بڑی گمراہ کن بات لکھ دی ہے۔ اس نے بغیر کسی حوالہ اور سند کے لکھ دیا ہے کہ بعض حنفی اور معتزلہ مصنفین کے نزدیک اجماع، قرآن کو منسوخ کر سکتا ہے۔ سارے اسلامی

ص۱۔ تشکیلِ پاکستان کے بعد یہ دشواری تو خود دور ہو گئی تھی۔

لٹریچر میں اس بات کے جواز و تائید میں کوئی چیز نہیں ملتی۔ (اجماعِ اُمّت تو ایک طرف) قرآن کو تو رسول اللہؐ کی کوئی حدیث بھی منسوخ نہیں کر سکتی۔ میرا خیال ہے کہ اس مغربی مصنّف کو جس بات نے مغالطہ میں ڈالا ہے وہ یہ ہے کہ ہمارے متقدّمین نے اپنی تحریروں میں نسخ کا لفظ استعمال کیا ہے۔ لیکن جیسا کہ امام ساطبی نے الموافقات (جلد سوم۔ صہ٦٥) میں لکھا ہے، صحابہؓ کے اجماع کے سلسلہ میں جب نسخ کا لفظ آئے تو اس سے مطلب صرف یہ ہوتا ہے کہ انہوں نے قرآن کے فلاں حکم کو فلاں حد تک نافذ کیا یا اسے فلاں دائرہ تک محدود رکھا (یعنی احکامِ قرآنی کی تقیید و تعمیم)[۱]۔ اس سے ہرگز یہ مفہوم نہیں ہوتا کہ انہوں نے قرآن کے کسی حکم کو منسوخ کر دیا یا اس کی جگہ کوئی دوسرا حکم نافذ کر دیا۔ اس تحدید و توسیع کے سلسلہ میں بھی بقول آمدی نظریۂ قانون یہ ہے کہ صحابہؓ کے پاس اس کے لئے کوئی نہ کوئی حکمِ شریعت ضرور ہوگا[۲]۔ (آمدی شافعیؒ امامِ فقہ ہیں جن کی وفات ساتویں صدی کے وسط میں ہوئی تھی اور حال ہی میں مصر سے ان کی کتابیں شائع ہوئی ہیں)۔

صحابہؓ کے فیصلوں کی حیثیّت

لیکن فرض کیجئے کہ کسی معاملہ میں صحابہؓ نے بالاتّفاق ایک فیصلہ کیا تو اس سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا آنے والی نسلیں بھی اس فیصلہ کی پابند رہیں گی؟ امام شوکانی نے اس مسئلہ پر سیر حاصل بحث کی ہے اور مختلف مذاہبِ فقہ کے آئمّہ کی آراء بھی نقل کی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اس باب میں ضروری ہے کہ ان امور میں جن کا تعلّق واقعات (FACTS) سے ہے اور اُن میں جن کا تعلّق قانون سے ہے۔ فرق ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ جن امُور کا تعلّق (عہدِ رسالتؐ یا زمانۂ صحابہؓ کے) واقعات و حوادث سے ہے، اُن میں صحابہؓ کا فیصلہ قولِ فیصل ہوگا۔ اس لئے کہ اس زمانے کے واقعات کا علم صحابہؓ سے زیادہ اور کسی کو نہیں ہو سکتا تھا۔ مثال کے طور پر اس واقعہ کو لیجئے جس میں یہ سوال اٹھا کہ کیا قرآن کی وہ صورتیں جنہیں معوذتین کہا جاتا ہے، قرآن کا حصہ ہیں یا نہیں اور صحابہؓ نے متفقہ

---

[۱] مثلاً حضرت عمرؓ نے جنگ کے دوران حد نافذ کرنے کو ملتوی کر دیا تھا۔ یا قحط کے زمانے میں ان لوگوں کو چوری کی سزا نہیں دی تھی جنہوں نے بھوک کی وجہ سے غلّہ کی چوری کی تھی۔

[۲] یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی کہ صحابہؓ کے پاس "حکمِ شرعی" ہونے سے کیا مراد ہے۔ انہوں نے قرآن کی تعلیم سے ایسا استنباط کیا ہوگا۔ اور ایسا استنباط ہو سکتا ہے۔ ان کا ایسا فیصلہ (جو قرآن کے اصولوں کے اندر ہو) خود حکمِ شرعی کی حیثیت رکھتا تھا۔

طور پر فیصلہ کیا کہ یہ قرآن کا جزو ہیں۔ لیکن جہاں تک ان امور کا تعلّق ہے جن کی حیثیت قانونی ہے، ان کی بابت میری ناچیز رائے یہ ہے کہ بعد میں آنے والی نسلیں صحابہؓ کے فیصلوں کی پابند نہیں ہیں۔ اس لئے کہ اس میں سوال (قرآن کے کسی اصولی حکم کی) تعبیر کا ہے۔ چنانچہ امام کرخی اس خیال کی تائید کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "سنتِ صحابہؓ صرف ان معاملات میں واجب الاتباع ہے جن کا فیصلہ قیاس سے نہیں کیا جاسکتا۔ جن معاملات کا فیصلہ (اجتہاد) قیاس سے کیا جاسکتا ہے ان میں اُن کی سُنّت کی تقلید لازم نہیں۔"

اس ضمن میں ایک اور سوال پوچھا جاسکتا ہے۔ اور وہ یہ کہ بحالاتِ موجودہ مسلمانوں کی جو مجالسِ قانون ساز بنائی جائیں گی ان میں لامحالہ ایسے لوگ آجائیں گے جو قانونِ شریعت کی باریکیوں سے واقف نہیں ہوں گے۔

ہماری مجالسِ قانون ساز

ظاہر ہے کہ اس قسم کی مجالس سے قانونِ شریعت کی تعبیرات میں غلطیاں سرزد ہوں گی۔ سوال یہ ہے کہ اس قسم کی غلطیوں کے سدِّ باب، یا ان کے مواقع کو کم کرنے کے لئے کیا تدابیر اختیار کی جائیں؟ (اس سلسلہ میں) ایران نے اپنے ۱۹۰۶ء کے دستورِ مملکت کی رُو سے، ایسے علماء کی "جو امورِ دنیا سے باخبر ہوں" ایک کمیٹی مقرّر کی تھی تاکہ وہ مجلسِ قانون ساز کے کام کی نگرانی کرے۔ یہ تدبیر بڑی خطرناک تھی۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اسے ایران کے نظریۂ دستور کے حالات خصوصی کے پیشِ نظر اختیار کیا گیا تھا۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے۔ ان کا نظریۂ دستور یہ ہے کہ مملکت درحقیقت امامِ غائب کی مِلک ہے اور بادشاہ صرف اس کا محافظ ہے۔ علمائے مذہب، بہ حیثیت نمائندگانِ امامِ غائب اپنا حق سمجھتے ہیں کہ وہ ملّت کی زندگی کے ہر گوشے کے محاسب و نگراں ہوں۔ اگرچہ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ جب امامِ غائب کی جانشینی کو تسلیم نہیں کیا جاتا تو ان علماء کے حقِّ نیابت کو کیسے تسلیم کیا جاسکتا ہے؟ بہرحال ایران کا نظریۂ دستور کچھ ہی ہو، یہ تدبیر خطرات سے خالی نہیں ہے۔ اگر کوئی سُنّی مملکت اس تدبیر کو آزمائشی طور پر اختیار کرنا چاہے۔ تو وہ اسے عارضی طور پر آزما کر دیکھ لے۔ وہ بھی اس طرح کہ علماء کو

ؔ ہمارے نومسلم مصنّف اسد لیوپولڈ نے اپنے مسودۂ دستورِ پاکستان میں اس قسم کی مجلسِ علماء کی تجویز پیش کی تھی۔ جس کی طلوعِ اسلام نے مخالفت کی تھی۔ نیز پہلی مجلسِ دستور ساز کی کمیٹی نے بھی کچھ اس قسم کی تجویز کی تھی جو منظور نہیں کی گئی تھی بعد کے دساتیرِ پاکستان میں اس قسم کی کوئی شق نہیں رکھی گئی۔

مجلس قانون ساز کا رکن بنا دیا جائے تاکہ وہ قوانینِ شریعت پر آزادانہ بحث و تمحیص[1] ہیں دوسروں کی معاونت اور راہنمائی کریں۔ احکامِ شریعت میں غلطیوں کے سدِ باب کا موثر طریق ایک ہی ہے۔ اور وہ یہ کہ مسلمان ممالک میں قانونی تعلیم کے موجودہ طریق میں ایسی اصلاح کی جائے جس سے اس کا دائرہ وسیع ہو جائے اور جدید اصولِ قانون سازی کو طلباء کے درس کا لازمی جزو قرار دیا جائے۔

۴۔ قیاس

فقہ کا چوتھا بنیادی مأخذ قیاس ہے۔ یعنی کسی ایک حکم یا فیصلہ کو، عقل و بصیرت کی رُو سے، اس سے ملتے جلتے حالات پر منطبق کرنا۔ (عہدِ رسالت مآبؐ کے بعد) جو ممالک اسلامی فتوحات کے دائرے میں آئے۔ ان میں معاشرتی اور تمدنی حالات، عربوں سے، بالکل مختلف تھے۔ ان معاملات کی نزاعات کے تصفیہ کے لئے، اُن نظائر سے کچھ مدد نہیں مل سکتی تھی جو احادیث کے مجموعوں میں مندرج تھے۔ اس دشواری کے پیشِ نظر، مذہبِ حنفی کے لئے اس کے سوا چارہ کار نہ تھا کہ وہ قانونی تعبیرات میں قیاس اور رائے سے کام لیں۔

ارسطوی منطق

عراق میں جو نئے حالات سامنے آئے ان کے پیشِ نظر انہوں نے یہ خیال کیا کہ اگر قانون سازی میں ارسطوی منطق سے کام لیا جائے تو کامیابی ہو سکتی ہے۔ لیکن قانونِ شریعت کی تدوین کے ابتدائی مراحل میں یہ طریق کار بہت نقصان رساں تھا۔ ارسطوی منطق کے معنی یہ ہیں کہ عام اصولوں سے، ایسے قواعد و ضوابط مستنبط کئے جائیں جن میں کہیں لوچ اور لچک نہ ہو۔ بظاہر ہے کہ طرق و اعمالِ حیات کچھ ایسے پیچیدہ واقع ہوئے ہیں کہ اسے اس قسم کے تحت قواعد و ضوابط کے شکنجے میں کسا نہیں جا سکتا۔ لیکن اگر زندگی کو ارسطو کی منطق کی عینک سے دیکھا جائے تو وہ ایک مشین محض دکھائی دیتی ہے جس میں کوئی داخلی اصولِ حرکت کارفرما نہیں۔ مذہبِ حنفیہ کے آئمہ نے حیات کی تخلیقی آزادی اور خود ارادی کو نظرانداز کر دیا۔ اس سے انہیں اُمید بندھتی تھی کہ خالص منطق کی بنیادوں پر ایک مکمل ضابطۂ قوانین کی تشکیل کی جا سکے گی۔ یہ طریق کار فقہائے حجاز کے فطری میلان کے خلاف تھا (عربی فطرت اس قسم کی جادو یا ایسی جکڑ بندیوں کو قبول ہی نہیں کر سکتی تھی)۔ چنانچہ انہوں نے فقہائے عراق کی اس قسم کی قانونی موشگافیوں کے۔ اور ان کے اس رجحان کے خلاف کہ محض قیاسی اور فرضی مقدمات کو سامنے

---

[1] وہ آزادانہ بحث و تمحیص کی اجازت کب دیں گے؟

رکھ کر، قانون بناتے چلے جائیں، صدائے احتجاج بلند کی۔ وہ سمجھتے تھے اور بجا طور سمجھتے تھے کہ اس طرح اسلام کا قانون ایک بے جان مشین ہو کر رہ جائے گا۔ ان آئمۂ فقہ کی اس قسم کی باہمی نزاعات سے یہ بحثیں چھڑ گئیں کہ قیاس کے حدود کیا ہیں۔ کن حالات میں قیاس جائز ہے۔ غلط قیاس کی تصحیح کس طرح کی جا سکتی ہے وغیرہ وغیرہ۔ ان بحثوں کی ضرورت اس لئے بھی لاحق ہو گئی کہ شروع میں قیاس کے متعلق صرف اتنا ہی سمجھا جاتا تھا کہ یہ ایک مجتہد کی ذاتی رائے کا نام ہے۔ لیکن آخر الامر یہی چیز قانونِ اسلام میں سرچشمۂ حیات و عمل بن گئی۔ آریائی ذہنیت و رجحانِ طبع یہ ہے کہ انسان تصورات کی خیالی دنیا میں مگن رہے اور واقعات و ممکنات کی دنیا سے کم دلچسپی لے۔ یہ ذہنیت زندگی کے عملی مسائل کے مقابلہ میں نظری مسائل کے متعلق بحث و تمحیص سے زیادہ لذت اندوز ہوتی ہے۔ اس کے برعکس، سامی رجحانِ طبع دنیا کے واقعات سے زیادہ دلچسپی لیتا ہے اور تصورات کی بجائے ٹھوس حقائق پر قابو پانا چاہتا ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو امام ابو حنیفہؒ کے اس مسلک پر کہ قیاس، قانون کا مآخذ ہے۔ امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کی کڑی تنقید، آریائی ذہنیت پر سامی احتسابؒ[1] ہے۔ بالفاظِ دیگر، یہ ایک نزاع تھی قانون کی تحقیق میں، استقرائی اور استخراجی اسلوب کے حامیوں کے درمیان شروع میں، فقہائے عراق، تصور کی ابدیت پر زیادہ زور دیتے رہے۔ ان کے برعکس حجاز کے فقہار نے اس کے زمانی 'TEMPORAL' پہلو پر زور دیا لیکن انہوں نے اپنی پوزیشن کی اہمیت کا کماحقہٗ احساس نہ کیا۔ وہ چونکہ حجاز کے رہنے والے تھے اس لئے طبعی طور پر وہ حجاز کے قانونی روایات کے طرفدار ہو گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے اپنے آپ کو صرف ان نظائر کے دائرہ میں محدود کر لیا جو عہدِ رسالت مآبؐ اور عہدِ صحابہؓ میں وقوع میں آئے تھے۔ اس سے ان کی نگاہ کا دائرہ بہت تنگ ہو کر رہ گیا۔ انہوں نے بات تو یہاں سے شروع کی تھی کہ اہمیت ٹھوس واقعات کو حاصل ہے۔ لیکن انہوں نے (ایک خاص دور کے) ٹھوس واقعات کو ابدی اور غیر متبدل سمجھ لیا۔ اور خاص واقعات سے متعلق احکام کو اسی قسم کے ملتے جلتے واقعات پر منطبق کرنے کے لئے قیاس سے

---

[1] امام ابو حنیفہؒ کا تعلق آریہ نسل سے تھا اور امام مالکؒ اور شافعیؒ سامی النسل تھے۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ اس میں افرادِ متعلقہ کے ذاتی رجحان کے بجائے حالات کے تقاضے زیادہ ذمہ دار تھے۔ جیسا کہ خود علامہؒ نے آگے چل کر بیان کیا ہے۔

شاذونادر کام لیا۔ ان کے برعکس، ان کی سخت تنقیدیں مذہب حنفیہ کے لئے (ایک اورنگ میں) بڑی مفید ثابت ہوئیں۔ اس سے انہوں نے محسوس کر لیا کہ اصولِ قانون سازی کی تعبیر میں، زندگی کی حقیقی (واقعاتی) نقل و حرکت اور تنوع کو نظرانداز نہیں کرنا چاہئے۔ یہی وجہ ہے کہ امام ابو حنیفہؒ کا مکتبِ فقہ، جس نے ان مباحث کے نتائج کو اچھی طرح جذب کر لیا تھا۔ اپنے خاص الخاص اصولِ فقہ میں بالکل آزاد ہے اور دیگر مذاہب فقہ و تشریح کے مقابلے میں، حالات سے مطابقت کی بڑی صلاحیت اپنے اندر رکھتا ہے۔ لیکن جائے حیرت ہے کہ موجودہ حنفی علماء نے خود اپنے مکتبِ فقہ کی روح کے خلاف، امام ابو حنیفہؒ اور ان کے رفقاء کے فیصلوں کو ابدی اور غیر متبدل قرار دے رکھا ہے۔ بعینہٖ اسی طرح جس طرح، امام ابو حنیفہؒ کے ناقدین نے، ان فیصلوں کو ابدی اور غیر متبدل قرار دے لیا تھا جو عہدِ رسالت مآبؐ اور صحابہؓ میں پیش آمدہ مقدمات کے سلسلہ میں نافذ ہوئے تھے۔

اس مکتبِ فقہ کا خاص الخاص اصول۔ قیاس۔ بشرطیکہ اسے اچھی طرح سمجھ لیا جائے۔ امام شافعیؒ کے الفاظ میں اجتہاد ہی کا دوسرا نام ہے جس سے وحی کی چاردیواری کے اندر، پوری پوری آزادی سے کام لیا جا سکتا ہے۔ ایک اصولِ قانون کی حیثیت سے اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ۔ جیسا کہ بعض علماء بالخصوص قاضی شوکانی نے لکھا ہے، خود نبی اکرمؐ کی زندگی میں بھی اس کی اجازت تھی۔ اسلام میں اجتہاد کا دروازہ بند کر دینا، اسلام کے خلاف افتراء ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہوئی کہ مسلمانوں میں قانون کے تصور نے ایک خاص معین شکل اختیار کر لی۔ اور ایک وجہ یہ کہ قوموں کے زوال کے زمانہ میں ذہنوں میں اس قدر جمود اور تساہل پیدا ہو جاتا ہے کہ بڑے بڑے مفکرین کو (انسان سمجھنے کے بجائے) معبود بنا دیا جاتا ہے۔ اگر علمائے متاخرین میں سے بھی بعض نے اس "افتراء" کو برقرار رکھا ہے تو وہ ان کا ذاتی فعل ہے۔ دورِ حاضر کا مسلمان اس کا پابند نہیں کہ جس طرح انہوں نے برضا و رغبت اپنی فکری آزادی کو (اپنے خودساختہ معبودوں کی) نذر کر دیا تھا، یہ بھی اپنی آزادی کو سلب ہو جانے دیں۔ علامہ سرخسیؒ (دسویں صدی میں) لکھتے ہیں:-

"اگر اس افتراء کے حامی یہ سمجھتے ہیں کہ پہلے زمانے کے مفکرین و مصنفین کو زیادہ سہولتیں حاصل تھیں، اور ان کے مقابلہ میں متاخرین کے راستے میں بہت سی دشواریاں ہیں، تو ایسا سمجھنا سراسر حماقت ہے۔ اس لئے کہ اس معمولی سی بات کے سمجھنے کے لئے کسی افلاطون کی عقل کی ضرورت نہیں کہ متقدمین کے مقابلہ میں متاخرین کے لئے اجتہاد زیادہ آسان ہے۔ حقیقت

یہ ہے کہ اب قرآن اور سنّت کی اس قدر تفسیریں اور شرحیں لکھی جا چکی ہیں کہ ہمارے زمانے کے مجتہد کے پاس، تعبیرات کے لئے کافی سے زیادہ مسالہ موجود ہے (جو متقدمین کے پاس نہ تھا")

مجھے امید ہے کہ ان مختصر تصریحات سے یہ حقیقت آپ کے سامنے آ گئی ہو گی کہ ہمارے نظامِ قانون کے نہ اساسی اصولوں میں اور نہ ہی ان کے اوپر اٹھی ہوئی موجودہ عمارت میں کوئی چیز ایسی ہے جو ہمارے موجودہ طرزِ عمل کے لئے وجہ جواز بن سکے (جس کے مطابق سمجھا جاتا ہے کہ اسلامی قوانینِ شریعت ناقابلِ تغیّر و تبدّل ہیں) بنا بریں

جرأت کی ضرورت ہے

دنیائے اسلام کو چاہئیے کہ وہ جرأت و بسالت سے کام لے اور فکرِ عمیق اور تجرباتِ جدید کی روشنی میں نظامِ شریعت کی تشکیلِ نو کے اہم کام کو اپنے ہاتھ میں لے۔ اس سلسلہ میں اس نکتہ کا سمجھ لینا ضروری ہے کہ تشکیلِ جدید کے معنی صرف اسی قدر نہیں کہ زمانہ کے موجودہ حالات سے مطابقت پیدا کر لی جائے۔ اس کا ایک گوشہ اس سے بھی زیادہ اہم اور نازک ہے۔ گذشتہ جنگِ عظیم (پہلی جنگِ عظیم) اپنے پیچھے دو اہم اثرات چھوڑ گئی ہے۔ ایک ترکی کی بیداری — جس کے متعلق ایک فرانسیسی مصنّف نے کہا ہے کہ وہ دنیائے اسلام میں ثبات و استحکام کا عنصر ہے — اور دوسرے وہ معاشی تجربہ جو مسلم ایشیا کے پہلو (روس) میں ہو رہا ہے۔ یہ وہ کوائف ہیں جن سے ہمیں اس امر پر غور کرنا چاہئیے کہ اسلام کا حقیقی مفہوم کیا ہے۔ اور وہ انسانیت کو کس منزل کی طرف لے جانا چاہتا ہے۔ آج عالمِ انسانیت کو تین چیزوں کی ضرورت ہے۔

عالمِ انسانیت کے تقاضے

(۱) کائنات کی روحانی تعبیر

(۲) فرد کی روحانی آزادی اور

(۳) عالمگیر اصول اساسی جو انسانیت کو روحانی بنیادوں پر نشوو ارتقاء کے راستے پر ڈال دیں۔

اس میں شبہ نہیں کہ جدید یورپ نے ان بنیادوں پر چند تصوراتی نظام قائم کئے ہیں۔ لیکن تجربہ بتاتا ہے کہ جن صداقتوں کو محض عقل کی رو سے دریافت کیا جاتا ہے ان سے (قلبِ انسانیت میں) زندہ و پائندہ ایمان کا وہ شعلہ کبھی بیدار نہیں ہوتا جو وحیٔ نبوّت کی رو سے ظہور میں آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ محض عقل، لوگوں کو بہت کم متاثر کر سکی ہے۔ اس کے مقابلہ میں مذہب نے ہمیشہ افراد کو بھی بلندیاں عطا کی ہیں اور پورے کے پورے

معاشرے میں بھی انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ یورپ کی تصورِیت (جسے اس نے خالص عقل کی رُو سے قائم کیا ہے) اس کی زندگی میں کبھی ایک زندہ عنصر نہیں بن سکی۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہاں ایک بدنہاد اور مسخ شدہ انانیت (PERVERTED EGO) ان جمہوریتوں کے پیکر میں نمودار ہو گئی ہے جو باہمدگر متصادم ہیں اور جن کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ دولت مندوں کی عیش سامانیوں کی خاطر غریبوں کو لوٹا کھسوٹا جائے۔ یقین مانیے! انسانیت کی اخلاقی ترقی کے راستے میں آج سب سے بڑی رکاوٹ یورپ ہے۔ اس کے برعکس، مسلمانوں کے پاس وحی کے تصدق، وہ بنیادی تصورات موجود ہیں (جن کا اُوپر ذکر کیا گیا ہے اور جن کی آج انسانیت کو اس قدر ضرورت ہے) وحی کا سرچشمہ اعماقِ حیات ہے۔ اس کے حروف والفاظ کے لباس میں اس کی اہم حقیقتیں مستور ہیں۔ اس میں الفاظ و معانی میں وہی اختلاط ہے۔ ؎

جس طرح انگر قبا پوشش اپنی خاکستر سے ہے

زندگی کی روحانی بنیاد مسلمان کا ایمان ہے۔ ایسا ایمان جس کی خاطر، ہم میں سے کم سے کم پڑھا لکھا آدمی بھی بلا توقف و تامل، اپنی جان تک دے دینے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ اسلام کا بنیادی تخیل یہ ہے کہ اب وحی کا دروازہ بند ہو چکا ہے۔ اس بناء پر ہمیں دنیا کی سب سے زیادہ آزاد قوم ہونا چاہئے پہلے زمانے کے مسلمان جو ایشیائے قبل از اسلام کی رُوحانی غلامی سے ابھی ابھی آزاد ہوئے تھے، اس پوزیشن میں نہیں تھے کہ (ختمِ نبوت کے) اس بنیادی تخیل کی اہمیت کا صحیح صحیح اندازہ کر سکتے۔ لیکن دورِ حاضر کے مسلمان کو چاہئے کہ وہ اپنی پوزیشن کو اچھی طرح سے سمجھے۔ (قرآن کے) غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں اپنے معاشرے کی تشکیل جدید کرے۔ اور وہ عالمگیر جمہوریت قائم کر کے دکھا دے جو اسلام کی اصل و غایت ہے۔ لیکن جو ابھی تک پورے طور پر بے نقاب ہو کر دنیا کے سامنے نہیں آئی۔

(ختم)　　ختم شُد

لے یعنی ہم صرف ان غیر متبدل اصولوں کے پابند ہیں جو خدا نے آخری بار قرآن میں متعین کر دیئے ہیں۔ ان اصولوں کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے ہم ہر طرح سے آزاد ہیں کہ زندگی کے نئے تقاضوں کے مطابق اپنے معاشرہ میں مناسب تغیر و تبدل کرتے رہیں۔ نیز ان معنوں میں آزاد کہ اب کوئی شخص ہم سے آکر یہ نہیں کہہ سکے گا کہ خدا نے میری معرفت تمہارے لئے یہ احکام بھیجے ہیں۔ تم ان کی اطاعت کرو۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بتقریب یومِ اقبالؒ
اپریل ۱۹۸۰ء

اقبالؒ اور کمیونزم

ہمارے ہاں چونکہ نہ تحریکِ پاکستان کی کوئی مستند تاریخ ہے۔ نہ قائدِ اعظمؒ یا علامہ اقبالؒ کے قابلِ اعتماد سوانحِ حیات، اس لئے فتنہ گروں کے لئے، الزام تراشیوں اور تہمت بافیوں کی فضا بڑی سازگار ہے۔ کبھی کہہ دیا جاتا ہے کہ تقسیمِ ہند کی اسکیم دراصل انگریز کی تخلیق تھی اور قائدِ اعظمؒ برطانیہ کے آلۂ کار تھے۔ کبھی آواز اٹھتی ہے کہ قائدِ اعظمؒ پاکستان کو سیکولر اسٹیٹ بنانا چاہتے تھے (اور اب تو خیر سے ایک بزرگوار نے اس موضوع پر ایک کتاب بھی شائع کر دی ہے ... یا للعجب) دوسری طرف، علامہ اقبالؒ کے متعلق طرح طرح کی افواہیں پھیلائی جاتی ہیں۔ کچھ عرصہ ہوا یہ آواز اٹھی کہ اقبالؒ کمیونسٹ تھا۔ طلوعِ اسلام نے اس کی بھرپور تردید کی تو یہ چنگاری خاموش ہو گئی لیکن معلوم ہوا کہ یہ دب گئی تھی، بجھی نہیں تھی۔ اس لئے کہ اب جو حادثۂ افغانستان کے سلسلہ میں کمیونسٹوں نے کروٹ لی ہے تو یہی فتنہ پھر بیدار کیا جا رہا ہے۔ یعنی یہ افواہ پھیلائی جا رہی ہے کہ اقبالؒ کمیونسٹ تھا۔ علامہ اقبالؒ زندہ ہوتے تو اس الزام کی تردید خود فرما دیتے۔ لیکن اب اس فریضہ کی ادائیگی طلوعِ اسلام کے ذمہ ہے جو نکہ اقبالؒ کا پیغامبر ہے۔ ان سطور کا محرک یہی جذبہ ہے۔ اقبالؒ کو کمیونسٹ کہنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی یہ کہہ دے کہ اقبالؒ درحقیقت ہندو تھا اور اس کا ... اصلی نام اقبال چند تھا! ویسے کسی کو کمیونسٹ کہہ دینا آسان بھی بڑا ہے۔ جہاں کسی نے کہا کہ ملک میں کوئی بھوکا نہیں رہنا چاہیئے۔ مشہور کر دیا کہ وہ کمیونسٹ ہے۔ آپ کو شاید معلوم ہو گا کہ خود طلوعِ اسلام کے خلاف بھی یہ فتویٰ صادر کیا گیا کہ یہ کمیونسٹ ہے کیونکہ یہ کہتا ہے کہ قرآن کریم نظامِ سرمایہ داری کے خلاف ہے۔ بہرحال سردست بات اقبالؒ اور کمیونزم کی ہو رہی ہے اس لئے ہم اپنے رشحاتِ قلم کو یہیں تک محدود رکھنا چاہتے ہیں۔

ہم متعدد بار وضاحت سے لکھ چکے ہیں کہ کمیونزم (یا اس کا قدمِ اول، سوشلزم) ایک معاشی نظام ہی نہیں بلکہ ایک فلسفۂ زندگی اور نظریۂ حیات ہے۔ جس کی بنیادوں پر اس کے معاشی نظام کی عمارت استوار ہوتی ہے۔

اس کا فلسفۂ حیات، اسلام کے نظریۂ زندگی کی ضد ہے۔ اسی طرح جیسے دہریت اور اسلام ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ کمیونسٹ ہونے کے لئے ضروری ہے کہ اس کے فلسفۂ حیات کو تسلیم کیا جائے، اور اسے تسلیم کرنے کے بعد، اسلام کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہتی۔ یہ وجہ ہے کہ جو ہم متعدد بار لکھ چکے ہیں کہ نہ کوئی کمیونسٹ مسلمان ہو سکتا ہے، اور نہ ہی کوئی مسلمان کمیونسٹ یعنی کوئی شخص بیک وقت مسلمان اور کمیونسٹ نہیں ہو سکتا۔ جو ایسا دعویٰ کرتا ہے اکہ وہ مسلمان بھی ہے اور کمیونسٹ بھی، وہ جاہل ہے یا منافق۔

البتہ جہاں تک کمیونزم کے معاشی نظام کا تعلق ہے وہ قرآنِ حکیم کے معاشی نظام سے ایک حد تک ملتا جلتا ہے۔ بلکہ یوں کہیئے کہ جس حد تک کمیونزم یا سوشلزم جا سکی ہے، قرآن اس سے کہیں آگے جاتا ہے۔۔۔۔ (پرویز صاحب کے ایک خطاب کا عنوان ہی یہ تھا۔ جہاں مارکس ناکام رہ گیا، اس سے آگے!) یہ ہے ان دونوں نظاموں میں وہ جزوی مماثلت جس سے سطح بیں مسلمان دھوکا کھا جاتے ہیں اور اسلام اور کمیونزم کو ایک دوسرے کا حلیف سمجھنے لگتے ہیں۔ یا جس سے فائدہ اٹھا کر، کمیونسٹ، مسلمانوں کو دھوکا دینے میں (بعض اوقات) کامیاب ہو جاتے ہیں۔ وہ اقبالؒ کو کمیونسٹ ثابت کرنے میں اس حربہ سے کام لیتے ہیں۔ حالانکہ جس طرح اسلام کے معاشی نظام کو اس کے فلسفۂ حیات سے الگ نہیں کیا جا سکتا، اسی طرح کمیونزم (یا سوشلزم) کے معاشی نظام کو اس کے نظریۂ زندگی سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ جس طرح مسلمان ہونے کے لئے سب سے پہلے، اسلام کے فلسفۂ حیات پر ایمان لانا ضروری ہے اسی طرح کمیونسٹ ہونے کے لئے کمیونزم کے نظریۂ زندگی کا ماننا لاینفک ہے اور جس طرح کوئی شخص محض اسلام کے معاشی نظام کو، صحیح سمجھ کر مسلمان نہیں ہو سکتا اسی طرح کوئی شخص، محض کمیونزم کے معاشی نظام کو تسلیم کرنے سے کمیونسٹ نہیں کہلا سکتا۔ اسلام اور کمیونزم دونوں میں، ان کے معاشی نظام کو ان کے فلسفۂ حیات سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا کمیونزم کو سمجھنے کے لئے سب سے پہلے اس کے فلسفۂ حیات کا سمجھنا ضروری ہے۔

جیسا کہ معلوم ہے، کمیونزم کا بانی کارل مارکس تھا۔ وہ محض ایک ماہرِ معاشیات نہیں تھا، اس کا شمار فلاسفرز کے زمرہ میں بھی ہوتا ہے۔ اس نے بنیادی طور پر ایک فلسفہ پیش کیا تھا اور پھر، اس فلسفہ کی بنیادوں پہ ایک معاشی نظام کا نقشہ دیا تھا جس کی ابتدائی شکل سوشلزم اور انتہائی کمیونزم ہے۔ لہٰذا، کمیونزم یا سوشلزم

سے مراد ہے مارکسؔ کا پیش کردہ فلسفۂ حیات اور اس پر متفرّع معاشی نظام۔ مارکسؔ کے فلسفۂ حیات کی رُو سے انسان کی زندگی بس یہی طبعی زندگی ہے اور اس سے متعلق مسائل مادی۔ اس تصوّرِ حیات کے مطابق، نہ خدا کا وجود باقی رہتا ہے نہ وحی کا۔ جب وحی کا وجود باقی نہ رہے تو نہ جنّت کا تصوّر باقی رہتا ہے، نہ اس کی وساطت سے عطا کردہ مستقل اقدار کا۔ اور ظاہر ہے کہ اس کے بعد، حیاتِ اخروی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ ہے (مسئلہ زیرِ نظر کی حد تک) مارکسؔ کے فلسفۂ حیات کا ملخّص۔

جہاں تک معاشی نظام کا تعلّق ہے۔ مارکسؔ کے نظریہ کا ماحصل یہ ہے کہ :۔

۱۔ نظامِ سرمایہ داری کا دَور ختم ہو چکا ہے۔ اب اس کی جگہ ایک ایسا نظام لے گا جو اس نظام (سرمایہ داری) کی ضد ہو گا۔

۲۔ اس (جدید) نظام میں، ذرائع پیداوار، افراد کی ذاتی ملکیت کے بجائے، محنت کشوں کی مشترکہ ملکیت (یا تحویل) میں رہیں گے۔

۳۔ فاضلہ دولت، جو نظامِ سرمایہ داری کی اصل و بنیاد ہے، کسی کے پاس نہیں رہے گی۔

۴۔ جب فاضلہ دولت کسی کے پاس نہیں رہے گی تو دولت کی بنیاد پر، دوسروں کی محنت کو غصب کر کے، مزید دولت کمانے کا سوال باقی نہیں رہے گا۔ نہ ذاتی جائیدادیں کھڑی کی جا سکیں گی۔ نہ انفرادی کارخانے لگائے جا سکیں گے، نہ سودی کاروبار ہو سکے گا، نہ یہ صورت پیدا ہو سکے گی کہ :۔

اُمّتے بر اُمّتے دیگر چَرد!
دانہ ایں می کارد آں حاصل بَرد!

ان تصریحات سے واضح ہے کہ جو شخص اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہے وہ مارکس کے پیش کردہ فلسفۂ حیات کا کبھی مؤید نہیں ہو سکتا۔ اسلام کا فلسفۂ حیات اور مارکسی فلسفۂ حیات ایک دوسرے کی ضد ہیں۔

اب رہا معاشی نظام۔ سو اگر اسلام کا مفہوم غیر متعیّن رکھا جائے تو پھر مارکسی نظام، خلافِ اسلام بھی ہو سکتا ہے اور مطابقِ اسلام بھی۔ لیکن اگر اس کے مفہوم کے لئے قرآن کریم کو حرفِ آخر قرار دے لیا جائے تو اس حقیقت کے اثبات میں کوئی شبہ نہیں رہ جاتا کہ قرآنِ کریم نظامِ سرمایہ داری کا سخت دشمن ہے اور اشتراکی نظام کسی حد تک قرآن کے معاشی نظام کے مماثل ہے۔

آیئے، ہم دیکھیں کہ اقبالؒ اس باب میں کیا کہتا ہے؟

اقبالؒ کا قلبِ درد آگیں

اقبالؒ نے اپنے سینے میں ایک درد آگیں قلب پایا تھا جو مفلسوں اور ناداروں، محنت کشوں اور مزدوروں کی زبوں حالی پر خون کے آنسو بن کر اس کے چشمِ گریاں سے ٹپک پڑتا تھا۔ ان کی سب سے پہلی (نثری) کتاب "علم الاقتصاد" ۱۹۰۳ء میں شائع ہوئی تھی۔ وہ اس کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:۔

اس میں شک نہیں کہ تاریخ انسانی کے سیلِ رواں میں، اصولِ مذہب بھی بے انتہا موثر ثابت ہوئے ہیں ہیں۔ مگر یہ بات بھی روزمرہ کے تجربہ اور مشاہدے سے ثابت ہوتی ہے کہ روزی کمانے کا دھندا ہر وقت انسان کے ساتھ ساتھ ہے اور چپکے سے اس کے ظاہری و باطنی قویٰ کو اپنے سانچے میں ڈھالتا رہتا ہے۔ ذرا خیال کرو کہ غریبی، یا یوں کہو کہ ضروریاتِ زندگی کے کامل طور پر پورا نہ ہونے سے انسانی طرزِ عمل کہاں تک متاثر ہوتا ہے۔ غریبی قوی انسانی پر بہت برا اثر ڈالتی ہے۔ بلکہ بسا اوقات انسانی روح کے مجلا آئینہ کو اس قدر زنگ آلود کر دیتی ہے کہ اخلاقی اور تمدنی لحاظ سے اس کا وجود و عدم برابر ہو جاتا ہے۔ معلّم اوّل، یعنی حکیم ارسطو سمجھتا تھا کہ غلامی تمدنِ انسانی کے قیام کے لئے ایک ضروری جزو ہے، مگر مذہب اور زمانۂ حال کی تعلیم نے انسان کی جبلّی آزادی پر زور دیا اور رفتہ رفتہ مہذب قومیں محسوس کرنے لگیں کہ یہ وحشیانہ تفاوتِ مدارج، بجائے اس کے کہ قیامِ تمدن کے لئے ایک ضروری جزو ہے، اس کی تخریب کرتا ہے اور انسانی زندگی کے ہر پہلو پر نہایت مذموم اثر ڈالتا ہے۔ اسی طرح اس زمانے میں یہ سوال پیدا ہوا ہے کہ آیا مفلسی بھی نظمِ عالم میں ایک ضروری جزو ہے؟ کیا ممکن نہیں کہ ہر فرد مفلسی کے دکھ سے آزاد ہو؟ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ گلی کوچوں میں چپکے چپکے کراہنے والوں کی دلخراش صدائیں ہمیشہ کے لئے خاموش ہو جائیں اور ایک دردمند دل کو ہلا دینے والے افلاس کا دردناک نظارہ ہمیشہ کے لئے صفحۂ عالم سے حرفِ غلط کی طرح مٹ جائے۔

یہ ۱۹۰۳ء کی بات ہے۔ غور کیجئے کہ اتنی سی عمر میں، اقبالؒ کے دل میں کس قسم کے سوالات ابھر رہے تھے —— یہ سوالات کہ

۱۔ آیا مفلسی بھی نظمِ عالم میں ایک ضروری جزو ہے؟ ۔۔۔۔ اور

۲۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ گلی کوچوں میں چپکے چپکے کراہنے والوں کی دلخراش صدائیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے

خاموش ہو جائیں اور ایک دردمند دل کو ہلا دینے والا نظارہ ہمیشہ کے لئے صفحۂ عالم سے حرفِ غلط کی طرح مٹ جائے

ان سوالات میں "ہمیشہ کے لئے" کے الفاظ بڑے غور طلب ہیں۔ اقبالؒ کی باقی زندگی (منجملہ دیگر امور) انہی سوالات کے اطمینان بخش جواب کی تلاش میں گذری۔ ظاہر ہے کہ ان کا جواب ہمارے مروجہ مذہب کے معاشی نظام سے نہیں مل سکتا تھا، جس کی بنیاد اس عقیدہ پر ہے کہ نظمِ عالم کے لئے مفلسی ایک جزو لازم ہے۔ کیونکہ اگر مفلسی نہ رہے تو دولتمند لوگ صدقہ و خیرات دے کر ثواب کیسے حاصل کر سکیں گے، اور مفلسی سے کراہنے والوں کی دلخراش صدائیں ہمیشہ کے لئے خاموش نہیں ہو جانی چاہئیں، کیونکہ اگر ایسا ہو گیا تو صدقہ و خیرات سے متعلق احکامِ شریعت معطل ہو کر رہ جائیں گے۔

لیکن اقبالؒ نے ان سوالات کا جواب قرآنِ حکیم کے عالمگیر ابدی ضابطۂ حیات سے پالیا اور انہی جوابات کو وہ اُمّت اور عالمگیر انسانیت کے سامنے پیش کرتے رہے۔ سب سے پہلے انہیں قرآن کی دفتین سے

اقبالؒ اور نظامِ سرمایہ داری

یہ جواب ملا کہ مفلسی اور ناداری کا بنیادی سبب، نظامِ سرمایہ داری ہے۔ اور جب تک اس نظام کی جڑیں نہیں کٹتیں، کراہنے والوں کی دل خراش صدائیں خاموش نہیں ہو سکتیں۔ ان صداؤں کا علاج، محتاجوں اور مفلسوں کی جھولی میں بھیک کے ٹکڑے ڈال دینے میں نہیں، ان کا علاج، اس نظام کو بدل دینے میں ہے جو انہیں مفلس اور محتاج بناتا ہے۔ اس حقیقت کے پیشِ نظر، اقبالؒ نے نظامِ سرمایہ داری کے خلاف جہاد کو اپنی زندگی کا مشن قرار دے لیا۔ وہ اپنی مشہور نظم "خضرِ راہ" میں ـــــ جو ۱۹۲۲ء (۹) میں کہی گئی تھی ـــــ خضر سے سوال کرتے ہیں کہ ـــــ

زندگی کا راز کیا ہے، سلطنت کیا چیز ہے
اور یہ سرمایہ و محنت میں ہے کیسا خروش؟

اور خضر کی زبانی اس سوال کا یہ جواب دیتے ہیں کہ:-

بندۂ مزدور کو جا کر مرا پیغام دے!
خضر کا پیغام کیا، ہے یہ پیامِ کائنات

اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دارِ حیلہ گر — شاخِ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات
مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار — انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات

اُٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دَور کا آغاز ہے

اسی زمانہ میں، ان کا فارسی مجموعۂ کلام، پیامِ مشرق، شائع ہوا۔ اس کے آخری باب ——— "نقشِ فرنگ" ——— کا بیشتر حصہ، محنت اور سرمایہ کے اہم موضوع کے لئے وقف ہے۔ یہ اشعار فارسی زبان میں ہیں۔ طلوعِ اسلام میں جب بھی فارسی کے اشعار درج کئے جاتے ہیں تو اکثر یہ مطالبہ کیا جاتا ہے کہ ان کا اُردو ترجمہ کر دیا جایا کرے کیونکہ اب فارسی بہت کم لوگ سمجھتے ہیں (بالخصوص ہماری نئی نسل کا تعلیم یافتہ طبقہ اس سے بہرہ ہوتا ہے ——— یہ طالبِ علم تو اب اُردو سمجھنے سے بھی قاصر ہوتے جا رہے ہیں) شعر کا ترجمہ نہ صرف اس کی شعریت ختم کر دیتا ہے بلکہ اس سے اس کی اثر انگیزی بھی باقی نہیں رہتی۔ اشعار کا مفہوم تو سمجھایا جا سکتا ہے، ان کا ترجمہ انہیں بے روح بنا دیتا ہے۔ اس لئے ہم نے ایسے مطالبات کو پورا کرنے سے اکثر معذرت چاہی ہے۔

اور پیامِ مشرق کے یہ اشعار، نہ صرف یہ کہ ان کی زبان فارسی ہے بلکہ ان میں جو فلسفہ پیش کیا گیا ہے وہ بھی بڑا دقیق ہے اس لئے بھی ان کا ترجمہ مفیدِ مطلب نہیں ہو سکتا۔ بنابریں ہم انہیں علیٰ حالہ پیش کر دینے پر مجبور ہیں۔

اس کی تلافی علامہؒ کے اُردو کے وہ اشعار کر دیں گے جو بعد میں آئیں گے۔

پیامِ مشرق کے آخر میں "صحبتِ رفتگان" کے زیرِ عنوان، حضرت علامہ سب سے پہلے ٹالسٹائے کی زبان سے کہلواتے ہیں :-

دارُوئے بیہوشی است، تاج، کلیسا، وطن
جانِ خداداد را خواجہ بجامے خرید

اور کارل مارکس کے یہ الفاظ دہراتے ہیں کہ :-

رازدانِ جزو و کل، از خویش نامحرم شداست
آدم از سرمایہ داری، قاتلِ آدم شداست

ٹالسٹائے، ہیگل کے فلسفۂ اضداد کو "عقلِ دورُو" کی تخلیق قرار دے کر، اس پر، ان الفاظ میں سخت تنقید

کرتا ہے کہ اس کی رُو سے وہ :-

درسِ رضا ہی دہد بندۂ مزدور را[1]

ایرانی تحریکِ کمیونزم کا بانی، مزدک، دورِ حاضر کی اضطراب انگیزیوں کو دیکھ کر، پکار اٹھتا ہے کہ

دانۂ ایراں ز کشتِ زار و قیصر بردمید — مرگِ نوی رقصد اندر قصرِ سلطان و امیر
مدتے در آتشِ نمرود می سوزد خلیل!
تا تہی گردد حرمیش از خداوندانِ پیر
دورِ پرویزی گذشت، اے کشتۂ پرویز، خیز
نعمتِ گم گشتۂ خود را ز خسرو باز گیر[2]

اس کے ساتھ ہی، مزدوروں کا نمائندہ، کوہکن (فرہاد) اس نعرۂ قیامت خیز کے ساتھ سامنے آتا ہے :-

نگارِ من کہ بسے سادہ و کم آمیز است — ستیزہ کیش و ستم کوش و فتنہ انگیز است
بروں او ہمہ بزم و درونِ او ہمہ رزم — زبان او ز مسیح و دلش ز چنگیز است
اگرچہ تیشۂ من کوہ را ز پا آورد — ہنوز گردشِ گردوں بکامِ پرویز است
ز خاک تا بہ فلک ہر چہ ہست رہ پیماست
قدم کشائے کہ رفتارِ کارواں تیز است

اس کے بعد ہمارے سامنے فرانسیسی فلاسفر، آگسٹس کومٹ اور مردِ مزدور کا مکالمہ آتا ہے۔ کومٹ، فلسفۂ مادیت کا علمبردار تھا اور طبقات کی تقسیم کو مطابقِ فطرت قرار دیتا تھا۔ اس کے فلسفہ کے جواب میں، مردِ مزدور کہتا ہے :-

فریبی بہ حکمت مرا اے حکیم — کہ نتواں شکست ایں طلسمِ قدیم
مسِ خام را از زر اندودۂ ؟ — مرا خوئے تسلیم فرمودۂ؟
حقِ کوہکن دادی اے نکتہ سنج — بہ پرویز پُر کار و نابردہ رنج؟
جہاں راست بہروزی از دستِ مُزد — ندانی کہ ایں ہیچ کار است دُزد

---

[1] انسانوں کا خود ساختہ مذہب، غریب کو تقدیرِ خداوندی پر شاکر رہنے کی تلقین سے درسِ رضا دیتا ہے۔

[2] ایران کے حالیہ انقلاب کی روشنی میں ان اشعار کا صحیح مفہوم سمجھ میں آسکتا ہے۔

پئے جرم او پرسش آوردهٔ ؟
بایں عقل و دانش فسوں خوردهٔ ؟

ازاں بعد، سرمایہ دار اور مزدور کا "قسمت نامہ" ہمارے سامنے آتا ہے۔ اس تقسیم کی رُو سے، سرمایہ دار، مزدور سے کہتا ہے کہ دنیا میں جو کچھ ہے اس میں تمہارا بھی حصّہ ہے اور میرا بھی۔ اس کی تقسیم یوں ہوگی کہ :-

غوغائے کارخانۂ آہنگری ز من — گلبانگِ ارغنونِ کلیسا از آنِ تو !
نخلے کہ شہ خراج بر و می نہد، ز من — باغِ بہشت و سدرہ و طوبیٰ از آنِ تو
تلخابۂ کہ دردِ سر آرد، از آنِ من — صہبائے پاک آدم و حوّا از آنِ تو

ایں خاک و آنچہ در شکم او از آنِ من
وز خاک تا بہ عرشِ مُعلّٰی از آنِ تو

اور پھر مزدور کی یہ دل خراش صدائے دردناک ہمارے کانوں میں آتی ہے :-

ز مُزدِ بندۂ کرپاس پوش و محنت کش
نصیبِ خواجۂ ناکردہ کار رختِ حریر

زخوئے فشانیٔ من لعلِ خاتمِ والی — ز اشکِ کودکِ من گوہرِ ستامِ[1] امیر
ز خونِ من چو زلو[2] فربہی کلیسا را — بزورِ بازوئے من دستِ سلطنت ہمہ گیر

خرابہ رشکِ گلستاں زگریۂ سحرم
شبابِ لالہ و گل از طراوتِ جگرم

اور اس کا رَدِ عمل :-

بیا کہ تازہ نوا می تراود از رگِ ساز — مئے کہ شیشہ گداز د بہ ساغر اندازیم
مغان و دیرِ مغاں را نظامِ تازہ دہیم — بنائے میکدہ ہائے کہن بر اندازیم
ز رہزنانِ چمن انتقامِ لالہ کشیم — بہ بزمِ غنچہ و گل طرحِ دیگر اندازیم

---

[1] گھوڑے کی زین — [2] زلو۔ جونک

بطوفِ شمع چو پروانہ زیستن تا کے
زخویشتن ایں ہمہ بیگانہ زیستن تا کے

آگے بڑھنے سے پیشتر، ذرا اس حقیقت کو سامنے لائیے کہ یہ اشعار ۱۹۲۳ء سے پہلے کہے گئے ہیں۔ اس کے بعد نظامِ سرمایہ داری اور محنت کشوں میں جو کش مکش ہوئی ہے اور دنیا کے معاشی نظام میں جس قدر انقلابات آئے ہیں، ان اشعار میں ان کی کس طرح پیش گوئی کی گئی ہے۔ اسے کہتے ہیں فراستِ مردِ مومن! —— حضرت علامہؒ نے سچ کہا تھا کہ:-

حادثہ وہ جو ابھی پردۂ افلاک میں ہے
عکس اس کا میرے آئینۂ ادراک میں ہے

اس میں ایک نکتہ یہ بھی قابلِ غور ہے کہ انہوں نے "آئینۂ ادراک" کہا ہے۔ یعنی ان کی فکر —— کشف و الہام نہیں کہا۔ جس کے دعویدار "مامور من اللہ" بن جاتے ہیں۔

اب آگے چلئے۔ زبورِ عجم میں یہ حشر بداماں پیغامِ انقلاب ہمارے سامنے آتا ہے:-

خواجہ از خونِ رگِ مزدور سازد لعلِ ناب
از جفائے دہ خدایاں کشتِ دہقاناں خراب

انقلاب!

انقلاب! اے انقلاب! (زبور صـ ۱۳۴)

—— (۰) ——

"بالِ جبریل" میں فرشتوں کا گیت، اسی روحِ انقلاب کا طنزیہ نشتر ہے۔ وہ خدائے کائنات کو مخاطب کر کے شکوہ سنج ہیں کہ:-

عقل ہے بے زمام ابھی عشق ہے بے مقام ابھی
نقش گرِ ازل ترا نقش ہے ناتمام ابھی
خلقِ خدا کی گھات میں رند و فقیہہ و میر و پیر
تیرے جہاں میں ہے وہی گردشِ صبح و شام ابھی
تیرے امیر مال مست تیرے فقیر حال مست
بندہ ہے کوچہ گرد ابھی خواجہ بلند بام ابھی (صـ ۱۴۸)

اور یہی وہ "عرش کے کنگورے ہلا دینے والا" احتجاج ہے جس کے جواب میں خدا کی طرف سے فرشتوں کو حکم ملتا ہے کہ

اس انسانیّت کُش نظام کو اُلٹنے کے لئے

اُٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو — کاخِ اُمراء کے در و دیوار ہلا دو!
جس کھیت سے دہقاں کو میسّر نہیں روزی — اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو
کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے — پیرانِ کلیسا کو کلیسا سے اُٹھا دو
حق را بسجودے صنماں را بطوافے — بہتر ہے چراغِ حرم و دیر بجھا دو

میں ناخوش و بیزار ہوں مرمر کی سلوں سے
میرے لئے مٹی کا حرم اور بنا دو (صـ ۱۴۹)

یہی بات ضربِ کلیم میں ان الفاظ میں کہی گئی ہے کہ:۔

اے شیخ امیروں کو مسجد سے نکلوا دے
ہے ان کی نمازوں سے محراب ترش ابرو (صـ ۱۶)

اس لئے کہ

کثرتِ نعمت گداز از دل بُرد — نازمی آرد نیاز از دل بُرد!

سالہا اندر جہاں گردیدہ ام
نم بچشمِ منعماں کم دیدہ ام (جاوید نامہ)

بالِ جبریل میں ایک نظم ہے جس کا عنوان ہے۔ "لینن۔ خدا کے حضور"! آپ غور کیجئے کہ خدا کا منکر لینن، خدا سے کیا شکایت کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ:۔

اِک بات اگر مجھ کو اجازت ہو تو پوچھوں — حل کر نہ سکے جس کو حکیموں کے مقالات

وہ بات کیا ہے جسے گوش گذار کرنے کی اس طرح اجازت مانگی گئی ہے؟ وہ بات وہی ہے جو ہر کمیونسٹ کے دل میں کھٹکتی رہتی ہے کہ:۔

وہ کون سا آدم ہے کہ تو جس کا ہے معبود؟ — وہ آدمِ خاکی کہ جو ہے زیرِ سماوات؟

اس "آدمِ خاکی" کے تو اور ہی خدا ہیں!

مشرق کے خداوند سفیدانِ فرنگی!
مغرب کے خداوند درخشندہ فلزات!

ان "خداوند سفیدانِ فرنگی" کے نظامِ سرمایہ داری کا یہ عالم ہے کہ :۔

ظاہر میں تجارت ہے حقیقت میں جوا ہے　　سود ایک کا لاکھوں کے لئے مرگِ مفاجات
یہ علم یہ حکمت، یہ تدبر، یہ حکومت　　پیتے ہیں لہو دیتے ہیں تعلیمِ مساوات

اس کے بعد وہ کہتا ہے کہ :۔

آثار تو کچھ کچھ نظر آتے ہیں کہ آخر　　تدبیر کو تقدیر کے شاطر نے کیا مات
مے خانے کی بنیاد میں آیا ہے تزلزل　　بیٹھے ہیں اسی فکر میں پیرانِ خرابات
چہروں پہ جو سرخی نظر آتی ہے سرِ شام　　یا غازہ ہے یا ساغر و مینا کی کرامات

اور اس کے بعد دیکھئے کہ وہ کس حسرت آمیز یا طنز آلود لہجہ میں کہتا ہے کہ :۔

تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں　　ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات
کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ؟　　دنیا ہے تری منتظرِ روزِ مکافات! ص۱۴۷

عصرِ حاضر کا علم و حکمت، تدبر و حکومت، کس طرح نظامِ سرمایہ داری کے آلۂ کار ہیں۔ اقبالؒ، مختلف مقامات پر، مختلف انداز سے اس کی وضاحت کرتا ہے۔ ارمغانِ حجاز میں ایک بڑی جامع نظم ہے جس کا نام ہے "ابلیس کی مجلسِ شوریٰ"۔ اس میں ابلیس کا ایک مشیر، مختلف نظام ہائے حکومت کا تجزیہ کرنے کے بعد کہتا ہے کہ :۔

کاروبارِ شہریاری کی حقیقت اور ہے　　یہ وجودِ میر و سلطاں پر نہیں ہے منحصر
مجلسِ ملت ہو یا پرویز کا دربار ہو　　ہے وہ سلطاں غیر کی کھیتی پہ ہو جس کی نظر (ص۲۱۷)

دوسری جگہ اس حقیقت کو بڑے انوکھے اور نہایت دلچسپ انداز سے بیان کیا گیا ہے۔ اس میں ایک دوزخی خدا سے مناجات کرتے ہوئے کہتا ہے :۔

یہ علم، یہ حکمت، یہ سیاست، یہ تجارت　　جو کچھ ہے وہ ہے فکرِ ملوکانہ کی ایجاد

اور بارگاہِ باری تعالیٰ میں سجدۂ شکرانہ بجا لاتے ہوئے کہتا ہے :۔

اللہ ترا شکر ہے کہ یہ خطۂ پرسوز　　سوداگرِ یورپ کی غلامی سے ہے آزاد

(ارمغان ص۲۴۲)

علامہ دورِ حاضر کے طالب علم سے کہتے ہیں :-

عصرِ حاضر ملک الموت ہے تیرا، جس نے — قبض کی روح تری دے کے تجھے فکرِ معاش

(ضربِ کلیم صہ۸۲)

ارمغانِ حجاز میں وہ اُس سے کہتے ہیں :-

مرا کافر کند اندیشۂ رزق — تُرا کافر کند علمِ کتابی (صہ۵۳)

جاوید نامہ میں مسلمانوں کی تباہی و بربادی کے اسباب کا تجزیہ کرتے ہوئے کہتے ہیں :-

چار مرگ اندر پئے ایں دیر میر — سود خوار و والی و مُلّا و پیر

دوسرے مقام پر ہے :-

باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری — اے کشتۂ سلطانی و مُلّائی و پیری

نظامِ سرمایہ داری کے علمبردار، غریبوں اور ناداروں کو جس اسلام کا سبق پڑھاتے ہیں، اقبالؒ اسے ابلیس کا پیدا کردہ فریب قرار دیتا ہے۔ چنانچہ ارمغانِ حجاز میں ابلیس کی زبان سے کہلوایا گیا ہے :-

میں نے ناداروں کو سکھلایا سبق تقدیر کا — میں نے منعم کو دیا سرمایہ داری کا جنوں

لینن نے خدا سے پوچھا تھا کہ :-

کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ — دنیا ہے تری منتظرِ یومِ مکافات

اقبالؒ اس کے جواب میں کہتا ہے کہ اس میں اب زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ مجھے تو نظر آرہا ہے کہ :-

گیا دورِ سرمایہ داری گیا! — تماشا دکھا کر مداری گیا

لیکن وہ کہتے یہ ہیں کہ نظامِ سرمایہ داری، کمیونزم یا سوشلزم کے ہاتھوں نہیں ٹوٹے گا، اس لئے کہ ان کا معاشی نظام چل ہی نہیں سکتا۔ یہ خود ناکام رہ جائے گا۔

دستِ فطرت نے کیا ہے جن گریبانوں کو چاک — مزدکی منطق کی سوزن سے نہیں ہوتے رفو

(ارمغانِ حجاز صہ۲۲۳)

اس نظام کا سفینہ، اسلام کے ہاتھوں ڈوبے گا جس کے نظام کی حقیقت یہ ہے کہ وہ :-

موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لیے — نے کوئی فغفور و خاقاں، نے فقیرِ رہ نشیں (" صہ۲۲۵)

اس کے بعد وہ بتاتے ہیں کہ اسلام کا وہ نظام کیا ہے جس کے ہاتھوں نظامِ سرمایہ داری کا خاتمہ ہوگا۔

مثبت نظامِ معیشت

نظامِ سرمایہ داری کی بنیاد اس نظریہ پر ہے کہ ذرائع پیداوار افراد کی ذاتی ملکیت میں رہنے چاہئیں۔ اقبالؒ کے نزدیک یہ نظریہ، قرآنی نظریۂ معیشت کا یکسر نقیض ہے اور ابلیسانہ فکر کی ایجاد، ذرائع پیداوار میں بنیادی حیثیت زمین (ارض کو) حاصل ہے۔ اس باب میں اقبالؒ کا نظریہ اس قدر واضح ہے کہ اس میں دو آراء ہو نہیں سکتیں۔ جاوید نامہ میں انہوں نے "محکماتِ عالمِ قرآنی" کے جو تین ستون بیان کئے ہیں، ان میں ایک ستون یہ ہے کہ:۔

ارض ملکِ خدا است

اس عنوان کے تابع وہ لکھتے ہیں:۔

حق زمیں را جز متاع ما نگفت　　　　این متاعِ بے بہا مفت است مفت

دِہ خدایا! نکتۂ از من پذیر　　　　رزق و گور از وے بگیر اور امگیر!

باطنِ "الارض للہ" ظاہر است

ہر کہ ایں ظاہر نہ بیند کافر است　　　　(صہ ۸)

آخری شعر میں اقبالؒ ایک عظیم حقیقت بیان کر گیا ہے۔ ہمارے ہاں کا قدامت پرست طبقہ "الارض للہ" (یعنی ارض خدا کی ملکیت ہے)، کا اعتراف کرتا ہے لیکن وہ کہتا ہے کہ یہ محض نظری عقیدہ ہے۔ ہمارا ایمان ہے کہ کائنات میں جو کچھ ہے سب خدا کی ملکیت ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ زمین پر کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی۔ "الارض للہ" عقیدہ کی حد تک تو صحیح ہے۔ عملی نظام ایسا نہیں ہو سکتا۔ علامہ اقبالؒ کہتے ہیں کہ "الارض للہ" کا نظری عقیدہ دیا ہی اس لئے گیا ہے کہ اس کے مطابق معاشی نظام متشکل کیا جائے۔ اگر اس عقیدہ کو محض نظری طور پر مانا جائے۔ اور عملی نظام اس کے خلاف ہو تو یہ اسلام نہیں، کفر ہے۔

غور فرمائیے۔ اقبالؒ کس طرح مسئلہ ملکیتِ زمین کو کفر و ایمان کی بنیاد قرار دیتے ہیں؟

آگے چل کر کہتے ہیں:۔

رزقِ خود را از زمیں بُردن رواست　　　　ایں "متاع" بندہ و ملکِ خداست　　　　(صہ ۹)

اور اس کی تشریح ان الفاظ میں کرتے ہیں:۔

ایں ہمی گوئی متاع ما زماست | مرد ناداں ایں ہمہ مالکِ خداست
ارضِ حق را ارضِ خود دانی ، بگو | چیست شرحِ آیۂ لَاتُفْسِدُوْا[1]
ابنِ آدم دل با بلیسی نہاد | من ز ابلیسی ندیدم جز فساد

بردہ چیزے کہ از آنِ تو نیست!
داغم از کارے کہ شایانِ تو نیست (ص ۱۲۵)

اور اس کے بعد کہتے ہیں کہ :-

ملکِ یزداں را بہ یزداں باز دہ | تا ز کارِ خویش بکشائی گرہ

"ابلیس کی مجلسِ شوریٰ" (ارمغانِ حجاز) میں ، ابلیس کی زبان سے کہلوایا گیا ہے :-

اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب
پادشاہوں کی نہیں ، اللہ کی ہے یہ زمیں!

"بالِ جبریل" میں اس اجمال کی تفصیل حسبِ ذیل الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔ نظم کا عنوان ہے :-

الارضُ للہ!

وہ زمیندار کو (جو اپنے آپ کو زمین کا مالک سمجھتا ہے) مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ یہ بتاؤ کہ :-

پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون | کون دریاؤں کی موجوں سے اٹھاتا ہے سحاب؟
کون لایا کھینچ کر پچھم سے بادِ سازگار | خاک یہ کس کی ہے، کس کا ہے یہ نورِ آفتاب؟
کس نے بھر دی موتیوں سے خوشۂ گندم کی جیب | موسموں کو کس نے سکھلائی ہے خوئے انقلاب؟

دہ خدایا! یہ زمیں تیری نہیں ، تیری نہیں
تیرے آبا کی نہیں ، تیری نہیں میری نہیں[2]

جب یہ زمین ، تیرے آباء کی نہیں تھی تو اسے وراثت میں پاکر مالک بننے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔ اور جب یہ نہ تیری ہے نہ میری ، تو اسے کسی دوسرے کے ہاتھ فروخت کیسے کیا جا سکتا ہے؟ یہ خدا کی ہے ۔ اور قرآن کی رو سے جس چیز کو خدا اپنی طرف منسوب کرتا ہے ۔ اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ وہ تمام انسانوں کے فائدے کے لئے کھلی رہے گی ، کسی کی ذاتی ملکیت میں نہیں جا سکے گی ۔ جیسے اس نے کعبہ کے متعلق کہا کہ وہ میرا گھر (بیتی) ہے تو اس کے ساتھ ہی کہہ دیا کہ اسے للناس بنایا گیا ہے ۔ یعنی تمام نوعِ انسانی کے فائدے کے لئے ۔ اس لئے وہ ــــــ

---

[1] وَلَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا ۸۵/۷ [2] یہ اشعار ، قرآنی آیات ۶۳/۵۶ تا ۷۲ کی تفسیر ہیں

سواء ن العاکف فیہ والباد ہے۔ یعنی وہاں کے رہنے والوں اور باہر سے آنے والوں، سب کے لئے یکساں طور پر کھلا۔ یہی حیثیت زمین کی ہے۔ وہ نوع انسانی کے لئے متاع (سامانِ زیست حاصل کرنے کا ذریعہ) ہے۔ کسی کی ذاتی جائیداد نہیں۔

فاضلہ دولت

زمین سے آگے بڑھیئے تو نظام سرمایہ داری کی دوسری بنیاد فاضلہ دولت ..... (SURPLUS MONEY) ہے۔ اس سلسلہ میں قرآن کریم کا فیصلہ صاف اور واضح ہے۔ سورۂ بقرہ میں ہے۔ یَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ - اے رسول! یہ لوگ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ ہم کس قدر دولت نوع انسان کی ربوبیت عامہ کے لئے دے دیں۔ قُلِ الْعَفْوَ۔ (۲/۲۱۹) ان سے کہہ دو کہ تمہاری ضروریات سے زائد جس قدر ہے، سب کی سب۔ اس فیصلہ نے فاضلہ دولت کا تصور ہی ختم کر دیا۔ قرآن کریم کے اسی فیصلہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے۔ اقبالؒ جاوید نامہ میں کہتے ہیں :-

با مسلماں گفت جاں برکف بنہ

ہرچہ از حاجت فزوں داری بدہ

جب روس میں اشتراکیت کا انقلاب برپا ہوا تو اقبالؒ کی نگہ ژرف بیں و دُوررس نے اس میں فطرت کے اس اشارہ کو مضمر دیکھا کہ وہ دَور قریب آرہا ہے جب قرآن کا معاشی نظام وجہِ شادائی عالم بن جائے گا۔ ضربِ کلیم کی یہ نظم (جس کا عنوان اشتراکیت ہے) اسی حقیقت کی پردہ کشائی کرتی ہے۔ کہتے ہیں :-

قوموں کی روش سے مجھے ہوتا ہے یہ معلوم

بے سود نہیں روس کی یہ گرمیٔ رفتار

اندیشہ ہوا شوخیٔ افکار پہ مجبور! | فرسودہ طریقوں سے زمانہ ہوا بیزار

انساں کی ہوس نے جنہیں رکھا تھا چھپا کر | کھلتے نظر آتے ہیں بتدریج وہ اسرار

قرآن میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلماں | اللہ کرے تجھ کو عطا جدتِ کردار

جو حرفِ قُلِ الْعَفْو میں پوشیدہ ہے اب تک

اس دَور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار!

جب قرآن کی یہ مضمر حقیقت نمودار ہو گی تو اس وقت اس دنیا کا نقشہ کیا ہوگا۔ اسے اقبالؒ نے جاوید نامہ میں، فلکِ مریخ پر، شہرِ مرغدین (دین کا گلستان) کے رنگ میں پیش کیا ہے۔ اس میں :-

سخت کوشی دہقاں چراغش روشن است — از نہاب دہ خدایاں ایمن است
کشت و کارش بے نزاع آبجوست — حاصلش بے شرکت غیرے ازاوست (صہ۱۲۱)

اور

نے بیازاراں ز بیکاراں خروش — نے صداہائے گدایاں در د گوش

اقبالؒ اپنی ۱۹۰۳ء کی آرزو کو (جس کا ذکر شروع میں ہو چکا ہے) قرآنی نظام کی اس آئیڈیل دنیا میں پورا ہوتے دیکھتا ہے جہاں کیفیت یہ ہے کہ:-

کس درین جا سائل و محروم نیست
عبد و مولا۔ حاکم و محکوم نیست (صہ۱۲۰)

اسی کو وہ دین کا ماحصل قرار دیتا ہے جب کہتا ہے کہ:-

کس نگردد در جہاں محتاج کس!
نکتۂ شرع مبیں این است و بس (پس چہ باید کرد۔ صہ۱۴)

اقبالؒ نے جو کچھ نظام سرمایہ داری کے خلاف کہا ہے، مارکسزم کے حامی اسی کی سند سے اسے (اقبالؒ کو) کمیونسٹ ثابت کرتے ہیں۔ لیکن یہ ان کی غلط نگہی یا فریب انگیزی ہے۔ یہ اقبالؒ کے پیش کردہ نظام یا پیغام کا آدھا حصہ ہے۔ اس کے ساتھ اس کا باقی نصف حصہ ملانے سے پیغام اقبالؒ کا صحیح تصور سامنے آسکتا ہے۔ علامہ نے (جاوید نامہ میں) اس غلط نگہی یا فریب کاری کی بڑے لطیف انداز میں پردہ دری کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اسلامی نظام کے ادھورے مطالعہ سے ابوجہل نے بھی یہی کہا تھا کہ جو کچھ رسول (نبیؐ اکرم) مساوات کے نام سے پیش کر رہا ہے، یہ درحقیقت مزدکیت سے مستعار لیا ہوا نظریہ ہے جسے سلمانؓ اپنے ساتھ فارس سے لایا ہے۔ اور یہاں اسے اسلام کے نام سے پیش کیا جا رہا ہے۔ اس نے کہا کہ:-

ایں مساوات، ایں مواخات عجمی است — خوب می دانم کہ سلمانؓ مزدکی است
(جاوید نامہ۔ نوحۂ ابوجہل۔ صہ۵۹)

اس غلط فہمی کو رفع کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم دیکھیں کہ علامہ اقبالؒ نے (قرآن کریم کی روشنی میں) کمیونزم یا اشتراکیت کے متعلق کیا کہا ہے۔ اس سے کمیونسٹوں کی مغالطہ آفرینی اور فریب دہی کا بھانڈا پھوٹ جائے گا۔

کمیونزم کی مخالفت

جب ۱۹۱۷ء میں روس میں کمیونزم کا سیلاب اُمڈا تو اس نے دنیا میں تہلکہ مچا دیا۔ وہ انقلاب تھا بھی بڑا زلزلہ انگیز۔ سطح بین نگاہوں نے اسے محض ایک معاشی نظام سمجھا اور نظام سرمایہ داری کے حامیوں کی طرف سے اس کی مخالفت ہوئی۔ لیکن علامہ اقبالؒ نے گہری نظروں سے اس کا جائزہ لیا۔ اور انہیں ایسا کرنا بھی چاہئے تھا۔ جس انقلاب کا دعویٰ ہو کہ وہ ہر نظامِ کہن کی بساط اُلٹ کر ایک جدید نظام دنیا پر مسلّط کرے گا جس سے غریبوں اور محتاجوں کی دردناک صدائیں ہمیشہ کے لئے خاموش ہو جائیں گی۔ اس کا گہری نظروں سے جائزہ اقبالؒ نہ لیتا تو اور کون لیتا؟ انہوں نے جب اس فلسفۂ حیات پر نگاہ ڈالی جس کی بنیادوں پر اس عظیم معاشی نظام کی عمارت استوار کرنا مقصود تھا تو وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ نظام کبھی کامیاب نہیں ہو سکے گا۔ انہوں نے اپنے ان تأثرات کو (اپنی مثنوی "پس چہ باید کرد" میں) ان الفاظ میں بیان کیا ہے:-

کردہ ام اندر مقاماتش نگہ — لاسلاطیں، لاکلیسا، لا الٰہ

انہوں نے کہا کہ یہ منفیانہ فلسفۂ انسانی زندگی کی اساس نہیں بن سکتا۔ زندگی مثبت بنیادوں پر ہی قائم رہ سکتی ہے:-

در مقامِ لا نیا ساید حیات — سوئے اِلّا می خرامد کائنات

لا و اِلّا برگ و سازِ اُمتاں — نفیِ بے اثبات مرگِ اُمتاں

زندگی خلا میں باقی نہیں رہ سکتی۔ اگر آپ خلا کو پر کرنے کے لئے تعمیری اقدار مہیا نہیں کریں گے تو تخریبی قوتیں وہاں اپنا ڈیرہ جما لیں گی۔ مشہور مغربی فلاسفر لیکانی نے لکھا ہے:-

> انسانی ذہن اپنی فطرت سے مجبور ہے کہ وہ کسی نہ کسی چیز پر ایمان رکھے۔ خلا قدرت کے کارخانے میں محال ہے۔ اور محض مادی دنیا میں نہیں بلکہ اخلاقی اور روحانی دنیا میں بھی خلا ناممکن ہے۔ انسان جب خدا پر ایمان چھوڑ دے تو شیطان کی پرستش کرنے لگتا ہے اور اچھے نصب العینوں سے دکش ہو جائے تو برے راستے اس کو خوش آتے ہیں۔ وہ زندگی جس میں نہ ایمان کی گرمی ہو اور نہ اخلاقی ضابطہ کی کشش، وہ زندگی موت سے بدتر ہوتی ہے۔" (انسان نے کیا سوچا؟ صـ ۳۳۹)

اقبالؒ نے کہا کہ لاسلاطین اور لا کلیسا کی حد تک تو بات ٹھیک ہے کہ یہ دونوں قوتیں تخریبی ہیں۔ اور انسانیت کی بلندی کے راستے میں بری طرح حائل۔ اس لئے ان کا مٹانا ضروری ہے۔ لیکن اگر الٰہِ حقیقی کا بھی انکار کر دیا جائے تو اس سے مستقل اقدارِ خداوندی کا انکار لازم آجاتا ہے اور جب انسانی زندگی میں اقدار کی کارفرمائی نہ رہے تو پھر انسان حیوانوں کی سطح پر آجاتا ہے جس میں "روٹی" کے سوا کوئی مقصدِ حیات نہیں رہتا۔ اقبالؒ نے اس ضمن میں کہا کہ:-

دینِ آں پیغمبرِ حق ناشناس　　　بر مساواتِ شکم دارد اساس
تا اخوت را مقام اندر دل است　　　بیخ او در دل، نہ در آب و گل است　(جاوید نامہ ص ۶۹)

طبیعی (یا حیوانی زندگی) کی مساوات کچھ معنی نہیں رکھتی۔ طبیعی زندگی کی ضروریات کا پورا ہونا بے شک لازمی ہے لیکن حقیقی مساوات شرف و تکریمِ انسانیت میں مضمر ہے۔

برتر از گردوں مقامِ آدم است

اصلِ تہذیب احترامِ آدم است

اور احترامِ آدم مستقل اقدارِ خداوندی کے اتباع سے حاصل ہو سکتا ہے۔ ان اقدار کے انکار سے "حیوانی آدم" تو زندہ رہ سکتا ہے، "انسانی آدم" زندہ نہیں رہ سکتا۔ اسی لئے انہوں نے کہا کہ:-

دل کی آزادی شہنشاہی شکم سامانِ موت　　　فیصلہ تیرا ترے ہاتھوں میں ہے دل یا شکم

(بالِ جبریل۔ ص ۵۱)

جہاں تک سلاطین کا تعلق ہے۔ انہوں نے کہا کہ حکومت کی شکل بدل دینے سے کچھ نہیں ہوتا۔ یورپ نے شہنشاہیت کو ختم کر کے جمہوریت کی طرح ڈالی تو اس سے محض حکومت کی شکل بدلی۔ بعض انسانوں کا دوسرے انسانوں پر حکومت کرنے کا سلسلہ ویسے ہی رہا۔ اگر روس، زار کی شہنشاہیت کو ختم کر کے اس کی جگہ "مزدوروں" کی حکومت قائم کر دے گا تو اس سے انسانیت کش استبداد میں کمی واقع نہیں ہو جائے گی۔

زمامِ کار اگر مزدور کے ہاتھوں میں ہو　　　طریق کوہکن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی

(بالِ جبریل۔ ص ۶۲)

کمیونزم کے فلسفہ اور اس کا اس طرح گہری نظروں سے تجزیہ کرنے کے بعد اقبالؒ نے ملتِ روسیہ کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ:-

تو کہ طرحِ دیگرے انداختی   دل ز دستورِ کہن پرداختی
کردۂ کارِ خداوندان تمام   بگذر از لا، جانبِ الا خرام
در گذر از لا اگر جوینده ٔ   نارہ اثبات گیری زندۂ
اے کہ مے خواہی نظامِ عالمے
جستۂ او را اساس محکمے

"اساسِ محکم" کا ذکر کرتے ہوئے اقبالؒ نے کارل مارکس کی ایک بنیادی معذوری کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اس نے کہا تھا کہ نوعِ انسانی کی مشکلات کا حل اسی معاشی نظام میں مضمر ہے۔ جس میں:-

"ہر فرد اپنی استعداد کے مطابق کام کرے اور ہر ایک کو اس کی ضرورت کے مطابق ملے"۔

مارکس کے رفقاء نے کہا کہ یہ بہت بڑا انقلابی دعویٰ ہے۔ اسے آپ عملاً متشکل کیجئے۔ اس پر مارکس نے کہا کہ میں اس سے معذور ہوں۔ انسانی مشکلات کا حل تو وہی ہے جسے میں نے پیش کیا ہے لیکن میں ابھی تک سمجھ نہیں سکا کہ وہ جذبۂ محرکہ کیا ہوگا جس کی رُو سے ایک شخص جان مار کر دن رات محنت کرے اور اس کے ماحصل میں سے اپنے لئے صرف اتنا لے جتنے کی اسے ضرورت ہے اور باقی سب دوسروں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے دے دے۔ جب تک مجھے اس جذبۂ محرکہ کا علم نہ ہو جائے میں اس کے لئے عملی قدم اٹھانے کے لئے تیار نہیں، کیونکہ اس کے بغیر اس نظام کا قیام ناممکن ہے۔ اس کی پارٹی میں کافی عرصہ تک یہ بحث جاری رہی لیکن جب وہ کسی صورت میں بھی عملی اقدام کے لئے تیار نہ ہوا تو اس کی پارٹی کے کئی ممبر دل برداشتہ ہو کر اس سے علیحدہ ہو گئے۔ اس نے ان سے کہا کہ تم اس اختلاف کی وجہ سے مجھ سے الگ ہوتے ہو تو ہو جاؤ۔ لیکن میں تمہاری رضاجوئی کی خاطر ایسا قدم اٹھانے کے لئے تیار نہیں جسے میں ممکن العمل نہیں سمجھتا۔ ایسا کرنا منافقت ہوگا۔

یہ ہے وہ جذبۂ محرکہ جسے اقبالؒ نے اس قسم کے نظام کے لئے اساسِ محکم قرار دیا اور اس سلسلے میں روس سے کہا۔

داستانِ کہنہ شستی باب باب   فکر را روشن کن از اُمّ الکتاب

کیا اس کے بعد کوئی شخص اقبالؒ کو کمیونسٹ کہہ سکتا ہے؟ اقبالؒ نے کمیونزم کے معاشی نظام اور اس کے فلسفۂ زندگی کو الگ الگ کر کے دونوں پر تبصرہ کیا اور اسی لحاظ سے مارکس کے قلب اور دماغ کا بھی الگ الگ تجزیہ کیا۔ اس نے کہا کہ مارکس نے نوعِ انسان کی معاشی مشکلات کا جو حل تجویز کیا ہے وہ مبنی برحقیقت ہے۔

قرآن کریم نے یہی حل بتایا تھا اور اسلام کے صدرِ اوّل میں اسے عملاً متشکّل کر کے دکھایا گیا تھا۔ لیکن اس کا (مارکس کا) فلسفۂ حیات جو مستقل اقدارِ خداوندی کے انکار پر متفرع ہے یکسر باطل ہے۔ چنانچہ وہ مارکس کی زندگی کے گوشۂ اوّل کی بڑی تعریف کرتا ہے۔ لیکن اس کے دوسرے گوشے کی بنا پر اس کی تردید بھی اسی شدّت کے ساتھ کرتا ہے چنانچہ وہ کہتا ہے :۔

صاحبِ سرمایہ، از نسلِ خلیل! یعنی آں پیغمبرِ بے جبرئیل

مارکس کی بنیادی کتاب کا نام "سرمایہ" (DAS CAPITAL) ہے اور چونکہ وہ یہودی تھا۔ اس لئے اسے "از نسلِ خلیل" کہا گیا ہے اور "پیغمبرِ بے جبرئیل" کہہ کر اس کے پیغام کے دونوں گوشوں کو جسطرح منعکس کیا گیا ہے اس کی داد صاحبِ نظر ہی دے سکتے ہیں۔ اسی تجزیہ کو انہوں نے ارمغانِ حجاز میں ابلیس کے مشیر کی زبان سے ان الفاظ میں پیش کیا ہے۔

وہ کلیمِ بے تجلّی، وہ مسیحِ بے صلیب نیست پیغمبر ولیکن در بغل دارد کتاب

اور ذیل کے شعر میں انہوں نے ان "متشابہات" کو "محکمات" کے پیکر میں پیش کر دیا ہے۔ جہاں کہا ہے کہ :۔

زانکہ حق در باطلِ او مضمر است قلبِ او مومن دماغش کافر است

کس قدر برجستہ اور بلیغ ہے یہ تجزیہ جس کی رُو سے کہا گیا ہے کہ، اس کا قلب درد آگیں مفلسوں، محتاجوں، مزدوروں، محنت کشوں کے مسائل کے احساس سے وقفِ اضطراب تھا۔ اس لئے اس کا قلب مومن تھا لیکن اس نے، وحی کی روشنی سے محروم رہ جانے کی بنا پر جو فلسفۂ حیات پیش کیا وہ یکسر باطل ہے۔ مارکس (یا کمیونزم) کی بے بصری پر اقبالؒ کا دل کڑھتا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ وحی کی اساسِ محکم موجود نہ ہونے کی وجہ سے اس قدر عظیم انقلاب نہ صرف ناکام رہ جائے گا بلکہ فسادِ انسانیت کا موجب بن جائے گا۔ وہ ہزار جان سے چاہتا تھا کہ اس انقلاب کے داعی اپنے فلسفۂ حیات کے لئے قرآن سے راہ نمائی حاصل کریں تاکہ یہ معاشی انقلاب موجبِ تعمیرِ انسانیت ہو جائے۔ اس سے یہ معاشی نظام قرآنی نظام کے مماثل ہو جائے گا۔ اس ضمن میں انہوں نے سر فرانسس ینگ ہسبنڈ کو ۱۹۳۱ء میں لکھا تھا :۔

"بالشویزم کے ساتھ اگر خدا کو ملا دیا جائے تو یہ نظام اسلامی نظام کے مماثل ہو سکتا ہے"۔

علامہ اقبالؒ نے اپنی تنقید میں صرف روس کو مخاطب کیا ہے، چین کا ذکر نہیں کیا۔ یہ اس لئے کہ ان کی زندگی میں چین، کمیونسٹ مملکت کی حیثیت سے اُبھرا نہیں تھا۔ لیکن علامہ کی تنقید، کمیونزم کے خلاف ہے۔ وہ کسی ملک میں بھی کارفرما کیوں نہ ہو۔ یہ حیثیت قابلِ غور ہے کہ انہوں نے جو کہا تھا کہ کسی محکم بنیاد کے نہ ہونے کی وجہ سے یہ نظام کامیاب نہیں ہوسکے گا۔ ان کی یہ "پیش گوئی" حرف بحرف صحیح ثابت ہوئی۔ روس نے تو پھر بھی ناکام ہونے کے لیے کچھ عرصہ لیا۔ چین کا نظام ماؤزے تنگ کی شخصیت کے ساتھ وابستہ تھا۔ اس کی وفات کے ساتھ ہی اس بظاہر فلک بوس عمارت کی اینٹیں ایک ایک کر کے گرنی شروع ہوگئیں اور اب وہ تھوڑے عرصہ کی مہمان نظر آتی ہیں۔ سچ کہا تھا حضرت علامہؒ نے انسانیت 'لا' کے خلا میں زندہ نہیں رہ سکتی! اے کاش! اس وقت دنیا میں کہیں قرآن کے اِلّا کا نظام قائم ہوتا تو اس کے عالمگیر ہونے کے لئے فضا بڑی سازگار تھی۔ لیکن اس میں مایوس ہونے کی کوئی بات نہیں۔ نظامِ سرمایہ داری کی ناکامی کے بعد، نظامِ کمیونزم کا ناکام تجربہ، انسانیت کو قرآن کے اِلّا کی طرف آنے کے لئے مجبور کر دے گا۔ قُلِ الْعَفْوَ کا دور آکر رہے گا۔

ان تصریحات سے علامہ اقبالؒ کے مسلک کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ وہ مارکسزم کے معاشی نظام کو قرآن کے معاشی نظام کے مماثل سمجھتے تھے لیکن اس کے فلسفۂ حیات کو یکسر کفر۔ اور چونکہ کمیونزم میں اس کے فلسفۂ حیات کو اس کے معاشی نظام سے الگ نہیں کیا جاسکتا اس لئے کمیونزم ان کے نزدیک کبھی قابلِ قبول نہیں ہوسکتا تھا۔ انہوں نے کھلے لفظوں میں اس کی وضاحت بہت پہلے کر دی تھی۔ بات یوں ہوئی کہ جب انہوں نے بانگِ درا اور پیامِ مشرق میں، نظامِ سرمایہ داری کے خلاف لکھا تو ایک صاحب، شمس الدین حسن نے، جو کمیونزم کے بہت بڑے حامی (اور ہفتہ وار اخبار، انقلاب اور خاور کے ایڈیٹر رہ چکے تھے۔) روزنامہ زمیندار (لاہور) کی اشاعت بابت ۲۳ جون ۱۹۲۳ء میں ایک مضمون لکھا:-

"بالشویک خیالات کا حامی ہونا جرم ہے تو پھر ہمارے ملک کا سب سے بڑا شاعر، اقبالؒ، قانون کی زد سے کس طرح بچ سکتا ہے۔ بالشوزم، کارل مارکس کے فلسفۂ سیاسیات کا لُبِّ لباب ہے اور اسی کو عام فہم زبان میں سوشلزم اور کمیونزم کہا جاتا ہے۔ اقبالؒ کی نظم ——— خضرِ راہ ——— اور ان کے مجموعۂ کلام، پیامِ مشرق، کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ، ایک اشتراکی ہی نہیں بلکہ اشتراکیت کے مبلغِ اعلیٰ ہیں۔"

اس کے جواب میں حضرت علامہؒ کا ، ۲۴ ؍ جون ۱۹۲۳ء کے زمیندار میں خط شائع ہوا جس میں انہوں نے تحریر فرمایا کہ :-

۱- میرے افکار کو بالشوزم سے منسوب کرنا غلط ہے ۔ بالشویک خیالات رکھنا میرے نزدیک دائرۂ اسلام سے خارج ہو جانے کے مترادف ہے ۔

۲- میں مسلمان ہوں اور میرا عقیدہ ہے کہ انسانی جماعتوں کے اقتصادی امراض کا بہترین حل قرآن مجید نے تجویز کیا ہے ۔

۳- روسی بالشوزم یورپ کی ناعاقبت اندیش اور خود غرض سرمایہ داری کے خلاف ایک زبردست ردّعمل ہے ۔ لیکن مغرب کی سرمایہ داری اور روس کا بالشوزم دونوں افراط و تفریط کا نتیجہ ہیں ۔ اعتدال کی راہ وہی ہے جو قرآن نے ہم کو بتائی ہے ۔

(بحوالہ ۔ اقبالؒ اور قرآن جلد ۱ صفحہ ۱۹)

اس کے بعد انہوں نے ، ۱۹۳۶ء میں ، خواجہ غلام السیدین کے نام ایک خط میں لکھا :-

" سوشلزم کے معترف ہر جگہ روحانیت اور مذہب کے خلاف ہیں ۔ اور اسے افیون تصور کرتے ہیں ۔ لفظ افیون اس ضمن میں سب سے پہلے کارل مارکس نے استعمال کیا تھا ۔ میں مسلمان ہوں اور انشاء اللہ مسلمان مروں گا ۔ میرے نزدیک تاریخ انسانی کی مادی تعبیر سراسر غلط ہے ۔ روحانیت کا میں قائل ہوں ۔ مگر روحانیت کے قرآنی مفہوم کا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جو روحانیت میرے نزدیک مغضب یعنی افیونی خواص رکھتی ہے ۔ اس کی تردید میں نے جا بجا کی ہے ۔ باقی رہا سوشلزم ۔ سو اسلام خود ایک قسم کا سوشلزم ہے جس سے مسلمان سوسائٹی نے بہت کم فائدہ اٹھایا ہے ۔ "

(مکاتیبِ اقبالؒ)

اس سے سوشلزم اور اسلام کا فرق نمایاں ہو جاتا ہے اور یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ سوشلزم کا فلسفۂ حیات ماننے والا ، مسلمان نہیں ہو سکتا ۔

انہوں نے اپنی وفات سے ایک سال پہلے ، قائداعظمؒ کے نام ایک خط میں لکھا تھا کہ :-

" شریعتِ اسلامیہ کے طویل و عمیق مطالعہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اسلامی قانون

کو معقول طریق پر سمجھا اور نافذ کیا جائے تو ہر شخص کو کم از کم عام معاش کی طرف سے اطمینان ہو سکتا ہے۔ اسلام کے لئے سوشل ڈیماکریسی کی کسی موزوں شکل میں ترویج، جب اسے شریعت کی تائید و موافقت حاصل ہو حقیقت میں کوئی انقلاب نہیں بلکہ اسلام کی حقیقی پاکیزگی کی طرف رجوع کرنا ہوگا"۔

ان حقائق سے واضح ہے کہ علامہ اقبالؒ سوشلزم کے فلسفہ حیات کو اسلام کی نقیض قرار دیتے اور اس کے شدید مخالف تھے اور وہ قرآن کے معاشی نظام کو (جو سوشلزم کے معاشی نظام کے مماثل ہے) نوع انسانی کی مشکلات کا حل قرار دیتے تھے۔ لہٰذا اقبالؒ کو کمیونسٹ کہنا بڑی زیادتی ہے۔

پرویز

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مطالبۂ پاکستان کی اساس

دو قومی نظریہ

(اقبال رح اور قائداعظم رح کی نگاہوں میں)

ذیل کا مقالہ، روزنامہ نوائے وقت کی ۱۱، ۱۲ نومبر ۱۹۸۰ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا۔ اسے پرویز صاحب کی نظرثانی کے بعد، نوائے وقت کے شکریہ کے ساتھ شائع کیا جاتا ہے:۔

---

۱۷ اکتوبر ۱۹۸۰ء کے نوائے وقت میں میرا مبسوط مقالہ شائع ہوا، جس کا عنوان تھا۔ "کیا قائداعظم رح پاکستان کو سیکولر سٹیٹ بنانا چاہتے تھے؟"۔ اس میں ضمناً دو قومی نظریہ کا بھی ذکر آ گیا تھا، لیکن چونکہ میرے زیرِ نظر موضوع دوسرا تھا اس لئے میں اسے چھوتا ہوا آگے بڑھ گیا تھا۔ اس مقالہ کی اشاعت کے بعد مجھے متعدد خطوط موصول ہوئے ہیں، جن میں کہا گیا ہے کہ جس طرح میں نے اسلامک سٹیٹ اور سیکولر سٹیٹ کے فرق کو نکھار اور اُبھار کر بیان کیا ہے اور اس باب میں قائداعظم رح کے خیالات کو شرح و بسط سے پیش کیا ہے۔ اسی طرح "دو قومی نظریہ" کے متعلق بھی مجھے تفصیل سے لکھنا چاہئے اور اس باب میں علامہ اقبال رح اور قائداعظم رح کے نظریات اور مسلک کو وضاحت سے بیان کرنا چاہئے۔ یہ سطور اسی مطالبہ کی تعمیل میں تحریر ہیں۔

جب اس کرۂ ارض پر انسانوں نے پہلے پہل مل جل کر رہنا شروع کیا تو وہ (مختصر ہی سہی) لامحالہ ایک جماعت، ایک گروہ، ایک معاشرہ تھا۔ جس میں کسی قسم کی تفریق اور تقسیم نہیں تھی۔ اس کے بعد ان میں تفریق پیدا ہونی شروع ہوئی۔ قرآن کریم کے الفاظ میں:۔

وَمَا كَانَ النَّاسُ إِلَّآ أُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوا ۚ (۱۰/۱۹)

"ابتداء میں نوعِ انسان ایک ہی اُمت تھی۔ پھر اُن میں اختلافات پیدا ہو گئے۔"

ان اختلافات کو مٹا کر انسانوں کو پھر سے اُمتِ واحدہ بنانے کے لئے انبیاء کرام ع کا سلسلہ شروع ہوا۔

ارشاد ہے۔

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً قف فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ص وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ط (۲/۲۱۳)

"نوع انسان شروع میں ایک ہی اُمّت کے افراد تھے۔ پھر ان میں اختلافات پیدا ہونے شروع ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے مبشّرین اور منذرین انبیاء کرام کا سلسلہ شروع کیا اور ان کے ساتھ ضابطۂ قوانین بھی نازل کیا۔ تاکہ وہ اس کے ذریعہ ان کے اختلافات کو مٹا کر (انہیں پھر سے اُمّتِ واحدہ بنا دیں)"۔

نوعِ انسان کی اُمّتِ واحدہ، سب سے پہلے خاندانوں میں تقسیم ہوئی۔ خاندان بڑھے تو اس تفرق نے قبائل کی شکل اختیار کی۔ قبائل دامن دراز ہوئے تو نسلی امتیازات کی تفریق پیدا ہوگئی۔ اور اب اس دور میں، اس تقسیم نے قومیت کی شکل اختیار کر لی ہے۔ اس تفرق کے لئے کرۂ ارض پر لکیریں کھینچی گئیں اور ان سے مختلف ممالک وجود میں آ گئے۔ اور ایک ملک کی چار دیواری کے اندر بسنے والے انسان ایک قوم کے افراد قرار پا گئے۔ اس طرح خدا کی وسیع و عریض زمین مختلف ملکوں کی حدود میں بٹ گئی اور انسانوں کی عالمگیر برادری نے متعدد قوموں کی شکل اختیار کر لی۔ چنانچہ اب کوئی انسان محض انسان ہونے کی نسبت سے پہچانا نہیں جاتا۔ وہ متعارف ہوتا ہے وطن یا قوم کی نسبت سے۔ اس سے دنیا کس قدر عالمگیر جہنّم کے عذاب میں مبتلا ہے۔ اس کا اندازہ اُس چیخ و پکار سے لگ سکتا ہے جو دنیا (بالخصوص مغرب کے دانشکدوں) سے مسلسل اُٹھ رہی ہے (یہ بہر حال دوسرا موضوع ہے) آپ نے دیکھا کہ یہ تفریق، خون، رنگ، نسل، زبان، وطن کی بنیادوں پر پیدا ہوئی۔ حضرات انبیاء کرام نے (وحیٔ خداوندی کی رُو سے) کہا کہ یہ معیارِ تفریق باطل ہے حقیقی معیارِ تقسیم فکر و نظر (آئیڈیالوجی) کی ہم آہنگی ہے۔ زندگی کا ایک تصور، مستقل اقدارِ خداوندی کی رُو سے متشکل ہوتا ہے۔ جو لوگ اس تصورِ حیات میں ہم آہنگ ہوں وہ رنگ، نسل، زبان اور وطن کے اختلاف کے باوجود ایک برادری کے افراد ہیں۔ جو اس تصور کو تسلیم نہ کریں وہ دوسری برادری کے افراد۔ قرآن کریم میں ہے۔

هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّمِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ ط (۶۴/۲)

"خدا نے تم سب کو پیدا کیا۔ پھر تم میں سے ایک گروہ نے بلند انسانیت کی زندگی سے انکار

کر دیا۔ دوسرے گروہ نے اسے تسلیم کر لیا۔"

اور یوں نوعِ انسان دو گروہوں میں بٹ گئی۔ بلند سطحِ زندگی سے انکار کرنے والوں کو اصطلاح میں کافر کہتے ہیں۔ حقیقی زندگی کے تسلیم کرنے والوں کو مومن۔ کافر کے معنی انکار کرنے والا ہیں اور مومن کے معنی مان لینے والا۔ قرآن کریم کی رُو سے، تفریقِ انسانیت کا یہی معیار ہے۔ جس کے مطابق دنیا میں دو ہی قومیں بستی ہیں۔ مومن اور کافر۔ یا مسلم اور غیر مسلم۔

حضرات انبیاء کرامؑ نے اس معیارِ تفریق کو محض نظری طور پر پیش نہیں کیا۔ اپنی زندگی میں اس پر عمل پیرا ہو کر دکھائی دیا۔ سلسلۂ وحی کا آغاز حضرت نوحؑ سے ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں ہے کہ جب ان کے زمانے میں، ان کی اپنی قوم میں، اس معیار کے مطابق تفریق پیدا ہوئی تو حضرت نوحؑ ایک طرف تھے اور ان کا حقیقی بیٹا دوسری طرف، کیونکہ وہ مبنی بر وحی نظریۂ حیات میں ان سے ہم آہنگ نہیں تھا۔ اسی طرح جب حضرت ابراہیمؑ کے باپ نے اس صحیح روشِ زندگی کو اختیار کرنے سے انکار کر دیا تو آپ نے نہ صرف باپ سے بلکہ پوری قوم سے یہ کہہ کر قطع تعلق کر لیا کہ:

وَاَعۡتَزِلُكُمۡ وَمَا تَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ (۱۹/۴۸)

"میں تم سے اور جنہیں تم خدا کے سوا پکارتے ہو ان سب سے الگ ہوتا ہوں۔"

اور اتنا ہی نہیں، بلکہ ان سے کہہ دیا کہ:

اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنۡكُمۡ وَمِمَّا تَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ۔۔۔

"ہم تم سے اور ان سے جن کی تم خدا کو چھوڑ کر عبودیت اختیار کئے ہو ان سب سے یکسر بے تعلق ہیں۔"

كَفَرۡنَا بِكُمۡ۔ "ہم تم سے ہر رشتے کا انکار کرتے اور بیزاری کا اعلان کرتے ہیں۔" وَبَدَا بَيۡنَنَا وَ بَيۡنَكُمُ الۡعَدَاوَةُ وَالۡبَغۡضَآءُ اَبَدًا۔ "تم میں اور ہم میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کھلی عداوت اور نفرت رہے گی۔ اگر تم چاہتے ہو کہ ہم سے تعلق پیدا کرو، اور یہ عداوت محبت سے اور یہ نفرت رفاقت میں بدل جائے تو اس کا ایک ہی طریق ہے، اور وہ یہ کہ تم بھی اس راستے کی سچائی پر یقین کر لو جو اللہ نے ہم سب کے لئے مقرر کیا ہے۔ حَتّٰى تُؤۡمِنُوۡا بِاللّٰهِ وَحۡدَهٗۤ (۶۰/۴)" اس لئے کہ اس عالمگیر اصولِ زندگی کی رُو سے اپنوں اور بیگانوں کا معیار، خون یا وطن کا رشتہ نہیں۔ معیار یہ ہے کہ فَمَنۡ تَبِعَنِىۡ فَاِنَّهٗ مِنِّىۡ (۱۴/۳۶) "جو شخص میرے پیچھے

پیچھے چلتا ہے (وہ کسی قبیلہ کا فرد اور کسی وطن کا باشندہ ہو) وہ میرے اپنوں میں سے ہے" اور میرے "اپنے" جو کسی دوسری راہ پر چلتے ہیں وہ میرے لئے غیر ہیں۔ یہی تھا وہ معیار جس کے مطابق حضرت لوطؑ کی بیوی کے متعلق کہہ دیا گیا کہ وہ بھی اپنوں میں سے نہیں بلکہ غیروں میں سے تھی اس لئے اس کا حشر انہی کے ساتھ ہوا۔ (۱۱/۸۱) قومیت کی تقسیم و تفریق کا یہی معیار تھا جو نوعِ انسانی کی وسعتوں کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتا چلا گیا۔ تا آنکہ دنیا کے سامنے وہ دور آگیا جب وحی کی تکمیل ہوگئی۔ اور اس کے مطابق نبی اکرمؐ کے مقدس ہاتھوں، ایک ایسی قوم کی تشکیل ہوئی جس نے ساری دنیا پر روزِ روشن کی طرح واضح کر دیا کہ قومیت کا صحیح معیار کیا ہے۔ اس تشکیل

قومِ رسولؐ ہاشمی

قومیت کے مطابق حبش کا بلال۔ فارس کا سلمان۔ اور روم کا صہیب (رضی اللہ تعالیٰ عنہم) محمدؐ عربی کی "اپنی قوم" کے افراد تھے اور مکہ کا ابوجہل اور حقیقی چچا ابولہب "غیر قوم" کے افراد۔ قومیت کی اس تقسیم کا عملی مظاہرہ بدر کے میدان میں نکھر کر سامنے آگیا جب آسمان کی آنکھ نے یہ نظارہ دیکھا کہ حضرت ابوبکرؓ ایک طرف تھے اور ان کا بیٹا دوسری طرف۔ حضرت حذیفہؓ ادھر تھے تو ان کا باپ عتبہ دوسری طرف، حضرت عمرؓ اس طرف تھے تو ان کا ماموں اس طرف۔ حضرت علیؓ ادھر تھے تو ان کا بھائی عقیل اُدھر۔ نہیں! اور آگے بڑھئے۔ ادھر خود محمدؐ تھے تو اُن کے مدِ مقابل آپؐ کے حقیقی چچا عباس اور داماد ابوالعاص۔ یہ تھی وہ تقسیمِ انسانیت، جو وطن، رنگ، زبان، نسل، رشتہ داری کے تمام حدود و ثغور سے بلند ہو کر، خالص ایمان اور کفر کے معیار پر وجود میں آئی تھی۔ یہ تھی وہ اُمتِ محمدیہ یہ وہ ملتِ اسلامیہ۔ وہ جماعتِ مومنین جو دنیا کے مختلف حصوں کے اُن انسانوں پر مشتمل تھی جن میں وجہِ اشتراک صرف ایمان تھا یہی تھی وہ تقسیم جس کے متعلق کہہ دیا کہ مومنین کی جماعت کے افراد بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ (۹/۷۱) "ایک دوسرے کے دوست اور چارہ ساز ہیں" اور ان کے مقابلہ میں، نہ ماننے والوں (کفار) کی قوم، بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ (۸/۷۳) "ایک دوسرے کے دوست اور چارہ ساز" اس کے بعد اس قومِ مومنین کو تاکید کر دی کہ:۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا بِطَانَةً مِّن دُونِكُمْ

"اے جماعتِ مومنین! تم اپنے سوا اور کسی کو اپنے رازوں میں شریک نہ کرو۔"

اس لئے کہ لَا يَأْلُونَكُمْ خَبَالًا "یہ تمہاری تخریب میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھیں گے۔" وَدُّوا مَا عَنِتُّمْ ... "ان کی دلی خواہش یہ ہے کہ تم کسی نہ کسی مصیبت میں اُلجھے رہو۔" قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَاءُ

مِنْ اَفْوَاهِهِمْ وَمَا تُخْفِيْ صُدُوْرُهُمْ اَكْبَرُ ط " ان کے بغض وعداوت کی بعض باتیں تو اُن کے منہ پر آجاتی ہیں۔ لیکن جو کچھ ان کے دلوں میں چھپا رہتا ہے وہ اس سے کہیں زیادہ ہوتا ہے۔" قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ (۳/۱۱۷) " ہم نے تمہیں واضح طور پر ان امور سے آگاہ کر دیا ہے اگر تم عقل و فکر سے کام لوگے (تو زندگی کے صحیح راستے پر چلتے جاؤ گے)۔ ان نہ ماننے والوں کی حالت یہ ہے کہ اِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ " اگر کوئی بات تمہاری بھلائی کی ہوتی ہے تو اس سے انہیں سخت رنج پہنچتا ہے۔" وَاِنْ تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَّفْرَحُوْا بِهَا ط (۳/۱۱۹) " اور اگر تمہیں کچھ نقصان پہنچتا ہے تو یہ چیز ان کے لئے بڑی خوشی کا موجب ہوتی ہے[1]

یہ ہے قرآن کی تعلیم مسلم اور غیر مسلم کے باہمی تعلقات کی بابت۔ پھر چونکہ یہ قوم (مومنین) خانقاہ نشین راہبوں کی جماعت یا تارک الدنیا زاہدوں کا گروہ نہیں تھی، بلکہ وہ قوم تھی جس کے دین کے متمکن (ESTABLISH) ہونے کے لئے حکومت لاینفک تھی (دیکھئے ۲۴/۵۵) اس لئے ان سے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ، تم نے اپنی حکومت میں تمام فیصلے احکام خداوندی کے مطابق کرنے ہیں: فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ۔ (۵/۴۸) جو ایسا نہیں کرے گا وہ مومن نہیں کافر ہے۔ (۵/۴۴) قرآن کے ان اصولوں کی روشنی میں تمہیں جو فرعی قوانین مرتب کرنے پڑیں، انہیں آپس میں ایک دوسرے کے مشورے سے طے کیا کرو۔ (وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ۔ ۴۲/۳۸) ان میں کسی غیر کو شریک نہ کیا کرو۔ جو ان مستقل اقدار کی صداقت پر یقین ہی نہیں رکھتا وہ تمہارے امورِ مملکت میں شریک و دخیل کیسے ہو سکتا ہے؟ چنانچہ آپ کو نہ رسول اللہ کی مجلسِ شوریٰ میں کوئی غیر مومن دکھائی دے گا

نہ خلفائے راشدینؓ کی پارلیمان میں کوئی غیر مسلم۔ ان کی حکومت خالصتاً جماعت مومنین پر مشتمل تھی اور غیر مسلم اس مملکت میں ایک ایسی اقلیت کی حیثیت سے رہتے تھے جن کی حفاظت کی ذمہ داری ان کے سر پر تھی۔ وہ "قوم مسلم" کے افراد نہیں تھے۔

---

[1] عدم گنجائش کے باعث یہاں صرف اہم آیات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ مزید آیات کے لئے دیکھئے۔

۳/۲۸، ۴/۱۳۹، ۴/۸۹، ۴/۱۴۴، ۵/۵۵، ۸/۸۳، ۹/۱۰، ۵۸/۲۲، ۶۰/۱۱-۱۰

صدرِ اوّل کے بعد

اسلام کے صدرِ اوّل کے بعد، جب دین، مذہب میں بدل گیا تو اس کے دیگر مہمات اصول کی طرح قومیت کا یہ نظریہ بھی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا اور مسلمان بھی، دیگر قوموں کی طرح، نسل اور وطن کی تفریق سے مختلف قوموں میں بٹ گئے۔ صدیوں سے ہماری یہی حالت چلی آرہی تھی کہ ہم میں اقبالؒ جیسا مفکر پیدا ہو گیا جس نے اپنی قرآنی بصیرت کی رُو سے (دین کی دیگر اساسات کی طرح) اس فراموش کردہ حقیقت کی بھی از سرِ نو یاد دہانی کرائی کہ اُمتِ محمدیہ کا نسلوں اور وطنوں کی تفریق سے مختلف قوموں میں بٹ جانا، اسلام کی بنیادی حقیقت کے خلاف ہے۔ یہ پوری اُمت، ایمان کے اشتراک کی بناء پر اُمتِ واحدہ ہے۔ فکرِ اقبالؒ کے عام ہو جانے کی وجہ سے آج ہمارے لئے یہ سمجھنا کہ اسلامی قومیت کا یہی معیار ہے، چنداں تعجب انگیز نہیں، لیکن خود اقبالؒ کا اس قرآنی حقیقت تک پہنچنا بڑا تعجب انگیز تھا۔ وہ ۱۹۰۵ء میں (جب اس کی عمر تیس بتیس سال سے زیادہ نہ تھی) حصولِ تعلیم کے لئے یورپ گیا اور تین سال تک وہاں رہا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اقوامِ یورپ میں نیشنلزم کی مدح و ستائش کے غلغلے بلند ہو رہے تھے۔ دانایانِ مغرب اس نظام کو نوعِ انسان کی مشکلات کا مداوا قرار دے رہے تھے۔ چاروں طرف سے اس کی بارگاہ میں تبریک و تہنیت کے تحائف پیش کئے جا رہے تھے۔ ان حالات میں ایک ایسے نوجوان طالب علم کا جو پہلے ہی سے نیشنلزم سے متأثرہ ذہن لے کر یورپ گیا ہو، متشدد نیشنلسٹ ہو جانا چاہیے تھا۔ لیکن مؤرخ کی نگاہ یہ دیکھ کر محوِ حیرت رہ جاتی ہے کہ اس طالب علم کے قلب و نگاہ میں ایک عجیب انقلاب رُونما ہوا۔ وہ گیا تھا تو یہ کہتے ہوئے کہ ؎

ہندی ہیں ہم، وطن ہے ہندوستاں ہمارا

اور واپس آیا تو یہ گاتا ہوا کہ :-

چین و عرب ہمارا، ہندوستاں ہمارا
مسلم ہیں ہم، وطن ہے سارا جہاں ہمارا

وہ گیا تھا تو یہ گنگناتا ہوا کہ ؎

خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرّہ دیوتا ہے!

اور وہ واپس آیا تو یہ الاپتا ہوا کہ ؎

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

وہ گیا تھا تو یہ سندیش دیتا ہوا کہ ؎

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

اور آیا تو یہ اعلان کرتا ہوا کہ ؎

نرالا سارے جہاں سے اس کو عرب کے معمار نے بنایا
بنا ہمارے حصارِ ملت کی اتحادِ وطن نہیں ہے

چونکہ یہ نظریہ اسلامی نظامِ زندگی کی اصل اور بنیاد تھا، اس لئے علامہؒ نے اس کی تبلیغ کو اپنی زندگی کا مشن قرار دے لیا۔ وہ اسے کس شدومد سے پیش کرتے تھے، اس کا اندازہ اس نظم سے لگائیے جو "بانگِ درا" میں "وطنیت" کے عنوان سے درج ہے۔ اس میں وہ کہتے ہیں ؎

اس دور میں مے اور ہے جام اور ہے جم اور ساقی نے بنا کی روشِ لطف و ستم اور
مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور تہذیب کے آذر نے ترشوائے صنم اور
ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے
یہ بُت کہ تراشیدۂ تہذیبِ نوی ہے غارت گرِ کاشانۂ دینِ نبویؐ ہے
بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے اسلام ترا دیس ہے، تو مصطفویؐ ہے
نظارۂ دیرینہ زمانے کو دکھا دے
اے مصطفویؐ! خاک میں اس بُت کو ملا دے

اس نظریہ کی مخالفت

میں نے اپنے مقالہ (شائع شدہ نوائے وقت بابت ۷ر اکتوبر ۱۹۸۰ء) میں بتایا تھا کہ جب قائدِاعظمؒ نے سیکولر سٹیٹ کے خلاف اسلامی مملکت کا نظریہ پیش کیا تو اس کی سب سے زیادہ مخالفت نیشنلسٹ علماء کی طرف سے ہوئی تھی۔ اسی طرح اقبالؒ کے پیش کردہ نظریۂ قومیت کی شدید ترین مخالفت بھی انہی کی

طرف سے ہوئی۔ اس کا ٹیپ کا بند اُن کی وہ بحث ہے جو (مولانا) حسین احمد مدنی (مرحوم) کے ساتھ ہوئی۔

شروع ۱۹۳۸ء کی بات ہے۔ مولانا مرحوم نے دہلی کے ایک جلسۂ عام میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ـــ "قومیتیں" اوطان سے بنتی ہیں، مذہب سے نہیں"۔ ہندوستان کے سب سے بڑے دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث کی طرف سے اس قسم کا اعلان، کوئی ایسا حادثہ نہیں تھا جسے آسانی سے برداشت کیا جاسکتا۔ علامہ اقبالؒ اس زمانے میں یوں کہیے کہ مرض الموت میں مبتلا تھے۔ جب انہوں نے اس خلافِ اسلام نعرہ کو سُنا تو ان کے دلِ صد چاک سے ایک آہ اُبھری، جو ان الفاظ کی شکل میں، فضا کو چیرتی ہوئی آں سوئے افلاک تک جا پہنچی کہ :-

عجم ہنوز نداند رموزِ دیں ورنہ ز دیوبند حسین احمدؐ ایں چہ بوالعجبی است

سرود بر سرِ منبر کہ ملّت از وطن است چہ بے خبر ز مقامِ محمدؐ عربی است

مصطفےٰؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست

اگر باو نرسیدی تمام بولہبی است

ان اشعار میں "مصطفےٰ برساں خویش را" کے الفاظ گہرے غور و فکر کے متقاضی اور ایک عظیم حقیقت کے عکاس ہیں۔ دین خدا کی طرف سے ملتا ہے، لیکن اُمت کی تشکیل اس رسُول کی نسبت سے ہوتی ہے جو اس دین کو انسانوں تک پہنچاتا اور اس کے مطابق ایک معاشرہ کی تشکیل کرتا ہے۔ اسی نسبت سے اسلام کے پیرو، اُمتِ محمدیہؐ کہلاتے ہیں۔ اگر قومیت کی اساس وطن یا نسل قرار پا جائے تو رسولؐ سے نسبت ختم ہو جاتی، اور جب رسولؐ سے نسبت منقطع ہو جائے تو پھر اسلام بھی باقی نہیں رہتا۔

اِنَّ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِيْ شَيْءٍ (۶/۱۵۹)

"جو لوگ اپنے دین میں تفرقہ پیدا کر لیں اور اس طرح الگ الگ فرقے، پارٹیاں، قومیں بن جائیں اے رسولؐ! تیرا ان سے کوئی واسطہ نہیں"۔

یعنی اگر قومیت کی اساس، اسلام کی طرف نسبت کے بجائے کوئی اور قرار دے لی جائے تو ایسے لوگوں کا رسولؐ سے تعلق منقطع ہو جاتا ہے۔ اسی بنا پر، علامہ اقبالؒ نے کہا کہ وطن کو قومیت کی اساس قرار دینے سے، رسول اللہؐ سے رشتہ منقطع ہو جاتا ہے۔ اگر تم مسلمان رہنا چاہتے ہو تو اپنی قومیت کی نسبت، وطن کے بجائے حضور نبی اکرمؐ کی طرف کرو۔ مصطفےٰؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست ـــ اگر باو نرسیدی

اگر تم نے اپنی نسبت حضورؐ کی طرف نہ کی تو ــــ تمام بوالہبی است ۔ پھر دین باقی نہیں رہتا ۔ بولہبی رہ جاتی ہے جس میں قومیت کی نسبت وطن یا نسل کی طرف کی جاتی ہے ۔ اس اصولی حقیقت کی وضاحت کرتے ہوئے علامہؒ نے کہا :۔

"اگر وطنیت کا جذبہ ایسا ہی قابلِ قدر اور اہم تھا تو رسول اللہؐ کے بعض اقارب ، ہم نسلوں اور ہم قوموں کو آپ سے پرخاش کیوں ہوئی ۔ کیوں نہ رسول اللہؐ نے اسلام کو ایک ہمہ گیر ملت سمجھ کر بلحاظِ قوم یا قومیت ، ابوجہل اور ابولہب کو اپنائے رکھا اور ان کی دلجوئی کرتے رہے ۔ بلکہ کیوں نہ عرب کے سیاسی امور میں ان کے ساتھ قومیت وطنی قائم رکھی ... ۔ محمدؐ (فداہ ابی و امی) کی قوم آپ کی بعثت سے پہلے ایک قوم تھی اور آزاد تھی ، لیکن جب محمدؐ کی اُمت بننے لگی تو اب قوم کی حیثیت ثانوی رہ گئی ۔ جو لوگ رسول اللہؐ کی متابعت میں آگئے وہ خواہ ان کی قوم میں سے تھے یا دیگر اقوام سے ، وہ سب اُمتِ مسلمہ یا ملتِ محمدیہؐ بن گئے ۔ پہلے وہ ملک و نسب کے گرفتار تھے ، اب " ملک و نسب" ان کا گرفتار ہو گیا ۔

کسے کو پنجہ زد ملک و نسب را ۔۔۔ نہ داند نکتۂ دینِ عرب را !

اگر قوم از وطن بودے ، محمدؐ ۔۔۔ ندادے دعوتِ دیں بولہب را !

حضور رسالت مآبؐ کے لئے یہ راہ بہت آسان تھی کہ آپ بولہب یا بوجہل یا کفارِ مکہ سے فرماتے کہ تم اپنی بت پرستی پر قائم رہو ، ہم اپنی خدا پرستی پر قائم رہتے ہیں ۔ مگر اس نسلی اور وطنی اشتراک کی بناء پر جو ہمارے اور تمہارے درمیان موجود ہے ، ایک وحدتِ عربیہ قائم کی جا سکتی ہے ۔ لیکن اگر حضورؐ (نعوذ باللہ) یہ راہ اختیار کرتے تو اس میں شک نہیں کہ یہ ایک وطن دوست کی راہ ہوتی ۔ نبیٔ آخر الزماںؐ کی راہ نہ ہوتی ۔

آپ نے غور فرمایا کہ علامہ اقبالؒ نے اپنے اس بیان میں اسلامی نظریۂ قومیت کو کس قدر اُبھار کر اور نکھار کر بیان کر دیا ہے ۔ لیکن ابھی تک اس نظریہ کا ایک رُخ باقی ہے ۔ جیسا کہ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں ، دین تو خدا کی طرف سے ملتا ہے لیکن اُمت کی تشکیل اس نبیؐ کی طرف نسبت سے ہوتی ہے جس کی وساطت سے وہ دین ہم تک پہنچا ہے ۔ میں اس حقیقت کو اس سے پہلے بھی متعدد بار واضح کر چکا ہوں ۔ لیکن موضوع کی اہمیت کے پیشِ نظر ۔ اسے آج پھر دہرانا ضروری سمجھتا ہوں کہ اُمت کی یہ تشکیل اس رسولؐ کی طرف نسبت

سے ہوتی ہے جسے سلسلۂ انبیاء کی آخری کڑی تسلیم کیا جائے۔ مثلاً ایک عیسائی، حضرت عیسےٰؑ اور ان سے پہلے کے جملہ انبیائے بنی اسرائیل پر ایمان رکھتا ہے۔ لیکن چونکہ وہ حضرت عیسےٰؑ کو اس سلسلہ کی آخری کڑی سمجھتا ہے، یعنی نبوت کو حضرت عیسےٰؑ کی ذات پر ختم قرار دیتا ہے، اس لئے وہ اُمتِ حضرت عیسےٰؑ کا فرد (یعنی عیسائی) کہلاتا ہے۔ لیکن جونہی وہ حضرت عیسےٰؑ کے بعد ایک اور نبی (یعنی محمدؐ رسول اللہ) پر ایمان لے آتا ہے، وہ اُمتِ عیسویؑ سے کٹ کر ایک نئی اُمت یعنی اُمتِ محمدیہؐ کا فرد بن جاتا ہے۔ اسی اصول کی رُو سے، اگر کوئی شخص، محمدؐ رسول اللہ کے بعد کسی اور نبی پر ایمان لے آتا ہے تو وہ اُمتِ محمدیہؐ سے کٹ کر ایک نئی اُمت کا فرد قرار پاجاتا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے اپنے بیان میں اس حقیقت کو بھی واضح کر دیا کہ جس طرح رسولؐ اللہ کے بعد کسی کو نبی تسلیم کرنے والے کا رشتہ، اُمتِ محمدیہ سے کٹ جاتا ہے، اسی طرح وطن یا نسل کو قومیت کی اساس قرار دینے سے بھی اُمتِ محمدیہ کے ساتھ رشتہ باقی نہیں رہتا۔

انہوں نے کہا ہے کہ:۔

"حقیقت یہ ہے کہ مولانا حسین احمدؒ مدنی یا ان کے دیگر ہم خیالوں کے افکار میں نظریۂ وطنیت ایک معنی میں وہی حیثیت رکھتا ہے جو قادیانی افکار میں "انکارِ خاتمیت" کا نظریہ۔ وطنیت کے حامی بالفاظِ دیگر یہ کہتے ہیں کہ اُمتِ مسلمہ کے لئے ضروری ہے کہ وقت کی مجبوریوں کے سامنے ہتھیار ڈال کر اپنی اس حیثیت کے علاوہ جس کو قانونِ الٰہی ابدالآباد تک متعین ومتشکل کر چکا ہے، کوئی اور حیثیت بھی اختیار کر لے جس طرح قادیانی نظریہ، ایک جدید نبوت کی اختراع سے قادیانی افکار کو ایسی راہ پر ڈال دیتا ہے کہ اس کی انتہا نبوتِ محمدیہؐ کے کامل واکمل ہونے سے انکار ہے۔ بعینہٖ اسی طرح وطنیت کا نظریہ بھی اُمتِ مسلمہ کی بنیادی سیاست کے کامل ہونے سے انکار کی راہ کھولتا ہے۔"

آپ نے دیکھا کہ علامہ اقبالؒ نے کس طرح اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ وطن یا نسل کی بنیادوں پر قومیت کا تصور، ذاتِ رسالت مآبؐ سے اپنا رشتہ منقطع کر کے، ایک جدید اُمت، یا نئے دین کو وجود میں لانے کے مرادف بن جاتا ہے۔

علامہ اقبالؒ کی یہ تنبیہہ اس قدر واضح تھی کہ اس کے بعد مولانا مدنی اور اس کے ساتھ دیگر نیشنلسٹ علماء کو نہ صرف اپنی غلطی کا اعتراف کر لینا چاہیے تھا بلکہ نیشنلزم کا مسلک بھی ترک کر دینا چاہیے تھا۔ لیکن اس کے

بجائے مولانا مدنی نے اپنے دعویٰ کی مدافعت میں لمبا چوڑا بیان داغ دیا۔ اس کے جواب میں علامہ اقبالؒ نے وہ بیان شائع کیا جو "معرکۂ دین و وطن" کے نام سے مشہور ہے۔ اور جو اسلامی قومیت کے مسئلہ پر ناقابلِ تردید حقائق کی تابندہ دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ جی چاہتا تھا کہ ان کے اس معرکہ آراء بیان کو یہاں درج کرا دیا جائے۔ لیکن عدم گنجائش اس سے مانع ہے۔ (ویسے میں اس موضوع پر طلوعِ اسلام میں مسلسل لکھتا چلا آ رہا ہوں)

(ضمناً، مولانا مدنی (مرحوم) کے متبعین میں سے بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ علامہ اقبالؒ کے اس بیان کے بعد، مولانا مدنی نے یہ وضاحت کر دی تھی کہ انہوں نے یہ نہیں کہا تھا کہ اسلام کی رُو سے قومیت کا معیار وطنیت ہے۔ میں نے یہ کہا تھا کہ آجکل قومیتیں، وطنیت کی بنا پر متشکل ہوتی ہیں۔ اور علامہ اقبالؒ نے ان کی اس معذرت (یا وضاحت) کو تسلیم کر لیا تھا، اس لئے اس قصہ کو اب دہرانا نہیں چاہئے۔ لیکن یہ حضرات اس حقیقت کو سامنے نہیں لاتے کہ مولانا مدنی (مرحوم) نے حضرت علامہؒ کی وفات کے قریب چھ ماہ بعد، ایک کتابچہ شائع کیا تھا جس میں کہا تھا کہ اقبالؒ کا موقف مبنی بر حقیقت نہیں تھا۔ اسلام کی رُو سے قومیت کا معیار وطنیت ہے۔ طلوعِ اسلام نے اسی زمانہ میں اس کتابچہ کا بھرپور جواب شائع کیا تھا جس کا کسی سے آج تک جواب بن نہیں پڑا۔ (یہ مقالہ بارِ دیگر، طلوعِ اسلام بابت جولائی ۱۹۷۵ء میں شائع ہوا تھا)۔

علامہ اقبالؒ عمر بھر اسلام کی اس بنیادی حقیقت کو پیش کرتے رہے، لیکن یہ احساس ان کے دل میں برابر کھٹک پیدا کر رہا تھا کہ ان کے بعد ہندوستان کی سیاست میں ان نظریات کو عملی طور پر کون آگے بڑھائے گا؟ جب آنے والا مورخ اس حقیقت پر نگاہ ڈالے گا کہ اس مقصد کے لئے ان کی نگہِ انتخاب کہاں جا کر ٹکی تو وہ یقیناً محوِ حیرت رہ جائے گا۔ ان کی نگاہ کا ہدف تھا مسٹر محمد علی جناح۔ وہ جناح جو عمر بھر نیشنلسٹ رہا اور پھر ہندوستانی سیاست سے دل برداشتہ ہو کر لندن کے گوشۂ خلوت میں جا بیٹھا تھا۔ اس قسم کے نیشنلسٹ کو اسلامی قومیت کے نظریہ کا ایسا معتقد بنا دینا کہ وہ اسے اپنی زندگی کا مشن قرار دے لے، اقبالؒ کا وہ کارنامہ ہے جس سے ملتِ اسلامیہ ان کی ہمیشہ رہینِ منت رہے گی۔ یہ کیسے ہوا تھا؟ اس حقیقت کی پردہ کشائی قائد اعظمؒ کے سوانح حیات کا انگریز مرتب (ہیکٹر بولیتھو) ان الفاظ میں کرتا ہے:-

" اپنے قیامِ لندن کے دوران مسٹر جناحؒ نے اقبالؒ سے کئی ملاقاتیں کیں۔ وہ ایک دوسرے کے بہت

اچھے دوست تھے۔ لیکن اس کے باوجود جناحؒ نے اقبالؒ کے دلائل کو فوری طور پر تسلیم نہیں کیا
اس میں قریب دس سال کا عرصہ لگ گیا۔" (ص ۹۹)

جناحؒ انگلستان گیا تھا تو اس نیشنلزم کا پرستار جس کی شہادت آج بھی بمبئی میں 'جناح کانگریس ہال' دے رہا ہے۔ اور واپس آیا تو اقبالؒ کا یہ پیغام دہراتا ہوا کہ ؎

اپنی ملت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر — خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمیؐ
ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار — قوت مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری
دامن دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں
اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملت بھی گئی

قائداعظمؒ نے اسلام کے اس تصور قومیت کو کس کس انداز سے پیش کیا، اس کی مثالیں آگے چل کر پیش آئیں گی لیکن میں سب سے پہلے ان کا ایک ایسا فقرہ پیش کر دینا مناسب سمجھتا ہوں جس میں انہوں نے پوری تفصیل کو اس طرح سمٹا کر رکھ دیا ہے جیسے آنکھ کے تل میں آسمان۔ انہوں نے ۸، مارچ ۱۹۴۴ء کو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ایک تقریر کے دوران کہا تھا:-

"پاکستان کا آغاز اس دن سے ہو گیا تھا جب ہندوستان میں پہلا غیر مسلم مسلمان ہوا تھا۔ یہ اس زمانے کی بات ہے۔ جب یہاں ہنوز مسلمانوں کی حکومت بھی قائم نہیں ہوئی تھی۔"

بات کس قدر واضح ہے کہ جب یہاں پہلی بار ایک غیر مسلم، اسلام لے آیا تو اس ملک میں دو قوموں کا وجود عمل میں آگیا۔ اور یہی پاکستان کی بنیاد ہے۔

انہوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے بنیادی اختلافات کا ذکر کرتے ہوئے، ایڈورڈس کالج۔ پشاور میں، ۲۷، نومبر ۱۹۴۵ء کو کہا تھا:-

"ہم دونوں قوموں میں صرف مذہب کا فرق نہیں۔ ہمارا کلچر ایک دوسرے سے الگ ہے۔ ہمارا دین، ہمیں ایک ایسا ضابطۂ حیات دیتا ہے جو زندگی کے ہر شعبہ میں ہماری راہ نمائی کرتا ہے۔ ہم اس ضابطے کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔"

جداگانہ قومیت کا یہی وہ تصور تھا جس کی مخالفت ہندوؤں کی طرف سے اس شدومد کے ساتھ ہوئی تھی۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے، آل انڈیا نیشنل کنونشن کے خطبۂ صدارت میں (مارچ ۱۹۳۷ء میں) کہا تھا کہ

"ایسے لوگ ابھی تک زندہ ہیں جو ہندو، مسلمان کا ذکر اس طور پر کرتے ہیں گویا دو ملکوں اور قوموں کے بارے میں گفتگو ہے۔ جدید دنیا میں اس دقیانوسی خیال کی گنجائش نہیں۔"

انہوں نے اپنی سوانح عمری میں لکھا تھا :-

"مسلم قومیت کا تخیل صرف چند لوگوں کی من گھڑت اور محض پرواز خیال ہے۔ اگر اخبارات اس کی اس قدر اشاعت نہ کرتے تو بہت تھوڑے لوگ اس سے واقف ہوتے۔"

جب قائداعظمؒ نے اس تصورِ قومیت پر بار بار زور دیا تو مسٹر گاندھی نے انہیں (مورخہ ۱۵ ستمبر ۱۹۴۴ء کو) ایک خط میں لکھا :-

"میں تاریخ میں اس کی مثال نہیں پاتا کہ کچھ لوگ جنہوں نے اپنے آباؤ اجداد کا مذہب چھوڑ کر ایک نیا مذہب قبول کر لیا ہو، وہ اور ان کی اولاد یہ دعویٰ کریں کہ وہ اپنے آباؤ اجداد سے الگ قوم بن گئے ہیں۔ اگر ہندوستان اسلام کی آمد سے پہلے ایک قوم تھا تو اسلام کے بعد بھی اسے ایک قوم ہی رہنا چاہیئے خواہ اس کے سپوتوں میں سے ایک کثیر تعداد نے اسلام قبول کر لیا ہو۔"

مسٹر گاندھی کا یہ خط، یوں سمجھئے کہ قائداعظمؒ کے اس خط کے جواب میں تھا جس میں انہوں نے، مسٹر گاندھی کو لکھا تھا کہ :-

"اس باب میں مجھے نہ کسی قسم کا دھوکا ہے، نہ شک و شبہ، کہ نہ ہندوستان میں ایک قوم بستی ہے اور نہ ہی یہ ملک ایک ہے۔ یہ برصغیر مختلف اقوام کا مجموعہ ہے جن میں ہندو اور مسلمان دو بڑی بڑی قومیں ہیں۔ آج آپ اس سے انکار کرتے ہیں کہ قومیت کی تشکیل میں مذہب ایک بہت بڑا عنصر ہے لیکن آپ سے جب یہ سوال کیا گیا تھا کہ زندگی میں آپ کا مقصود کیا ہے اور وہ کونسی قوت محرکہ ہے جو ہمیں آمادہ بہ عمل کرتی ہے، کیا وہ مذہب ہے یا سیاست یا عمرانی اصلاح ہے، تو آپ نے کہا تھا کہ وہ خالص مذہبی جذبہ ہے ..... (لہٰذا، مذہب اور سیاست دو الگ الگ شعبے نہیں ہیں)، آج انسانی سعی و کاوش کا دائرہ ایک ناقابلِ تقسیم وحدت بن چکا ہے۔ آپ تمدنی، سیاسی، معاشی اور خالص مذہبی امور کو الگ الگ شعبوں میں تقسیم کر ہی نہیں سکتے۔ جس مذہب کو نوعِ انسانی کے معاملات سے واسطہ نہیں میں اسے مذہب ہی تسلیم نہیں کرتا۔ مذہب انسان کے ہر معاملہ کے لئے اخلاقی بنیاد مہیا کرتا ہے اگر مذہب نہ ہو تو انسانی

اعمال اس بنیاد سے محروم رہ جاتے ہیں، اور جب زندگی ایسی بنیاد سے محروم رہ جائے تو وہ انسانی زندگی نہیں محض غوغہ آرائی اور ہنگامہ پروری بن کر رہ جاتی ہے۔ جس میں شور و شغب تو بہت ہوتا ہے۔ لیکن مقصود کچھ نہیں ہوتا۔"

(جناحؒ کا خط بنام گاندھی۔ جنوری ۱۹۴۰ء)

مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس ۱۹۴۰ء تحریک پاکستان کی تاریخ میں نشانِ منزل کی حیثیت رکھتا ہے۔ کیونکہ اس میں پاکستان کا ریزولیشن پاس ہوا تھا۔ اس اجلاس کے خطبۂ صدارت میں قائداعظمؒ نے فرمایا تھا:-

"میرے لئے یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ آخر ہمارے ہندو بھائی، اسلام اور ہندومت کی حقیقت اور اہمیت کو سمجھنے سے کیوں گریز کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں "مذہب" نہیں بلکہ ایک دوسرے سے مختلف معاشرتی نظام ہیں اور اس بنا پر متحدہ قومیت کا تخیل ایک ایسا خواب ہے جو کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ یاد رکھئے، ہندو اور مسلمان، مذہب کے ہر معاملہ میں دو جداگانہ فلسفے رکھتے ہیں۔ دونوں کی معاشرت ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ دونوں الگ الگ تہذیبوں سے تعلق رکھتے ہیں جن کی بنیادیں متضاد تصورات پر ہیں۔ دو ایسی قوموں کو ایک نظامِ مملکت میں یکجا کر دینا باہمی مناقشت کو بڑھائے گا اور بالآخر اس نظام کو پاش پاش کر دے گا۔ جو اس ملک کی حکومت کے لئے وضع کیا گیا ہو۔"

اس کے ایک سال بعد انہوں نے آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس مدراس، کے خطبۂ صدارت میں اپنے اس دعویٰ کا اعادہ کرتے ہوئے فرمایا:-

"مسلم لیگ کا نصب العین یہ بنیادی اصول ہے کہ ہندوستان کے مسلمان ایک جداگانہ قومیت رکھتے ہیں۔ انہیں کسی دوسری قوم میں جذب کرنے یا ان کے نظریات یا ملی تشخص کو مٹانے کے لئے جو کوشش بھی کی جائے گی، اس کا ڈٹ کر مقابلہ کیا جائے گا۔ ہم نے تہیہ کر لیا ہے کہ اپنے جداگانہ قومی تشخص اور جداگانہ حکومت کو قائم کر کے رہیں گے۔"

قائداعظمؒ نے اس دعویٰ کو اس شدومد سے دہرایا کہ اس کے مخالفین تک کو اس کا اعتراف کرنا پڑا کہ اس حقیقت کو تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں، چنانچہ آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے ایک ممتاز رکن، مسٹر ایس، سی دت نے اپنے ابنائے قوم کے نام ایک کھلی چٹھی میں جو اخبار مدینہ، بجنور کی یکم فروری ۱۹۴۰ء کی اشاعت

میں شائع ہوئی تھی، لکھا تھا:۔

"ان حالات میں، میرا خیال ہے کہ ہندو مسلم قضیہ کا حل یہی ہو گا کہ ہندوستان میں ہندو اور مسلمان کو "دو" قومیں سمجھ لیا جائے اور پھر دو قوموں کی حیثیت سے ان کے متعلق ایک متحدہ قومیت کا خیال ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دل سے نکال دیا جائے۔ مسٹر جناحؒ نے حال ہی میں گاندھی جی کو جواب دیتے ہوئے متحدہ قومیت کے تصور کو سراب کے لفظ سے تعبیر کر کے اس خیال کا اظہار کیا ہے۔ یہ، میرے خیال میں، اب نہیں، تو کل حقیقت ہو کر رہے گا.... میرا خیال ہے کہ اب ہمیں پاکستان کے خیال سے ڈرنا نہیں چاہیئے۔ البتہ اس میں ترمیم و اصلاح کر کے، اسے اپنے حسب حال بنانے کی کوشش کرنی چاہیئے۔"

اور اس حقیقت کو، بالآخر، ہندو اور انگریز دونوں کو تسلیم کرنا پڑا۔ اور دو قومی نظریہ کی بنا پر پاکستان وجود میں آگیا۔ اس موضوع پر، قائد اعظمؒ کی تقاریر اور بیانات سے اور بھی بہت کچھ پیش کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ اس کی چنداں ضرورت نہیں۔ انہی اقتباسات سے واضح ہو گیا ہو گا کہ دو قومی نظریہ کے متعلق ان کے خیالات اس قدر صاف اور واضح تھے کہ اس باب میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہتی۔ تشکیل پاکستان کے بعد بھی وہ کس طرح اس حقیقت کو دہراتے رہے، اسے ذرا آگے چل کر پیش کیا جائے گا۔

میں نے اپنے مقالہ (مندرجہ نوائے وقت مورخہ ۷، ار اکتوبر ۱۹۸۰ء) میں کہا تھا کہ تقسیم ہند اور تشکیل پاکستان کے مخالفین، قائد اعظمؒ کی ۱۱ر اگست ۱۹۴۷ء کی تقریر کو ترپ کے پتے کے طور پر استعمال کرتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ قائد اعظمؒ نہ تو اسلامی مملکت کے قائل تھے اور نہ ہی مسلمانوں کی الگ قومیت کے مؤید۔ وہ وطن کی بنیادوں پر متحدہ قومیت کے قائل تھے۔ میں نے اپنے اس مضمون میں (محولہ بالا تقریر کے ضمن میں) اسلامی مملکت کے مسئلہ پر تو وضاحت سے بحث کی تھی۔ لیکن نظریۂ قومیت کے سلسلے میں صرف اتنا کہا تھا کہ اس سے ان کی مُراد یہ نہیں تھی کہ "مسلمان اور غیر مسلم" اشتراک وطن کی بنا پر ایک قوم بن جائیں گے۔ انہوں نے کہا یہ تھا کہ غیر مسلم یہاں اقلیت کی حیثیت سے رہیں گے اور اسی حیثیت سے ان کے حقوق کی حفاظت کی جائے گی۔ اس نکتہ کی وضاحت ضروری ہے۔

غیر مسلم اقلیتیں

انہوں نے (۱۱ر اگست ۱۹۴۷ء کی محولہ بالا تقریر سے قریب ایک ماہ پہلے) ۱۳ر جولائی ۱۹۴۷ء کو نامزد گورنر جنرل کی حیثیت سے، دہلی میں ایک پریس کانفرنس سے خطاب کیا تھا۔ اس میں ان سے جب پاکستان میں اقلیتوں کے بارے میں سوال کیا گیا تو انہوں نے فرمایا:-

"میں ان وعدوں میں سے جو میں نے بارہا اقلیتوں کے بارے میں کئے ہیں، منحرف نہیں ہوں گا۔ میں نے بارہا اقلیتوں کے بارے میں کہا ہے کہ انہیں پورا پورا تحفظ حاصل ہوگا۔ میں جو کچھ کہتا ہوں اس کا وہی مفہوم ہوتا ہے اور جو کچھ میں کہہ چکا ہوں مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ اقلیتوں کو خواہ وہ کسی جماعت اور فرقے سے متعلق ہوں بہر طور پوری طرح تحفظ دیا جائے گا۔ ان کو اپنی مذہبی رسومات و عبادات کی پوری آزادی ہوگی۔ اس میں کسی قسم کی کوئی مداخلت نہیں کی جائیگی۔ ان کی جان، ان کے مال اور ان کے تمدن کی پوری حفاظت کی جائے گی اور انہیں بلا تفریق مذہب و ملت و رنگ ہر صورت میں پاکستان کا باشندہ تصور کیا جائے گا۔"

(بحوالہ نوائے وقت۔ مورخہ ۱۹ر جنوری ۱۹۷۸ء)

آپ نے دیکھا کہ قائداعظمؒ نے اس میں، پاکستان کے غیر مسلموں کو اقلیتیں کہہ کر پکارا ہے۔ یہ ان کی ۱۱ر اگست کی تقریر سے ایک ماہ پہلے کی بات ہے۔ اس کے بعد انہوں نے (اس تقریر کے تین ہی دن بعد) ۱۴ر اگست کو مجلس آئین ساز کا افتتاح کیا۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے اپنی تقریر میں کہہ دیا تھا کہ

۱۱ر اگست کے بعد

مجھے امید ہے کہ پاکستان میں غیر مسلم اقلیتوں سے ویسا ہی کشادہ ظرفی اور رواداری کا سلوک کیا جائے گا جیسا شہنشاہ اکبرؒ نے کیا تھا۔ قائداعظمؒ نے ماؤنٹ بیٹن کے اس مشورہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:-

"شہنشاہ اکبر نے غیر مسلموں کے ساتھ جس مذہبی رواداری اور حسن سلوک کا ثبوت دیا، وہ ہمارے ہاں کوئی بعد کا وضع کردہ مسلک نہیں تھا۔ وہ مسلک ہمارے ہاں تیرہ سو سال پہلے سے چلا آرہا تھا جب حضور نبی اکرمؐ نے یہودیوں اور عیسائیوں پر فتح حاصل کر لینے کے بعد ان سے لفظاً ہی نہیں بلکہ عملاً انتہائی رواداری برتی اور ان کے مذہب اور عقائد کو عزت و احترام کی نظروں

سے دیکھا۔ مسلمانوں کی تمام تاریخ اس کی شاہد ہے کہ انہوں نے جہاں جہاں بھی حکومت کی (غیر مسلموں کے ساتھ رواداری اور حسن سلوک کے) انہی عظیم انسانیت ساز اصولوں پر عمل کیا اور انہیں پر ہمیں بھی عمل کرنا چاہیئے۔"

آپ نے غور فرمایا کہ قائداعظمؒ نے کس طرح اس حقیقت کو واضح کر دیا کہ پاکستان میں غیر مسلموں کی حیثیت کیا ہوگی؟ اس ضمن میں آپ اس نکتہ پر بھی غور فرمائیے کہ حضور نبی اکرمؐ نے جن یہودیوں اور عیسائیوں سے حسن سلوک کا برتاؤ کیا تھا، وہ مسلم قوم کا جزو نہیں بن گئے تھے۔ اسلامی مملکت میں ان کی حیثیت ذمیوں کی تھی۔ یہ حقیقت بجائے خویش اسلامی نقطۂ نگاہ سے "دو قومی نظریہ" کا بیّن ثبوت ہے۔

اس کے بعد قائداعظمؒ قریب ایک سال تک زندہ رہے اور اس دوران میں انہوں نے بہت سے مواقع پر تقاریر کیں اور بیانات دیئے۔ جہاں جہاں بھی موقع ملا انہوں نے غیر مسلموں کو ہمیشہ اقلیت کہہ کر پکارا اور انہیں یقین دلایا کہ اُن سے رواداری کا برتاؤ کیا جائے گا۔ مثلاً انہوں نے ۱۱ر اکتوبر ۱۹۴۷ء کو خالق دینا ہال کراچی میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:۔

"ایک اور سوال جو میرے دل میں بار بار اُبھرتا ہے، اقلیتوں کا مسئلہ ہے۔ میں نے جلوت اور خلوت میں بار بار اس امر پر زور دیا ہے کہ ہمیں اقلیتوں سے حسن سلوک کا ثبوت دینا چاہیئے۔ تقسیم ہند کے وقت اس امر کی ضمانت دی گئی تھی کہ ہندوستان اور پاکستان دونوں میں اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ کیا جائے گا۔ لہٰذا جب تک اقلیتیں مملکت کی وفادار رہیں گی، انہیں یہاں کسی قسم کا خطرہ نہیں ہوگا۔"

پھر انہوں نے ۳۰ر اکتوبر کو یونیورسٹی سٹیڈیم لاہور میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:۔

"اسلام ہر مسلمان کا فریضہ قرار دیتا ہے کہ وہ اپنے ہمسایوں اور اقلیتوں کی پوری پوری حفاظت کرے۔ خواہ ان کا عقیدہ کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ ہندوستان میں مسلمانوں کے خلاف جو کچھ ہو رہا ہے۔ اس کے باوجود ہمیں یہاں کی اقلیتوں کا پورا پورا تحفظ کرنا چاہیئے۔ اور ان کے دل میں اس حفاظت کی طرف سے کامل اعتماد پیدا کرنا چاہیئے۔ ہمارا یہی رویّہ ہمارے لئے باعث عزت اور وجۂ افتخار ہونا چاہیئے۔"

۳ر فروری ۱۹۴۸ء کو سندھ کے پارسیوں نے قائداعظمؒ کی خدمت میں استقبالیہ پیش کیا تو اس کے جواب

میں انہوں نے فرمایا کہ "حکومت اس امر کا خاص اہتمام کر رہی ہے کہ اقلیتوں کے دل سے، خوف اور بد اعتمادی کے تمام شبہات کا ازالہ کر دے" انہوں نے ۱۹، فروری ۱۹۴۸ء کو آسٹریلیا کے باشندوں کے نام اپنے براڈ کاسٹ میں کہا:۔

"اسلام ہم سے تقاضا کرتا ہے کہ ہم دوسرے اہل مذہب کے ساتھ رواداری کا ثبوت دیں۔ جو لوگ بھی یہاں برضا و رغبت ہم سے تعاون کریں گے ہم ان کے اس تعاون کا گرمجوشی سے استقبال کریں گے۔"

انہوں نے ۲۱، مارچ ۱۹۴۸ء کو ڈھاکہ کے ایک جلسۂ عام میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ:۔

"ہر غیر جانبدار مبصر اس سے اتفاق کرے گا کہ ہم نے اپنی انتہائی مشکلات کے اس زمانے میں اپنی اقلیتوں کی جس قدر حفاظت کی ہے اور ان کا جتنا خیال رکھا ہے، ہندوستان میں اس کی کہیں مثال نہیں مل سکتی۔ میں اس موقع پر ایک بار پھر دُہرا دینا چاہتا ہوں کہ ہم پاکستان کی اقلیتوں کے ساتھ منصفانہ سلوک کریں گے۔ پاکستان میں ان کی جان اور مال کی حفاظت ہندوستانی اقلیتوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہو رہی ہے۔ پاکستان کے ہر شہری کی جان و مال کی حفاظت ہمارا ذمہ ہے اور ہم اس ذمہ داری کو مذہب و ملت کی تمیز سے بلند ہو کر پورا کرتے رہیں گے۔"

اس کے بعد انہوں نے، اسی تقریر کے دوران فرمایا:۔

"اسلام نے ہمیں یہ سکھایا ہے ۔۔ اور آپ مجھ سے متفق ہوں گے (کہ یہ ایک عظیم سبق ہے جو اس نے ہمیں یہ سکھایا ہے) کہ آپ کچھ بھی ہوں، اوّل و آخر آپ مسلمان ہیں اور ایک قوم کے افراد ہیں۔ تم نے اپنے لئے ایک وسیع مملکت تراشی ہے۔ یہ مملکت آپ سب کی مشترکہ ملکیت ہے۔ یہ نہ پنجابی کی ہے نہ بنگالی کی۔ نہ سندھی کی ہے نہ پٹھان کی۔ یہ آپ سب کی ہے ..... اس لئے اگر تم ایک قوم بننا چاہتے ہو تو خدا کے لئے صوبائی تفرقے کے خیال کو جھٹک دیجئے۔ صوبائی تفرقہ ایک لعنت ہے۔ ویسی ہی لعنت جیسی لعنت فرقہ بندی، شیعہ سُنی کی تفریق ہے۔

اس کے ساتھ ہی انہوں نے فرمایا:۔

"میں اس موقعہ پر ایک بار پھر دُہرا دینا چاہتا ہوں کہ ہم پاکستان میں اقلیتوں کے ساتھ رواداری کا برتاؤ کریں گے۔"

آپ نے دیکھا کہ اس تقریر کے پہلے اقتباس میں انہوں نے مسلمانوں سے خطاب کرتے ہوئے انہیں "ایک قوم" کہا ہے۔ اور دوسرے اقتباس میں، غیر مسلموں کو اقلیتیں۔ فرمائیے کہ ایسا کہنے والا "دو قومی نظریہ" کا علمبردار تھا، یا متحدہ قومیت کا؟

انہوں نے ۲۶ مارچ ۱۹۴۸ء کو چاٹگام میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ:-

"ایک غیر جانبدار مبصر اس سے اتفاق کرے گا کہ ہندوستان کے مقابلے میں پاکستان نے اپنی اقلیتوں کے ساتھ کہیں بہتر سلوک کیا ہے۔ وہ یہاں ہمارے درمیان نہ صرف امن و اطمینان سے رہ رہی ہیں بلکہ انہیں اپنے قدم جمانے کی بھی پوری پوری آزادی حاصل ہے۔"

۱۳ جون ۱۹۴۸ء کو کوئٹہ کے پارسیوں کے ایک وفد نے قائداعظمؒ کی خدمت میں استقبالیہ پیش کیا تو اس کے جواب میں آپ نے فرمایا کہ:-

"آپ کو معلوم ہے کہ میری اور میری حکومت کی یہ پالیسی ہے کہ پاکستان میں بلا تمیز مذہب و ملت اور بلالحاظ رنگ و نسل ہر شخص کی جان، مال اور عزت کی پوری پوری حفاظت کی جائے گی۔ اقلیتوں کو اس باب میں بالکل مطمئن رہنا چاہیئے۔"

آپ نے دیکھا کہ قائداعظمؒ اس تمام دوران میں پاکستان میں بسنے والے غیر مسلموں کو اقلیت کہہ کر پکارتے رہے اور انہیں ان کی جان، مال اور عزت، آبرو کی حفاظت کا یقین دلاتے رہے۔ انہوں نے کہیں ایک بار بھی یہ نہیں کہا کہ یہاں مسلم اور غیر مسلم دونوں مل کر ایک قوم بن چکے ہیں، اس لئے اب ان میں کسی قسم کی تفریق و تمیز باقی نہیں رہتی۔ اس کے برعکس وہ اس حقیقت کا اعادہ کرتے رہے کہ مسلمان اپنے مخصوص نظریۂ زندگی کی بناء پر ایک الگ قوم بنتے ہیں۔ انہوں نے ۱۹ فروری ۱۹۴۸ء کو آسٹریلیا کے باشندوں کے نام اپنے اس براڈکاسٹ میں جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے، کہا کہ:-

"یہاں کی آبادی کی اکثریت مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ ہم محمدؐ رسول اللہ کی تعلیم کے پیرو ہیں۔ ہم اس اسلامی برادری کے افراد ہیں جس میں حقوق، شرف و احترام اور تکریم ذات کے اعتبار سے تمام افراد برابر ہوتے ہیں۔ بنا بریں ہم میں وحدت اور اخوت کا بڑا گہرا اور خاص

جذبہ ہے۔ ہماری اپنی تاریخ ہے اور اپنی رسوم و روایات، ہم اپنے نظریاتِ زندگی، نقطۂ نگاہ اور احساس دروں کے مالک ہیں جو قومیت کی تشکیل کا مدار بنتا ہے۔"

آپ نے غور فرمایا کہ قائداعظمؒ نے قومیت کی تشکیل کے لیئے کون کون سے اجزا کو لاینفک قرار دیا؟ کیا یہ وہی نہیں جن کے امتزاج سے مسلم قوم یا اُمتِ مسلمہ کی تشکیل ہوتی ہے۔ قائداعظمؒ نے کہیں بھی یہ کہا تھا کہ ہم (پاکستان کے مسلم اور غیر مسلم) اشتراکِ وطن کی بنیاد پر ایک قوم بن چکے ہیں؟

پھر انہوں نے ۱۴ اگست ۱۹۴۸ء کو مملکتِ پاکستان کی پہلی سالگرہ کے موقع پر اپنے اس پیغام میں جو اُن کی زندگی کا آخری پیغام تھا پاکستان کو "دنیا کی سب سے بڑی مسلم سٹیٹ" کہہ کر پکارا۔ یہ پہلا موقع نہیں تھا کہ انہوں نے اسے "مسلم سٹیٹ" کہا ہو، اس سے پہلے بھی انہوں نے اسے، ہر موقعہ پر، مسلم سٹیٹ ہی قرار دیا تھا۔

ہم پوچھتے ہیں دنیا بھر کے ماہرینِ سیاست سے کہ جو مملکت محض وطنیت کی بنیادوں پر استوار ہوئی ہو، اُسے کبھی بھی، مسلم سٹیٹ، ہندو سٹیٹ یا عیسائی سٹیٹ کہا جا سکتا ہے؟ یاد رہے کہ وطنیت کی بنیاد پر مختلف آئیڈیالوجی رکھنے والوں کے امتزاج سے جو قوم متشکل ہوتی ہو، اس کی مملکت ہمیشہ سیکولر ہوتی ہے۔

مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم) کے ساتھ اس بحث کے سلسلہ میں جس کا ذکر پہلے آچکا ہے، علامہ اقبالؒ نے فرمایا کہ:-

"اگر بعض مسلمان اس فریب میں مبتلا ہیں کہ دین اور وطن بحیثیت ایک سیاسی تصور کے یکجا رہ سکتے ہیں تو میں مسلمانوں کو انتباہ کرتا ہوں کہ اس راہ کا آخری مرحلہ اوّل تو لادینی ہوگا، اور اگر لادینی نہیں تو اسلام کو محض ایک اخلاقی نظریہ سمجھ کر اس کے اجتماعی نظام سے بے پرواہی۔"

لہٰذا، قائداعظمؒ کا مملکتِ پاکستان کو مسلم سٹیٹ کہنا خود اس امر کی شہادت ہے کہ وہ متحدہ قومیت کے قائل نہیں تھے۔

نئی نسل کی تعلیم

یہ تھے دو قومی نظریہ کے متعلق قائداعظمؒ کے خیالات۔ میں نے تشکیلِ پاکستان کے فوری بعد، ملک کے اربابِ حل و عقد کی خدمت میں گزارش کیا تھا کہ مذہب (دین) کی بنیادوں پر ایک مملکت اور ایک جداگانہ

قومیت کا تصور دنیا میں رائج نظریاتِ سیاست کے خلاف اور انوکھے نظریات ہیں۔ ہم (پرانی نسل کے افراد) تو وہاں سے یہ کچھ پکارتے ہوئے یہاں آ گئے ہیں۔ لیکن ہماری نئی نسل کی سمجھ میں یہ بات از خود نہیں آسکے گی اس کے لئے ضروری ہے کہ ان کی تعلیم کا نظام ایسا کیا جائے کہ یہ نظریات علیٰ وجہ البصیرت ان کی زندگی کا جزو بن جائیں۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو ہمارا نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ عام نظریاتِ سیاست سے متاثر ہو کر، سیکولر سٹیٹ اور وطنی قومیت کا قائل ہو جائے گا، اور اس سے پاکستان کی جداگانہ مملکت کی وجہ جواز ہی ختم ہو جائے گی۔ ان حضرات نے میری ان گذارشات پر کوئی توجہ نہ دی۔ نتیجہ یہ کہ یہ زہر ہماری نئی نسل کے رگ و پے میں سرایت کرتا گیا۔ ملک میں موجود پاکستان دشمن عناصر اس زہر آلودہ خون کی گردش کو تیز سے تیز کرتے چلے گئے اور اس کا عملی مظاہرہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کی شکل میں ہوا۔ تعلیم کی طرف سے ہماری مجرمانہ تغافل شعاری کی وجہ سے وہاں کے طالبعلموں کی ذہنیت کیا بن چکی تھی، اس کا اندازہ ڈھاکہ یونیورسٹی کے (اس زمانے کے) ایم اے فائنل کے ایک طالب علم عزیز الرحمٰن کے اس خط سے لگ سکتا ہے جو روزنامہ (DAINIC PAKISTAN) کی اشاعت بابت ۲ مئی ۱۹۶۹ء میں شائع ہوا تھا۔ اس میں اس نے لکھا تھا کہ ہم سے جو کہا جاتا ہے کہ ہم مذہب کی بنا پر ہندوؤں سے الگ قوم ہیں تو اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ:-

> "ہم شری چیتنیا، خودی رام، سبھاش بوس، بیجائے سنگھ، جیسے اپنے قومی ہیروز کو فراموش کر بیٹھے اور ان کی جگہ خالد، طارق، موسیٰ اور علیؓ جیسوں کو اپنا ہیرو سمجھنے لگ گئے۔ ہم نے اپنے دیس کے بھگوان کو بھلا دیا، اور اس کی جگہ ایک غیر ملکی خدا، یعنی اللہ کو اپنا معبود تصور کر لیا۔ ہم اپنے بچوں کے نام اپنی زبان کے بجائے ایک اجنبی زبان میں رکھنے میں خوشی محسوس کرنے لگے۔ ہم نور اللہ اور خلیل اللہ جیسے ناموں پر ریجھ گئے اور ناگنی، گھاگنی جیسے سیدھے سادھے ناموں کو تیاگ کر دیا۔"

اس کے بعد اسی نے لکھا تھا:-

> "اب ہمارا بنگالی جذبہ آہستہ آہستہ بیدار ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اس سے اسلامی قومیت کے بند ڈھیلے پڑ جائیں گے اور علاقائی قومیت کے رشتے مضبوط ہو جائیں گے۔ مغربی پاکستان میں ہمارے سندھی بھائی بھی بیدار ہو رہے ہیں۔ انہوں نے بھی یہ سمجھنا سیکھ لیا ہے کہ ہم راجہ داہر کی اولاد ہیں اور پہلے سندھی اور اس کے بعد کچھ اور ہیں۔"

مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے اسباب اور وجوہات معلوم کرنے کے لئے ہم تحقیقاتی کمیشن بٹھاتے رہے۔ لیکن یہ سب بے سود تھا۔ اس کا بنیادی سبب وہ ذہنیت تھی جس کی جھلک عزیز الرحمٰن کے مندرجہ بالا خط میں صاف نظر آرہی ہے۔ ۱۹۷۱ء کی جنگ کے بعد، سقوطِ ڈھاکہ کے جگرخراش المیہ پر شادیانے بجاتے ہوئے بنگلہ دیش کے اس وقت کے قائم مقام صدر، مسٹر نذر الاسلام نے اعلان فرمایا تھا کہ:۔

"ہماری یہ فتح، نہ کسی فوج کی فتح ہے، نہ کسی ملک کی۔ یہ فتح ہے حق کی باطل پر۔ یہ فتح ہے، ایک صحیح نظریہ کی غلط نظریہ پر۔ تقسیم ہند سے پہلے سرپھرے مسلمانوں نے یہ دعویٰ کیا کہ قومیت کا مدار مذہب کا اشتراک ہے، وطن کا اشتراک نہیں اور حکومت کی بنیاد مذہب پر ہے، سیکولرزم نہیں۔ وہاں ان لوگوں کو لاکھ سمجھایا گیا کہ یہ نظریہ غلط ہے اور ناممکن العمل، اس پر اصرار نہ کرو۔ لیکن وہ نہ مانے اور اپنے غلط مفروضہ کی بنیاد پر ایک جداگانہ قوم بن کر ایک الگ مملکت کے بانی بن گئے۔ لیکن چوبیس سال کے تجربہ نے ثابت کر دیا کہ جو نظریہ یہ لوگ پیش کر رہے تھے وہ باطل تھا اور حق وہی تھا جو ان کے مخالفین پیش کر رہے تھے۔ سقوطِ ڈھاکہ نے اس حقیقت پر مہرِ تصدیق ثبت کر دی۔ اب یہ شہادت تاریخ کے صفحات پر ہمیشہ کے لئے منقوش رہے گی۔ ہم ان راہ گم کردہ لوگوں سے اب بھی کہیں گے کہ وہ اس باطل نظریہ کو ترک کر کے وطن کے اشتراک کی بنا پر پھر سے ہندوستانی قوم کا جزو بن جائیں اور مذہب کو سیاست میں گھسیٹنے کی کوشش نہ کریں ورنہ جو حشر مشرقی پاکستان کا ہوا ہے، وہی کل مغربی پاکستان کا بھی ہوگا، حقائق کسی کے جھٹلائے ہوئے جھوٹے ثابت نہیں ہو جایا کرتے۔"

مسز اندرا گاندھی

ادھر نذر الاسلام صاحب یہ کہہ رہے تھے اور دوسری طرف (اس زمانہ کی بھارت کی وزیرِاعظم مسز اندرا گاندھی اپنی پارلیمان میں جشنِ "فتح بنگالہ" پر ہدیۂ تبریک کے جواب میں یہ فرما رہی تھیں کہ:۔

"یہ کامیابی نہ ہماری فوجوں کی کامیابی ہے اور نہ ہی حکومت کی کامیابی، یہ کامیابی ہے حق پر مبنی نظریہ کی، اس نظریہ کے خلاف جو باطل پر مبنی تھا۔ مسلمانوں نے تحریک پاکستان کی بنیاد ایک باطل نظریہ پر رکھی تھی۔ ہم انہیں بار بار سمجھاتے رہے کہ ان کا نظریہ غلط ہے۔ یہ

کامیاب نہیں ہو سکتا۔ انہوں نے نہ مانا اور اپنی ضد پر قائم رہے۔ اب ۲۵ سال کے تجربہ نے بتا دیا ہے کہ جو کچھ ہم کہتے تھے وہ حق تھا اور ان کا نظریہ باطل۔ یہ ان کے باطل نظریہ کی شکست ہے؟

(سابقہ مشرقی پاکستان) حالیہ بنگلہ دیش میں اس ذہنیت نے ملک کو دولخت کر دیا۔ ادھر مغربی پاکستان میں اس ذہنیت کی پرورش کے لئے دوسرا انداز اختیار کیا گیا۔ یہاں کہا گیا کہ مغربی پاکستان میں ایک قوم نہیں بلکہ مختلف قومیں آباد ہیں۔

قارئین کو شاید یاد ہو کہ ۱۹۶۸ء میں کراچی کی "عوامی ادبی" انجمن کی طرف سے ایک پمفلٹ شائع ہوا تھا جس پر منجملہ دیگر "دانشوران قوم" جوش ملیح آبادی اور فیض احمد فیض کے دستخط ثبت تھے۔ اس پمفلٹ میں کہا گیا تھا:-

"ہمارے نزدیک جمہوری آزادی میں قوموں کی ترقی کا مسئلہ بھی شامل ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے ملک میں جو مختلف قوموں کا وطن ہے وہ حالات پیدا کئے جائیں کہ سب قومیں، ان کی زبانیں اور تہذیبیں کسی ایک قوم کے اثر و تسلط سے آزاد ہو کر خود مختارانہ ترقی کر سکیں۔ ہمارے نزدیک پاکستان کی تمام قومیں مساوی حقوق کی مالک ہیں"۔

یعنی سیکولر مملکتوں میں تو وطن کی چار دیواری کے اندر بسنے والے تمام افراد ایک قوم کہلاتے ہیں یہاں ان حضرات نے اس نظریہ کی ترویج شروع کی کہ پاکستان کے مختلف صوبوں میں بسنے والے الگ الگ قوم ہیں۔ یعنی یہ "ارباب دانش" سیکولرزم سے بھی ایک قدم آگے بڑھ گئے! ادھر تقسیم ہند کے سب سے شدید مخالف خان عبدالغفار خان بھی اسی قسم کے نظریات عام کرنے میں برابر مصروف ہیں۔ انہوں نے ۱۹۷۳ء میں "ٹائمز آف انڈیا" کے نمائندے مسٹر دلیپ کمار مکرجی کو انٹرویو دیتے ہوئے فرمایا تھا کہ "چند سال پہلے کا پاکستان اب مر چکا ہے۔ مغربی پاکستان میں اب چار قومیتوں کے درمیان رشتہ کے لئے اسلام کافی نہیں رہے گا۔ اس کے لئے سیکولر بنیادوں پر رشتے کی تعمیر کرنی ہو گی"۔ انہوں نے یہ بات کوئی پہلی مرتبہ نہیں کہی۔ وہ جب ۱۹۶۹ء میں کابل سے بھارت گئے تھے تو انہوں نے وہاں کہا تھا:-

"میں نے دو قومی نظریہ کبھی تسلیم نہیں کیا نہ ہی میں کبھی ایسا کروں گا۔ مذہب قومیت کا معیار کس طرح ہو سکتا ہے؟ میں افغانستان کے باشندوں کو بھی کہتا رہا ہوں اور دوسرے

لوگوں کو بھی کہ اسلام دنیا میں انسان کے بعد آیا ہے۔ جب اسلام یا کوئی اور مذہب دنیا میں نہیں آیا تھا اس وقت بھی تو یہاں انسان بستے تھے۔ ان کی کوئی نہ کوئی قومیت تو تھی ہی، لہٰذا میں یہ کس طرح تسلیم کر لوں کہ قومیت کا معیار مذہب ہو سکتا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ ہماری اکثر مشکلات کا سبب یہ ہے کہ مذہب کو قومیت کے ساتھ ملا دیتے ہیں۔"

(سٹیٹسمین ۱۶ اکتوبر ۱۹۶۹ء بحوالہ پاکستان ٹائمز ۳؍۲؍۷۲ء)

اُدھر والد بزرگوار یہ فرما رہے تھے اور اِدھر ان کے صاحبزادہ خان عبدالولی خان، یہ اعلان کر رہے تھے:-

"دو قومی نظریہ ختم ہو چکا ہے۔ اسلام کی باتیں ڈیڑھ ہزار سال پرانی اور فرسودہ ہیں۔ پچیس سال کے تجربے نے ثابت کر دیا ہے کہ نظریۂ پاکستان غلط تھا۔"

(نوائے وقت۔ ۱۳ اکتوبر ۱۹۷۲ء)

میں نے پہلے لکھا ہے کہ بنگالی طالب علم، عزیز الرحمٰن نے اپنے خط میں کہا تھا کہ اب وطن پرستی کی ذہنیت مشرقی پاکستان سے آگے بڑھ کر سندھ میں سرایت کر رہی ہے۔ کراچی سے شائع ہونے والے روزنامہ "حریت" کی اشاعت بابت ۴ نومبر ۱۹۶۸ء میں ایک سندھی طالبہ مس نسیم تھل کا ایک خط چھپا تھا جس میں انہوں نے کہا تھا کہ:-

"وہ اسلام اور پاکستان، جو ہم سے ہمارا سندھ اور سندھی زبان چھینے، ایسے اسلام اور پاکستان کو ہم اپنا بدترین دشمن سمجھتے ہیں۔ یہ جھوٹ ہے کہ سندھ صرف اسلام اور اسلامی فلسفہ کی وجہ سے عظیم ہے۔ سندھ کی عظمت، سندھ کے سادہ لوح بہادر عوام ہیں۔ سندھ موہنجو ڈارو، کوٹ ڈیجی جان کے آثارِ قدیمہ، اور لطیف، سچل، ایاز، جی ایم سید کی طرح کے شاعروں اور دانشوروں کی وجہ سے عظیم ہے۔ وہ اپنی تہذیب کی وجہ سے عظیم ہے۔ (نہ کہ اسلام کی وجہ سے)۔" (طلوعِ اسلام۔ دسمبر ۱۹۶۸ء)

مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بعد وہاں کے بہاری (یعنی غیر بنگالی) مسلمانوں پر جو قیامت ٹوٹی اور ان پر مصائب و آلام کا جو سلسلہ اب تک جاری ہے، اس پر اظہار خیال کرتے ہوئے سندھ کی ایک ادیبہ غزالہ بلوچ کا ایک خط اخبار "ڈیلی نیوز" کراچی کی ۱۹ اگست ۱۹۷۲ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا جس میں اس نے لکھا تھا:-

"اگر مشرقی پاکستان کے بہاری، پاکستانی فوج اور مرکزی حکومت کے بجائے بنگالی علیحدگی پسندوں کی حمایت کرتے تو وہ آج بڑی پُرمسرت حالت میں ہوتے لیکن انہوں نے سخت حماقت کی اور پاکستان۔ ایک پاکستان کے ساتھ وفاداری پر اصرار کرتے رہے اور اب اپنی حماقت کی قیمت اپنی اور اپنے بال بچوں کی جانوں کی شکل میں ادا کر رہے ہیں۔ بہاریوں کی بدقسمتی دراصل اس دن شروع ہوئی تھی جب انہوں نے ۱۹۴۶-۴۷ء میں پاکستان کے حق میں ووٹ دیا تھا۔ اگر بہاری مسلمان ہندوستان کے ہندوؤں کے اندر جذب ہو جاتے تو آج بہار میں آرام اور چین سے زندگی کے دن گزار رہے ہوتے۔ ہندوؤں کے اندر جذب ہونے کے لئے انہیں صرف اسقدر کرنا پڑتا کہ اسلام چھوڑ کر ہندو دھرم اختیار کر لیتے۔ اگر وہ ایسا کر لیتے تو دو قومی نظریہ کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔ ہندوستان میں ایک ہندو قوم ہوتی۔ اب بھی پاکستان میں رہنے والے مہاجرین کے سامنے دو راستے کھلے ہیں یا تو وہ ہندو دھرم اختیار کر کے ہندوستان واپس چلے جائیں اور وہاں ایک عظیم ترقی پذیر قوم کا جزو بن کر رہیں اور یا پاکستان میں سندھی بن کر رہیں جس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ ایک بہت چھوٹی سی قوم کا جزو بن جائیں گے۔"

(طلوع اسلام۔ اکتوبر ۱۹۷۲ء، صفحہ ۴۳)

وہاں کے نوجوان طبقہ میں یہ ذہنیت از خود پیدا نہیں ہو گئی تھی وہاں کے "بزرگ سیاستدانوں" نے جب اپنی گاڑی کا رُخ بدلا تو اس سے ساری فضا متاثر ہو گئی۔ سندھ کی "بزرگ ترین سیاسی شخصیت" مسٹر جی ایم سیدکی تھی۔ وہ مسٹر سید جنہوں نے سب سے پہلے سندھ میں مسلم لیگ کو متعارف کرایا تھا اور بعد میں ان کی کیفیت یہ ہو گئی کہ اوائل ۱۹۷۲ء میں جب ان کی سالگرہ منائی گئی تو اس تقریب پر انہوں نے تقریر کرتے ہوئے کہا تھا:۔

"پاکستان کے موجودہ انتشار، افراتفری اور پسماندگی میں چار عناصر کا ہاتھ ہے۔ یعنی دو قومی نظریہ، مذہبی نظام حکومت کا تخیّل، فسطائی نظریہ سیاست اور پڑوسی ملکوں سے دشمنی۔"

اس کے بعد انہوں نے مطالبہ کیا کہ:۔

"۲۴ سالہ تجربات سے فائدہ اٹھا کر مسلمانوں کے دو قومی نظریہ کو خیرباد کہا جائے، یا پاکستان میں پانچ قوموں کے وجود کو تسلیم کیا جائے اور بنگال کی آزادی کے بعد مغربی پاکستان کی چار قوموں

کو ملکی خود مختاری دے کر ان کے باہمی سمجھوتے سے ایک فیڈریشن بنائی جائے۔"

(المنبر۔ ۴، فروری ۱۹۷۲ء)

سندھ سے آگے بڑھ کر بلوچستان کی طرف آئیے۔ وہاں کے (اس زمانے میں) وزیر اعلیٰ، سردار عطاء اللہ مینگل نے ۱۹۷۲ء میں کہا تھا کہ :-

"جس دو قومی نظریہ کی اساس پر پاکستان حاصل کیا گیا تھا وہ خلیج بنگال میں غرق ہو چکا ہے"۔

(نوائے وقت۔ ۱۸، اکتوبر ۱۹۷۲ء)

اور وہاں کے گورنر میر غوث بخش بزنجو نے ملتان کے ہوائی اڈے پر اخبار نویسوں سے بات چیت کرتے ہوئے کہا تھا :-

"پاکستان میں بسنے والی قومیتوں کی تاریخ، جغرافیائی حدود، تہذیب و ثقافت ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ان کا معاشرہ جدا ہے۔ ہمارا مطالبہ اتنا ہے کہ ان کے نازک احساسات کا خیال رکھا جائے۔ آپ سے سوال کیا گیا کہ پھر پاکستان کو متحد رکھنے کی کیا اساس ہے۔ انہوں نے کہا کہ چار قومیتوں کے مجموعہ سے ایک پاکستانی قوم بنے گی۔ جب ہم آپس میں بات کریں گے تو علیحدہ علیحدہ قومیتوں میں ہوں گے۔ جب کسی غیر ملک سے بات ہوگی تو پاکستانی قوم کی بات ہوگی"۔

(نوائے وقت۔ ۱۴، اکتوبر ۱۹۷۲ء)

کسی نے ان سے یہ پوچھا کہ جب سارے ملک میں قومیں الگ الگ ہوں گی تو پاکستانی قوم کی بات کون کرے گا؟ میں اس سلسلہ میں بہت سی مثالیں پیش کر سکتا ہوں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ میرے زیر نظر مقصد کے لئے سر دست اتنا ہی کافی ہے۔ (میں مزید تفاصیل کسی دوسرے وقت پر اٹھائے رکھتا ہوں۔)

اس وقت تک دو قومی نظریہ سے متعلق گفتگو پاکستان کے حوالے سے ہو رہی تھی۔ لیکن، جیسا کہ شروع میں کہا گیا ہے یہ نظریہ نہ تو تحریک پاکستان کے کسی سیاسی محرکہ کی تخلیق تھا اور نہ ہی پاکستان یا کسی اور ملک سے وابستہ یا اُس تک محدود۔ یہ ایک ابدی حقیقت ہے جو کفر اور اسلام کی تفریق کے ساتھ وابستہ ہے۔ چونکہ اسلام میں قومیت کا معیار ایمان کا اشتراک ہے، اس لئے کوئی اہل ایمان، جہاں بھی ہے، وہ عظیم اُمت

مسلمہ کا فرد ہے۔ اور جغرافیائی بُعد اور مسافت اُسے نہ اُس اُمت سے الگ کر سکتے ہیں اور نہ ہی کسی دوسری قوم کا جزو بنا سکتے ہیں، اسلام چھوڑنے کے بعد ہی کسی دوسری قوم کا جزو بن سکتا ہے۔

علامہ اقبالؒ نے جب دو قومی نظریہ کا تصور پیش کیا تھا تو اُسے صرف ہندی مسلمانوں تک محدود نہیں رکھا تھا۔ (پاکستان کا اس زمانے میں ابھی تصور تک بھی ذہنوں میں نہیں آیا تھا)، انہوں نے اس پیغام کو تمام دنیا کے مسلمانوں تک پھیلا دیا۔ (مثلاً، انہوں نے ۱۹۲۲ء میں، پہلی جنگ عظیم کے بعد، تمام مسلم ممالک کی بالعموم اور ترکی کی بالخصوص حالت بڑی سقیم ہو رہی تھی، جملہ عالم اسلام کو مخاطب کر کے کہا تھا کہ یاد رکھو ہماری نکبت و زبوں حالی کا ایک ہی علاج ہے، اور وہ یہ کہ ؎

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے — نیل کے ساحل سے لیکر تابخاکِ کاشغر
جو کرے گا امتیازِ رنگ و خوں مٹ جائے گا — ترکِ خرگاہی ہو یا اعرابیٔ والا گہر
نسل اگر مسلم کی مذہب پر مقدم ہو گئی
اُڑ گیا دنیا سے تو مانندِ خاکِ رہ گذر

اور اس سے اگلے سال (۱۹۲۳ء میں)، انہوں نے اپنی مشہور نظم، طلوعِ اسلام میں انہی اقوام کو مخاطب کر کے کہا کہ : ؎

ہوس نے کر دیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوعِ انساں کو — اخوت کا بیاں ہو جا محبت کی زباں ہو جا
یہ ہندی، وہ خراسانی، یہ افغانی، وہ تورانی — تو اے شرمندۂ ساحل اُچھل کر بے کراں ہو جا
غبار آلودۂ رنگ و نسب ہیں بال و پر تیرے!
تو اے مرغِ حرم، اُڑنے سے پہلے پرفشاں ہو جا

وہ عمر بھر اسی طرح وحدتِ اُمت کے اس پیغام کو عام کرتے رہے۔ اس لئے کہ وہ حقیقی اسلام کے داعی تھے اور اسلام اور وحدتِ اُمت لازم و ملزوم ہیں۔ لیکن مسلمانانِ عالم، جو حقیقی اسلام کو نظر انداز کر کے دنیا کی دوسری قوموں کی طرح جغرافیائی حدود میں بٹ کر مختلف قومیں بن چکے تھے، انہوں نے اس پیغام کا کوئی اثر نہ لیا۔

اس کے بعد علامہ اقبالؒ نے اس نظریے کو عملی شکل دینے کے لئے اسے پاکستان کے خطۂ زمین تک سمٹایا اور اس کی ابتداء ہندوستانی مسلمانوں سے کی۔ انہوں نے اس خطۂ زمین کا تصور ہی اس لئے دیا تھا کہ اس میں اسلام کو اس کی حقیقی شکل میں عملاً نافذ کیا جا سکے۔ اس اعتبار سے اسلام، دو قومی نظریہ، اور پاکستان

ایک ہی حقیقت کے مختلف گوشے تھے۔ پاکستان وجود میں آگیا، لیکن یہ دیکھ کر تاسف ہی نہیں، صدمہ ہوتا ہے کہ اس میں حقیقی اسلام کا احیاء تو ایک طرف، ہم پاکستانی مسلمان بھی ایک اُمت نہیں بن سکے۔ ہم میں صوبائی تقسیم بدستور قائم ہے۔ یہ صوبائی تقسیم نہیں، درحقیقت نسلی تفریق ہے، اور وہ بھی اس قدر گہری کہ ایک ہی نسل کے ایک ہی صوبے میں بسنے والے پاکستانی مسلمان ہندوؤں کی طرح ذاتوں، برادریوں، گوتوں تک میں بٹے ہوتے ہیں اور باہمی تفریق و تقسیم کی گرہوں کو مضبوط سے مضبوط تر کرتے چلے جا رہے ہیں۔ ہم میں قدرِ مشترک صرف مسلمان کا لفظ ہے۔ اس سے زیادہ اس کا مفہوم کچھ نہیں۔ ظاہر ہے کہ ان حالات میں اگر ہم ... دو قومی نظریہ کے الفاظ دہراتے ہیں تو اس کا عملی نتیجہ تو کچھ نہیں نکل سکے گا۔ لہٰذا، جہاں ہم اُن لوگوں کی مخالفت کرتے ہیں جو دو قومی نظریہ کے مخالف ہیں، ہمیں ان لوگوں کی بھی اسی طرح مخالفت کرنی چاہیئے جو لفظی طور پر تو دو قومی نظریہ کے قائل ہیں، لیکن عملاً ایک اُمت بننے کے لئے کوئی عملی قدم نہیں اٹھاتے۔ اس وقت مسلمانانِ عالم کے لئے بالعموم اور پاکستانی مسلمانوں کے لئے بالخصوص مقدم ترین مسئلہ وحدتِ اُمت کی تشکیل کا ہے جب تک یہ وحدت قائم نہیں ہوتی نہ مملکتی سطح پر ہمارا کوئی مسئلہ حل ہو سکتا ہے، اور نہ ہی بین المملکتی سطح پر۔

والسلام

پرویز

۲۱ نومبر ۱۹۸۰ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

احترامِ آدمیت

کس نگردد در جہاں محتاجِ کس
نکتۂ شرعِ مبیں این است و بس!

بتقریب یومِ اقبالؒ اپریل ۱۹۸۱ء

پرویز

عزیزانِ گرامی قدر! سلام ورحمت!

جو حضرات میرے ہفتہ واری درسِ قرآن مجید میں شریک ہوتے ہیں، یا جن کی نگاہوں سے میری تحریریں گزرتی ہیں، وہ جانتے ہیں کہ میں کس طرح قرآنی حقائق کی تشریح و تفسیر، کلامِ اقبالؒ سے کرتا ہوں۔ اس سے جہاں قرآنی معارف وضاحت سے سامنے آجاتے ہیں، وہاں خود اقبالؒ کا شعر بھی فلک بوس بلندیوں تک جا پہنچتا ہے۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو اقبالؒ کا احسان حدود فراموش ہوجاتا ہے۔ عالمگیر انسانیت پر احسان اس اعتبار سے کہ اس وقت اقوامِ عالم جن زہرہ گداز مصائب اور اضطراب انگیز آلام کا شکار ہو رہی ہیں، اُس نے انہیں ان سے نجات حاصل کرنے کا راستہ بتایا۔ ملّتِ اسلامیہ ہندیہ پر اس کا یہ احسان کہ اس نے، ان کے لئے ایک ایسی آزاد مملکت کی نشاندہی کی جس میں وہ اقدارِ خداوندی کے مطابق نظام قائم کر کے صحیح آزادی حاصل کر سکیں۔ اور پھر ان کا احسانِ عظیم اس ہیچمدان پر کہ جس کی قرآن فہمی کا طریق فکرِ اقبالؒ کا رہینِ منّت ہے۔ یہی ہے احسانات اقبالؒ کی وہ سرگونہ اہمیت جس کی یاد تازہ کرنے کے لئے میں ایسی تقاریب پر خصوصی خطاب پیش کیا کرتا ہوں۔

جیسا کہ آپ نے اعلان میں دیکھ لیا ہوگا، میرے آج کے خصوصی درس کا موضوع ہے: ؎

کس نگردد در جہاں محتاجِ کس نکتۂ شرعِ مبیں، این است و بس!

یعنی اسلام کا ملخّص اور شریعتِ قرآنیہ کا منتہیٰ یہ ہے کہ دنیا میں کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا محتاج نہ رہے۔

اقبالؒ نے ان دو چھوٹے چھوٹے مصرعوں میں، اسلام کے مقصود و منتہیٰ کو سمٹا کر رکھ دیا ہے۔ قرآن کریم کا اعلان ہے کہ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْ آدَمَ ..... ﴿۱۷/۷۰﴾ "خدا نے ہر انسان کو، محض انسان ہونے کی جہت سے واجب التکریم پیدا کیا ہے"۔ آپ دیکھئے! اس میں کافر و مومن کی تمیز و تفریق نہیں۔ (یہ تفریق آگے جا کر شروع ہوتی ہے) اس نے ہر انسان کو واجب التکریم قرار دیا ہے۔ اور یہی (شرف و تکریم انسانیت) پیغام اقبالؒ کا بھی منتہیٰ ہے۔

برتر از گردوں مقامِ آدم است　　　　اصلِ تہذیب، احترامِ آدم است

اس، مقصود و مطلوب پیامِ خداوندی کے بعد، اقبالؒ نے بتایا ہے کہ انسان کو اس عزت و تکریم سے محروم کس طرح کیا جاتا ہے۔ اس نے (بصیرت قرآنی کی روشنی میں) کہا ہے کہ مستبد قوتیں سامانِ رزق کو اپنے قبضے میں لے کر، کمزور انسانوں کو ضروریاتِ زندگی کے لئے ان کا محتاج بنا دیتی ہیں، اور جب وہ ان کا محتاج ہو جاتا ہے تو پھر وہ اسے اپنا محکوم بنا لیتی ہیں۔ قرآنی نظام، رزق کی تقسیم اس طرح کرتا ہے کہ کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا محتاج ہی نہیں رہتا۔ اور جب وہ کسی انسان کا محتاج نہیں رہتا، تو کسی کا محکوم بھی نہیں بنتا۔

جنّتِ ارضی

اس (اقبالؒ) نے جنّتِ ارضی کی خصوصیت یہ بتائی ہے کہ:-

کس دریں جا، سائل و محروم نیست
عبد و مولا، حاکم و محکوم نیست!

چونکہ اس میں کوئی بھی اپنی ضروریاتِ زندگی کے لئے کسی کا محتاج نہیں ہوتا، اس لئے اس معاشرہ میں غلام اور آقا۔ حاکم اور محکوم کی تفریق ہی نہیں ہوتی۔ اقبالؒ نے جو کہا کہ:-

بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے　　　تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

تو وہ اسی جنّتِ ارضی کی خصوصیت ہے جو قرآنی نظام سے وجود میں آتی ہے۔

شاعر نہیں

اقبالؒ کے متعلق بنیادی غلط نگہی یہ ہے کہ ہم نے اسے یا تو ایک شاعر سمجھا ہے اور یا فلاسفر ——— وہم نے اسے جو سب سے بڑا "اعزاز" بخشا ہے۔ وہ "شاعرِ مشرق" کا ہے۔ وہ عمر بھر کہتا رہا کہ بابا! میں شاعر نہیں!

مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ　　　کہ میں ہوں محرمِ رازِ درونِ میخانہ

بلکہ تنگ آکر یہاں تک بھی کہنے پر مجبور ہو گیا کہ :-

نہ پنداری کہ من بے بادہ مستم — مثالِ شاعراں افسانہ بستم
نہ بینی خیر ازاں مردِ فرودست — کہ بر ما تہمتِ شعر و سخن بست

یہ اس لئے کہ :-

شاعر کی نوا مردہ و افسردہ و بے ذوق — افکار میں سرمست، نہ خوابیدہ، نہ بیدار

نہ فلاسفر

جہاں تک فلسفہ کا تعلق ہے، اس نے دو لفظوں میں ساری بات کہہ دی کہ — ہے فلسفہ زندگی سے دوری! — اور فلاسفر سے برملا کہا کہ —

اگر نہ سہل ہوں تجھ پہ زمیں کے ہنگامے — بری ہے مستیٔ اندیشہ ہائے افلاکی

چنانچہ وہ عمر بھر زمین کے ہنگامے سہل کرنے کی تدابیر سوچتے رہے۔ ان ہنگاموں میں سرِ فہرست روٹی کا مسئلہ ہے۔ جس سے محرومی سے، محتاجی پیدا ہوتی ہے۔ جو شرف و تکریمِ انسانیت کو کچل کر رکھ دیتی ہے۔

یہ مسئلہ کب سے ان کی توجہ کا مرکز بنا، بہت کم لوگوں کو معلوم ہے۔ یوں تو ہمارا دور، اقتصادیات کا زمانہ (AGE OF ECONOMICS) کہلاتا ہے لیکن ہمارے ہاں اس نے بہت تھوڑے ... عرصہ سے اہمیت اختیار کی ہے۔ اقبالؒ کا قلبِ حساس اور نگہ دور بیں اس کی منتظر نہیں تھی کہ یہ مسئلہ یہاں اہمیت اختیار کرے تو وہ لب کشائی کرے۔ اُردو زبان میں اقتصادیات پر سب سے پہلی کتاب ۱۹۰۳ء میں شائع ہوئی اس کے مصنف اقبالؒ تھے۔ حالانکہ تعلیم کے زمانے میں اقتصادیات (اکنامکس) ان کا اعلیٰ مضمون بھی نہیں تھا۔ اور

علم الاقتصاد

ان کی عمر بھی تیس بتیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔ اتنی سی عمر میں فلسفہ کے اس ... طالب علم نے وہ کتاب لکھی جس کے دیباچہ میں کہا :-

"اس میں کچھ شک نہیں کہ تاریخِ انسانی کے سیلِ رواں میں، اصولِ مذہب بھی بے انتہا مؤثر ثابت ہوئے ہیں۔ مگر یہ بات بھی روزمرہ کے تجربہ اور مشاہدہ سے ثابت ہوتی ہے کہ روزی کمانے کا دھندا ہر وقت انسان کے ساتھ ساتھ ہے اور چپکے سے اس کے ظاہری اور باطنی قویٰ کو اپنے سلسلے میں ڈھالتا رہتا ہے۔ ذرا خیال کرو کہ غریبی، یا یوں کہو کہ ضروریاتِ زندگی کے کامل طور پر پورا نہ ہونے سے انسانی طرزِ عمل کہاں تک متاثر ہوتا ہے۔ غریبی، قوائے انسانی پر بہت برا اثر ڈالتی ہے۔ بلکہ بسا اوقات انسانی روح کے مجلا آئینہ کو اس قدر زنگ آلود کر دیتی ہے کہ اخلاقی، اور

تمدنی لحاظ سے اس کا وجود و عدم برابر ہو جاتا ہے۔ معلم اوّل، یعنی حکیم ارسطو سمجھتا تھا کہ غلامی تمدنِ انسانی کے قیام کے لئے ایک ضروری جزو ہے۔ مگر مذہب اور زمانہ حال کی تعلیم نے انسان کی جبلّی آزادی پر زور دیا اور رفتہ رفتہ مہذّب قومیں محسوس کرنے لگیں کہ یہ وحشیانہ تفاوتِ مدارج، بجائے اس کے کہ قیامِ تمدّن کے لئے ایک ضروری جزو ہو، اس کی تخریب کرتا ہے اور انسانی زندگی کے ہر پہلو پر نہایت مذموم اثر ڈالتا ہے۔ اسی طرح اس زمانے میں یہ سوال پیدا ہوا ہے کہ آیا مفلسی بھی نظمِ عالم میں ایک ضروری جزو ہے؟ کیا یہ ممکن نہیں کہ ہر فرد مفلسی کے دکھ سے آزاد ہو؟ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ گلی کوچوں میں چپکے چپکے کراہنے والوں کی دلخراش صدائیں ہمیشہ کے لئے خاموش ہو جائیں اور ایک درد مند دل کو ہلا دینے والے افلاس کا دردناک نظّارہ ہمیشہ کے لئے صفحۂ عالم سے حرفِ غلط کی طرح مٹ جائے۔" (اقبالؒ اور قرآن۔ ص۱۷۸)

اس کے بعد یہ نوجوان، مزید تعلیم کے حصول کے لئے یورپ چلا گیا۔ اس زمانے میں یورپ میں، نظامِ سرمایہ داری انتہائی عروج پر تھا۔ یہ نظام کن بنیادوں پر استوار تھا، اس کے متعلق میں اس مقام پر صرف ایک اقتباس پر اکتفا کروں گا۔ اس نظام کے ایک علمبردار WILLIAM TOWNSEND نے ایک کتاب لکھی تھی: 'DISSERTATION ON THE POOR LAWS'۔ اس میں اس نے کہا تھا:

"بھوک کا کوڑا ایسا سخت ہے جو وحشی سے وحشی اور تُند خو سے تُند خو جانور کو رام کر دیتا ہے۔ اس سے سرکش سے سرکش انسان بھی مطیع و فرمانبردار بن جاتا ہے۔ اس لئے اگر تم غریبوں سے کام لینا چاہتے ہو تو اس کا ذریعہ فقط ایک ہے۔ یعنی بھوک ——— بھوک ہی وہ جذبۂ محرکہ ہے جس سے غریب اور محتاج ہر قسم کا کام کرنے پر آمادہ ہو سکتے ہیں۔"

(بحوالہ۔ نظامِ ربوبیت۔ ص۲۲۳)

یورپ میں اقبالؒ نے ان کوڑوں کے خونچکاں زخموں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ واپسی پر انہوں نے ۱۹۱۱ء میں، علی گڑھ میں، وہ معرکہ آرا تقریر کی جس کا شہرہ آج تک قائم و دائم ہے۔ (مولانا) ظفر علی خان (مرحوم) نے اس کا اردو میں ترجمہ کیا تھا۔ جس کا عنوان تھا۔ **ملّتِ بیضا پر ایک عمرانی نظر۔**

مسلمانوں کا افلاس

اس میں اقبالؒ نے کہا تھا:

"یقیناً کسی کو اس بات سے انکار نہ ہوگا کہ غریب مسلمان کی اقتصادی حالت نہایت ہی افسوسناک اور

قابل رحم ہے۔ شہروں میں جہاں کی آبادی کا جزوِ غالب مسلمان ہیں۔ معمولی درجہ کے مسلمانوں کی قلیل اُجرت، غلیظ مکان، اور ان کے پیٹ بھر روٹی کو ترستے ہوئے بچوں کا حسرت ناک نظارہ کس نے نہیں دیکھا؟ لاہور کے کسی اسلامی محلّہ میں جا نکلو۔ ایک تنگ و تاریک کوچہ پر تمہاری نظر پڑے گی۔ جس کے وحشت زا سکوت کے طلسم کو رہ رہ کر یا تو لاغر و نیم برہنہ بچوں کی چیخ پکار یا کسی پردہ نشین بڑھیا کی لجاجت آمیز صدا توڑتی ہوگی۔ جس کی سوکھی اور مرجھائی ہوئی انگلیاں برقع میں سے نکل کر خیرات کے لئے پھیلی ہوئی ہوں گی۔ یہ تو گلی کی حالت تھی۔ الم زدہ گھروں کے اندر جا کر دیکھو تو صدہا مرد اور عورتیں ایسی پاؤ گے۔ جنہوں نے کبھی اچھے دن دیکھے تھے لیکن آج فاقہ کر رہی ہیں۔ کئی دن سے اناج کا ایک دانہ تک منہ میں اُڑ کر نہیں گیا۔ لیکن غیرت اور خودداری اجازت نہیں دیتی کہ خیرات کے لئے کسی کے آگے ہاتھ پساریں۔ ہمارے نوجوان علم بردارانِ اصلاحِ تمدّن جو پردہ کی رسم کو ہماری قوم کے قوٰی روز افزوں انحطاط کا باعث قرار دینے کے عادی ہیں شاید نہیں جانتے کہ اس انحطاط کا اصلی ذمّہ دار پردہ نہیں بلکہ یہ جان فرسا افلاس ہے جو ہماری قوم کے ادانی و اقاصی کو کھائے جا رہا ہے۔" (بحوالہ مضامینِ اقبالؒ۔ مرتّبہ تصدّق حسین تاج۔ صہ ۱۰۳)

اس کے بعد علامہ اقبالؒ، عمر بھر، "بھوک سے کراہنے والوں کی دلخراش صداؤں کو ہمیشہ کے لئے ختم کرنے کے لئے" مصروفِ جہاد رہے۔ اس کا علاج، قرآن کے معاشی نظام کا قیام تھا جس کے لئے انہوں نے پاکستان کا تصوّر عطا فرمایا تھا۔

علامہ اقبالؒ کے اس جہاد کے تین نمایاں مراحل ہمارے سامنے آتے ہیں۔ قلّتِ وقت کے پیشِ نظر میں ان مراحل پر مختصر انداز سے روشنی ڈال سکوں گا۔

مرحلۂ اوّل ۔ محنت کشوں کا مسئلہ

پہلی عالمگیر جنگ کے بعد، اقوامِ یورپ جس طرح ترکی کے حصّے بخرے کر کے، اس کی قوّت اور شوکت کو ہمیشہ کے لئے ختم کرنے کے درپے تھیں، اس کے احساس سے اقبالؒ کے قلبِ درد آگیں کی فلک رس صدائیں، اس زہرہ گداز نظم کی صورت میں لرزہ انگیز ہوئی تھیں جس کا عنوان "خضرِ راہ" ہے۔ اس کا عمودی موضوع

تو یہ تھا کہ :-

لے گئے تثلیث کے فرزند میراثِ خلیل ۔۔۔ خشتِ بنیادِ کلیسا بن گئی خاکِ حجاز!

لیکن اس میں، اُن اہم مسائل کا حل بھی (بزبانِ خضر) پیش کیا گیا ہے جن سے اس زمانے میں دنیا وقفِ اضطراب تھی۔ اس میں ایک اہم ترین مسئلہ "سرمایہ و محنت" کا بھی ہے اس کے متعلق اقبالؒ کے سوال کے جواب میں خضر کہتا ہے :-

بندۂ مزدور کو جا کر مرا پیغام دے ۔۔۔ خضر کا پیغام کیا! ہے یہ پیامِ کائنات!
اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دارِ حیلہ گر ۔۔۔ شاخِ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات
دستِ دولت آفریں کو مزد یوں ملتی رہی ۔۔۔ اہلِ ثروت جیسے دیتے ہیں غریبوں کو زکات
مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار ۔۔۔ انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات

اُٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے (بانگِ درا)

یہ ۲۳-۱۹۲۲ء کی بات ہے۔ اس کے بعد، پیامِ مشرق کے آخری باب میں اس موضوع پر بڑی فکر انگیز بحث سامنے آتی ہے۔ لیکن ایک تو وہ بحث عمیق فلسفیانہ ہے اور دوسرے وہ فارسی زبان میں ہے، اس لئے ہم اس سے صرفِ نظر کرتے ہوئے، بالِ جبریل تک پہنچ جاتے ہیں، اس میں، دو تین مربوط نظمیں بڑی دلچسپ بھی ہیں اور معنی خیز بھی۔ اس سلسلہ کی پہلی نظم کا عنوان ہے ۔

لینن ——— خدا کے حضور

جیسا کہ معلوم ہے، مارکسزم کا مشہور لیڈر اور مفکر، لینن، خدا، وحی، آخرت، سب کا منکر تھا۔ اس کا "خدا کے حضور" نظر آنا بڑا تعجب انگیز سا ہے۔ لیکن وہ اپنے سوال تک پہنچنے سے پہلے، اس معمّہ کو خود ہی حل کر دیتا ہے جب کہتا ہے کہ جو گتھی فلسفہ نہیں سلجھا سکا تھا، اسے عینی مشاہدہ نے حل کر دیا۔ تو (خدا) میرے سامنے ہے اس لئے تیرے وجود سے اب کیسے انکار کیا جا سکتا ہے؟ اس تمہید کے بعد وہ کہتا ہے :-

اک بات اگر مجھ کو اجازت ہو تو پوچھوں ۔۔۔ حل کر نہ سکے جس کو حکیموں کے مقالات
جب تک میں جیا خیمۂ افلاک کے نیچے ۔۔۔ کانٹے کی طرح دل میں کھٹکتی رہی یہ بات
گفتار کے اسلوب پہ قابو نہیں رہتا ۔۔۔ جب روح کے اندر متلاطم ہوں خیالات

آپ نے غور فرمایا کہ اقبالؒ کے اس اسلوبِ بیان میں، وہ لینن کس طرح چلمنی انداز سے سامنے آ رہا ہے جو زندگی بھر خدا کا منکر ہی نہیں، انتہائی درجہ کا سرکش تھا، اور اب خدا سے مخاطب! اس کی (سابقہ) خوئے سرکشی، روح میں تلاطم برپا کر رہی ہے، لیکن احترامِ خداوندی، دل کی بات بیباکانہ زبان تک آنے کے راستے میں حائل ہے۔ بات حلق تک آتی ہے، پھر لوٹ جاتی ہے جھجکتے اور لرزتے ہوئے، بصد توقف و تامل، اسے پھر نوکِ زبان تک لانے کی کوشش (بلکہ جرأت) کرتا ہے۔ کچھ ایسا ہی تامل اور اضطراب تھا جس سے تنگ آ کر ایک وقت طلسمِ پیچ و تاب نے کہا تھا کہ:

از سینۂ تا بجپند بر آرم، فرو برم ایں نیم قطرہ خوں کہ ز مژگاں چکیدنی است

اب سنیے وہ بات جسے لینن اس صبر آزما توقف کے بعد زبان تک لایا۔ کہا کہ میں جانتا ہوں کہ "تو خالقِ اعصار و نگارندۂ آنات" ہے، لیکن میں معلوم یہ کرنا چاہتا ہوں کہ:

وہ کون سا آدم ہے کہ تو جس کا ہے معبود؟ وہ آدمِ خاکی کہ جو ہے زیرِ سماوات؟

یہ پوچھنے کی ضرورت اس لئے پڑی کہ:

مشرق کے خداوند، سفیدانِ فرنگی مغرب کے خداوند درخشندہ فلزات!

مشرق میں، سفید فام مغربی اقوام کی پرستش ہوتی ہے۔ اور مغربی اقوام چاندی سونے (دولت) کی پرستار ہیں۔ ان دونوں کے خدا تو یہ ہیں! میں معلوم یہ کرنا چاہتا ہوں کہ آپ کون سے آدم کے خدا ہیں؟

آپ نے غور فرمایا کہ اقبالؒ کا تبیانِ حقیقت کا انداز کس قدر بلیغ اور حسین ہوتا ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ اس وقت خدا کی حکمرانی دنیا میں کہیں بھی نہیں، اس لئے لینن کا یہ سوال بالکل فطری ہے، اور ایسا جس کا جواب کوئی نہیں بن پڑ سکتا ہے کہ وہ کون سا آدم ہے کہ تو جس کا ہے معبود؟ ہم پر تو منکرینِ خدا ہونے کا الزام دھر دیا۔ لیکن میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ خدا کے مومن کون ہیں، اور وہ کس دنیا میں بستے ہیں؟

اقبالؒ نے اس موضوع پر بڑی تفصیل سے لکھا ہے کہ نہ دیر میں نہ حرم میں خودی کی بیداری — اور یہ تیرے مومن و کافر تمام زناری — وہ نہ اپنے آپ کو دھوکا دیتا ہے، نہ دوسروں کو یہ کہہ کر فریب میں رکھنا چاہتا ہے کہ دنیا میں نوّے کروڑ مومن بستے ہیں۔ وہ واضح الفاظ میں کہتا ہے کہ:

تیرے محیط میں کہیں، گوہرِ زندگی نہیں ڈھونڈ چکا میں موج موج دیکھ چکا صدف صدف

اس میں نہ مشرق کی استثناء ہے نہ مغرب کی تمیز!

مغرب ز تو بیگانہ مشرق ہمہ افسانہ — وقت است کہ در عالم نقش دگر انگیزی

لینن کہتا ہے کہ اہلِ مشرق جن (مغربی) خداؤں کو پوجتے ہیں، ان کے ہاں کیفیت یہ ہے کہ :۔

یہ علم، یہ حکمت، یہ تدبر، یہ حکومت — پیتے ہیں لہو، دیتے ہیں تعلیم مساوات

اس کے بعد وہ اپنے ترکش سے ایک اور تیر نکالتا ہے، اور کہتا ہے کہ :۔

تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں — ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات

دنیائے اخلاق کا ایک قدیم معمہ ہے جسے ذہنِ انسانی آج تک حل نہیں کر سکا۔ معمہ یہ ہے کہ :۔

اگر خدا خیر ہے، تو دنیا میں شر کا وجود کیوں ہے؟

اگر شر کا وجود، اس کی مرضی سے ہے تو وہ خیر نہیں۔

اور اگر شر کا وجود اس کی مرضی کے خلاف ہے تو وہ قادرِ مطلق نہیں۔

لینن نے خدا سے کہا ہے کہ ترا دعوےٰ ہے کہ تو عادل بھی ہے اور قادر بھی۔

عدل کا تقاضا ہے کہ بندۂ مزدور کو اس کی محنت کا ماحصل ملے۔ لیکن وہ نہیں مل رہا اور بندۂ مزدور کے اوقات سخت تلخ ہیں۔ اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ خدا عادل تو ہے لیکن اس کے فیصلے عملاً نافذ نہیں ہوتے۔ اس کے یہ معنی ہوئے کہ وہ قادر نہیں۔ JUDICIARY تو اس کے پاس ہے لیکن EXECUTIVE اس کے پاس نہیں۔ اگر ایسا ہی ہے تو اس کے عادل ہونے کا فائدہ کیا ہے!

اور اس کے بعد وہ اس نہایت پیچیدہ سوال کا جواب خود ہی دیتا ہے کہ میں مانتا ہوں کہ تو عادل بھی ہے اور قادر بھی۔ لیکن تیرا قانون یہ ہے کہ انسان کے عمل اور اس کے نتائج کے محسوس طور پر سامنے آنے میں مہلت کا وقفہ ہوتا ہے۔ اور یہ خود تقاضائے عدل ہے، جس طرح دنیاوی قانون کی رُو سے بھی حاملہ عورت کی سزائے موت، وضعِ حمل تک ملتوی کر دی جاتی ہے۔ اس قانونِ مہلت کی رُو سے وہ پوچھتا ہے کہ :۔

کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ؟ — دنیا ہے تری منتظرِ یومِ مکافات!

یہ نہیں کہ مجھے یقین نہیں کہ سرمایہ داری کا سفینہ ڈوبے گا یا نہیں۔ سوال صرف 'کب' کا ہے۔ یہ کب ڈوبے گا؟ تیری دنیا اس دن کا بڑی بے تابی سے انتظار کر رہی ہے! اس لئے آپ ذرا جلدی کریں۔

"کب" کا یہ سوال فرشتوں کے دل میں بھی مچل رہا ہے جس کا تذکرہ اگلی نظم میں سامنے لایا گیا ہے۔ اس کا عنوان

فرشتوں کا گیت

ہے "فرشتوں کا گیت"۔

قرآن مجید نے قصۂ آدم، اپنے مخصوص تمثیلی انداز میں بیان کیا ہے۔ وہ کسی خاص شخص (آدم) یا ایک جوڑے (آدم اور حوّا) کا تذکرہ نہیں۔ وہ خود آدمی کی داستانِ حیات ہے۔ وہ تاریخ انسانیت کا تمثیلی بیان ہے۔ اس تمثیل میں یوں سمجھئے گویا ایک مجلس میں خدا اور اس کے فرشتے بیٹھے ہیں اور بات اس مخلوق کی ہو رہی ہے جسے دنیا میں صاحبِ اقتدار بنا کر بھیجا جا رہا ہے۔ وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً... (۲/۳۰) ملائکہ جب اس ہیولیٰ آب وگل پر گہری نگاہ ڈالتے ہیں تو انہیں اس میں خون کے چھینٹے اور آگ کی چنگاریاں نظر آتی ہیں۔ وہ عرض کرتے ہیں أَتَجْعَلُ فِيهَا مَنْ يُفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ۔ بارِ الٰہا! جرأت معاف ہو تو ہم عرض کریں کہ کیا تو کرۂ ارض کو ایسی مخلوق کے حوالے کر دینا چاہتا ہے جو وہاں خوں ریزیاں اور فساد انگیزیاں کرے گی؟ جواب ملا إِنِّي أَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُونَ .... (۲/۳۰) گھبراؤ نہیں! ہم جانتے ہیں جو تم نہیں جانتے۔

اس پر فرشتے خاموش ہو گئے اور نہایت گہری نظروں سے تاریخ انسانیت کا مطالعہ، بلکہ مشاہدہ کرتے رہے۔ جو کچھ وہ دیکھتے اس پر بڑے ضبط اور صبر سے کام لیتے۔ لیکن ضبط کی بھی تو کوئی حد ہوتی ہے۔ ہمارے دور میں پہنچ کر، جب انہوں نے آدم کی عالمگیر سفاکیوں اور ناکاریوں کو دیکھا تو ان سے نہ رہا گیا۔ اور ایک دن بارگاہِ خداوندی میں لب کشائی کی جرأت کر ہی لی۔

لیکن ملائکہ کی جرأتِ لب کشائی اور لینن کے استفسار میں بڑا فرق تھا۔ لینن نے بھی ادب و احترام کو ملحوظ رکھا تھا۔ لیکن اس کے باوجود اس کے حرفِ تمنّا میں، طعن و تشنیع کا کھلا ہوا نشتر نہ سہی، چھپی ہوئی پھانس ضرور تھی۔ ملائکہ کی عرض داشت کا انداز کچھ اور تھا۔ انہوں نے کہا....؎

عقل ہے بے زمام ابھی، عشق ہے بے مقام ابھی نقش گرِ ازل! ترا نقش ہے ناتمام ابھی

اس "ابھی" میں گہری حقیقتیں سربستہ ہیں۔ انہوں نے یہ نہیں کہا کہ "کیوں؟ کیا وہی نہیں ہوا، جو ہم کہتے تھے؟ کیا آدم ویسا ہی نہیں نکلا جیسا ہم نے اندازہ لگایا تھا"؟ انہوں نے کہا یہ.... کہ ہمیں اس کا تو یقین ہے کہ آدم ویسا ہی ہوگا جیسا آپ کی مشیئت میں تھا، لیکن ابھی تک یہ اُس معیار پر پورا نہیں اُترا۔ ابھی یہ نقش ناتمام ہے۔

ارتقائی منازل

اور اس میں عظیم حقیقت پوشیدہ ہے۔ یہ کائنات اور انسان، پہلے ہی دن اپنی مکمل شکل میں وجود پذیر نہیں ہو گئے تھے۔ یہ ابتدائی ہیولیٰ کی صورت میں تخلیق کئے گئے تھے۔ اس کے بعد انہیں ہزارہا ارتقائی منازل طے کرنے کے بعد اس منتہیٰ تک پہنچنا تھا جو ان کا مقصود تھا۔ قرآن مجید میں اس سلسلۂ ارتقاء کے شواہد موجود ہیں اور کلام اقبالؒ میں اس کی بکثرت تفصیلات۔ ذرا ان دو قطعہ بند شعروں کو دیکھئے:۔

یکے در معنئ آدم نگر۔ از من چہ می پرسی؟ ہنوز اندر طبیعت می خلد موزوں شود روزے

چناں موزوں شود ایں پیش پا افتادہ مضمونے کہ یزداں را دل از تاثیر او، پرخوں شود روزے!

یہ پیکر آب و گل ہنوز ارتقائی منازل طے کر رہا ہے۔ اسے تکمیل تک پہنچنے دو، پھر دیکھنا کہ یہ کیا بنتا ہے:۔

مہ و ستارہ سے آگے مقام ہے جس کا وہ مشت خاک ابھی آوارگان راہ میں ہے

ان حقائق کی روشنی میں دیکھئے کہ ملائکہ کی "ابھی" میں کتنے راز سربستہ تھے! انہوں نے عرض کیا تھا کہ بارالہٰا!:۔

عقل ہے بے زمام ابھی، عشق ہے بے مقام ابھی نقش گرِ ازل ترا نقش ہے ناتمام ابھی

عقلِ حیلہ جو کی اس بے زمامی، عشقِ انسانیت ساز کی اس بے مقامی، اور آدم کی ناتمامی کا نتیجہ یہ ہے کہ:۔

خلقِ خدا کی گھات میں رند و فقیہہ و میر و پیر تیرے جہاں میں ہے وہی گردشِ صبح و شام ابھی

تیرے امیر مال مست، تیرے فقیر حال مست بندہ ہے کوچہ گرد ابھی، خواجہ بلند بام ابھی

دانش و دین و علم و فن، بندگئ ہوس تمام
عشق گرہ کشائے کا فیض نہیں ہے عام ابھی
جوہرِ زندگی ہے عشق، جوہرِ عشق ہے خودی
آہ کہ ہے یہ تیغِ تیز، پردگئ نیام ابھی! (بالِ جبریل ص۱۴۸)

ملائکہ کی اس عرضداشت میں اتنا ہی نہیں کہا گیا کہ آدم کی ناکامی کا نتیجہ یہ ہے کہ فساد انگیزیوں اور خونریزیوں کی ابلیسی قوتیں ساری دنیا میں برہنہ رقص کر رہی ہیں۔ انہوں نے ضمناً یہ بھی کہہ دیا کہ جب آدم تکمیل تک پہنچ گیا تو ان میں سے کوئی قوت بھی باقی نہیں رہے گی۔ انہوں نے بھی زیرِ لب یہی کہا تھا کہ بارالہٰا! اس میں اس قدر

تاخیر کیوں ہو رہی ہے۔؟ ؎۱

ملائکہ کی اس عجلت پسندی کے جواب میں، اگلی نظم میں، جس کا عنوان ہے، "فرمانِ خدا (فرشتوں سے) ایک اور بسیط حقیقت کو بے نقاب کیا گیا ہے۔ یہ وہ نظم ہے جس کا صحیح مفہوم نہ سمجھنے سے بڑی تخریب انگیز

فرمانِ خدا

غلط فہمیاں پیدا ہوتی (یا پیدا کی جاتی) ہیں، اور ہمارے "تشدد پسند کمیونسٹ" تو اس شعر کو گلی گلی، کوچے کوچے، گاتے پھرتے اور کہتے ہیں کہ دیکھو! خدا خود "جلاؤ، گھیراؤ" کے طریق کی تاکید کرتا، بلکہ فرشتوں کو ایسا کرنے کا حکم دیتا ہے اور اقبالؒ اس پیغام کو عام کرتا ہے کہ:۔

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

اصل حقیقت کچھ اور ہے۔

خدا کے کائناتی ارتقاء کے پروگرام کی رفتار (ہمارے حساب و شمار کی رُو سے) بڑی سست ہوتی ہے۔ اس میں ایک ایک دن ہزار ہزار سال کا ہوتا ہے۔ وَاِنَّ يَوْمًا عِندَ رَبِّكَ كَأَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّونَ (۲۲/۴۷) بلکہ پچاس پچاس ہزار سال کا (۷۰/۴) اگر اس پروگرام میں انسان کے دست و بازو بھی شریک ہو جائیں، تو پھر یہ مدت انسانوں کے حساب و شمار کے دنوں میں سمٹ آتی ہے۔ انسانی دنیا میں اس قسم کا انقلاب جماعتِ مومنین کے ہاتھوں رونما ہوتا ہے۔ اس کا طریق کار یہ ہے کہ لوگوں کے قلب و دماغ میں انقلاب پیدا کیا جاتا ہے اور ذہنیتوں کے اس انقلاب سے، قوم میں تعمیری انقلاب رونما ہو جاتا ہے۔ یہ طریق کار خود خدا کا متعین فرمودہ ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوا مَا بِاَنفُسِهِمْ ۔۔۔۔۔ (۱۳/۱۱) "خدا کسی قوم کی حالت میں تبدیلی پیدا نہیں کرتا جب تک وہ اپنی ذہنیت میں (نفسیاتی) تبدیلی نہ پیدا کر لے۔" اس طریق انقلاب میں کسی قسم کی تخریب نہیں ہوتی، تباہی نہیں ہوتی، فساد نہیں ہوتا، خونریزی نہیں ہوتی۔

لیکن اگر انسانوں کی ایسی جماعت کھڑی نہ ہو۔ اور دوسری طرف، سلب و نہب کی خون آشام قوتیں حد فراموش ہوتی چلی جائیں، تو پھر مظلوم و محتاج عوام، تنگ آکر اٹھ کھڑے ہوتے ہیں، اور بپھرے ہوئے سیلاب

؎۱ بالِ جبریل ہی کے اس شعر کو دیکھئے: ۔

حرم کے دل میں سوزِ آرزو پیدا نہیں ہوتا کہ پیدائی تری اب تک حجاب آمیز ہے ساقی!

اور جس تپش و خلش اور سوز و گداز کی یہ فغانِ سحری تخلیق ہے، اس کا اندازہ لگائیے!

کی طرح ہر اس چیز کو خس وخاشاک کی طرح بہا کر لے جاتے ہیں جو ان کی لپیٹ میں آجائے۔ وہ سیلاب نہ مسجد و مندر میں تمیز کرتا ہے، نہ ظالم اور مظلوم میں تفریق۔ ان کے جنون خیز پروگرام میں، تخریب ہی تخریب ہوتی ہے تعمیر نہیں ہوتی۔ یہ انقلاب نہیں ہوتا، فساد ہوتا ہے۔ عام اصطلاح میں اسے زمانے کے تقاضے کہا جاتا ہے اور قرآن کی اصطلاح میں "عذاب لانے والے ملائکہ"۔ ہمارے زمانے میں اس قسم کا (وسیع پیمانے پر) "فساد" روس میں برپا ہوا جسے اقبالؒ نے (یوں کہئے گویا) اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ ان کی نگہ حقیقت بین و دوررس نے دیکھا کہ اس پروگرام میں لَا ہی لَا (یعنی تخریب ہی تخریب) ہے۔ اِلَّا (مثبت یا تعمیر) کا شائبہ تک نہیں۔

کردہ ام اندر مقاماتش نگہ　　لا سلاطین، لا کلیسا، لا الٰہ

(پس چہ باید کرد)

میں نے ان کے پروگرام کی مختلف کڑیوں پر غور کیا ہے۔ وہ ظلم و استبداد کی حکومتوں کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔ وہ دیکھتے ہیں کہ یہ قوتیں، مذہبی پیشوائیت کے سہارے مصروفِ جور و ستم رہتی ہیں۔ اس لئے وہ مذہب کو بھی مٹا دینا چاہتے ہیں، لیکن ان کا جوشِ جنون یہیں تک نہیں رہتا۔ آگے بڑھتا ہے۔ وہ خود خدا کی ہستی کا بھی انکار کر دیتے ہیں۔ اس انکار کا نتیجہ یہ ہے کہ انہوں نے ہر قسم کے ضوابطِ اخلاق و اقدار کو مسترد کر دیا ہے۔ لینن کے الفاظ میں، جو اس نے ۱۹۲۰ء میں، یوتھ کمیونسٹ لیگ کی تیسری کانفرنس میں، نوجوانوں سے خطاب کرتے ہوئے کہے تھے:-

"ہم ان تمام ضوابطِ اخلاق کو مسترد کرتے ہیں جو کسی مافوق الفطرت سرچشمہ (یعنی وحیِ خداوندی) یا طبقاتی تصوّر کے پیدا کردہ ہوں۔ ہم علانیہ کہتے ہیں کہ اخلاقیات کا اس قسم کا تصوّر فریب ہے۔ یہ تصور زمینداری اور سرمایہ داری کے مفاد کے تحفظ کی خاطر محنت کشوں اور کاشتکاروں کے دلوں کو تاریکی اور دھند میں رکھنے کے لئے وضع کیا گیا ہے...... ان کا دعویٰ ہے کہ ان کا ضابطۂ اخلاق احکام خداوندی پر مبنی ہے۔ ہم خدا کی ہستی ہی کے قائل نہیں...... ہم کسی ابدی صداقت کے قائل نہیں۔ اس قسم کے اخلاق کے متعلق جس قدر افسانے وضع کئے گئے ہیں، ہم ان سب کا پردہ چاک کر کے رکھ دیں گے۔" (بحوالہ نظامِ ربوبیت۔ صـ۳۳)

یہ ٹھیک ہے کہ اخلاق کا جو ضابطہ مذہبی پیشوائیت کی طرف سے پیش کیا جاتا ہے، وہ نظامِ ملوکیت اور سرمایہ داری کے مفاد کے تحفظ کی ضمانت کے لئے وضع کیا گیا ہے۔ لیکن اسے مسترد کرتے ہوئے، خدا اور مستقل اقدار سے انکار کر دینا، شدّتِ جنون کا نتیجہ ہے۔ جب اخلاق و اقدار کے وجود سے انکار کر دیا جائے تو پھر معاشرہ میں تبدیلی

لانے کے لئے، تشدّد اور تلوار کے سوا کون سا طریق رہ جاتا ہے؟ لینن نے، انجلز کے ایک مقالہ کا حوالہ دیتے ہوئے کہا تھا کہ:-

"انقلاب، ایک ایسا عمل ہے جس کی رُو سے آبادی کا ایک حصّہ، دوسرے حصّہ پر اپنا اختیار اور تسلّط، قوّت و استبداد، نوکِ شمشیر، گولیوں کی بوچھاڑ اور آتشیں گولوں کے دھماکے سے زبردستی قائم کرتا ہے۔" (نظامِ ربوبیّت - صـ۳۴)

روس کا یہی وہ لا کا پروگرام تھا جس کے نتائج و عواقب سے متنبّہ کرتے ہوئے اقبالؒ نے اس سے کہا تھا کہ، یاد رکھو! :-

درمقامِ لانیاساید حیات — سوئے اِلّا می خرامد کائنات
لا و الّا برگ و سازِ اُمّتاں — نفیٔ بے اثبات، مرگِ اُمّتاں

اس کے بعد کہا :-

ایکہ می خواہی نظامِ عالمے — جستۂ اورا، اساسِ محکمے؟

یہ اساسِ محکم کہاں سے ملے گی؟ فرمایا

داستانِ کہنہ شستی باب باب — فکر را روشن کن از اُمّ الکتاب

(اقبالؒ اور قرآن صـ۱۸۸ جلد۱)

ان تصریحات کی روشنی میں کیا آپ ایک لمحہ کے لئے بھی اس کا تصوّر کر سکتے ہیں کہ اقبالؒ کمیونزم کا حامی اور اس کے "جلاؤ گھیراؤ" کے تشدّد آمیز طریقِ کار کا مؤید تھا؟ ۱۹۲۳ء کا ذکر ہے کہ شمس الدین حسن نامی ایک کمیونسٹ نے اپنے ایک مضمون میں لکھ دیا کہ "اقبالؒ ایک اشتراکی ہی نہیں، بلکہ اشتراکیت کے مبلغِ اعلیٰ ہیں۔" علامہ اقبالؒ نے ایک دن کے بھی توقّف کے بغیر، ۲۴ جون ۱۹۲۳ء کے روزنامہ زمیندار میں حسبِ ذیل خط شائع کرا دیا۔

(۱) میرے افکار کو بالشوزم سے منسوب کرنا غلط ہے۔ بالشویک خیالات رکھنا میرے نزدیک دائرہ اسلام سے خارج ہو جانے کے مترادف ہے۔

(۲) میں مسلمان ہوں اور میرا عقیدہ ہے کہ انسانی جماعتوں کے اقتصادی امراض کا بہترین حل قرآنِ مجید نے تجویز کیا ہے۔

(۲) روسی بالشوزم، یورپ کی ناعاقبت اندیشی اور خود غرض سرمایہ داری کے خلاف ایک زبردست ردِّ عمل ہے۔ لیکن مغرب کی سرمایہ داری اور روس کا بالشوزم، دونوں افراط و تفریط کا نتیجہ ہیں۔ اعتدال کی راہ وہی ہے جو قرآن نے ہمیں بتائی ہے۔"

(اقبالؒ اور قرآن۔ صفحہ ۱۹)

اس کے بعد آپ اس نظم کی طرف آیئے جس کے صحیح مفہوم کے سمجھنے کے لئے اس طولانی تمہید کی ضرورت لاحق ہوتی۔ اس نظم میں درحقیقت، عالمگیر انسانیت کو متنبّہ (WARN) کیا گیا ہے کہ اگر تم نے مستبد قوتوں کی دراز دستیوں کو نہ روکا، تو زمانے کے تقاضے، ایسا سیلاب بلا بن کر ابھریں گے جس کے سامنے انسانیت کی کوئی متاعِ حیات بھی ٹھہر نہیں سکے گی۔ یہ وارننگ قرآنِ کریم نے چودہ سو سال پہلے ان الفاظ میں دی تھی کہ:-

وَاتَّقُوا فِتْنَةً لَّا تُصِيبَنَّ الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنكُمْ خَاصَّةً ۖ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ ۝ (۸/۲۵)

"اس فتنہ سے بچنے کی کوئی حفاظتی تدبیر کر لو، کہ جب وہ آتا ہے تو اپنے آپ کو ظالموں تک ہی محدود نہیں رکھا کرتا۔ وہ سب کو اپنی لپیٹ میں لے لیا کرتا ہے۔ یاد رکھو! خدا کا قانونِ مکافات، بڑی قوتوں کا مالک بھی ہے اور مجرموں کا پیچھا کرنے میں انتھک بھی" ——

حذر اے چیرہ دستاں! سخت ہیں فطرت کی تعزیریں!

خدا کے اس جلالی قانونِ مکافات کی تشریح حضورؐ نے ایک نہایت دلنشین مثال کی رُو سے فرمائی۔ ترمذی کی ایک حدیث ہے جس میں حضورؐ نے فرمایا:-

"کچھ لوگ ایک کشتی میں سوار ہوئے۔ ان میں سے کچھ اُوپر کے حصے میں پہنچ گئے۔ کچھ نیچے کے حصے میں۔ جو نچلے حصے میں تھے وہ پانی لینے کے لئے اُوپر گئے۔ اُوپر والوں نے انہیں یہ کہہ کر پانی لینے سے روک دیا کہ اس سے انہیں تکلیف ہوتی ہے۔ نیچے والوں نے کہا:-
بہت اچھا، ہم نیچے سوراخ کر کے پانی حاصل کر لیں گے۔ اب اگر نیچے والوں کو یہ کہہ کر اس اقدام سے نہ روکا گیا تو ظاہر ہے کہ اُوپر اور نیچے والے سب غرق ہو جائیں گے۔ اگر روک دیا گیا، تو سب بچ جائیں گے۔"

(ترمذی۔ جلد دوم۔ باب الفتن)

یہ نتیجہ ہوتا ہے اس طوفان کا جو زمانے کے تقاضوں سے مجبور ہونے والے، عوام کے ہاتھوں برپا ہوتا ہے اور جس کی شعلہ فشانیوں سے کوئی بھی محفوظ نہیں رہتا۔

ان تشریحات کی روشنی میں اس نظم کو دیکھئے جس کا مفہوم سمجھنے میں، میں سمجھتا ہوں، اب آپ کو کوئی دقت نہیں ہوگی۔ نظم کا عنوان ہے۔

فرمانِ خدا — فرشتوں سے

اُٹھو! میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو　　کاخِ اُمرا کے در و دیوار ہلا دو!
گرماؤ غلاموں کا لہو سوزِ یقیں سے　　کنجشکِ فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو
سلطانیٔ جمہور کا آتا ہے زمانہ　　جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے مٹا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی　　اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو
کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے　　پیرانِ کلیسا کو، کلیسا سے اُٹھا دو
حق را بسجودے، صنماں را بطوافے　　بہتر ہے چراغِ حرم و دیر بجھا دو
میں ناخوش و بیزار ہوں مرمر کی سلوں سے　　میرے لیے مٹی کا حرم اور بنا دو

تہذیبِ نوی کارگہِ شیشہ گراں ہے
آدابِ جنوں شاعرِ مشرق کو سکھا دو!

یوں تو اقبالؒ کا پیغام، پوری نوعِ انسان کے لئے تھا لیکن اس کی اوّلین مخاطب، ملّتِ اسلامیہ (مسلمانوں کی قوم تھی) جو، ملوکیت، سرمایہ داری اور مذہبی پیشوائیت، تینوں کی صید زبوں تھی۔ یہ موضوع ایک مستقل تصنیف کا متقاضی ہے اور میں نے اس پر بہت کچھ لکھا ہے۔ وہ اس مظلوم و مقہور قوم سے کہتے ہیں: —

باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری　　اے کشتۂ سلطانی و ملّائی و پیری　　(جاویدنامہ)

۱ؔ　ایک مشہور شعر ہے: —

نہ ہاں! تاں قوم نہ باشی کہ فریبند　　حق را بسجودے و نبی را بدرودے!

۲ؔ　ضربِ کلیم میں ہے: —

اے شیخ! امیروں کو مسجد سے نکلوا دے　　ہے ان کی نمازوں سے محراب ترش ابرو

اقبالؒ نے ملّائی و پیری کے خلاف جو کچھ کہا ہے، اسے تو سردست چھوڑیئے۔ اس نے سلطانی (ملوکیت یا شہنشاہیت) کے خلاف جو بات کہی ہے، میری نظر سے اس کی مثال کہیں نہیں گزری۔ ہمارا آج کا موضوع "محتاجی" ہے۔ یہ

گدائے بے حیا

خیال عام ہے کہ اور لوگ تو، کم و بیش، کسی نہ کسی کے محتاج ہوتے ہیں۔ لیکن بادشاہ (سربراہِ مملکت) کسی کا محتاج نہیں ہوتا۔ سب اس کے محتاج ہوتے ہیں۔ اقبالؒ کہتا ہے کہ یہ غلط ہے۔ وہ سب سے زیادہ محتاج ہوتا ہے۔ قبل اس کے کہ ہم اس نکتہ کی تائید میں اقبالؒ کے دلائل تک پہنچیں، اصولی طور پر یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ محتاج کسے کہتے ہیں۔ مختصر الفاظ میں یوں سمجھئے کہ جو شخص اپنی محنت سے رزق حاصل کرتا ہے وہ کسی کا محتاج نہیں ہوتا (یہ اور بات ہے کہ اس کا رزق چھین کر اسے محتاج بنا دیا جائے) محتاج وہ ہوتا ہے جو دوسروں کی کمائی پر زندگی بسر کرے۔ محتاج کی اس DEFINITION کے بعد، جس کے حقیقت ہونے میں کسی کو شبہ نہیں ہو سکتا، بالِ جبریل کی اس نظم کو سنیئے جس کا عنوان ہے، گدائیؒ ——— سنیئے، اور محوِ حیرت رہ جایئے کہ ہم کیا سُن رہے ہیں، محوِ حیرت ہی نہیں بلکہ قدرے محجوب بھی کہ ایسی بدیہی بات، اس سے پہلے ہماری سمجھ میں کیوں نہ آئی! جس قدر اس کا موضوع انوکھا ہے اسی قدر اس کا اندازِ بیان بھی شوخ ہے۔ فرماتے ہیں: —

میکدے میں ایک دن اک رندِ زیرک نے کہا ہے ہمارے شہر کا والی گدائے بے حیا

ذرا دیکھو کہ: —

تاج پہنایا ہے کس کی بے کلاہی نے اسے؟ کس کی عریانی نے بخشی ہے اسے زرّیں قبا؟

اس کے آبِ لالہ گوں کی خونِ دہقاں سے کشید تیرے میرے کھیت کی مٹی ہے اس کی کیمیا

اس کے نعمت خانے کی ہر چیز ہے مانگی ہوئی دینے والا کون ہے؟ مردِ غریب و بے نوا!

مانگنے والا گدا ہے! صدقہ مانگے یا خراج کوئی مانے یا نہ مانے، میر و سلطان سب گدا [1]

ایک غزل میں وہ باندازِ دگر اسی خیال کو پیش کرتے ہیں، جہاں لکھتے ہیں: —

بنگاہِ فقر میں شانِ سکندری کیا ہے! خراج کی جو گدا ہو، وہ قیصری کیا ہے!

---

[1] بالِ جبریل میں، نظم کے آخر میں لکھا ہے (ماخوذ از انوری) لیکن اقبالؒ نے دیگر متعدد مقامات پر بھی اس موضوع کو پیش کیا ہے۔

ایک اور شعر: ؎

کسے نہیں ہے تمنائے سروری، لیکن　　　خودی کی موت ہو جس میں وہ سروری کیا ہے!

خودی کی موت اسی گداگری سے واقع ہوتی ہے۔ اس باب میں، وہ عہدِ قدیم کی ملوکیت اور عصرِ حاضر کی جمہوریت، دونوں کو ہم سنگ قرار دیتے ہیں جب کہتے ہیں کہ ؎

مجلسِ ملّت ہو یا پرویز کا دربار ہو　　　ہے وہ سلطاں غیر کی کھیتی پہ ہو جس کی نظر

گداگری سے خودی کی موت واقع ہوتی ہے، اور خودی کی موت کے بعد، کمینگی کی زندگی۔ بالِ جبریل ہی میں علامہ نے اس نکتہ کو بڑے دلآویز انداز میں پیش کیا ہے۔ فرماتے ہیں: ؎

اک مفلسِ خود دار یہ کہتا تھا خدا سے　　　میں کر نہیں سکتا گلہ دردِ فقیری!

لیکن یہ بتا، تیری اجازت سے فرشتے　　　کرتے ہیں عطا مردِ فرومایہ کو میری؟

مردِ فرومایہ اس لئے کہ ———— خودی کی موت ہو جس میں وہ سروری کیا ہے؟

قزاقی

ان مقامات میں تو اقبالؒ نے ان والیانِ مملکت کو "گداگر" کہا ہے۔ ضربِ کلیم کی ایک نظم میں وہ انہیں ڈاکو کہہ کر پکارتا ہے۔ سکندر کے سامنے ایک بحری قزاق، مجرم کی حیثیت سے پیش ہوتا ہے۔ سکندر اس سے کہتا ہے: ؎

صلہ تیرا، تیری زنجیر یا شمشیر ہے میری　　　کہ تیری رہزنی سے تنگ ہے دریا کی پہنائی!

قزاق جواب دیتا ہے: ؎

سکندر! حیف تو اس کو جوانمردی سمجھتا ہے　　　گوارا اس طرح کرتے ہیں ہم چشموں کی رسوائی؟

ترا پیشہ ہے سفاکی، مرا پیشہ ہے سفاکی!　　　کہ ہم قزاق ہیں دونوں، تو میدانی میں دریائی

کوئی مانے یا نہ مانے، میر و سلطاں سب گدا!

اس مقام پر ایک اہم سوال پیدا ہوتا ہے جسے سامنے لائے بغیر، آگے بڑھنے کو جی نہیں چاہتا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مملکت تو قرآن بھی قائم کرتا ہے۔ اس مملکت کا سربراہ بھی ہوتا ہے۔ اس سربراہ کو اپنے گذارے کے لئے بہر حال، مملکت کی آمدنی سے کچھ لینا پڑتا ہے جو دوسروں کی محنت سے حاصل ہوتی ہے۔ تو کیا اسے بھی "گدا" کہا جائے گا؟

آپ ان سربراہانِ مملکت کی زندگی کو سامنے لائیے اور پھر خود فیصلہ کیجئے کہ انہیں کیا کہا جائیگا؟

خلیفہ کا وظیفہ حضرت ابوبکر رضؓ صدیق، منصبِ خلافت پر سرفراز ہونے سے پہلے، کپڑے کا کاروبار کرتے تھے اور خاصے مرفہ الحال تھے۔ خلیفہ منتخب ہونے کے دوسرے دن حضرت عمر رضؓ نے دیکھا کہ وہ کپڑے کا گٹھا اٹھائے بازار کی طرف جا رہے ہیں۔ انہوں نے پوچھا کہ آپ کدھر جا رہے ہیں؟ جواب دیا کہ اپنے کام پر۔ انہوں نے کہا کہ خلافت کی ذمہ داریاں قبول کر لینے کے بعد، آپ کا وقت آپ کا نہیں رہا، ملت کا ہو گیا ہے۔ اس لئے آپ اسے ذاتی کام کے لئے صرف نہیں کر سکتے۔ انہوں نے کہا کہ ایسا نہ کروں گا تو کھاؤں گا کہاں سے؟ حضرت عمر رضؓ نے کہا کہ اس کا انتظام کرنا اُمت کے ذمے ہے۔ چنانچہ سوال درپیش ہوا کہ خلیفہ کا وظیفہ، یعنی حق الخدمت کیا ہونا چاہیئے۔ بعض روایات میں ہے کہ آپ نے کہا کہ اسے میں خود اپنے لئے مقرر کر دوں گا۔ چنانچہ آپ نے معلوم کیا کہ مدینہ میں ایک مزدور کی یومیہ اُجرت کیا ہے! اس کے مطابق آپ نے اپنا وظیفہ مقرر کیا۔ دوسری روایات میں ہے کہ اسے دیگر صحابہ رضؓ نے مقرر کیا تھا اور معیار تھا کہ قریش کے معمولی فرد کا اندازِ زندگی۔ کچھ بھی تھا۔ جب آپ رضؓ کی وفات کا وقت قریب آیا تو آپ نے اپنے اعزا سے کہا کہ میں نہیں کہہ سکتا کہ جو کچھ میں نے مسلمانوں کے بیت المال میں سے لیا ہے اس کے مطابق ان کی خدمت بھی کر سکا ہوں یا نہیں، اس کے متعلق قیامت میں باز پرس ہو گی۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کا حساب یہیں چکا دیا جائے۔ ایک مختصر سا قطعۂ زمین میرے پاس ہے۔ اسے فروخت کر دیا جائے اور جس قدر رقم میں نے بیت المال سے لی ہے اسے واپس کر دیا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔

حضرت عمر رضؓ نے اپنے لئے جو وظیفہ مقرر کیا تھا، وہ یہ تھا:-

> "کپڑوں کے دو جوڑے، ایک سردی کا ایک گرمی کا، حج اور عمرہ کے لئے ایک احرام۔ اور میرے اور میرے اہل و عیال کے لئے فی کس اتنا کھانا جو قریش کے ایک آدمی کی خوراک ہے۔ نہ اس سے زیادہ نہ اس سے کم۔ اس کے بعد میں مسلمانوں کا ایک فرد ہوں جو ان کا حال سو میرا حال"۔

اس اُجرت کے عوض کام کتنا؟ بائیس لاکھ مربع میل پر پھیلی ہوئی مملکت کا نظم و نسق۔ ذمہ داری کے احساس کا یہ عالم۔۔۔ کہ حضرت علی رضؓ فرماتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ حضرت عمر رضؓ پالان پر سوار تیز تیز جا رہے ہیں۔ میں نے پوچھا، امیر المؤمنین! کدھر؟ کہنے لگے بیت المال کا ایک اونٹ گم ہو گیا ہے، اسے ڈھونڈنے جا رہا ہوں۔

حضرت علیؓ نے کہا کہ آپ نے کسی اور سے کیوں نہ کہہ دیا کہ وہ اس اونٹ کو تلاش کرے۔ آپ نے کہا کہ بخدا! یہ تو ایک اونٹ ہے۔ اگر بیت المال کی ایک بکری بھی کہیں گم ہو گئی تو عمرؓ سے اس کی بھی باز پرس ہو گی!

امیر المؤمنین، دن بھر اس قسم کے فرائض سرانجام دیتے تھے، اور راتوں کو گشت کرتے تھے تاکہ رعایا کا حال براہِ راست معلوم کیا جائے اور ضرورت مندوں کی ضروریات پوری کرنے میں توقف یا تاخیر نہ ہو۔ یہ اسی قسم کی گشت کا واقعہ ہے کہ آپ نے دیکھا کہ ایک خیمہ میں ایک عورت کچھ پکا رہی ہے اور دو تین بچے پاس بیٹھے رو رہے ہیں۔ آپ کے استفسار پر اس نے کہا کہ کئی وقت سے بچوں کو کچھ کھانے کو نہیں ملا۔ میں نے خالی ہنڈیا میں پانی ڈال کر چولہے پر چڑھا رکھا ہے کہ بچوں کا دل بہلا رہے۔ حضرت عمرؓ اُٹھے۔ بیت المال سے آٹا، گھی، کھجوریں لیں اور اپنے خادم، اسلم سے کہا کہ انہیں میری پیٹھ پر لاد دو۔ اسلم نے کہا کہ مجھے دے دیجئے۔ میں لے جاتا ہوں۔ فرمایا۔ اسلم! اس معاملہ کا تعلق قیامت سے ہے۔ اور قیامت میں تم میرا بوجھ نہیں اٹھاؤ گے۔ اس لئے یہ بوجھ مجھے خود ہی اٹھا کر لے جانے دو۔ (شاہکارِ رسالت ص۳)

"اس معاملہ کا تعلق قیامت سے ہے اور قیامت میں ہر ایک کو اپنا اپنا بوجھ آپ اٹھانا پڑے گا۔"

یہ تھیں وہ خدمات جو یہ سربراہانِ مملکت سرانجام دیتے تھے۔ ان خدمات کی اُجرت میں جو کھانا منظور کرایا تھا، اس کی نوعیت یہ تھی کہ ایک دن مصر کا گورنر ملنے کے لئے آیا تو آپ کھانا کھا رہے تھے۔ کھانے میں جَو کی روٹی، زیتون کا تیل اور موٹا پسا ہوا نمک تھا۔ اس نے کہا کہ امیر المؤمنین! آپؓ گیہوں کے آٹے کی روٹی کیوں نہیں کھاتے؟ آپؓ نے کہا کہ تم بتاؤ کہ کیا اس وقت ہماری مملکت میں ہر شخص کو گیہوں کی روٹی مل رہی ہے؟ اس نے کہا کہ ایسا تو میں نہیں کہہ سکتا! اس پر آپؓ نے فرمایا:-

> "عمرؓ کو اس وقت اس کا یقین ہے کہ مملکت میں ہر شخص کو کم از کم جَو کی روٹی مل رہی ہے۔ وہ گیہوں کی روٹی اس دن کھائے گا جب اسے اس کا اطمینان ہو جائیگا کہ ہر شخص کو گیہوں کی روٹی میسر آ رہی ہے۔"

آپ نے غور فرمایا کہ جو کچھ رعایا سے لیا جا رہا ہے اس کے عوض میں خدمات کس قدر انجام دی جا رہی ہیں کیا کسی کو ایسے کاموں کے لئے اتنا سستا مزدور مل سکتا تھا؟ سستا بھی اور پھر امین بھی! خدمت کے بغیر کچھ

خدمت کے بغیر کچھ نہیں

لینا تو ایک طرف، وہ تو خدمت کے بغیر مملکت کے لئے بھی کچھ لینا جائز نہیں سمجھتے تھے! اس ضمن میں ایک آزاد شدہ غلام (سعید)

کا بیان کردہ واقعہ بڑا بصیرت افروز ہے۔ ان کا بیان ہے کہ میں آزادی حاصل ہونے کے بعد حکومت کے واجبات کی رقم ادا کرنے کے لئے حضرت عمرؓ کے پاس آیا تو آپ نے پوچھا کہ کیا تم نے حکومت کے بیت المال سے کچھ فائدہ بھی اٹھایا ہے؟ میں نے کہا کہ نہیں! ابھی تک تو میں نے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔ ——— اس پر آپ نے فرمایا کہ "پھر اپنی رقم واپس لے جاؤ۔ جب تمہیں حکومت کی طرف سے کچھ مل جائے تو پھر اسے لانا"۔
(شاہکار رسالت صفحہ ۳۶۸)

آپ نے دیکھا کہ سربراہِ مملکت تو ایک طرف، وہاں خود مملکت بھی نہ گداگر ہوتی تھی؛ نہ قزاق، وہ حق الخدمت لیتی تھی اور یہ نہ محتاجی ہوتی ہے نہ گداگری!

نہ محتاج نہ ذلیل

اور جب اس مملکت میں کوئی کسی کا محتاج نہیں ہوتا، تو کوئی ذلیل بھی نہیں ہوتا۔ وہ مملکت، احترامِ آدمیت کی زبانی دعویدار نہیں تھی، عملاً بھی اس کا مظاہرہ کرتی تھی۔ ایک دفعہ حمص کے حاکم، حضرت عمیر بن سعدؓ کے منہ سے ایک غیر مسلم (ذمی) کے متعلق یہ الفاظ نکل گئے۔ اخزک اللہ، "خدا تجھے ذلیل کرے"! سہواً یہ الفاظ تو زبان سے نکل گئے، اس کے بعد اس قدر ندامت اور تأسف ہوا کہ بابِ خلافت میں آکر استعفےٰ دے دیا کہ میں اس منصب کا اہل نہیں۔ جو احترامِ آدمیت نہیں کر سکتا وہ خود بھی کسی عزت و احترام کا مستحق نہیں۔

یہ تھے وہ حکمران جو نہ گداگر تھے، نہ قزاق۔ اقبالؒ کے الفاظ میں:

آں مسلماناں کہ میری کردہ اند　　　در شاہنشاہی، فقیری کردہ اند

اور یہ تھی وہ مملکت جو اس بنیاد پر قائم ہوئی تھی کہ

کس نہ گردد در جہاں محتاجِ کس　　　نکتۂ شرعِ مبیں، این است و بس

وہ جانتے تھے کہ اسلامی نظام کسے کہتے ہیں اور شریعتِ حقہ کا مقصود و منتہا کیا ہے!

عزیزانِ من! وقت تھوڑا ہے اور داستان دراز۔ اس لئے مجھے اختصار سے کام لینا ہے۔

ابھی تک ہم محنت کشوں کی محتاجی کا ذکر کر رہے تھے۔ اس کا اگلا گوشہ، مالکانِ زمین اور مزارعین کی کشمکش ہے۔ اس باب میں قرآن مجید کا فیصلہ یہ ہے کہ زمین، تمام نوعِ انسان (بلکہ تمام ذی حیات) کے لئے سرچشمۂ رزق ہے اس لئے اس پر کسی کی ذاتی ملکیت ہو نہیں سکتی۔ اور جب کوئی شخص زمین کا مالک نہیں ہو

سکتا تو، مالکِ اراضی اور مزارع کی کش مکش کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ قرآن مجید میں بھی اس موضوع پر بڑی تفصیل سے آیا ہے اور علامہ اقبالؒ نے بھی اس پر شرح و بسط سے لکھا ہے (تفصیل اس کی میری کتاب، نظامِ ربوبیت میں ملے گی) میں یہاں اس کے صرف ایک مقام پر اکتفا کروں گا۔ سورۃ واقعہ کی چند آیات میں قرآن کریم نے اس حقیقت کو بڑے دلکش انداز سے بیان کیا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ :-

تم ذرا اس نظام پر غور کرو جس کے مطابق تمہاری پرورش اور نشو و نما ہوتی ہے اور سوچو کہ یہ سب کچھ قانون خداوندی کے مطابق ہوتا ہے یا تمہارے کسب و ہنر کے مطابق۔ مثلاً تم جو کھیتی باڑی کرتے ہو تو غور کرو کہ اس میں تمہارا عمل دخل کتنا ہوتا ہے اور ہمارا قانون کیا کچھ کرتا ہے؟ تم زمین میں ہل چلا کر اس میں بیج ڈال دیتے ہو۔ اب بتاؤ کہ اس بیج سے فصل کون اگاتا ہے؟ کیا ایسا تم کرتے ہو یا ہمارے قانون کی رو سے ہوتا ہے۔ اَفَرَءَیۡتُمۡ مَّا تَحۡرُثُوۡنَ ؕ ءَاَنۡتُمۡ تَزۡرَعُوۡنَهٗۤ اَمۡ نَحۡنُ الزّٰرِعُوۡنَ ۝ (۵۶/۶۳-۶۴)

اس کے بعد کہا کہ تم اس پانی پر غور کرو جس پر تمہاری کھیتی ہی کا نہیں، خود تمہاری زندگی کا دارومدار ہے۔ کیا اسے بادلوں سے تم برساتے ہو یا ہمارا قانونِ ربوبیت ایسا کرتا ہے۔ اَفَرَءَیۡتُمُ الۡمَآءَ الَّذِیۡ تَشۡرَبُوۡنَ ؕ ءَاَنۡتُمۡ اَنۡزَلۡتُمُوۡهُ مِنَ الۡمُزۡنِ اَمۡ نَحۡنُ الۡمُنۡزِلُوۡنَ ۝ (۵۶/۶۸-۶۹)

اس کے بعد کہا کہ ۔۔۔۔ تم اس آگ (حرارت) پر غور کرو جس سے تم اتنے کام لیتے ہو۔ کہو کہ سبز درختوں کی شاخوں میں حرارت کو یوں مستور کر دینا، تمہاری کاریگری ہے یا ہمارا قانون ایسا کرتا ہے۔ اَفَرَءَیۡتُمُ النَّارَ الَّتِیۡ تُوۡرُوۡنَ ؕ ءَاَنۡتُمۡ اَنۡشَاۡتُمۡ شَجَرَتَهَاۤ اَمۡ نَحۡنُ الۡمُنۡشِـُٔوۡنَ ۝ (۵۶/۷۱-۷۲)

ان حقائق کے بیان کرنے کے بعد کہا کہ رزق پیدا کرنے کی اس تمام کائناتی مشینری پر غور کرو اور سوچو کہ یہ کس کے قانون کی کارفرمائی ہے۔ پھر اس پر بھی غور کرو کہ اس میں تمہارا حصّہ کس قدر ہے اور نظامِ خداوندی کا کس قدر! تم کسی نہج سے بھی غور کرو۔ بہر حال، اسی نتیجہ پر پہنچو گے کہ اس کاروبار میں تم صرف محنت کرتے ہو۔ باقی سب کچھ خدا کا نظام کرتا ہے۔ لہٰذا اس ما حصل میں تمہارا حصّہ صرف تمہاری محنت کے بقدر ہو سکتا ہے۔ تم پورے کے پورے کے مالک نہیں بن سکتے۔ تم اپنی محنت کا معاوضہ اپنے سامانِ پرورش کی صورت میں اپنے پاس رکھ لو اور ہمارا حصّہ ۔۔۔۔ ہمیں دے دو! سوال پیدا ہوا کہ آپ کا حصّہ آپ تک کیسے پہنچائیں؟ جواب دیا: مَتَاعًا لِّلۡمُقۡوِیۡنَ ۝ (۵۶/۷۳) یہ انہیں دے دو جو اپنا رزق پیدا کرنے سے معذور ہیں۔ ان تک پہنچ گیا تو سمجھ لو کہ

ہم تک پہنچ گیا۔
علامہ اقبالؒ نے اس پورے تذکرہ کو بال جبریل کی اس نظم میں بڑی برجستگی سے بیان کیا ہے جس کا عنوان ہے۔

اَلْاَرْضُ لِلّٰہ !

اور نظم یہ ہے: ؎

پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون
کون دریاؤں کی موجوں سے اٹھاتا ہے سحاب؟
کون لایا کھینچ کر پچھم سے بادِ سازگار؟
خاک یہ کس کی ہے؟ کس کا ہے یہ نورِ آفتاب؟
کس نے بھر دی موتیوں سے خوشۂ گندم کی جیب؟
موسموں کو کس نے سکھلائی ہے خوئے انقلاب؟
دہ خدایا! یہ زمیں تیری نہیں، تیری نہیں!
تیرے آبا کی نہیں، تیری نہیں، میری نہیں

(بالِ جبریل ص۱۶۱)

جب زمین پر کسی کی ذاتی ملکیت ہو نہیں سکتی تو کسی مزارع کو زمین، بٹائی یا پٹہ پر دینے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ ابوداؤد میں حضرت ابن ابی نعیم کی روایت ہے کہ:-

"رافع بن خدیجؓ نے ایک زمین کاشت پر لی۔ وہ اسے پانی دے رہے تھے کہ حضورؐ کا گذر اس طرف سے ہوا۔ آپؐ نے دریافت فرمایا کہ یہ زمین کس کی ہے۔ اور کھیتی کس کی؟ رافعؓ نے کہا کہ یہ کھیتی میرے بیج اور میری محنت کا نتیجہ ہے۔ اس کا ایک حصہ میرا ہوگا اور ایک حصہ فلاں خاندان کا جس کی یہ زمین ہے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ تم دونوں سودی کاروبار کر رہے ہو۔ زمین صاحب زمین کو واپس کر دو اور اپنا خرچہ اس سے وصول کر لو۔" (شاہکار رسالت۔ ص۳۸۲)

جب زمین پر کسی کی ملکیت ہی جائز نہیں، تو کوئی شخص نہ زمیندار ہو سکتا ہے، نہ اس کا کوئی مزارع۔ لہٰذا نہ وہ اس کا محتاج ہوگا، نہ ذلیل۔ کس نگر دو در جہاں محتاجِ کس۔

اور آخر میں ہمارے سامنے وہ گوشہ آتا ہے جو ان تمام خبائث اور مفاسد کی جڑ اور بنیاد ہے۔ یعنی نظامِ سرمایہ داری! قرآنِ کریم نے معاشی نظام کا بنیادی اصول یہ بتایا ہے کہ وَاَنْ لَّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی ۵۳/۳۹

معاوضہ صرف محنت کا ہے۔ اس کے برعکس، نظامِ سرمایہ داری کی بنیاد اس پر ہے کہ معاوضہ سرمایہ کا ہے یعنی ایک شخص سرمایہ لگاتا ہے اور دوسرے لوگ محنت کرتے ہیں، خواہ اس کی شکل انڈسٹری (کارخانہ داری) کی ہو، اور خواہ کامرس (تجارت) کی۔ یہ شخص ان محنت کشوں کی محنت کے ماحصل میں سے معتدبہ حصہ لے جاتا ہے اور اسے اپنے سرمایہ کا معاوضہ کہتا ہے۔ قرآن کریم اسے ربٰو کہہ کر پکارتا ہے اور نہ صرف اسے حرام کہتا ہے بلکہ اسلامی مملکت کے خلاف بغاوت قرار دیتا ہے۔ سرمایہ، دولت جمع کرنے کا نام ہے اور قرآن کریم دولت جمع کرنے کو، جرمِ عظیم اور عذابِ جہنم کا مستوجب ٹھہراتا ہے۔ قرآن مجید کی بکثرت آیات اسی موضوع پر ہیں۔ میں اس وقت صرف ایک آیت پر اکتفا کرتا ہوں۔

وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۙ يَّوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ ۭ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ ۝ (۹/۳۴-۳۵)

"جو لوگ سونا چاندی (مال و دولت) جمع کرتے ہیں اور انہیں اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے لئے کھلا نہیں رکھتے۔ اے رسولؐ! تو انہیں الم انگیز عذاب کی "بشارت" سنا دے (یہ عذاب اس دن واقع ہو گا) جب سونے چاندی کے ان جمع کردہ سکوں کو دوزخ کی آگ میں تپایا جائے گا اور ان سے ان کی پیشانیوں۔ پہلوؤں اور پیٹھوں کو داغا جائیگا۔ اور ان سے کہا جائیگا کہ یہ وہ دولت ہے جسے تم نے اپنے مفاد کے لئے جمع کر رکھا تھا۔ سو اب اس جمع شدہ دولت کے لائے ہوئے عذاب کا مزہ چکھو"۔

جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے، قرآن مجید میں اکتنازِ دولت کے خلاف اس قدر آیات ہیں، کہ ان کی روشنی میں اس حقیقت کے سمجھنے میں ذرا بھی دقت پیش نہیں آتی کہ قرآن کریم نظامِ سرمایہ داری کی جڑ کاٹ دیتا ہے۔ اگرچہ مجھے اس کے بعد عنانِ گفتگو اقبالؒ کی طرف موڑ دینی چاہئے لیکن یہاں ایک ایسا سوال میرے سامنے آتا ہے اور میرا خیال ہے کہ وہ آپ کے دل میں بھی ابھر رہا ہو گا، جس سے صرفِ نظر کر کے آگے بڑھا نہیں جا سکتا۔ اور وہ سوال یہ ہے کہ دولت جمع کرنے کے دیگر عنوانات کو چھوڑیئے۔ زکوٰۃ کو اسلام کا ایک ستون قرار دیا جاتا ہے اور زکوٰۃ بہرحال جمع شدہ دولت پر ہی ادا کی جاتی ہے۔ اگر اسلام میں دولت جمع کرنا اس قدر ممنوع ہے تو پھر

زکوٰۃ ادا کرنے کا سوال کس طرح پیدا ہوگا۔ میں سر دست اس موضوع کی طرف نہیں آنا چاہتا کہ قرآن کریم کی رُو سے زکوٰۃ کا مفہوم کیا ہے، اور اس مفہوم کی رُو سے اکتنازِ دولت کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ میں صرف اس قدر بتانا چاہتا ہوں کہ، آیۂ زیرِ نظر کی موجودگی میں زکوٰۃ کس طرح فرض ہوئی؟ ابو داؤد کی ایک روایت میں ہے کہ:-

"(حضرت) ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ جس وقت یہ آیت نازل ہوئی (وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ ......)

تو مسلمانوں پر اس کا خاص اثر ہوا۔ یعنی انہوں نے اس حکم کو گراں خیال کیا۔ حضرت عمرؓ نے لوگوں سے کہا کہ میں تمہاری اس فکر کو دُور کر دوں گا اور اس مشکل کو حل کر دوں گا۔ پس عمرؓ رسول اللہؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا۔ یا نبیؐ اللہ! یہ آیت آپؐ کے صحابہؓ پر گراں گزر رہی ہے؎۔ آپؐ نے فرمایا کہ خداوند تعالیٰ نے زکوٰۃ اس لئے فرض کی ہے کہ وہ تمہارے باقی مال کو پاک کر دے... ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ حضورؐ کا یہ بیان سن کر عمرؓ نے جوشِ مسرت سے اللہ اکبر کہا......"

(ابوداؤد۔ بحوالہ مشکوٰۃ۔ کتاب الزکوٰۃ)

اس سے واضح ہے کہ ہماری مروجہ زکوٰۃ کو (یعنی جمع شدہ مال پر سال کے بعد، اڑھائی فی صد دے دینا) قرآن نے فرض نہیں قرار دیا۔ وضعی روایات کی رُو سے ایسا ہوا ہے۔ نتیجہ اس کا یہ کہ وہ نظام سرمایہ داری جسے ختم کرنے کے لئے اسلام آیا تھا، عین مطابقِ اسلام قرار پا گیا۔ چنانچہ سید ابوالاعلیٰ مودودی (مرحوم) اپنی کتاب مسئلہ ملکیتِ زمین، میں لکھتے ہیں:-

"اسلام نے کسی نوع کی ملکیت پر بھی مقدار اور کمیت کے لحاظ سے کوئی حد نہیں لگائی۔... جائز ذرائع سے جائز چیزوں کی ملکیت، جبکہ اس سے تعلق رکھنے والے شرعی حقوق و واجبات ادا کئے جاتے رہیں۔ بلا حد و نہایت رکھی جا سکتی ہیں، روپیہ، پیسہ، جانور، استعمالی اشیاء، مکانات سواری، غرض کسی چیز کے معاملہ میں بھی قانوناً ملکیت کی مقدار پر کوئی حد نہیں۔ (پہلا ایڈیشن صفحہ ۵۲) پھر جس طرح اسلام ہم سے یہ نہیں کہتا کہ تم زیادہ سے زیادہ اتنا روپیہ۔ اتنے مکان، اتنا تجارتی کاروبار، اتنا صنعتی کاروبار، اتنے مویشی، اتنی موٹریں، اتنی کشتیاں، اور اتنی فلاں چیز اور اتنی فلاں چیز رکھ سکتے ہو۔ اسی طرح وہ ہم سے یہ بھی نہیں کہتا کہ تم زیادہ سے زیادہ اتنے ایکڑ زمین کے مالک ہو سکتے ہو...... نیز وہ یہ بھی نہیں کہتا کہ زمین کا مالک بس وہی ہو سکتا ہے جو اس میں خود کاشت

؎ خدا کا حکم ہے۔ رسول اللہ کی لسانِ مبارک سے اور صحابہؓ پر گراں گذرے! (معاذ اللہ)

کرے۔ اور یہ کہ اُجرت یا شرکت پر کاشت کرانے والوں کو سرے سے حقِ ملکیت ہی حاصل نہیں۔" (ص۴۳)
اس سے نظامِ سرمایہ داری (ربوٰ) کے دروازے چوپٹ کھل گئے اور مزارعت (بٹائی یا پٹہ پر زمین کاشت کرانا) اور مضاربت (SLEEPING PARTNERSHIP) سب جائز قرار پاگئے۔ اقبالؒ نے اس کے خلاف مسلسل جہاد جاری رکھا۔

نظامِ سرمایہ داری کی بنیاد فاضلہ دولت (SURPLUS MONEY) ہے۔ قرآن کریم نے اس کا راستہ ہی بند کر دیا۔ سورۃ بقرہ میں ہے۔ یَسۡـَٔلُوۡنَکَ مَاذَا یُنۡفِقُوۡنَ ط ۔۔۔۔۔ "اے رسولؐ! یہ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ ہم کس قدر دوسروں کی ضرورت پوری کرنے کے لئے دیں"؟ ... قُلِ الۡعَفۡوَ ..... ط (۲/۲۱۹) " فرمایا کہ ان سے کہہ دو کہ جس قدر تمہاری ضرورت سے زائد ہو، وہ سب"!

ہماری ملوکیت نے ان .... آیات کو یا تو منسوخ قرار دے رکھا تھا اور یا محض تلاوت کے لئے برقرار۔ ان کا حکم بہرحال منسوخ سمجھا جاتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ کہ اس اُمت میں بھی نظامِ سرمایہ داری رائج رہا اور باقی دنیا بھی قرآنی نظام کی برکات سے محروم رہی۔ جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں، اگر کوئی جماعت، قرآنی نظام کو قائم کرنے کے لئے نہیں اُٹھتی، تو کائناتی قوتیں یا زمانے کے تقاضے، انسانوں کو اس کی طرف آنے کے لئے مجبور کر دیتے ہیں۔ روس کا انقلاب انہی تقاضوں کا نتیجہ تھا۔ اس میں فاضلہ دولت کے نظریہ کو شدت سے مسترد کیا گیا تھا۔ اقبالؒ نے اسی کے پیشِ نظر کہا تھا کہ :-

قوموں کی روش سے مجھے ہوتا ہے یہ معلوم — بے سُود نہیں روس کی یہ گرمیٔ گفتار
انساں کی ہوس نے جنہیں رکھا تھا چھپا کر — کھلتے نظر آتے ہیں بتدریج وہ اسرار
قرآں میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلماں — اللہ کرے تجھ کو عطا جدتِ کردار
جو حرفِ قُلِ العَفو میں پوشیدہ ہے اب تک
اس دَور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار

ہمارے ہاں آجکل معاشرے کے ہر جزو اور کُل کو "مسلمان کرنے" کا جنون اعصاب پر سوار ہے۔ معاشیات اس کا خاص طور پر ہدف ہے۔ اس سلسلہ میں سود کے مسئلہ پر بڑی طول و طویل بحثیں ہو رہی ہیں۔ پانچ پانچ سو صفحات پر مشتمل تصانیف شائع ہو رہی ہیں۔ یہ کچھ اس مسئلہ کے متعلق ہو رہا ہے جسے قرآن کریم نے دو لفظوں میں حل کر کے رکھ دیا ہے۔ اسلامی نظام قائم ہونے سے

ربوٰ

پہلے، عربی معاشرہ میں ربوٰا کا کاروبار عام تھا۔ جب قرآنِ مجید نے ربوٰا کو حرام قرار دیا اور مملکت کے خلاف بغاوت، تو سابقہ کاروبار کے سلسلہ میں فرمایا۔ فَلَكُمْ رُءُوسُ أَمْوَالِكُمْ ……… تم صرف اپنا اصل زر لے سکتے ہو ….. لَا تَظْلِمُونَ وَلَا تُظْلَمُونَ ٥ (۲/۲۷۹) اس سے نہ تو تم پر کوئی زیادتی ہوگی کہ تمہیں تمہارا پیسہ واپس مل جائے گا۔ اس میں کچھ کمی نہیں ہوگی اور فریقِ مقابل پر بھی کوئی ظلم و زیادتی نہیں ہوگی کہ اسے اصل سے کچھ زیادہ نہیں دینا پڑے گا۔ قرآنِ مجید کے ان چار لفظوں نے ساری بات واضح کر دی۔ جو کچھ راس المال (اصل زر) سے زیادہ لیا جائے گا، وہ ربٰو ہوگا، خواہ اس کی شکل نقدی قرضہ کی ہو، مزارعت کی ہو، مضاربت کی ہو، بینک کی ….. اصطلاح "شرکتِ منافع" کی ہو۔ سب ربوٰا کے زمرہ میں آئے گا۔ آپ دیکھیں گے کہ سود پر پان پان پر سو صفحات پر مشتمل تصانیف میں، قرآنِ کریم کی اس آیت کو کبھی سامنے نہیں لایا جائے گا۔ جو کچھ لکھا جائے گا وہ اس حقیقت کا غماز ہوگا کہ: ؎

خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں   ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق

یہ تو تھا سابقہ سودی کاروبار کے متعلق حکم۔ اسلامی نظامِ معیشت میں "قُلِ الْعَفْوَ" نے سارا مسئلہ حل کر دیا۔ نہ کسی کے پاس فاضلہ دولت ہوگی، نہ اس پر کچھ زائد لینے کا سوال پیدا ہوگا۔ اور نہ ہی کسی کو کسی سے کچھ مانگ کر ذلیل ہونے کی ضرورت پڑے گی۔ اسلامی نظام ہر ایک کی ضرورت، بطور اس کے حق کے پوری کرے گا۔

انقلابِ روس کے دعاوی میں اقبالؒ کو اسی "قُلِ الْعَفْوَ" کی جھلک دکھائی دی تھی جس سے اس کی خوش نظری نے اسے اس نتیجہ پر پہنچایا تھا کہ: ؎

زمانے کے انداز بدلے گئے   نیا راگ ہے، ساز بدلے گئے

پرانی سیاست گری خوار ہے   زمیں، میر و سلطاں سے بیزار ہے

گیا دورِ سرمایہ داری گیا!

تماشا دکھا کر مداری گیا!

(ضمناً) "مداری" کا لفظ یوں تو (بظاہر) "سرمایہ داری" کے قافیہ کے لئے لایا گیا ہے، لیکن اس میں ایک معنوی نکتہ بھی ہے۔ اب تو اس قسم کے مداری نہیں آتے۔ کچھ عرصہ پہلے جو مداری آتے تھے، وہ خالی ہاتھوں روپے پر روپیہ بناتے چلے جاتے تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ روپیہ درحقیقت بنتا نہیں تھا۔ نظر ایسا آتا

تھا کہ روپیہ بن رہا ہے۔ یہی کیفیت نظام سرمایہ داری کی ہے۔ قرآن کریم نے کہا ہے : لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰوٓا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً ۖ ص ...... (۳/۱۳۰) سمجھا یہ جاتا ہے کہ ربوا سے دولت بڑھتی ہے۔ یہ صحیح نہیں۔ اس سے قومی دولت بڑھتی نہیں، گھٹتی ہے۔ یہ جو دولت بڑھتی ہوئی نظر آتی ہے، مداری کا "ہتھ ناٹک" ہے۔

علامہ اقبالؒ نے اسی نظم میں یہاں تک کہہ دیا تھا کہ :-

گراں خواب چینی سنبھلنے لگے　　　ہمالہ کے چشمے ابلنے لگے

حالانکہ یہ ۳۵-۱۹۳۴ء کی بات ہے۔ جب ہنوز خود چینیوں کو بھی اس کا احساس نہیں تھا کہ ان کی شب نیرہ و تار کی سحر قریب ہے۔ لیکن قرآنی بصیرت کی روشنی میں حال کے واقعات و حوادث کے تجزیے سے، مستقبل کے متعلق اس قسم کی قیاس آرائی مشکل نہیں ہوتی۔ اسی بنا پر انہوں نے کہا تھا کہ :-

حادثہ وہ جو ابھی پردۂ افلاک میں ہے　　　عکس اس کا میرے آئینۂ ادراک میں ہے

یہ روس اور چین کی بات تھی۔ یہ کہتے ہیں کہ مور جنگل میں ناچتا ہے تو اپنے رقص کی نازک خرامیوں اور اپنے رنگین پروں کی جلوہ پاشیوں میں وہ ایسا کھو جاتا ہے کہ اسے ماحول تو ایک طرف، خود اپنے آپ کا بھی ہوش نہیں رہتا لیکن اس کے بعد جب اس کی نگاہ اپنے پاؤں پر پڑتی ہے تو رقص ختم ہو جاتا ہے۔ پر سمٹ جاتے ہیں۔ اور وہ نہایت پژمردگی کے عالم میں نگوں سار ہو جاتا ہے۔

حضرت علامہؒ ــــ زمانے کے انداز بدلے گئے　نیا راگ ہے، ساز بدلے گئے ــــ کی وجد آفرینیوں میں محو تھے کہ ان کی نگاہ ملت اسلامیہ پر پڑی۔ کیف و مستی کا وہ عالم، رقص طاؤس کی طرح مرجھا گیا اور انتہائی سوز و گداز سے پکار اٹھے کہ :-

مسلماں ہے توحید میں گرم جوش　　　مگر دل ابھی تک ہے زنّار پوش
تمدن، تصوف، شریعت، کلام　　　بتانِ عجم کے پجاری تمام
حقیقت خرافات میں کھو گئی　　　یہ اُمت روایات میں کھو گئی
لبھاتا ہے دل کو کلامِ خطیب　　　مگر لذّتِ شوق سے بے نصیب
بیاں اس کا منطق سے سلجھا ہوا　　　لُغت کے بکھیڑوں میں الجھا ہوا
وہ صوفی کہ تھا خدمتِ حق میں مرد　　　محبت میں یکتا، حمیت میں فرد
عجم کے خیالات میں کھو گیا　　　یہ سالک مقامات میں کھو گیا

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے !
مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے ! (بال جبریل ص۱۶۸)

مشیرانِ ابلیس کی زبان میں : ؎

ہے ازل سے ان غریبوں کے مقدر میں سجود   ان کی فطرت کا تقاضا ہے نمازِ بے قیام
آرزو اوّل تو پیدا ہو نہیں سکتی کہیں   ہو کہیں پیدا تو مر جاتی ہے یا رہتی ہے خام
یہ ہماری سعیٔ پیہم کی کرامت ہے کہ آج   صوفی و مُلّا ملوکیت کے بندے ہیں تمام
ہے طواف و حج کا ہنگامہ اگر باقی تو کیا   کُند ہو کر رہ گئی مومن کی تیغِ بے نیام

(ارمغانِ حجاز)

اور خود ابلیس کے الفاظ میں :۔

جانتا ہوں میں یہ اُمّت حاملِ قرآں نہیں   ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دیں
جانتا ہوں میں کہ مشرق کی اندھیری رات میں   بے ید بیضا ہے پیرانِ حرم کی آستیں

ایسے یاس انگیز حالات میں بڑے بڑے اربابِ عزم کے سینوں میں بھی اُمید کی کرن بجھ کر رہ جاتی ہے ، لیکن اقبال رح تو کسی اور ہی مٹی کا بنا ہوا تھا۔ اس کا ایمان اور پیغام یہ تھا کہ : ؎

مسلم استی ! سینہ را از آرزو آباد دار   ہر زماں پیشِ نظر، لایُخْلِفُ الْمِیْعَاد دار

وہ قوم کے بڑے بوڑھوں سے نا اُمید ہوا تو اپنی توجہ کا مرکز آنے والی نسل کے نوجوانوں کو قرار دے لیا۔ وہ خدا سے پورے عجز و الحاح کے ساتھ دعائیں مانگتے تھے کہ :؎

من کہ نومیدم ز پیرانِ کہن !   دارم از روزے کہ می آید ، سُخن
بر جواناں سہل کن حرفے مرا   بہرِ شاں پایاب کن ژرفِ مرا

اور : ؎

جوانوں کو میری آہِ سحر دے   پھر ان شاہیں بچّوں کو بال و پر دے
خدایا آرزو میری یہی ہے   مرا نورِ بصیرت عام کر دے

اور بالِ جبریل (کے ساقی نامہ) کی اسی نظم میں ، جو ابھی فردوسِ گوش بن رہی تھی ، کہا کہ : ؎

خرد کو غلامی سے آزاد کر   جوانوں کو پیروں کا اُستاد کر

اس میں شبہ نہیں کہ اس وقت حالات اُس زمانے سے بھی کہیں زیادہ مایوس کن ہیں، جب علامہؒ پیرانِ کہن سے نا اُمید ہوئے تھے، لیکن ان کی یاد میں اس تقریب کو افسردہ نہیں کرنا چاہتا۔ میں اس کا اختتام ان کی اُس دعا پر کرنا چاہتا ہوں جو ان کے دل کی گہرائیوں سے اُبھری تھی۔ یعنی :-

تیرے آسمانوں کے تاروں کی خیر! زمینوں کے شب زندہ داروں کی خیر!
جوانوں کو سوزِ جگر بخش دے مرا عشق، میری نظر بخش دے
مرے دیدۂ تر کی بے خوابیاں! مرے دل کی پوشیدہ بے تابیاں
مرے نالۂ نیم شب کا نیاز مری خلوت و انجمن کا گداز!
اُمنگیں مری، آرزوئیں مری! اُمیدیں مری، جستجوئیں مری!
یہی کچھ ہے ساقی متاعِ فقیر! اسی سے فقیری میں ہوں میں امیر!

مرے قافلے میں لٹا دے اسے
لٹا دے ٹھکانے لگا دے اسے

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ

ایک سوال

میرا خطاب تو ختم ہؤا، لیکن ایک سوال ہے جو مجھ سے ایک عرصہ سے پوچھا جا رہا ہے اور میں اسے اب تک ٹالتا چلا آیا ہوں۔ لیکن اب اس کے تقاضے اس قدر شدید ہو گئے ہیں کہ مجھے (بادلِ ناخواستہ) اسے سامنے لانا پڑ رہا ہے۔ سوال کے الفاظ کچھ اس قسم کے ہیں کہ "ہم برسوں سے آپ کے درس میں بھی اور دیگر تقاریب میں بھی آپ کی زبانی پیغامِ اقبالؒ سنتے چلے آ رہے ہیں، اور آپ کی تحریروں میں پڑھتے بھی ہیں۔ آپ کو جس قدر اقبالؒ پر عبور ہے اور اسے آپ جس انداز سے قرآن مجید کی روشنی میں پیش کرتے ہیں، اس کی مثال نہیں ملتی۔ ملک میں علامہ اقبالؒ سے متعلق اتنی تقاریب منعقد ہوتی ہیں۔ آپ ان میں کیوں شریک نہیں ہوتے تاکہ اس پیغام کا دائرہ وسیع ہو۔"

جواب: اس سوال کا دو لفظوں میں جواب یہ ہے کہ ان تقاریب میں وہی شریک ہو سکتا ہے۔ جسے

شرکت کی دعوت دی جائے۔ مجھے دعوت نہیں دی جاتی۔۔۔ اس لئے میں ان میں شریک نہیں ہوتا۔

لیکن اس پر مجھ سے یہ پوچھا جاتا ہے کہ یہ لوگ آپ کو دعوت کیوں نہیں دیتے؟ اس کا پھر دو لفظی جواب یہ ہے کہ یہ اُن حضرات سے پوچھئے کہ وہ مجھے دعوت کیوں نہیں دیتے؟ لیکن چونکہ اس سے بھی مستفسرین کا اطمینان نہیں ہوگا اس لئے جو کچھ میں سمجھتا ہوں اسے عرض خدمت کر دینا چاہتا ہوں۔ میرے خیال میں یہ حضرات مجھے اس لئے نہیں بلاتے کہ میں بالواسطہ یا بلاواسطہ قرآن کریم پیش کرتا ہوں (خواہ اس کا واسطہ کلام اقبالؒ ہو یا پیغام قائداعظمؒ) اور قرآن ہماری قوم کے مزاج کے موافق نہیں۔ اس لئے ان کی کوشش یہی رہتی ہے کہ اس کی آواز عام نہ ہونے پائے۔ مجھے اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا کیونکہ میرے ہاں اپنے ذرائع ابلاغ موجود ہیں۔ لیکن اس سے جس طرح قوم اقبالؒ کی قرآنی فکر سے محروم رہ جاتی ہے اس کا افسوس ضرور ہوتا ہے۔ اقبالؒ سے متعلق تقاریب ہوں یا قائداعظمؒ سے متعلق، انہیں رسمی طور پر منایا جاتا ہے اور یہ بھی اس وقت تک کیا جائے گا جب تک اس سے کچھ مفاد حاصل ہوتے ہوں۔ اس کے بعد فقط تاریخ کی کتابوں میں ان کے نام رہ جائیں گے۔ آپ نے کبھی اس پر غور کیا ہے کہ داتا گنج بخش (علیہ الرحمۃ) کا عرس تو اس قدر دھوم دھام سے منایا جاتا ہے لیکن حضرت ابوبکر صدیقؓ یا حضرت عمر فاروقؓ کے متعلق اتنا بھی بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ ان کی تاریخ وفات (یا شہادت) کون سی ہے! دو ایک سال اُدھر سے، یوم صدیقؓ اور یوم فاروقؓ کی آوازیں تو سنائی دینے لگی ہیں لیکن بڑی مدہم سی۔ آپ کو معلوم ہے کہ ایسا کیوں ہے؟ داتا صاحب (علیہ الرحمۃ) کی تقاریب کے سلسلہ میں لاکھوں روپے کی یافت ہوتی ہے اور صدیق اکبرؓ اور عمر فاروقؓ کی یاد منانے میں (کچھ ملنا تو ایک طرف) گرہ سے خرچ کرنا پڑتا ہے یا چندہ جمع کرنا۔ اگر اقبالؒ کی تقاریب کے سلسلہ میں بھی یہ صورت پیدا ہوگئی تو اس کی آواز صرف قوالوں کی ڈھولک کی تھاپ پر سنائی دیا کرے گی کہ "طبع مشرق کے لئے موزوں یہی افیون ہے۔"

ہماری قوم کی انتہائی کوشش یہ ہے کہ ——— ہو نہ جائے آشکارا شرع پیغمبر کہیں ——— اور قرآن کریم کو تلاوت تک، اور اقبالؒ کو شاعری تک محدود (بلکہ محبوس) رکھنے سے بھی مقصد یہی ہے۔ اور اس میں اسے خاصی کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ قوم کی اسی ذہنیت کے پیش نظر، علامہ نے کہا تھا کہ: ؎

اقبالؒ یہاں نام نہ لے علم خودی کا ——— موزوں نہیں مکتب کے لئے ایسے مقالات
بہتر ہے کہ بیچارے ممولوں کی نظر سے ——— پوشیدہ رہیں باز کے احوال و مقامات

" ابلیس کی مجلسِ شوریٰ" میں آخری ریزولیشن یہ پاس ہوا تھا کہ ؎

مست رکھو ذکر و فکرِ صبحگاہی میں اسے
پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اسے

اقبالؒ سے متعلق تقاریب بھی اسی مقصد کے حصول کا ذریعہ بن کر رہ گئی ہیں۔ اس نے سچ کہا تھا کہ: ؎

وہی میری کم نصیبی، وہی تیری بے نیازی!
میرے کام کچھ نہ آیا یہ کمالِ نے نوازی!

یہ اس لئے کہ: ؎

وہ فریب خوردہ شاہیں کہ پلا ہو کرگسوں میں
اسے کیا خبر کہ کیا ہے رہ و رسمِ شاہبازی

نتیجہ اس کا یہ کہ: ؎

کوئی کارواں سے ٹوٹا، کوئی بدگماں حرم سے
کہ امیرِ کارواں میں نہیں خوئے دلنوازی!

اور: ؏

علاج اس کا وہی آبِ نشاط انگیز ہے ساقی!

— والسلام —

پرویز

بسلسلہ یوم آزادی
۱۴ اگست ۱۹۸۱ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پاکستان کا مطلب کیا؟

لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ!

یوم آزادی کی تقریب کے سلسلہ میں ہم اپنے خیالات وجذبات کا اظہار طلوعِ اسلام بابت اگست ۱۹۸۱ء کے لمعات میں کر چکے ہیں۔ وہ سطور ماہ جولائی میں رقم ہوئی تھیں، لیکن جب ۱۴ اگست کی صبح نمودار ہوئی تو ہماری کیفیت یہ تھی کہ ؎

دل میں پھر گریہ نے اک شور اٹھایا غالبؔ آہ جو قطرہ نہ نکلا تھا، سو طوفان نکلا

لیکن ہم نے ان طوفانوں کو پھر قطرات میں منتقل کر دیا کہ صبر طلبیٔ عشق کا یہی تقاضا تھا۔

ابھرنے کو تو تحریک پاکستان کی بہت سی یادیں اُفقِ سینہ سے اُبھریں، لیکن ان میں سرِفہرست وہ چند الفاظ تھے جن میں پاکستان کا مفہوم، مطلوب و مقصود اس جامعیت سے سمٹا دیا گیا تھا، جس کی مثال کم ملے گی۔ نہ معلوم یہ الفاظ کس نے کہے تھے، لیکن تھے ایسے مقبول کہ پاکستان کا مطالبہ کرنے والوں میں سے ہر ایک کی زبان پر تھے۔ وہ الفاظ تھے:-

پاکستان کا مطلب کیا؟ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ

لہ یہ عجیب حسن اتفاق ہے کہ ۱۲ اگست ۱۹۸۱ء کی شب کو لاہور ٹیلی ویژن سے نشر ہونے والے ایک انٹرویو میں یہ حقیقت سامنے آئی کہ اس ترانہ کے خالق پروفیسر اصغر سودائی ہیں۔ جنہوں نے اسے ۱۹۴۴ء میں لکھا۔ ہم سودائی صاحب کی خدمت میں، ان کی اس زندہ جاوید تخلیق پہ ہدیۂ تبریک پیش کرتے ہوئے آرزو مند ہیں کہ خدا اس قوم کو، اس "سودائی" کی کہی ہوئی بات سمجھنے کا شعور عطا فرمائے۔

تحریکِ پاکستان کے دوران تو پاکستان کا مطلب — لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ — کہہ کر سمجھا دیا گیا، لیکن تشکیلِ پاکستان کے بعد کسی نے یہ نہ سمجھایا کہ خود لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ کا مطلب کیا ہے؟ تحریکِ پاکستان کے دوران، داعیانِ پاکستان اور اس کے مخالف علماء (مذہبی پیشواؤں) کے درمیان مابہ النزاع مسئلہ ہی لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ کا مطلب اور مفہوم تھا۔ وہ کہتے تھے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا کے سوا کسی کی "پرستش" جائز نہیں اور داعیانِ پاکستان کہتے تھے کہ اس کا مطلب ہے: اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ (۱۲/۴۰) یعنی خدا کے سوا کسی کی محکومیت جائز نہیں۔ وہ کہتے تھے کہ ہندو اس امر کی ضمانت دیتا ہے کہ آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کو "خدا کی پرستش" کی آزادی حاصل ہوگی۔ ان کے معتقدات میں کوئی دخل نہیں دے گا۔ وہ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ شعائر و ارکانِ اسلام کی ادائیگی پوری آزادی سے کر سکیں گے۔ ان کے شخصی معاملات ان کے فقہی قوانین کی رُو سے طے پائیں گے۔ وہ کہتے تھے کہ اسی کا نام اسلام ہے۔ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ کا یہی مطلب ہے۔ اور اس کے لئے مسلمانوں کو الگ مملکت کی ضرورت نہیں۔

ہم اُن سے کہتے تھے کہ اِلٰہ کے معنی پرستیدہ (جس کی پرستش کی جائے) اور عبادت کے معنی پرستش نہیں۔ اِلٰہ کے معنی صاحبِ اقتدار یا حکمران کے ہیں، اور عبادت کا مفہوم ہے محکومیت۔ اس اعتبار سے لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ کا مطلب یہ ہے کہ خدا کے سوا کسی کو حقِ حکومت حاصل نہیں۔ اور عبادت سے مُراد ہے خدا کی محکومیت اختیار کرنا۔ خدا کی حکمرانی کا عملی ذریعہ اس کی کتاب (قرآن مجید) کی حکومت ہے اور اسلام سے مُراد ہے قرآنِ مجید کی حکمرانی۔ اس اسلام کی اجازت، کوئی مملکت بھی نہیں دے سکتی۔ نہ ہی کسی غیر مسلم مملکت میں اس کا امکان ہے۔ کتاب اللہ کی رُو سے، کسی انسان کو حق حاصل نہیں کہ وہ دوسرے انسانوں پر حکومت کرے۔ "انسانوں کی حکومت" کی کوئی شکل ہو، قرآن کی رُو سے اس کی اطاعت، غیر اللہ کی اطاعت، فلہٰذا کفر اور شرک ہے۔" انسانوں کی حکومت میں، عہدِ پارینہ کی ملوکیت سے لے کر عصرِ حاضر کی جمہوریت تک، سب شامل ہیں۔ حتّٰی کہ فقہی قوانین کی اطاعت بھی انسانوں کی اطاعت ہے کیونکہ وہ قوانین بھی ان ماہرینِ قوانین کے وضع کردہ ہیں جو انسان ہی تھے۔ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ کا صحیح مطلوب، قرآنی حکومت کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا، اور اس قسم کی حکومت اپنی آزاد مملکت میں ہی قائم ہو سکتی ہے۔ اسلام کا یہی تقاضا مطالبۂ پاکستان کا جذبۂ محرکہ تھا۔

تحریکِ پاکستان کے دوران، حقیقی نزاع، لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ کے مطلب کا یہی اختلاف تھا۔ یہ جنگ، اوّل

تو انگریز یا ہندو کے خلاف تھی ہی نہیں کیونکہ وہ مذہبی سطح پر گفتگو نہیں کرتے تھے۔ اور اگر تھی بھی تو اس کی حیثیت ثانوی تھی۔ بنیادی جنگ، داعیانِ پاکستان اور مسلمانوں کی مذہبی پیشوائیت کے مابین تھی۔ ہندو اگر اس مطالبہ کے خلاف کبھی مذہبی دلیل پیش کرتا تھا تو اس لئے کہ اس کے مذہب کی رُو سے، مذہب کو سیاست سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ اور یا اس لئے کہ خود مسلمانوں کے علماء یہی دلیل پیش کرتے تھے (مثلاً مولانا ابوالکلام آزاد (مرحوم) کے نزدیک، اسلام کا ماحصل "خداپرستی اور نیک عملی کی زندگی" تھا۔ یعنی ہی "پرستش" کا تصور)۔ ان کے پیش کردہ اس تصوّر کو ہندوؤں نے اپنے اہتمام سے سارے ملک میں عام کیا تھا۔

علامہ اقبالؒ نے جب ۱۹۳۰ء میں الٰہ آباد کے مقام پر مسلمانوں کی جُداگانہ مملکت کا تصوّر پیش کیا تھا تو ایسا اچانک یا کسی ہنگامی جذبہ کے تحت نہیں کیا تھا۔ اُن کی ساری عمر" لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ" کا مطلب سمجھانے میں گذر گئی تھی۔ انہوں نے (مثنوی رموزِ بے خودی) میں پہلے یہ بتایا کہ نزولِ قرآن سے پہلے انسانوں کی حالت یہ تھی کہ ؎

بود انساں درجہاں انساں پرست ناکس و نابود مند و زیر دست

اس میں "انساں پرست" کا ٹکڑا غور طلب ہے۔ اس میں ہر قسم کی انسانی حکومت آجاتی ہے۔ یعنی ؎

سطوتِ کسریٰ و قیصر رہزنش بند ہا در دست و پا و گردنش

یہ ملوکیت کی "انسان پرستی" (غلامی اور محکومی) تھی۔ اس کے ساتھ ؎

کاہن و پاپا و سلطان و امیر بہرِ یک نخچیر صد نخچیر گیر

یہ تھیاکریسی (یعنی مذہبی پیشواؤں کے فقہی قوانین) کی محکومی تھی۔ ملوکیت اور تھیاکریسی کے گٹھ جوڑ سے حالت یہ ہو چکی تھی کہ ؎

صاحبِ اورنگ و ہم پیرِ کنشت باج بر کشتِ خرابِ او نوشت
در کلیسا اُسقفِ رضواں فروش بہرِ ایں صیدِ زبوں دامے بدوش

(رموزِ بے خودی۔ صہ ۱۱۹)

غریب و مُفلس، محنت کش و مزدور، مزارع و کاشتکار بیچارے، دونوں ہاتھوں سے لٹتے تھے۔ ایک طرف حکومت اپنے ٹیکس وصول کرتی تھی۔ دوسری طرف مذہب کے نام پر، ان کا خون نچوڑا جاتا تھا۔ اس

کا نتیجہ یہ تھا کہ ؎

از غلامی فطرتِ اُو دوں شدہ　　نغمہ ہا اندر نئے اُو خوں شدہ　(ایضاً)

نزولِ قرآن کے وقت... انسان کی یہی حالت تھی۔ وہ ایک طرف مستبد حکمرانوں کی ذلّت آمیز اور اذیّت ناک زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا۔ اور دوسری طرف مذہبی پیشوائیت کے غضبناک اور قہر آلود بندھنوں میں بندھا ہوا۔ کہ انقلابِ محمدیہ نے (وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ ط (۷:۱۵۷) فرعونوں کی ان زنجیروں کو توڑ دیا اور ہامانوں کی ان بندشوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے اور اس طرح، انسانوں کو انسانوں کی محکومیت سے آزاد کرا دیا۔

تا امینِ حق بحق داراں سپرد　　بندگاں را مسندِ خاقاں سپرد
شعلہ ہا از مردہ خاکستر کشاد　　کوہکن را پایۂ پرویز داد
قوتِ اُو ہر کہن پیکر شکست　　نوعِ انسان را حصارِ تازہ بست
تازہ جاں اندر تنِ آدم دمید　　بندہ را باز از خداونداں خرید

(رموزِ بے خودی۔ صفحہ ۱۱۹-۱۲۰)

حضرت علامہؒ نے اس آخری مصرعہ میں قرآن کے انقلابِ عظیم کا ماحصل چار لفظوں میں سمو کر رکھ دیا ہے۔ جب کہا ہے کہ "بندہ را باز از خداونداں خرید"۔ یعنی انسانوں کو انسانوں کی محکومیت سے آزاد کرا دیا۔ خواہ وہ انسان قیصر و کسریٰ کی ملوکیت کے نمائندے تھے اور خواہ مذہبی پیشوائیت کے خود ساختہ خداوند!

سوال یہ ہے کہ اس انقلابِ عظیم کا نقطۂ ماسکہ یا بنیادی محرّک کیا تھا؟ علامہ اقبالؒ نے (قرآنِ کریم کی روشنی اور راہنمائی میں) بتا دیا تھا کہ یہ سب کرشمہ اور اعجاز تھا لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کا۔

یہ کلمۂ انقلاب آفریں دو گوشوں پر مشتمل ہے:۔ "لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ"

"لَا اِلٰہَ" ہر انسانی حکمرانی سے انکار، بلکہ اس کے خلاف اعلانِ بغاوت۔ اور "اِلَّا اللّٰہ" کتاب اللہ کی حکومت کا اثبات۔ اقبالؒ کا سارا کلام اسی حقیقت کی تفسیر ہے۔ وہ اپنی دوسری مثنوی "پس چہ باید کرد اے اقوامِ مشرق" میں کہتے ہیں:۔

درجہاں آغازِ کار از حرفِ لاست　　ایں نخستیں منزلِ مردِ خداست
پیشِ غیر اللہ لَا گفتن حیات　　تازہ از ہنگامۂ اُو کائنات

بندہ را با خواجہ خواہی در ستیز؟ تخم لا در مشت خاک او بریز
لا مقام ضرب ہائے پے بہ پے این غو رعد است نے آواز نے
(پس چہ باید کرد۔ صفحہ ۱۹)

لا الٰہ کو مسلک حیات قرار دینے والے کو قرآن مومن کہہ کر پکارتا ہے۔ اقبالؒ اسے مرد حر (یعنی بندۂ آزاد) سے تعبیر کرتا ہے۔ مرد حر کے متعلق وہ کہتے ہیں : ؎

مرد حر از لا الٰہ روشن ضمیر می نگردد بندۂ سلطان و میر
ما کلیسا دوست، ما مسجد فروش او ز دست مصطفےؐ پیمانہ نوش
در جہان بے ثبات او را ثبات مرگ او را از مقامات حیات (ایضاً)

جاوید نامہ میں وہ خود غو رعد (بجلی کی کڑک) بن کر یوں غلغلہ انداز ہوتے ہیں : ؎

لا الٰہ گوئی؟ بگو از روئے جاں تا ز اندام تو آید بوئے جاں
این دو حرف لا الٰہ گفتار نیست لا الٰہ جز تیغ بے زنہار نیست
زیستن با سوز او قہاری است لا الٰہ ضرب است و ضرب کاری است
(جاوید نامہ۔ صفحہ ۲۳۴)

آپ نے غور فرمایا کہ مصور پاکستان نے لا الٰہ الا اللہ کا مفہوم کس واشگاف انداز میں سمجھایا تھا۔ لا الٰہ انسانوں کی ہر حکومت کے خلاف اعلان جنگ تھا، اور وہ اس جنگ کے مضمرات سے اچھی طرح واقف تھے (اسی لئے انہوں نے اپنی آخری تحریر ارمغان حجاز میں) کہا تھا کہ : ؎

بنور تو برافروزم نگہ را کہ بینم اندرون مہر و مہ را
چو می گویم مسلمانم، بلرزم کہ دانم مشکلات لا الٰہ را (ایضاً صفحہ ۸۱)

اس سے آپ نے اندازہ فرما لیا کہ تحریک پاکستان کے دوران جب کہا گیا تھا کہ :-

پاکستان کا مطلب کیا۔ لا الٰہ الا اللہ

تو اس میں، لا الٰہ الا اللہ کا مطلب کیا تھا؟ اس کا مطلب تھا۔ انسانوں کی ہر قسم کی حکومت کو ختم کر کے اس کی جگہ کتاب اللہ کی حکمرانی کا ثبت کرنا۔ اسی کا نام توحید ہے۔ جس کی وضاحت اقبالؒ نے ان الفاظ میں کی ہے :-

"جب توحید ایک عملی نظام کی شکل اختیار کرلے تو اس کا لازمی نتیجہ "مساوات، محکمیت اور آزادی" ہوگا۔ اسلام نہ کسی انسان کی حکمرانی کو تسلیم کرتا ہے نہ مذہبی پیشواؤں کے مبیّنہ الوہیاتی اقتدار کو"۔

(خطبات تشکیل جدید۔ انگریزی۔ صـــ ۱۴۷)

یہ تھی وہ قرآنی مملکت جسے مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ ط وَالَّذِیْنَ مَعَہٗٓ کے انقلاب آفرین ہاتھوں نے قائم کیا اور ساری دنیا میں اعلان کیا کہ آکر دیکھ لو کہ :۔

کس دریں جا سائل و محروم نیست　　　عبد و مولا، حاکم و محکوم نیست

یہ نتیجہ تھا اس انسانیت سازِ تغیّر کا کہ :۔

نقشِ قرآں تا دریں عالم نشست　　　نقشہائے کاہن و پاپا شکست

(جاوید نامہ۔ صفحہ ۹۰)

قرآن نے ملوکیت کے ساتھ مذہبی پیشوائیت کا بھی خاتمہ کر دیا تھا۔ اس کے بعد اس قوم (یعنی ہم مسلمانوں) نے کیا کیا؟ اسے بھی اقبالؒ کے الفاظ میں سُن لیجئے :۔

خود طلسمِ قیصر و کسریٰ شکست　　　خود سرِ تختِ ملوکیت نشست!

تا نہالِ سلطنت قوت گرفت　　　دینِ او نقشِ از ملوکیت گرفت

از ملوکیت نگہ گردد دگر
عقل و ہوش و رسم و رہ گردد دگر

(جاوید نامہ۔ صـــ ۸۷)

یعنی جس قوم نے دنیا سے ملوکیت کا خاتمہ کیا تھا، اُس نے پھر نظامِ ملوکیت قائم کر لیا! بظاہر یہ ایک سیاسی انقلاب تھا، لیکن (اقبالؒ کہتا ہے کہ) یہ سیاسی انقلاب نہیں تھا۔ اس نے دین پر ملوکیت کا ٹھپّہ لگا کر اسے مذہب میں تبدیل کر دیا، کیونکہ دین ملوکیت کو راس آ ہی نہیں سکتا۔ اور یہ تبدیلی مذہبی پیشوائیت کے تعاون سے (بلکہ اس کے بل بوتے پر) رُونما ہوئی۔

اُس دن سے لے کر آج تک ملوکیت اور مذہبی پیشوائیت، باہوں میں باہیں ڈال کر اُمّت کو دین سے برگشتہ کیے چلی آ رہی ہے۔ علامہ اقبالؒ اس (مروّجہ) اسلام کی جگہ قرآن کا الدّین قائم کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ اس الدّین (یعنی قرآنی نظامِ حکومت) کے قیام کا امکان ہندوستان میں تو ایک

طرف، خود مسلمانوں کی کسی مملکت میں بھی نہیں، کیونکہ یہ مملکتیں بھی، ملوکیت[1] اور مذہبی پیشوائیت کا ملغوبہ تھیں۔ ہزار سال کی اس دوہری غلامی سے ان کی یہ حالت ہو چکی تھی کہ :-

لَاْ اِلٰہ اندر نمازش بود، و نیست — نازہا اندر نیازش بود، و نیست
نور در صوم و صلوٰتِ اُو نماند — جلوۂ در کائناتِ اُو نماند!
روح چوں رفت از صلوٰت و از صیام — فرد ناہموار و ملت بے نظام
سینہ ہا از گرمیٔ قرآں تہی! — از چنیں مرداں چہ اُمید بہی
ہر کسے بر جادۂ خود تند رو — ناقۂ مابے زمام و ہرزہ دو

(جاوید نامہ صہ ۲۳۵)

لیکن اس کے باوجود وہ (اقبالؒ) اس سے مایوس نہیں ہوا۔ جس کی نگاہیں قرآنی بصیرت سے مستنیر ہوں وہ مایوس ہوا ہی نہیں کرتا۔ وہ نامساعد حالات کی تہہ بہ تہہ تاریکیوں میں بھی روشنی کی کرن دیکھ لیتا ہے۔ انہوں نے اس کا حل یہ سوچا کہ ایک ایسا خطۂ زمین حاصل کیا جائے جس میں پہلے سے کوئی نظام قائم نہ ہو، اور اس لوحِ سادہ پر قرآنی اسلام کا نقش ثبت کر دیا جائے۔ چنانچہ انہوں نے اس مجوزہ مملکت کا تصور پیش کرتے ہوئے یہ نہیں کہا تھا کہ اس سے ہم انگریز یا ہندو کی غلامی سے نجات حاصل کر لیں گے، نہ ہی انہوں نے یہ کہا تھا کہ اس سے ہم پر معیشت کی راہیں کھل جائیں گی۔ یہ تمام مقاصد ثانوی حیثیت رکھتے تھے۔ انہوں نے کہا یہ تھا کہ :-

"اس سے ہم اس قابل ہو جائیں گے کہ ہم اسلام پر سے اُس نقش کو مٹا سکیں جسے عربی ملوکیت نے اس پر ثبت کر رکھا ہے"۔ (خطبۂ الٰہ آباد)

یہ تھا ہمارے اس حسین و سادہ لیکن عظیم انقلاب آفریں سلوگن کا مقصود کہ :-

پاکستان کا مطلب کیا؟ لَاْ اِلٰہَ اِلَّا اللہ

یعنی اس قرآنی نظام کا قیام جو :-

---

[1] واضح رہے کہ ملوکیت سے مراد صرف بادشاہت نہیں۔ اس سے مراد ہر غیر قرآنی نظام ہے خواہ اس کی شکل کوئی بھی ہو اور وہ کسی کے ہاتھوں متشکل ہو۔ اس وقت (مسلمانوں کی مملکتوں سمیت) ساری دنیا میں ملوکیت مسلط ہے۔

موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لئے — لے کوئی فغفور و خاقان، نے فقیرِ رہ نشین
(ابلیس کی مجلسِ شوریٰ)

لیکن اقبالؒ کے اس خواب کی جو تعبیر ہم نے متشکل کی، اُسے:-

کسی بتکدہ میں بیاں کروں، تو کہے صنم بھی "ہری ہری"!

ہم نے اللہ کو تو (معاذ اللہ) ملک بدر کر دیا، اور فرعونوں، ہامانوں اور قارونوں کے آلہٰ تراش کر انہیں اپنا معبود بنا لیا۔ صدرِ اوّل میں تو پھر بھی قرآنی نظام قائم ہو جانے کے بعد، ہمارا تختہ اُلٹا تھا۔ یہاں ہمیں جھوٹوں بھی اس کا عکس تک دیکھنا نصیب نہ ہؤا۔ کاہن دیاپا کی وہی قوتیں جنہیں شکستِ فاش ہوئی تھی، یورش کر کے یہاں آگئیں اور انہوں نے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کا وہی مطلب یہاں عملاً ثابت کر دیا جسے وہ متحدہ ہندوستان میں اسلام کہہ کر پیش کرتی تھیں۔ اُن کا وہاں دعوے تھا کہ اس اسلام کے لئے الگ مملکت کی ضرورت نہیں۔ یہاں ان کے اس اسلام کو دیکھ کر جسے وہ پاکستان میں رائج کر رہے ہیں، ہماری نئی نسل نے کہنا شروع کیا ہے کہ اس اسلام کے لئے ملک کو تقسیم کرنے کی کیا ضرورت تھی؟

یوں ہم نے اپنی جیتی ہوئی بازی ہار دی ہے۔ اور قیامت بالائے قیامت، کہ ملک میں شاید ہی کوئی آنکھ ہو جو اس شکست کے مضرات کو دیکھ رہی ہو! ایسی حالت اس وقت ہوتی ہے جب "کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا"۔ اور احساسِ زیاں کے جاتے رہنے سے اہلِ کارواں کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ وہ، رہزن کو یہ کہہ کر دعائیں دیتے ہیں کہ:-

نہ لُٹتے دن کو تو کب رات کو یوں بے خبر سوتے؟
(غالبؔ بہ ادنیٰ تصرف)

قوموں کی تباہی اِس "بے خبر سونے" کا نتیجہ ہوتی ہے۔

پرویزؔ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نومبر ۱۹۸۱ء

نذرِ اقبالؒ

اس سے پہلے ہمارے ہاں علامہ اقبالؒ کے یومِ وفات کی تقریب اپریل میں منائی جاتی تھی۔ لیکن اب اس کے علاوہ ان کے یومِ پیدائش کی تقریب بھی (نومبر میں) منائی جاتی ہے۔ اس نسبت سے طلوعِ اسلام کی نومبر کی اشاعت کے لمعات حضرت علامہ اقبالؒ کی تعلیم اور پیغامات کی نذر کئے جاتے ہیں۔

۱۔ قرآن سے باہر جانے کی ضرورت نہیں

عرشی صاحب کا بیان ہے کہ انہوں نے ایک مرتبہ علامہ اقبالؒ سے پوچھا "خارج از قرآن ذخیرۂ احادیثؐ روایات اور کتب فقہ وغیرہ کو شامل کر کے اسلام مکمل ہوتا ہے یا صرف قرآن اس باب میں کفایت کرتا ہے؟" انہوں نے فرمایا۔ "یہ چیزیں تاریخ و معاملات پر مشتمل ہیں۔ ان کی بھی ضرورت ہے اور ان سے پتہ چلتا ہے کہ کن ضروریات کے تحت وضع کی گئیں۔ لیکن نفسِ اسلام قرآنِ مجید میں بکمال و تمام آچکا ہے۔ خدا تعالیٰ کا منشا دریافت کرنے کے لئے ہمیں قرآن سے باہر جانے کی ضرورت نہیں۔"

(البیان۔ دسمبر ۱۹۲۹ء)

۲۔ احکامِ قرآنیہ کی ابدیت کو ثابت کیا جائے

مجھ کو اُن[1] کے خیالات سے کسی حد تک پہلے بھی آگاہی ہے۔ کیا اچھا ہو کہ وہ شریعتِ محمدیہؐ پر ایک مبسوط کتاب تحریر فرمائیں۔ جس میں عبادات و معاملات کے متعلق صرف قرآن سے استدلال کیا گیا ہو۔ معاملات

---

[1] خواجہ احمد الدین صاحب (امرتسری مرحوم)

کے متعلق خاص طور پر اسی قسم کی کتاب کی آجکل شدید ضرورت ہے۔ ہندوستان میں تو شاید اس کے مقبول ہونے کے لئے مدت درکار ہے۔ ہاں دوسرے اسلامی ممالک میں اس کی ضرورت کا احساس ہر روز بڑھ رہا ہے۔ شیخ علی رزاق اور دوسرے علمائے مصر کے مباحث سے مولوی صاحب آگاہ ہوں گے۔ علیٰ ہذالقیاس ترکی میں بھی یہی مسائل زیر غور ہیں، اس پر ایک آدھ کتاب بھی تصنیف ہو چکی ہے۔ اس میں زیادہ تر زمانۂ حال کے مغربی اصول فقہ کو ملحوظ رکھ کے فقۂ اسلامی پر بحث کی گئی ہے۔ ترکوں نے جو "چرچ" اور "سٹیٹ" میں امتیاز کر کے ان کو الگ کر دیا ہے۔ اس کے نتائج نہایت دور رس ہیں اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ افتراق اقوام اسلامی کے لئے باعث برکت ہوگا یا شقاوت۔

غرض کہ مولوی صاحب یا ان کے رفقاء کو جو کلام الٰہی اور مسلمانوں کے دیگر مذہبی لٹریچر پر عبور رکھتے ہیں، اس طرف توجہ کرنی چاہئے۔ میں اور مجھ جیسے اور لوگ صرف ایک آنکھ رکھتے ہیں۔ ایک مدت سے ہم یہ سن رہے ہیں کہ قرآن کامل کتاب ہے اور خود اپنے کمال کا مدعی ہے۔ لیکن ضرورت ہے کہ اس کے کمال کو عملی طور پر ثابت کیا جائے کہ سیلز انسانی کے لئے تمام ضروری قواعد اس میں موجود ہیں اس میں فلاں فلاں آیت سے فلاں فلاں قواعد کا استخراج ہوتا ہے نیز جو قواعد عبادات یا معاملات کے متعلق (بالخصوص مؤخر الذکر کے متعلق) دیگر اقوام میں اس وقت تک مروج ہیں۔ ان پر قرآنی نقطۂ نگاہ سے تنقید کی جائے اور دکھایا جائے کہ وہ بالکل ناقص ہیں اور ان پر عمل کرنے سے نوع انسانی کبھی سیادت سے بہرہ اندوز نہیں ہو سکتی۔ میرا عقیدہ یہ ہے کہ جو شخص اس وقت قرآنی نقطۂ نگاہ سے زمانۂ حال کے "جورس پروڈنس" یعنی اصول فقہ پر ایک تنقیدی نگاہ ڈال کر احکام قرآنیہ کی ابدیت کو ثابت کرے گا، وہی اسلام کا "مجدد" ہوگا۔ اور بنی نوع انسان کا سب سے بڑا خادم بھی وہی شخص ہوگا۔ مگر افسوس ہے کہ زمانۂ حال کے اسلامی فقہا یا تو زمانہ کے میلان طبیعت سے بالکل بے خبر ہیں یا قدامت پرستی میں مبتلا ہیں۔ ایران میں مجتہدین شیعہ کی تنگ نظری اور قدامت پرستی نے بہاء اللہ کو پیدا کیا جو سرے سے احکام قرآنی کا ہی منکر ہے۔ ہندوستان میں علمائے حنفی اس بات کے قائل ہیں کہ اجتہاد کے تمام دروازے بند ہیں۔ میں نے ایک بہت بڑے عالم کو یہ کہتے سنا کہ حضرت امام ابو حنیفہؒ کا نظیر ناممکن ہے۔ غرضکہ یہ وقت عملی کام کا ہے، کیونکہ میری ناقص رائے میں مذہب اسلام گویا زمانہ کی کسوٹی پر کسا جا رہا ہے اور شاید تاریخ اسلام میں ایسا وقت اس سے پہلے کبھی نہیں آیا۔ (مکتوب بنام صوفی غلام مصطفےٰ تبسم۔ محررہ ۳۰ ستمبر ۲۵ء)

۳۔ مسلمانوں کا نصب العین

انسان کی تاریخ پر نظر ڈالو، ایک لامتناہی سلسلہ ہے باہم آویزشوں کا، خونریزیوں کا، اور خانہ جنگیوں کا۔ کیا

ان حالات میں عالمِ بشری میں ایک ایسی اُمّت قائم ہو سکتی ہے جس کی اجتماعی زندگی امن و سلامتی پر موسّس ہو؟ قرآن کا جواب ہے کہ ہاں ہو سکتی ہے، بشرطیکہ توحیدِ الٰہی کو انسانی فکر و عمل میں حسبِ منشاءِ الٰہی مشہود کرنا انسان کا نصب العین قرار پائے۔ ایسے نصب العین کی تلاش اور اس کا قیام سیاسی تدبیر کا کرشمہ نہ سمجھئے، بلکہ یہ رحمت اللعالمین کی ایک شان ہے کہ اقوامِ بشری کو ان کے تمام خودساختہ تفوّقوں اور فضیلتوں سے پاک کر کے ایک ایسی اُمّت کی تخلیق کی جائے جس کو **امۃ مسلمۃ لک** کہہ سکیں اور اس کے فکر و عمل پر **شہداء علی النّاس** کا خدائی ارشاد صادق آسکے۔ (مولانا حسین احمد مدنی کے جواب میں بمتعلقہ قومیت)

۴۔ اسلام رنگ و نسل و جغرافیہ سے بلند ہو کر انسانیّت کو دعوت دیتا ہے

۱۔ اسلام ہمیشہ رنگ و نسل کے عقیدہ کا، جو نصب العین کی راہ میں سب سے بڑا سنگِ گراں ہے، نہایت کامیاب حریف رہا ہے۔ دنیا کا یہ خیال غلط ہے کہ سائنس اسلام کا سب سے بڑا دشمن ہے، دراصل اسلام بلکہ کائناتِ انسانیّت کا سب سے بڑا دشمن رنگ و نسل کا عقیدہ ہے اور جو لوگ نوعِ انسانی سے محبت رکھتے ہیں ان کا فرض ہے کہ ابلیس کی اس اختراع کے خلاف علمِ جہاد بلند کریں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ قومیت کا عقیدہ جس کی بنیاد نسل یا جغرافیائی حدودِ ملک پر ہے، دنیائے اسلام میں استیلا حاصل کر رہا ہے۔ اور مسلمان عالم گیر اخوت کے نصب العین کو نظر انداز کر کے اس عقیدہ کے فریب میں مبتلا ہو رہے ہیں جو قومیّت کو ملک و وطن کی حدود میں مقیّد رکھنے کی تعلیم دیتا ہے۔ اس لئے میں ایک مسلمان اور ہمدردِ نوعِ انسانی کی حیثیت سے انہیں یہ یاد دلانا مناسب سمجھتا ہوں کہ ان کا حقیقی فرض سارے بنی آدم کی نشوونما اور ارتقا ہے۔

یہ درست ہے کہ مجھے اسلام سے بے حد محبت ہے لیکن مسٹر ڈکنسن کا یہ خیال صحیح نہیں کہ میں نے محض اس محبت کے پیشِ نظر مسلمانوں کو اپنا مخاطب ٹھہرایا ہے، بلکہ دراصل عملی حیثیت سے میرے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ ایک خاص جماعت یعنی مسلمان کو اپنا مخاطب قرار دیا جائے۔ کیونکہ تنہا یہی جماعت میرے مقاصد کے لئے موزوں دکھائی دیتی ہے۔ مسٹر ڈکنسن کا یہ خیال بھی تسامح سے خالی نہیں کہ اسلامی تعلیمات کی روح کسی خاص گروہ سے مختص ہے۔ اسلام تو کائناتِ انسانیّت کے اتحادِ عمومی کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ان

کے تمام جزوی اختلافات سے قطع نظر کر لیتا ہے اور کہتا ہے۔ تعالوا الی کلمۃ سواء بیننا وبینکم

(ڈاکٹر نکلسن کے نام مکتوب۔ متعلقہ فلسفہ سخت کوشی)

۲

اسلام کے مذکورہ بالا دعویٰ پر عقلی دلائل کے علاوہ تجربہ بھی شاہد ہے۔ اول یہ کہ اگر عالم بشریت کا مقصد اقوام انسانی کا امن، سلامتی اور ان کی موجودہ اجتماعی ہیئتوں کو بدل کر ایک واحد اجتماعی نظام قرار دیا جائے تو سوائے نظام اسلام کے کوئی اور نظام ذہن میں نہیں آسکتا، کیونکہ جو کچھ قرآن سے میری سمجھ میں آیا ہے اس کی رو سے اسلام محض انسان کی اخلاقی اصلاح ہی کا داعی نہیں بلکہ عالم بشریت کی اجتماعی زندگی میں ایک تدریجی مگر اساسی انقلاب بھی چاہتا ہے، جو اس کے قومی اور نسلی نقطۂ نگاہ کو یکسر بدل کر اس میں خالص انسانی ضمیر کی تخلیق کرے۔ تاریخ ادیان اس بات کی شاہد وعادل ہے کہ قدیم زمانہ میں "دین" قومی تھا۔ جیسے مصریوں، یونانیوں اور ہندیوں کا، بعد میں نسلی قرار پایا، جیسے یہودیوں کا۔ مسیحیت نے یہ تعلیم دی کہ دین انفرادی اور پرائیویٹ عقائد کا نام ہے اس واسطے انسان کی اجتماعی زندگی کی ضامن صرف اسٹیٹ ہے۔ یہ اسلام ہی تھا جس نے بنی نوع انسان کو سب سے پہلے یہ پیغام دیا کہ دین نہ قومی ہے، نہ نسلی، نہ انفرادی، نہ پرائیویٹ بلکہ خالصتاً انسانی ہے، اور اس کا مقصد باوجود تمام فطری امتیازات کے عالم بشریت کو متحد و منظم کرنا ہے۔ ایسا دستور العمل قوم اور نسل پر بنا نہیں کیا جا سکتا، نہ اس کو پرائیویٹ کہہ سکتے ہیں، بلکہ اس کو صرف معتقدات پر مبنی کیا جا سکتا ہے۔ صرف یہی ایک طریق ہے جس سے عالم انسانی کی جذباتی زندگی اور اس کے افکار میں یک جہتی اور ہم آہنگی پیدا ہو سکتی ہے جو ایک امت کی تشکیل اور اس کے بقاء کے لئے ضروری ہے۔ اس سے علیحدہ رہ کر جو اور راہ اختیار کی جائے وہ راہ لادینی کی ہوگی اور شرف انسانیت کے خلاف ہوگی۔ چنانچہ یورپ کا تجربہ دنیا کے سامنے ہے۔ جب یورپ کی دینی وحدت پارہ پارہ ہو گئی اور یورپ کی اقوام علیحدہ علیحدہ ہو گئیں تو ان کو اس بات کی فکر ہوئی کہ قومی زندگی کی اساس کیا قرار پائے۔ ظاہر ہے کہ مسیحیت ایسی اساس نہ بن سکتی تھی۔ انہوں نے یہ اساس وطن کے تصور میں تلاش کی مگر کیا انجام ہوا اور ہو رہا ہے ان کی اساس کے انتخاب کا؟ لوتھر کی اصلاح، غیر سلیم عقلیت کا دور، اصول دین کا اسٹیٹ کے اصولوں سے افتراق بلکہ جنگ، یہ تمام قوتیں یورپ کو دھکیل کر کس کی طرف لے گئیں، لادینی، دہریت اور اقتصادی جنگوں کی طرف!

(مولانا حسین احمد مدنی کے جواب میں، مضمون متعلقہ وطنیت)

۴

نبوّتِ محمدیہؐ کی غایت الغایات یہ ہے کہ ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ قائم کی جائے۔ جس کی تشکیل اس قانونِ الٰہی کے تابع ہو، جو نبوّتِ محمدیہؐ کو بارگاہِ الٰہی سے عطا ہوا تھا۔ بالفاظِ دیگر یوں کہئے کہ بنی نوعِ انسان کی اقوام کو، باوجود شعوب و قبائل اور الوان والسنہ کے اختلافات کو تسلیم کر لینے کے، ان تمام آلودگیوں سے منزہ کیا جائے، جو زمان، مکان، وطن، قوم، نسل، نسب، ملک وغیرہ کے ناموں سے موسوم کی جاتی ہیں اور اس طرح اس پیکرِ خاکی کو وہ ملکوتی تخیل عطا کیا جائے جو اپنے وقت کے ہر لحظہ میں ابدیت سے ہمکنار رہتا ہے۔ یہ ہے مقامِ محمدیؐ، یہ ہے نصب العین ملتِ اسلامیہ کا۔ اس کی بلندیوں تک پہنچنے میں معلوم نہیں حضرتِ انسان کو کتنی صدیاں لگیں، مگر اس میں بھی کچھ شک نہیں کہ اقوامِ عالم کی باہمی مغائرت دور کرنے اور باوجود شعوبی، قبائلی، نسلی، لونی اور لسانی امتیازات کے، ان کو ایک رنگ کرنے میں جو کام اسلام نے تیرہ سو سال میں کیا ہے وہ دیگر ادیان سے تین ہزار سال میں بھی نہیں ہو سکا۔ یقین جانئے کہ دینِ اسلام ایک پوشیدہ اور غیر محسوس حیاتی اور نفسیاتی عمل ہے جو بغیر کسی تبلیغی کوششوں کے بھی عالمِ انسانی کے فکر و عمل کو متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ ایسے عمل کو حال کے سیاسی مفکرین کی جدت طرازیوں سے مسخ کرنا ظلمِ عظیم ہے، بنی نوعِ انسان پر اور اس نبوّت کی ہمہ گیری پر جس کے قلب و ضمیر سے اس کا آغاز ہوا۔

(مولانا حسین احمد مدنی کے جواب میں مضمون متعلقہ وطنیت)

۵۔ عالمگیر پیغام کے لئے بھی ایک سوسائٹی کی ضرورت ہوتی ہے

مسٹر ڈکنسن نے آگے چل کر میرے فلسفہ کے متعلق فرمایا ہے کہ وہ اپنی حیثیت کے اعتبار سے عالمگیر ہے لیکن باعتبار اطلاق و انطباق بخصوص و محدود۔ ایک حیثیت سے ان کا ارشاد صحیح ہے۔ انسانیت کا نصب العین شعر اور فلسفہ میں عالمگیر حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ لیکن اگر اسے مؤثر نصب العین بنانا اور عملی زندگی میں بروئے کار لانا چاہیں، تو آپ شاعروں اور فلسفیوں کو اپنا مخاطب اوّلین نہیں ٹھہرائیں گے اور ایسی ایک مخصوص سوسائٹی تک اپنا دائرۂ مخاطبت محدود کر دیں گے جو ایک مستقل عقیدہ اور معین راہِ عمل رکھتی ہو، لیکن اپنے عملی نمونے اور ترغیب و تبلیغ سے ہمیشہ اپنا دائرہ وسیع کرتی چلی جائے۔ میرے نزدیک اس قسم کی سوسائٹی اسلام ہے۔

(ڈاکٹر نکلسن کے نام مکتوب۔ متعلقہ فلسفہ سمت کوشی)

۶۔ مذہب نجی معاملہ نہیں

سوال یہ ہے کہ آج جو مسئلہ ہمارے پیش نظر ہے، اس کی صحیح حیثیت کیا ہے؟۔ کیا واقعی مذہب ایک نجی معاملہ ہے؟ کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ اخلاقی اور سیاسی نصب العین کی حیثیت سے اسلام کا بھی وہی حشر ہو جو مغرب میں مسیحیت کا ہے؟ کیا یہ ممکن ہے کہ ہم اسلام کو بطور ایک اخلاقی تخیل کے تو برقرار رکھیں، لیکن اس کے نظام سیاست کی بجائے ان قومی نظامات کو اختیار کر لیں جن میں مذہب کی مداخلت کا کوئی امکان باقی نہیں رہتا۔ ہندوستان میں یہ سوال اور بھی اہمیت رکھتا ہے، کیونکہ باعتبار آبادی ہم لوگ اقلیت میں ہیں۔ یہ دعویٰ کہ مذہبی واردات محض انفرادی، اور ذاتی واردات ہیں، اہل مغرب کی زبان سے تو تعجب خیز نہیں معلوم ہوتا، کیونکہ یورپ کے نزدیک مسیحیت کا تصور ہی یہی تھا کہ وہ ایک مشرب رہبانیت ہے جس نے دنیائے مادیات سے منہ موڑ کر اپنی تمام تر توجہ عالم روحانیت پر جمالی ہے۔ اس قسم کے عقیدے سے لازماً وہی نتیجہ مرتب ہو سکتا تھا جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے واردات مذہب کی حیثیت، جیسا کہ قرآن پاک میں بھی ان کا اظہار ہوا ہے، اس سے قطعاً مختلف ہے۔ یہ محض حیاتی نوع کی واردات نہیں ہے کہ ان کا تعلق محض صاحب واردات کے اندرون ذات سے ہو، لیکن اس کے باہر اس کے گردوپیش کی معاشرت پر ان کا کوئی اثر نہ پڑے۔ اس کے برعکس یہ وہ انفرادی واردات ہیں جن سے بڑے بڑے اجتماعی نظامات کی تخلیق ہوتی ہے اور جن کے اولین نتیجہ سے ایک ایسے نظام سیادت کی تاسیس ہوئی جس کے اندر قانونی تصورات مضمر تھے اور جن کی اہمیت کو محض اس لئے نظرانداز نہیں کیا جا سکتا کہ ان کی بنیاد وحی پر ہے۔ لہٰذا اس کا مذہبی نصب العین اس معاشرتی نظام سے جو خود اسی کا پیدا کردہ ہے، الگ نہیں۔ دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں۔ اگر آپ نے ایک کو ترک کر دیا تو بالآخر دوسرے کا ترک بھی لازم آئے گا۔

(خطبۂ صدارت مسلم لیگ ۱۹۳۰ء)

———— ۷ ————

یاد رکھنا چاہیئے کہ اسلام کوئی کلیسائی نظام نہیں بلکہ یہ ایک ریاست ہے جس کا اظہار روسو سے بھی کہیں پیشتر ایک ایسے وجود میں ہوا جو عقد اجتماعی کا پابند ہو۔ ریاست اسلامی کا انحصار ایک اخلاقی نصب العین پر ہے جس کا یہ

عقیدہ ہے کہ انسان شجر و حجر کی طرح کسی خاص زمین سے وابستہ نہیں بلکہ وہ ایک روحانی ہستی ہے جو ایک اجتماعی ترکیب میں حصہ لیتا ہے اور اس کے ایک زندہ جزو کی حیثیت سے چند فرائض اور حقوق کا مالک ہے۔ (ایضاً)

۷۔ اسلام اپنے اصولوں میں کوئی لچک اپنے اندر نہیں رکھتا

اسلام ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ کے اصول کی حیثیت میں کوئی لچک اپنے اندر نہیں رکھتا اور ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ کے کسی اور آئین سے کسی قسم کا راضی نامہ یا سمجھوتہ کرنے کو تیار نہیں، بلکہ اس امر کا اعلان کرتا ہے کہ ہر دستور العمل جو غیر اسلامی ہو، نامعقول و مردود ہے۔

(بجواب مولانا حسین احمد مدنی۔ متعلقہ قومیت)

(۲)

اُمّتِ مسلمہ جس دین کی حامل ہے۔ اس کا نام دینِ قیّم ہے۔ دینِ قیّم کے الفاظ میں ایک عجیب و غریب لطیفہ قرآنی مخفی ہے اور وہ یہ کہ صرف دین ہی مقوّم ہے اس گروہ کے امورِ معاشی اور مادّی کا جو اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی اس کے نظام کے سپرد کر دے، یا لفاظ دیگر قرآن کی رُو سے حقیقی، تمدّنی یا سیاسی معنوں میں قوم، دینِ اسلام ہی سے تقویم پاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن صاف صاف اس حقیقت کا اعلان کرتا ہے کہ کوئی دستور العمل جو غیر اسلام ہو نامعقول و مردود ہے۔ (ایضاً)

۸۔ مُلّائیّت، تصوّف، ملوکیّت

۱۔ مُلّائیّت: کبھی علماء اسلام کے لئے ایک قوّتِ عظیم کا سرچشمہ رہے ہیں، لیکن صدیوں کے مرور کے بعد خاص کر زوالِ بغداد کے زمانہ سے وہ بے حد قدامت پرست بن گئے اور آزادیٔ اجتہاد (یعنی قانونی امور میں آزاد رائے قائم کرنا) کی مخالفت کرنے لگے۔ پس اُنیسویں صدی کے مصلحین اسلام کا پہلا مقصد یہ تھا کہ عقائد کی جدید تفسیر کی جائے اور بڑھتے ہوئے تجربہ کی روشنی میں قانون کی جدید تعبیر کرنے کی آزادی حاصل کی جائے۔

۲۔ تصوّف: مسلمانوں پر ایک ایسا تصوّف مسلّط تھا جس نے حقائق کی آنکھیں بند کر لی تھیں، جس نے

عوام کی قوتِ عمل کو ضعیف کر دیا تھا اور ان کو ہر قسم کے توہم میں مبتلا کر رکھا تھا۔ اور عوام کی جہالت اور ضعفِ اعتقادی سے فائدہ اٹھانے کا ذریعہ بن گیا تھا۔ اس نے بتدریج اور غیر محسوس طریقہ پر مسلمانوں کی قوتِ ارادی کو کمزور اور اس قدر ختم کر دیا تھا کہ مسلمان اسلامی قانون کی سختی سے بچنے کی کوشش کرنے لگے تھے۔ انیسویں صدی کے مصلحین نے اس قسم کے تصوف کے خلاف علمِ بغاوت بلند کر دیا اور مسلمانوں کو عصرِ جدید کی روشنی کی طرف دعوت دی۔ یہ نہیں کہ یہ مصلحین مادہ پرست تھے، ان کا مقصد یہ تھا کہ مسلمان اسلام کی روح سے آشنا ہو جائیں، جو مادہ سے گریز کرنے کی بجائے اس کی تسخیر کی کوشش کرتی ہے۔

(۲)۔ ملوکیت: مسلمان سلاطین کی نظر اپنے خاندان کے مفاد پر جمی رہتی تھی اور اپنے اس مفاد کی حفاظت کے لئے اپنے ملک کو بیچنے میں پس و پیش نہیں کرتے تھے۔ سید جمال الدین افغانی کا مقصدِ خاص یہ تھا کہ مسلمانوں کو دنیائے اسلام کے ان حالات کے خلاف بغاوت پر آمادہ کیا جائے۔

(ختم نبوت - بجواب پنڈت جواہر لال نہرو)

۹۔ پاکستان کی آزادی مسلمانوں کے جمود کو توڑ ڈالیگی

میں صرف ہندوستان اور اسلام کی فلاح و بہبود کے خیال سے ایک منظم اسلامی ریاست کے قیام کا مطالبہ کر رہا ہوں۔ اس سے ہندوستان کے اندر توازنِ قوت کی بدولت امن و امان قائم ہو جائے گا اور اسلام کو اس امر کا موقع ملے گا کہ وہ ان اثرات سے آزاد ہو کر جو عربی شہنشاہیت کی وجہ سے اب تک اس پر قائم ہیں، اس جمود کو توڑ ڈالے جو اس کی تہذیب و تمدن، شریعت اور تعلیم پر صدیوں سے طاری ہے۔ اس سے نہ صرف ان کے صحیح معانی کی تجدید ہو سکے گی بلکہ وہ زمانۂ حال کی روح سے بھی قریب تر ہو جائیں گے۔

(خطبۂ صدارت - ۱۹۳۰ء)

۱۰۔ کمیونزم خلافِ اسلام ہے

سوشلزم کے معترف ہر جگہ روحانیت کے مذہب کے مخالف ہیں اور اس کو افیون تصور کرتے ہیں۔

لفظ افیون اس ضمن میں سب سے پہلے کارل مارکس نے استعمال کیا تھا۔ میں مسلمان ہوں اور انشاء اللہ مسلمان مروں گا۔ میرے نزدیک تاریخ انسانی کی مادی تعبیر سراسر غلط ہے۔ روحانیت کا میں قائل ہوں مگر روحانیت کے قرآنی مفہوم کا، جس کی تشریح میں نے ان تحریروں میں جابجا کی ہے اور سب سے بڑھ کر اس فارسی مثنوی میں جو عنقریب آپ کو ملے گی۔ جو روحانیت میرے نزدیک مغضب ہے یعنی افیونی خواص رکھتی ہے، اس کی تردید میں نے جابجا کی ہے۔

(مکتوب بنام غلام السیدین محررہ ۱۷ / اکتوبر ۱۹۳۶ء)

۱۱۔ یہی اسلام کی منزہ شکل ہے

لیگ کو آخر العمل یہ طے کرنا ہوگا کہ وہ ایک ایسی جماعت رہنا چاہتی ہے جو صرف مسلمانوں کے اعلیٰ طبقہ کی نمائندگی کرے یا وہ عوام کی نمائندگی کرنا چاہتی ہے۔ اس وقت تک عوام نے لیگ میں کوئی دلچسپی نہیں لی اور اس کی ان کے پاس وجوہات ہیں۔ ذاتی طور پر میرا خیال ہے کہ کوئی سیاسی جماعت جو مسلمانوں کے متوسط طبقہ کی مرفۃ الحالی کا وعدہ نہیں دے سکتی، عوام کے لئے کبھی جاذبِ نگاہ نہیں بن سکے گی (اس وقت حالت یہ ہے کہ) آئینِ جدید (یعنی ۱۹۳۵ء کے آئین) کے مطابق اعلیٰ ملازمتیں امراء کے بیٹوں کے حصے میں آجائیں گی اور نچلی ملازمتیں وزراء کے دوستوں اور رشتہ داروں کے لئے وقف ہو جائیں گی۔ (عوام اور متوسط درجہ کے مسلمانوں کا ان میں کوئی حصہ نہیں ہوگا) یہ تو رہا ملازمتوں کی بابت۔ اسی طرح دیگر معاملات میں کبھی ہمارے سیاسی اداروں نے کبھی عوام کی مرفۃ الحالی کے متعلق کچھ نہیں سوچا۔ روٹی کا مسئلہ دن بدن نازک ہوتا چلا جا رہا ہے۔ مسلمان محسوس کر رہا ہے کہ وہ گزشتہ دو سو سال سے نیچے ہی نیچے جا رہا ہے۔ اس لئے سوال یہ ہے کہ مسلمانوں کے افلاس کا علاج کیا ہو؟ لیگ کا مستقبل اسی سوال کے حل پر موقوف ہے۔ اگر لیگ نے اس باب میں یہ نہ کیا تو مجھے یقین ہے کہ عوام اس سے اسی طرح بے تعلق رہیں گے جس طرح اس وقت تک بے تعلق رہے ہیں۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ اسلامی آئین کے پاس اس مسئلہ کا حل موجود ہے۔ اس آئین کو دورِ حاضرہ کے تصورات کی روشنی میں مزید نشوونما دی جا سکتی ہے۔ اسلامی آئین کے طویل اور گہرے مطالعہ کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اگر اس نظام کو اچھی طرح سے سمجھ کر نافذ کر دیا جائے تو اس سے کم از کم ہر فرد کو سامانِ پرورش ضرور مل جاتا ہے۔

(مکتوب بنام قائدِ اعظمؒ محمد علی جناحؒ۔ مورخہ ۲۸۔ مئی ۱۹۳۷ء)

دُرِّ منثور

ان موتیوں میں سے چند ایک جو اقبالؒ کے مکتوبات و دیگر تحریرات نثر میں جابجا بکھرے ہوئے ہیں۔

۱۔ داخلی انقلاب

زندگی اپنے حوالی میں کسی قسم کا انقلاب پیدا نہیں کر سکتی جب تک پہلے اس کی اندرونی گہرائیوں میں انقلاب نہ ہو اور کوئی نئی دنیا خارجی وجود اختیار نہیں کر سکتی جب تک کہ اس کا وجود پہلے انسانوں کے ضمیر میں متشکل نہ ہو۔

(دیباچہ پیام مشرق)

۲۔ نسل پرستی

تاریخ انسانیت میں اسلام کا ظہور ایسے وقت میں ہوا جب وحدتِ انسانیت کے لئے دقیانوسی اصول، مثلاً خونی رشتے اور تخت و تاج کے علائق ناکام ہو رہے تھے۔ چنانچہ اسلام کے نزدیک وحدتِ انسانیت کا اصول گوشت پوست سے متعلق نہیں، بلکہ اس کا سرچشمہ انسانی قلب میں ہے۔ انسانیت کے نام اسلام کا عمرانی پیغام یہی ہے کہ نسلی امتیازات مٹا دو، ورنہ خانہ جنگی میں تباہ ہو جاؤ گے۔ یہ کہنا مبالغہ آمیزی نہ ہوگا کہ اسلام فطرت کے نسل ساز مظاہر کو پسند نہیں کرتا اور اپنے مخصوص اداروں سے ایسے نقطۂ نگاہ کی تخلیق کرتا ہے جو فطرت کے نسل ساز قوی کو بے کار کر دے۔ انسانوں کے سدھانے کے لئے اسلام نے ایک ہزار سال میں وہ کچھ کر دکھایا جو عیسائیت اور بدھمت سے دو ہزار سال سے اوپر میں بھی نہیں ہو سکا۔

(احمدیت سے متعلق۔ نہرو کے جواب میں)

۳۔ مذہب اور سیاست

اسلام، محض انسان کی اخلاقی اصلاح ہی کا داعی نہیں بلکہ عالم بشریت کی اجتماعی زندگی میں ایک تدریجی مگر اساسی انقلاب بھی چاہتا ہے، جو اس کے قومی نقطۂ نگاہ کو یکسر بدل کر اس میں خالص انسانی ضمیر کی تخلیق کرے۔ قدیم زمانے میں دین قومی تھا جیسے مصریوں، یونانیوں اور ہندیوں کا۔ بعد میں نسلی قرار پایا جیسے یہودیوں کا۔ مسیحیت نے یہ تعلیم دی کہ دین انفرادی اور پرائیویٹ ہے۔ یہ اسلام ہی تھا جس نے بنی نوع انسان کو سب سے پہلے یہ پیغام دیا کہ دین نہ قومی ہے نہ نسلی۔ نہ انفرادی ہے نہ پرائیویٹ۔ بلکہ خالصتاً انسانی ہے اور اس کا مقصد، باوجود تمام فطری امتیازات کے، عالم بشریت کو متحد و منظم کرنا ہے۔ صرف یہی ایک طریقہ ہے جس سے عالم انسانی کی جذباتی زندگی اور اس کے افکار میں یکجہتی اور ہم آہنگی پیدا ہو سکتی ہے، جو ایک امت کی تشکیل اور اس کی بقا کے لئے ضروری ہے۔

(مولانا حسین احمد مدنی کے جواب میں بیان)

۴۔ شریعت کا مقصود

اسلام نفس انسانی اور اس کی مرکزی قوتوں کو فنا نہیں کرتا، بلکہ ان کے عمل کے لئے حدود متعین کرتا ہے۔ ان حدود کے متعین کرنے کا نام اصطلاح اسلام میں شریعت یا قانون الٰہی ہے۔

(مولوی ظفر احمد صاحب صدیقی کے نام خط ۱۹۳۶ء)

۵۔ دورِ انحطاط کے پیشوا

اقوام و ملل کے عروج و زوال کی داستانوں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ قوموں کی زندگی کی سوتیں خشک ہونا شروع ہوتی ہیں تو ان کا زوال بجائے خود ان کے شعراء، فلاسفر، سیاستین وغیرہم کو ایک نئی تحریک خیال سے ابھارتا ہے۔ چنانچہ وہ پیغمبرانہ شان سے اٹھتے ہیں اور استدلال کے گورکھ دھندے تیار کر کے حیاتِ ملی کے رذائل و ذمائم کے گیت گاتے اور انہیں خوش آئند و درخشاں بناتے ہیں۔ یہ پیغمبر غیر شعوری طور پر قنوطیت

کورجائیت کے نگاہ فریب لباس میں پیش کرتے ہیں۔ اس طرح وہ اہل قوم کے عملی قوی کو شل اور ان کی روحانی قوت نمو کو یکسر فنا کر دیتے ہیں۔ (بیان متعلقہ احمدیت)

۶۔ مجوسی کلچر

جب کسی کلچر میں علامات زوال نمودار ہونا شروع ہوجاتی ہیں تو اس کی فلسفیانہ بحثیں، اس کے تصورات اور اس کے واردات روحانی کی شکلیں جامد اور غیر متحرک ہوجاتی ہیں۔ مجوسی کلچر ایسے دور سے گزر رہی تھی کہ اسلام کا ظہور ہوا۔ جہاں تک میں تاریخ کلچر کا مطالعہ کر سکا ہوں، اسلام نے مجوسی کلچر کے خلاف شدید احتجاج کیا۔ قرآن میں بین ثبوت اس امر کے ملتے ہیں کہ قرآن کا مقصد یہ تھا کہ وہ نہ صرف فکر و نظر کی نئی راہیں کھول دے بلکہ واردات و کیفیات روحانی کی تشکیل نو کرے۔ لیکن ہمارے مجوسی ورثہ نے اسلام کی زندگی کی سوتیں خشک کر دیں اور اس کی روح کی نشو و نما اور اس کے مقاصد کی تکمیل کے سلسلے کو آگے بڑھنے سے روک دیا۔

(احمدیت سے متعلق، اخبار لائٹ کے جواب میں)

۷۔ محاورہ عرب

ہندی مسلمانوں کی بڑی بدبختی یہ ہے کہ اس ملک سے عربی زبان کا علم اٹھ گیا ہے، اور قرآن کی تفسیر میں محاورۂ عرب سے بالکل کام نہیں لیتے، یہی وجہ ہے کہ اس ملک میں قناعت اور توکل کے وہ معانی لیئے جاتے ہیں جو عربی میں ہرگز نہیں۔

(سراج الدین پال کے خط۔ ۱۹۱۶ء)

۸۔ ملت کی حالت

اسلام کے لئے اس ملک میں نازک زمانہ آرہا ہے۔ جن لوگوں کو کچھ احساس ہے، ان کا فرض ہے کہ اس کی حفاظت کے لئے ہر ممکن کوشش اس ملک میں کریں۔ علماء میں مداہنت آگئی ہے۔ یہ گروہ حق کو کہنے سے

ڈرتا ہے۔ صوفیاء اسلام سے بے پرواہ اور حکام کے تصرف میں ہیں۔ اخبار نویس اور آجکل کے تعلیم یافتہ لیڈر خود غرض ہیں اور ذاتی منفعت و عزت کے سوا کوئی مقصد ان کی زندگی کا نہیں۔ عوام میں جذبہ موجود ہے مگر ان کا کوئی بے غرض راہنما نہیں۔

(چوہدری نیاز علی خاں کے نام خط۔ ۱۹۳۷ء)

۹۔ اضطراب

میرے دل میں ممالک اسلامیہ کے موجودہ حالات دیکھ کر بے انتہا اضطراب پیدا ہو رہا ہے۔ یہ بے چینی اور اضطراب محض اس وجہ سے ہے کہ مسلمانوں کی موجودہ نسل گھبرا کر کوئی اور راہ اختیار نہ کرلے۔

(سید سلیمان ندوی کے نام خط۔ ۱۹۲۶ء)

۱۰۔ فکر سے محرومی

قومیں فکر سے محروم ہو کر تباہ ہو جاتی ہیں۔

(خطبۂ صدارت۔ ۱۹۳۲ء)

۱۱۔ لیڈروں کا فقدان

اس وقت ہندوستان کے مسلمان دو امراض میں مبتلا ہیں۔ پہلا مرض ان قائدین کا فقدان ہے، جو اسلام کی روح اور تقدیر کو بھی بخوبی سمجھتے ہوں اور تاریخ جدیدہ کے میلانات پر بھی ان کی نگاہ ہو۔ ایسے اشخاص ہی قوموں کی قوت متحرکہ ہوتے ہیں۔ لیکن وہ خدا کی دین ہوتے ہیں اور ضرورت کے مطابق پیدا نہیں کئے جا سکتے۔ دوسرا مرض احساس اجتماعیت کا فقدان ہے اس سے افراد اور گروہ اپنی جداگانہ راہیں تلاش کر رہے ہیں اور عمومی فکر اور اجتماعی حرکت میں کوئی اضافہ نہیں کر رہے۔ اس وقت ہم سیاست میں وہ کچھ کر رہے ہیں جو مذہب میں صدیوں سے کرتے چلے آ رہے ہیں۔

(خطبۂ صدارت۔ ۱۹۳۰ء)

۱۲۔ احترامِ آدمیت

انسان کی بقا کا راز انسانیت کے احترام میں ہے۔

(ریڈیو تقریر ۱۹۳۸ء)

۱۳۔ وحدتِ انسانیت

قومی وحدت ہرگز قائم و دائم نہیں ہے۔ وحدت صرف ایک معتبر ہے اور وہ بنی نوع انسان کی وحدت ہے جو نسل، زبان، رنگ اور قومیت سے بالاتر ہے۔

۱۴۔ قومیت سے بلند

اس وقت دنیا میں اور بالخصوص ممالک مشرق میں ہر ایسی کوشش جس کا مقصد افراد و اقوام کی نگاہ کو جغرافیائی حدود سے بالاتر کرکے ان میں ایک صحیح اور قوی انسانی سیرت کی تجدید و تخلیق ہو، قابلِ احترام ہے۔

(دیباچہ پیامِ مشرق)

۱۵۔ وطنیت

میں یورپی تصور کی وطنیت کا مخالف ہوں۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ اس سے مسلمانوں کو کم تر مادی فوائد حاصل ہوں گے بلکہ اس لئے کہ اس میں منکرِ خدا مادیت کے جراثیم پائے جاتے ہیں، جسے میں جدید انسانیت کے لئے عظیم ترین خطرہ سمجھتا ہوں۔

(خطبۂ صدارت)

۱۶۔ مغربی سیاست

جن نام نہاد مدبّرین کو انسانوں کی قیادت اور حکومت سونپی گئی تھی، وہ خونریزی، سفاکی، استبداد اور ظلم کے دیوتا ثابت ہوئے۔ جن حاکموں کا یہ فرض تھا کہ اخلاقِ انسانی کے نوامیسِ عالیہ کی حفاظت کریں، انسان کو انسان پر ظلم کرنے سے روکیں اور انسانیت کی ذہنی اور عملی سطح کو بلند کریں، انہوں نے ملوکیت اور استعمار کے جوش میں لاکھوں، کروڑوں مظلوم بندگانِ خدا کو ہلاک و پامال کر ڈالا۔ صرف اس لئے کہ ان کے اپنے مخصوص ہوا و ہوس کی تسکین کا سامان بہم پہنچائے۔ (ریڈیو تقریر - ۱۹۳۸ء)

۱۷۔ تاریک ترین دَور

اس زمانہ ملوکیت کے جبرو استبداد نے جمہوریت، اشتراکیت، فسطائیت اور خدا جانے اور کیا کیا نقاب اوڑھ رکھے ہیں۔ اور ان نقابوں کے نیچے دنیا بھر کے تمام گوشوں میں قدرِ حرّیت اور شرفِ انسانیت کی وہ مٹی پلید ہو رہی ہے کہ تاریخِ عالم کا کوئی تاریک سے تاریک صفحہ بھی اس کی مثال پیش نہیں کر سکتا۔

(ریڈیو تقریر - ۱۹۳۸ء)

۱۸۔ قوانینِ الہٰیّہ کا اتباع

جب تک اقوام کی خود ہی قانونِ الٰہی کی پابند نہ ہو، امنِ عالم کی کوئی سبیل نہیں نکل سکتی۔

(مولانا ظفر احمد صاحب صدیقی کے نام خط ۱۹۳۶ء)

۱۹۔ انحطاط کا جادو

انحطاط کا سب سے بڑا جادو یہ ہے کہ یہ اپنے صید پر ایسا اثر ڈالتا ہے جس سے انحطاط کا مسحور اپنے قاتل

کو اپنا مربّی تصور کرنے لگ جاتا ہے۔ یہی حال اس وقت مسلمانوں کا ہے۔

(سراج الدین پال کے نام خط　۱۹۱۶ء)

۲۰۔ ایرانی اثرات

ہندوستان کے مسلمان کئی صدیوں سے ایرانی تاثرات کے اثر میں ہیں۔ ان کو عربی اسلام (یعنی خدا کے عطا کردہ دین) سے اور اس کے نصب العین اور غرض و غایت سے آشنائی نہیں، ان کے لٹریری آئیڈیل بھی ایرانی ہیں اور سوشل نصب العین بھی ایرانی۔ میں چاہتا ہوں کہ اس مثنوی میں حقیقی اسلام کو بے نقاب کر دوں، جس کی اشاعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوئی۔　　(منشی سراج الدین کے نام خط)

۲۱۔ تصوّف

تصوّف کی تمام شاعری مسلمانوں کے پولٹیکل انحطاط کے زمانہ میں پیدا ہوئی اور ہونا بھی یہی چاہیئے تھا۔ جس قوم میں توانائی مفقود ہو جائے، جیسا کہ تاتاری یورش کے بعد مسلمانوں میں مفقود ہو گئی تو قوم کا نقطۂ نگاہ بدل جاتا ہے۔ ان کے نزدیک ناتوانی ایک حسین و جمیل شے ہو جاتی ہے اور ترکِ دنیا موجبِ تسکین۔ اس ترکِ دنیا کے پردے میں قومیں اپنی سستی و کاہلی اور اس شکست کو جو ان کی تنازع للبقاء میں ہو، چھپایا کرتی ہیں۔ ہندوستان کے مسلمانوں کو دیکھیے کہ ان کے ادبیات کا انتہائی کمال لکھنؤ کی مرثیہ گوئی پر ختم ہوا۔

(سراج الدین پال کے نام خط　۱۹۱۶ء)

۲۲۔ تصوّف کا وجود سرزمینِ اسلام میں ایک اجنبی پودا ہے جس نے عجمیوں کی دماغی آب و ہوا میں پرورش پائی۔

(سیّد سلیمان ندوی کے نام خط　۱۹۱۷ء)

۲۳۔ جب تصوّف فلسفہ بننے کی کوشش کرتا ہے اور عجمی اثرات کی وجہ سے نظامِ عالم کے حقائق، اور باری تعالیٰ کی ذات

کے متعلق موشگافیاں کر کے کشفی نظریہ پیش کرتا ہے، تو میری روح اس کے خلاف بغاوت کرتی ہے۔

(علامہ اسلم جیراجپوری کے نام خط ۔ ۱۹۱۹ء)

---

۲۴ ۔ ہندی اور ایرانی صوفیا میں سے اکثر نے مسئلہ فنا کی تفسیر فلسفۂ وحدانیت (وحدت الوجود) اور بدھ مت کے زیر اثر کی ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان اس وقت عملی اعتبار سے ناکارہ محض ہے۔ میرے عقیدے کی رُو سے یہ تفسیر بغداد کی تباہی سے بھی زیادہ خطرناک تھی اور ایک معنی میں میری تمام تحریریں اسی تفسیر کے خلاف ایک قسم کی بغاوت ہے۔ (مولوی ظفر احمد صاحب صدیقی کے نام خط ۱۹۳۶ء)

---

۲۵ ۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی مذہب یا قوم کے دستور العمل و شعار میں باطنی معانی تلاش کرنا یا باطنی مفہوم پیدا کرنا اصل میں اس دستور العمل کو مسخ کر دینا ہے۔ یہ ایک نہایت SUBTLE طریق تنسیخ کا ہے۔ اور یہ طریق وہی قومیں ایجاد یا اختیار کر سکتی ہیں جن کی فطرت گوسفندی ہو۔ شعرائے عجم بیشتر وہ شعرا ہیں جو اپنے فطری میلان کے باعث (وحدت) وجودی فلسفہ کی طرف مائل تھے۔ اسلام سے پہلے بھی ایرانی قوم میں یہ میلان طبع موجود تھا۔ اور اگرچہ اسلام نے کچھ عرصہ تک اس کا نشوونما نہ ہونے دیا، تاہم وقت پاکر ایران کا آبائی اور طبعی مذاق اچھی طرح ظاہر ہوا۔ یا بالفاظ دیگر مسلمانوں میں ایک ایسے لٹریچر کی بنیاد پڑی جس کی بنا وحدت الوجود تھی۔ ان شعراء نے نہایت عجیب و غریب اور بظاہر دلفریب طریقوں سے شعائر اسلام کی تردید و تنسیخ کی ہے اور اسلام کی ہر محمود شئے کو مذموم بیان کیا ہے۔ (سراج الدین پال کے نام خط ۔ ۱۹۱۶ء)

---

۲۶ ۔ ابنِ عربی

تصوف کا سب سے پہلا شاعر عراقی ہے جس نے لمعات میں فصوص الحکم محی الدین ابن عربی کی تعلیموں کو نظم کیا ہے۔ جہاں تک مجھے علم ہے، فصوص میں سوائے الحاد و زندقہ کے اور کچھ نہیں۔

(سراج الدین پال کے نام خط ۔ ۱۹۱۶ء)

۲۷۔ خوئے غلامی

جب انسان میں خوئے غلامی راسخ ہو جاتی ہے تو وہ ہر ایسی تعلیم سے بیزاری کے بہانے تلاش کرتا ہے جس کا مقصد قوتِ نفس اور روحِ انسانی کا ترفع ہو۔

(مولوی ظفر احمد صاحب صدیقی کے نام خط۔ ۱۹۳۶ء)

۲۸۔ قرآن کا مسلک

اگرچہ یورپ نے مجھے بدعت کا چسکا ڈال دیا ہے تاہم مسلک میرا وہی ہے جو قرآن کا ہے۔

(سید سلیمان ندوی کے نام خط ۱۹۳۲ء)

۲۹۔ شاعری

میرے زیرِ نظر حقائق اخلاقی و ملّی ہیں۔ زبان میرے لئے ثانوی حیثیت رکھتی ہے، بلکہ فنِ شعر سے بھی بحیثیت فن کے نابلد ہوں۔

(پروفیسر شجاع کے نام خط۔ ۱۹۳۱ء)

۳۰۔ شاعری میں لٹریچر بحیثیت لٹریچر کبھی میرا مطمحِ نظر نہیں رہا۔ مقصود صرف یہ ہے کہ خیالات میں انقلاب پیدا ہو اور بس۔ اس بات کو مدِنظر رکھ کر جن خیالات کو مفید سمجھتا ہوں ان کو ظاہر کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ کیا عجب کہ آئندہ نسلیں مجھے شاعر تصور نہ کریں۔

(سید سلیمان ندوی کے نام خط۔ ۱۹۱۹ء)

پرویز

۱۵۱۴

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بیادِ اقبالؒ

حقیقت خرافات میں کھو گئی

(خصوصی درس تقریب یومِ اقبالؒ ۲۲ اپریل ۱۹۸۴ء) (پرویز)

عزیزانِ گرامی قدر! سلام و رحمت!

آج کل سڑکوں پر بجلی کے قمقمے آویزاں ہوتے ہیں۔ پاور ہاؤس میں بیٹھا ہوا الیکٹریشن ایک بٹن دباتا ہے تو سارے قمقمے بیک وقت روشن ہو جاتے ہیں۔ لیکن ہمارے بچپن کے زمانے میں سڑکوں پر مٹی کے تیل سے جلنے والی لیمپیں ہوتی تھیں۔ لیمپیں جلانے والا۔ ایک ایک لیمپ روشن کرتا چلا جاتا تھا۔ وہ اپنے حلقہ کا آخری لیمپ جلا کر نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا اور اس کی جلائی ہوئی لیمپیں رات بھر راستوں کو روشن کئے رکھتیں۔ تاریخ انسانیت عبارت ہے اسی قسم کے لیمپ جلانے والوں سے جن کے نورِ بصیرت اور حسنِ کردار سے روشن شدہ شمعوں سے انسانی زندگی کی گزرگاہیں فروزاں ہیں۔ وہ ان شمعوں کو اپنے فائدے کے لئے نہیں جلاتے تھے وہ تو انہیں جلا کر آگے بڑھ جاتے تھے اور ان کے بعد آنے والوں کی راہیں ان سے مستنیر ہوتی تھیں۔ ان کی کیفیت یہ تھی کہ:۔

قدم قدم پہ جلاتا ہوں خونِ دل کے چراغ   یہ سوچ کر کوئی پیچھے بھی آ رہا ہو گا

انہی، خونِ جگر سے شمعیں روشن کرنے والوں میں ایک تابندہ و درخشندہ نام حکیم الامت علامہ اقبالؒ کا بھی ہے جن کے یومِ وفات کی یاد تازہ کرنے کے لئے ہم یہاں جمع ہوئے ہیں۔ حضرتِ علامہ کا سب سے پہلے عمومی احسان، عالمگیر انسانیت پر ہے جس کی تاریک راتوں کو انہوں نے نورِ سحر سے روشناس کرایا۔ دوسرا احسان ملتِ پاکستانیہ پر ہے جس کے راہ گم کردہ قافلے کو انہوں نے نشانِ منزل عطا کیا۔ اور ایک ذاتی احسان اس ذرّہ ناچیز پر بھی ہے جس کا فہمِ قرآن ان کے نورِ بصیرت کا رہینِ کرم ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اسے آپ آج کسی سایہ میں

بوڑھ شاہ" کے مزار پر دھونی رمائے بیٹھا دیکھتے۔

علامہ اقبالؒ کا قلب حزیں ملّت کے درد سے لبریز تھا۔ ان کی ساری عمر اسی کے غم کی خونتابہ فشانی میں گذری۔ ان کا سارا کلام اسی سوز و ساز و درد و داغ کی داستان خوں چکاں ہے۔ دیکھئے وہ ارمغانِ حجاز کی ایک سادہ سی نظم میں پہلے ملّت کی زبوں حالی پر کس طرح خون کے آنسو روتے ہیں۔ جب کہتے ہیں کہ :-

ملّت کا درد

آتی ہے دمِ صبح صدا عرشِ بریں سے　　کھویا گیا کس طرح ترا جوہرِ ادراک؟
کس طرح ہوا کُند ترا نشترِ تحقیق؟　　ہوتے نہیں کیوں تجھ سے ستاروں کے جگر چاک؟
تُو ظاہر و باطن کی خلافت کا سزاوار　　کیا شعلہ بھی ہوتا ہے غلامِ خس و خاشاک؟
مہر و مہ و انجم نہیں محکوم ترے کیوں؟　　کیوں تیری نگاہوں سے لرزتے نہیں افلاک؟
اب تک ہے رواں گرچہ لہو تیری رگوں میں　　نے گرمیٔ افکار، نہ اندیشۂ بے باک!

یہاں تک تو امّتِ مرحوم کی نکبت و زبوں حالی کا مرثیہ تھا۔ اس کے بعد چار لفظوں میں اس کے اسباب کو اس حسنِ ایجاز و جامعیت سے مرتکز کیا دیا ہے کہ ہماری ساری تاریخ اس میں سمٹ کر آجاتی ہے۔ فرمایا۔ ؎

باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری!　　اے کشتۂ سلطانی و مُلّائی و پیری!

دوسری جگہ ہے۔ ؎

چار مرگ اندر پئے ایں دیر میر　　سود خوار و والی و مُلّا و پیر

چار بلائیں

ان کے نزدیک یہی وہ چار عفاریت ہیں جنہوں نے اُمّت کے جسدِ ناتواں سے خون کا آخری قطرہ تک نچوڑ لیا ہے۔ یعنی ملوکیت۔ نظامِ سرمایہ داری۔ خانقاہیت اور مُلّائیت! ان کا کلام انہی چار امراض کی تشریح اور ان کا پیغام انہی سے جان چھڑانے کی تلقین ہے۔ میں آج کی نشست میں ان کے صرف ایک گوشے یعنی مُلّائیت کی اقبالیؒ تشریحات و تلقینات پیش کر دوں گا۔ لیکن پہلے دو امور کا تمہیداً سمجھ لینا ضروری ہے۔

(۱) آپ تاریخِ انسانیت کا پہلا صفحہ الٹئے۔ آپ کو ملوکیت اور مذہبی پیشوائیت کی استبدادی قوتیں شانہ بشانہ چلتی نظر آئیں گی۔ جہاں تک تسلّط و تغلّب کا تعلّق ہے۔ یہ دونوں قوتیں یکساں دکھائی دیں گی لیکن حکمران طبقہ کے مقابلہ میں مذہبی پیشوائیت کی زنجیریں زیادہ محکم اور سنگین ہوتی ہیں۔ حکمرانوں (بادشاہوں۔ راجاؤں) کو اپنا

غلبہ و تسلط قائم رکھنے کے لئے پولیس اور فوج کی ضرورت ہوتی ہے لیکن مذہبی پیشوائیت کو ان میں سے کسی کی بھی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہ اس لئے کہ حکمرانوں کا تسلّط محکوموں کے جسم پر ہوتا ہے اور مذہبی پیشوائیت کا تغلّب ان کے قلب اور دماغ پر۔ حکمرانوں کے خلاف سرکشی کے خیالات ذہنوں میں ابھرتے اور بعض اوقات بغاوت کی شکل بھی اختیار کر لیتے ہیں۔ لیکن مذہبی تسلّط کا یہ عالم ہے کہ اگر ان کے کسی حاکم کے خلاف کسی کے دل کی گہرائیوں میں شائبہ تک بھی کروٹ لے تو وہ ڈرتا ہے، روتا ہے، گڑگڑاتا ہے، معافیاں مانگتا ہے، منّتیں مانتا ہے، کفّارے ادا کرتا ہے۔ "نادیدہ خوف" اس کے اعصاب پر ایسی کڑی گرفت رکھتا ہے کہ وہ سر اٹھانے کی جرأت ہی نہیں کر سکتا۔

فتویٰ کی گرفت

ملکی حکمرانوں اور مذہبی پیشواؤں کے غلبہ اور خوف کی ایک بیّن مثال حال ہی میں ہمارے سامنے آئی ہے۔ گزشتہ فروری میں قانونِ شہادت کے خلاف، کچھ خواتین نے احتجاجاً جلوس نکالا۔ حکومت نے اسے خلافِ قانون قرار دے کر مؤاخذہ کیا۔ بعض گرفتاریاں بھی عمل میں آئیں۔ لیکن انہوں نے اسے ہنسی خوشی برداشت کر لیا۔ نہ کسی کی آنکھ میں آنسو آئے۔ نہ دل میں دھڑکن پیدا ہوئی۔ کچھ دنوں کے بعد اخبارات میں حسب ذیل خبر شائع ہوئی:-

"جمعیت العلماء جموں و کشمیر کے مرکزی ڈپٹی چیف آرگنائزر مولانا عبدالرزاق چشتی نے فتویٰ دیا ہے کہ قانونِ شہادت کے خلاف حال ہی میں لاہور میں نکالے جانے والے جلوس میں جن شادی شدہ خواتین نے حصہ لیا ہے ان کے نکاح ٹوٹ گئے ہیں۔ اب انہیں جائز تصوّر نہیں کیا جانا چاہئے۔ مولانا نے ایسی خواتین کے شوہروں کو ہدایت کی ہے کہ وہ اپنی بیویوں کے ساتھ نکاح کی تجدید کے لئے شرعی طریق کار اختیار کریں۔ ایک بیان میں مولانا چشتی نے کہا کہ جن خواتین نے جلوس میں شرکت کی ہے انہوں نے خدا اور قانونِ پاک کی تعلیمات کی خلاف ورزی کی ہے کیونکہ انہوں نے ایک مقدس قانون کو چیلنج کیا ہے۔ چنانچہ ان کے نکاح جائز نہیں رہے[1]۔ اس کے ساتھ ساتھ مولانا نے کہا کہ جن سیاسی جماعتوں نے اجتماعی اور افراد نے نجی طور پر عورتوں کی حمایت میں جلوس میں شرکت کی ہے۔ وہ بھی خدا اور اس کے رسولؐ کے مجرم ہیں۔ انہوں نے مذہبی تعلیمات کی توہین کی ہے اس لئے وہ پھانسی کے مستحق ہیں۔"

(جنگ لاہور۔ مورخہ ١٠ مارچ ١٩٨٣ء)

سنا گیا ہے کہ جن عورتوں کے خلاف یہ فتویٰ صادر ہوا، ان میں سے جو زیادہ "مذہب زدہ" تھیں، ان کا بُرا حال

[1] اُمید ہے آئندہ، خواتین محتاط رہیں گی اور صرف غیر شادی شدہ عورتوں کا جلوس نکالا کریں گی۔

تھا۔ ڈر کے مارے ان کا رنگ زرد تھا۔ چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ جسم پر لرزہ طاری تھا۔ دل دھڑک رہا تھا۔ ڈری سہمی ہوئی پوچھتی تھیں کہ اب کیا ہوگا؟

یہ ہوتا ہے مملکتی حکمرانی اور مذہبی پیشوائیت کی حکمرانی میں فرق!

یہ تو پھر بھی ایک ہنگامی حادثہ تھا۔ یہاں آئے دن ایسے واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں کہ کسی زود رنج خاوند نے غصّہ میں آکر بیوی کو "طلاق۔ طلاق۔ طلاق" کہہ دیا۔ غصّہ فرو ہونے پر مولوی صاحب سے پوچھا کہ اب کیا ہوگا؟ انہوں نے فرمایا کہ تمہاری بیوی پر طلاق پڑگئی ہے۔ سہمے ہوئے کہا کہ حضرت! اس کے ازالہ کی کوئی صورت؟ فرمایا کہ ایک صورت ہے اور وہ یہ کہ تمہاری بیوی کسی غیر مرد کے ساتھ نکاح کرکے ایک رات اس سے ہم بستر ہو۔ صبح کو وہ اسے طلاق دے۔ پھر وہ تم سے ازسرِ نو نکاح کرے تو تم میاں بیوی کی زندگی بسر کر سکتے ہو۔ ورنہ نہیں۔ بال بچوں بلکہ بعض اوقات، "دودھ، پوت" والی بڑھیا بیوی کانپ اُٹھتی ہے کہ یہ کیسے ہوگا؟ اس کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ غصّہ میں حماقت تو اس کے خاوند سے سرزد ہوئی۔ یہ سزا اُسے کیوں مل رہی ہے؟ لیکن مولوی صاحب گرج کر فرماتے ہیں کہ یہ شریعتِ حقّہ کا حکم ہے۔ اس کے خلاف چوں چراں نہیں کی جا سکتی[1]۔ آپ سوچئے کہ کسی دنیاوی حکومت کی گرفت اس قدر اعصاب شکن ہو سکتی ہے؟ اس قسم کا ہوتا ہے مذہبی پیشوائیت (تھیاکریسی) کی حکومت کا تسلّط!

(۲) اور یہی وجہ ہے جو خود ملوکیّت کو بھی مذہبی پیشواؤں کی تائید کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ جب تک برہمن، کھشتری (راجہ) کے ماتھے پر اپنی توثیق کا ٹھپہ (ٹیکہ) نہ لگا دے وہ گدّی پر براجمان نہیں ہو سکتا۔ جب تک پادری بادشاہ کے سر پر مقدّس پانی کا چھینٹا نہ دے دے وہ جائز حکمران تسلیم نہیں کیا جاتا۔ جب تک مفتیانِ کرام سلطان المعظم کے ظلّ اللہ علی الارض (زمین پر خدا کا سایہ) ہونے کا اعلان نہ کر دیں۔ وہ "خلیفۃ اللہ فی الارض" قرار نہیں پا سکتا۔ یہ (ملوکیت اور مذہبی پیشوائیت کا) گٹھ جوڑ ہے جو حکمرانی کے شکنجے کو مستحکم رکھتا ہے۔

بعثتِ نبی اکرمؐ کے وقت غلامی کے ان بندھنوں کی یہی حالت تھی۔ اقبالؒ کے الفاظ میں :-

بود انساں، درجہاں انساں پرست ناکس و نابود و مند و زیر دست

زیر دست انسان بالا دستوں کی غلامی کے شکنجوں میں جکڑا ہوا تھا۔ اس کی اپنی نہ کوئی ہستی تھی، نہ وجود۔ نہ تشخص تھا نہ مقام، سے

سطوتِ کسریٰ و قیصر رہزنش بندھا در دست و پاؤ گردنش

[1] واضح رہے کہ یہ خدا کا حکم نہیں، انہی حضرات کی خود ساختہ "شریعت" کا فیصلہ ہے۔

قیصر و کسریٰ (ملوکیت) اس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر، اسے لوٹنے میں مصروف تھی ؎

کاہن و پاپا و سلطان و امیر بہرِ یک نخچیر صد نخچیر گیر

ایک طرف کسریٰ و قیصر اور سلطان و امیر اور دوسری طرف، مذہبی پیشوا۔ ایک شکار کے پیچھے سینکڑوں شکاری :-

کسریٰ

از غلامی فطرتِ اُو دوں شدہ نغمہ ہا اندر نئے اُو خوں شدہ

صدیوں کی غلامی سے اس کی فطرت پست ہو چکی تھی۔ اس کی رگوں میں خونِ زندگی منجمد ہو گیا تھا۔ اس میں نہ حرکت باقی رہی تھی نہ حرارت۔ وہ جیتا جاگتا انسان نہیں۔ ممی شدہ لاش بن کر رہ گیا تھا۔

یہ تھی انسان کی حالت ظہورِ اسلام کے وقت۔ قرآن آیا اور اس نے نوعِ انسان کی غلامی کے ایک ایک بندھن کو توڑ کر ریزہ ریزہ کر دیا۔ اس نے ملوکیت کی زنجیروں کو توڑا تو اس کے ساتھ ہی اس مذہبی پیشوائیت کے حلقہ ہائے زنّار بھی ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ قرآن نے اعلان کر دیا کہ یاد رکھو! یہ احبار و رہبان لوگوں کا مال ناجائز طور پر کھا جاتے ہیں۔ انہوں نے مذہب کو کاروبار بنا رکھا ہے۔ یہ لوگوں سے کہتے ہیں کہ ہم خدا کی طرف لے جانے والے راستے کی طرف تمہاری راہ نمائی کرتے ہیں حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ "یَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ (۹/۳۴)" خدا کی طرف جانے والے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ خود ہیں۔ یہ اور سرمایہ دار دونوں جہنّم کا ایندھن ہیں۔

اس طرح اس نے نوعِ انسان کو غلامی کی ان تمام زنجیروں سے رہائی دلا دی :- ؎

نقشِ قرآں تا دریں عالم نشست نقش ہائے کاہن و پاپا شکست

دورِ ملوکیت

انسانی حرّیت و آزادی کا یہ سلسلہ اس وقت تک باقی رہا جب تک قرآنی نظامِ مملکت قائم رہا۔ اس کے بعد خلافت کی جگہ ملوکیت نے لے لی اور ملوکیت کے ساتھ ہی اس کے لازم عناصر۔ سرمایہ داری اور مذہبی پیشوائیت بھی وجود پذیر ہو گئے۔ خود مسلمانوں نے ملوکیت کے تختوں اور مذہبی پیشوائیت کی مسندوں کے ان ٹکڑوں کو جنہیں انہوں نے ابھی کچھ عرصہ پہلے توڑ کر پھینک دیا تھا۔ اپنی مترکّز عقیدت سے ایک ایک کر کے چُنا اور انہی منہدم کردہ مسندوں کو بارِ دگر استوار کر کے ان پر مسلّط ہو کر بیٹھ گئے۔ آسمان کی آنکھ نے اس سے زیادہ حیرت انگیز نظّارہ کہیں نہیں دیکھا ہو گا کہ :-

خود طلسمِ قیصر و کسریٰ شکست خود سرِ تختِ ملوکیت نشست

اس طرح سلاطین، اقتدارِ مملکت بزورِ شمشیر یا وراثتاً حاصل کر کے تختِ حکومت پر متمکّن ہو گئے،

اور علماء حضرات برسرِ منبر، ان کے حق میں نصرتِ خداوندی کی دعائیں مانگتے رہے اور ان کی قصیدہ خوانی اور چاپلوسی میں اس حد تک آگے بڑھ گئے کہ یافعی کی تاریخ کے مطابق خلیفہ یزید بن عبدالمالک کے عہد میں، چالیس شیوخ نے آکر گواہی دی کہ :۔

"خلفاء قیامت کے دن بغیر حساب کے بخشے جائیں گے۔"

(تاریخ یافعی صد ۲۲۴ ۔ بحوالہ طلوعِ اسلام۔ جولائی ۱۹۶۴ء)

اس پر تبصرہ کرتے ہوئے، مولانا مناظر احسن گیلانی (مرحوم) نے لکھا تھا کہ :۔

"انہی دنوں محدثین کا ایک بڑا گروہ پیدا ہو گیا تھا۔ جس نے اس عقیدہ کو اپنا دین بنا لیا تھا۔ چنانچہ ابوبکر جصاص اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ ان لوگوں کا اس کے ساتھ یہ بھی خیال تھا کہ ظلم و جور اور بے گناہ لوگوں کے قتل وغیرہ افعال کا صدور بادشاہِ وقت سے اگر ہو تو اس کے خلاف آواز بلند کرنا شرعاً صحیح نہیں۔ ہاں بادشاہ کے سوا عوام کو ٹوکنا درست ہے اور وہ بھی صرف زبان کی حد تک، ہتھیار تو بہر حال کسی کے مقابلہ میں اٹھانا شرعاً جائز نہیں۔"

(احکام القرآن ۔ جصاص ۔ جلد دوم ۔ صد ۳۹ ۔ بحوالہ "امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی" صد ۳۵)

جاہ پرستی کچھ آج ہی کے تملق پیشہ گان کا شیوہ نہیں۔ اقتدار اور قصیدہ خوانی کا چولی دامن کا ساتھ چلا آرہا ہے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ اس سارے دور میں کوئی بھی اللہ کا بندہ ایسا نہیں ہو گا جس نے اس کے خلاف آواز اٹھائی ہو لیکن جیسا کہ ہر مستبد نظام میں ہوتا ہے ۔ ان کی آواز چھوڑ، ان کے آثار تک کو مٹا دیا گیا۔ نتیجہ اس کا یہ کہ ہمارے ہاں ملوکیت اور مذہبی پیشوائیت کی تاریخ تو پوری تفاصیل کے ساتھ انبار در انبار موجود ہے لیکن ان کے خلاف آواز اٹھانے والوں کا نام تک بھی کہیں نہیں ملتا۔

ہم یہ بھی نہیں کہتے کہ ان سلاطین میں کوئی نیک سیرت نہیں تھا۔ لیکن جب ملوکیت کا نظام ہی خلافِ قرآن تھا تو کسی بادشاہ کے انفرادی طور پر نیک ہونے سے وہ نظام تو اسلامی نہیں ہو جاتا۔ ہماری ہزار سالہ تاریخ میں یہ خلافِ اسلام نظام مسلسل اور متواتر جاری رہا۔ یہ سعادت ہمارے زمانے کے حصے میں لکھی تھی کہ اس میں ملوکیت، اور اس شجرۃ الزقوم کے برگ و بار (نظامِ سرمایہ داری، خانقاہیت اور ملائیت) کے خلاف بھرپور آواز بلند ہوئی۔ یہ آواز تھی، حکیم الامت علامہ اقبالؒ کی، جس نے کہا تھا کہ :۔

مرے گلو میں ہے اک نغمہ جبریل آشوب
سنبھال کر جسے رکھا ہے لامکاں کے لئے

لیکن اس کے دردِ دل نے اسے مجبور کر دیا کہ وہ اس صورِ اسرافیل کو اسی جہان کون و مکاں میں پھونکے۔ اس نے ایسی بھرپور آواز میں، جس سے یہ چارسو، لرز اُٹھے پکار کر کہا کہ :- ؎

ہنوز اندر جہاں آدم غلام است　　　　نظامش خام و کارش ناتمام است
غلامِ فقرِ آں گیتی پناہم　　　　که در دینش ملوکیت حرام است

(ارمغانِ حجاز ص۱۲۷)

" دنیا میں انسان ابھی تک غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہے اگرچہ غلامی کی شکل بدل گئی ہے۔
اسے ابھی تک کوئی انسانیت ساز نظام میسر نہیں آیا۔ میں اس شاہنشاہِ بوریہ نشین و گیتی پناہ کے در کا غلام ہوں جس نے اعلان کیا کہ اس کے نظام کی رُو سے ملوکیت حرام ہے۔
اس نے غلامی کی ہر زنجیر کو توڑ دیا۔"

اقبالؒ نے اس ایک نعرۂ مستانہ سے، ہماری تاریخ اور اس کے مضمرات کی، جسے ہم خود فریبی یا ابلہ فریبی کی بنا پر اسلامی تاریخ کہتے چلے آ رہے تھے اور اب تک یہی کہہ رہے ہیں۔ حقیقت بے نقاب کر کے رکھ دی۔ میں اس کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتا کیونکہ آج کی نشست میں میرا یہ موضوع نہیں۔ میرا موضوع مذہبی پیشوائیت ہے جس کی طرف مجھے زُود پلٹ آنا چاہیئے۔

مُلّا سے مراد

لیکن ایک اہم نقطہ کا سمجھ لینا ضروری ہے۔ علامہ اقبالؒ (یا خود میں) جب ملّا پر تنقید کرتے ہیں تو اس سے کسی خاص فرد یا افراد کے گروہ کی تنقیص یا (خدانخواستہ) تحقیر مقصود نہیں ہوتی۔ ملّا یا ملّا ازم درحقیقت ایک انسٹی ٹیوشن، ایک نظام، ایک مسلک کا نام ہے (جیسے عیسائیت میں چرچ یا ہندومت میں برہمنیت)، اس مسلک کا مفہوم یہ ہے کہ جو کچھ اسلاف سے چلا آرہا ہے وہ اسلام میں سند و حجت، قولِ فیصل اور حرفِ آخر ہے۔ وہ ابدی ہے اور غیر متبدل۔ نہ اس پر تنقید کی جا سکتی ہے۔ نہ کسی قسم کی ترمیم و تنسیخ، وہ سمجھ میں آئے یا نہ آئے۔ وہ ممکن العمل ہو یا نہ۔ اسلام بہرحال وہی ہے اس سے اختلاف مستوجبِ سزا ہے اور انکار کفر کے مرادف ہے۔ جس سے مسلمان مُرتد ہو جاتا ہے اور مُرتد کی سزا موت ہے۔ یہ ہے وہ مسلک

مشرب جس کی اقبالؒ مخالفت کرتا ہے کیونکہ اس قسم کے مسلک کی نہ اسلام میں گنجائش ہے نہ جواز۔ اسلام سے مراد کتاب اللہ کی راہ نمائی میں علم و عقل سے کام لینا اور مذہبی پیشوائیت کے مسلک میں نہ کتاب اللہ کا کوئی عمل دخل ہوتا ہے نہ علم و عقل سے کچھ واسطہ۔ علم و عقل سے اسے کس قدر واسطہ ہوتا ہے اس کے لئے صرف ایک مثال پیش کر دینا کافی ہوگا۔ کچھ عرصہ ادھر کی بات ہے :-

"سعودی عرب کے شہر مدینہ منورہ کی اسلامی یونیورسٹی کے صدر نے اعلان کیا کہ زمین ایک جگہ پر قائم ہے اور سورج اس کے گرد چکر لگا رہا ہے۔ اگر کوئی شخص اس کے خلاف تصور کرے تو اسے پھانسی پر لٹکا دینا چاہیئے۔ سعودی عرب ہی کی ایک اخبار میں صدر یونیورسٹی شیخ عبدالعزیز بن باز کا مضمون شائع ہوا تھا جس میں انہوں نے کہا تھا کہ چاہے کتنی ہی تاخیر کیوں نہ ہو گئی ہو لیکن اب بھی اگر لوگوں کو صحیح راستے پر لایا جائے تو کوئی ہرج نہیں۔ بنی نوع انسان خود دیکھتے ہیں کہ زمین اپنی جگہ ساکت ہے اور سورج اس کے گرد گردش کر رہا ہے۔ طلوع ہوتا ہے اور پھر غروب ہوتا ہے۔ آپ نے مزید لکھا کہ آج کے دعوے کے بموجب زمین اگر گردش کرتی ہوتی تو پھر شہر، درخت، پہاڑ، دریا اور سمندروں میں استقامت نہ ہوتی۔ اگر زمین گردش کرنے لگے تو مشرق کے شہر مغرب میں اور مغرب کے شہر مشرق میں دکھنے لگیں گے۔"

(بحوالہ طلوع اسلام، اگست ۱۹۶۶ء)

اقبالؒ ملّا ازم کے اسی مسلک پر تنقید بھی کرتا ہے اور بعض مقامات پر اس میں اور حقیقی اسلام میں تقابل بھی۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ صدرِ اوّل کے بعد، ہماری تاریخ، ملوکیت کی تاریخ ہے جو اسلام کی نقیض ہے۔ ظاہر ہے کہ جو نظام ہی اسلام کا نقیض ہو اس میں جو کچھ اسلام کے نام سے ہوگا اسلام کا نقیض ہوگا۔ اقبالؒ نے اپنے کلام میں، غیر اسلامی عقائد، نظریات، تصوّرات، مسالک و مشارب کے لئے "عجمی اسلام" کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ وہ مذہبی پیشوائیت کے مروجہ اسلام پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں : ؎

تمدّن۔ تصوّف۔ شریعت۔ کلام   بتانِ عجم کے پجاری تمام
لُبھاتا ہے دل کو کلامِ خطیب   مگر لذّتِ شوق سے بے نصیب
بیاں اس کا منطق سے سُلجھا ہوا   لغت کے بکھیڑوں میں اُلجھا ہوا

حقیقت خرافات میں کھو گئی ہے یہ اُمت روایات میں کھو گئی ہے
بجھی عشق کی آگ، اندھیر ہے
مسلماں نہیں، راکھ کا ڈھیر ہے!

اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ

ساری دنیا کی مساجد میں مؤذن، دن میں پانچ مرتبہ، مینارۂ مسجد پہ یا لاؤڈ سپیکر کے سامنے کھڑے ہو کر، باآواز بلند اعلان کرتا ہے کہ :-

اَشْهَدُ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ

وہ یا تو ساری عمر ان الفاظ کو بلا سمجھے دھراتا رہتا ہے اور اگر سمجھتا ہے تو یہ کہ خدا کے سوا کسی کی پرستش نہیں ہو سکتی۔ اسے الٰہ کے یہی معنی بتائے گئے ہیں لیکن جب اسلام ایک زندہ حقیقت تھا تو الٰہ کے معنی تھے۔ صاحبِ اقتدار، وہ جسے حقِ حکومت حاصل ہو۔ مؤذن اعلان یہ کرتا تھا کہ اے اہلِ دنیا! کان کھول کر سُن لو کہ :-

"میں اس حقیقت کی شہادت دیتا ہوں کہ انسانوں پر حکومت کا حق کسی انسان کو حاصل نہیں۔ حقِ حکومت صرف خدا کو حاصل ہے"

آپ نے غور فرمایا کہ یہ کس قدر زلزلہ انگیز اور انقلاب انگیز اعلان ہے۔ جو ساری دنیا کے در و دیوار کو ہلا دیتا ہے۔ پھر اسے بھی سوچئے کہ شہادت یا گواہی تو اسی کی قابلِ اعتماد ہو سکتی ہے۔ جو اپنا آنکھوں دیکھا حال بیان کر رہا ہو۔ وہ مؤذن جس مقام پر کھڑا اعلان کر رہا ہے کہ میں شہادت دیتا ہوں کہ خدا کے سوا کسی کو حقِ حکومت حاصل نہیں۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ کہہ رہا ہوتا ہے کہ میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں کہ (کم از کم جہاں تک میری نگاہ جاتی ہے) حکومت صرف خدا کی قائم ہے۔ کسی انسان کی نہیں۔ اور یہ اعلان ساری دنیا میں قدم قدم پہ ہو رہا ہوتا ہے۔ یہ تھا اذان کے سب سے پہلے جزو کا مفہوم حقیقی اسلامی نظام کے زمانے میں۔ اس مفہوم کا ملوکیت کے لئے قابلِ قبول ہونا تو ایک طرف وہ اسے خود نہ سن سکتی تھی نہ اس کی اجازت دے سکتی کہ کوئی اور بھی اسے سُن پلئے۔ مشکل اس کی یہ تھی کہ وہ ان الفاظ کو تبدیل بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اس مشکل کا حل مذہبی پیشوائیت نے مہیا کر دیا۔ اس کے لئے الٰہ کا ترجمہ کر دیا "وہ جس کی پرستش کی جائے" اب یہ اعلان بالکل بے ضرر ہو گیا۔ مذہبی پیشوائیت کرتی ہی یہ ہے۔ وہ الفاظ تو وہی رہنے دیتی ہے۔ ان کا مفہوم بدل دیتی ہے۔ اقبالؒ نے اس حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔ ۔

الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں لیکن ملّا کی اذاں اور، مجاہد کی اذاں اور
پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور

ضمناً۔ اقبالؒ نے جو کچھ کہا ہے "الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں" تو یہ صحیح نہیں۔ الفاظ میں تو بے شک تفاوت نہیں۔ لیکن یہ معانی کا تفاوت تو ہے جو مُلّا کی اذان، اور مجاہد کی اذان میں فرق پیدا کرتا ہے۔ وہ دوسری جگہ کہتے ہیں۔

اندازِ بیاں گرچہ بہت شوخ نہیں ہے شاید کہ اُتر جائے تیرے دل میں میری بات
یا وسعتِ افلاک میں تکبیرِ مسلسل یا خاک کے آغوش میں تسبیح و مناجات
وہ مذہبِ مردانِ خود آگاہ و خدامست
یہ مذہبِ مُلّا و جمادات و نباتات

لیکن یہ بھی اقبالؒ کی خوش فہمی تھی جو کہا تھا کہ "شاید کہ اُتر جائے تیرے دل میں میری بات" مُلّا کے دل میں قرآن کی بات اُتر ہی نہیں سکتی۔ خود ارشادِ خداوندی ہے کہ لَا يَمَسُّهُ إِلَّا الْمُطَهَّرُونَ[۱] (۵۶/۷۹) قرآن کے مطالب و مقاصد تک اسی کی رسائی ہو گی جو دل و دماغ کو غیر قرآنی خیالات و معتقدات سے پاک صاف کر کے اس کی طرف آئے۔ اسی کو توحید کہتے ہیں۔ اقبالؒ کے الفاظ میں۔

بیاں میں نکتۂ توحید آ تو سکتا ہے ترے دماغ میں بت خانہ ہو تو کیا کہیے!
وہ رمزِ شوق جو پوشیدہ لاالٰہ میں ہے طریقِ شیخ فقیہانہ ہو تو کیا کہیے!

توحید کے مقابلہ میں سب سے بڑے بُت، فرقہ پرستی کے ہیں جسے قرآن نے شرک کہہ کر پکارا ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ ہر فرقہ کے اسلام کی انتہا کسی نہ کسی شخصیت پر جا کر ہو جاتی ہے اور یہی شخصیت پرستی توحید کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ جو شخص بھی کسی فرقے کے ساتھ متمسک ہے۔ اس کی قرآن تک رسائی نہیں ہو سکتی جب تک ان بتوں کو کعبۂ ذہن سے نکال باہر نہ کیا جائے، خدا اس کے اندر قدم نہیں رکھتا۔ یہ حقیقت ہے کہ: ؎

کھو دیا گیا جو مطلب ہفتاد و دو ملّت میں سمجھے گا نہ تو جب تک بے رنگ نہ ہو ادراک

---

[۱] مروجہ اسلام میں اس کے معنی یہ لئے گئے کہ قرآن مجید کو نہا دھو کر باوضو چھونا چاہئے۔ اس میں شبہ نہیں کہ جسم کی پاکیزگی بھی اچھی چیز ہے لیکن یہاں بات تطہیرِ قلب و دماغ کی ہو رہی ہے جسکے بغیر قرآنی مفاہیم سامنے نہیں آسکتے۔ اسی کو توحید کہتے ہیں۔

بیرنگی ادراک ہی کو اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ کہا گیا ہے۔

کارِ مُلّا

اقبالؒ نے جاوید نامہ میں ترکی کے مشہور مدبّر، سعید حلیم پاشا (مرحوم) کی زبانی عجمی اسلام کے ان علمبرداروں کا جو نقشہ کھینچا ہے۔ میرے نزدیک اس سے بہتر تصویر کشی اور حقیقت نگاری شاید ہی کہیں اور مل سکے۔ غور سے سُنئے کہ وہ کیا کہتے ہیں؟ کہتے ہیں، ؎

دینِ حق از کافری رسواتر است　　　زانکہ مُلّا مومن کافر گر است

اللہ کا دین ملّا کے ہاتھوں، کفر سے بھی زیادہ ذلیل و رسوا ہو گیا ہے۔ کیونکہ اس کا کام یہ رہ گیا ہے کہ بجائے اس کے کہ وہ کافروں کو مسلمان کرے، اُلٹا مسلمان کو کافر بنا کر ملّت کی چھانٹی کرتا چلا جاتا ہے۔ اس کا شیوہ ہی کافر گری ہے۔ ؎

شبنمِ ما در نگاہِ ما یم است　　　از نگاہِ او یمِ ما شبنم است

ہماری نگاہوں میں اُمّت کا ہر فرد متاعِ گراں بہا ہے کہ: ؎

ہر فرد ہے ملّت کے مقدّر کا ستارہ

لیکن ان کے نزدیک اپنے فرقے کے سوا سب مسلمان جہنّم کا ایندھن ہیں۔ ان کی قیمت پرِ کاہ جتنی بھی نہیں۔

از شگرفیہائے آں قرآں فروش　　　دیدہ ام روح الامیں را در خروش

یہ قرآں فروش جس نے مذہب کو اپنا پیشہ بنا رکھا ہے ایسی عجیب و غریب حرکتیں کرتا ہے کہ ان سے جبریل امینؑ تک بھی تلملا اٹھتا ہے۔

علامہ اقبالؒ نے ان لوگوں کی دین فروشی کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ ایک مستقل موضوع ہے اور تفصیل کا متقاضی جس کے لئے سرِ دست نہ فرصت ہے نہ گنجائش۔ اختصاراً یہ ایک شعر ہی کافی ہو گا کہ ؎

یہی شیخِ حرم ہے جو چُرا کر بیچ کھاتا ہے　　　گلیمِ بوذرؓ و دلقِ اویسؓ و چادرِ زہراؓ

بات جاوید نامہ کی نظم کی ہو رہی تھی۔ اس کا اگلا شعر ہے:۔

زانسوئے گردوں دلش بیگانۂ　　　نزدِ اُو اُمّ الکتاب افسانۂ

حقائقِ قرآنی کے سرچشمہ، یعنی علمِ خداوندی سے وہ شناسا تک نہیں۔ اس کے نزدیک خدا کی کتاب، قصّے، کہانیوں اساطیر الاوّلین کے سوا کچھ نہیں (معاذ اللہ) افسانوں کا مجموعہ!

بے نصیب از حکمتِ دینِ نبیؐ　　　آسمانش تیرہ از بے کوکبی

وہ اس دین سے جسے حضور نبیٔ اکرمؐ نے دنیا کے سامنے پیش کیا تھا، قطعاً بے خبر ہے۔ جس آسمان کے نیچے وہ زندگی بسر کرتا ہے اس میں ایک چمکتا ہؤا ستارہ بھی نہیں اس لئے اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا ہی اندھیرا رہتا ہے؛ ؎

کم نگاہ و کور ذوق و ہرزہ گرد ملّت از قال و اقولش فرد فرد

وہ بے حد تنگ نظر ہے۔ کور ذوق ہے اور اس کے ساتھ بیہودہ گو بھی۔ اس کی بحث وجدل سے اُمّت ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی ہے۔ ملّت فرقوں میں بٹ چکی ہے:۔

مکتب و مُلّا و اسرارِ کتاب کورِ مادر زاد و نُورِ آفتاب

صدیوں کی کورانہ تقلید اور علم وعقل سے نفرت و عداوت کی وجہ سے اس کی سمجھنے سوچنے کی صلاحیتیں سلب ہو چکی ہیں۔ اس لئے خدا کی کتاب کے رموز و حقائق کا سمجھ سکنا اس کے بس کی بات نہیں۔ ایسے ہی جس طرح کسی پیدائشی اندھے کو لاکھ سمجھاؤ۔ اس کی سمجھ میں ہی نہیں آسکتا کہ روشنی کسے کہتے ہیں؟

اقبالؒ کی حق گوئی اور تلخ نوائی کا مقطع یہ ہے۔۔ اور حقیقت یہ ہے کہ یہ اس موضوع میں حرفِ آخر کا حکم رکھتا ہے کہ: ؎

دینِ کافر، فکر و تدبیرِ جہاد[1] دینِ مُلّا فی سبیل اللہ فساد

فی سبیل اللہ فساد

کفّار کا کیش و مسلک تو یہ ہے کہ جُہد للبقاء اور تسخیرِ کائنات کے لئے کیا کیا تدبیریں سوچی اور اختیار کی جائیں اور ان حضرات کا مذہب و مشرب یہ کہ خدا کے نام پر کس طرح فسادات کھڑے کئے جائیں۔

یوں تو اقبالؒ کا سارا کلام ہی بلند ترین حقائق اور حسین ترین شریعت کا مرقّع ہے۔ لیکن بعض مقامات پر اس کی رعنائی، گوہرِ تابناک کی طرح جگمگا اٹھتی ہے۔ مُلّا کے برپا کردہ فساد کو " فی سبیل اللہ فساد" کہنا اقبالؒ ہی کا حصّہ ہو سکتا تھا۔

اس " فی سبیل اللہ فساد" کو انہوں نے دوسرے مقام پر ذرا شوخ انداز میں بیان کیا ہے۔ جب کہا ہے کہ قیامت میں: ؎

---

[1] جہاد، جُہد سے مراد ہے۔

میں بھی حاضر تھا وہاں ضبطِ سخن کر نہ سکا — حق سے جب حضرتِ مُلّا کو ملا حکمِ بہشت!
عرض کی میں نے الٰہی مری تقصیر معاف — خوش نہ آئیں گے اسے حور و شراب و لبِ کشت!
نہیں فردوس مقامِ جدل و قال و اقوال! — بحث و تکرار اس اللہ کے بندے کی سرشت!
ہے بد آموزیٔ اقوام و ملل کام اس کا — اور جنّت میں نہ مسجد نہ کلیسا نہ کنشت!

فساد کا اوّلین جرثومہ نفرت سے پیدا ہوتا ہے اور ان حضرات کے مذہب و مسلک کی بنیاد ہی نفرت پر ہوتی ہے۔ اس سے بڑھ کر نفرت اور کیا ہوگی کہ یہ اپنے فرقہ کے سوا، تمام (غیر مسلم تو ایک طرف خود) مسلمانوں کو جہنمی قرار دیتے ہیں۔ یہ نفرت فریقِ مقابل کی زندگی تک ہی محدود نہیں ہوتی۔ اس کے مرنے کے بعد بھی بدستور (بلکہ پہلے سے بھی زیادہ شدّت کے ساتھ) باقی رہتی اور نمودار ہوتی ہے۔ ترکی کے مُلّا اتاترک اور اس کی پارٹی کے خلاف تھے۔ یہ ۲۲-۱۹۲۱ء کی بات ہے۔ اس کے چالیس پینتالیس سال بعد:-

"اتاترک کے ایک ساتھی، عمران ادکتم کی میّت نمازِ جنازہ کے لئے جامع مسجد میں لائی گئی۔ تو خطیب نے لاؤڈ سپیکر پہ اعلان کرنا شروع کر دیا کہ وہ اس مرتد کی نمازِ جنازہ نہیں پڑھائیں گے اور نہ ہی دوسرا کوئی مسلمان نماز پڑھ سکتا ہے۔ اس پہ اتاترک کے ایک اور ساتھی، جنرل عصمت انونو آگے بڑھے اور انہوں نے اعلان کیا کہ جب تک عمران ادکتم کی نمازِ جنازہ نہیں پڑھی جاتی وہ گھر واپس نہیں جائیں گے۔ ان کے اس اعلان پہ بہت سے لوگ جن کی داڑھیاں تھیں ان کی طرف بڑھے۔ جب صورتِ حال نازک ہو گئی تو ترکی کی فوج کے جنرل نبی البرتم نے پستول نکال لیا۔ انہوں نے کہا کہ اگر کسی شخص نے ۸۵ سالہ جنرل انونو کو ہاتھ لگایا تو وہ گولی چلانے پہ مجبور ہو جائیں گے۔ اس طرح جنرل انونو کو ہجوم سے بچا لیا گیا۔" (بحوالہ مشرق ۹ رمئی ۱۹۶۹ء)

عمران ادکتم (جن کے جنازہ کے ساتھ یہ کچھ کیا گیا) ترکی کی سپریم کورٹ کے صدر تھے اور ان کا جرم یہ تھا کہ اتاترک اور عصمت انونو کے ساتھیوں میں سے تھے۔ اتاترک اور عصمت انونو کے ساتھ ہزار اختلاف کے باوجود ایک دنیا جانتی ہے کہ اگر ۱۹۲۲ء میں یہ جانباز اپنے سر ہتھیلیوں پہ رکھ کر آگے نہ بڑھتے تو یہ خطیب صاحب اور ان کی مسجد اہلِ صلیب کے تسلّط میں ہوتی۔ لیکن مولوی صاحبان کو اس سے کیا غرض۔ ان کا کام تو مسلمانوں کو کافر اور مرتد قرار دینا، ان کی زندگی میں ان کی بیویوں پر طلاق وارد کرنا اور مرنے کے بعد ان کی نمازِ جنازہ کو ناجائز قرار دینا ہے۔ اس کے مظاہرے آپ آئے دن یہاں بھی دیکھتے رہتے ہیں۔

جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں، ملوکیت، مذہبی پیشوائیت کی پرورش اور حوصلہ افزائی کرتی ہی اس لئے ہے کہ یہ اس کی اپنی بقاء اور استحکام کا ذریعہ بنتی ہے۔ بزورِ شمشیر حاصل کرنے والے مستبد حکمران کو ظلّ اللہ علی الارض کی حیثیت سے منوانا مذہبی پیشوائیت ہی کی کرشمہ سازی کا نتیجہ ہو سکتا تھا۔ اربابِ اقتدار، لاکھ زور لگاتے، از خود نہ ایسا بن سکتے تھے، نہ منوا سکتے۔ اتنا ہی نہیں۔ اربابِ اقتدار جو کچھ کرنا چاہتے اس کے جواز اور عین مطابقِ اسلام ہونے کا فتویٰ ان حضرات سے حاصل کر لیتے تھے۔ اس طرح ان حکمرانوں کی رعایا ان کے ظلم و استبداد اور سلب و نہب کو بطیبِ خاطر برداشت کر لیتی تھی کہ دین کے یہ مدعی اسے منشائے خداوندی کہہ کر عوام کو مطمئن کر دیتے تھے۔

اقبالؒ کے الفاظ میں۔ ؎

کرتے ہیں غلاموں کو غلامی پہ رضامند ۔۔۔ تاویلِ مسائل کو بناتے ہیں بہانہ

ان کی اس قسم کی دین فروشی اور دیدہ دلیری کو دیکھ کر اقبالؒ کا دلِ دردمند پکار اٹھتا تھا کہ: ؎

سینۂ افلاک سے اٹھتی ہے آہِ سوزناک ۔۔۔ مردِ حق ہوتا ہے جب مرعوبِ سلطان و امیر

یہ سیاستِ ملوکیت کی انتہائی چابکدستی تھی کہ اس نے امورِ مملکت تو خود اپنے ہاتھ میں رکھے اور نکاح طلاق وغیرہ کے مسائل مذہبی پیشوائیت کے سپرد کر کے انہیں مطمئن کر دیا کہ حکومت کا ایک شعبہ ان کے ہاتھ میں دے دیا گیا ہے۔ نتیجہ اس کا یہ کہ امورِ سیاست سے یہ حضرات یکسر بے بہرہ رہے۔ تحریکِ پاکستان کے دوران جس طرح یہ لوگ ہندو عیار کے ہاتھوں میں کھلونے بن کر کھیلتے رہے۔ اسے دیکھ کر اقبالؒ نے کہا تھا کہ:-

قوم کیا چیز ہے، قوموں کی امامت کیا ہے؟
اس کو کیا سمجھیں یہ بیچارے دو رکعت کے امام!

(غیر منقسم) ہندوستان میں، جب تحریکِ خلافت کے زمانے میں علماء حضرات کو پہلی بار سیاست میں لایا گیا، تو ان کی اس میدان میں تہی ماندگی اور ناتجربہ کاری کی بناء پر اقبالؒ نے اس کی مخالفت کی تھی۔ انہوں نے اکبر شاہ خاں صاحب (مرحوم) کے نام اپنے ایک خط میں لکھا تھا کہ:-

"آپ نے ٹھیک فرمایا ہے کہ پیشہ ور مولویوں کا اثر سر سید احمد خانؒ کی تحریک سے بہت کم ہو گیا تھا۔ مگر خلافت کمیٹی نے اپنے پولیٹیکل فتوؤں کی خاطر ان کا اقتدار ہندی مسلمانوں میں قائم کر دیا ہے۔ یہ بہت بڑی غلطی تھی جس کا احساس ابھی تک غالباً کسی کو نہیں ہوا۔"

پھر انہوں نے ۱۹۳۲ء میں اپنے ایک بیان میں ، جو روزنامہ انقلاب (لاہور) کی ۲۳ ، اپریل کی اشاعت میں شائع ہوا تھا۔ قوم کو مخاطب کر کے فرمایا تھا کہ :-

" تمہارے دین کی یہ عظیم الشان بلند فطری ، ملاؤں اور فقیہوں کے فرسودہ اوہام میں جکڑی ہوئی ہے اور آزادی چاہتی ہے ۔ روحانی اعتبار سے ہم حالات وجذبات کے ایک قید خانے میں محبوس ہیں جو صدیوں کی مدت میں ہم نے اپنے گرد خود تعمیر کر لیا ہے اور ہم بوڑھوں کے لئے شرم کا مقام ہے کہ ہم نوجوانوں کو ان اقتصادی ، سیاسی ، بلکہ مذہبی بحرانوں کا مقابلہ کرنے کے قابل نہ بنا سکے جو زمانۂ حاضر میں آنے والے ہیں ۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ساری قوم کی موجودہ ذہنیت کو یکسر تبدیل کر دیا جائے تاکہ وہ پھر نئی آرزوؤں ، نئی تمناؤں اور نئے نصب العین کی اُمنگ کو محسوس کرنے لگ جائے ۔"

علامہ اقبالؒ نے جو کہا تھا کہ ان علماء کو میدانِ سیاست میں لانے کی جو غلطی قوم نے کی ہے اس کا احساس اس زمانے تک کسی کو نہیں ہوا تھا ، سو اس کا احساس تحریکِ پاکستان کے زمانے میں ہوا ۔ ہندوؤں نے انہیں اپنا آلۂ کار بنایا اور قوم کی بیشتر توانائیاں وقت اور پیسہ ان کی مخالفت کی مدافعت میں ضائع ہو گیا ۔ یہ کہتے تھے کہ جب ہندو ہمیں مذہبی آزادی کی ضمانت دیتا ہے تو مسلمانوں کے لئے الگ مملکت کی ضرورت کیا ہے ؟ یہ وہی مذہبی آزادی تھی ۔ جو انہیں اپنے دورِ ملوکیت میں حاصل تھی ۔ یہ اسی کو اسلام کی آزادی سمجھتے تھے ۔ اسی بناء پر علامہؒ نے کہا تھا کہ :-

مُلّا کو جو ہے ہند میں سجدہ کی اجازت نادان سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

دار العلوم دیوبند کے شیخ الحدیث مولانا حسین احمد مدنیؒ ان علماء کے سرخیل کہے جاتے تھے ۔ وہ حقیقی اسلام کے مبادیات تک سے کس قدر نا آشنا تھے ۔ اس کا اندازہ اس بحث سے بخوبی لگ سکتا ہے جو مسلم قومیت کے مسئلہ پر ان کے اور علامہ اقبالؒ کے مابین ہوئی تھی اس کی یہی وجہ تھی کہ ان کے نصابِ تعلیم سے علومِ سیاسیات اور قرآن دونوں خارج تھے ۔ جبہ و قبہ میں ملبوس حضرات ، اقبالؒ اور قائداعظمؒ کے متعلق بار بار کہا کرتے تھے کہ یہ مغرب زدہ انگریز پرست ، اسلام نا آشنا ، مسٹر قسم کے لوگ ملحد و بے دین ہیں ۔ یہ کیا جانیں اسلام کسے کہتے ہیں ؟ اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے علامہؒ نے ایک دفعہ کہا تھا کہ :-

مجھ کو تو سکھا دی ہے افرنگ نے زندیقی اس دور کے ملّا ہیں کیوں ننگِ مسلمانی !

اس وقت ہمارے ایوانِ قانون سازی میں جو ڈھول اُڑ رہی ہے، اس کے ذمہ دار بھی انہی حضرات کے باہمی اختلافات ہیں۔ انہوں نے ۱۹۵۱ء میں بڑے طمطراق سے اعلان کیا کہ ہم نے اپنے اختلافات مٹا لئے ہیں اور قانون سازی کی متفق علیہ بنیاد فراہم کر لی ہے۔ وہ بنیاد کیا تھی؟ یہ کہ ملک کے قوانین کتاب و سنت کے مطابق ہوں گے۔ اس باہمی اتفاق کی حقیقت کیا تھی اس کے متعلق اتنا سمجھ لینا کافی ہوگا کہ

اختلافات

کتاب کا لفظ تو محض برائے وزنِ بیت تھا۔ جہاں تک سنت کا تعلق ہے) سنت کا کوئی متفق علیہ مجموعہ تو ایک طرف، سنت کہتے کسے ہیں؟ اس پر بھی سب کا اتفاق نہیں۔ ان کے سب فرقوں کی سنت الگ الگ ہے۔ اسی پر تو ان کے فرقوں کی بنیاد ہے۔ اس حقیقت کی روشنی میں سوچئے کہ کیا اس بنیاد پر ملک کا کوئی ایسا ضابطۂ قوانین مرتب ہو سکتا ہے جسے یہ سب اسلامی تسلیم کر لیں۔ ہم حیران تھے کہ ایسی کھلی ہوئی حقیقت بھی ہمارے واضعین قوانین کو نظر نہیں آئی؟ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب یہ دُھند چھٹ رہی ہے اور روشنی کی کرن ان حضرات کو دکھائی دینے لگی ہے۔ اگلے دنوں، مجلس شوریٰ کے صدر محترم خواجہ صفدر صاحب نے اپنی ایک تقریر میں فرمایا کہ:۔

"ملک میں مکمل اسلامی نظام کی راہ میں فقہ کا اختلاف ایک رکاوٹ ہے ان اختلافات کو ختم کرنے کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔ ان اختلافات کو ختم کئے بغیر ملک میں اسلامی نظام کا نفاذ حماقت ہوگی ۔۔۔۔ انہوں نے ایک بار پھر کہا کہ مختلف مکاتبِ فکر کا باہمی فقہی اختلاف تاخیر کا باعث بن رہا ہے اور ہمیں زیادہ سوچ بچار کے بعد ایسا متفقہ لائحہ عمل تیار کرنا ہے جو انتشار کی راہیں بند کر دے"۔ (جنگ۔ لاہور ۲۷ر مارچ ۱۹۸۳ء)

ان (مزعومہ) کوششوں کے بارے میں جو اختلافات مٹانے کے سلسلہ میں کی جا رہی ہیں۔ خواجہ صاحب نے دوسرے موقعہ پر فرمایا :۔

"ان فقہی اختلافات پر علمائے کرام غور کر رہے ہیں۔ ان کا حل نکالا جائے گا یہ اختلافات طے کئے بغیر فوری طور پر اسلامی قوانین کا نفاذ انتشار کا باعث بنے گا"

(جنگ۔ لاہور۔ ۲۶۔ مارچ ۱۹۸۳ء)

ہم نہیں سمجھتے کہ محترم خواجہ صاحب جیسا پختہ کار، صاحبِ دانش و بینش سیاست دان اتنی سی بات بھی نہ جانتا ہو کہ جو علماء ہزار برس میں اتنا سا باہمی اختلاف بھی نہ مٹا سکے ہوں کہ نماز میں آمین اونچی آواز سے کہنی چاہئے یا نیچی

اُدائے اور ترادیح اُٹھ پڑھنی چاہئیں یا ہیں، وہ ان فقہی اختلافات کو مٹا سکیں گے جو ملکی قوانین کی تدوین کی راہ میں حائل ہیں؛ ہم سے تو غالب زیادہ معاملہ فہم تھا جو جلد ہی اس نتیجہ پر پہنچ گیا کہ ؎

ہم کو اُن سے وفا کی ہے اُمید جو نہیں جانتے وفا کیا ہے؟

ان کے یہ اختلافات آج کے پیدا شدہ نہیں۔ اقبالؒ کے الفاظ میں ؛ "دیرینہ ہے تیرا مرض کورنگاہی"۔ یہ روایات اور فقہ کے اوّلین دور ہی میں پیدا ہو چکے تھے۔ اس کی ایک مثال علامہ محمد اسلم جیراج پوریؒ "نے اپنی کتاب، ہمارے دینی علوم، میں ان الفاظ میں پیش کی ہے :۔

"روایات کا یہ اختلاف دیار و امصار، یعنی حجاز و عراق وغیرہ پر محدود نہیں تھا بلکہ ایک ہی مقام میں مختلف اور متضاد روایتیں ہوتی تھیں۔ اس کا ایک نمونہ عبدالوارث بن سعید کا بیان ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ " میں مکہ میں آیا تو معلوم ہوا کہ یہاں عراق کے نامور فقہاء حج کے لئے آئے ہوئے ہیں۔ پہلے میں امام ابو حنیفہؒ کے پاس پہنچا اور ان سے پوچھا کہ بیع میں بائع اگر کوئی شرط لگائے تو کیا وہ جائز ہو گی؟ جواب دیا کہ بیع بھی باطل ہے اور شرط بھی۔ پھر میں نے ابنِ ابی لیلیٰ سے بھی جا کر یہی سوال کیا۔ انہوں نے کہا کہ بیع جائز ہے اور شرط باطل ہے۔ اس کے بعد ابنِ شبرمہ سے جا کر دریافت کیا۔ بولے بیع بھی جائز ہے اور شرط بھی جائز ہے۔

میں نے دل میں سوچا کہ سبحان اللہ! یہ تینوں فقہا ایک ہی جگہ کے ہیں اور ان میں ایک ہی مسئلہ میں راویوں کا اس قدر اختلاف!

اب دوبارہ میں ابو حنیفہؒ کے پاس گیا اور ان سے یہ سب باتیں کہیں، فرمایا معلوم نہیں کہ وہ لوگ کیوں ایسا کہتے ہیں۔ مجھے تو حدیث ملی ہے :۔

حدثنی عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ قال نھیٰ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم عن بیع و شرط

"یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیع کے ساتھ شرط ممنوع فرمائی"۔

یہ سن کر میں ابنِ ابی لیلیٰ کے یہاں پہنچا اور ان سے بیان کیا۔ انہوں نے کہا کہ حدثنی ھشام عن عروۃ عن ابیہ عن عائشۃؓ قالت امرنی رسول اللّٰہ ان اشتری بریرۃ فاعتقھا فاشترط اھلھا الولاء

لا نفسھم فقال رسول اللہؐ ما کان من شرط لیس فی کتاب اللہ فھو باطل۔

"یعنی حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ میں بریرہ کو خرید کر آزاد کر دوں۔ اس کے مالکوں نے شرط یہ کی کہ وہ ان کی رہے گی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شرط کتاب اللہ میں نہیں وہ باطل ہے۔

اب ابن شبرمہ کے پاس آیا۔ انہوں نے سب کچھ سن لینے کے بعد کہا کہ حد ثنی مسعر بن کدام عن محارب بن دثار عن جابر قال بعت النبی بعیر او شرطت لی حملانہ الی لمدینہ۔" یعنی میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ ایک اونٹ بیچا اور میری شرط یہ منظور کی گئی کہ اس پر لد کر مدینہ تک جاؤں گا۔"

اس پر علامہ موصوف نے اپنے مخصوص انداز میں، چار سطروں میں جو تبصرہ فرمایا ہے وہ اپنے مقام پر منفرد ہے۔ فرماتے ہیں :۔

"مگر اس کا الزام صرف روایات کے اختلاف پر نہیں بلکہ مذہبی انفرادیت پر بھی ہے۔ اگر اجتماعی مرکز، فقہ کو اپنے ہاتھ میں رکھتا تو ساری ملت کی ایک ہی فقہ ہوتی اور شخصی فقہوں میں پڑ کر وہ فرقوں میں تقسیم نہ ہو جاتی۔ اور اس مرکزیت کی وجہ سے حدیثوں کی بھی یہ حالت نہ ہوتی۔"

روایات اور فقہ کے یہ اختلاف اسی ایک مسئلہ میں نہیں۔ زندگی کے ہر گوشے اور ہر معاملہ میں یہی کیفیت ہے اور مشکل یہ ہے کہ کوئی فرقہ اپنے معتقدات یا مسائل میں ذرا سی تبدیلی کے لئے بھی تیار نہیں۔ ان حالات میں آپ سوچئے کہ کیا یہ کسی طرح بھی ممکن ہے کہ یہ حضرات کوئی ایسا ضابطہ قوانین مرتب کر سکیں یا کسی ایسے ضابطہ پر متفق ہو سکیں جس میں ان کے اختلافات کی گنجائش نہ ہو۔ ایسا سمجھنا خوش فہمی ہی نہیں خود فریبی ہے اور اس کی وجہ ظاہر ہے۔ ان کا تشخص ان اختلافات کی غیر متبدل حدود سے متعین ہوتا اور قائم رہتا ہے۔ یہ اختلافات مٹ جائیں تو ان کی جداگانہ ہستی ہی ختم ہو جائے۔ توحید کا یہ لازمی نتیجہ ہوتا ہے کہ اختلافات کے بت باقی نہیں رہتے۔ غالب نے کس قدر عمیق اور بلیغ انداز میں اس حقیقت کو بیان کیا ہے۔ کہ :۔

ہم مؤحد ہیں، ہمارا کیش ہے ترک رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

یہ حضرات بڑے دعوے سے کہا کرتے ہیں کہ اس بات کا ثبوت کہ ہمارے اختلافات مٹ سکتے ہیں، تحریک نظامِ مصطفٰی' کا متحدہ محاذ ہے جس میں مختلف فرقوں کے علماء اپنے اختلافات مٹاتے ہوئے شانہ بشانہ جادہ پیما تھے۔ ان حضرات کے اختلافات کس حد تک مٹ چکے تھے۔ اس کا اندازہ دو ایک واقعات سے لگایئے۔ مفتی محمود (مرحوم) نے حیدرآباد پریس کلب میں پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے مودودی صاحب (مرحوم) کے متعلق فرمایا تھا:۔

"مودودی نے جمعیت العلماء کے مولویوں کے خلاف فتویٰ دیا ہے۔ مودودی کو فتویٰ دینے کا حق حاصل نہیں ہے۔ میں اب تک پندرہ ہزار فتوے دے چکا ہوں اور وہ سب مجلد کتابوں میں موجود ہیں۔ میں آج اس پریس کلب میں فتویٰ دیتا ہوں کہ مودودی، گمراہ، کافر اور خارج از اسلام ہے۔ اس سے اور اس کی جماعت سے تعلق رکھنے والے کسی مولوی کے پیچھے نماز پڑھنا، ناجائز اور حرام ہے۔ اس کی جماعت سے تعلق رکھنا کفر اور ضلالت ہے۔
وہ امریکہ اور سرمایہ داروں کا ایجنٹ ہے۔ اب وہ موت کے آخری کنارے پہ پہنچ چکا ہے اور اب اسے کوئی طاقت نہیں بچا سکتی۔ اس کا جنازہ نکل کر رہے گا۔"

(ہفت روزہ زندگی۔ لاہور۔ مورخہ ۱۰ نومبر ۱۹۶۹ء)

متحدہ محاذ میں شمولیت کے باوجود، نہ مفتی صاحب نے اپنے اس فتویٰ کو واپس لیا تھا اور نہ ہی مودودی صاحب نے اس کے خلاف احتجاج کیا تھا۔

جمعیت العلماء اسلام اور جمعیت العلماء پاکستان، دونوں اہل سنت والجماعت کے حنفی فرقہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ دونوں متحدہ محاذ میں شامل تھیں لیکن اس کے باوجود باہمی اختلافات کی کیفیت یہ تھی کہ:۔

"۲۵۔ اگست ۱۹۷۷ء کی شام، پاکستان متحدہ محاذ کے بڑے بڑے لیڈر جب افطاری کرنے لگے تو اسلامی اخوت اور نظامِ مصطفٰی' کے قیام کے دعوے داروں کے درمیان ایک عجیب منظر دیکھنے میں آیا۔ یہ لیڈر جب افطاری کر چکے تو نماز کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے اور لوگ وہاں یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ مفتی صاحب اور نواب زادہ نصر اللہ خاں دس بارہ آدمیوں کو لے کر ایک طرف چل پڑے۔

اور ان نمازیوں کی امامت مفتی صاحب نے کی۔ جب کہ مولانا نورانی اور میاں طفیل محمد دوسری طرف کھڑے ہو گئے۔ یہاں شاہ احمد نورانی نے جماعت کرائی اور تحریک استقلال کے میاں محمود علی قصوری نے بھی نورانی صاحب کے پیچھے نماز پڑھی۔"

(مساوات ۔ ۲۶ ر اگست ۱۹۷۷ء)

اس سے واضح تر، مولانا نورانی کی وہ تقریر ہے جو معاصر ایشیا کی (۱۵ ر جنوری ۱۹۷۸ء) کی اشاعت میں شائع ہوئی تھی۔ اس میں انہوں نے فرمایا تھا :-

"ابھی حال ہی کا ذکر ہے کہ میں اور مولانا عبدالستار نیازی، مولانا غلام علی اوکاڑوی اور مولانا سید حسین الدین شاہ صاحب، یہ ابھی تین چار روز پہلے (۱۳ ر اکتوبر ۱۹۷۷ء جمعرات) کا ذکر ہے کہ ہم سب جنرل ضیاء الحق سے ملاقات کے لئے گئے تاکہ دار العلوم اور ایک مسجد کا سنگ بنیاد ان سے رکھوایا جائے تو جب ان سے باتیں ہو رہی تھیں، انہوں نے یہ فرمایا، میں نے سُنا ہے کہ آپ بڑے وسیع القلب ہیں، آپ میں بڑی رواداری ہے۔ آپ میں بڑی فراخدلی ہے اور پھر فرمانے لگے کہ اسی فراخدلی کا نتیجہ ہے کہ جب آپ سہالہ میں تھے۔ قید کے ان لمحات میں رواداری اور وسعت قلبی کا مظاہرہ کرتے ہوئے فلاں صاحب کے پیچھے نماز پڑھی۔ مجھے یہ رپورٹ ملی ہے۔ میں سنتا رہا۔ جب ان کی بات ختم ہو گئی تو میں نے جواباً عرض کیا۔ جنرل صاحب بڑا افسوس ہے۔ آپ کو غلط اطلاعات دی گئیں۔ ہم میں الحمد للہ بڑی وسعتِ قلب ہے لیکن گستاخ رسولؐ کے لئے کوئی وسعت نہیں۔ ہم میں رواداری ہے لیکن حضورِ پرنور صلعم کی شان میں تنقیص کرنے والے کے لئے کوئی رواداری نہیں۔ اعلیٰ حضرت عظیم البرکت امام اہلِ سنت مولانا احمد رضا خان فاضل بریلویؒ کا لکھا ہوا مجموعہ فتاویٰ حسام الحرمین کے نام سے مشہور ہے۔ جس میں علماء حرمین شریفین کے فتویٰ موجود ہیں اور مسلک اعلیٰ حضرت کی تصدیق ہے۔ ہم الحمد للہ! اس فتوے پر عمل کرتے ہوئے کوئی بھی شخص ہو خواہ ڈیرہ اسمٰعیل خان کا ہو، ملتان کا ہو، اچھرہ کا ہو۔ کسی شاتم رسولؐ کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے۔ اور میں نے کہا۔ جناب والا! یہ چار چار ٹکے کے لوگ ہیں، ہم تو حرمین شریفین کے نجدی امام کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے۔ یہ ملا جو چار ٹکے کے ہیں ان کے پیچھے نماز پڑھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آپ

کو یہ غلط اطلاع ملی ہے، آپ مطمئن رہیں، ہمارے مسلک میں ایسی رواداری، فراخ دلی اور وسعت قلبی نہیں ہے۔ ہمارے قلب میں شاتم رسول صؐ کے لئے کوئی وسعت نہ آج ہے نہ آئندہ ہوگی اور اس کے لئے لوگ بہت سی باتیں کہتے ہوں گے۔ قومی اسمبلی میں بھی اذان ہوتی تھی علامہ ازہری موجود ہیں۔ ان لوگوں کا رُخ ایک طرف ہوتا تھا اور ہمارا رُخ ان سے دوسری طرف۔ اس کے دیکھنے والے ایک نہیں، دو نہیں بے شمار لوگ ہیں"۔

(بحوالہ طلوع اسلام۔ بابت فروری ۱۹۷۸ء صفحہ ۶۲)

یہ تھی نظام مصطفیٰؐ کے لئے جہاد میں ان کی صفوں میں اتحاد کی عملی شکل! وہ اتحاد کسی مذہبی مقصد کے لئے تھا ہی نہیں، سیاسی مفاد کے لئے تھا۔ مقصد مذہبی ہوتا تو اتحاد کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا۔ آپ نے دیکھا نہیں کہ جوں ہی وہ مقصد ختم ہوا، وہ اتحاد بھی کالعدم ہو گیا۔

ملوکیت کا مفاد اسی میں ہوتا ہے کہ یہ حضرات ایسے بے کار مسائل کے متعلق بحثوں میں اُلجھے رہیں جن کا زندگی کے عملی معاملات سے کوئی تعلق نہ ہو۔ اور قوم تشتت و انتشار کا شکار رہے۔ مثلاً ؎

ابن مریم مر گیا یا زندۂ جاوید ہے — ہیں صفاتِ ذاتِ حق حق سے جدا یا عینِ ذات
آنے والے سے مسیحؑ ناصری مقصود ہے — یا مجدد جس میں ہوں فرزند مریم کے صفات
ہیں کلام اللہ کے الفاظ حادث یا قدیم — اُمتِ مرحوم کی ہے کس عقیدے میں نجات
(ابلیس کی مجلس شوریٰ)

غرضیکہ :-

تم اسے بیگانہ رکھو عالم کردار سے — تا بساطِ زندگی میں اس کے سب مہرے ہوں مات

جس اسلام کی قوم کو تلقین کی جاتی ہے اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ اس کے متعلق علامہ اقبالؒ نے اپنی اسی نظم میں جس کے چند اشعار پیشِ خدمت کئے گئے ہیں۔ ابلیس کے ایک مشیر کی زبان سے کہلوایا ہے :-

ہے ازل سے ان غریبوں کے مقدر میں سجود — ان کی فطرت کا تقاضا ہے نمازِ بے قیام
آرزو اول تو پیدا ہو نہیں سکتی کہیں — ہو کہیں پیدا تو مر جاتی ہے یا رہتی ہے خام
یہ ہماری سعیٔ پیہم کی کرامت ہے کہ آج — صوفی و مُلّا ملوکیت کے بندے ہیں تمام

اور آخر میں یہ کہ :-

ہے طواف و حج کا ہنگامہ اگر باقی تو کیا
کُند ہو کر رہ گئی مومن کی تیغِ بے نیام

اس کی تیغِ بے نیام کے کُند ہو کر رہ جانے کی اس سے بڑی اور زندہ شہادت کیا ہو سکتی ہے کہ ابھی کل کی بات ہے فلسطین اور لبنان کی سرزمین بے گناہ مردوں، مظلوم عورتوں اور معصوم بچوں کے خون سے لالہ زار بنتی رہی اور اب تک بن رہی ہے۔ لیکن مراکش سے لے کر انڈونیشیا تک دیکھئے تو ان آزاد مملکتوں کے مسلمانوں کی تلواریں سب کی سب کُند ہو کر رہ گئی ہیں۔ ایک بھی فضا میں نہیں اُبھری۔ اور اس تمام دوران میں ہر سال لاکھوں کی تعداد میں مسلمان حج کا مقدس فریضہ ادا کرنے کے لئے جمع ہوتے اور عرفات کے میدان میں دشمنانِ اسلام کی ذلت و خواری کی دعائیں مانگ کر اپنے اپنے ممالک کی طرف واپس آتے رہے ہیں اور اب تک یہ سلسلہ جاری ہے۔ آسام کے مسلمان "یا بھیڑ بکریوں کی طرح ذبح ہو رہے ہیں" یا ڈھور ڈنگر کی طرح اپنے گھروں سے باہر ہانکے جا رہے ہیں۔ خونِ مسلم کی اس بے پناہ ارزانی کے خلاف کہیں سے آواز تک نہیں اُٹھتی۔ البتہ ایک ایک مسجد کے چار چار لاؤڈ سپیکروں سے ذکر و فکر کی محفلیں گرم کر کے جنت میں محلات تعمیر کرانے کے اعلانات مسلسل و پیہم فضا میں گونجتے رہتے ہیں۔ یہ سب اس اسلام کی برکات ہیں جس کے بیج ہمارے دورِ ملوکیت میں بوئے گئے اور جسے آج استعماری قوتوں کی نوازش ہائے گراں مایہ سے پروان چڑھایا جا رہا ہے۔ اقبالؒ بہت پہلے اس گُر کو سمجھا گیا تھا کہ :-

پسر را گفت پیرے خرقہ بازے ترا ایں نکتہ باید حرزِ جاں کرد
بہ نمرودانِ ایں دَور آشنا باش ز فیضِ شاں براہیمیؑ تواں کرد

(ارمغانِ حجاز)

"ایک عیار جُبّہ پوش نے اپنے بیٹے سے کہا کہ میں تمہیں ایک گُر بتلاتا ہوں جسے اچھی طرح گرہ میں باندھ لو۔ وہ گُر یہ ہے کہ اس دَور کے نمرودوں کے ساتھ یارانہ رکھو۔ اور ان کے فیوض و اکرام سے "اسلام کا جھنڈا" بلند کرتے رہو"۔

اس دَور کے نمرودوں نے اس مقصد کے لئے سب سے پہلا دانہ اس وقت پھینکا جب انہیں کمیونزم کی یلغار کو روکنے کے لئے، مسلم ممالک کی تائید اور حمایت کی ضرورت لاحق ہوئی۔ اس کے لئے انہوں نے انہیں سیاسی دعوت نہیں دی۔ ان کی دکھتی ہوئی رگ کو پکڑا۔ انہوں نے آواز دی کہ :-

" دنیا کے خدا پرستو! آؤ! اس الحاد اور بے دینی کے خلاف متحدہ محاذ بنائیں"۔

قرآن کی رُو سے جس طرح یہ اس خدا کا منکر ہے اسی طرح مغرب کی عیسائی اقوام بھی اس کی منکر ہیں۔ وہ ان دونوں میں فرق نہیں کرتا اور دونوں کو اس خدا پر ایمان لانے کے لئے کہتا ہے، جس کا تصوّر قرآن پیش کرتا ہے۔ لیکن ہماری مذہبی پیشوائیت نے اس دعوت پر گھی کے چراغ جلائے اور اس پر لبیک کہتے ہوئے ان کی طرف دوستی (کیا؟ زیردستی) کا ہاتھ بڑھایا اور کہا کہ اگر سرمایہ دار اقوامِ مغرب کا یہ بلاک فی الواقعہ مسلمانوں کی حمایت چاہتا ہے تو انہیں یہ دعوت ان کی مذہبی پیشوائیت کو دینی چاہیے۔ چنانچہ سیّد ابوالاعلیٰ مودودی (مرحوم) نے پبلک جلسوں میں تقریر کرتے ہوئے کہا۔

" اگر یہ بلاک فی الواقعہ یہ چاہتا ہے کہ کمیونزم کی روک تھام کے لئے اسے مسلم عوام کا دلی تعاون حاصل ہو تو اسے اپنی بنیادی پالیسی میں بنیادی تغیّر کرنا پڑے گا۔ اسے یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ اسے مسلم بلاک کے حکمرانوں سے ساز باز کرنا ہے یا مسلم ممالک کے عوام کا تعاون حاصل کرنا ہے۔ یہ اس کے سوچنے کا کام ہے کہ اسے کون سی راہ اختیار کرنی چاہیئے۔ اسے حکمرانوں کی ضرورت ہے جو عوام پر سطحی اثر بھی نہیں رکھتے یا عوام کے تعاون کی ضرورت ہے جو طاقت کا اصلی سرچشمہ ہوتے ہیں... مسلمان ملکوں کے ساتھ آپ کی جو پالیسی اب تک چلی آرہی ہے وہ ایسی ہرگز نہیں ہے کہ پاکستان اور دوسرے ممالک کے عوام کا دلی تعاون آپ کو حاصل ہوسکے"۔

(اخبار تسنیم، مورخہ ۱۶ / تا ۲۰ / دسمبر ۱۹۵۵ء)

بات بالکل واضح تھی۔ مسلم ممالک کے عوام مذہب پرست واقعہ ہوئے ہیں۔ اس لئے اس بلاک سے جو کچھ کہا جارہا تھا وہ یہ تھا کہ تم ان ممالک کے حکمرانوں کے بجائے وہاں کی مذہبی پیشوائیت سے معاملہ کرو۔ وہاں کے عوام کا تعاون بھی تمہیں حاصل ہو جائے گا اور حکمرانوں کا بھی، کیونکہ جب ہم کہیں گے اس بلاک کی حمایت اسلام کا تقاضا ہے تو ان (حکمرانوں) کو جرأت نہیں ہوگی کہ وہ اس کے خلاف جاسکیں۔ اس بلاک اور ہماری مذہبی پیشوائیت میں اس باب میں کس قسم کی سودا بازی ہوئی اس سے پہلے تو یہ راز ہی تھا لیکن اب اس تحریک کی شکل میں مبرہن ہوگئی ہے۔ جسے فنڈامینٹل ازم کہا جاتا ہے۔ اس کے مراکز مغربی ممالک میں ہیں اور شاخیں مسلم ممالک میں (سرطان کی طرح) پھیلی ہوئی ہیں۔ زر و سیم کے چشمے وہاں سے اُبلتے ہیں اور ان کے صدقے، ان کی منشار کا "اسلام" ساری دنیا میں پھیلایا جارہا ہے۔ اسلامک مشن، اسلامک سنٹرز، اسلامک کانفرنسیں

اسلامک سیمینار۔ اور نامعلوم کیا کیا "اسلامک"؟ اور پھر، اس مقصد جلیلہ کی خاطر، ہمارے مذہبی راہ نما جس طرح سال کا آدھا آدھا حصہ، ان ممالک کے اعلیٰ درجہ کے ہوٹلوں میں گزارتے ہیں، وہ کس کی نگاہوں سے پوشیدہ ہے؟ اس تناظر میں آپ کی سمجھ میں یہ بات آجائے گی جسے اس دیدہ ور نے پچاس سال پہلے کہا تھا کہ:۔

بہ نمرودانِ ایں دَور آشنا باش ۔۔۔ زفیضِ شاں براہیمی، تواں کرد

اس طرح وہ خطرہ ٹل گیا جو ہمارے دَور کی ملوکیت اور سرمایہ داری کو عفریت کی طرح ڈراتا تھا کہ:۔

عصرِ حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف ۔۔۔ ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبرؐ کہیں

ان سے کہہ دیجئے کہ آپ ان خرفہ بازوں سے ساز باز رکھئے اور چین کی نیند سوئیے۔ یہ شرعِ پیغمبرؐ کو کبھی آشکارا نہیں ہونے دیں گے۔ کہ اس سے تمہارا ہی نہیں، خود ان کا مفاد بھی وابستہ ہے۔

والسلام

پرویز

بتقریب یوم اقبال ۱۹۸۴ء

خصوصی خطاب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خلقِ خدا کی گھات میں رِند و فقیہہ و میر و پیر

عزیزانِ گرامی قدر! سلام و رحمت

آج کی تقریب اُس جلیل القدر، نادرۂ روزگار ہستی کی یاد میں منعقد کی گئی ہے جس کا نام ہمارے محسنینِ ملت کی فہرست میں سرِعنوان آتا ہے۔ اس لئے کہ اس نے اربابِ دانش و بینش کو فکری اور تخلیاتی اُفق پر ایک جہانِ نَو سے روشناس کرایا۔ اسلامیانِ ہند و پاک کو اس الوہیاتی حقیقت سے متعارف کرایا کہ اسلام مذہب نہیں، دین ہے جس کا احیاء اور قیام صرف اپنی آزاد مملکت میں ممکن ہے اور پھر اس آزاد مملکت کے اسلامی خط و خال متعین کر کے اس کے حصول کی راہیں متعین کیں۔ آج اگر ہمارا شمار دنیا کی آزاد قوموں میں ہوتا ہے تو یہ بنیادی طور پر اسی کی نگاہِ دوربیں اور حقیقت شناس کا تصدق ہے اور اگر اس خطۂ زمین میں کبھی صحیح اسلامی (قرآنی) مملکت کا قیام عمل میں آیا، تو وہ بھی اسی قرآنی مفکر کے تصورات کی رہینِ منت ہوگی۔ خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را۔

علامہ اقبالؒ کو ایک شاعر، زیادہ سے زیادہ ایک مفکر کی حیثیت سے پہچانا جاتا ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ شاعر ہو یا مفکر، وہ اپنے خیالات کی دنیا میں مستغرق رہتا ہے اور اسے دنیائے ممکنات (انسان کی عملی زندگی) سے کچھ واسطہ نہیں ہوتا۔ لیکن اس شاعر اور مفکر کی کیفیت اس سے مختلف تھی۔ اس کی فکر کی ابتداء دنیائے ممکنات کے سنوارنے سے ہوئی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ:

اگر نہ سہل ہوں تجھ پر زمیں کے ہنگامے   بُری ہے مستیٔ اندیشہ ہائے افلاکی

یہ اس لئے کہ اُن کی فکر کا سرچشمہ خدا کی کتاب تھی، جس نے مومن کی زندگی کے سلسلہ میں اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً پہلے کہا ہے اور وَفِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً اس کے بعد (۲/۲۰۱) بالفاظِ دیگر، وہ

انسان کی موجودہ دنیا سنوارنے سے اس کی اُخروی زندگی سنورتا ہے۔ بلکہ یوں کہیے کہ اس کے نزدیک اُخروی زندگی موجودہ زندگی کے تسلسل کا نام ہے۔ حیات ایک جوئے رواں ہے جو یہاں سے وہاں تک مسلسل چلی جاتی ہے اس لئے جیسی یہاں کی زندگی، ویسی وہاں کی زندگی۔ مَنْ كَانَ فِي هَٰذِهِ أَعْمَىٰ فَهُوَ فِي الْآخِرَةِ أَعْمَىٰ (۱۷/۷۲) جو یہاں اندھا ہے، وہ وہاں بھی اندھا ہوگا۔

وہ کل کے غم و عیش پہ کچھ حق نہیں رکھتا — جو آج خود افروز و جگر سوز نہیں ہے
وہ قوم نہیں لائقِ ہنگامۂ فردا — جس قوم کی تقدیر میں امروز نہیں ہے

روٹی کی اہمیت

دنیاوی زندگی کا مدار سامانِ زیست پر ہے۔ اسے قرآن کی اصطلاح میں رزق کہا جاتا ہے، اور ہمارے ہاں اسے "روٹی" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ قرآنِ کریم نے رزق یا روٹی کو کسقدر اہمیت دی ہے، اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ اس نے قصۂ آدم کے تمثیلی انداز میں جنت کی خصوصیت یہ بتائی ہے: وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا (۲/۳۵) اس میں جہاں سے کسی کا جی چاہے پیٹ بھر کر کھائے۔ یعنی اس میں رزق کے معاملے میں "میری اور تیری" کی تفریق نہ ہو۔ اس کا دسترخوان تمام نوعِ انسان کے لئے یکساں بچھا ہو۔ جہاں سے ہر شخص، اپنی ضرورت کے مطابق، بلا تکلف لے لے۔ دوسرے مقام پر اس کی تفصیل ان الفاظ میں بیان کر دی: إِنَّ لَكَ أَلَّا تَجُوعَ فِيهَا وَلَا تَعْرَىٰ ۝ (۲۰/۱۱۸) وَأَنَّكَ لَا تَظْمَأُ فِيهَا وَلَا تَضْحَىٰ ۝ (۲۰/۱۱۹) "اس میں بھوک، پیاس اور رہائش کا سامان ہر ایک کے لئے یکساں موجود ہوگا، کوئی اس سے محروم نہیں ہوگا"۔ یہ تو رہی جنت میں آدم کی زندگی۔ حضرت ابراہیمؑ جب خدا کے گھر کی تعمیر سے فارغ ہوئے تو خدا سے پہلی دعا یہ مانگی کہ وَارْزُقْ أَهْلَهُ مِنَ الثَّمَرَاتِ ... (۲/۱۲۶)۔ "وہاں کے رہنے والوں کے لئے سامانِ رزق فراہم کیا جائے"۔ اس نے اقوامِ عالم کے لئے زندگی کی جن آسائشوں کا ذکر کیا ہے، ان میں رزق سرِفہرست ہے۔ سورہ نحل میں تمثیلاً ایک بستی کا ذکر ہے جو نعماءِ خداوندی سے متمتع تھی۔ اس کے متعلق کہا کہ يَأْتِيهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّن كُلِّ مَكَانٍ ... (۱۶/۱۱۲) "اس کی طرف ہر گوشے سے سامانِ زیست چلا آتا تھا"۔ اس نے قریش کو جن انعاماتِ خداوندی کی یاد دلائی تھی۔ اس کے متعلق کہا تھا: أَطْعَمَهُم مِّن جُوعٍ وَآمَنَهُم مِّنْ خَوْفٍ (۱۰۶/۴) "وہ روٹی کی طرف سے مطمئن، اور خطرات سے مامون تھے"۔ اس نے بھوک اور خوف کو خدا کا عذاب بتایا ہے۔ جس بستی کا تمثیلی ذکر اوپر کیا گیا ہے کہ اسے سامانِ زیست کی فراوانیاں حاصل تھیں۔ اس کے متعلق کہا ہے کہ جب اس نے کفرانِ نعمت کیا تو: فَأَذَاقَهَا اللَّهُ لِبَاسَ الْجُوعِ وَالْخَوْفِ ... (۱۶/۱۱۲)

"اس پر بھوک اور خوف کا عذاب مسلط ہو گیا"۔ جہاں جنتی زندگی کے متعلق کہا ہے کہ اس میں ضروریاتِ زندگی کی فراوانی ہوگی، اس کے ساتھ ہی اس کی وضاحت بھی کر دی کہ وَمَنْ أَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِي فَإِنَّ لَهُ مَعِيشَةً ضَنْكًا ۔ " جو قوم قوانینِ خداوندی سے اعراض برتے گی، اس کی روزی تنگ ہو جائے گی، وہ بھوک کے عذاب میں مبتلا ہو جائیگی"۔ اور اس کے بعد ہے۔ وَنَحْشُرُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَعْمَىٰ (۲۰/۱۲۴) "جس کی روزی یہاں تنگ ہوگی وہ قیامت میں بھی اندھا اٹھایا جائے گا۔"

رزقِ کریم

لیکن قرآنِ کریم نے رزق کے ساتھ ایک شرط عائد کی ہے۔ یعنی رزقِ کریم، باعزت روٹی۔ روٹی تو ہر طریق سے حاصل کی جا سکتی ہے، لیکن ایک روٹی وہ ہے، جسے عزت بیچ کر حاصل کیا جاتا ہے، اور ایک وہ جس میں عزت وآبرو برقرار رہتی ہے۔ قرآنِ کریم کی رو سے، ایمان واعمالِ صالحہ کے نتیجے میں جو مملکت حاصل ہوتی ہے، اسے استخلاف فی الارض، یعنی اسلامی مملکت کہا جاتا ہے۔ (وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ ... (۲۴/۵۵) اور اس اسلامی مملکت میں جو رزق حاصل ہوتا ہے، وہ اسے رزقِ کریم کہہ کر پکارتا ہے۔ فَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَهُمْ مَغْفِرَةٌ وَرِزْقٌ كَرِيمٌ (۲۲/۵۰) "جو لوگ ایمان اور اعمالِ صالحہ کے حامل ہوں گے، انہیں خطرات سے حفاظت بھی ملے گی اور رزقِ کریم، باعزت روٹی بھی۔" اس نے اسے رزقِ طیب بھی کہا ہے۔ یعنی خوشگوار، زندگی بخش اور پاکیزہ رزق۔ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر اپنی نعماء کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ وَلَقَدْ بَوَّأْنَا بَنِي إِسْرَائِيلَ مُبَوَّأَ صِدْقٍ وَرَزَقْنَاهُمْ مِنَ الطَّيِّبَاتِ ... (۱۰/۹۳) بنی اسرائیل کو مسکن عطا کیا اور رزقِ طیب۔ یہی مومنین کے متعلق کہا۔ مہاجرین اور مجاہدین کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُونَ حَقًّا ۚ لَهُمْ مَغْفِرَةٌ وَرِزْقٌ كَرِيمٌ (۸/۷۴)۔ "یہ پکے اور سچے مومن تھے۔ انہیں خطرات سے حفاظت اور رزقِ کریم حاصل تھا۔" اسی کو اکلِ حلال کہا گیا تھا۔

اقبالؒ نے قرآنِ کریم کے اس بنیادی نکتہ کو پالیا تھا، اور حیرت ہے کہ اسے اس نے ابتدائی عمر ہی میں پالیا تھا۔ اس نے کالج کی تعلیم سے فارغ ہونے کے دو تین سال بعد جو اپنی سب سے پہلی کتاب تصنیف کی، اس کا موضوع تھا "علم الاقتصاد" وہ فلسفہ کے طالب علم تھے۔ اقتصادیات ان کا مضمون نہیں تھا، لیکن ان کی نگاہ میں معاشیات کی اس قدر اہمیت تھی کہ انہوں نے سب سے پہلے اسی موضوع کو اپنی توجہ کا مرکز قرار دیا۔ یہ کتاب ۱۹۰۳ء میں شائع ہوئی تھی۔ جب ان کی عمر بیس تئیس سال سے زیادہ نہ تھی۔ اس کتاب کے دیباچہ میں انہوں نے کہا تھا:-

اقبالؒ اور غریبوں کی آہیں

"اس میں کوئی شک نہیں کہ تاریخِ انسانی کے سیلِ رواں میں، اصولِ مذہب بھی بے انتہا مؤثر ثابت ہوئے ہیں۔ مگر یہ بات بھی روزمرّہ کے مشاہدہ اور تجربہ سے ثابت ہوتی ہے کہ روزی کمانے کا دھندا ہر وقت انسان کے ساتھ ساتھ ہے اور چپکے سے اس کے ظاہری اور باطنی قویٰ کو اپنے سانچے میں ڈھالتا رہتا ہے۔ ذرا خیال کرو کہ غریبی، یا یوں کہو کہ ضروریاتِ زندگی کے کامل طور پر پورا نہ ہونے سے انسانی طرزِ عمل کہاں تک متاثر ہوتا ہے۔ غریبی قوئ انسانی پر بہت بُرا اثر ڈالتی ہے بلکہ بسا اوقات انسانی روح کے مجلّا آئینہ کو اس قدر زنگ آلود کر دیتی ہے کہ اخلاقی، اور تمدنی لحاظ سے اس کا وجود و عدم برابر ہو جاتا ہے۔ معلّمِ اوّل، یعنی حکیم ارسطو سمجھتا تھا کہ غلامی تمدنِ انسانی کے قیام کے لئے ایک ضروری جزو ہے۔ مگر مذہب اور زمانۂ حال کی تعلیم نے انسان کی جبلّی آزادی پر زور دیا اور رفتہ رفتہ مہذب قومیں محسوس کرنے لگیں کہ یہ وحشیانہ تفاوتِ مدارج، بجائے اس کے کہ قیامِ تمدن کے لئے ایک ضروری جزو ہو، اس کی تخریب کرتا ہے اور انسانی زندگی کے ہر پہلو پر نہایت مذموم اثر ڈالتا ہے۔ اسی طرح اس زمانے میں یہ سوال پیدا ہوا ہے کہ آیا مفلسی بھی نظمِ عالم میں ایک ضروری جزو ہے؟ کیا یہ ممکن نہیں کہ ہر فرد مفلسی کے دکھ سے آزاد ہو؟ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ گلی کوچوں میں چپکے چپکے کراہنے والوں کی دلخراش صدائیں ہمیشہ کے لئے خاموش ہو جائیں اور ایک دردمند دل کو ہلا دینے والے افلاس کا دردناک نظارہ ہمیشہ کے لئے صفحۂ عالم سے حرفِ غلط کی طرح مٹ جائے۔"

(اقبالؒ اور قرآن جلد ۱ صفحہ ۱۷۸)

یہ، ایک فلسفہ کے طالبِ علم، نوجوان کے احساسات ہیں۔ آپ نے غور فرمایا کہ ان کا سینہ اسی زمانے میں غریبوں اور مفلسوں کے ساتھ ہمدردی کے جذبات سے کسقدر گداز تھا۔ اس کے بعد وہ حصولِ تعلیم کے لئے یورپ چلے گئے۔ وہاں انہوں نے نظامِ سرمایہ داری کے خونچکاں، انسانیت کُش مظاہر کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ واپسی کے بعد انہوں نے ۱۹۱۲ء میں علیگڑھ میں وہ معرکہ آرا تقریر کی جس کی صدائے بازگشت آج تک برِّصغیر پاک و ہند کے در و دیوار سے سنائی دیتی ہے (مولانا) ظفر علی خان (مرحوم) نے اس تقریر کا اُردو میں ترجمہ کیا تھا جس کا عنوان تھا۔ ملّتِ بیضا پر عمرانی نظر۔ اس میں اقبالؒ نے کہا تھا:۔

ملّتِ بیضا پر عمرانی نظر

یقیناً کسی کو اس بات سے انکار نہ ہوگا کہ غریب مسلمان کی اقتصادی حالت نہایت ہی افسوس ناک اور قابلِ رحم ہے۔ شہروں میں جہاں کی آبادی کا جزوِ غالب مسلمان ہیں، معمولی درجہ کے مسلمانوں کی قلیل اُجرت، غلیظ مکان

اور ان کے پیٹ بھر روٹی کے لئے ترستے ہوئے بچوں کا حسرتناک نظارہ کس نے نہیں دیکھا؟ لاہور کے کسی اسلامی محلہ میں جانکلو۔ ایک تنگ و تاریک کوچہ پر تمہاری نظر پڑے گی، جس کے وحشت زا سکوت کے طلسم کو رہ رہ کر یا تو لاغر و نیم برہنہ بچوں کی چیخ و پکار یا کسی پردہ نشین بڑھیا کی لجاجت آمیز صدا توڑتی ہوگی جس کی سوکھی اور مرجھائی ہوئی انگلیاں برقعہ میں سے نکل کر خیرات کے لئے پھیلی ہوئی ہوں گی۔ یہ تو گلی کی حالت تھی۔ الم زدہ گھروں کے اندر جاکر دیکھو تو صدہا مرد اور عورتیں ایسی پاؤ گے جنہوں نے کبھی اچھے دن دیکھے تھے، لیکن آج فاقہ کر رہی ہیں۔ کئی دن سے اناج کا ایک دانہ تک منہ میں اُڑ کر نہیں گیا۔ لیکن غیرت اور خودداری اجازت نہیں دیتی کہ خیرات کے لئے کسی کے آگے ہاتھ پسار دیں۔"

اس کے بعد علامہ اقبالؒ عمر بھر بھوک اور افلاس کے خلاف مصروفِ جہاد رہے۔ اس کا علاج قرآن کا معاشی نظام تھا جس کا قیام اپنی آزاد مملکت کے بغیر ممکن نہ تھا۔ اس کے لئے انہوں نے پاکستان کا تصور عطا فرمایا تھا۔ اپنی آزاد مملکت اور اس میں رزقِ کریم، باعزت روٹی ہر ایک کے لئے۔ اقبالؒ کا ابلیسی نظامِ سرمایہ داری کے خلاف جہاد اس مقصد کے حصول کے لئے تھا۔

نظامِ سرمایہ داری کی بنیاد محنت کش طبقہ کا استحصال (EXPLOITATION) ہے۔ بانگِ درا میں ان کی زہرہ گداز نظم "خضرِ راہ" کا ایک گوشہ اس استحصال کے خلاف نعرۂ انقلاب ہے۔ اس میں اقبالؒ کے سوال کے جواب میں "خضر" کہتا ہے۔

بندۂ مزدور

بندۂ مزدور کو جاکر مرا پیغام دے
خضر کا پیغام کیا؟ ہے یہ پیامِ کائنات

اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دارِ حیلہ گر
شاخِ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات

دستِ دولت آفریں کو مزد یوں ملتی رہی
اہلِ ثروت جیسے دیتے ہیں غریبوں کو زکوٰۃ

مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار
انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات

اُٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

العفو

نظامِ سرمایہ داری کی بنیاد فاضلہ دولت (SURPLUS MONEY) پر ہوتی ہے۔ اسی دولت کے بل بوتے پر سرمایہ دار، دوسروں کی محنت کے ماحصل کو چھین لیتا ہے۔ قرآن کی زبان میں فاضلہ دولت کو العفو کہہ کر پکارا گیا ہے اس کے نظام میں العفو کسی کے پاس نہیں رہتا۔ وَيَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ؕ قُلِ الْعَفْوَ ؕ (۲/۲۱۹) یہ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ ہم کس قدر۔ دوسروں کی ضرورت کے لئے دے دیں کہو کہ جس قدر تمہاری اپنی ضرورت سے زائد ہے، "سب کا سب"۔ ظاہر ہے کہ جب کسی کے پاس فاضلہ دولت رہے گی نہیں، تو نظامِ سرمایہ داری خود بخود ختم ہو جائے گا۔ روس میں جب کمیونزم کا غلغلہ بلند ہوا تو وہ نظامِ سرمایہ داری کے خلاف انقلابی نعرہ تھا۔ اقبالؒ نے اس سے محسوس کیا کہ زمانے کے تقاضے، شاید قرآن کے معاشی نظام پہ پڑے ہوئے پردے اٹھا رہے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے کہا:-

قوموں کی روش سے مجھے ہوتا ہے یہ معلوم ‏ ‏ ‏ بے سود نہیں روس کی یہ گرمیِٔ گفتار

انساں کی ہوس نے جنہیں رکھا تھا چھپا کر ‏ ‏ ‏ کھلتے نظر آتے ہیں بتدریج وہ اسرار

قرآں میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلماں ‏ ‏ ‏ اللہ کرے تجھ کو عطا جدّتِ کردار

جو حرفِ قُلِ الْعَفْوَ میں پوشیدہ ہے اب تک

اس دور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار

کمیونزم کا سُقم

کمیونزم، نظامِ سرمایہ داری کے خلاف برہنہ آواز تھی۔ لیکن ذرا آگے چل کر اقبالؒ کی نگہِ حقیقت شناس نے دیکھ لیا کہ کمیونزم کے فلسفہ کی رُو سے وہ جذبۂ محرکہ میسر نہیں آسکتا جو العفو کے بارِ گراں کا متحمل ہو سکے، اس لئے روس کا نظام کامیاب نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ انہوں نے روس کو اس سے متنبہ کیا اور کہا:-

ایکہ می جوئی نظامِ عالمے ‏ ‏ ‏ جستۂ اورا اساسِ محکمے!

لینن خدا کے حضور

یہ اساسِ محکم قرآنی نظام میں مل سکتی تھی۔ چونکہ قرآنی نظام کا قیام، نظامِ سرمایہ داری کا تختہ اُلٹنے کے بغیر ممکن نہ تھا، اس لئے علامہؒ اس کے خلاف، مختلف اسالیب و انداز سے ستیزہ کار رہے۔ ان میں سب سے زیادہ دلکش انداز وہ ہے جسے بالِ جبریل کی دو مربوط نظموں میں اختیار کیا گیا ہے۔ سب سے پہلے وہ لینن کو بارگاہِ خداوندی میں پیش کرتے ہیں۔ وہ خدا سے ان سوالات کے جواب مانگتا ہے جو اس کے دل میں کانٹے کی طرح کھٹکتے رہے ہیں۔

وہ خدا سے کہتا ہے کہ ہمیں تو خدا کے منکر و ملحد اور بے دین کہا جاتا ہے۔ لیکن میں، بصد ادب یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ:۔

وہ کون سا آدم ہے کہ تو جس کا ہے معبُود؟ — وہ آدمِ خاکی کہ جو ہے زیرِ سماوات
مشرق کے خداوند سفیدانِ فرنگی — مغرب کے خداوند، درخشندہ فلزّات

اہلِ مشرق، یورپ کے حکمرانوں کے پرستار ہیں اور اہلِ یورپ دولت کے پرستار، میں پوچھنا یہ چاہتا ہوں کہ وہ انسان کہاں بستے ہیں جو تیرے پرستار ہیں؟ مجھے تو وہ کہیں دکھائی نہیں دیتے۔

لینن

اقبالؒ نے لینن کے مکالمہ کے پردے میں ایک بے پاک حقیقت کو عریاں کیا ہے۔ یعنی اس حقیقت کو کہ اس وقت دنیا میں خدا کی حکمرانی کہیں بھی نہیں، مشرق کی محکوم قوموں کے خدا، مغرب کے حکمران ہیں۔ اور مغرب کے حکمران، دولت کے محکوم۔ اقبالؒ نے اس حقیقت کو متعدد مقامات پر دُہرایا ہے۔ کہیں کہا ہے کہ۔ نہ دیر میں نہ حرم میں خودی کی بیداری۔ کہیں یہ کہ — یہ تیرے کافر و مومن تمام زنّاری۔ اس سے بھی واضح تر الفاظ میں:۔

مغرب ز تو بیگانہ، مشرق ہمہ افسانہ — وقت است کہ در عالم نقشِ دگر انگیزی

اس اعتراض کے بعد پھر لینن کی طرف آیئے وہ خدا سے کہتا ہے:۔

یہ علم، یہ حکمت، یہ تدبر، یہ حکومت — پیتے ہیں لہو، دیتے ہیں تعلیمِ مساوات
ظاہر میں تجارت ہے، حقیقت میں جُوا ہے — سود ایک کا لاکھوں کے لئے مرگِ مفاجات

اس کے بعد وہ ذرا کھُل کر بات کرتا ہے اور کہتا ہے:۔

تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں — ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات

میں پوچھنا یہ چاہتا ہوں کہ:۔

کب ڈُوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ — دنیا ہے تیری منتظرِ یومِ مکافات

فرشتوں کا گیت

یہ سوال فرشتوں کے دل کو بھی وقفِ اضطراب کئے ہوئے تھا۔ جسے حضرت علامہؒ اگلی نظم میں سامنے لائے ہیں۔ قرآن میں، قصۂ آدم کے ضمن میں، (جو درحقیقت تمثیلی انداز میں خود آدمی کی داستان ہے) کہا گیا ہے کہ خدا نے ملائکہ سے کہا کہ اِنّی جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً"... (۲/۳۰) "میں دنیا میں ایک صاحبِ اختیار مخلوق پیدا کر رہا ہوں" اس پر

فرشتوں نے کہا: اَتَجۡعَلُ فِیۡهَا مَنۡ یُّفۡسِدُ فِیۡهَا وَ یَسۡفِکُ الدِّمَآءَ ۚ "بار الٰہا! کیا تو کرۂ ارض کو ایسی مخلوق کے سپرد کرنا چاہتا ہے جو وہاں خونریزیاں اور فساد انگیزیاں کرے گی"؟ جواب ملا۔ اِنِّیۡۤ اَعۡلَمُ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ ۝ (۲/۳۰) "ہم وہ کچھ جانتے ہیں جو تم نہیں جانتے۔"[1]

یہ سن کر فرشتے خاموش ہو گئے۔ خاموش تو ہو گئے۔ لیکن دل میں یہ کھٹک رہی کہ دیکھیں اس مخلوق جدید میں کون سے جوہر پنہاں ہیں جنہیں ہم نہیں جانتے، صرف خدا جانتا ہے۔ اس کے لئے وہ تاریخ انسانیت کا مشاہدہ کرتے رہے۔ لیکن، نہ صرف یہ کہ انہیں اپنے سوال کا کوئی جواب نہ ملا، دورِ حاضر میں پہنچ کر انسان کی خونریزیوں اور فساد انگیزیوں نے انتہائی شدت اختیار کر لی۔ اس پہ فرشتوں کا پیمانۂ ضبط لبریز ہو گیا، اور انہوں نے جرأت کر کے کہہ ہی دیا کہ "حضور کا ارشاد بجا، اِنِّیۡۤ اَعۡلَمُ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ" لیکن واقعہ یہ ہے کہ[2]

عقل ہے بے زمام ابھی، عشق ہے بے مقام ابھی ——— نقش گرِ ازل! ترا نقش ہے ناتمام ابھی
خلقِ خدا کی گھات میں، رند و فقیہ و میر و پیر ——— تیرے جہاں میں ہے وہی گردشِ صبح و شام ابھی
تیرے امیر مال مست، تیرے فقیر حال مست ——— بندہ ہے کوچہ گرد ابھی، خواجہ بلند بام ابھی
دانش و دین و علم و فن، بندگیٔ ہوس تمام
عشقِ گرہ کشائے کا فیض نہیں ہے عام ابھی

انسان سازی کے تخلیقی مراحل

قرآن کریم کا مقصود و منتہیٰ ایک ایسا نظام قائم کرنا ہے جس میں افرادِ انسانیہ کی مضمر صلاحیتوں کی اس طرح نشوونما ہو کہ وہ ایسا انسان بن جائے جو مشیتِ ایزدی کے معیار پر پورا اترے۔ لیکن وہ انسان کو اس مقام تک انقلابی طریق سے نہیں، ارتقائی انداز سے پہنچانا چاہتا ہے۔ اور ارتقائی انداز سے منازل بڑی سست رفتاری سے طے ہوتی ہیں۔ عجلت پسند انسان اس آخری منزل کو اپنے سامنے جلد دیکھنا چاہتا ہے،

---

[1] ان امور کی وضاحت میری کتاب، مطالب الفرقان جلد دوم ص ۳۲ میں ملے گی۔
[2] اس نظم میں جو کچھ فرشتوں کی زبان سے کہلوایا ہے وہ درحقیقت انسان کے موجودہ معاشرہ کی بے نقاب تصویر ہے۔

اور نظامِ فطرت کی آہستہ خرامی سے جھنجلا اُٹھتا ہے۔ اقبالؒ نے اس حقیقت کو متعدد مقامات پر متنوع انداز سے بیان کیا ہے۔ کبھی وہ کہتا ہے کہ:۔

مہ و ستارہ سے آگے مقام ہے جس کا ۔۔۔ وہ مشتِ خاک ابھی آوارگانِ راہ میں ہے

اور کبھی بارگاہِ خداوندی میں بہ پُرسوز گلہ کرتا ہے کہ:۔

حرم کے دل میں سوزِ آرزو پیدا نہیں ہوتا ۔۔۔ کہ پیدائی تیری اب تک حجاب آمیز ہے ساقی!

فرشتوں کی وہ شکایتِ رنگیں جس کا ذکر اُوپر آچکا ہے، دراصل خود انسان کے قلبِ مضطرب کی بیتابانہ دھڑکن ہے کہ یہ منازل برق رفتاری سے طے کیوں نہیں ہوتیں؟ اس کا جواب خدا کا قانونِ مکافاتِ عمل ہے۔ قانونِ مکافات کے معنی یہ ہیں کہ ہر باطل نظام کا انجام تباہی ہوتا ہے۔ اس کی بنیاد میں تخریب مضمر ہوتی ہے لیکن وہ رفتہ رفتہ اُس مقام کی طرف بڑھتا ہے۔ اس کی رفتار تو بڑی سُست ہوتی ہے، لیکن جب وہ آخری لمحہ آجاتا ہے تو وہ نظام اور وہ قوم، جو اس باطل نظام کی حامل ہوتی ہے، اس طرح تباہ و برباد ہوتے ہیں کہ ان کا نام و نشان تک باقی نہیں رہتا۔ قرآن اپنے اس دعویٰ کی صداقت کی شہادت میں اقوامِ سابقہ کے تاریخی شواہد پیش کرتا ہے اور کہتا ہے کہ تم ان سے خود اندازہ لگالو کہ باطل کے تخریبی نظام کا انجام کیا ہوا کرتا ہے۔ وہ قومِ ثمود کے متعلق کہتا ہے کہ اس کے سرغنوں نے زمین

باطل کا انجام

اور اس کی چراگاہوں اور چشموں پر اس طرح قبضہ جما رکھا تھا کہ غریبوں اور کمزوروں کے مویشی پانی پینے تک کو ترس جاتے تھے۔ انہیں بہتیرا سمجھایا لیکن وہ اپنی اس مستبدانہ روش سے باز نہ آئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ بِذَنْبِهِمْ فَسَوّٰهَا (۱۴/۹۱) خدا نے اپنے قانونِ مکافات کی رُو سے، ان کے جرائم کی بناء پر اُن پر اس طرح روڈ رولر (ROAD ROLLER) پھیر دیا کہ سب اونچ نیچ برابر ہوگئی۔ غریب اور امیر کا امتیاز مٹ گیا۔ طبقاتی تقسیم ختم ہوگئی۔ وہ، قومِ مدین کی داستان کے ضمن میں کہتا ہے کہ ان کی تجارت سراسر فریب کاری تھی۔ جس سے وہ غریبوں کو لُوٹتے تھے۔ جب وہ اس سے باز نہ آئے تو ان کی بستیاں اس طرح برباد ہوگئیں، كَأَنْ لَمْ يَغْنَوْا فِيهَا ط (۹۵/۱۱)، "گویا ان میں کبھی کوئی بسا ہی نہ تھا۔" وہ قومِ لوط کے انجام کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے، جَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا (۸۲/۱۱)، "اس کی بلندیاں، پستیوں میں بدل گئیں"۔ وہ ہر ظالم قوم کے انجام کے متعلق کہتا ہے، فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِينَ ظَلَمُوْا ط ... (۴۵/۶)، "ان کی جڑوں تک کٹ جاتی ہیں"۔

دوسری جگہ ہے، وَكَمْ أَهْلَكْنَا مِن قَرْيَةٍ بَطِرَتْ مَعِيشَتَهَا ۖ فَتِلْكَ مَسَاكِنُهُمْ لَمْ تُسْكَن مِّن بَعْدِهِمْ إِلَّا قَلِيلًا ط.... ○ (۲۸/۵۸) "کتنی ہی قومیں ایسی تھیں جنہیں رزق کی فراوانیاں حاصل تھیں، لیکن چونکہ تقسیم رزق کا نظام ظالمانہ تھا، اس لئے وہ تباہ و برباد ہو گئیں۔ یہ ہیں ان کے اُجڑے ہوئے کاشانے جن میں ان کے بعد کم ہی کوئی بسا ہے۔" ان کی بستیوں کے کھنڈرات ان کی بربادی کے نوحہ خواں ہیں۔ ایک آیت میں ان کی تباہی کی ایسی مثال دی ہے جس سے رُوح کانپ اُٹھتی ہے۔ کہا کہ وہ اپنی بربادیوں کو دیکھ کر چیختے چلاتے رہے۔ لیکن کوئی ان کی مدد کو نہ پہنچا۔ حَتَّىٰ جَعَلْنَاهُمْ حَصِيدًا خَامِدِينَ ○ (۲۱/۱۵) "تا آنکہ وہ قوم ایسی ہوگئی جیسے کٹا ہوا کھیت ہو، یا بجھا ہوا شعلہ"۔

فرمانِ خُدا

خدا کے قانونِ مکافات کی رُو سے باطل نظام کی حامل قوموں کا یہی انجام ہے، جسے اقبالؒ نے انتہائی اثر انگیز محاکاتی انداز میں فرشتوں کے نام، فرمانِ خداوندی کے عنوان سے پیش کیا ہے۔ کہا کہ خدا نے فرشتوں کی شکایت سُن کر کہا ؎

اُٹھو! میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو　　کاخِ اُمرا کے در و دیوار ہلا دو
گرماؤ غلاموں کا لہو سوزِ یقین سے　　کنجشکِ فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسّر نہیں روزی　　اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

کچھ عرصہ پہلے، کمیونسٹ نوجوان، "گھیراؤ۔ جلاؤ" کے اپنے تخریبی پروگرام کی تائید میں اقبالؒ کا یہ شعر گلی، کوچے کوچے گاتے پھرا کرتے تھے۔ اور کہا کرتے تھے کہ دیکھئے! اقبالؒ جیسا مفکر بھی جلانے، مٹانے کی تلقین کرتا ہے۔ انہیں کون بتاتا کہ اقبال جلانے مٹانے کی تلقین نہیں کرتا۔ وہ خدا کے قانونِ مکافات کی رُو سے باطل نظام کے انجام کا نقشہ کھینچتا ہے کہ جس قوم میں ظلم و استبداد اس حد تک پہنچ جاتے کہ کاشتکار سال بھر محنتِ شاقّہ سے اپنا لہو پسینہ ایک کر دے، لیکن اس کی فصل کو زمیندار اُٹھا کر اپنے گھر لے جائے، اسکا انجام یہ ہوتا ہے کہ جس فصل سے کاشتکار کے بچّوں کو محروم کیا گیا تھا، خود زمیندار اور اس کے بچّے بھی اس سے محروم رہ جایا کرتے ہیں۔ تباہی و بربادی کا ایسا بے پناہ سیلاب آتا ہے جو ان سب کو بہا کر لے جاتا ہے۔

مذہبی پیشوائیت کی پُرکاری

فرشتوں کے نام فرمانِ خداوندی کے ایک حصّے کو آپ دیکھ چکے۔ اس کے بعد اگلے حصّے میں اقبالؒ نے اس حقیقت پر سے پردہ اُٹھایا ہے کہ ملوکیت اور سرمایہ داری کا نظام مذہبی پیشواؤں کی خدا فریبیوں کے بل بوتے پر قائم ہوتا ہے۔ جا بجا

حکمران اور خون آشام سرمایہ دار، غریبوں اور کمزوروں کو کچلتے چلے جاتے ہیں، اور مذہبی راہنما انہیں تھپکیاں دے دے کر سلاتے رہتے ہیں کہ یہ سب خدا کی مرضی کے مطابق ہوتا ہے۔ حکومت اور دولت خدا نے اپنے ہاتھ میں رکھے ہیں وہ جسے چاہے امیر بنادے اور جسے چاہے فقیر کر دے۔ خدا کی مرضی کے خلاف لب کشائی کرنا تو ایک طرف، دل میں بھی اس کے خلاف احساسِ شکایت پیدا نہیں ہونا چاہیئے۔ انسان کو راضی برضا رہنا چاہیئے۔ ان حاکموں اور سرمایہ داروں کو اس دنیا میں یہ کچھ مل رہا ہے، تمہیں آخرت میں جنّت عطا ہوگی۔ وہ اپنے اس قسم کے سحر کار وعظوں اور سامراجی نصیحتوں سے غریبوں اور مظلوموں کو افیون پلاتے رہتے ہیں۔ مستبد نظامِ ملوکیت اور خون آشام نظامِ سرمایہ داری کو مٹانے کے لئے ضروری ہے کہ مذہبی پیشوائیت کو ختم کیا جائے۔ اس لئے فرشتوں کے نام فرمانِ خداوندی میں کہا گیا ہے:

کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے — پیرانِ کلیسا کو کلیسا سے ہٹا دو
"حق را بسجودے صنماں را بطوافے" — بہتر ہے چراغِ حرم و دیر بجھا دو
میں ناخوش و بیزار ہوں مرمر کی سلوں سے — میرے لئے مٹی کا حرم اور بنا دو

آپ اقبالؒ کے پیغام کو شروع سے آخر تک دیکھ جائیے، وہ آمریت اور سرمایہ داری کے ساتھ مذہبی پیشوائیت کو بھی انسانیت کے لئے باعثِ عذاب قرار دیتا ہے۔ وہ اُمت کی تباہی کے اسباب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے:

چار مرگ اندر پئے ایں دیر میر — سُود خوار و والی و مُلّا و پیر

دوسرے مقام پر کہا ہے:

باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری — اے کشتۂ سلطانی و مُلّائی و پیری

اصل یہ ہے کہ ملوکیت کا استبداد اور سرمایہ داری کا استحصال پنپتا ہی مذہبی پیشوائیت کی مقدس سحر کاریوں کے بل بوتے پر ہے۔

نظامِ زمینداری

اقبالؒ نظامِ سرمایہ داری کو کاروباری طبقہ تک محدود نہیں رکھتا۔ وہ نظامِ زمینداری کو بھی اس کا جزو قرار دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے زمین کے متعلق فرمایا کہ وہ تمام نوعِ انسان کے لئے ذریعۂ رزق ہے۔ اس لئے اسے تمام افرادِ انسانیہ کے لئے یکساں کھلا رہنا

چاہیئے۔ اس پر کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی۔ قرآن کریم میں متعدد مقامات پر اس بنیادی حقیقت کی وضاحت کی گئی ہے۔ میں یہاں اس کے صرف ایک مقام پر اکتفا کروں گا۔ سورۃ واقعہ کی چند آیات میں اسے بڑے دلکش انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ اُس نے کہا ہے:۔

"تم ذرا اس نظام پر غور کرو جس کے مطابق تمہاری پرورش اور نشو و نما ہوتی ہے۔ اور سوچو کہ یہ سب کچھ قانونِ خداوندی کے مطابق ہوتا ہے یا تمہارے کسب و ہنر کی رُو سے۔ مثلاً تم جو کھیتی باڑی کرتے ہو تو غور کرو کہ اس میں تمہارا عمل دخل کتنا ہوتا ہے، اور ہمارا قانون کیا کچھ کرتا ہے؟ تم زمین میں ہل چلا کر اس میں بیج ڈال دیتے ہو۔ اب بتاؤ کہ اس بیج سے فصل کون اگاتا ہے؟ ایسا تم کرتے ہو یا ہمارے قانون کی رُو سے ہوتا ہے؟" أَفَرَءَيْتُم مَّا تَحْرُثُونَ ۝ ءَأَنتُمْ تَزْرَعُونَهُۥٓ أَمْ نَحْنُ ٱلزَّٰرِعُونَ ۝ (۵۶/۶۳-۶۴)

اس کے بعد کہا کہ تم اس پانی پر غور کرو جس پر تمہاری کھیتی کا ہی نہیں، خود تمہاری زندگی کا دار و مدار ہے۔ کیا اسے بادلوں سے تم برساتے ہو یا ہمارا قانونِ ربوبیت ایسا کرتا ہے؟" (۵۶/۶۸-۶۹)

اس کے بعد کہا کہ تم اس آگ (حرارت) پر غور کرو جس سے تم اتنے کام لیتے ہو۔ کہو کہ سبز درختوں کی شاخوں سے حرارت کو یوں مستور کر دینا، تمہاری کارگیری ہے یا ہمارا قانون ایسا کرتا ہے"۔ أَفَرَءَيْتُمُ ٱلنَّارَ ٱلَّتِى تُورُونَ ۝ ءَأَنتُمْ أَنشَأْتُمْ شَجَرَتَهَآ أَمْ نَحْنُ ٱلْمُنشِـُٔونَ (۵۶/۷۱-۷۲)

ان حقائق کے بیان کرنے کے بعد کہا کہ رزق پیدا کرنے کی اس تمام کائناتی مشینری پر غور کرو کہ اس میں تمہارا حصّہ کس قدر ہے اور نظامِ خداوندی کا کس قدر! تم کسی نہج سے بھی غور کرو، بہرحال اس نتیجے پر پہنچو گے کہ اس کاروبار میں تم صرف محنت کرتے ہو۔ باقی سب کچھ خدا کا نظام کرتا ہے۔ لہٰذا اس کے ماحصل میں تمہارا حصّہ صرف تمہاری محنت کے بقدر ہو سکتا ہے۔ تم پورے کے پورے کے مالک نہیں بن سکتے۔ تم اپنی محنت کا معاوضہ اپنے سامانِ پرورش کی صورت میں اپنے پاس رکھ لو۔ اور ہمارا حصّہ ہمیں دے دو۔ سوال پیدا ہوا کہ آپ کا حصّہ آپ تک کیسے پہنچائیں؟ جواب دیا مَتَٰعًا لِّلْمُقْوِينَ ۝ (۵۶/۷۳) "یہ انہیں دے دو جو اپنا رزق پیدا کرنے سے معذور ہیں"۔ ان تک پہنچ گیا تو سمجھ لو کہ ہم تک پہنچ گیا۔

اقبالؒ نے اس پورے تذکرہ کو بالِ جبریل کی اس نظم میں بڑی برجستگی سے بیان کیا ہے، جس کا عنوان ہے:۔

الارض للہ !

اور نظم یہ ہے !

پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون ؟ کون دریاؤں کی موجوں سے اٹھاتا ہے سحاب ؟
کون لایا کھینچ کر پچھم سے باد سازگار ؟ خاک یہ کس کی ہے، کس کا ہے یہ نورِ آفتاب ؟
کس نے بھر دی موتیوں سے خوشۂ گندم کی جیب ؟ موسموں کو کس نے سکھلائی ہے خوئے انقلاب ؟

دہ خدایا یہ زمیں تیری نہیں، تیری نہیں!
تیرے آباء کی نہیں، تیری نہیں، میری نہیں ! (بالِ جبریل صفحہ ۱۶۱)

ظاہر ہے کہ جب زمین کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی، تو نہ کوئی شخص زمیندار ہو سکتا ہے، نہ اس کا کوئی مزارع جسے زمین بٹائی یا پٹہ پر دی جائے۔ اس باب میں حضور نبی اکرمؐ کا ایک فیصلہ حقیقت ثابتہ ہے۔ صحاح ستہ کے ایک مجموعہ، ابوداؤد، میں حضرت ابن ابی نعیمؓ کی ایک روایت ہے کہ :-

مزارعت

"رافع بن خدیجؓ نے ایک زمین کاشت کی۔ وہ اسے پانی دے رہے تھے کہ حضورؐ کا گذر اس طرف سے ہوا۔ آپ نے دریافت فرمایا کہ یہ زمین کس کی ہے اور کھیتی کس کی؟ رافعؓ نے کہا کہ یہ کھیتی میرے بیج اور میری محنت کا نتیجہ ہے۔ اس کا ایک حصہ میرا ہوگا اور ایک حصہ فلاں خاندان کا جس کی یہ زمین ہے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ تم دونوں سودی کاروبار کر رہے ہو۔ زمین صاحب زمین کو واپس کر دو اور اپنا خرچہ اس سے وصول کر لو۔"

(شاہکارِ رسالت صفحہ ۲۸۲)

ربٰو کا مفہوم

یہاں حضورؐ نے فرمایا کہ مزارعت بھی سودی کاروبار یعنی ربٰوا ہے۔ اسلام کے معاشی نظام کے سمجھنے کے لئے نہایت ضروری ہے کہ یہ سمجھ لیا جائے کہ ربٰو کسے کہتے ہیں۔ زمانۂ نزول میں قرآن میں عربوں میں "سرمایہ داری" کی اصطلاح رائج نہیں تھی۔ اس کی بجائے ربٰو کی اصطلاح عام تھی۔ اس لئے یوں سمجھئے کہ ربٰو سے مُراد نظام سرمایہ داری ہے۔ قرآن کریم کی بنیادی تعلیم یہ ہے کہ لَيْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ (۵۳/۳۹) "معاوضہ محنت کا ہے"۔ اس کے برعکس نظام سرمایہ داری میں معاوضہ سرمایہ (CAPITAL یعنی روپے) کا ہوتا ہے۔ لہٰذا، اسلامی نظام اور نظام سرمایہ داری ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ آپ نے کبھی اس پر بھی غور فرمایا کہ قرآن کریم میں مختلف جرائم کی سزائیں مذکور ہیں۔ لیکن ربٰو کے

متعلق کہا ہے کہ اگر تم اس سے باز نہ آئے تو، فَأْذَنُوا بِحَرْبٍ مِّنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ... (۲/۲۷۹) "اسے خدا اور رسول کی طرف سے اپنے خلاف اعلانِ جنگ سمجھو"۔ بالفاظِ دیگر، قرآن کی رُو سے ربٰو اسلامی مملکت کے خلاف بغاوت ہے۔ یعنی جس طرح اسلام اور نظامِ ملوکیت یکجا نہیں ہو سکتے، اس طرح اسلام اور نظامِ سرمایہ داری بھی یکجا نہیں رہ سکتے۔ جب کہا کہ تم اس سے باز آجاؤ، تو اس کی تشریح یہ کہہ کر کر دی۔ فَلَكُمْ رُءُوسُ أَمْوَالِكُمْ... (۲/۲۷۹) "تم صرف اپنا اصل زر واپس لے سکتے ہو، اس سے ایک پیسہ بھی زائد نہیں لے سکتے کہ وہ ربٰو ہوگا" اس سے واضح ہے کہ قرآن کریم کی رُو سے:۔

۱۔ اسلام اور نظامِ سرمایہ داری ایک دوسرے کی ضد ہیں۔

۲۔ نظامِ سرمایہ داری کے معنی ہیں، محنت کا نہیں بلکہ سرمایہ کا معاوضہ لینا، خواہ وہ کسی شکل میں ہو۔ زمانۂ نزولِ قرآن میں ربٰو کی تین شکلیں رائج تھیں:۔

(i) دست بدست (ذاتی) قرضوں پر سُود۔ قرآن کریم نے یہ کہہ کر اسے ختم کر دیا کہ تم صرف اپنا اصل زر واپس لے سکتے ہو۔ اس سے ایک پیسہ بھی زائد نہیں۔ حتیٰ کہ اگر مقروض تنگدست ہو تو اصل زر بھی چھوڑ دو تو بہتر ہے۔ (۲/۲۸۰)

(ii) زمین کو بٹائی یا پٹہ پر دینا۔ پہلے اسے ربٰو قرار دے کر ناجائز ٹھہرا دیا اور جب زمین مملکت کی تحویل میں لے لی گئی تو اس قسم کی کوئی شکل باقی نہ رہی۔

(iii) عرب، بالخصوص قریش، تجارت پیشہ بھی تھے، اور لوگ دوسروں کے کاروبار میں روپیہ لگا کر، نفع میں شریک ہو جاتے تھے۔ قرآن کریم نے اسے بھی ربٰو قرار دے دیا۔ فرمایا:۔

مضاربت

وَمَا آتَيْتُم مِّن رِّبًا لِّيَرْبُوَ فِي أَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا يَرْبُو عِندَ اللَّهِ... (۳۰/۳۹)

"جو روپیہ تم دوسروں کے مال میں شامل کر دیتے ہو کہ وہ بڑھتا رہے، تو یہ ربٰو ہے، جو اللہ کے نزدیک نہیں بڑھتا۔"

اس طرح مضاربت یا مشارکت کو بھی ختم کر دیا۔ المختصر اس نے حَرَّمَ الرِّبَا (۲/۲۷۵) کہہ کر ربٰو کی ہر شکل کو حرام قرار دے دیا۔ اور اس جرم کی سنگینی کو یہ کہہ کر واضح کر دیا کہ اس کے مرتکب اور کفار ایک ہی

جہنم میں اکٹھے ہوں گے۔ (۱۴۰/۴)

اس طرح اس معاشرہ میں رزق، کریم اور طیب ہوگیا۔ یعنی قرآن کی رُو سے وہی رزق کریم اور طیب ہے جسے اپنی محنت سے حاصل کیا جائے۔ (جو محنت کرنے سے معذور ہو اس کے رزق کی ذمہ داری مملکت کے سر پہ ہوگی) ربٰو کے ذریعے رزق حاصل کرنے والا چونکہ محنت نہیں کرتا، اس لئے اس کے قوائے عملیہ مفلوج ہو جاتے ہیں، اور آہستہ آہستہ اس میں محنت کرنے کی صلاحیت اور استعداد ہی نہیں رہتی۔ یہی وہ رزق ہے جس کے متعلق اقبالؒ نے کہا ہے۔

اے طائرِ لاہوتی اس رزق سے موت اچھی   جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

محنت کر کے کمانے کی صلاحیت، ربٰو سے، مفلوج ہو جاتی ہے اور ہوسِ زر اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ وہ ہر وقت مضطرب و بیقرار ادھر اُدھر مارے مارے پھرا رہتا ہے۔

كَمَا يَقُومُ الَّذِي يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطَٰنُ مِنَ الْمَسِّ (۲/۲۷۵) "جیسے اسے سانپ نے ڈس لیا ہو"۔

یہ تھا دورِ محمد رسول اللہ وَالَّذِينَ مَعَهُ کی اسلامی مملکت کا نظام، جس میں کوئی شخص رات کو بھوکا نہیں سوتا تھا، اور ہر فرد کو رزقِ حلال میسر تھا، یعنی عزت کی روٹی۔

دورِ ملوکیت

اس کے بعد ہمارا دورِ ملوکیت آگیا، اور جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، اس کے ساتھ ہی نظامِ سرمایہ داری اور نظامِ مذہبی پیشوائیت بھی در آیا اور چونکہ خود مملکت غیر اسلامی تھی، اس لئے وہ سب کچھ جسے قرآن نے ناجائز اور حرام قرار دیا تھا، جائز اور حلال قرار پاگیا۔ صرف اس کا نام بدل گیا۔ اس کے لئے مذہبی پیشوائیت نے جواز کی راہیں ہموار کر دیں۔ قرآن مجید نے دولت جمع کرنے والوں کے لئے عذابِ جہنم کی وعید سنائی تھی، یہ تہدید اس شدت اور تکرار سے آئی تھی کہ ان آیات کی تنسیخ تو کجا، تاویل تک ممکن نہ تھی۔ اس کے جواز کی ایک اور راہ تراشی گئی۔ قرآن کریم میں ہے:۔

وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ اللَّهِ

فَبَشِّرْهُم بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ۝ يَوْمَ يُحْمَىٰ عَلَيْهَا فِي نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوَىٰ بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوبُهُمْ وَظُهُورُهُمْ ۖ هَٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِأَنفُسِكُمْ فَذُوقُوا مَا كُنتُمْ تَكْنِزُونَ (۹/۳۴-۳۵)

"جو لوگ سونا چاندی (مال و دولت) جمع کرتے ہیں، اور انہیں اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے لئے کھلا نہیں رکھتے۔ اے رسولؐ! تو انہیں الم انگیز عذاب کی "بشارت" سنا دے، یہ عذاب اس دن واقعہ ہو گا جب سونے چاندی کے ان جمع کردہ سکوں کو دوزخ کی آگ میں تپایا جائے گا، اور ان سے ان کی پیشانیوں، پہلوؤں اور پیٹھوں کو داغا جائے گا، پھر ان سے کہا جائے گا کہ یہ وہ دولت ہے جسے تم نے اپنے مفاد کے لئے جمع کر رکھا تھا۔ سو اب اس جمع شدہ دولت کے لائے ہوئے عذاب کا مزہ چکھو۔"

زکوٰۃ کی وضعی روایات

بات کس قدر صاف اور نکھری ہوئی ہے۔ اب وہ روایت ملاحظہ فرمائیے جسے نظام سرمایہ داری کے جائز قرار دینے کے لئے وضع کیا گیا ہے۔

(حضرت) ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ جس وقت یہ آیت نازل ہوئی (وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ ...) تو مسلمانوں پر اس کا خاص اثر ہؤا۔ یعنی انہوں نے اس حکم کو گراں خیال کیا۔ حضرت عمرؓ نے لوگوں سے کہا کہ میں تمہاری اس فکر کو دُور کر دوں گا۔ پس عمرؓ رسولؐ اللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا۔ یا نبیؐ اللہ! یہ آیت آپؐ کے صحابہؓ پر گراں گذری ہے۔[1] آپ نے فرمایا کہ خداوند تعالیٰ نے زکوٰۃ اس لئے فرض کی ہے کہ وہ تمہارے باقی مال کو پاک کر دے .... ابن عباسؓ کہتے ہیں حضورؐ کا یہ بیان سُن کر عمرؓ نے جوشِ مسرت سے اللہ اکبر کہا".... (ابوداؤد۔ بحوالہ مشکوٰۃ۔ کتاب الزکوٰۃ)

لیجئے! ایک وضعی روایت کی رُو سے، اکتناز زر شیرِ مادر کی طرح حلال قرار پا گیا اور اس طرح نظام سرمایہ داری کے لئے پھاٹک کُھل گئے۔

زمین پر ذاتی ملکیت تسلیم کر لی گئی، اور اس طرح بٹائی یا پٹّہ کو عین مطابق اسلام قرار دے دیا۔ فقط اس کا نام مزارعت رکھ دیا۔

کسی کے کاروبار میں روپیہ لگا کر منافع میں شریک ہو گئے۔ اس کا نام مضاربت رکھ دیا، جو حلال و طیّب ہے۔ قرآنی آیت کے الفاظ اپنی جگہ برقرار اور محفوظ رہے اور وضعی روایات اور ان پر مبنی فقہ کی رُو سے وہ سب جائز پا گیا جسے ان آیات نے ناجائز و حرام قرار دیا تھا۔ اقبالؒ نے اس صورتِ حالات پر اک

---

[1] خدا کا حکم، رسولؐ اللہ کی لسانِ مبارک سے، اور صحابہؓ پر گراں گذرے۔ (معاذ اللہ)

آہ جگر سوز کیساتھ کہا ہے :-

احکام تیرے حق ہیں مگر اپنے مفسر تاویل سے قرآں کو بنا سکتے ہیں پاژند

اس کے بعد وہ سلطنتیں ختم ہو گئیں جن کے عہد اقتدار میں یہ تبدیلیاں ہوئی تھیں، ان کے ملکی آئین و قوانین نسیاً منسیا ہو گئے۔ ان کے معاشرہ کے خط و خال مٹ گئے۔ لیکن مذہبی پیشوائیت کی قرآنی تحریفات جنہیں شرعی قوانین کا نام دیا گیا تھا، بدستور آگے بڑھتی گئیں اور رفتہ رفتہ عین اسلام بن گئیں۔ اس پر صدیاں گذر گئیں، اور آج تک ——— ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دین ——— عصر حاضر میں زمانہ کے تقاضوں سے سرمایہ داری کے قصر کہن میں کچھ تزلزل کے آثار نمودار ہونے شروع ہوئے تو علامہ اقبالؒ کی کچھ ڈھارس بندھی کہ یہ کابوس سینۂ انسانیت سے اتر گیا تو قرآن کے معاشی نظام کے لئے راہ ہموار ہو جائیگی یہی وہ احساسات تھے جن سے کیف اندوز ہو کر انہوں نے اپنی مشہور مثنوی۔ ساقی نامہ۔ میں جھوم جھوم کر کہا تھا :-

زمانے کے انداز بدلے گئے نیا راگ ہے ساز بدلے گئے
پرانی سیاست گری خوار ہے زمیں میر و سلطاں سے بیزار ہے
گیا دور سرمایہ داری گیا
تماشہ دکھا کر مداری گیا

عجمی اسلام

لیکن ان وجد آفرینیوں میں جب ان کی نگاہ ملت اسلامیہ پر پڑی تو اُن کی امیدیں مایوسیوں میں بدل گئیں۔ انہوں نے بصد حسرت و یاس، انتہائی غم و الم کے عالم میں کہا :-

مسلماں ہے توحید میں گرم جوش مگر دل ابھی تک ہے زنار پوش
تمدن تصوف، شریعت، کلام بتانِ عجم کے پجاری تمام
حقیقت خرافات میں کھو گئی یہ امت روایات میں کھو گئی
بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے
مسلماں نہیں، راکھ کا ڈھیر ہے

ہماری مذہبی پیشوائیت کے نزدیک سب سے بڑا جہاد یہ قرار دیا گیا کہ جہاں کسی نے سرمایہ داری کے

خلاف ایک لفظ بھی کہا، انہوں نے اسے کمیونسٹ قرار دے کر، کفر و الحاد کے فتووں سے نواز دیا۔ مغرب کی سرمایہ پرستانہ اقوام کے لئے ان کا یہ اسلام بڑا سازگار تھا۔ انہوں نے آگے بڑھ کر ان کی ہمت افزائی کی اور دامے، درمے، قدمے، قلمے اس اسلام کے فروغ کے لئے ہر ممکن کوشش کی۔ انہی اقوام کے نمائندۂ ابلیس کے مشیروں نے کہا تھا کہ:-

یہ ہماری سعیٔ پیہم کی کرامت ہے کہ آج　　صوفی و مُلّا، ملوکیت کے بندے ہیں تمام
ہے طواف و حج کا ہنگامہ اگر باقی تو کیا　　کُند ہو کر رہ گئی مومن کی تیغ بے نیام

اور خود ابلیس نے یہ کہہ کر، انہیں اطمینان دلایا تھا:-

جانتا ہوں میں یہ اُمّت حامل قرآں نہیں　　ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دین
جانتا ہوں میں کہ مشرق کی اندھیری رات میں　　بے ید بیضا ہے پیران حرم کی آستین

(ابلیس کی مجلس شوریٰ)

آپ کو یاد ہوگا کہ روس کے بڑھتے ہوئے خطرہ کی روک تھام کے لئے، امریکہ نے مسلمانانِ عالم کو مخاطب کر کے کہا تھا:-

"دنیا کے خدا پرستو! آؤ۔ ہم متحد ہو کر اس الحاد اور بے دینی کا مقابلہ کریں"

امریکہ اور مودودی مرحوم

ہماری مذہبی پیشوائیت کی طرف سے اس دعوت پر لبیک کس طرح کہا گیا اس کا اندازہ اس خبر سے لگایئے جو روزنامہ امروز (لاہور) کی یکم دسمبر ۱۹۵۲ء کی اشاعت میں شائع ہوئی تھی۔ اس میں کہا گیا تھا:-

"امریکن سفارت خانہ کے پروفیسر، ڈاکٹر ویلر نے گورنمنٹ کالج میانوالی کے طلباء کو لیکچر دیئے جن میں کمیونزم کی مخالفت کی۔ ان کے ساتھ جماعت اسلامی، لاہور، کے راہنما بھی تھے۔ اور مقامی امیر، مولانا گلزار احمد بھی"

(بحوالہ امروز۔ یکم دسمبر ۱۹۷۶ء)

اس کے بعد جب ۱۹۵۵ء میں حکومت پاکستان نے امریکہ کے ساتھ اپنے روابط قائم کرنے کا فیصلہ کیا تو (مرحوم) مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے کراچی اور لاہور میں پبلک جلسوں میں تقریر کرتے ہوئے کھلے الفاظ میں کہا:-

" اگر یہ (امریکن) بلاک فی الواقعہ چاہتا ہے کہ کمیونزم کی روک تھام کے لئے اسے مسلم عوام کا دلی تعاون حاصل ہو تو اسے اپنی پالیسی میں بنیادی تغیر کرنا پڑے گا۔ اسے یہ فیصلہ کرنا ہو گا کہ اسے مسلم بلاک کے حکمرانوں سے ساز باز کرنا ہے یا مسلم ممالک کے عوام کا تعاون حاصل کرنا ہے۔ یہ اس کے سوچنے کا کام ہے کہ اسے کون سی راہ اختیار کرنی چاہیئے۔ اسے حکمرانوں کی ضرورت ہے جو عوام پر سطحی اثر بھی نہیں رکھتے یا عوام کے تعاون کی ضرورت ہے جو طاقت کا اصلی سرچشمہ ہوتے ہیں..... مسلمان ملکوں کے ساتھ آپ کی جو پالیسی اب تک چلی آ رہی ہے وہ ایسی ہرگز نہیں ہے کہ پاکستان اور دوسرے ممالک کے عوام کا دلی تعاون آپ کو حاصل ہو۔"

(جماعت اسلامی کا ترجمان اخبار تسنیم بابت ۱۶، ۲۰ دسمبر ۱۹۵۵ء)

ان روابط کا تو ہمیں علم نہیں کہ یہ قائم ہوئے یا نہیں اور اگر ہوئے تو ان کی نوعیت کیا تھی، البتہ

مودودی مرحوم اور نظامِ سرمایہ داری

جو معاشی نظام (مرحوم) مودودی صاحب نے پیش کیا وہ خالص سرمایہ دارانہ تھا۔ اسے انہوں نے اپنی کتاب "مسئلہ ملکیتِ زمین" میں تفصیل سے پیش کیا تھا۔ اس کے دو ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیے:-

" اسلام نے کسی نوع کی ملکیت پر بھی مقدار اور کمیت کے لحاظ سے کوئی حد نہیں لگائی۔ جائز ذرائع سے جائز چیزوں کی ملکیت جب کہ اس سے تعلق رکھنے والے شرعی حقوق و واجبات ادا کئے جاتے رہیں، بلا حدّ و نہایت رکھی جا سکتی ہیں۔ روپیہ، پیسہ، جانور، استعمالی اشیاء مکانات، سواری، غرض کسی چیز کے معاملہ میں بھی قانوناً ملکیت کی مقدار پر کوئی حد نہیں۔ پھر آخر تنہا زرعی جائیداد میں وہ کون سی خصوصیت ہے جس کی بناء پر صرف اس کے معاملہ میں شریعت کا میلان یہ ہو کہ اس کے حقوقِ ملکیت کو مقدار کے لحاظ سے محدود کر دیا جائے۔ یا انتفاع کے مواقع سلب کر کے ایک حدِ خاص سے زائد ملکیت کو آدمی کے لئے بے کار کر دیا جائے۔"

(مسئلہ ملکیتِ زمین۔ پہلا ایڈیشن ۱۹۵۰ء، صہ ۵۲-۵۳)

آگے چل کر اس کی وضاحت ان الفاظ میں کی گئی ہے:-

" آخری چیز جو مسلمان مصلحین کی نگاہ میں رہنی ضروری ہے یہ ہے کہ اسلام کے حدود میں رہتے ہوئے ہم کسی نوع کی جائز ملکیتوں پر نہ تو تعداد یا مقدار کے لحاظ سے کوئی پابندی عائد کر سکتے ہیں

اور نہ ایسی من مانی قیود لگا سکتے ہیں جو شریعت کے دیئے ہوئے جائز حقوق کو عملاً سلب کر دینے والی ہوں۔ اسلام جس چیز کا آدمی کو پابند کرتا ہے وہ یہ ہے کہ اس کے پاس جو کچھ مال آئے جائز راستے سے آئے۔ جائز طریقے پر استعمال ہو۔ جائز راستوں میں جائے۔ اور خدا اور بندوں کے جو حقوق اس پر عائد کئے گئے ہیں وہ اس میں سے ادا کر دیئے جائیں اس کے بعد جسطرح وہ ہم سے یہ نہیں کہتا کہ تم زیادہ سے زیادہ اتنا روپیہ، اتنے مکان، اتنا تجارتی کاروبار، اتنا صنعتی کاروبار، اتنے مویشی، اتنی موٹریں، اتنی کشتیاں اور اتنی فلاں چیز اور اتنی فلاں چیز رکھ سکتے ہو، اسی طرح وہ ہم سے یہ بھی نہیں کہتا کہ تم زیادہ سے زیادہ اتنے ایکڑ زمین کے مالک ہو سکتے ہو۔ پھر جسطرح وہ ہم سے یہ نہیں کہتا کہ تم صرف اسی تجارت یا صنعت یا دوسرے کاروبار کے مالک ہو سکتے ہو جسے تم براہِ راست خود کرو اور جسطرح اس نے دنیا کے کسی دوسرے معاملہ میں ہم پر یہ قید نہیں لگائی ہے کہ تم کسی ایسے کام پر حقوقِ ملکیت نہیں رکھ سکتے ہو جس کو تم اُجرت پر یا شرکت کے طریقے پر دوسروں کے ذریعے سے کر رہے ہو، اسی طرح وہ یہ بھی نہیں کہتا کہ زمین کا مالک بھی وہی ہو سکتا ہے جو اس میں خود کاشت کرے اور یہ کہ اُجرت یا شراکت پر کاشت کرانے والوں کو سرے سے زمین پر حقوقِ ملکیت حاصل ہی نہیں ہیں۔ اس قسم کی قانون سازیاں خود مختار لوگ تو کر سکتے ہیں۔ مگر جو خدا اور رسولؐ کے مطیع فرمان ہیں وہ ایسی باتیں سوچ بھی نہیں سکتے۔" (ایضاً ۳ - ۷۲)

مودودی مرحوم اور نظامِ سرمایہ داری

صدرِ پاکستان نے بھی بھارت کے جریدہ "سنڈے" کو ایک انٹرویو کے دوران فرمایا تھا کہ:۔

"اسلام کی رُو سے ایک شخص جسقدر جی چاہے دولت جمع کر سکتا ہے۔ بس اس پر اسے ٹیکس ادا کرنا ہو گا۔" (طلوعِ اسلام اگست ۱۹۸۴ء صفحہ ۱۶)

اس سے کچھ عرصہ پہلے انہوں نے پنجاب زکوٰۃ کنونشن میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا تھا:۔

"بعض لوگ کہتے ہیں کہ اسلام مساوات کا دین ہے اس لئے فضل الحق کے پاس بھی سو روپے ہونے چاہئیں، ضیاء الحق صاحب کے پاس بھی سو روپے ہونے چاہئیں۔ میں آپ سے کہتا ہوں کہ آپ قرآن کی طرف توجہ دیجئے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے اور ہمارا یہ دین ایمان ہے

کہ اسلام کی روح قرآن اور سنتِ رسولؐ میں ہے تو آپ یہ بتایئے کہ اگر مساوات کا مسئلہ قرآن کے نظریہ کے اندر یہ ہوتا کہ کوئی غریب نہیں ہوگا۔ کوئی مسکین نہیں ہوگا تو پھر قرآن میں اسکا ذکر کیوں آیا ہے۔ یہ آپ کے سوچنے کی بات ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مخیّر حضرات سے کہا ہے کہ اپنے اموال میں سے ایک مقررہ رقم[1] ان لوگوں کو دیں جو اس کے مستحق ہیں۔"

(الاعتصام ۹ جولائی ۱۹۸۲ء)

ہمارے دورِ ملوکیت کا وضع کردہ یہ اسلام، حضرت علامہؒ کے سامنے تھا۔ انہوں نے اس کا علاج یہ سوچا کہ ایک خطۂ زمین حاصل کیا جائے جس میں ایسا قرآنی نظام متشکل ہو سکے جس میں حکمرانی

اقبالؒ کی انقلاب آفرینی

صرف کتاب اللہ کی ہو اور اس طرح اُمّت ملوکیت، آمریت، سرمایہ داری اور تھیا کریسی کی زنجیروں سے آزاد ہو جائے اس کے لئے انہوں نے ۱۹۳۰ء میں پاکستان کا تصور پیش کیا۔ اس تصور کو پیش کرنے کے بعد وہ برابر پکارتے رہے کہ :-

سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی، باقی بتانِ آذری

اَلْاَرْضُ لِلّٰہِ کے انقلابی نعرہ سے وہ نظامِ زمینداری کے قصرِ تعیش میں تزلزل پیدا کرتے رہے۔ وہ سرمایہ داروں کو براہِ راست مخاطب کر کے کہتے رہے کہ :-

کارخانے کا ہے مالک مردکِ ناکردہ کار
عیش کا پُتلا ہے، محنت ہے اسے ناساز گار

حکمِ حق ہے لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی
کھائے کیوں مزدور کی محنت کا پھل سرمایہ دار

(بانگِ درا صفحہ ۳۲۵)

سرمایہ داروں کو وارننگ

جب زمامِ تحریکِ پاکستان، قائدِاعظمؒ کے ہاتھ میں آئی، تو انہوں نے بھی زمینداروں اور سرمایہ داروں کو للکار کر کہہ دیا کہ پاکستان میں ان کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہوگی۔ انہوں نے آل انڈیا مسلم لیگ کے سیشن واقعہ دہلی

---

[1] خدا نے کہیں ایسا نہیں فرمایا۔

۱۹۴۲ء میں پوری شدت کے ساتھ کہا :۔

"اس مقام پر زمینداروں اور سرمایہ داروں کو بھی متنبہ کرنا چاہتا ہوں۔ وہ ایک ایسے فتنہ انگیز ابلیسی نظام کی رُو سے، جو انسان کو ایسا بدمست کر دیتا ہے کہ وہ کسی معقول بات کے سننے کے لئے آمادہ ہی نہیں ہوتا، عوام کے گاڑھے پسینے کی کمائی پر رنگ رلیاں مناتے ہیں۔ عوام کی محنت کو غصب کر لینے کا جذبہ اُن کے رگ و پے میں سرایت کر چکا ہے۔ میں اکثر دیہات میں گیا ہوں، وہاں میں نے دیکھا ہے کہ لاکھوں خدا کے بندے ہیں جنہیں ایک وقت بھی پیٹ بھر کر روٹی نہیں ملتی۔ کیا اس کا نام تہذیب ہے؟ کیا یہی پاکستان کا مقصد ہے؟ اگر پاکستان سے یہی مقصود ہے تو میں ایسے پاکستان سے باز آیا۔ اگر ان سرمایہ داروں کے دماغ میں ہوش کی ذرا سی بھی رمق باقی ہے تو انہیں زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے ساتھ چلنا ہوگا۔ اگر انہوں نے ایسا نہ کیا تو ان کا خدا حافظ، ہم ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتے"!

پاکستان میں

آمریت، سرمایہ داری اور مذہبی پیشوائیت کے خلاف ان انقلاب آفریں غلغلوں اور طنطنوں کے ساتھ پاکستان وجود میں آیا۔ لیکن قوم کی بدقسمتی کہ جب یہ ذرا اُبھرا تو اُس وقت نہ وہ مفکرِ اعظم (اقبالؒ) موجود تھا، نہ قائدِ اعظمؒ اور (اقبالؒ کے الفاظ میں) شاہین کا یہ نشیمن، زاغوں کے تصرف میں چلا گیا۔ یہاں آمریت، مذہبی پیشوائیت اور نظامِ سرمایہ داری کے عفاریت نے ہجوم کر کے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا، اور ربٰو کا طوفان بالخصوص، سیلاب کی طرح اُمنڈ آیا۔

قرآن کریم نے قارون کو، نظامِ سرمایہ داری کے نمائندہ کی حیثیت سے متعارف کرایا ہے۔ وہ یہودی تھا، اور یہودی اسی نظام کے سہارے زندہ چلے آرہے ہیں۔ ان کی مملکت چھن گئی۔ حکومت باقی نہ رہی۔ کوئی وطن نہ رہا۔ وہ دنیا میں خانماں خراب صحرانوردوں کی طرح سرگرداں پھرتے رہے۔ ایں سوماندہ واں سو درماندہ لیکن انہوں نے اپنے نظامِ سرمایہ داری کو اس قدر محکم بنیادوں پر استوار رکھا کہ دنیا کی بڑی بڑی مملکتیں ان کی دست نگر ہیں، اور اس حد تک کہ ان کی سیاست بھی انہی کے اشاروں پر چلتی ہے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں ـــ "فرنگ کی رگِ جاں، پنجۂ یہود میں ہے"۔ انہوں نے اس سے بھی واضح تر الفاظ میں کہا تھا کہ :۔

یہودی نظامِ بینکاری

تاک میں بیٹھے ہیں مدت سے یہودی سود خوار | جن کی روباہی کے آگے، ہیچ ہے زورِ پلنگ
خود بخود گرنے کو ہے پکے ہوئے پھل کی طرح | دیکھئے پڑتا ہے آخر کس کی جھولی میں فرنگ

یہودیوں نے ساری دنیا میں بنکوں کا جال بچھا رکھا ہے۔ بنکوں کے متعلق عام طور پر یہی سمجھا جاتا ہے کہ وہ روپیہ محفوظ رکھنے کا ذریعہ ہیں، لیکن وہ درحقیقت ربٰو کا عالمگیر نظام ہے جس کے اثرات بڑے دُور رس ہیں۔ علامہ اقبالؒ کی نگۂ حقیقت شناس نے بہت پہلے بھانپ لیا تھا کہ :-

شیوۂ تہذیبِ نو آدم دری است | پردۂ آدم دری سوداگری است
ایں بنوک، ایں فکرِ چالاکِ یہود | نورِ حق از سینۂ آدم ربود

(پس چہ باید کرد)

یہ اس لئے کہ بنکوں کا سارا کاروبار ربٰو کے سر پر چلتا ہے، اور ربٰو وہ ابلیسی نظام ہے جس سے سینۂ آدم نورِ حق سے محروم ہو جاتا ہے۔ قرآن کریم نے اسے حرام اور خدا و رسولؐ کے خلاف بغاوت اسی لئے قرار دیا ہے کہ اس سے محفلِ انسانیت کے چراغ گُل ہو جاتے ہیں۔ دین کا سارا مدار اکلِ حلال پر ہے، اور ربٰو کے نظام میں اکلِ حلال کا شائبہ تک باقی نہیں رہتا۔ حضرت علامہؒ نے اس حقیقت کو بڑی شدت سے واشگاف کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ :-

نانداني نکتۂ اکلِ حلال | بر جماعت زیستن گردد وبال
آہ! یورپ زیں مقام آگاہ نیست | چشمِ اُو ینظر بنور اللہ نیست
اُو نداند از حلال و از حرام | حکمتش خام است و کارش ناتمام

نانز و بالا نہ گردد ایں نظام
دانش و تہذیب و دیں سودائے خام

(مثنوی۔ پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق)

آپ ربٰو یعنی سرمایہ داری کے نظام کی تخریب کاری کا اندازہ اس سے لگائیے کہ (حضرت علامہؒ کے الفاظ میں) اس میں دین تو ایک طرف، تہذیب و دانش تک باقی نہیں رہتے۔

علامہ اقبالؒ نے یہ وارننگ اقوامِ یورپ کو دی تھی۔ انہیں کیا معلوم تھا کہ جس اسلامی مملکت کا خواب وہ دیکھ رہے ہیں، اس میں یہ تباہ کن کاروبار ان سے بھی زیادہ شدت سے پھیلے گا۔ بنکاری کا سودی نظام تشکیل

پاکستان سے پہلے بھی اس برِصغیر میں کارفرما تھا لیکن محدود پیمانے پر۔ پاکستان میں یہ پھیلتا چلا گیا اور اب ملک گیر ہو رہا ہے۔ انگریز کے کافرانہ دورِ حکومت میں سوّد کو سود (INTEREST) کہا جاتا تھا، لیکن مسلمان عوام کے دل میں سود کے لفظ سے تکدر پیدا ہوتا تھا۔ اس کا

سُود نہیں منافع

علاج یہ سوچا گیا کہ اسے سود نہیں بلکہ منافع (PROFIT) کہا جائے۔ اس طرح (ایک لفظ کی تبدیلی سے) خدا کے حرام کردہ کو حلال کر لیا۔ موجودہ حکومت چونکہ اسلامی ہونے کی مدعی ہے، اس لئے اسے اس تبدیلی کے لئے شرعی سند کی ضرورت تھی۔ اس کے لئے اسے کوئی دقت پیش نہ آئی۔ پاکستان میں اقامتِ دین کے داعی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی (مرحوم) نے فتویٰ صادر فرما دیا کہ:-

"روپیہ جمع کرنے والوں کو سود دینے کے بجائے بینک ایسے منصوبے تیار کریں گے جن کے منافع میں روپیہ جمع کرانے والے برابر کے حقدار ہوں گے۔"

(ایشیا، ۵، نومبر ۱۹۷۸ء بحوالہ طلوعِ اسلام۔ اکتوبر ۱۹۷۹ء)

آپ کو غالباً علم ہوگا کہ بینک نہ کوئی اپنے تجارتی "منصوبے تیار کرتا ہے"، نہ خود کاروبار کرتا ہے۔ وہ کرتا یہ ہے کہ لوگوں سے کم شرح سود پر روپیہ لے کر، اسے کاروباری لوگوں کو زیادہ شرح سود پر قرض دے دیتا ہے۔ ان سے جو سود وصول ہوتا ہے، اس سے زائد حصّہ خود رکھ لیتا ہے اور باقی روپیہ جمع کرانے والوں میں تقسیم کر دیتا ہے۔ یہ خالص سودی کاروبار ہوتا ہے۔

غنیمت ہے کہ ہمارے مذہبی حلقوں سے بھی اب یہ آواز بلند ہونی شروع ہو گئی ہے کہ بینک کا منافع ہر شکل میں سود ہے۔ جماعتِ اہلِ حدیث کے ترجمان، ہفتہ وار الاعتصام میں ایک مقالہ قسط وار شائع ہو رہا ہے۔ اس کی اشاعت بابت ۲۔ مارچ ۱۹۸۴ء میں تحریر ہے:-

یہ منافع نہیں، سود ہی ہے

"بعض لوگ بینک کے نظام کو سود نہیں، بلکہ تجارتی منافع پر مبنی قرار دیتے ہیں۔ لیکن ادھر نصف صدی کے اندر اس موضوع پر اس قدر بحث ہو چکی ہے۔ اردو زبان میں بھی اتنا لٹریچر آ گیا ہے کہ مزید اضافے کی ضرورت نہیں رہ گئی ہے اور علماءِ حقّانی کی کثیر تعداد نے دلائل سے ثابت کر دیا

ہے کہ یہ سُود ہی ہے، منافع نہیں اور اب اسی پر سارے عالم کے تقریباً تمام اہل حق کا اتفاق ہے"۔

بایں ہمہ ہماری "اسلامی مملکت" اسے منافع قرار دیتی ہے، سُود نہیں۔ اس کاروبار کو مزید "اسلامیانے کے لئے" دو حصّوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ ایک کا نام رکھا ہے "بلاسود بنیکاری" اور دوسرے کو کہا گیا ہے "باسود بنیکاری"۔ یہ بھی صرف الفاظ کا فرق ہے۔ دونوں کا مدار سُود پر ہوتا ہے۔ فرق اتنا ہے کہ باسود بنیکاری میں شرح سود پہلے سے متعین کر دی جاتی ہے اور بلاسود بنیکاری میں اس شرح کا تعین منافع (یعنی سُود) تقسیم کرتے وقت کیا جاتا ہے۔

ربوٰ سے زکوٰۃ

اس کے بعد ایک قدم اور آگے بڑھایا۔ باسود بنیکاری کی مجموعی رقم (یعنی روپیہ جمع کرانے والے اصل زر اور منافع کی مجموعی رقم) سے اڑھائی فیصد وضع کر لیا اور اس کا نام زکوٰۃ رکھ دیا! ویسے تو خود لفظِ زکوٰۃ کے معنی پاکیزہ نشوونما کے ہیں، لیکن قرآن کریم نے یہ کہہ کر اس کی مزید وضاحت کر دی، يَآ أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوٓا أَنفِقُوا مِن طَيِّبَٰتِ مَا كَسَبْتُمْ ... (۲/۲۶۷) "اے جماعت مومنین (خدا کی راہ میں) اپنی پاکیزہ کمائی خرچ کرو"۔ اس لئے کہ لَا يَسْتَوِي الْخَبِيثُ وَالطَّيِّبُ ... (۵/۱۰۰) "خبیث اور طیّب کبھی ایک جیسے نہیں ہو سکتے"۔ یہاں یہی نہیں ہوا کہ خبیث طیّب کو باہم گڈمڈ کر دیا گیا، بلکہ اس آمیزش کے بعد جو رقم وضع کی گئی، اسے زکوٰۃ قرار دے دیا۔ اس زکوٰۃ میں دینی مدارس کا بھی حصّہ ہوتا ہے۔ اس لئے حضرات "علماء کرام" میں سے کوئی اس کے خلاف لب کشائی نہیں کرتا۔ بلکہ وہ اسے جھولیاں پھیلا پھیلا کر وصول کرتے ہیں۔

تھا جو ناخوب، بتدریج وہی خوب ہوا — کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

لیکن اس طرح زکوٰۃ وصول کرنے سے بھی مسئلہ کما حقہٗ، حل نہیں ہوا۔ چنانچہ صدرِ مملکت نے، کراچی میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:۔

"زکوٰۃ کے نظام اور حدود کے نفاذ سے اچھے نتائج حاصل ہو رہے ہیں، اگرچہ بہت سی توقعات پوری نہیں ہوئیں۔ زکوٰۃ کی رقم (۳۳۳ کروڑ روپے) وصول ہوئی ہے لیکن گداگروں کی فوج ابھی موجود ہے۔ بیواؤں کی بڑی تعداد امداد سے محروم ہے"۔ (جنگ لاہور، ۱۱ر مارچ ۱۹۸۴ء)

لیکن وزیرِ خزانہ محترم غلام اسحٰق خان صاحب نے اعتراف کر لیا ہے کہ بینک کا منافع بھی سود ہے۔ انہوں نے پاکستان سوسائٹی آف ڈویلپمنٹ اکاونٹس کے سالانہ اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ :-

"سود کو ختم کرنے کی پوری کوششیں کی جا رہی ہیں جب کہ سود کی جگہ منافع کو لے آنا بھی جدید سرمایہ دارانہ طریقہ ہے اور قطعی طور پر اسلامی نہیں ہے۔ اس لئے ہم سرمایہ داری کو جدید سرمایہ داری سے بدلنا نہیں چاہتے"۔

(روزنامہ جنگ۔ لاہور۔ مورخہ ۱۸ مارچ ۱۹۸۴ء)

عمرت دراز باد کہ ایں ہم غنیمت است، لیکن سود کا خاتمہ کرنے کے لئے سارا نظامِ سرمایہ داری بدلنا ہوگا کہ اس کے بغیر سود کا خاتمہ ہو نہیں سکتا۔

سُود خوری کے شرعی حیلے

انگریز کے کافرانہ نظام تک ہمارے ہاں "سود خور" کو بڑی نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ "سود خور" سے مراد ہوتی تھی، نجی قرضوں پر سود لینے والا۔ یہ کاروبار ہندو بنیا کیا کرتا تھا۔ مسلمانوں میں ایک خاص ٹائپ کے پٹھان (بالخصوص بمبئی وغیرہ کے علاقہ میں) اس کے لئے بدنام تھے۔ ہمارے ہاں اس قسم کے قرضے، بینکاری یا سیونگز اسکیموں کے دائرہ کار میں نہیں آتے، اس لئے ان قرضوں پہ منافع کو بہر حال سود سمجھا جاتا تھا۔ لیکن ہمارے مفتیانِ عظام نے ایسے حیلے بنا دیئے جن سے یہ حرام بھی حلال ہو جائے۔ مفتی محمد ابو سعید غلام سرور قادری (ایم اے اسلامک لاء) کی ایک کتاب ہے جس کا نام ہے "معاشیاتِ نظامِ مصطفیٰؐ"۔ اس میں پہلے سود کے خلاف اسلامی احکامات کا ذکر ہے، اور اس کے ایسے حیلے درج کئے گئے ہیں جن کی رُو سے سود لیا بھی جا سکے اور اس کا گناہ بھی نہ ہو۔ ایک آدھ حیلہ آپ بھی ملاحظہ فرمائیے۔

پہلی تدبیر

ایک شخص کسی کو دس ۱۰/- روپے قرض دے کر، اس سے دو روپے زائد لینا چاہتا ہے تا کہ

ہے کہ یہ دو روپے سود ہوں گے۔ لیکن اس جرم اور گناہ سے بچنے کی تدبیر یہ ہے کہ قرض دینے والا، قرض لینے والے کی کوئی چیز دس روپے میں نقد خرید کرے اور اسے قرض لینے والے کے ہاتھ مدّتِ معینہ کے لئے بارہ روپے میں اُدھار بیچ دے۔ اس مدّت کے بعد قرض لینے والا، قرض دینے والے کو بارہ روپے ادا کر دے۔"

اس فقہی حیلے سے زائد دو روپے حلال و طیّب قرار پا جائیں گے۔

اس قسم کی کئی ایک تدابیر، اس کتاب میں درج کرنے کے بعد لکھا ہے کہ:-

"امام ابو یوسف ؒ ایسے کاروبار کے متعلق فرماتے ہیں کہ اس سے منافع بھی ہوگا اور ثواب بھی ملے گا۔ ثواب اس لئے ملے گا کہ اسے سود جیسے حرام سے بچنے کے لئے اختیار کیا گیا ہے۔"

(بحوالہ: فتویٰ قاضی خان مع عالمگیری۔ جلد دوم صہ ۲۷۹/۲۸۰۔ حصری)

اور خود صاحبِ کتاب کہتے ہیں:

"لیکن افسوس کہ مسلمان دینِ فطرت کی ایسی تدابیر سے غافل رہ کر سود ایسی لعنت میں مبتلا ہیں۔ افسوس، صد افسوس کہ شاہیں نہ بنا تو۔ دیکھے نہ تیری آنکھ نے فطرت کے اشارے۔"

بحوالہ طلوعِ اسلام۔ اکتوبر ۱۹۷۹ء صفحہ ۲۳-۲۲)

اب آپ نے غور فرمایا کہ مودودی صاحب (مرحوم) نے کیوں کہا تھا؟ کہ ملک میں فقہ حنفی نافذ کر دی جائے۔

قرآنِ کریم نے نظامِ سرمایہ داری (ربٰو) کو حرام قرار دیا تھا، کیونکہ اس میں یہ ہوتا ہے کہ:-

اُشتُرِ بر اُشتُرِ دیگرے چرد دانہ ایں می کارد آں حاصل برد

کھیتی کسی کی ہے، اس میں مویشی کسی اور کے چرتے ہیں۔ کاشت کوئی کرتا ہے، پیداوار کوئی اور لے جاتا ہے۔

از ضعیفاں نان ربودن حکمت است از تنِ شاں جان ربودن حکمت است

اس میں، مفلسوں، ضعیفوں کے ہاتھ سے روٹی چھین لینا، یعنی ان کے جسمِ ناتواں سے جان کشید کر لینا کاریگری کہلاتا ہے۔ اس کے بعد کہا تھا کہ:-

تا تہ و بالا نہ گردد ایں نظام دانش و تہذیب و دیں سودائے خام

جب تک یہ نظام تہ و بالا نہ ہوگا، دین تو ایک طرف، عقل و خرد، تہذیب و تمدن تک باقی نہیں رہیں گے یہاں ایک نکتہ قابلِ غور ہے۔ قرآنِ کریم نے اس نظام کو حرام قرار دیا ہے۔ وہ جس مسلک یا شعار کو حرام قرار دیتا ہے تو وہ کوئی آمرانہ اڑلیبی نص نہیں ہوتا۔ وہ سراسر علم و حکمت پر مبنی ہوتا ہے۔ اس نے نظامِ ربوٰ مسلمانوں کے لئے اس لئے حرام قرار دیا کہ اس سے ان کا دین باقی نہیں رہتا لیکن دیگر نوعِ انسان سے کہا ہے کہ یاد رکھو! یہ نظام دشمنِ تہذیب و دانش ہے۔ اس سے تم سطحِ انسانیت سے نیچے گر جاؤ گے۔ انسانیت کی بقا اسی میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس نظام کو حرام قرار دیا ہے، اسے حرام سمجھا جائے۔

گر جہاں داند حرامش را حرام ۔۔۔ تا قیامت پختہ ماند ایں نظام

دوام اور پائندگی قرآن کے معاشی نظام ہی کو حاصل ہوگی کیونکہ اس میں تہذیب و دانش پروان چڑھیں گے۔ ان تنذیرات و تصریحات کے بعد علامہؒ نے اس کی وضاحت کر دی۔

نیست ایں کارِ فقیہاں اے پسر ۔۔۔ با نگاہے دیگرے اُو را نگر

نظامِ سرمایہ داری کو مٹا کر قرآن کا نظام قائم کرنا، مذہبی پیشوائیت کے بس کی بات نہیں۔ اس لئے کہ یہ خود دوسروں کی کمائی پر زندہ رہتے ہیں۔ قرآن کا نظام تو یہ تھا کہ

کس نہ گردد در جہاں محتاجِ کس ۔۔۔ نکتۂ شرعِ مبیں ایں است و بس

لیکن

مکتب و مُلّا سخن ہا ساختند ۔۔۔ مومناں ایں نکتہ را نشناختند

زندہ قومے بود از تاویل مُرد ۔۔۔ آتش اُو در ضمیر اُو فسرد

مذہبی پیشوائیت یہ نہیں ہونے دیگی

نکتۂ شرعِ مبیں یہ تھا کہ دنیا میں کوئی کسی کا محتاج نہ رہے۔ لیکن مذہبی پیشوائیت نے قرآنِ حکیم کے اس اصل الاصول کو اس طرح مسخ کر دیا ہے کہ یہ سرتاپا حرکت و حرارت قوم، راکھ کا ڈھیر بن کر رہ گئی۔ یہ سب دین فروش ہیں۔ قرآنِ حکیم نے کہا تھا کہ ان کا شیوہ یہ ہے کہ يَكْتُبُونَ الْكِتَابَ بِأَيْدِيهِمْ ثُمَّ يَقُولُونَ هَٰذَا مِنْ عِندِ اللَّهِ "یہ خود قوانین وضع کرتے ہیں اور لوگوں کو یہ کہہ کر فریب دیتے ہیں کہ وہ ارشاداتِ خداوندی ہیں"۔ یہ سب اس لئے کہ لِيَشْتَرُوا بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا "تاکہ اس سے چار پیسے کمائے جائیں"۔ اور نہیں جانتے کہ فَوَيْلٌ لَّهُم مِّمَّا كَتَبَتْ أَيْدِيهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُم مِّمَّا

یکسبُونَ ۵ (۳۲ے)
○ ان کے یہ فتویٰ اور ان کے ذریعے حاصل کردہ روٹی انہیں لے ڈوبے گی۔"

اس سے:

عقل و نقل اُفتاد در بندِ ہوس منبرِ شاں منبرِ کاک است و بس

یہ منقولی بات کہیں یا معقولی، مقصد ان کا اپنی مفاد پرستی ہوتا ہے۔ ان کا منبر، روٹی بیچنے والے کا خوانچہ بن کر رہ گیا ہے:۔

زیں کلیماں نیست اُمیدِ کشود آستیں ہائے ید بیضا، چہ سُود ؟

یہ وہ صاحبانِ ضربِ کلیم نہیں جن کا ثعبانِ مبین فرعون، ہامان وقارون کو ہڑپ کر جائے۔ ان کی آستینوں میں چھپے ہوئے ہاتھوں میں ایمان کی شمعیں نہیں۔ لہٰذا ان سے کشود کار کی کوئی امید نہیں رکھنی چاہیئے۔

یہ تھے وہ ساحرین وسامرین جن سے پیچھا چھڑانے کے لئے حضرت علامہؒ نے پاکستان کی آزاد مملکت کا تصور دیا تھا تاکہ اُمّتِ مرحومہ کو حلال کی روٹی مل سکے۔ اگر وہ جانتے کہ اس مملکت کا حشر یہ ہونا ہے تو وہ کبھی اپنے نالۂ نیم شبی اور فغانِ سحری کو اس کے لئے وقف نہ کرتے۔ انہوں نے مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم) کے اعتراض کے جواب میں اس حقیقت کو واضح کر دیا تھا کہ:۔

"مسلمان ہونے کی حیثیت سے انگریزوں کی غلامی کے بند توڑنا اور اس کے اقتدار کو ختم کرنا ہمارا فرض ہے لیکن اس آزادی سے یہ مطلب نہیں کہ ہم آزاد ہو جائیں، بلکہ ہمارا اولین مقصد یہ ہے کہ اسلام قائم رہے..... اس لئے مسلمان کسی ایسی حکومت کے قیام میں مددگار نہیں ہو سکتا، جس کی بنیادیں انہی اصولوں پر ہوں جن پر انگریزی حکومت قائم ہے۔ ایک باطل کو مٹا کر دوسرے باطل کو قائم کرنا چہ معنی دارد ؟

کہا جاتا ہے کہ نظامِ سرمایہ داری اس دور کا اقتصادی تقاضا ہے۔ اس کے بغیر چارہ ہی نہیں[لے]۔ اگر یہی بات

[لے] اس کے بغیر چارہ اس لئے نہیں کہ ہم میں قرآن کا معاشی نظام اختیار کرنے کی ہمت نہیں۔

ہے تو اسے اختیار کئے رہیئے، لیکن اسے حرام تو سمجھئے۔ قرآن کے معاشی نظام کے بجائے اسے اختیار کرنے سے جو حشر باقی دنیا کا ہوگا، وہی ہمارا بھی ہوگا۔ لیکن اس کے اسلامی قرار دینے سے اسلام دنیا میں بدنام ہو جائے گا۔ یہی وہ جرمِ عظیم تھا جس کے احساس سے علامہؒ نے انتہائی سوز و گداز کے ساتھ کہا تھا:

نامداری از محمدؐ رنگ و بو! از درودِ خود میالا نامِ او!

ہماری وجہ سے اگر اسم محمدؐ پر کوئی حرف آگیا تو یہ جرم ناقابلِ معافی ہوگا، جو ہمیں کہیں کا نہیں چھوڑے گا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس سے محفوظ رکھے۔

میں نے ابھی ابھی کہا ہے کہ دین کا نظام اختیار نہ کرنے سے جو حشر باقی قوموں کا ہوگا وہی ہمارا ہوگا۔ لیکن ذرا گہرائی میں اتر کر دیکھئے تو نظر آجائے گا کہ حشر ان قوموں سے بھی زیادہ اندوہناک اور عبرت آموز ہوگا۔ سیکولر قوموں کی کیفیت یہ ہے کہ جو معاملہ ان کے سامنے آتا ہے وہ عقل و فکر کی رُو سے اس پر غور کرتی ہیں۔ علم و آگہی کی روشنی میں اس کے ہر پہلو کا جائزہ لیتی ہیں۔ زمانے کے تقاضوں کے ترازو میں رکھ کر اسے تولتی ہیں۔ اور اس کے بعد کسی فیصلہ پر پہنچتی ہیں۔

جب تجربہ بتاتا ہے کہ اس فیصلہ میں کوئی سقم رہ گیا ہے تو وہ اس پر نظرثانی کرتی ہیں۔ اور اس طرح دانش و بینش کے ہمرکاب زندگی کا سفر طے کرتی چلی جاتی ہیں۔ ان کے برعکس، ہماری حالت یہ ہے کہ جونہی کوئی معاملہ ہمارے سامنے آئے، اُدھر سے آواز آجاتی ہے کہ یہ شرعاً ناجائز ہے۔ (بغیر بتائے کہ اس کی اتھارٹی کیا ہے۔) اس آواز کے ساتھ ہی عقل و فکر کی کھڑکیاں بند ہو جاتی ہیں۔ علم و شعور کے دروازے مقفل ہو جاتے ہیں۔ دماغوں پر تالے پڑ جاتے ہیں، ذہن مفلوج ہو جاتے ہیں۔ آپ اگر اس کے خلاف ایک لفظ بھی کہیں تو آپ پر کفر و الحاد حتیٰ کہ ارتداد تک کا فتویٰ لگ جاتا ہے۔ آپ کو ان کا فیصلہ ماننا پڑتا ہے۔ اس باب میں افراد ہی نہیں، حکومتیں بھی بے بس ہوتی ہیں۔ وہ اعتراف کرتی ہیں کہ فلاں (شرعی) قانون ناممکن العمل ہے لیکن وہ اسے منسوخ کرنا تو ایک طرف اس میں کسی قسم کا ردّ و بدل بھی نہیں کر سکتیں۔ اس کی زندہ مثالیں خود ہمارے سامنے موجود ہیں۔ یہ جو ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمان جہاں کہیں بھی ہیں شدید جذباتی واقع ہوئے ہیں، تو اس کی وجہ یہی ہے۔ جس قوم پر صدیوں سے علم و عقل سے کام لینا حرام قرار دے دیا گیا ہو۔ جس کا غور و فکر کا گلا گھونٹ دیا گیا ہو، وہ جذباتی نہیں ہوگی تو اور کیا ہوگی؟ اور عقل و فکر

سے عاری، جذباتی قوموں کا جو حشر ہوا کرتا ہے، ظاہر ہے۔ اس کی زندہ مثال ہم خود ہیں۔ اقبالؒ ساری عمر یہی رونا روتا رہا اور یہ کہہ کر چلا گیا کہ

داستانِ او مپرس از من، کہ من چوں بگویم، آنچہ ناید در سخن

اور یہی کہتا خود میں بھی چلا جاؤں گا۔[1]

والسلام

پرویز۔ مئی ۱۹۸۴ء

---

[1] محترم پرویزؒ صاحب کا یہ خطاب فکر اقبال پر ان کی زندگی کی آخری نگارش ہے۔